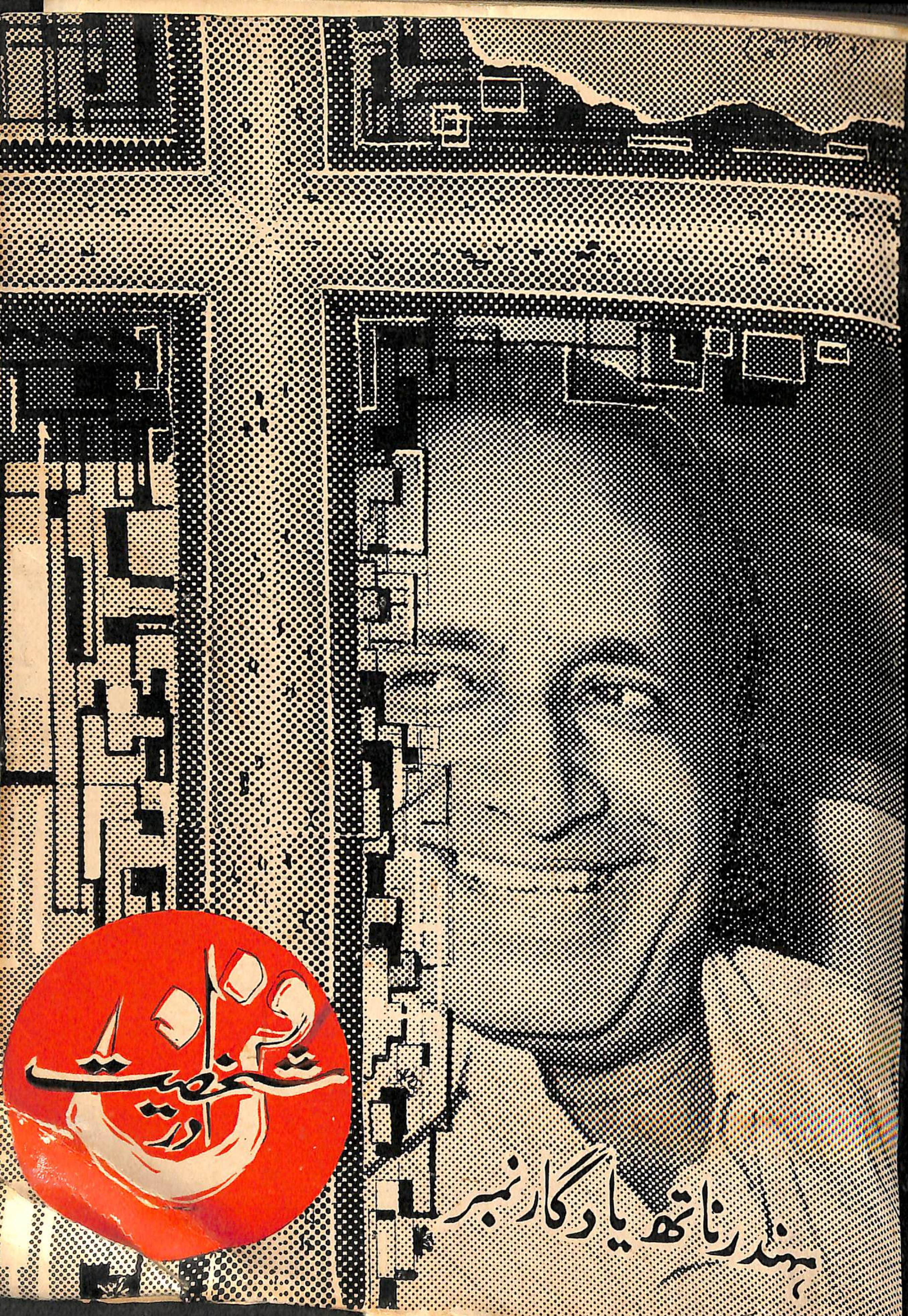
شخصیت اور فن



مہندر ناتھ یادگار نمبر

جموں اور کشمیر ترقی کی جھلکیاں

- اناج کی پیداوار میں تین لاکھ ٹن سے زیادہ اضافہ ہوا۔ سنہ ۵۰ء کی دہائی کے مقابل اجناس کی پیداوار میں یہ اضافہ امسال دس لاکھ ٹن سے بھی تجاوز کر گیا۔
- پھلوں کی پیداوار میں چار سو فیصد سے زیادہ اضافہ ہوا۔ سنہ ۶۷-۱۹۶۶ء میں پھلوں کی پیداوار ۳۴،۰۰۰ ٹن تھی جو بڑھ کر اب ۱،۸۰،۰۰۰ ٹن ہو گئی ہے۔
- چوتھے پنجسالہ منصوبے کے دوران نصف شب برقی قوت دگنی سے زیادہ ہو گئی یعنی ۴۰،۳۶ ایم ڈبلیو ایس (میگا واٹس) سے بڑھ کر ۸۳ ایم ڈبلیو ایس ہوئی۔
- گذشتہ تین سال کی مدّت میں اسٹیٹ ہینڈی کرافٹس کارپوریشن نے کشمیری دستکاری مصنوعات کی فروخت میں ۲۵۰ فیصد اضافہ درج کیا اور اس دوران برآمدات میں تین گنا اضافہ ہوا۔
- سنہ ۱۹۶۹ء میں رجسٹرڈ چھوٹی صنعتی یونٹوں کی تعداد دو سو سے کم تھی اب یہ اعداد شمار چار ہزار سے بھی تجاوز کر گئے ہیں۔
- فی کس سالانہ آمدنی کا اوسط (۵۱-۱۹۵۰) میں ۱۴۶۸۸۱ روپے تھا جو بڑھ کر ۰،۷۶۷،۱۳۱ روپے (۵۶-۱۹۵۵) نرخ کے مطابق)

ماہ و سال کے حساب سے مہندر جی
مجھ سے عمر میں چھوٹے تھے۔ لیکن
انسان دوستی، دردمندی، حاجت روائی
اور کھری سچائی کے اظہار میں مجھ سے
بڑے تھے۔

کرشن چندر

"فن اور شخصیت" کے مبشر
جناب کشمیری لال ذاکر صاحب کی
خدمت میں

1.6.71

رسالہ "فن اور شخصیت" ہر سال آپ کی خدمت میں دو شاہکار پیش کیا کرے گا۔ ہر اُس فنکار اور شخصیت کے بارے میں جس نے ادب، فلم، سائنس، سیاست، مصوری یا زندگی کے کسی بھی اہم شعبہ میں انسانیت کی ترقی اور عوام کی بہبودی کے لئے کوئی کارنامہ کیا ہو گا۔

(ادارہ)

مہندر ناتھ یادگار نمبر

ششماہی

شخصیات

بمبئی

جلد (۱) مارچ ۱۹۷۵ء شمارہ (۱)

— مُدیر —

صابر دت

— مُدیر اعزازی —

سی۔ ایل۔ کاوش

موجودہ شمارہ: پچیس ۲۵ روپئے

عام شمارہ: دس روپئے

تین مورتی پبلیکیشنز

۱۵۔ چھپرا بلڈنگ ۔ مادھو داس پاستہ روڈ
دادر ۔ بمبئی ۱۴۰۰۱۴

تقسیم کار:
علوی بکڈپو
محمد علی روڈ
بمبئی ۔ ۳

انتساب

یہ لو تمہارا شمارہ
تمہیں گلہ تو نہیں
کہ میں نے کچھ نہ کیا
ہر ایک دوست تمہارا تمہارے سامنے ہے
ہر ایک لب پہ تمہاری ہی داستان تو ہے
یہ داستان کبھی ختم ہو نہیں سکتی
تمہارا فن تھا تمہاری ہی شخصیّت کی نمود
کبھی ادب سے یہ میراث کھو نہیں سکتی

صابر دت
(مدیر)

ترتیب
مہندر ناتھ یادگار نمبر

کوئی مضمون بلا اجازت شائع نہ کیا جائے

ہمارے قلمکار

پیام

اندر کُمار گجرال (وزیر نشر و اشاعت)، کے۔ ایل۔ پوسوال (وزیر داخلہ ہریانہ) لال چند پراکتی (وزیر جنگلات ہماچل پردیش) آغا شورش کاشمیری ایڈیٹر "چٹان"، لاہور۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی۔ پروفیسر آل احمد سرور۔ مالک رام۔ پدم شری نرگس دت۔ حمیدہ سُلطان۔ ڈاکٹر دھرم ویر بھارتی۔ کمال احمد صدیقی۔ سریندر ناتھ ورما۔ اداکار آئی۔ ایس جوہر۔ اروند کمار ایڈیٹر "مادھوری" ڈاکٹر نریش۔ وشرام بڈیکر اور حسن کمال ایڈیٹر اردو "بلٹز"

شمع بُجھ گئی لیکن

اہلِ غم اور بھی ہیں
(فلمِ آنچل)

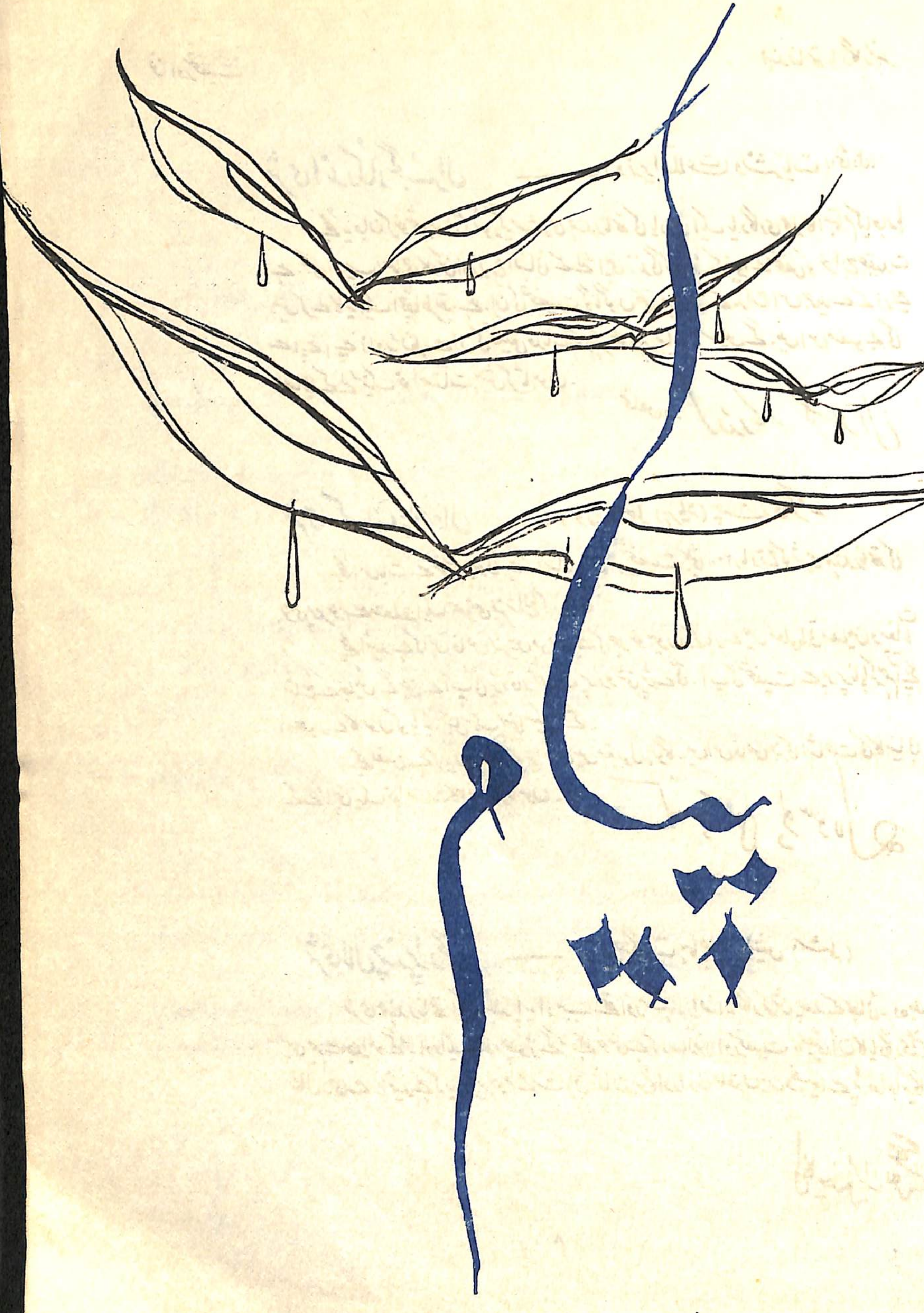
شگوفے

بڑا ہے درد کا رشتہ

شریکِ غم

شیخ عبداللہ (وزیر اعظم کشمیر)، نیاز حیدر۔ مالک رام۔ پرکاش پنڈت۔ کلام حیدری، مجتبیٰ حسین، فکر تونسوی۔ احمد جمال پاشا۔ جگت نارائن۔ سید میر قاسم سابق چیف منسٹر جموں کشمیر۔ ڈاکٹر کیول کرشن اسپیکر ودھان سبھا چنڈی گڑھ۔ ڈاکٹر محمد حسن۔

صاکبر دت ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے یونیورسل فائن آرٹ لیتھو پریس ۲۳ نوروجی اسٹریٹ ٹھاکر دوار بمبئی ۲ سے چھپوا کر ۵ اے/۱ چیمبر بلڈنگ مادھو داس پاستہ روڈ بمبئی ۱۴ سے شائع کیا۔


پیام

شری اندر کمار گجرال

—— (وزیر اطلاعات و نشریات) (نئی دہلی)

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ سورگیہ شری مہندر ناتھ کی یاد میں ایک یادگاری مجلہ کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ کسی ادیب، سماجی کارکن اور ربوع انسانی کے لئے اپنی زندگی کو وقف کرنیوالے شخص کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کا یہ ایک اچھا طریقہ ہے۔ ان کی شخصیت گوناگوں تھی لہذا ان کے مداح اس جریدے کے ذریعے سے اپنے اپنے زاویۂ نظر سے ان کی تخلیقی خدمات کو بہتر طور پر بیان کر سکیں گے۔ میں اس منصوبے کی کامیابی کے لئے نیک خواہشات پیش کرتا ہوں۔

مخلص:-

شری کے۔ ایل۔ پوسوال

—— (وزیر داخلہ (ہریانہ) چنڈی گڑھ

مجھے اس بات سے خوشی ہوئی ہے کہ رسالہ "فن اور شخصیت بمبئی" ۲۰ مارچ کو شری مہندر ناتھ کی برسی پر مرحوم سے متعلق ایک خصوصی نمبر شائع کر رہا ہے۔

مجھے امید ہے کہ اس خاص نمبر میں موصوف کی جملہ خوبیوں کے بارے میں معلوماتی مضامین و پیغامات شائع کئے جائیں گے جن سے آپ کی پُروقار شخصیت پر روشنی پڑے گی۔ آپ کی شخصیت سے پریرنا پاکر ہم آپکے ادھورے کاموں کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکیں گے۔

مجھے یقین ہے کہ یہ نمبر مرحوم کے مداحوں میں مقبول ہوگا۔ میں اس خاص نمبر کی اشاعت کی کامیابی کے لئے اپنی نیک خواہشات کا اظہار کرتا ہوں۔

شری لال چند پرارتھی

—— وزیر جنگلات ہماچل پردیش (شملہ)

شری مہندر ناتھ ایک بلند پایہ ادیب تھے اور مشہور افسانہ نگار کرشن چندر کے بھائی۔ وہ جلد ہی ہم سے جدا ہو گئے۔ اور ایک خلاء چھوڑ گئے۔ مجھے خوشی ہے کہ رسالہ "فن اور شخصیت" بمبئی اُن کا یادگاری نمبر نکال رہی ہے۔ امید ہے کہ یہ نمبر مرحوم کے شایانِ شان ہوگا اور ادبی حلقوں میں دلچسپی سے پڑھا جائیگا

آغا شورش کاشمیری ـــــ مُدیر "چٹان" لاہور (پاکستان)

کاوش ـــ برادر بجانِ برابر

تسلیمات ! آج چھ ماہ کی علالت کے بعد اور دو ماہ کے مزید ضعف کے بعد چند بوسیدہ و ژولیدہ الفاظ لکھنے کی طاقت پیدا ہوئی ہے ۔ آپ کو اور پربودھ جی کو پہلا خط لکھ رہا ہوں ۔

اصلی واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۶۵ سے ۱۹۷۴ء تک ہر سال جیل میں رہا ۔ دو دفعہ لمبی سے لمبی بھوک ہڑتال کی اور رہائی ملی ۔ نتیجۃً صحت گرتی ہوئی دیوار ہو گئی ۔ اب ایک ایسی عمارت ہوں جس کو مرمت سہارا دیے رہی ہے ، آپ کو دیکھنے کو جی چاہتا ہے ۔ لیکن ـــ جو کبھی پوری نہ ہو وہ آرزو ہے ۔ اور کیا ۔

ادھر خبر ملی ہے کہ مہندر ناتھ کا انتقال ہو گیا ۔ انا للہ وانا الیہ ـــــ

جب میں عالمی پریس کے ساتھ بمبئی گیا تھا تو فلم رائیٹرز ایسوسی ایشن بمبئی کے عشائیہ میں موجود تھے ۔ وہ ہنستا ہوا چہرا آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے ۔ پنڈت سُدرشن بھی اس عشائیہ میں موجود تھے ۔ وہ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے ۔ سب اُٹھتے جا رہے ہیں ۔) مہندر کے قلم نے اُردو کے دامنِ ادب کو بہت کچھ دیا ہے ۔ اِس کی چند کہانیاں پڑھی تھیں ـــ وہ منفرد افسانہ نگار تھا ۔

کاوش ! افسانہ کے عربی میں معنی ہیں کِذب یعنی جھوٹ ! لیکن مہندر ناتھ کی کہانیوں پر یہ بہتان نہیں باندھا جا سکتا ۔ وہ زندگی کی نقاشی کرتا تھا اور زندگی جھوٹ نہیں ہے ۔

اُس کے ادب میں غریب کا دل اور مفکر کا مزاج ہے ۔ نگارش میں پھولوں کی لچک ، چاندنی کی چمک ہے تم اس کا یادگار نمبر نکال رہے ہو ۔ خدا تمہیں توفیق دے اور اُن ترقی پسندوں کو ہدایت ـ جو عوام کی غربت کو اچھال کر اپنے بنگلوں کی پھلواریاں سجاتے ہیں لیکن اپنے مخلص ساتھیوں کو نابع مہمل سمجھ کر اُن سے اجتناب کرتے ہیں خدا انہیں تمہاری اس مخلصانہ کوشش میں کامیاب کرے ۔

میں نے کرشن جی کو کتابیں بھجوائی تھیں ، اُن کی جانب سے کوئی اطلاع نہیں آئی ۔ انہیں کتابیں ملیں یا نہیں ؟ ساحر کہاں ہے ؟ اپنے بچّے کو بہت بہت آداب کہیں ۔ آپ کا بھتیجا اور بھتیجی علیحدہ خط لکھ رہے ہیں

شورش

فن کا اُجالا ہوتا ہے

فن ہے شخصیت کی نمود

اہلِ علم اور بھیڑ

(فلم آنچل)

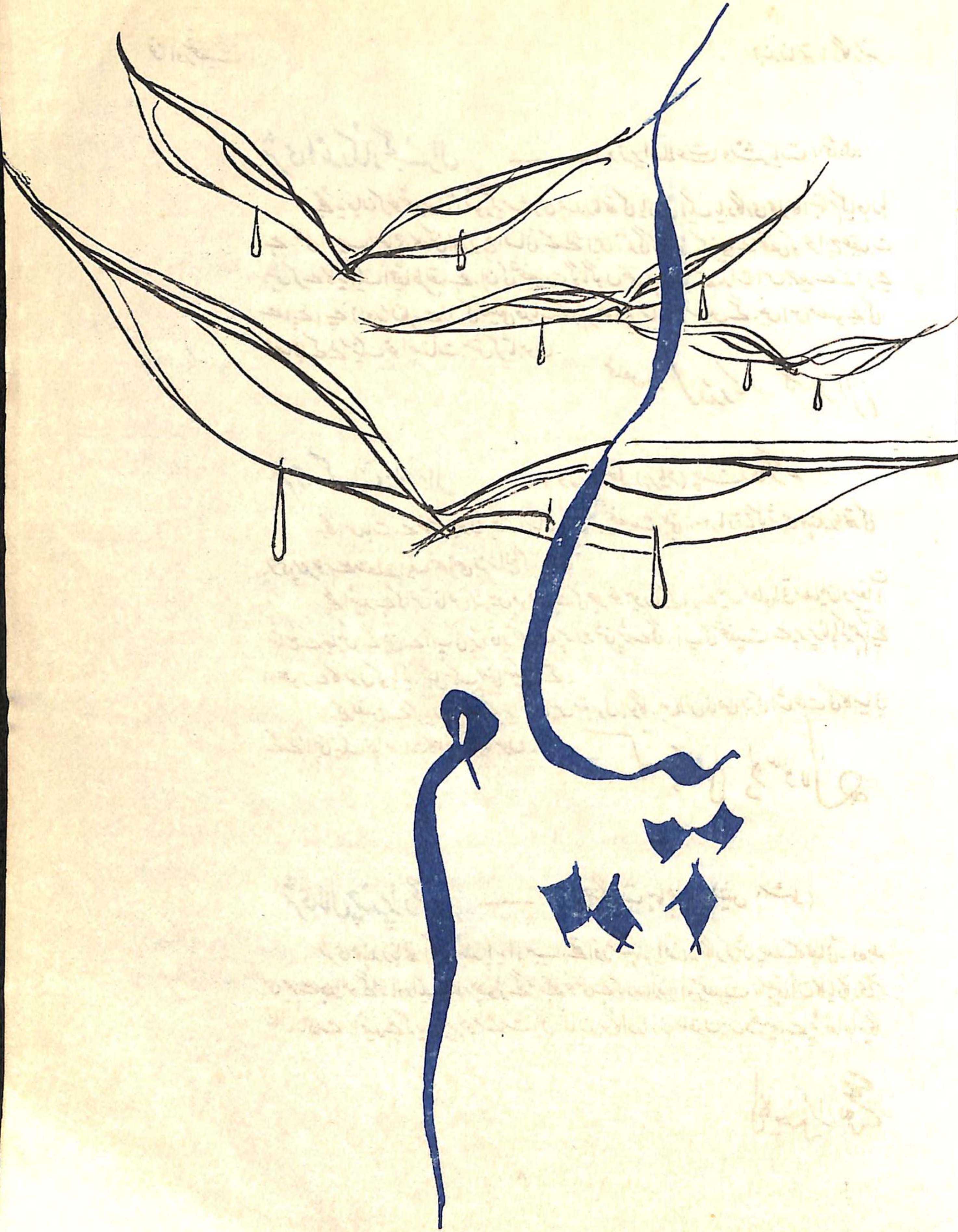
شگوفے

بڑا ہے درد کا رشتہ

شریکِ غم

شیخ عبداللہ (وزیر اعظم کشمیر)۔ نیاز حیدر۔ مالک رام۔ پرکاش پنڈت۔ کلام حیدری، مجتبیٰ حسین، فکر تونسوی۔ احمد جمال پاشا۔ جگت نارائن۔ سید میر قاسم سابق چیف منسٹر جموں کشمیر۔ ڈاکٹر کیول کرشن اسپیکر ودھان سبھا چنڈی گڑھ۔ ڈاکٹر محمد حسن۔

صابر دت ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے یونیورسل فائن آرٹ لیتھو پریس ۲۳ ٹولوجی اسٹریٹ ٹھاکرودوار بمبئی ۴ سے چھپوا کر ۵ اچیر ابلڈنگ مادھو داس پاستہ روڈ بمبئی ۱۴ سے شائع کیا۔



شری اندر کمار گجرال —— (وزیر اطلاعات و نشریات) (نئی دہلی)

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ سورگیہ شری مہندر ناتھ کی یاد میں ایک یادگاری مجلہ کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ کسی ادیب، سماجی کارکن اور رفاہِ انسانی کے لئے اپنی زندگی کو وقف کرنیوالے شخص کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کا یہ ایک اچھا طریقہ ہے۔ اِن کی شخصیت گوناگوں تھی لہذا ان کے مداح اس جریدے کے ذریعے سے اپنے اپنے زاویۂ نظر سے ان کی تخلیقی خدمات کو بہتر طور پر بیان کر سکیں گے۔ میں اس منصوبے کی کامیابی کے لئے نیک خواہشات پیش کرتا ہوں۔

مخلص:- اندر کمار گوجرال

شری کے۔ ایل۔ پوسوال —— (وزیر داخلہ (ہریانہ) چنڈی گڑھ

مجھے اس بات سے خوشی ہوئی ہے کہ رسالہ "فن اور شخصیت بمبئی" ۲۰ مارچ کو شری مہندر ناتھ کی برسی پر مرحوم سے متعلقہ ایک خصوصی نمبر شائع کر رہا ہے۔

مجھے امید ہے کہ اس خاص نمبر میں موصوف کی جملہ خوبیوں کے بارے میں معلوماتی مضامین و پیغامات شائع کئے جائیں گے جن سے آپ کی پُر وقار شخصیت پر روشنی پڑے گی۔ آپ کی شخصیت سے بہرہ پا کر ہم آپکے ادھورے کاموں کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکیں گے۔

مجھے یقین ہے کہ یہ نمبر مرحوم کے مداحوں میں مقبول ہوگا۔ میں اس خاص نمبر کی اشاعت کی کامیابی کے لئے اپنی نیک خواہشات کا اظہار کرتا ہوں۔

کنہیا لال پوسوال

شری لال چند پرارتھی —— وزیر جنگلات ہماچل پردیش (شملہ)

شری مہندر ناتھ ایک بلند پایہ ادیب تھے اور مشہور افسانہ نگار کرشن چندر کے بھائی۔ وہ جلد ہی ہم سے جدا ہو گئے۔ اور ایک خلا چھوڑ گئے۔ مجھے خوشی ہے کہ رسالہ "فن اور شخصیت" بمبئی اُن کا یادگاری نمبر نکال رہی ہے۔ امید ہے کہ یہ نمبر مرحوم کے شایانِ شان ہوگا اور ادبی حلقوں میں دلچسپی سے پڑھا جائیگا

لال چند پرارتھی

آغا شورش کاشمیری —— مُدیر "چٹان"، لاہور (پاکستان)

کاوش — برادرِ جان برابر

تسلیمات! آج چھ ماہ کی علالت کے بعد اور دو ماہ کے مزید ضعف کے بعد چند بوسیدہ و ژولیدہ الفاظ لکھنے کی طاقت پیدا ہوئی ہے۔ آپ کو اور پر بودھ جی کو پہلا خط لکھ رہا ہوں۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ 1966ء سے 1974ء تک ہر سال جیل میں رہا۔ دو دفعہ لمبی سے لمبی بھوک ہڑتال کی اور رہائی ملی۔ نتیجۃً صحت گرتی ہوئی دیوار ہوگئی۔ اب ایک ایسی عمارت ہوں جس کو مرمت سہارا دیے رہتی ہے۔ آپ کو دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن —— جو کبھی پوری نہ ہو وہ آرزو ہے۔ اور کیا۔

ادھر خبر ملی ہے کہ مہندر ناتھ کا انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ ——

جب میں عالمی پریس کے ساتھ بمبئی گیا تھا تو فلم رائیٹرز ایسوسی ایشن بمبئی کے عشائیہ میں موجود تھے۔ وہ ہنستا ہوا چہرہ آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ پنڈت سدرشن بھی اس عشائیہ میں موجود تھے۔ (وہ بھی اللہ کو پیارے ہوگئے۔ سب اُٹھتے جا رہے ہیں۔) مہندر کے قلم نے اُردو کے دامنِ ادب کو بہت کچھ دیا ہے۔ اس کی چند کہانیاں پڑھی تھیں —— وہ منفرد افسانہ نگار تھا۔

کاوش! افسانہ کے عربی میں معنی ہیں کذب یعنی جھوٹ! لیکن مہندر ناتھ کی کہانیوں پر یہ بہتان نہیں باندھا جاسکتا۔ وہ زندگی کی نقاشی کرتا تھا اور زندگی جھوٹ نہیں ہے۔

اُس کے ادب میں غریب کا دل اور مفکر کا مزاج ہے۔ نگارش میں پھولوں کی لچک، چاندنی کی چمک ہے تم اس کا یادگار نمبر نکال رہے ہو۔ خدا تمہیں توفیق دے اور اُن ترقی پسندوں کو ہدایت —— جو عوام کی غربت کو اچھال کر اپنے بنگلوں کی پھلواریاں سجاتے ہیں لیکن اپنے مخلص ساتھیوں کو تابع مہمل سمجھ کر اُن سے اجتناب کرتے ہیں خدا انہیں تمہاری اس مخلصانہ کوشش میں کامیاب کرے۔

میں نے کرشن جی کو کتابیں بھجوائی تھیں، اُن کی جانب سے کوئی اطلاع نہیں آئی۔ انہیں کتابیں ملیں یا نہیں؟ ساحر کہاں ہے؟ اپنے بچے کو بہت بہت آداب کہیں۔ آپ کا بھتیجا اور بھتیجی علاحدہ خط لکھ رہے ہیں

شورش

پروفیسر ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی —— (دہلی یونیورسٹی)

مرزا غالب نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد ایک خط میں میر مہدی مجروح کو لکھا ہے :-

" دلّی کے تمام مال و متاع اور زر و گوہر کی لوٹ، پنجاب احاطہ میں چلی گئی ہے۔ "

ہندوستان کی آزادی کے بعد اس کے برعکس ہوا۔ یعنی :

پنجاب کے تمام مال و متاع اور زر و گوہر کی لوٹ احاطۂ دہلی میں آگئی ہے۔

یہ فہرست بہت لمبی ہے میں زر و گوہر کی اس فہرست میں سے صرف دو نام لیتا ہوں : مہندر ناتھ اور کرشن چندر۔ مہندر ناتھ کا ناگہانی انتقال ہو گیا جن کی یاد میں یہ رسالہ "فن اور شخصیت" شائع ہو رہا ہے۔ کرشن چندر باقی ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں صد و سی سال زندہ رکھے۔

یہ وہ حضرات ہیں جو اپنی جان کے ساتھ اردو کا ذوق بھی لگا لائے ہیں اور انہوں نے خود بے گھر ہو کر ایک بے گھر زبان کی بے پایاں خدمت انجام دی ہے۔

مہندر ناتھ کی یاد کو قائم رکھنا اردو کی خدمت ہے۔ وہ قوم جو اپنے خدمت گزاروں کی خدمات کو بھول جائے، یقین جانئے کہ اس میں گھن لگ گیا ہے۔ میرے عزیز دوست صابر دت نے مہندر ناتھ کی خدمات کا سخن شناسانہ اعتراف کر کے، نہ صرف اُردو کی زندگی کا اعلان کیا ہے بلکہ ادبی تاریخ کے ایک گوشے کو جلا بخشی ہے اور صحافت کا ایک معیار قائم کیا ہے۔ میری دعا ہے کہ وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوں اور یہ شاخِ آرزو برومند ہو۔

خواجہ احمد فاروقی

پروفیسر آل احمد سُرور —— (شملہ)

مکرمی۔ تسلیم۔ یہ بڑی اچھی بات ہے کہ آپ مشہور افسانہ نگار مہندر ناتھ کی یاد میں ایک خاص نمبر مرتب کر کے اُن کی برسی پر شائع کر رہے ہیں۔ ہماری ادبی دنیا میں یہ بات افسوسناک ہے کہ ان کی زندگی میں ہم اپنے ادیبوں کا کماحقہٗ اعتراف کرتے ہیں اور مرنے کے بعد بھی صرف ایک رسم پوری کر لیتے ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے ادیبوں اور شاعروں اور فن کاروں کے حقیقی رول کو پہچانیں اور اس کی وجہ سے اُن کی قدر کریں۔ مہندر ناتھ ایک بلند پایہ افسانہ نگار اور فن کار تھے۔ انہوں نے ادب اور زندگی کی کسی دقیع قدروں کی ہمیشہ علمبرداری کی۔ وہ ایک مخلص اور نڈر انسان تھے۔ اُن کی عمر بہت کم ہوئی مگر اس عمر میں بھی انہوں نے آج کی ادبی دنیا میں ایک اہم مقام حاصل کر لیا تھا۔

اُن کی یاد تازہ رکھنا اور اُن کے خلوص اور جگر کاوی کو پیش نظر رکھنا ہمارے لئے ضروری ہے۔ مجھے یہ بھی توقع ہے کہ آپ لوگ اُن کے افسانوں کا ایک اچھا انتخاب بھی شائع کریں گے۔ اور ان کی مناسب یادگار کے لئے بھی اقدامات کریں گے۔

مخلص :- آل احمد سرور

شری مالک رام —— (نئی دہلی)

مہندر ناتھ ہماری زبان کے مشہور ادیب اور کامیاب افسانہ نگار اور ناول نویس تھے۔ افسوس کہ دنیائے ادب نے ان کی کما حقہٗ قدر نہیں کی۔ لیکن اس میں کچھ شائبہ خوبیٔ تقدیر بھی تھا۔ وہ کرشن چندر کے چھوٹے بھائی تھے۔ جس طرح برگد کے نیچے اور کچھ پنپ نہیں سکتا کیونکہ اس کے سائے کے باعث نیچے کی گھاس اور روئید گی کو کافی دھوپ نہیں پہنچتی اور اس سے وہ جلد ہی مرجھا جاتی ہے۔ یہی حال مہندر ناتھ کا ہوا۔ کرشن چندر کی عظمت سے انکار نہیں کیا جا سکتا؟ وہ اردو افسانے کے مسلّمہ استاد ہیں لیکن ان کی شہرت کے باعث مہندر ناتھ کو اپنا حق نہ مل سکا۔ گویا ان کے حق میں "سگ باش، برادرِ خُرد مباش" کا مقولہ ایک اور طرح بھی دُرست ثابت ہو گیا۔

لیکن اس کے لئے مہندر ناتھ خود بھی کسی حد تک ذمہ دار تھے۔ انہوں نے صُورتحال سے دل برداشتہ ہو کر اپنی تحریروں کی نوک پلک بنانے سے بے توجہی کو اپنا مزاج بنا لیا۔ ان کے ہاں جو کہیں کہیں خامی اور جھول پایا جاتا ہے تو اس کا باعث یہی ہے۔ لیکن انہوں نے جتنا ذخیرہ اپنی یادگار چھوڑا ہے وہ بے حد قیمتی ہے۔ میرے علم میں ان کے پندرہ ناول اور دس افسانوں کے مجموعے طبع ہو چکے ہیں۔ کچھ نہ کچھ غیر مطبوعہ بھی رہ گیا ہو گا۔

یہ ورثہ کچھ کم نہیں ہے، بلکہ کسی شخص کے لئے بھی فخر کا باعث اور حیات جاوداں کا ضامن ہو سکتا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس ذخیرے کا غائر جائزہ لیا جائے اور تاریخ ادب اردو میں مرحوم کا مقام متعیّن کیا جائے۔ یعنی جو کام ان کی زندگی میں نہیں ہو سکا تھا، وہ اب ان کی موت کے بعد ہو جائے۔ یہ موجودہ نسل پر مرحوم کا قرض ہے۔ دیکھیں،

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مردافگنِ عشق،

مالک رام

ڈاکٹر قمر رئیس —— (دہلی)

برادرم صابر دت صاحب مکرم

نوازش نامہ ملا۔ بے حد شکر گزار ہوں۔ اسی دوران جاں نثار صاحب دلّی آئے تو اُن کی زبانی پہلی بار یہ علم ہوا کہ آپ اور بھائی کرشن چندر مہندر ناتھ یادگار نمبر ترتیب دے رہے ہیں بلکہ ترتیب دے چکے ہیں اور اب طباعت کے مرحلہ میں ہے۔ اس خبر سے بے حد خوشی ہوئی۔ لیکن اس کا افسوس ہوا کہ میں اس میں شریک نہیں۔

گزشتہ چھ ماہ کے عرصہ میں دو بار اعجاز صدیقی صاحب کو لکھ چکا ہوں کہ وہ مہندر ناتھ یادگار نمبر نکالیں اور اس کام میں مَیں ہر امکانی تعاون کروں گا۔ لیکن موصوف نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مجھے آپ سے اور اس سے زیادہ کرشن چندر سے شکایت ہے کہ مجھے اس سے بالکل بے خبر رکھا۔ میں چھوٹا ادیب سہی

لیکن اُن کی تصانیف کے بارے میں ایک حقیر سا مضمون تو لکھ ہی سکتا تھا۔ نیا زمنفعد

قمر رئیس

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ——— (دہلی)

مہندر ناتھ اردو کے ان افسانہ نگاروں اور ناول نویسوں میں سے تھے جن کی خدمات کا صحیح اعتراف اِن کی زندگی میں نہیں ہوا۔ ایک زمانے میں وہ لوگوں کی نگاہوں کا مرکز بنے لیکن پھر بھی ایسی وجوہ سے جو ادبی کم اور غیر ادبی زیادہ تھیں وہ جیسے پردہ خفا میں چلے گئے۔

برگد کے پیڑ کا اپنا منظر ہوتا ہے۔ لیکن اس سے ذرا ہٹ کر سبز اور پھولوں کے تختوں کا منظر بھی اپنی بہار رکھتا ہے۔ اردو میں لوگ جب بڑے پیڑ پر نظریں جما لیتے ہیں تو سبزہ و روش سے بیگانہ ہو جاتے ہیں یہ ہماری فطری کمزوری یعنی مرعوبیت اور طرفداری کا ایک پہلو ہے۔ مہندر ناتھ کئی ناولوں اور کہانیوں کے مجموعوں کے مصنف تھے۔ ان کی بہت سی کہانیوں کا خام مواد خود ان کی زندگی سے ماخوذ تھا ان کی زندگی ایک ایسی داستان ہے جسے خود انہوں نے کہیں کہیں سے پڑھ لیا اور باقی کو خدمت خلق کی نذر کر دیا۔ وہ انسانیت کا سچا نمونہ تھے۔ اور ان کا ادب ان کی انسانیت دوستی کی دلآویز دستاویز ہے۔ فلموں میں کام کرنیوالوں کے لئے انہوں نے کیا نہیں کیا۔ مہندر ناتھ کی ذاتی زندگی بھی ان کی ذاتی زندگی نہیں تھی، اُن کی خوشیاں بھی ان کی خوشیاں نہیں تھیں۔ اگرچہ ان کا قلم اُن کا قلم تھا لیکن ان کی تحریر ہمیشہ دوسروں کے لئے رہتی۔ فرشتوں کو بھی شاید ان کی یہ ادا پسند آگئی اور انہوں نے مہندر ناتھ کی بقیہ زندگی کو اُن کے چاہنے والوں میں بانٹ دیا۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ دہلی

پدم شری نرگس دت ——— (پالی ہل، باندرہ بمبئی)

مہندر ناتھ جس زبان کا ادیب تھا۔ وہ میری مادری زبان ہے۔ "اردو" جب کوئی اردو کا ادیب یا شاعر مرتا ہے تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میری زبان مر رہی ہے۔

آپ مہندر ناتھ یادگار نمبر نکال رہے ہیں گویا میری زبان کو زندگی دے رہے ہیں۔

نرگس

شریمتی حمیدہ سلطان ——— (جنرل سکریٹری انجمنِ ترقی اردو (ہند) دہلی)

آپ مہندر ناتھ ایسی دل کش شخصیت پر اپنا خاص نمبر نکال رہے ہیں یہ بہت اچھی بات ہے۔ اردو کے ادیبوں اور فن کاروں کے لئے کچھ کرنا کوئی خاص نمبر نکالنا جہاد کے برابر ہے۔ میں دعا کرتی ہوں کہ خدا کرے کہ آپ کو اس معیاری نمبر نکالنے پر بھرپور داد ملے۔

حمیدہ سلطان

ڈاکٹر دھرم ویر بھارتی ——— (ایڈیٹر "دھرم یگ" بمبئی)

مہندر جی نہ صرف ایک اچھے لیکھک تھے بلکہ اُس سے بھی بڑھ کر ایک اچھے اعلیٰ درجے کے انسان تھے۔ عموماً لیکھک ایک خاص درجہ حاصل کر لینے کے بعد اُس ماحول سے کٹ جاتا ہے جہاں اُسکی جڑیں تھیں لیکن مہندر جی نے آخر تک اپنے اُسی ماحول کو بڑے زور سے اپنائے رکھا۔

یہ ایک بڑے جیوٹ کی بات اور اس کا ثبوت ہے کہ وہ جس عام آدمی کے دُکھ سکھ کو اپنی کہانیوں میں اُتارتے تھے۔ اُسے سچ مچ تہہ دل سے پیار کرتے تھے۔

بمبئی میں آنے کے بعد کرشن چندر جی نے مجھے ہمیشہ چھوٹا بھائی مان کر بے حد پیار دیا ہے۔ اکیلے مہندر جی اُس پیار کے حصے دار تھے۔ اُن کو کھو کر میں نے کچھ ایسا کھو دیا جس کی کمی کبھی پوری نہیں ہوسکتی۔

آپ اُن کے فن اور شخصیت پر خصوصی نمبر نکال رہے ہیں۔ میری شردھا کے پھول اُس میں شامل کریں۔

[signature]

اروند کمار ——— ایڈیٹر "مادھوری" (بمبئی)

پیارے صابر دت!

"فن اور شخصیت" کے "مہندر ناتھ" کے لئے نیک خواہشات قبول فرمایئے۔

مرحوم مہندر ناتھ ترقی پسند ادیب ہی نہیں تھے۔ وہ عام آدمی کی اچھی زندگی کی جدوجہد کے میدان کے عظیم مجاہد بھی تھے۔ فلمی دنیا کے ورکرس کے وہ ہمیشہ ہر دلعزیز لیڈر رہے ان کی رہنمائی میں ورکروں نے کئی لڑائیاں لڑیں اور فتح حاصل کی۔

میں ان سب کا ذکر اس لئے کر رہا ہوں کہ لیکھک نے صرف دور سے نظارہ دیکھنا اور اس پر لکھنا کافی نہیں ہے۔ سچے لیکھک کا میدان جنگ میں اترنا بھی ضروری ہے۔ ایسے ترقی پسند ادیب میرے لئے کوئی معنی نہیں رکھتے جو آرام کرسیوں ڈنلپ پلوں پر بیٹھ کر انقلاب کی باتیں کرتے ہیں۔ ایسے لیکھکوں کا ہم پڑھنے والے کبھی بھی سواگت نہیں کرسکتے اس لئے مہندر ناتھ پر آپ "فن اور شخصیت" کا جو نمبر نکال رہے ہیں اُس کی بڑی اہمیت ہے۔

یہ نمبر اگر لیکھکوں کو راہ دکھا سکے تو بہت بڑی بات ہوگی۔

[signature]

حسن کمال ——— مدیر "اردو بلٹز" بمبئی

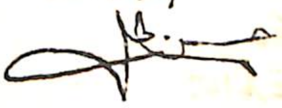
ڈیر صابر دت

مرحوم مہندر ناتھ کو خراج عقیدت پیش کرنے کی نیت سے ایک رسالہ ترتیب دینے پر میں تمہیں مبارکباد دیتا ہوں۔ ہم میں سے کوئی مہندر ناتھ کو بھول نہیں سکتا۔ جو شخص۔ جو شخص دوسروں کے لئے اپنے مفادات

کو قربان کر دینا عین عبادت سمجھتا ہو، اسے بھول بھی کون سکتا ہے۔ مرحوم میرے بزرگ دوستوں میں سے تھے اور ان کی صلاحیتیں ہمیشہ میرے کام آتی رہیں۔ ان کی رحلت سے اُردو دنیا ایک اچھے ادیب اور فلمی دنیا ایک ہمدرد قائد سے محروم ہو گئی۔ فلم کے رائٹرز ان کی قیادت اور بے باک لیڈرشپ کو یاد کرتے رہیں گے۔

خراج عقیدت کے اس سلسلہ کو قائم رکھو۔ ہم سب کا تعاون تمہارے ساتھ ہے۔

تمہارا دوست



ڈاکٹر نریش ——— (چنڈی گڑھ)

مہندر ناتھ نہایت مخلص اور وضعدار انسان تھے۔ اپنے بھائی کرشن کی طرح محبت اور خلوص ان کی رگوں میں دوڑتا تھا۔ افسانہ نگاری میں مہندر ناتھ نے WHITE COLLORED کلاس کو جس نکتہ سنج اور نکتہ رس نگاہ سے دیکھا اور جس کیفیت انگیز انداز میں بیان کیا ہے وہ یقیناً انہیں کا حصّہ ہے۔ وہ کم گو لیکن پُرگو تھے۔ ان کے افسانوں کے کردار تصوّر اور تخیل کی حدوں میں قید نہ تھے۔ بلکہ جیتے جاگتے۔ سانس لیتے ہوئے ایسے کردار تھے، جو افسانہ پڑھتے ہی قاری کی آنکھوں کے سامنے اس کے اپنے اعزا و احباب کی صورت میں موجود ہو جاتے ہیں۔ زبان کے سلسلے میں مہندر ناتھ بہت محتاط رہے ہیں۔ بول چال کی زبان ان کے افسانوں کا خاصہ ہے۔ یہ افسانے اس قدر گھٹے ہوئے ہوتے ہیں کہ ہر افسانے کا پلاٹ ایک اکائی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ کہیں کوئی حصّہ بھرتی کا نہیں، کہیں لفّاظی نہیں۔ اکثر اوقات ان کے کردار خود افسانے کو آگے لے جاتے ہیں۔ اور اپنی آزادانہ حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔

میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ خدا کرے یہ یادگاری نمبر مہندر ناتھ کی شخصیت اور ان کے فن کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہو۔ کسی ادیب کی یاد میں خراج تحسین پیش کرنے کا یہ ادیبانہ انداز قابل ستائش ہے۔

آپ کا
نریش

وشرام بیڈکر ——— بمبئی

اتنے سارے ادیبوں کا اکٹھے ہو کر کسی ایک ادیب کے لئے اس درجہ دلی خلوص کا اظہار ایک نادر اور عظیم خراج عقیدت ہے۔ بالخصوص جب یہ سوچا جائے اظہار تحسین و تشکر آج کل کی دنیا کا خاصہ نہیں ہے مگر مہندر ناتھ کی خدمات اور خلوص نے ادیبوں کو ان کی کمزوری سے اُبھار لیا ہے۔

مہندر جی نے اپنی زندگی میں انسانیت پرست فکر و عمل کو پہچان لیا تھا۔ اور اسی فکر و عمل کے ساتھ وہ زندگی بھر فلم رائٹرس ایسوسی ایشن کے لئے کام کرتے رہے۔ اور اپنی محنت سے انہوں نے اسے ایک قدر آور انجمن بنا دیا یہ خصوصی نمبر اُس جذبے اور گرم جوشی کی علامت ہے جس سے فلم رائٹرس ایسوسی ایشن کے ممبر اُن کی یاد تازہ کر رہے ہیں۔ اور یہ ایک خاموش دعا بھی ہے کہ اُن کا یقین اور انسانیت پرست جذبہ ہماری روح میں تا دیر سلامت رہے،

کمال احمد صدیقی ——— آل انڈیا ریڈیو (دہلی)

مہندر ناتھ نے اپنی زندگی میں کسی کو دُکھ نہیں دیا ۔ زندگی کے رسیا ہونے کے باوجود زندگی اُن سے اسوقت روٹھی جب ہم کو اس کا اندیشہ نہیں تھا اور شاید اُنہیں بھی نہیں تھا ۔

مہندر ناتھ بہت پیارے انسان اور بہت پیارے دوست تھے ۔ اس بات کا اعتراف اُن کے سب دوستوں کو ہے ۔ اور اگر کوئی اُن کا دشمن ہوگا تو اُسے بھی ہوگا ۔ اس بارے میں دنیا نے اُن کے ساتھ انصاف کیا لیکن ایک بات ایسی بھی ہے کہ جس کے سلسلے میں اُن کے ساتھ انصاف نہیں ہوا ۔ ادبی دنیا میں اُن پر بڑے بھائی کرشن چندر کا سایہ اس طرح رہا کہ اُن کی ادبی شخصیت دھندلائی رہی ۔

اگر وہ کرشن کے چھوٹے بھائی نہ ہوتے تو شاید اُن کی ادبی قدروقامت کا اعتراف زیادہ بھرپور طریقے سے کیا جاتا ۔ بنیادی طور سے ہم اب بھی کسی حد تک مردہ پرست ہیں جو اعتراف ہم نے اُن کی زندگی میں نہیں کیا ۔ وہ اب ہمیں کرنا چاہیئے ۔ کہ مہندر ناتھ ایک بڑے افسانہ نگار تھے ۔

کمال احمد صدیقی

سُریندر ناتھ ورما ——— ڈائریکٹر محکمۂ لسانی و ثقافتی امور ہماچل پردیش (شملہ)

میں صابر دت کو گذشتہ بیس برس سے جانتا ہوں اُس کو شعروادب کے ساتھ تو لگاؤ ہے ہی لیکن اسکے علاوہ اچھی کتب اور رسائل شائع کرنے کا بھی خبط ہے ۔ آج سے قریب دس برس پہلے بھی نہایت مفلوک الحالی کے دنوں میں اُس نے دلّی سے ایک بہت خوبصورت رسالے "روپ" کا اجرا کیا تھا ۔ جو کہ اس کی ادب دوستی اور بلند حوصلگی کا عین ثبوت تھا ۔ اب جبکہ اُسے ایشیا کے مایہ ناز افسانہ نگار کرشن چندر کی سرپرستی حاصل ہے تو مجھے یقین ہے کہ رسالہ فن اور شخصیت کے زیر اہتمام مہندر ناتھ مرحوم کی شخصیت اور فن پر شائع ہونے والا یادگار شمارہ اردو ادب میں ایک سنگِ میل ثابت ہوگا ۔ اور مرحوم کی ادبی خدمات ۔ اور تمام فنی پہلوؤں کو اجاگر کرنے میں کامیاب ہوگا ۔

امید کرنی چاہیئے کہ آئندہ بھی اس اشاعتی ادارے کی طرف سے اردو ادب کی برگزیدہ ہستیوں پر شاندار خاص نمبر شائع کیے جائیں گے ۔

سُریندر ناتھ ورما

اداکار آئی ایس ۔ جوہر ——— (بمبئی)

کئی ادیب نام کے ہوتے ہیں جیسے کہ میں ہوں اور کئی کام کے ہوتے ہیں جیسے کہ مہندر ناتھ تھا ۔ میرے جائزے کے مطابق مہندر ناتھ کے مقابلے میں کرشن چندر نے روسی اور فرانسیسی ادیبوں کی کتابوں سے متاثر ہوکر اور اس کے رنگ کو اپنا کر بہت نام پیدا کر لیا مگر مہندر ناتھ نے ایسا نہیں کیا ۔ اس لیے انکا اتنا نام نہ ہو سکا ۔

آئی ۔ ایس ۔ جوہر

نیاز حیدر

مہندرناتھ

اُس کا چہرا مری نظر کے لئے
تازگی اور خوشی کا چہرا ہے
جب اُسے پہلی بار دیکھا تھا
مجھ سے اُس کے شباب نے یہ کہا
دیکھ، یہ زندگی کا چہرا ہے
پھر ہٹائی گئی نہ رُخ سے نظر
آنکھ مجبور، آرزو مجبور
اور میں دیکھتا رہا اُسکو
بن گیا وہ مری نگاہ کا نور

اُس کے ماتھے پہ جب شکن اُبھری
سو فسانے لئے تھی دامن میں
پیار کے گلستاں برس جائیں
نب کشا ہو جو دل کے آنگن میں
اور اگر قہر پر اُتر آئے
آگ لگ جائے سرِ سنگھاسن میں
قتل گاہوں سے جب بھی گزرا ہے
چیخ اُٹھا اُس کا دل، ضمیر اُس کا
برق لہرائی آسمانوں پر
یہ تاثر تھا، ناگزیر اُس کا
اپنی خلوت میں بھی نہیں تنہا
غمِ دوراں کے سائے گھیرے ہیں
آپ اپنے سے تب وہ کہتا ہے
دردوغم ہوں کسی کے میرے ہیں

حسن، دوشیزگی، تصور، یار
شام سے صبح اور صبح سے شام
ہوک سینے کی، یا جلن دل کی
حاصلِ عشق، پیار کا انعام
حسن بکتا ہے منڈیوں میں کیوں؟
عصمتیں ہو رہی ہیں کیوں نیلام؟
بھاڑ میں جائیں ایسے لیل ونہار
عشق اور حسن کا ہو یہ انجام!
مل تو جاتی ہے اک شریکِ ہوس
پر شریکِ حیات کا ملنا
زندگی کے لئے ہے یوں جیسے
زندگی کو نجات کا ملنا
چھوڑ کر اپنے دیس کے دریا
وہ سمندر کے پاس آ نکلا
وسعتِ بیکراں نظر آئی
دل پکارا کہ حوصلہ نکلا!
موج ساحل تک آکے لوٹ گئی
بحرِ ذخار شرمسار ہوا
اک چٹان آئی اس کے پہلو تک
اور وہ اس سے ہمکنار ہوا
لے کے آغوش میں جس دم
کوہساروں کو جس نے للکارا
لوگ فرہاد کو بھلا بیٹھے
متحیر تھا قیس بیچارا!

مردِ میدانِ کارزارِ حیات
قوم مظلوم کا وہ راہ نما
اُس کی رفتار اُس کا رعب و جلال
شیر، جس پر ہے جلوہ گرِ درگاہ

دانش و علم، عزم اور عمل
نجم و شمس و قمر کا دیوانہ
حُسنِ فطرت پہ چھا گیا ہے دل
شمع پر جیسے چھائے پروانہ

اِک تبسّم جسے عطا کر دے
اُس کی وارفتگی امر ہو جائے
جس کی جانب سے پھیر لے وہ نظر
موت مرنے سے پیشتر ہو جائے

لیکن اُس کا نہیں ہے ظلم شعار
وہ وفادار آدمیت ہے
اُس کے رحم و کرم کو مت پوچھو
دُشمنوں سے بھی اس کو الفت ہے

پانچ دریاؤں کی صفت اس میں
جن میں طغیانیاں بھی آتی ہیں
مشکلیں اور مصیبتیں اُس سے
ڈر کے گھبرا کے بھاگ جاتی ہیں

ہے محبت کی سرزمیں پنجاب
دوستی کی خلوص کی دھرتی
ایسے انسان کی نہ پھر کیوں کر
وہ محبت سے پرورش کرتی

نازک اندام ہے خیال اُس کا
بے محابا طریقۂ اظہار
اُس کا اقرار فیصلہ اُس کا
اُس کے انصاف کا مہیب انکار

دیکھ سکتا ہے آرپار اس کے
گر ہے نیت کسی کی پاکیزہ
ورنہ اوجھل ہے وہ نگاہوں سے
یاد رکھ اے نگاہِ دزدیدہ

وہ زمیں پر جہاں قدم رکھ دے
ذرہ ذرہ شگفتہ خاطر ہو
جس طبیعت کو فکر چھو جائے
عمر بھر کے لئے وہ شاعر ہو

کرشن کی بنسری کا عاشق ہے
نغمۂ سرمدی کا متوالا
عشق نے یوں کیا محیط اُسے
چاند کو جیسے گھیر لے ہالا

ظلم کے سامنے کبھی نہ جھکے
باغیانہ مزاج ہے اُس کا
شاہِ فطرت ہے، حاکمِ فطرت
زندگانی خراج ہے اُس کا

داستاں بے کنار، لاحدود
اس کی اک جنبشِ قلم کا شکار
مثلِ طوفاں وہ جاگ اُٹھتا ہے
دیکھتا ہے جو ظلم کے آثار

یوں تو اس کا مہندر ناتھ ہے نام
پر وہ ہندو نہ وہ مسلماں ہے
جاٹ جیسی ہے سادگی اس کی
یعنی وہ غمگسارِ انساں ہے

نام لیوا عوام ہیں اُس کے
اقتدار اور زرگری کے گھاگ
اُس کی توہین کر نہ پائیں گے
کوئی اُس کو بھلا نہیں سکتا

○ بمبئی۔ ۱۲ر فروری ۱۹۷۴ء

یک نظر بیشے نہیں

سریندر ناتھ ورما

ڈائریکٹر محکمہ لسانی و ثقافتی امور، ہماچل پردیش (شملہ)

مہندر ناتھ، جن کی ۲۰ مارچ سنہ ۱۹۷۰ء کو ناگہانی موت نے بمبئی کی ادبی دنیا کو ہلا دیا تھا، سنہ ۱۹۲۳ء میں لاہور میں پیدا ہوئے تھے۔ اُن کے والد ڈاکٹر تھے۔ مہندر ناتھ نے اپنے بچپن اور جوانی کے ایام پونچھ اور کشمیر میں گذارے۔ انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ ایم۔ اے۔ کی طالب علمی کے دوران وہ پڑھائی کو خیر باد کہہ کر سوشلسٹ بن گئے۔ اور محنت کش عوام کو طوقِ غلامی سے نجات دلانے اور اُن کی بہبودی کے کام میں لگ گئے۔ لاہور سے دلّی اور پھر بمبئی کی طویل مسافت نے ان کے دل اور دماغ پر ایک گہرا نقش چھوڑا اور اس دوران انہیں مختلف مذاہب، ذات اور طبقوں کے لوگوں کے تعلق میں آنے کا موقعہ ملا۔

انہوں نے سنہ ۱۹۴۰ء میں اردو میں لکھنا شروع کیا۔ وہ ترقی پسند تحریک کے ایک سرگرم کارکن اور ایک مشہور افسانہ نگار اور ناول نگار تھے ان کے افسانوں کے دس مجموعے اور پندرہ ناول شائع ہو کر منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ ان کے اکثر افسانوں کے ہندی، مراٹھی، گجراتی، تامل، تیلگو، پنجابی، سندھی اوڑیہ ہندوستان کی دوسری زبانوں میں تراجم شائع ہو چکے ہیں۔ اُن کی کچھ کہانیاں روسی اور دیگر زبانوں میں بھی ترجمہ ہو چکی ہیں۔

مصنف ہونے کے ناطے اُن کو سماج وادی نظام میں اعتقاد تھا۔ اُن کا دعویٰ تھا کہ صرف سماج واد ہی مفلسی کا خاتمہ کر کے ایک بہتر قومی یکجہتی اور سیکولر طرزِ حکومت کی بنیاد قائم کر سکتا ہے۔

بھوک اور سیکس انسان کی وہ بنیادی خواہشات ہیں جن کے گرد مہندر ناتھ کی اکثر کہانیاں گھومتی ہیں۔ ان کے افسانوں پر گورکی اور موپاساں کی ایک لطیف چھاپ ہے۔ "جہاں میں رہتا ہوں"، "نیا کوبکاری"، "دو بیل"، "چاندی کے تار"، "ایک، دو، تین"، "مائی ڈارلنگ ہوٹل"، "جنوب کا ساتھی"، "سہارا"، "پھر کوئی نہیں آئے گا"، "اگر میں مر جاؤں"، "گاڈ بلس یو"، "چائے کی پیالی"، "ڈیڑھ روپیہ"، "گالی" اور کچھ اور افسانے دنیا کے مشہور و معروف افسانہ نگاروں کی تصانیف کے مقابلے میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔

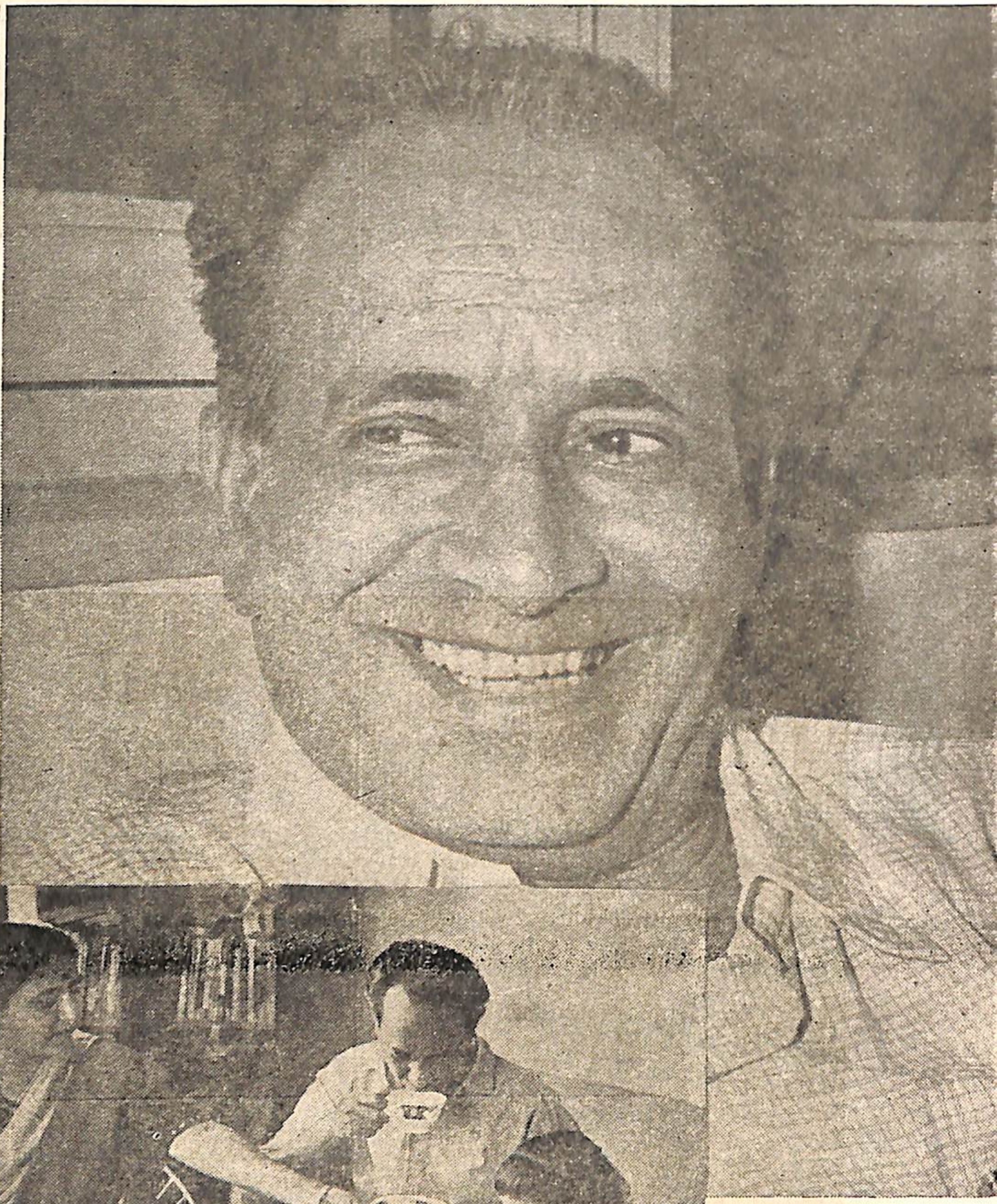
اُن کے ناول "آدمی اور سکّے"، "رات اندھیری ہے"، "سورج ریت اور گناہ"، "پیار کا موسم"، "ارمانوں کی سیج"، اور "لیڈر"، مہندر ناتھ کی حقیقی قابلیت کا مسلّمہ ثبوت ہیں۔ ہمارے لوگوں کی غربت، ان کی جسمانی بھوک، اُن کا کرب، اُن کی اُمنگیں موجودہ سماجی نظام میں بنیادی تبدیلی کی ضرورت، قومی یکجہتی، سیکولرازم جیسے خیالات کو نہایت فنکارانہ انداز میں مہندر ناتھ نے اپنے افسانوں اور ناولوں کا موضوع بنایا ہے۔

ایک مقتدر ترقی پسند مصنف ہونے کے علاوہ وہ ترقی پسند مصنفین کی انجمن کے سکریٹری بھی تھے اور انہوں نے اس تحریک کو چلانے میں کافی سرگرم رول ادا کیا۔ وہ ینگ رائٹرز ایسوسی ایشن کے صدر اور فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری تھے۔ انہوں نے قریب ۳۰ فلموں کے مکالمے لکھے۔ اُن کی کچھ فلمیں، جو مکالموں اور Treatment کے کارن یادگار فلمیں ہیں۔ مندرجہ ذیل ہیں۔

"ممتا"، "نقلی نواب"، "باغی شہزادہ"، "گستاخی معاف"، اور "امید"۔ فلم "منچلی" کے ڈائیلاگ ڈائرکٹر بھی مہندر ناتھ تھے۔ مشہورِ عالم افسانہ نگار کرشن چندر کے وہ سگے بھائی تھے۔

مہندر ناتھ بلاشبہ ایک عظیم مصنف اور ایک عظیم انسان تھے۔

انہوں نے زندگی اور ادب پر ایک گہرا نقش چھوڑا ہے۔





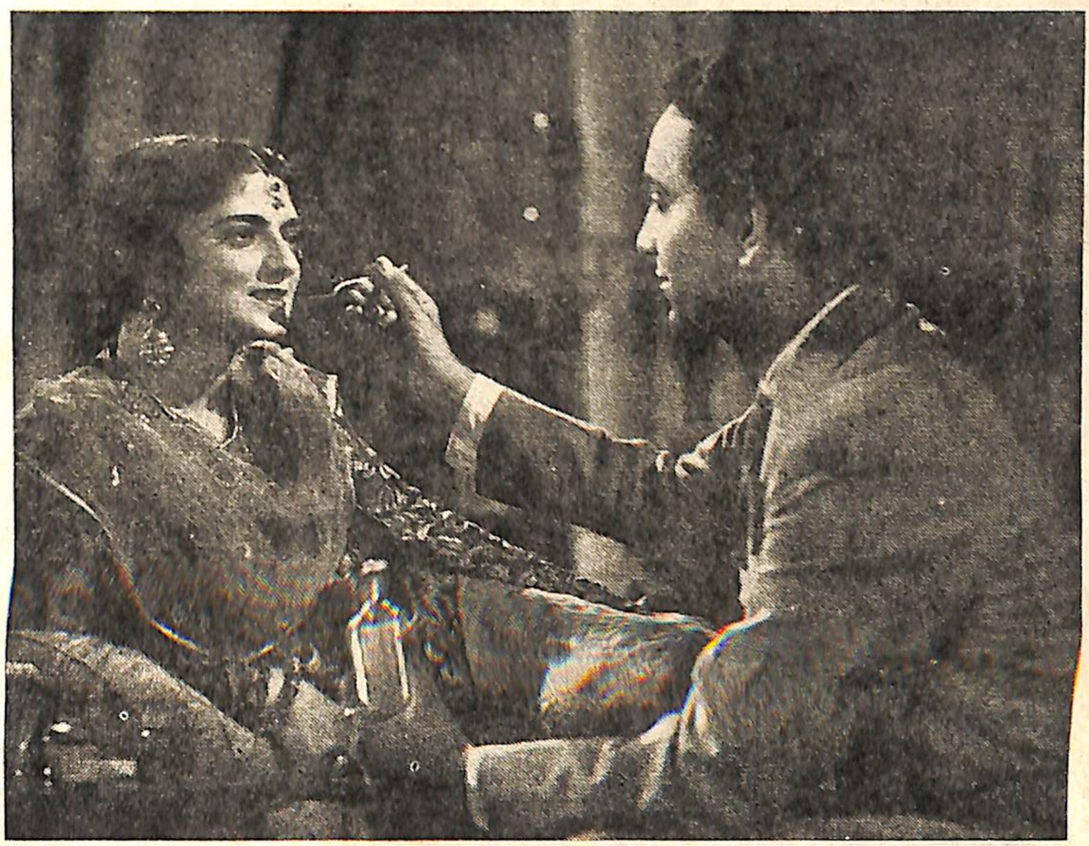
مسکراتا ہوا چہرہ
جو ابدی نیند میں
کھو گیا

اری بھاگوان! ہمارے بچے نہیں تو کیا ہوا پڑوس کے بچے بھی تو ہمارے ہی بچے ہیں۔

جن لوگوں نے مہندر جی کو فلم "سرائے کے باہر"۔ "زلزلہ"۔ "راکھ" اور "دھرتی کے لال" میں دیکھا ہے۔ وہ اُن کی حقیقت آمیز کردار نگاری کے معترف رہے ہیں مگر فلمی دنیا میں اعلیٰ کردار نگاری کے علاوہ اور بہت کچھ چاہیئے۔ پروڈیوسروں اور ڈائرکٹروں کی خوشامد اُنکے دفتروں اور گھروں کے چکر۔ غیبت اور سکینڈل بازی۔ مگر مہندر جی سے یہ سب کچھ ممکن نہیں تھا۔ مہندر اقبال کا وہ شاہین تھا جس نے اپنی خودی کی بلند ترین منزلوں سے نیچے اُترنا کبھی گوارا نہ کیا۔ اس لئے فلمی دُنیا کی دوڑ میں الگ تھلگ اور اکیلا رہ گیا۔ اور اپنی خوبروئی وجاہت اور مردانہ حُسن کے باوجود فلمی اداکاروں کے گلیمروں کو خیرباد کہہ کر زندگی کی سنگلاخ چٹانوں پر اُس نے بسیرا کر لیا۔ اس یکہ و تنہا خودی کا اپنا ایک نشہ ہوتا ہے۔ اُس کی اپنی ایک سزا بھی ہوتی ہے۔ مہندر نے دونوں کے مزے چکھے۔ اب کون کس سے گلہ کرے ؟

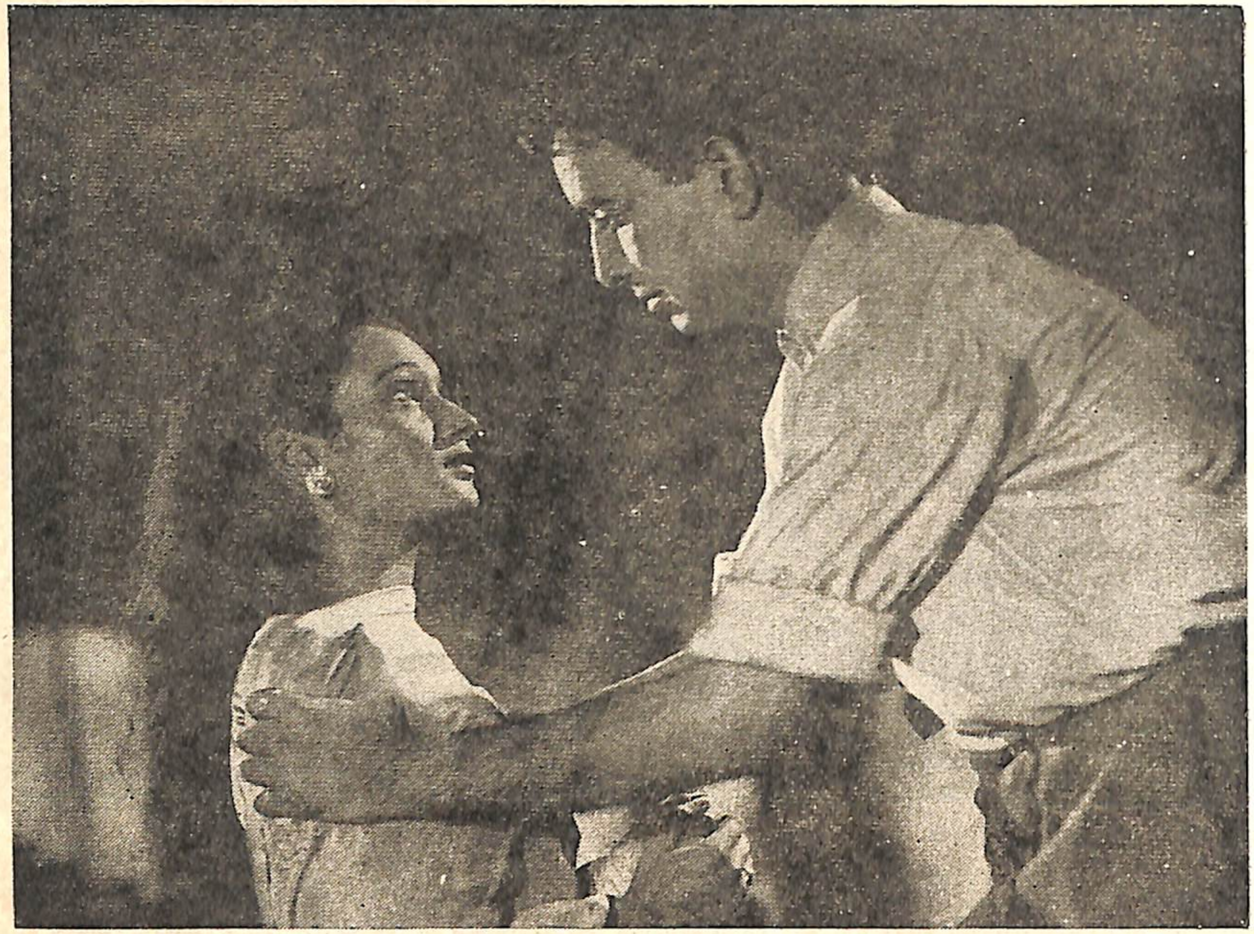
کرشن چندر

دوائے دردِ دل



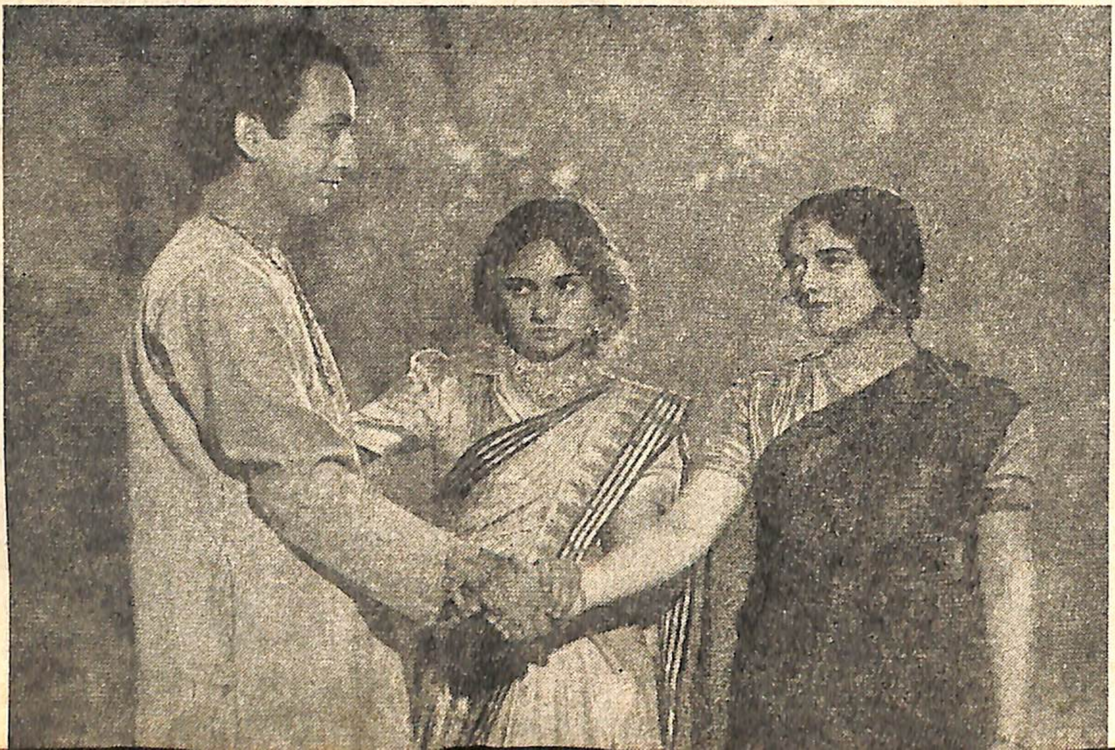
مہندر ناتھ اور ستیا دیوی۔ فلم "سرائے کے باہر"

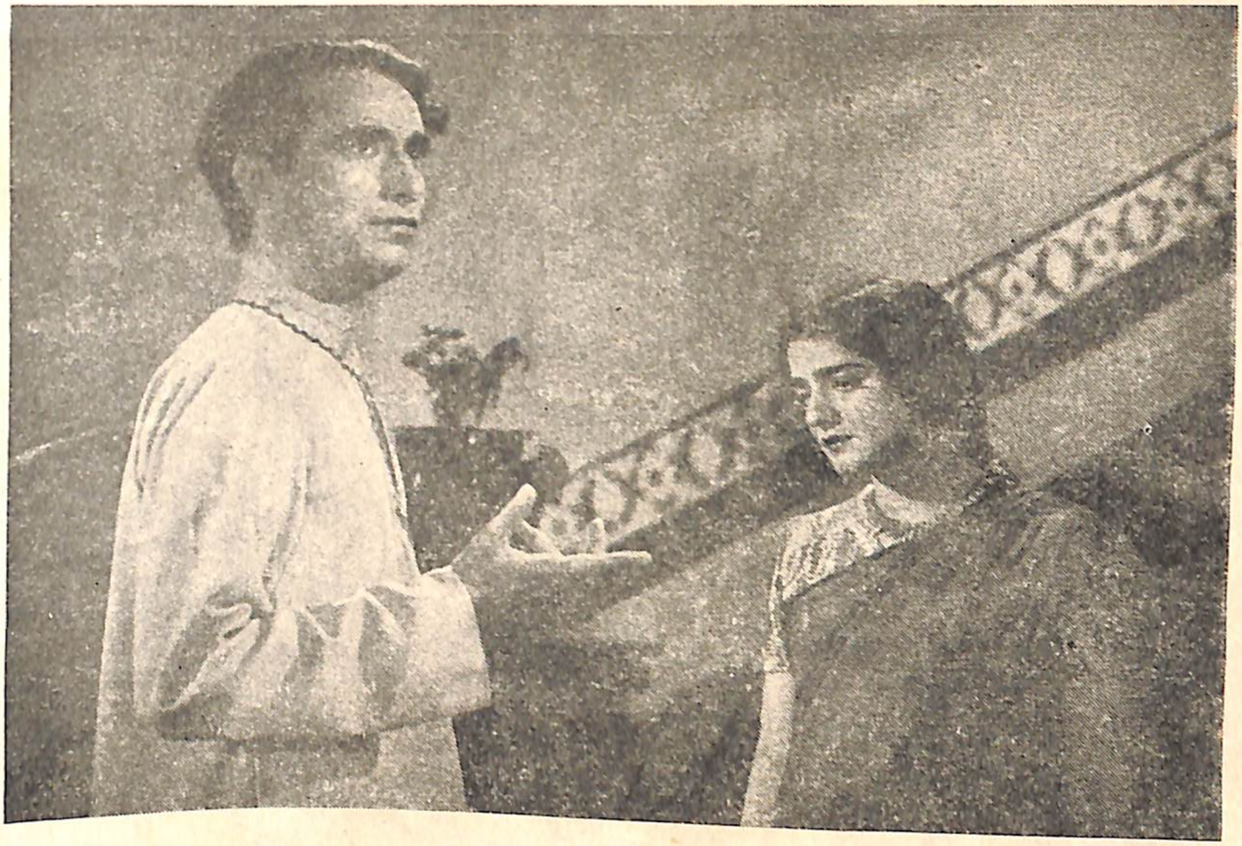
تفسیرِ عشق۔ مہندر ناتھ فلم "زلزلہ" میں



آخری مُلاقات

ستیادیوی۔ رادھیکا اور مہندر ناتھ فلم "سرائے کے باہر"

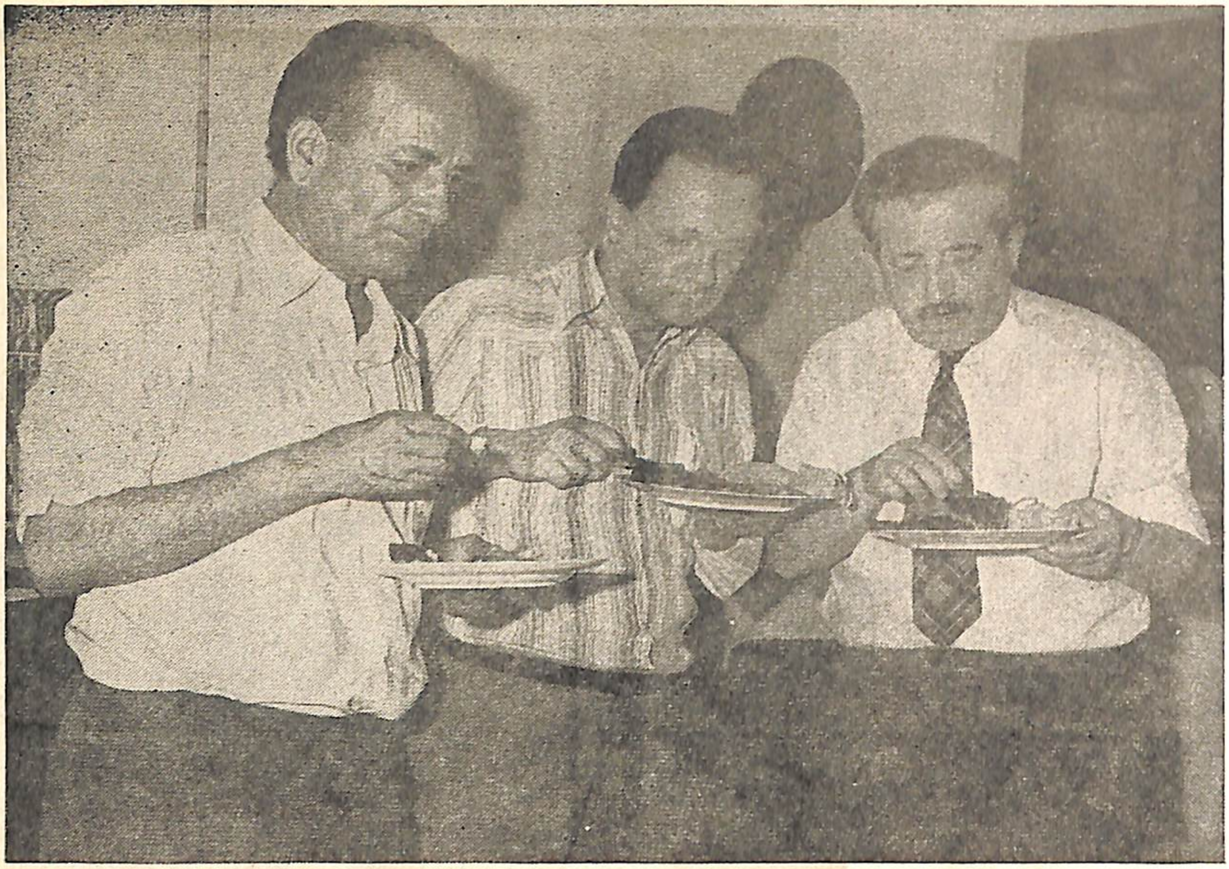




مہندر ناتھ مکالمہ نویس اور ڈائیلاگ ڈائریکٹر کی حیثیت میں

سنجیو کمار لینا چندرا ورکر اور ہدایتکار راجہ نواتے کے ساتھ "منچلی" کے سیٹ پر

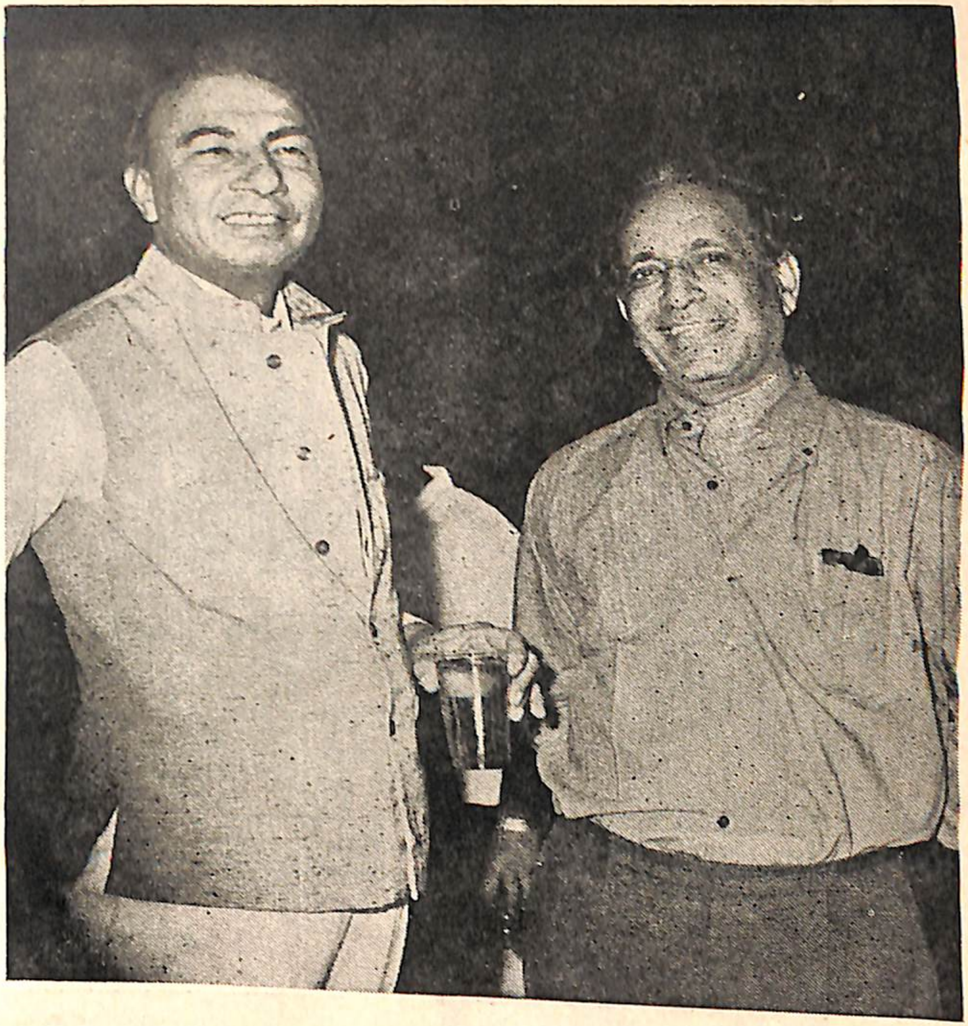




اُردُو کا ادیب روسی ادیبوں کے ساتھ

مہندر ناتھ روس کے معزز ڈیلیگیشن اور ترقی پسند ساتھیوں کیساتھ

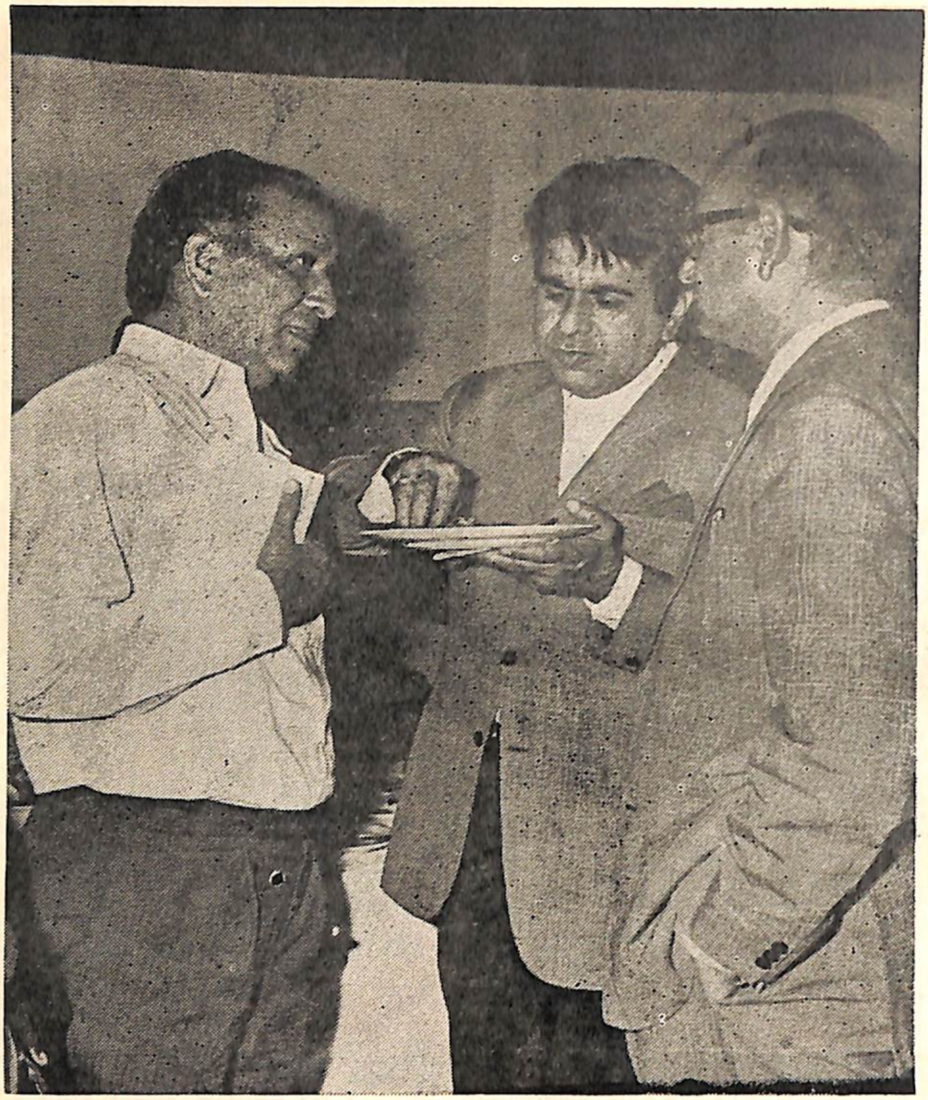




عوام کا شاعر ساحر لدھیانوی اور عوام کا کہانی کار مہندر ناتھ



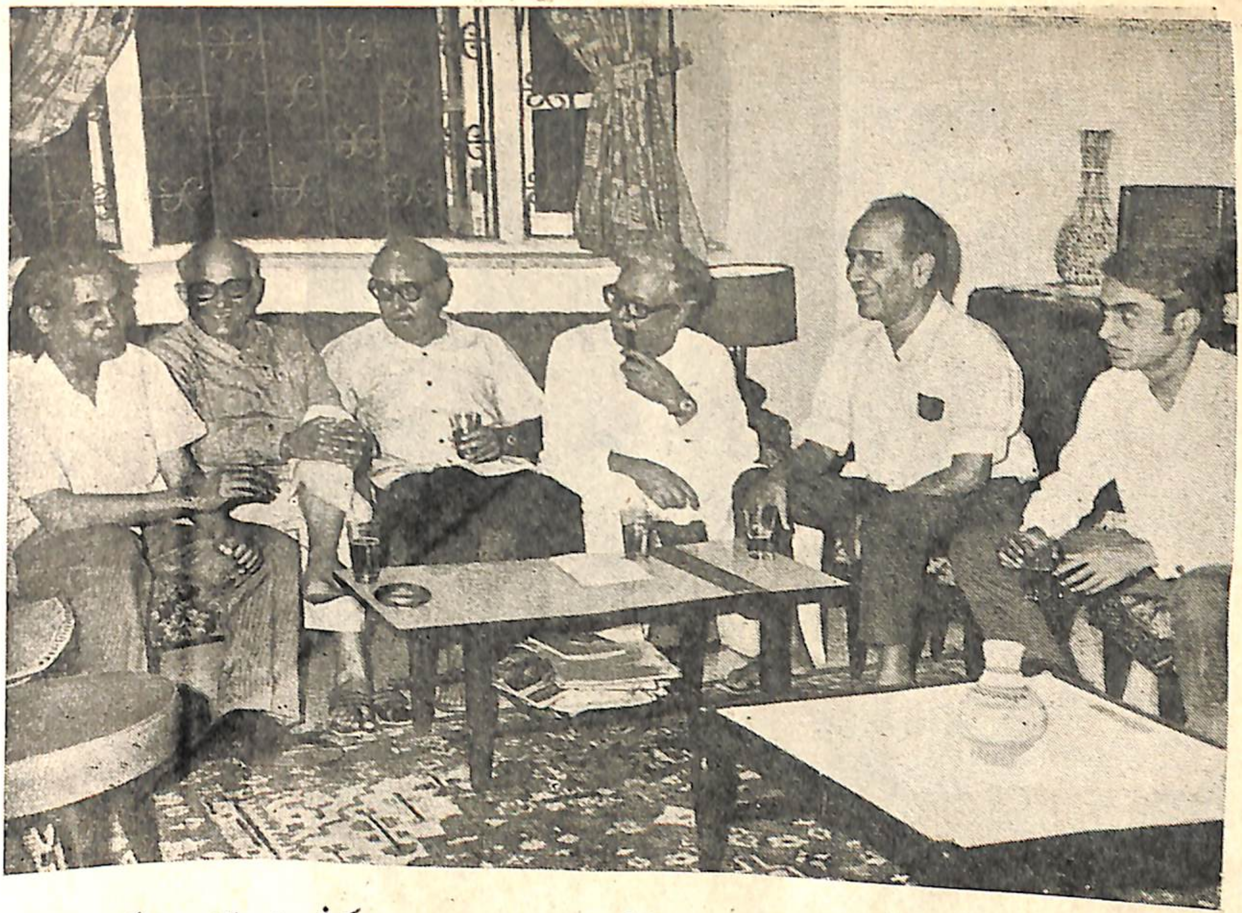
اسٹیج پر: قمر جلال آبادی کے ساتھ



مہندر کے بہنوئی ریوتی سرن شرما۔ دلیپ کمار اور مہندر ناتھ



جاں نثار اختر۔ مہندر ناتھ۔ غلام ربانی تاباں

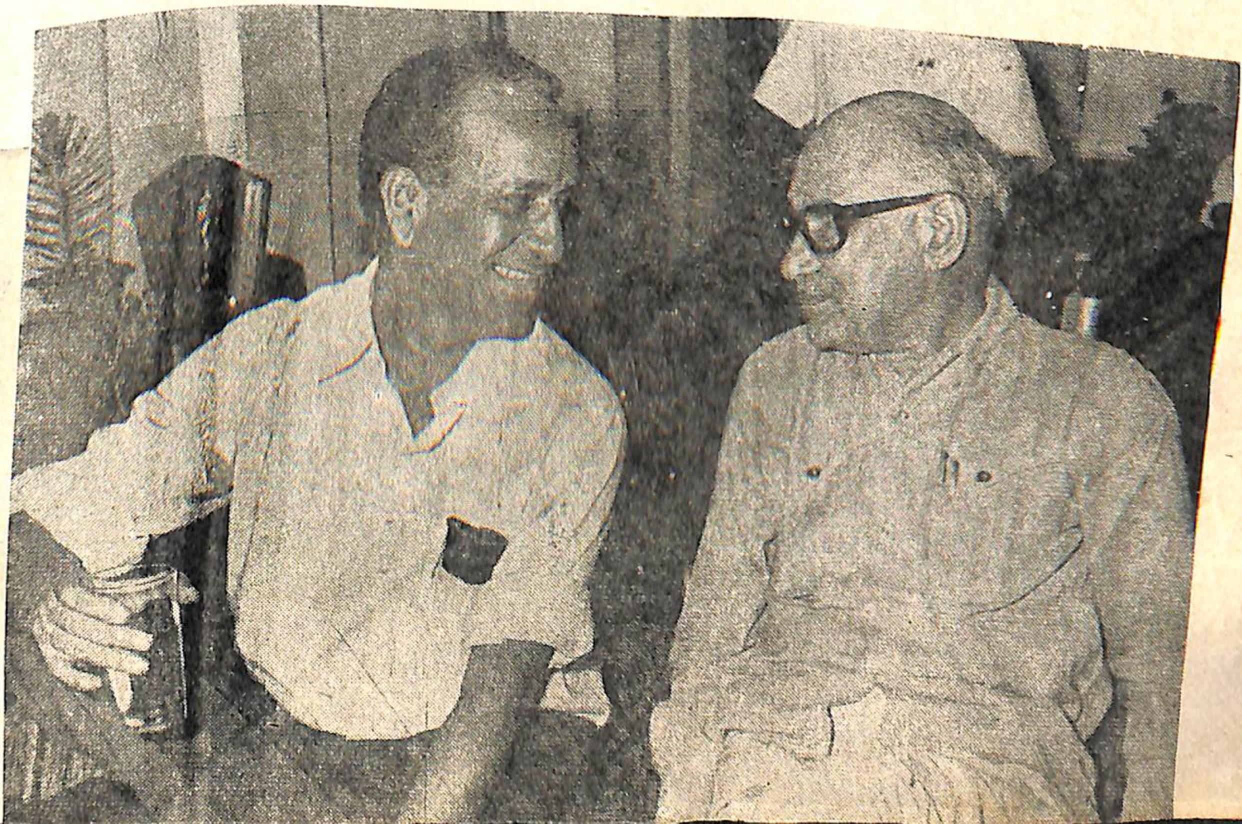


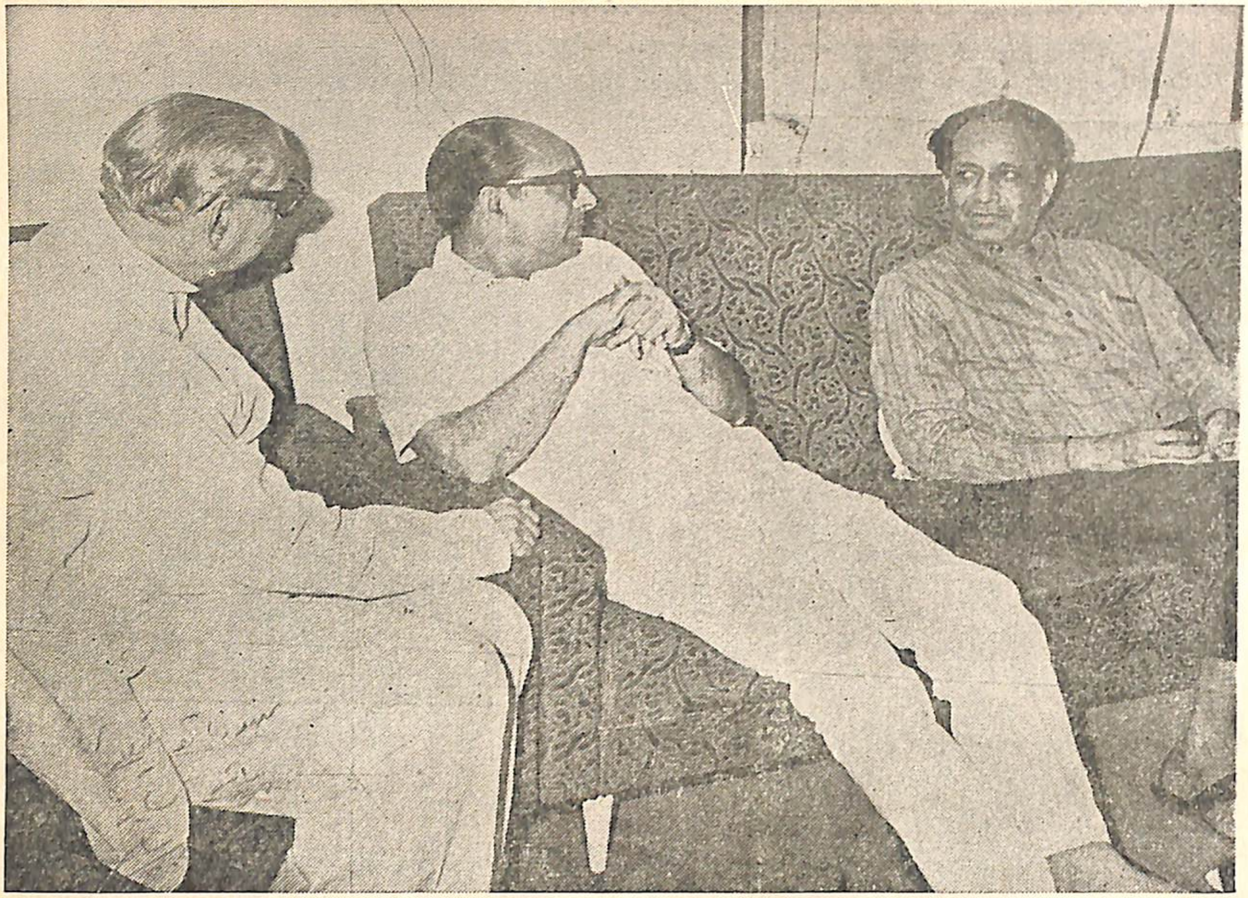
ترقی پسندوں کی ایک مجلس

پروفیسر ترتیم تبلی، مہندر ناتھ، مجروح سلطانپوری، کرشن چندر، عباس اور سردار جعفری۔

عباس صاحب!

زندگی کو چاہیئے سامانِ زندگی
اور کچھ بھی نہ ہو تو شیشہ و پیمان چاہیئے

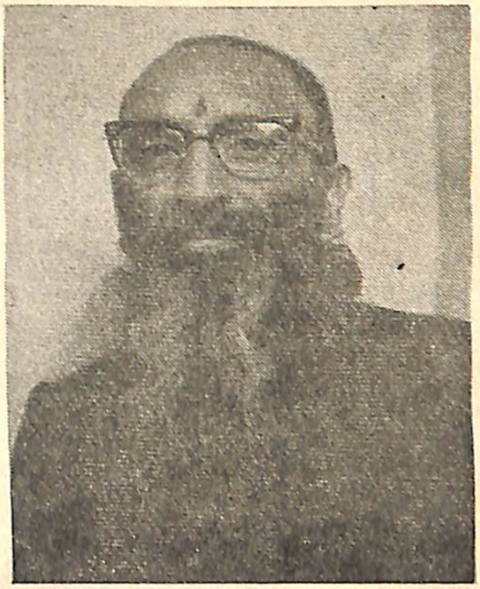




دائیں سے بائیں:۔ مہندر ناتھ، کرشن چندر، شری اندر کمار گجرال، فاطمہ زکریا، سجاد ظہیر، ڈاکٹر زکریا، سردار جعفری، ساحر لدھیانوی
اور ڈاکٹر آر۔ پی کپور



فن و شخصیت کے سرپرست :-



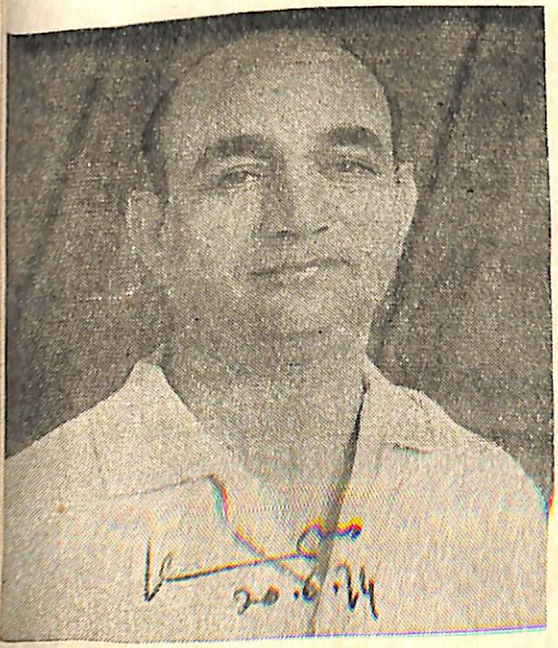
لال چند پرارتھی



رامانند ساگر

نگراں ۔ کرشن چندر





کنہیا لال پوسوال



پدم شری نرگس دت اور سنیل دت



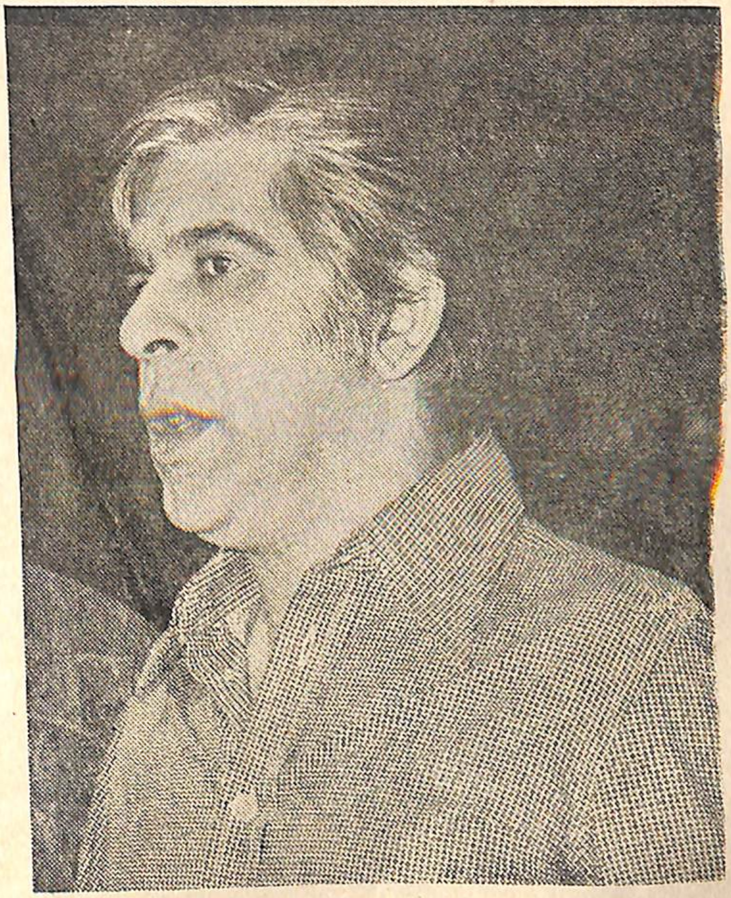


خواجہ عبدالغفور

قرۃ العین حیدر



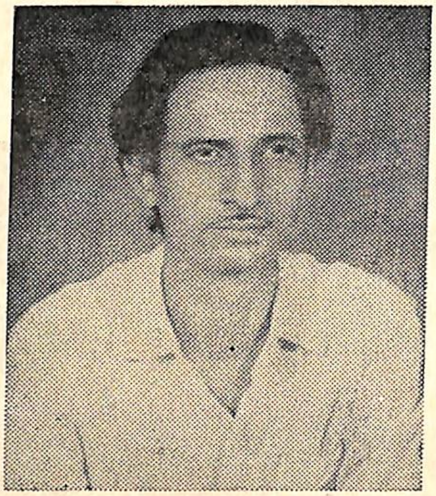
مدیر - صابر دت



منتظم اعلیٰ - احسن خان



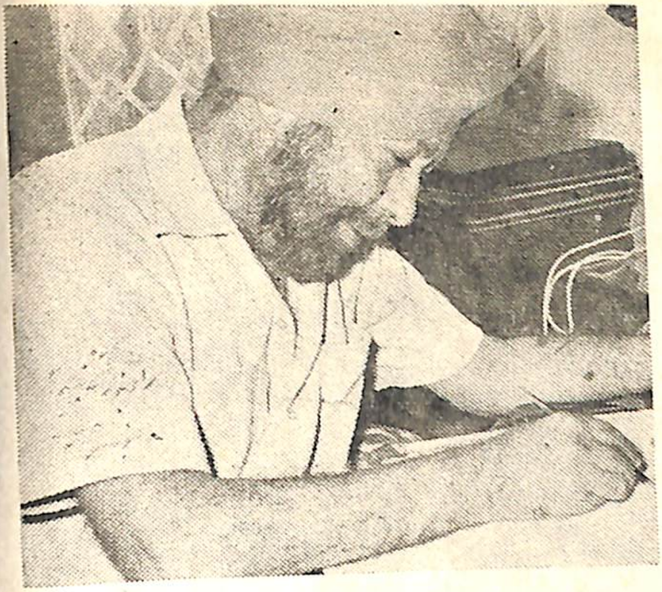
سی۔ ایل کاوِش مدیر اعزازی



حُسن کار ۔ راشد بن محمود



کملیشور ایڈیٹر ساریکا

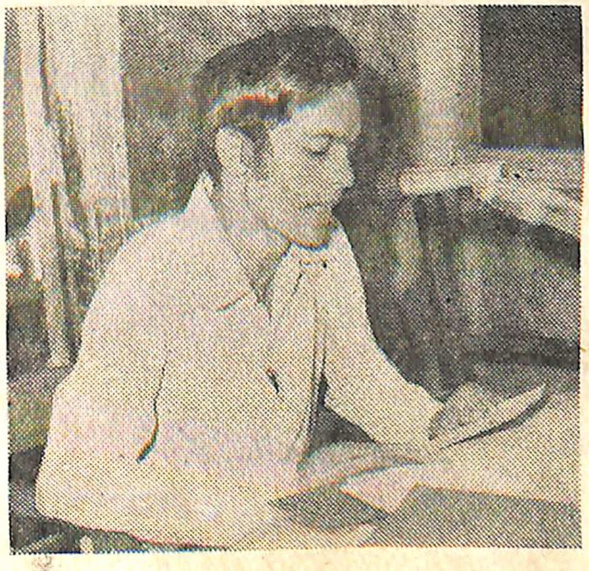


راجندر سنگھ بیدی

محفلِ یاراں



شام کرشن نگم
جو باون پتوں پر لوگوں کو کھلاتے ہیں لیکن خود
اُردو کے میدان میں کھیلتے ہیں۔



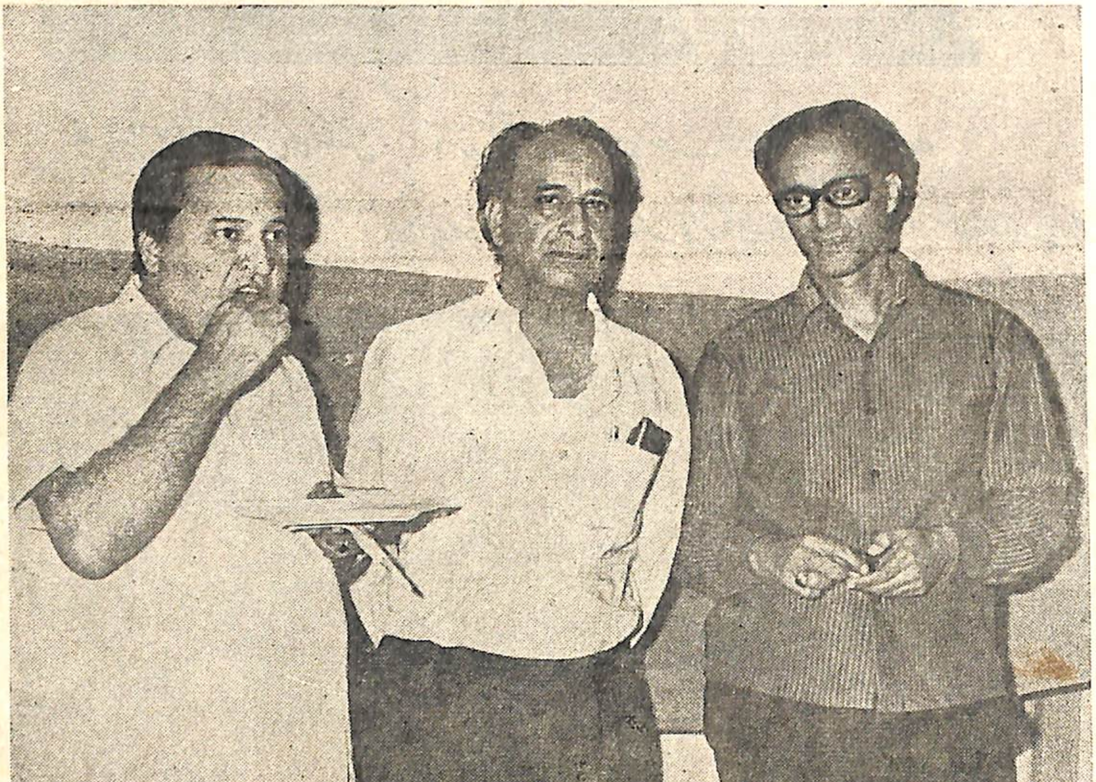
رفیق جعفر





رام لال

عباس صاحب!

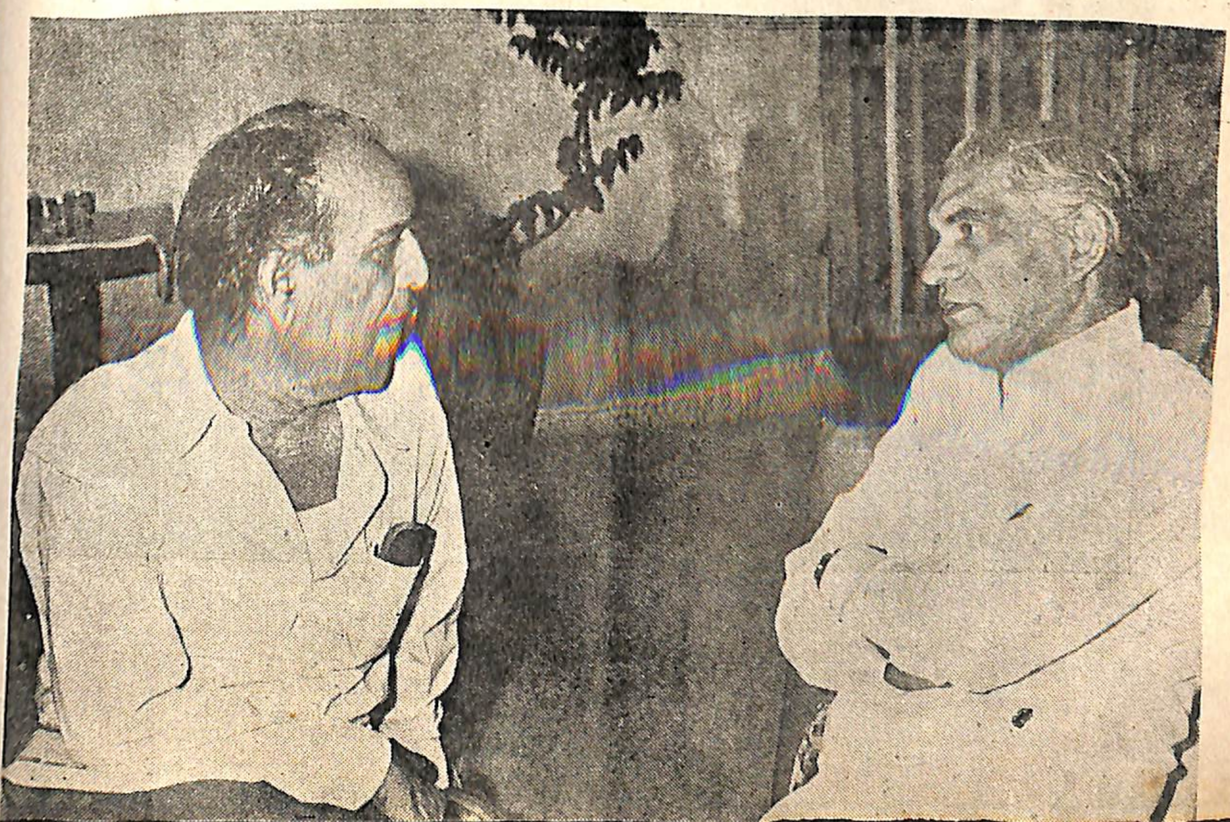


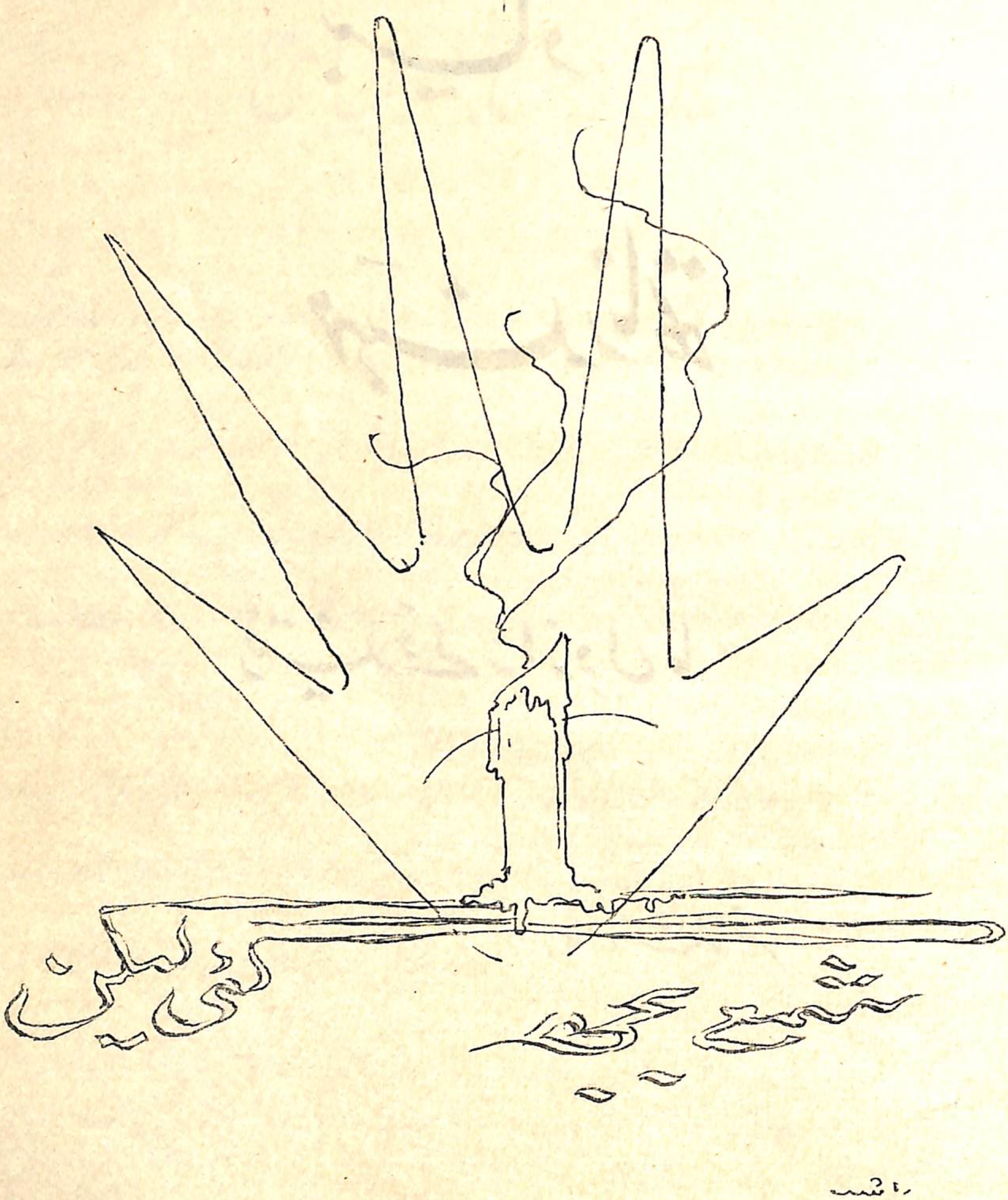
یَں اور ستیش بھٹناگر کھا چکے اب آپ تناوُل فرمائیے گلشن نندہ جی!



فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کا فنکشن ۔ آنند بخشی کو عوام سے متعارف کراتے ہوئے ۔

پروڈیوسر ڈائرکٹر بی ۔ آر چوپڑہ کیساتھ فلم انڈسٹری کے ادیبوں اور ورکروں کی الجھنوں پر غور کرتے ہوئے





بیاد

مہندر ناتھ

"رفتید و لے نہ از دلِ ما"

جاں نثار اختر

عصمت چغتائی

میں تمہیں نہیں جانتی

مہندر ناتھ! مہندر ناتھ!

کون مہندر ناتھ؟ مجھے کچھ کبھی یاد نہیں۔ سوائے ایک مسکراہٹ کے میں مہندر ناتھ کو نہیں جانتی۔ میں نے اس کی ڈھیروں کہانیاں پڑھی ہیں۔ برسوں جان پہچان رہی مگر میں پھر بھی مہندر ناتھ کو نہیں جانتی۔ میں اس کے گھر بھی گئی تھی مگر آج مجھے نہیں معلوم وہ گھر کہاں ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ اب مہندر ناتھ نہیں ہے۔ مجھے شک ہے وہ کبھی وہاں تھا بھی یا نہیں۔ ایسا کیوں تھا اور ایسا کیوں ہے۔ اِس بے حسی کا کارن کیا ہے؟

بمبئی بڑے بڑے اشتہاروں سے لپا ہوا ہے۔ میں اِن سب چہروں کو جانتی ہوں۔ جاننے کی ضرورت محسوس نہ کرتے ہوئے بھی مجھے جاننا پڑتا ہے کہ بے مصرف باتوں کو جاننا ضروری ہے۔

مجھے جاننا پڑتا ہے کہ اناسین کی دو گولیاں انسان کو موت کے منہ سے واپس گھسیٹ لاتی ہیں اور بِنا کا ٹوتھ پیسٹ اسے جیون کا کلیان ہو جاتا ہے۔

اور اُمل بٹر مُردوں کو زندہ کر دیتا ہے۔

لیکن میں نہیں جانتی مہندر ناتھ کہاں رہتا تھا اور اب وہاں نہیں رہتا۔

میں یہ بھی نہیں جانتی کہ سڑک پر جگمگانے والی روشنیوں کے بٹن کون دبا کر انھیں اجاگر کرتا ہے کیونکہ کبھی کسی نے نہیں بتایا اور نہ مجھے معلوم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور میں زندہ سڑکوں پر چلتی ہوں۔

مہندر ناتھ کیوں لکھتا تھا اور کیا لکھتا تھا یہ جانے بغیر بھی لوگ زندہ ہیں کہ سانس کی آواگون زندگی ہے اور زندگی نام ہے صرف سانس لینے کا۔

مہندر ناتھ سڑک کی روشنی تھا، ادبی راہِ سنیر بیٹی کے بال روم میں جگمگاتا فانوس نہیں تھا۔ اس کے دوست معمولی فلم ایکسٹرا اور ملوں میں کام کرنے والے پریشان حال مزدور تھے، بڑے بڑے سرکاری یا غیر سرکاری عہدے دار اور منسٹر نہیں تھے۔

وہ بِنا کا ٹوتھ پیسٹ کی طرح زندگی کے لئے اہم نہیں تھا۔ نہ مہندر ناتھ نے کبھی اشتہار دے کر اور روڈ پر چھپیاں ہونے کی ضرورت محسوس کی، نہ اپنے وجود کی اہمیت کو جانا نہ منوایا۔ مہندر ناتھ نے جب بھی کچھ کیا اسے سب نے اس کا فرض سمجھ کر اس کی طرف توجہ دینے کی بھی ضرورت نہ سمجھی۔ فلم ایکسٹراؤں کے دکھڑے سننا، فلم رائیٹرس کے حق کے لئے لڑنا یہ تو مہندر ناتھ کا فرض تھا اور فرض

کی ادائیگی کون بڑی بات ہے۔

مہندر ناتھ نے چپکے سے پیار کیا۔ چپکے سے شادی کرلی۔ نہ دعوتیں ہوئیں نہ تحفے تحائف کی بھرمار ہوئی۔ "مہندر ناتھ تم نے شادی بھی کرلی اور بتایا نہیں۔" میں نے ناراض ہو کر پوچھا۔ جواب میں مہندر ناتھ کا چہرہ اپنی مخصوص ہنسی سے کھل اٹھا۔

"میں سانس لیتا ہوں، پانی پیتا ہوں، جمائی لیتا ہوں اور کسی کو اطلاع نہیں دیتا۔" مہندر ناتھ کی ہنسی نے جواب دیا۔ مہندر ناتھ کی ہنسی بہت سے سوالوں کا جواب ہوا کرتی تھی۔

وہی ہنسی اس سالونی سلونی چاندنی رات کو سلگ رہی تھی جب ہم کشمیری ہائی اسکول کی سیڑھیوں پر بیٹھے بور ہو رہے تھے۔ کشمیری میں ترقی پسند ادیبوں کی کانفرنس ہو رہی تھی۔ اندر ہال میں اہم مسائل پر بحثیں چل رہی تھیں۔ وقفہ میں کچھ لوگ سگریٹ پینے سیڑھیوں پر آبیٹھے۔ باتوں باتوں میں ان نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کا ذکر آگیا جو کانفرنس سے زیادہ ایک دوسرے میں منہمک تھے۔ خاص طور پر اختر جمال کے کانفرنس میں شرکت پر قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں۔ عام طور پر کم رو لڑکیوں کو ترقی پسند اور انقلابی محفلوں میں شرکت کی ضرورت پڑتی ہے۔ اختر جمال جیسی خوش رو بلکہ کافی خوب صورت لڑکی پر کیا بپتا آپڑی کہ اسے انقلاب یاد آگیا۔

بحث خوب گرمی پکڑ گئی۔ خوب صورت اور بد صورت لڑکیوں کے حوالے دیئے جانے لگے۔

"کم رو لڑکیاں اس لئے انقلاب چاہتی ہیں کہ انقلابی سر پھرے ہوتے ہیں، وہ صورت شکل اور جہیز کی مانگ نہیں کرتے۔ عموماً سیرت پر عاشق ہو جاتے ہیں۔" کسی نے لقمہ دیا۔

مگر رشید جہاں تو خوب صورت ہیں۔ منہاج سسٹرس یعنی سلطانہ آمنہ خدیجہ خوبصورتوں میں گنی جاتی ہیں۔ انھیں جہیز کی بھی قلت نہیں پھر یہ کیوں ادھر آئیں۔"

"اور اختر جمال؟" کسی نے دبی زبان سے کہا۔

پھر خوب صورت اور بد صورت لڑکیوں کا ذکر چھڑ گیا۔

"عورت کوئی بھی بد صورت نہیں ہوتی۔" مہندر ناتھ کی جہاں گیر مسکراہٹ چمکی۔

سب ایک دم ان پر ٹوٹ پڑے۔

"یہ تمہیں کرشن چندر نے ورغلایا ہے۔" حالانکہ بات شاید اس کے الٹ تھی۔ مہندر نے کرشن کو بتایا تھا کہ ہر عورت خوب صورت ہوتی ہے۔

"چاہو تو یہ بھی کہہ دو کہ میں کرشن چندر کی حرص میں اپنی ماں کی کوکھ سے پیدا ہوا۔ کوئی فرق نہیں پڑتا۔" مہندر ناتھ نے سمجھایا۔

"تم کرشن سے بے حد مرعوب ہو۔"

"تم پر وہ چھائے ہوئے ہیں۔"

"ادبی دنیا میں بھی وہ بڑے کھیا بنے بیٹھے ہیں۔ لوگ اوچھے ہتھیاروں پر اتر آئے۔"

"ان ملامتوں کا ایک میں ہی شکار نہیں اور بھی ہیں۔" مہندر نے چپکے سے چٹکی لی۔

"تم احساسِ کمتری کا شکار ہو۔"

"شاید مگر اس کا علاج؟" مہندر ڈھٹائی سے مسکراتے رہے۔ بڑا جی جلتا تھا۔ نہایت کڑوے جملے چل رہے ہیں ایک شخص ہنس رہا ہے، شاید احمق سمجھ رہا ہے۔

اور اس وقت مہندر نے ہمیں بتایا کہ جب کرشن کی آنکھوں سے آنسو چھلکتے ہیں تو مہندر کے دامن میں ہی جذب ہونے آتے ہیں۔ کرشن

بہت کم زور ہیں، بڑے ڈرپوک۔ زندگی جب منہ پر طمانچہ مارتی ہے تو مہندر کے پاس پناہ لینے آتے ہیں۔ نہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا کہ کرشن نے اپنی زندگی کا بہترین ادب مہندر کے اجاڑ گھر میں تخلیق کیا۔ نجی زندگی میں مہندر ناتھ بڑے بھائی تھے اور وہ چھوٹے۔ مہندر نے کرشن چندر کو ایسے نازک وقتوں میں سنبھالا کہ اگر ان کے صابر اور مضبوط کندھوں کا سہارا نہ ملتا تو کرشن چندر ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاتے۔

یہ لیجیے ذکر مہندر ناتھ کا ہے اور کرشن دھنسے چلے آتے ہیں۔ زندگی میں بھی یہی ہوا۔ میرا مطلب ہے ادبی زندگی میں۔ مہندر ناتھ کو بڑھتے وقت فوراً کرشن سامنے آجاتے تھے۔ چھوٹا بھائی ہونا واقعی بڑی ٹریجڈی ہے۔ اپنی جگہ مہندر ناتھ کا ایک مقام تھا۔ انھوں نے بہتوں سے اچھا لکھا با مقصد ادب کی تخلیق کی مگر انھیں ہمیشہ کرشن چندر کے چھوٹے بھائی کی طرح جانچا گیا۔ ان پر ہمیشہ کرشن کی شہ پڑتی رہی یہ خود مجھ پر بیت چکی ہے جب میں نے لکھنا شروع کیا تو سب نے یہی کہا کہ عظیم بیگ چغتائی میرے بڑے بھائی میرے نام سے لکھ رہے ہیں۔ عرصہ تک میری تحریر پر ان کا اثر چھایا رہا۔ دو انسان جب ایک ماں کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں، ایک ماحول میں پلتے ہیں، ایک زبان بولتے ہیں تو لازمی طور پر ان کی تحریر میں رشتہ جھلک آتا ہے۔ مہندر کی تحریروں پر کرشن چندر کی ہلکی سی چھاپ تو لازمی بات تھی۔ مگر غور سے پڑھنے والوں کو پتہ چلے گا کہ یہ دو الگ انسانوں کا خون پسینہ ہے۔ مہندر ناتھ کا انداز فکر ایک ہی محور پر گھومنے کے بعد بالکل الگ ہے۔۔۔

کرشن چندر کو راستہ نظر آگیا ہے۔ انقلاب انسان کی نجات کا ذریعہ ہے مگر مہندر ناتھ کے دل میں شک ہے۔

مہندر ناتھ نے ملک کو ٹوٹتے دیکھا۔ ملک آزاد ہوا مگر آزادی چند نکتوں پر بانٹ لی گئی۔ انھیں انسان کی خصلت پر شک تھا۔ کہیں ہندستانی انقلاب بھی چند لوگوں کی جیبوں میں نہ گم ہو جائے! وہ داغ داغ اجالا اور شب گزیدہ سحر دیکھ چکے تھے۔ اسٹالن کا عروج اور زوال دیکھ چکے تھے۔ انسان کی بربریت کا تماشہ دیکھ چکے تھے۔ بڑے بڑے بت ان کے سامنے سرنگوں پڑے تھے۔ جدید لکھنے والوں کی طرح ان پر بھی ایک دبی دبی سی یاسیت، احساسِ تنہائی اور نامعلوم سی تاریکی چھا جاتی تھی انہیں کسی پر پورا بھروسہ نہ تھا۔ انقلاب کے نعروں کے بجائے وہ انسان میں انسانیت کی تلاش کر رہے تھے۔

مگر مہندر ناتھ خواب دیکھنا چاہتے تھے۔

ایک دن مہندر ناتھ کی ایک کہانی کے چیتھڑے اڑائے جا رہے تھے۔ مہندر ناتھ بھی ایک طرف بے تعلق سے بیٹھے تھے ان کے چہرے پر وہی جی جلانے والی مسکراہٹ تھی جیسے ان کی کہانی نہ ہو کسی اور کا قصہ ہو۔ اس کہانی کا ہیرو ایک نہایت پاجی داداقسم کا انسان ہے جس میں کسی بھی نرمی کی کوئی گنجائش نہیں۔ اسے اچانک معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بیوی کسی دوسرے مرد سے پینگ بڑھا رہی ہے قاعدے سے اسے بیوی کی ناک چوٹی کاٹ لینا چاہیے تھی یا سر گردن سے اڑا دیتا مگر اس نے نہایت غیر مردانہ بات کی کہ بیوی کو طلاق دے دی اور اس آدمی کو بلا کر اپنے سامنے اس کا نکاح پڑھوا دیا۔

"کیا دنیا میں ایسا کوئی ہو سکتا ہے اور کیا اس کے بعد لوگ اسے مرد ماننے پر تیار ہوں گے۔" میں نے پوچھا۔

"ہونا تو چاہیے۔" مہندر نے ہولے سے کہا۔

مہندر ناتھ تم خواب دیکھتے ہو، صدیوں پرانی سچائی کو جھٹلاتے ہو۔ عورت تو مرد کی ملکیت ہے۔ اس کی جنت تو مرد کے قدموں تلے ہے۔ وہ اس کی آخرت کا والی ہے۔ دین و دنیا کا مالک ہے۔ وہ اس کا خدائے مجازی ہے کہ اسے یہ مرتبہ خالق کائنات نے دیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو عورتیں بھی اپنے بدمعاش شوہروں کی ناکیں کاٹ ڈالتیں۔ تم انسانی فطرت کو جھٹلا رہے ہو۔

نہیں مہندر ناتھ میں تمہیں نہیں جاننا چاہتی تم ایسے دھیمے سے سلگاتے ہو کہ دھواں بھی نہیں اٹھتا۔ شعلہ تو دور کی بات ہے۔

مگر ایک دن کوئی سرپھرا تنقید نگار تمہیں جی لگا کر پڑھے گا، سمجھے گا اور سمجھائے گا کہ اس ہنسی کا کیا راز تھا جو کانچ کی نلکیوں کے پردے کی طرح تمہارے چہرے پر پڑی جگمگایا کرتی تھی، ان آنسوؤں کی ضد میں جو تمہارے قلم سے ٹپکا کرتے تھے۔

تب شاید میں بھی تمہیں جان جاؤں۔ ▲

سی۔ ایل۔ کاوش

میں تمھیں جانتا ہوں

تم اپنے بھائی کرشن چندر کو ہمیشہ اپنے سر پر بٹھائے تھے اور خود ہمیشہ اُس کے دِل میں بیٹھے رہتے تھے
تم وہی ہو جو چھپرا بلڈنگ کے اِس کمرے میں ہمیشہ کتابوں کی الماری کے آگے والے پلنگ پر بیٹھ کر لکھتے رہتے
تم فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کے دفتر میں بھی ہمیشہ کرسی پر بیٹھے ہو۔ جب کبھی میرے گھر آتے تب بھی صوفے پر ہی بیٹھتے تھے۔
میں نے تمھیں کبھی زمین پر بیٹھے نہیں دیکھا۔

آج تم اپنے ہی کمرے میں فرش پر پڑے ہو۔ اس حالت میں تمھیں میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ میں نے کیا کسی نے بھی نہیں دیکھا۔

تم ہمیشہ مُسکراتے رہتے تھے۔

میں جب بھی تمہارے کمرے میں آیا تم مسکرا کر کہتے "آؤ مہاراج!"

پہلے میں سمجھتا تھا کہ یہ مہاراج تم مجھے ہی کہتے ہو۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ مہاراج تم سب کو ہی کہتے تھے۔ اگر تم نے کسی کو مہاراج نہیں کہا تو صرف کرشن چندر کو کبھی نہیں کہا۔ اس مہاراج میں توقیر نہیں ایک طرح کا استہزا پایا جاتا تھا۔ تمہارا مطلب شاید یہ ہوتا تھا کہ یوں تم عزت کے قابل نہیں ہو لیکن میں ترقی پسند ہوں۔ سب کو برابر سمجھتا ہوں۔ مہاراج نہیں تو اور کیا کہوں۔"

میں "شاید" اس لئے کہہ رہا ہوں۔ کہ تم کسی سے کُھلتے نہیں تھے۔ سب کو ایسا احساس دلاتے تھے کہ تم کُھل کر بات کر رہے ہو۔ ہر آدمی سے تمہارے قریبی تعلقات تھے۔ ہر آدمی تمہیں اپنا سمجھتا تھا۔ اور یہ تو تم جانتے ہو۔ جس کو سب اپنا سمجھتے ہیں وہ کسی کا نہیں ہوتا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ تم اپنے بھی نہیں تھے۔ بنگالی زبان کے ایک شاعر نے کہا ہے۔ جو اپنا نہیں ہوتا وہ سب کا ہوتا ہے۔ ہاں سب کا! سب کے کام آنے والا کیا سب کا ہو جاتا ہے۔؟ یہ سوال میں تم سے ہی پوچھتا ہوں! تم بولتے نہیں۔؟ بولو گے بھی نہیں۔
لوگ کہتے ہیں کہ اب تم بول ہی نہیں سکتے۔ لیکن تم اب بھی مُسکرا رہے ہو۔

تمہارے ہونٹوں پر وہی مُسکراہٹ ہے۔ جو مہاراج کہتے ہوئے جاتی تھی۔ لوگ کہتے ہیں تم اس دنیا میں نہیں رہے ہاں نہیں رہے یہاں فرش پر تمہاری لاش پڑی ہے۔ میں تمہارے پاس بیٹھا ہوں۔ دروازے پر آدمی کھڑے ہیں۔ چھپرا بلڈنگ کے نیچے ہندوستان کے بڑے بڑے ادیب کھڑے ہیں۔ اردو کے ادیب ہندی کے لیکھک۔ گجراتی اور مراٹھی کے لکھنے والے۔ کچھ اُدھر دوسرے کمرے میں بیٹھے ہیں۔ ساتھ کے کمرے سے درگا بھابھی کے رونے کی آواز آرہی ہے۔ دروازے پر کبھی کبھی بچے آجاتے ہیں، تمہاری بلڈنگ کے بچے۔ وہ جھانکتے ہیں، بیچ بیچ میں عورتوں کی چیخیں اُبھرتی ہیں۔ سب رو رہے ہیں۔ میری آنکھوں میں کوئی آنسو نہیں۔

پرسوں یعنی ۔۔۔ ۱۹ر مارچ ۱۹۷۶ء کو تم اسی کمرے میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ تم صوفے پر بیٹھے تھے۔ سینٹر ٹیبل پر پلیٹیں رکھی تھیں۔ مٹر اور گاجر کی بھاجی تھی۔ چاول تھے۔ دال تھی۔ میں گھومتا گھامتا آیا تھا۔ تم نے کہا تھا ۔ آؤ مہاراج! کھانا کھاؤ،، ! میں نے جواب دیا تھا۔ میں دوپہر کو نہیں کھاتا۔ تو چائے پیو،، ! اور پھر درگا بھابی چائے کا پیالہ بنا کر لے آئی تھی۔ میں نے پوچھا تھا کپور کا کیا حال ہے ۔۔ ؟

اُسے دیکھ کر جانا ۔! یہ کہتے ہوئے تم نے نوالہ پلیٹ میں ہی چھوڑ دیا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ گفت گو مت کرنا،، یہ صلاح بھی تم نے ہی دی تھی۔

کپور ایک دو ہفتے سے بستر پر تھا۔ اُسے دل کا دورہ پڑا تھا۔

مدھوسدن کہتا تھا۔ جو اس بلڈنگ میں رہے گا ۔ اس گندی بلڈنگ میں ۔ وہ تندرست کیسے رہے گا ۔ ؟ وہ رہ ہی نہیں سکتا تم کہتے تھے ۔ ہندوستان کی زیادہ آبادی اس طرح کی بلڈنگوں میں رہتی ہے ۔ تب میں نے ایک دن کہا تھا ۔ اسی لئے سارا ہندوستان بیمار ہے ۔

لیکن سارا ہندوستان مر تو نہیں گیا۔ جی رہا ہے۔ تم مر کیوں گئے ۔ ؟ تم تو ابھی جوان تھے ۔ دو چار عشق اور بھی کر سکتے تھے۔ کر لیتے۔ نئے کردار چُن لاتے۔ کچھ کہانیاں بٹور لیتے۔ لیکن تم نے یہ کیا کیا ۔ خود ہی کہانی بن گئے ۔ ؟!

سُنو یار! تم نے وعدہ کیا تھا کہ تم ادیبوں کا ایک اپنا ادارہ بناؤ گے اُن کا اپنا (PUBLICATION) پبلیکیشن ہوگا۔ اپنا پریس ہوگا۔ تمہیں یاد ہے نا ہم گورنمنٹ کے کوآپریٹیو کے ڈائرکٹر سے ملنے گئے تھے۔ اُس نے ہمیں مشورہ دیا تھا کہ لاکھ روپے اکٹھا کرو۔ لاکھ روپے کوآپریٹیو اسکیم سے میں دلوا دوں گا۔ اور دو لاکھ مہاراشٹر گورنمنٹ تمہیں دے دے گی۔ چار لاکھ تمہاری پونجی ہوگی۔ WRITERS OWN PUBLICATION کی۔ اس پر آٹھ گنا تمہیں سرکاری بنک سے قرضہ ملے گا۔ گویا ۳۶ لاکھ کا اپنا پریس ہو جائے گا۔

پھر میں اور تم دونوں راما نند ساگر کے پاس گئے۔ راما نند ساگر نے ساری اسکیم سن کر کہا تھا کہ مہندر ناتھ تم بیس ہزار روپیہ رائٹرز سے اکٹھا کر کے لے آؤ۔ اسّی ہزار میں دیتا ہوں۔ تمہارا لاکھ روپیہ ہو جائے گا۔

ہم کتنے خوش ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا چاند ستارے باہوں میں آ گئے ہوں۔ بیس ہزار کی رقم تو کوئی بڑی رقم نہ تھی۔ فلم انڈسٹری میں ہم لوگ کام کرتے ہیں۔ بیس ہزار مل جاتا ہوگا۔ پندرہ بیس ہزار روپے تو ایک رات کی دعوت میں آتشبازی کی طرح جل جاتا ہے۔ صرف ایک لمحہ روشن کر کے راکھ بن جاتا ہے۔ گویا ہم ایک لمحہ کی تلاش میں تھے۔ اب یہ لمحہ ہمارے ہاتھ میں آ سکتا تھا۔ ہم نے دوستوں سے ذکر کیا کہ پانچ پانچ سو کے ممبر بن جاؤ۔ یہ ادارہ تمہارا ہوگا۔ تمہیں پانچ فیصد رائلٹی نہیں ملے گی بلکہ تم مالک ہو گے۔ حصے دار ہو گے۔ سیاہ سفید کے مالک۔ کرشن چندر جی سے بات کی کہ آپ ہزار روپیہ دیجئے۔ انہوں نے کہا دیدوں گا۔ لیکن دیئے نہیں۔ دو چار بار میرے ملتے۔ پھر کہنے لگے دیدوں گا۔ بھئی ابھی ہیں نہیں۔ میں نے تم سے شکایت کی تھی کہ ہندوستان کے ہی نہیں انٹرنیشنل رائٹر کے پاس ہزار روپے نہیں ہیں۔ تم کہتے تھے نہیں ہوں گے۔ کاوش تم چیل کے گھونسلے میں ماس ڈھونڈ رہے ہو۔ کئی دوستوں نے روپے دیئے بھی جیسے ششی بھوشن۔ مدھوسدن۔ جیون پرکاش۔ ویدراہی۔ پریتم بیلی۔ اور پھر ضرورت پڑنے پر کچھ لوگ واپس بھی لے گئے۔

اب کیا تم نے اُس ادارے کا خیال چھوڑ دیا ہے ۔۔ ؟

میرا قصور نہیں ہے۔ میں تو اب بھی تیار ہوں۔ میں نے کہا تھا کہ ہم دونوں ایک ساتھ نکلتے ہیں۔ بیس ہزار روپے اشاروں سے مانگ لاتے ہیں۔ مگر تم میرے ساتھ کبھی نہیں گئے۔ اصل میں مہندر معاف کرنا۔ میں تمہیں جانتا ہوں۔ تمہیں ہاتھ پھیلانا

اچھا نہیں لگتا اور تم کوئی ایسا کام نہیں کرسکتے تھے جس میں تمہارا فائدہ ہوتا ہو۔ لیکن اس میں تو سب ادیبوں کا فائدہ تھا ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ ہندی، اردو، مراٹھی، گجراتی سب بھاشاؤں کے ادیب شامل کریں گے۔ ایک زبان کا ادب دوسری زبان میں منتقل کریں گے۔

میں نے تمہیں ایک دن یہ بھی کہا تھا کہ چلو ساحر لدھیانوی کے پاس چلتے ہیں۔ دو ہزار روپے تو وہ آسانی سے دے سکتا ہے پھر میں نے تمہیں یہ بھی بتا دیا تھا کہ ساحر لدھیانوی کے پاس کلچر فرنٹ میں تیرہ ہزار روپیہ بنک میں پڑا ہے جو بالکل بے کار رکھا ہے۔ ہم لوگ کلچر فرنٹ کے تحت کلچر پبلیکیشن کی بھی ایک شاخ کھول لیتے ہیں۔ کلچر فرنٹ میں بھی سارے ہی ادیب ہیں۔ کسی کو اعتراض نہ ہوگا۔ لیکن تم ساحر کے پاس یہ اسکیم لے کر نہیں گئے۔ کیوں نہیں گئے ۔۔ ؟

تمہیں ہاتھ پھیلانا اچھا نہیں لگتا تھا شرم آتی تھی۔ تمہاری خودداری کو ٹھیس لگتی تھی نا۔ ٹھیک ہے تم نے اپنے لئے کچھ نہیں مانگا۔ پھر دوسروں کے لئے کیوں مانگتے۔ دوسروں کے لئے تم پھر بھی کچھ نہ کچھ کرتے رہتے تھے۔ بستر پہ بیٹھے بیٹھے سب کام کر لیتے تھے۔ چونکہ اس پبلیکیشن کے کام میں تم بھی شامل تھے۔ اسی لئے تم اُسے اپنا ذاتی کام سمجھتے تھے۔ تم نے اپنی ذات کے لئے اپنے بڑے بھائی کرشن چندر سے بھی کبھی کچھ نہیں کہا۔ حالانکہ تم جانتے تھے کہ ہر سال لوگوں کو انعامات ملتے ہیں۔ تم یہ بھی جانتے تھے خودغرضی کی جال میں ایوارڈ کی مچھلی کیسے پھنستی ہے۔ ہر سال شخصیت کے جال بنے جاتے ہیں۔ جال بننے والے تمہارے دوست تھے بھائی تھے مگر تم نے ان سے ایک بار بھی نہیں کہا۔ کہ دو چار دھاگوں کا ایک جال میرے لئے بھی بن ڈالو۔ اگر کہتے تو تمہیں بھی ایوارڈ مل جاتا۔ دسجاد ظہیر، تمہارے بنے بھائی۔ جب بھی بمبئی آئے وہ تمہاری اس چال سے ہو کر گزرے۔ تمہیں اُن سے محبت تھی عقیدت تھی۔ تم انہیں ترقی پسندوں کا لیڈر مانتے تھے۔ جب بھی اُن کا ذکر کرتے بڑے خلوص اور احترام سے کرتے اور میں دل میں سمجھتا تھا کہ یہ صرف میرے سامنے ہی تم اتنا خلوص بگھار رہے ہو۔ معاف کرنا دوست! سب ترقی پسندوں کی عادت ہے۔ وہ اپنے ترقی پسندوں کا ہی راگ الاپتے ہیں۔ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی کا خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی اور سردار جعفری کا۔ پھر سب مل کر مُلا اور حاجی کی گردان کرنے لگتے ہیں۔ سب مُلا ہیں سب حاجی ہیں۔ میں سمجھتا تھا کہ تم بھی اسی طرح بنے بھائی کا راگ الاپ رہے ہو۔ لیکن جس دن بنے بھائی کے انتقال کی خبر آئی اُس دن تمہارا حال قابلِ رحم تھا۔ میں تمہیں ملنے آیا تم بستر پہ تھے۔ تمہارا دل ڈوب رہا تھا۔ میں نے تمہیں سمجھایا تھا۔ کہ

"موت سے کس کو رستگاری ہے"

نہ کوئی بچا ہے نہ بچے گا۔ ہم سب موت کے منہ میں جی رہے ہیں۔ تم آج مر چکنے والوں کے لئے کیوں دکھی ہو رہے ہو؟ آج تک تم ان کے لئے دکھی ہو رہے تھے۔ جو جی جی کر مر رہے ہیں۔ یا جو مر مر کر جی رہے ہیں اور آج مر کر سکھی ہو جانے والوں کے لئے دکھی ہو رہے ہو۔ تم اپنے بستر پہ مسکرا دیئے تھے۔ اور پھر ایک لمبی سانس لی تھی تم نے، اور کہا تھا،

بنے بھائی بہت بڑا ادیب تھا۔ بہت بڑا انسان تھا۔ ترقی پسند تحریک کا بانی تھا۔ کاش تم اُسے نہیں جانتے۔"

میں نے پوچھا تھا۔ تمہیں کہاں تکلیف ہو رہی ہے۔ ؟ تم نے اپنے دل پہ ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔ یہاں ۔ ؟

مجھے تمہارے دل سے بہت ڈر لگتا تھا۔ میں کیور (کیمرہ مین) جیون پرکاش اور پروفیسر پریتم بیلی ڈاکٹروں کی طرف بھاگے تھے۔

ڈاکٹروں نے تمہارا معائنہ کیا اور کہا دل کا دورہ نہیں، نروس بریک ڈاؤن ہے۔ تم آٹھ دن بستر پر لیٹے رہے تب مجھے یقین ہوا کہ تم دوسروں کی طرح یوں ہی راگ نہیں الاپتے۔ جس کے ساتھ تمہارا رشتہ ہوتا ہے دلی ہوتا ہے۔ اور جو تمہیں ایوارڈ نہیں ملا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ تم اپنے لئے ہاتھ نہیں پسار سکتے۔ اچھا کرتے تھے۔ خودداری کے آبگینوں کو سنبھال کر رکھنا اچھی بات ہے۔ لیکن میں تم سے یہ پوچھ سکتا ہوں۔ مجھے مانگنے کے لئے کیوں بھیج دیتے تھے۔ پچھلے دنوں رائٹرز

ایسوسی ایشن کے ایک ادیب کی بیٹی کا بیاہ تھا۔ تم نے کہا تھا پانچ ہزار روپیہ اس کے لئے اکٹھا کرنا چاہیئے۔ میں غافل ہرنالوی اور وید راہی کو ساتھ لے کر کہاں کہاں بھاگتا پھرا تھا۔ تم کہیں نہیں گئے تھے۔ بڑی مشکل سے گلشن نندہ کو فون کرنے پر راضی ہوئے تھے۔ پانچ ہزار اکٹھا تو کیا گیا لیکن تم........؟

پرسوں پھر تم نے مجھے صلاح دی تھی کہ سلیم جاوید آج کل بہت کامیاب ہیں اُن کی اوپر تلے سات فلمیں ہٹ ہو گئی ہیں۔ پروڈیوسرز اور اسٹارز اُن کی بات مانتے ہیں۔ ذرا اُن کو ساتھ لے کر نکلو اور رائٹرز بنیولنٹ فنڈ کے لئے دس بارہ ہزار روپیہ اکٹھا کرلاؤ تاکہ غریب فلمی ادیبوں کی مدد کی جا سکے۔ ہماری ایسوسی ایشن کے ممبروں کی حالت اچھی نہیں ہے اور میں نے حامی بھرلی کہ اُن سے کہتا ہوں۔ تب میں نے سوچا تھا کہ تم میرے کندھے پر رکھ کر بندوق چلانا چاہتے ہو۔ خود مانگنے کے لئے کیوں نہیں نکلتے۔ سلیم جاوید ایسوسی ایشن کے ممبر ہیں۔ تم ایسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری ہو۔ جاوید تمہارے دوست جاں نثار اختر کا بیٹا ہے۔ تمہیں کہنا چاہیئے یہ سب باتیں میں تم سے نہیں کہہ سکا۔ میں نے تمہیں ٹال دیا۔ بہتر بہتر میرا دل کہہ رہا تھا کہ خود مانگتے شرم آتی ہے۔ بڑے شرمیلے ہیں نا آپ اور مجھے بے شرم سمجھتے ہیں ہماری خودداری کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔

پھر کل صابر دت موہن اسٹوڈیو میں ملا تھا اُس نے کہا تھا کہ "مہندر ناتھ نمبر" نکال رہا ہوں۔ اُس کی شخصیت اور فن کو اجاگر کروں گا۔ وہ اُس وقت تمہاری طرف دادر ہی جا رہا تھا۔

میں نے اُس سے پوچھا تھا۔ کہ تم نے مہندر سے اجازت لے لی ہے؟ مہندر کے ایما پر ہی نکال رہا ہوں۔ اُس نے جواب دیا تھا۔ اُس نے یہ بھی بتایا تھا کہ کاوش اس نمبر کو ترتیب دیگا۔ یہ تمہاری صلاح ہے۔

مجھے اُس کی بات کا یقین نہیں آیا۔ کیوں کہ تم اپنے لئے تو کبھی کچھ کرتے ہی نہیں تھے۔ یہ نمبر کا خیال تمہیں کیونکر آیا۔ پھر بھی میں نے صابر دت سے وعدہ کیا تھا کہ کل میں دادر آتا ہوں مہندر کے گھر وہاں اُس کے سامنے ہی سب پروگرام طے کریں گے۔ میں تم سے آج پوچھنے والا تھا کہ یہ نمبر صابر دت کیوں نکالے گا۔ اعجاز صدیقی کیوں نہیں نکالتا۔ اُس کے رسالے شاعر کے تم ایڈیٹر ہو۔ بیسویں صدی کیوں نہیں نکالتا۔ خوشتر گرامی کے تم دوست ہو۔ کرشن چندر کے دماغ میں یہ تجویز کیوں نہیں آئی۔ وہ اپنے دوستوں کے لئے سب کچھ کرتا ہے بھائی کے لئے کیوں نہیں سوچا یا تم تو ہمیشہ اُس کے بارے میں سوچتے رہے۔ اور ابھی ابھی تم نے کرشن چندر پر ایک ڈاکومنٹری فلم بنائی ہے۔ آٹھ دن پہلے ہی تم نے وہ فلم مکمل کر کے فلم ڈویژن کے حوالے کی ہے۔

پروفیسر کنہیا لال کپور کہتا ہے کہ کرشن چندر کو بڑا افسانہ نگار بنایا ہے اُس کے چھوٹے بھائی مہندر ناتھ نے۔ اب میں کہتا ہوں کہ کرشن چندر کے ہاتھ میں مہندر ناتھ نے قلم تو نہیں دیا تھا لیکن اُس کو شہرت بہت دی اور حد تو یہ کہ مرنے سے پہلے اُس کے فن اور شخصیت پر ۳ زبانوں میں ایک فلم بھی تخلیق کر دی۔

کچھ ایسی ہی باتیں سوچتا ہوا رات کو میں اپنی بالکنی میں ٹہل رہا تھا کہ بالکنی کے سامنے سڑک ہے مکان کے دروازے کے سامنے ایک لیمپ پوسٹ ہے۔ رات اُس کا بلب فیوز ہو چکا تھا۔ اندھیرا روشنی میں ڈوب جاتا ہے لیکن روشنی اندھیرے میں ڈوب گئی تھی ایک بلب کی حیثیت کیا ہے دو روپے تین روپے اس سے زیادہ نہیں گویا تین روپے میں اُجالا خریدا جا سکتا تھا۔ مگر یہ میرے گھر کا بلب نہیں تھا میونسپلٹی کا بلب تھا۔ اور میونسپلٹی سرکار کی ہے۔ سرکار کے معاملے میں میں دخل نہیں دے سکتا۔ اس لئے آج اندھیرا ہے۔ راتیں کبھی اندھیری ہیں۔ چاندنی راتوں میں منظر زیادہ خوبصورت ہوتا ہے۔ مکان کے کمپاؤنڈ میں لمبے لمبے ناریل کے درخت ہیں۔ چاندنی اُن سے گزر کر میری بالکنی پر پڑتی ہے۔ اُدھر چاندنی راتوں میں سمندر کی لہریں مترنم ہوتی ہیں۔ مگر کل رات کو آسمان پر ستارے تھے۔ چاند نہیں تھا۔ سمندر بھی چپ تھا۔ سڑک اندھیری تھی۔ درخت کالے تھے۔ ماحول اداس تھا۔ میں ٹہل رہا تھا۔ بالکنی میں

ٹہلنا مجھے اچھا لگتا ہے۔ اور ٹہلتے ہوئے رات کہیں کچھ بنیادی باتوں پر سوچا کرتا ہوں۔ اکیلا ہوتا ہوں نا گھر والے سب سو جاتے ہیں۔ تم جانتے ہو میرا گھر بھرا ہوا ہے۔ ادیب کو جو تھوڑی سی تنہائی کی ضرورت ہوتی ہے وہ مجھے اس وقت ملتی ہے۔ اور پھر میں یہ سوچتا ہوں کہ بھگوان نے انسان کو پیدا کیوں کیا۔ دُکھ دینے کے لئے۔ کیا انسان کو دکھی دیکھ کر اُسے سُکھ ملتا ہے۔ ویدانت کہتا ہے کہ۔ وہ بھگوان خود بھی دُکھ سُکھ بھوگتا ہے۔ وہی ہے دوسرا کوئی ہے بھی نہیں۔ یہ سنسار ہے نہ برہمانڈ ہے۔ اور کوئی کوٹی کروڑ ہا کروڑ برہمانڈ جو ہیں نا اور یہ کروڑوں آدمی یہ نہیں ہیں۔ صرف ان کا ایک تصور ہے۔ پھر آدمی انفرادیت کا شکار کیوں ہے۔ جو ہے نہیں وہ منفرد کیسے ہو سکتا ہے؟

یاں پال سارترے کا کہنا ہے ہمارا ایک دوسرے سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ کوئی کنکٹیٹ ہی نہیں ہو سکتا۔ ہر آدمی منفرد ہے مکمل اکائی ہے۔ آدمی ایک جزیرہ ہے۔ سب سے الگ تھلگ۔ لاتعلق۔

مجھے یوں ٹہلتے اور سوچتے دیکھ کر کبھی کبھی میری گھر والی میری باتیں سنتی ہے تو کہہ اُٹھتی ہے۔ بے کار کی باتیں ہیں۔ سوچنا ہے تو لڑکی کی شادی کے بارے میں سوچو وہ بڑی ہو گئی ہے اب۔ یہ سن کر میں آسمان پر اُڑتا ہوا دھڑام سے زمین پر گر پڑتا ہوں۔ کیونکہ میں انسانی برادری کا ایک رکن ہوں۔ اور سماج کہتا ہے کہ جوان لڑکی کے پاؤں کی دھمک ماں کے دل میں ہوتی ہے۔ اور باپ کے دماغ پر۔

لیکن مہندر جانے کیا بات تھی کہ کل رات میں یہ سب باتیں نہیں سوچ رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا تمہارے بارے میں جس نے شاید برسوں سے کہا ہے۔ میرا جنم نکالو۔ یہ تم کہہ سکتے ہو؟ تمہارے جیسا شرمیلا بے غرض آدمی یہ کیسے کہہ سکتا ہے۔ کیوں کہ میں تمہیں جانتا ہوں مہندر!!

اتنے میں سڑک پر میں نے ایک سایہ دیکھا جو میرے گھر کی طرف رینگتا ہوا چلا آرہا تھا۔ میرے مکان کے سامنے آکر وہ ٹھہر گیا۔ میں بھی بالکنی میں کھڑا ہو گیا۔ اتنے میں اُس سائے نے دوسرے سائے سے پوچھا۔

کاوش صاحب کہاں رہتے ہیں؟

اپنا نام سُن کر میں چونک گیا۔ وہ سایہ نہیں تھا۔ ہمارا ساتھی تھا۔

میں نے بے اختیار پکارا۔ مدھوسُدن!

تم نیچے آؤ کاوش!

کیوں ۔۔۔؟ اتنا کہہ کر میں ننگے پاؤں نیچے بھاگ گیا۔ میں نے اُس کے جواب کا انتظار بھی نہیں کیا۔

مدھوسدن اندھیرے میں کھڑا تھا۔

"کیا بات ہے"۔۔؟ میں نے پوچھا تھا۔

"مہندر ایکسپائرڈ EXPIRED"۔۔!! مدھوسدن کی آواز نہیں ایک سسکی سی سنائی دی۔

کیا ۔۔۔؟ میں چیخ کر خاموش ہو گیا تھا۔

پھر سناٹا تھا۔ ہوا بھی خاموش تھی۔ وقت ساکت ہو گیا تھا۔

پڑوس کے بنگلے میں کتا بھونکا۔ پھر چاروں طرف فضا بھونکنے لگی۔ میں نے مدھوسُدن کے کندھے پر ہاتھ رکھا یا اُس نے میرے کندھے پر مجھے یاد نہیں۔ اپنے جسم کا احساس ہی نہیں رہا تھا۔

پھر ہم دونوں اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں تھے۔ اُس نے پانی مانگا میں نے فریج سے بوتل نکالی۔

میرا بڑا لڑکا انل بھی پاس ہی آکر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے سوال کیا کب ہوا یہ حادثہ ۔۔؟ کیسے ہوا؟ کہاں ہوا ۔۔؟

مدھوسودن نے کہا آج رات ہسپتال میں آٹھ بجے مہندر ناتھ کا ہارٹ فیل ہوگیا۔ آج صبح ہسپتال لے کر گئے تھے
میں مدھوسودن کے ساتھ گھر سے نکل آیا۔ رات بارہ بج چکے تھے۔ رات پوری طرح چھا چکی تھی۔
چھپرا بلڈنگ میں جب داخل ہوا تو عورتوں اور بچوں کے سسکنے کی آوازیں آرہی تھی۔ لیکن میرا دھیان اُن کی سسکیوں پر نہیں تھا۔ کچھ سوچ رہا تھا شاید۔ کیا۔ وہ اب یاد نہیں۔ تمہارے جس کمرے میں کپور رہتا تھا وہاں تالا پڑا تھا میں وہیں رُک گیا مدھوسودن نے بتایا کہ کپور کو سلیپنگ پلز دے کر سلا دیا ہے۔ ڈاکٹر نے ابھی اسے خبر دینے سے منع کیا تھا۔ تمہارے کمرے کے ساتھ جو ستارہ چلی رہتے ہیں۔ جن کے بچے عام طور پر تمہارے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ دومنٹ کے لئے چپ نہیں تھے۔ وہی بچے جو آکر کہتے تھے چاچا چاچا آنے دو آنا اور تم نکال کر دے دیتے تھے۔ کبھی تمہارے پاس چھٹے پیسے نہ ہوتے تو وہ ہنگامہ برپا کر دیتے تھے۔ پھر تم بھابی کو آواز دیتے۔ درگا! اور بھابی آکر کھڑی ہوجاتی تم اُس کے ہاتھ میں دس کا نوٹ تھما کر کہتے ان کو پیسے دیدو بھئی۔ ہمیں بات کرنے نہیں دیتے۔ ہاں وہی بچے سب کے سب اُن گندی سیڑھیوں پر اُداس بیٹھے تھے۔ انہیں تم اپنے ساتھ کشمیر بھی لے کر گئے تھے۔
میں نے تمہیں ایک دن پوچھا تھا کیا تم چھپرا بلڈنگ کے اتنے سارے لوگ ساتھ لے کر جا رہے ہو مہندر! ڈاکومنٹری فلم کا شوٹنگ ہے وہاں۔ اتنا بڑا کارواں تو فیچر فلم والے بھی لے کر نہیں جاتے تم مسکرا دیئے تھے۔
جب تم کشمیر سے لوٹ کر آئے تو تمہاری طبیعت پھر خراب ہوگئی تھی۔ میں نے تمہیں جاتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ کشمیر میں جس قدر آدمی زیادہ لے جاؤ گے تم اتنے ہی دکھی ہوجاؤ گے۔ کیونکہ تمہاری عادت ہے لوگوں کی دیکھ بھال میں لگے رہنا۔ تم دل کے مریض ہو تمہیں TENsion ہوجائے گی۔ یہ تشنج تفکر تمہارے لئے بہت خطرناک ہیں۔ تم نے میرے ساتھ اتفاق بھی کیا تھا۔ لیکن تم کسی کے سامنے انکار نہیں کرسکتے۔ میں جانتا ہوں تمہاری سب سے بڑی کمزوری یہی تھی۔ کسی کو ناراض نہ کرنا۔ اندر ہی اندر سلگتے رہنا کڑھتے رہنا یہی کڑھنا اور سلگنا تمہیں موت کے قریب لئے جا رہا تھا۔ کمال تو یہ ہے کہ تمہیں شراب پینے کا بھی شوق نہیں تھا۔ لیکن جب کوئی دوست تمہیں شراب کی دعوت دیتا تو تم شراب کو انکار نہیں کرسکتے تھے۔ اُس کے ساتھ پی لیتے تھے۔ پھر دو تین روز تک تمہارا معدہ خراب رہتا تھا۔ تم بستر پر پڑے رہتے تھے پھر بھی پلنگ پر لیٹے ہی لیٹے تم سارے کام کرتے تھے۔ فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کے لوگ وہیں پلنگ کے آس پاس بیٹھے رہتے تھے۔ تم کہانیوں کے رجسٹریشن وہیں کر دیتے۔ دو دو سو صفحات پر دستخط کرتے کرتے تمہارا ہاتھ تھک جاتا تھا۔ میں تمہیں منع کرتا۔ کبھی بدھ وار اور شنی وار کے دو دن کہانی رجسٹریشن کے لئے ایسوسی ایشن نے مقرر کر رکھے ہیں پھر یہ روز کا جھنجھٹ کس لئے مول لیتے ہو تم۔۔۔؟
تمہارا جواب ہوتا تھا۔ بے چارا غریب رائٹر دور سے آیا ہے اسے پھر آنا پڑے گا۔ اور نہ چاہتے ہوئے بھی تم کام پر جٹے رہتے۔ میں نے ایک دن تمہیں صلاح دی تھی کہ اب ایسوسی ایشن سے الگ ہوجاتے ہیں۔ کیونکہ ہم ابھی ابھی ایک جھگڑے سے نپٹے تھے۔ وہ جھگڑا اتنا شدید تھا کہ فلم رائٹرز ایسوسی ایشن ٹوٹ سکتی تھی۔ ایک طرف تمہاری دوستی تھی تیس چالیس برس کی رفاقت۔ دوستی بھی اُن کی جن کے ساتھ تمہاری آئیڈیالوجی ملتی تھی۔ نصب العین کا تعلق۔ ایک فن کار کا سب سے بڑا رشتہ ہوتا ہے اور دوسری طرف فلم رائٹرز ایسوسی ایشن تھی۔ جس کے تم جنرل سکریٹری تھے۔ تم دل کے مریض بھی تھے۔ تم نے اپنی دوستی اور زندگی تک کی پرواہ نہیں کی۔ دل پر ہاتھ رکھ کر لڑے۔ دوستی ٹوٹ گئی ایسوسی ایشن بچ گئی۔ اس کا ردِ عمل کیا ہوا۔۔۔؟ موت تمہارے قریب آکر کھڑی ہوگئی۔ اس فنکشن کے بعد رات کو دوبارہ آیا تھا۔ اسی لئے میں نے تمہیں مشورہ دیا تھا کہ ایسوسی ایشن اب سلامت ہے اور میرے تمہارے بنا بھی چل سکتی ہے۔ کنارہ کشی۔ تم مسکرا دیئے تھے اور کہا کہ میرا کوئی بچہ تو ہے نہیں۔ کوئی ایسا کام بھی نہیں ہے جس میں مصروف رہوں۔ ایسوسی ایشن کی مصروفیت ہی نے تو آج تک زندہ رکھا ہے مجھے۔

میں نے تمہیں اُسی دن ایک فلاسفی سمجھائی تھی کہ دیکھو مہندر! مندر میں مورتی پتھر کی ہوتی ہے۔ سب اُس کے سامنے جا کر اپنے دکھڑے روتے ہیں۔ ہندوؤں نے پتھر کی مورتی اسی لئے مندر میں ٹکا دی ہے کہ لوگ اپنے دکھڑے دل کھول کر اس کے سامنے روتے رہیں۔ پتھر کو احساس تو ہوتا نہیں اگر وہاں سچ مچ کا بھگوان ہوتا۔ گوشت پوست کا تو اس کا کلیجہ پھٹ گیا ہوتا۔ اور تم جیتے جاگتے حساس انسان ہو۔ سب کے دکھڑے سنتے ہو۔ تمہارا کیا بنے گا۔ یا تو بھئی تم پتھر کے بن جاؤ۔ ،، لیکن ایک کھرا سچا ادیب پتھر کا کیسے بن سکتا ہے۔!! تم نے کبھی میری بات نہ مانی۔ اور آج دیکھو تمہارا جگری دوست کپور اندر گولیاں کھا کر سو رہا ہے۔ اُسے کسی نے نہیں بتایا کہ مہندر ناتھ اب دُنیا میں نہیں رہا۔

میں جب تمہارے کمرے میں داخل ہوا چھپرا بلڈنگ کی کھولی نمبر ۱۳ میں تو درگا بھابی تمہاری جگہ بیٹھی تھی۔ کتابوں والی الماری کے سامنے۔

میرے داخل ہوتے ہی اُسکی دھاڑیں نکل گئیں۔ پچھاڑیں کھانے لگی۔ میں کچھ نہیں بولا۔ آنسوؤں کو اپنی آنکھوں کی کوروں میں سمیٹنے کی کوشش کر کے اُس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ وہ کہہ رہی تھی مہندر جی۔ مہندر جی۔!! وہی نام تمہارا نام :- میں کچھ بولا نہیں۔ بول بھی نہیں سکتا تھا اگر بولنے کی کوشش کرتا تو ضبط کے سارے بندھ ٹوٹ جاتے۔ اور مجھے رونا بالکل اچھا نہیں لگتا۔ میں نے بھابی کے سر پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

اب دروازے کے باہر چھپرا بلڈنگ کے سب لوگ جمع ہو گئے تھے۔ میں نے مدھوسدن کی طرف دیکھا وہ پتھر کا بت بنا کھڑا تھا۔ ایک لمبے وقفے کے بعد اُس میں حرکت پیدا ہوئی اور اُس نے کہا چپ ہو جاؤ درگا کپور کی آنکھ کھل گئی تو ہم اُس کو کیا جواب دیں گے۔ اور بھابی کی آواز اندر ہی اندر گھٹ گئی۔ وہ سسکیاں لینے لگی۔

کپور کے ساتھ تمہاری پرانی دوستی ہے۔ وہ ۲۵ برس سے تمہارے ساتھ رہتا چلا آیا ہے۔ ہر روز صبح چائے کا پیالہ لے کر وہ ہی تمہارے پاس آتا ہے۔ پکارتا ہے۔ مہندر جی چائے پی لو — اور تم اٹھ کر چائے کا کپ لے لیتے تھے۔ آنکھیں ملتے ہوئے چائے کی چسکی لیتے تھے۔

کل تک اُسے نہیں معلوم تھا کہ تمہارے پر ہسپتال میں کیا بیتی۔ مگر آج اُسے معلوم ہے رات کو وہ بے خبر تھا اب باخبر ہے۔ کئی بار دھاڑیں مار کر رو چکا ہے۔ سنو وہ اُس کی آواز آئی۔ مہندر جی۔ مہندر جی۔ اُف کتنی دردناک پکار ہے سُن رہے ہو تم۔

کل رات بڑی خوفناک گزری۔ میں اور مدھوسدن رات کے پچھلے پہر تک ساتھ تھے۔ ہم سوچتے تھے۔ کرشن چندر سنیں گے تو اُن پر کیا بیتے گی۔ اُس نے مجھے بتایا کہ سلمیٰ نے کرشن جی کو دلی فون پر صرف اتنی خبر دی ہے کہ مہندر کی طبیعت خراب ہے ہوائی جہاز سے پہلے آ جائیے۔

میں نے کہا مدھوسدن چلو ہسپتال چلتے ہیں۔ مدھوسدن نے میری طرف دیکھا اور کہا کیا کرو گے۔ وہاں جا کر۔ مہندر ناتھ شام آٹھ بجے تک کے ای۔ ایم ہسپتال کے بستر پر تھا۔ اب ہسپتال کے مُردہ خانے میں ہے۔ ہمیں کرشن چندر کا انتظار کرنا ہو گا۔ وہ آ جائیں گے۔ تب کریا کرم ہو گا۔ اگر رات کو تھک گئے سب لوگ تو کل کیا ہو گا۔ کل کے لیے ہمیں اپنے آپ کو تیار کرنا پڑے گا۔ ابھی وہ آدمی تمہاری آنکھوں کے سامنے نہیں ہے جس نے آٹھ بجے میرے سامنے دم توڑا ہے۔ جب اُس کے سامنے جاؤ گے تب بڑی ہمت کی ضرورت پڑے گی۔ تم گھر جاؤ میں یہاں رہتا ہوں صبح چھ بجے پھر سوچیں گے۔ جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ قریب کھڑا کوئی بلڈنگ کا آدمی کہہ رہا تھا۔

ہاں ہوگیا۔ یہ تو ہونے ہی والا تھا۔ یہ آدمی کون تھا میں نہیں جانتا۔ ہوگا تمہاری کسی کہانی کا کردار۔ تمہاری چھیرا بلڈنگ کے سب آدمی ہی تو تمہاری کہانیوں میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ یہی جیتے جاگتے کردار تمہاری کہانیاں بناتے ہیں۔ یا یوں کہوں تم ان کرداروں کی کہانیاں بنا دیتے ہو۔

پہلے ایک یگ تھا جب راجوں مہاراجوں کی کہانیاں سُنی جاتی تھیں۔ پھر بہادروں کی کہانیاں سُنی جانے لگیں۔ ہم اس زمانے میں غریبوں اور بھکاریوں کی کہانیاں کہنے لگے ہیں۔ کیونکہ اس وقت وہ لوگ سچ ہوتے تھے۔ اور آج یہ لوگ سچ ہیں۔ تم نے سچ پر ہی کہانی کے تانے بانے بُنے ہیں۔ جھوٹے اور غیر حقیقی آدرش کو تم نے کبھی کہنے کی بات نہیں مانا۔

کچھ لوگ کہتے ہیں تم سوشلسٹ نظام کا پرپاگنڈا کرتے تھے۔ تم اشتراکی طرز کی کہانیاں لکھتے تھے۔ یہ الزام بجا ہے لیکن میں اُن لوگوں سے پوچھتا ہوں کیا وہ آدرش کا پرپگنڈا نہیں کرتے۔ کسی دوسری دنیا سے کوئی کردار تخلیق کرکے لے آتے ہیں۔ اور پھر اس پر کہانی کہہ دیتے ہیں۔ وہ بھی پرپگنڈا ہے۔ بامقصد ادب جب لکھا جائے گا اُس پر پراپگنڈے کا الزام تو ضرور عائد ہوگا۔ دوست آنے والا وقت اس بات کا فیصلہ کرے گا۔ کون کیا تھا۔ مگر تم اُس وقت کہتے فنکار کبھی نہیں مرتا۔ وہ اپنے میں زندہ رہتا ہے۔ مگر کل رات سب کہہ رہے تھے تم آج مر گئے ہو۔

میں نے راجندر سنگھ بیدی کو رات دو بجے کے بعد فون کیا۔ مسز بیدی نے بتایا کہ راجندر سنگھ بیدی دہلی میں ہیں تمہارے ایک رشتے دار کے یہاں فون کیا۔ تمہاری موت کی اطلاع دی۔ انہوں نے بڑا دُکھ پرکٹ کیا اور آخر میں پوچھا باہر کب لے جانے والے ہیں۔؟

باہر سے مطلب تھا شمشان بھومی۔ جب موت انسان پر قابو پا لیتی ہے۔ تب جیتے جاگتے انسانوں کا اتنا ہی رشتہ باقی رہ جاتا ہے۔

میں تمہارے کمرے میں بیٹھ گیا۔ روشنی مدھم تھی۔ بالکنی کا ٹوٹا ہوا دروازہ تھا۔ وہ کھلا ہوا تھا۔ تمہاری چھیرا بلڈنگ کی بالکنی کارپوریشن والے گرا گئے ہیں۔ کیونکہ اُس بالکنی کے گر جانے کا خطرہ تھا۔ اب وہ نئی بنائیں گے۔ کب بنے گی پتہ نہیں۔ جب ہندوستان کی حالت سدھرے گی تب تمہارے کمرے کی بالکنی بھی بن جائے گی۔ مگر تب تم کہاں ہوگے۔ !؟! ۔ تم نے ہندوستان کی حالت سدھارنے کے لئے کتنی کوشش کی ہے۔ کتنا لکھا ہے۔ تمہارا قلم تلوار کی طرح چلتا تھا۔ زندگی میں انسان کو کیا چاہیئے۔ اپنے لئے ایک کمرہ۔ تم نے اُس کمرے کا ایک بلیو پرنٹ بھی بنایا تھا۔ یوں تو تم نے ایک بلیو پرنٹ کہانی بھی لکھی ہے۔ لیکن یہ تم نے آدمی کے رہنے کے کمرے کا بلیو پرنٹ بنایا ہے۔ وہ ناول ارمانوں کی سیج میں ملا ہے۔ اس ناول میں تمہارا ایک کردار ہے۔ چمن تم نے لکھا ہے۔ وہ ایک گریجویٹ ہے۔ اور ایکٹر بننا چاہتا ہے۔ اس کردار کا جب میں تجزیہ کرتا ہوں تو مجھے تمہاری تصویر نظر آتی ہے۔ تم بھی گریجویٹ تھے۔ تم چمن کی طرح دوسروں کی نوکری نہیں کرنا چاہتے تھے۔ صرف لکھنا چاہتے تھے۔ لکھنے کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنانا چاہتے تھے۔ چمن ایکٹر بننا چاہتا تھا۔ وہ رہنے کے لئے ایک اچھے کمرے کی خواہش رکھتا ہے۔ کولی واڑہ میں اپنے بھائی کے ساتھ نہیں رہنا چاہتا۔ وہ بستی گندی لگی ہے۔ وہ کہتا ہے ——"

بس ایک کمرہ چاہتا ہوں۔ اپنے لئے صرف اپنے لئے۔ ایک صاف ستھرا کمرہ۔ ایک پلنگ۔ ایک تپائی۔ ایک صوفہ سیٹ۔ ایک بُک شیلف اور دیواروں پر چند آرٹسٹک تصویریں۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر رنگ دار پردے۔ بس مجھے اور کچھ نہیں چاہیئے۔ صرف ایک کمرہ اور اتنی کم چیزیں۔ بس یہی مری جنت ہوگی۔ اس چھوٹی سی جنت کے لئے مارا مارا پھرتا ہوں اور کوئی مجھے سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ شاید تم بھی نہیں!،

میں تمہیں جانتا ہوں مہندر! اسی لئے تو تمہارے کمرے کو دیکھ کر مجھے تمہارا کردار یاد آیا تھا۔ اور میں نے تمہارے کمرے کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھا تھا۔ پردے نہیں تھے دیواروں پر تصویریں بھی نہیں تھیں۔ ہاں ایک تصویر دیوار کے ساتھ لُٹی ہوئی سی تپائی پر دیوار کے سہارے رکھی ہے اُس تصویر میں بنے بھائی اور تمہارے کلاس فیلو اِندر کمار گجرال بیٹھے ہیں۔ ساحر لدھیانوی ہیں۔ تم ذرا ہٹ کر بیٹھے ہو تمہارے کمرے کی مدھم روشنی میں یہ تصویر دھندلا گئی ہے۔ تمہیں تمہاری خواہش کے مطابق کرہ بھی نہیں مل سکا تم نے یہ ناول ارمانوں کی سیج سنہ ۶۵-۱۹۶۴ء میں لکھا ہوگا تب بھی تم اُس چھبرا بلڈنگ میں رہتے تھے۔ تمہارے اندر کی خواہش ایک کرہ ڈھنگ کا اس ناول میں ابھر آئی ہے۔ لیکن تمہاری خواہش پوری ہو جاتی تو شاید تم ان لوگوں سے کٹ جاتے جنہیں جنتا یا عوام کہا جاتا تمہارے سب ترقی پسند اُن سے کٹ گئے ہیں۔ موٹریں لے کر۔ بنگلے لے کر۔

میں نے سنا ہے۔ تمہیں بھی ایک منسٹر نے فلیٹ کی پیش کش کی تھی۔ ایک عرضی لکھ دو اور فلیٹ لے لو۔ کہتے ہیں تب تم نے کہا تھا مجھے کم از کم تین سو فلیٹ چاہئیں۔ فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کے تین سو سے زائد ممبر ایسے ہیں جن کے پاس سر چھپانے کو چھت نہیں ہے۔ اس کے بعد کیا ہوا مجھے پتہ نہیں۔ اور تم تو آج بتا نہیں سکتے۔ مگر یار یہ تمنا کس میں ہو سکتی ہے اس دور میں سب غرض کے دیوانے ہیں۔ تم بے غرض کہاں سے پیدا ہو گئے۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ میں تب کھاؤں گا۔ جب میرے ساتھیوں کے سامنے کھانا پروس دیا جائے گا۔

تمہارے سامنے اُس وقت شاید وسطی ہوگا۔ جو تین بچوں کے ساتھ کسی سلم slem کی جھونپڑی میں رہتا ہے۔ یونم ہوگا۔ جسے تین مہینے کے بعد اپنا جھونپڑا بدلنا پڑتا ہے۔ ایسوسی ایشن سے قرض لے کر نئی جھونپڑی کے مالک کو ایڈوانس دینا پڑتا ہے۔ تم بے وقوف ہو! تمہاری جگہ کوئی دوسرا عقل مند ہوتا تو وہ فلیٹ لے لیتا۔ تم کیوں نہیں لے سکے۔ شاید درد مند بے وقوف ہی ہو سکتا ہے۔ اور تمہارے اندر تو سب کا درد سما گیا تھا۔ اُس درد کی یلغار نے تمہیں دل کے مرض میں مبتلا کر دیا۔

کرشن چندر بھی دل کے مریض ہیں۔ میں سوچتا ہوں انہیں جب اطلاع ملی ہوگی تو ان کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی۔

ایک بار کی بات ہے کہ تم بستر پر تھے۔ ڈاکٹر نے زینہ اترنے چڑھنے سے منع کر رکھا تھا۔ کرشن چندر انہی دنوں دل کے دورے سے گزرے تھے۔

تم بستر پر اُن کے لئے پریشان تھے۔ اور وہ اپنے گھر میں تمہارے لئے۔ تمہاری چھبرا بلڈنگ کے نیچے ٹیکسی کا ہارن بجا میں نے نیچے جھانکا کرشن چندر ٹیکسی کے پاس کھڑے تھے۔

کیا حال ہے مہندر کا "—؟ اُن کا سوال تھا۔

تم اُن کی آواز سُن کر کھڑکی تک سرک آئے تھے۔ تم نے پوچھا تھا۔

بھائی صاحب آپ کیسے ہیں —؟"

میں تو ٹھیک ہوں۔ بھائی! زینہ چڑھنا منع ہے۔

میں بالکل ٹھیک ہوں ابھی زینہ اترنا بھی ڈاکٹر نے بند کر رکھا ہے۔

میں تمہیں دیکھنے آ گیا تھا۔ کرشن جی نے کہا۔

آپ جا کر آرام کیجئے۔ میں تندرست ہوں۔ آپ اب مت آئیے گا میں آؤں گا۔

کرشن جی نے کہا تھا۔ نہیں میں آؤں گا۔

درگاہ بھابی نیچے بھاگ گئی تھی۔ اور کرشن چندر جی درگا سے بات کر کے چلے گئے تھے۔

دو ادیب! — نہیں دو بھائی! — دو دل کے مریض ایک دوسرے کی مزاج پرسی کر کے چلے گئے۔

میں گم سم تمہارے پاس بیٹھا سوچتا رہا کہ اگر خدا نخواستہ کسی ایک کو کچھ ہو گیا تو دوسرے کا کیا بنے گا۔

آج بھی گم سُم ہوں، مہندر کل رات سے گم سُم ہوں ۔ جانتے ہو۔ کل رات کو تمہارے مرنے کی خبر پا کر بھی میں ڈر گیا تھا۔ کسی نے سچ کہا ہے نیند تو پھانسی کے تختے پر بھی پیچھا نہیں چھوڑتی ۔

سوتے میں ایک سپنا دیکھا تمہاری لاش اسی جگہ رکھی ہے۔ کفن کی بجائے لال ٹاٹ میں لپٹی ہوئی ہے۔ لیکن تم اکیلے نہیں ہو تین لاشیں رکھی ہیں ۔ یہ دو کون ہیں۔ میں نہیں جانتا۔ میں نے صبح ہسپتال سے تمہاری لاش لانے سے پہلے مدھوسدن کو یہ سپنا سنایا تھا۔ وہ تھوڑی دیر میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر بولا تم بڑے وہمی ہو۔"

"آدمی تو وہمی ہوتا ہی ہے۔ اُسے وسوسے گھیرے رہتے ہیں۔" لیکن مہندر تم وہمی نہیں تھے۔ تم تو حقیقت سے بھی کبھی کبھی عذر کر جاتے تھے۔ مجھے یاد ہے ایک بار پنڈت بیج ناتھ تمہارے گھر آئے تھے۔ اُن دنوں فلم انڈسٹری والے پنڈت بیج ناتھ کو مہاتما۔ یوگی جوتشی جانے کیا کیا مانتے تھے۔ دادا مُنی تو آج تک مانتے ہیں۔ پنڈت بیج ناتھ نے تمہاری زندگی کے ماضی کو کھنگالا اور مستقبل کا بلیو پرنٹ تمہیں دکھایا وہ یوں بول رہے جیسے اُنکے سوالات اور جوابات غیب سے چلے آ رہے ہوں ۔ تم نے کہا یہ سب ہوکس پوکس ہے۔

میں نہیں مانتا۔ تب بیج ناتھ جلال میں آ کر بولے تمہاری جیب میں اسوقت کل تیس روپے چار آنے ہیں۔ اگر یقین نہ ہو تو گن لو۔ تم نے نکال کر گنے۔ تو پورے تیس روپے چار آنے تھے۔ ہم سب نے پنڈت جی کے چرن چھو لئے۔ لیکن تم نے ہنس کر کہا یہ اتفاق ہے میں ایسی باتوں کو ماننے والا نہیں ہوں ۔ جائیے پیو۔ عیش مارو۔ زندگی میں سب کو خوشی بانٹ سکو تو بانٹو۔ سکھی کر سکو تو سکھی کرو۔ میں تمہیں ایک مہان آدمی مان لوں گا۔ ان سب معجزوں کی میرے ہاں کوئی قیمت نہیں ہے ۔"

میں حیران ہو کر تمہیں دیکھتا رہا۔ تم جس مٹی کے آدمی ہو۔ اتنا بڑا معجزہ دیکھ کر بھی تمہارے دل میں اُس کے لئے کوئی عقیدت پیدا نہیں ہوئی۔

تم نے ہنس کر کہا تھا کہ میں بڑھیا کہانی لکھتا ہوں۔ اُسے پڑھ کر اگر کسی کے دل میں عقیدت پیدا نہیں ہوتی تو ایسی بے عقل باتوں پر میں عقیدت کیسے ہو سکتی ہے ۔ کاوش! ہم لوگ لکھتے ہیں Nothingness سے Create کرتے ہیں ادب کی تخلیق سب سے بڑا معجزہ ہے۔ سب سے بڑا چمتکار ہے۔ MIRICAL ہے۔ ان کے دل میں ہمارے لئے عقیدت ہونی چاہیئے ۔"

شاید تم نے پنڈت بیج ناتھ پر ایک کہانی بھی لکھی ۔ اُس کا عنوان یاد نہیں رہا۔

کل رات جب بیٹھی تو میں اور مدھوسدن ۔ ہم دونوں اندھیری کی طرف جا رہے تھے ۔ سورج کی کرن پھوٹ نکلی تھی۔ لیکن ہم دونوں اندھیرے میں ہی گھرے ہوئے تھے۔ میں نے مدھوسدن سے پوچھا گھر میں درگا بھابی کے پاس روپے پیسے تو ہوں گے۔ کفن دفن کے لئے۔ اور پھر خود ہی سوچنے لگا ۔ تمہارے دُکھ سے اُبھر کر میں زندگی کے طوفان میں کیسے پہنچ گیا۔ — لوکل ریل گاڑی گھسیٹ رہی تھی۔ پٹریاں چیخ رہی تھیں ۔ لوگ دھکا پیل کر رہے تھے ۔ تمہارے افسانوں کے رات پالی کرنے والے کردار واپس آ رہے تھے ۔ اور دن کی پالی کرنے والے سرمایہ دار کی مل میں محنت کا ایندھن بننے کے لئے بھاگے جا رہے تھے ۔ سب اپنی اپنی دھن میں تھے۔ ہماری طرف کسی نے نہیں دیکھا۔ دیکھتے کیسے اُنہیں کیا معلوم تھا کہ ہندوستان کا ایک عظیم فن کار جو اُن کے دُکھ سکھ کو محسوس کرتا تھا اُن کے بارے میں لکھتا تھا وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ چیخ چیخ کر کہوں ہڑتال کر دو۔ گاڑیاں روک دو۔ ملیں بند کر دو ۔ آج فلم انڈسٹری تو بند ہونی ہی چاہیئے ۔ مہندر ناتھ فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کا جنرل سکریٹری تھا۔ دس بارہ برس سے وہ لگاتار سکریٹری بنتا چلا آ رہا ہے ۔ سنے ورکرز فیڈریشن سے بھی گہرا تعلق ہے ۔ میں نے مدھوسدن سے کہا کہ آج اسٹوڈیوز

بند ہونگے؟ اُسنے کہا نہیں، تب میں نے سوال کیا تھا کہ اگر اِمپا کا سکریٹری مہندر ناتھ ہوتا تب تو ہڑتال ہوتی۔ مدھوسدن نے کہا تب تو قطعی نہیں ہوتی۔ کیونکہ اِمپا کا سکریٹری تنخواہ پاتا ہے۔ پیسہ لیتا ہے۔ تب کیسے ہو سکتی تھی۔ اور یہ آنریری تھا۔

میں چپ ہو گیا تھا۔ مدھوسدن سے کون بحث کر سکتا ہے۔ بڑی مدلّل بات کرتا ہے۔ لاجیکل برین کا آدمی ہے۔ تم کہتے تھے۔ یہ پروگریسو ہے۔ مخلص ہے۔ دوست ہے۔ لیکن اس کا اڑنا بہت خطرناک بات ہے۔ کسی بات پر اڑ جائے تو ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ دیانت دار ہے مگر پریکٹیکل نہیں ہے۔

ٹیکسی ورسوا کی طرف جا رہی تھی ہم دونوں چپ تھے۔ مدھوسدن بھی اندر ہی اندر کچھ تانے بانے بُن رہا ہوگا۔ تمہارا پرانا یار ہے مجھ سے بھی پرانا۔ میں بھی من ہی من سوچ رہا ہوں۔ خیالات گڈمڈ ہو رہے ہیں۔ ایک بات اپنے ذہن میں بری طرح اٹک گئی ہے کرشن جی آئیں گے تو ان کو خبر کون دے گا۔

جہاز گیارہ بجے آنے والا ہے۔

کل رات جب ہم نکلے تھے تو دادر سو گیا تھا۔ چھپرا بلڈنگ روتے روتے نڈھال ہو گئی تھی۔ بے بسی کی چپ لگ گئی تھی اُسے۔ اور اب دادر کی سڑکیں بھر گئی ہیں۔ ہوٹلوں میں چائے پینے والے جمع ہیں۔ ہمیں چائے کی طلب نہیں ہو رہی۔ شری ساؤنڈ اسٹوڈیو کے آگے لوگوں کی ٹولیاں کھڑی ہیں۔ تمہارا ذکر چل رہا ہے۔

چھپرا بلڈنگ کے فٹ پاتھ پر لوگ کھڑے ہیں۔ عزیز قیسی کے منہ پر درد کی سیاہی ہے۔ وہ سگریٹ سلگا کر مجھ سے پوچھ رہے ہیں۔ فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کا کیا ہوگا؟ میری اُنگلی آسمان کی طرف اُٹھ جاتی ہے۔ آسمان نیلا ہے۔ شفاف ہے۔ لیکن دل کے اندر بڑے گہرے بادل منڈلا رہے ہیں۔ جو نہ برستے ہیں نہ چھٹتے ہیں، ساحر لدھیانوی بالکل چپ ہے، اُس کا ایک ہاتھ کمر پہ ہے۔ گردے کے درد کے مریض ہیں۔ درد کو دبا رکھا ہے۔ اُنہوں نے سگریٹ کا پیکٹ نکالا ہے۔ آدھا سگریٹ توڑ کر پیکٹ میں ڈال دیا ہے اور پھر سگریٹ میری طرف بڑھا دیا ہے۔ ہم دونوں چپ ہیں۔ میں سگریٹ لے لیتا ہوں۔ سگریٹ پینے کی مجھے عادت نہیں ہے۔ تمہیں تھی مہندر۔ لیکن تم نے بھی سگریٹ چھوڑ دی تھی۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ دل کے مریض کے لئے سگریٹ شراب سے خطرناک ہے۔ بہت بُری چیز ہے یہ سگریٹ۔ میں نے سگریٹ لے لیا ہے۔ اچھا برا کچھ ہوتا نہیں۔ آگے زندگی میں کیا اچھائی ہو رہی ہے۔ دیش میں کیا اچھا ہے۔ نظام کہاں اچھا ہے۔ ہمارے حالات کہاں اچھے ہیں۔ جیتا وہ چاہتے ہیں جو خوشحال ہوں۔ زندگی جنہیں ایک مزہ دے رہی ہے یہاں کیا ہے ذمہ داریاں بہت ہے۔ حقوق کوئی نہیں۔ جو لوگ ذمہ داریاں پوری نہیں کرتے وہ سکھی ہوں گے ...... وہ جئیں۔ یہاں تو ذمہ داریوں کے سہارے ملک میں دم ہے۔ اُن سے فرصت ملے تو حقوق کی حفاظت کے لئے کشمکش کریں۔ مگر ذمہ داریوں سے فرصت نہیں۔ ایک عجیب بات میری سمجھ میں آ رہی ہے۔ ہمارے دیش میں ڈیموکریسی ہے۔ جمہوریت ہے۔ گن تنتر راج کے ہم سدیہ ہیں۔ ہمیں بولنے کی لکھنے کی۔ تنقید کرنے کی آزادی ہے۔ یہ ہمارا بنیادی حق ہے۔ لیکن یار آدمی سوچے گا تو بولے گا۔ لکھے گا۔ تنقید کرے گا۔

یہاں تو ہم لوگ روٹی کپڑے اور مکان کے چکر میں ایسے اُلجھے ہوئے ہیں کہ سوچنے کی فرصت ہی نہیں۔ بولیں گے کیا خاک۔!! حالات نے ناطقہ بند کر رکھا ہے۔ سب کا۔ اس بنیادی حق کا فائدہ کیا۔ ساحر کچھ سوچ رہا ہے۔ میں نے سگریٹ سلگا لیا ہے۔ ایک لمبا کش کھینچتا ہوں۔ کھانسی اُٹھ آئی ہے۔ ساحر نے میری طرف دیکھا ہے۔ اور اُس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا ہے ہاتھ کے مس ہوتے ہی میرے اندر کچھ پگھلنے لگا ہے بادل برسنے کے لئے بوجھل ہوتے جا رہے ہیں۔ شاید رات کے تھمے ہوئے بادل اب برسیں گے۔ ایک موٹر گاڑی آ کر قریب میں رُکی ہے۔ شیام کرشن نگم گاڑی سے اُترے ہیں۔ میں اُن کی طرف دوڑ جاتا ہوں۔

احساس کا حملہ شدید ہے۔ اس مقام سے فرار ہی بہتر ہے۔ تم پوچھ رہے ہیں گھر لاؤ گے یا ہسپتال سے ہی لے جاؤ گے۔
ہم لوگ کرشن جی کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ آئیں گے تب گھر لے آئیں گے۔ وہ کہتے ہیں میں ایرپورٹ جا رہا ہوں جہاز وقت پر آ رہا ہے۔"

مدھوسودن۔ جیون پرکاش۔ پروفیسر پریتم بیلی تمہیں لینے کے لئے اسپتال کی طرف چل دیئے۔

میں نیچے تمہارے کمرے کے عین نیچے فٹ پاتھ پر بچھی چارپائی پر بیٹھ جاتا ہوں۔ جاں نثار اختر کھڑے ہیں۔ سامنے کا فٹ پاتھ دھوپ سے بھر گیا ہے۔ سب لوگ بلڈنگ کے آگے والے فٹ پاتھ پر آ گئے ہیں۔ ساحر وہیں کھڑا ہے دھوپ میں رنگین صاحب آئے ہیں۔ ان کے ساتھ راما نند ساگر کا چھوٹا بھائی پتر نجن بھی ہے۔ وہ لندن سے دو چار دن پہلے ہی آیا ہے۔ تمہارا دوست ہے۔ تمہیں ملنے آیا ہے۔ زندہ ہوتے تو تم اُس سے کتنی باتیں کرتے۔ اب کون بات کریگا۔ وہ بھی چپ ہے۔ کوئی بات نہیں کر رہا ہے۔ لیکن شور بہت ہے۔

میں نے جاں نثار کو چارپائی پر بٹھا دیا ہے۔ ساحر کے پاس میں گیا ہوں۔ اُس سے کہا ہے دھوپ ہے یہاں آ جاؤ چارپائی پر۔ وہ کہتا ہے ٹھیک ہے۔ یہاں ہی ٹھیک ہے۔

کچھ عورتیں اوپر جا رہی ہیں۔ سلمیٰ بھابی کے پیچھے پیچھے مسز بیدی بھی اوپر گئی ہیں۔

میں تمہارے انتظار میں ہوں تم کب آؤ گے۔

لیکن مہندر تھوڑی دیر کے بعد میں اُکتا گیا۔ "الانتظار فی الموت" کا عربی مقولہ دماغ میں گھوم جاتا ہے۔ انتظار بڑی بلا ہے۔ معشوق کا ہو۔ دوست کا ہو۔ زندگی کی ہو یا موت کا۔ تم مر گئے ہو مجھے خیال آیا۔ اور لوگ تمہاری لاش کو لینے گئے ہیں۔ اب تم نہیں آؤ گے۔ تمہاری لاش آئے گی۔ مجھے یاد آیا تمہیں لائیں گے کیسے مردہ خانے میں سب لاشیں ننگی رہتی ہیں۔ تمہیں لانے کے لئے دو چادروں کی ضرورت ہو گی۔ ایمبولینس میں لپیٹ کر رکھیں گے۔ کسی کو چادروں کا دھیان ہے یا نہیں پتہ نہیں۔ میں ہسپتال کی طرف چلنے لگا اور پریل کی طرف۔

دماغ کہہ رہا ہے غم کے غار سے نکلنے کے لئے ایک راستہ یہ بھی ہے کہ اپنے آپ کو کام میں الجھا لو۔

پونم آیا ہے وہ منہ لسورے فٹ پاتھ پر آ کر کھڑا ہو گیا ہے۔ تم اس کی بڑی مدد کرتے تھے نا اور کہتے تھے ——

ایمو سی ایشن ہم نے چھوٹے ادیبوں کے لئے بنائی۔ کامیاب ادیبوں کو تو اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ پونم کا نام تم نے اپنی ڈائرکٹری کمیٹی میں بھی شامل کیا تھا تاکہ اس کی کچھ مدد ہو سکے۔ مدد تو تم سب کی کرتے تھے۔ لوگ آ جاتے تھے تم اپنے بنک میں کہیں نہ کہیں سے لا کر رکھ دیتے تھے۔ اور پھر لوگ لے جاتے تھے۔ واپس دے جاتے تھے کبھی نہیں بھی دیتے تھے مگر تم شکایت کبھی نہیں کرتے تھے کہ فلاں لے گیا دے نہیں گیا۔ ہم جیسے لوگ، تو دو پیسے دے کر بھی سخاوت کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں۔ یہ عجیب بات ہے مہندر۔ آدمی جب نہیں رہتا تو اُس کی ساری خوبیاں اُجاگر ہونے لگتی ہیں۔ جیسے اندھیری رات میں کوئی مشعل جل اُٹھتی ہے۔ اور جب تک رہتا ہے۔ اُس میں خاصیت نظر نہیں آتی۔ چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا نہیں بلکہ گہرا چھایا رہتا ہے۔ بیچ بیچ میں کبھی کوئی کرن چمک کر غائب ہو جاتی ہے۔

ہسپتال کے دروازے پر معلوم ہوا کہ ابھی ایمبولنس نہیں آئی ہے۔ ہم لوگ، چادریں خریدنے چلے گئے۔ بیکار بات ہو گئی ہے۔ تم کہتے تھے زندگی کی ضروریات مفت ملنی چاہئیں، ہمارے ولنٹیئر نے سوشلزم کا نعرہ لگایا ہے۔ مفت نہیں تو سستی ہونی چاہئیں۔ مدھوسودن روپے دے رہا ہے۔ جیون پرکاش نے کفن نکال کر رکھے ہیں۔ میں نے کہا تھا۔ ایک آدمی

خرچ کرے یہ روپے سب کرشن جی دیں گے یا درگا دے گی۔ ایسی رسم ہے کہ تجہیز و تکفین پر گھر والے خرچ کرتے ہیں۔ نہیں تو لاوارث کی تہمت لگتی ہے۔ تم لاوارث نہیں ہو۔ میں درگا بھابی سے کہا کرتا تھا۔ ایسوسی ایشن کے جتنے ممبر مہندر سے چھوٹے ہیں وہ سب تمہارے بچے ہیں۔ اور جتنے بڑے ہیں تمہارے جیٹھ ہیں۔

شو دا ہی (ایمبولینس ابھی تک نہیں آئی۔

ایک پرائیویٹ ایمبولینس آکر کھڑی ہو گئی ہے۔ ایمبولینس والا اپریل سے دادر تک کے ساٹھ روپے مانگ رہا ہے۔ مردہ خانے کا رکن کہہ رہا ہے۔ لے لیجئے آرتھر روڈ سے سرکاری ایمبولینس ملا ہے۔ (ایمبولینس) پہلے کب آتے ہیں۔

باہر دروازے کے قریب ایک موٹر رکنے کی آواز آئی ہے جیون پرکاش نے اُچک کر دیکھا اور بولا HORESS CROPS آگیا ہے۔

پرائیویٹ ایمبولینس والا سر جھکا کر چلا گیا۔ اور مردہ خانے کے انچارج نے جیون پرکاش کے ہاتھ سے کاغذات لے کر رجسٹر کی خانہ پُری شروع کر دی ہے۔ یہاں پر عجیب ہیبت طاری ہے لوگ چل پھر رہے ہیں۔ لیکن لاشوں کی طرح۔ انچارج کے پیچھے ایک لکڑی کا بڑا سا پنجرہ ہے۔ اُس میں ایک بندر بند ہے۔ بندر زندہ ہے لیکن وہ بھی ڈرا ہوا ہے سہما ہوا ہے چپ چاپ بیٹھا ہوا۔ بندر کو میں نے کبھی ساکت نہیں دیکھا۔ وہ اُچھل کود کرتا ہی رہتا ہے۔ لیکن یہ بندر بے حرکت ہے۔ بہت سست ہے۔ بیچ بیچ نظر گھما کر دیکھتا ہے۔ ہماری طرف اور پھر گردن جھکا لیتا ہے۔ اور پھر میں سوچنے لگتا ہوں۔ اندر اتنی لاشیں پڑی ہیں۔ یہاں آدمی تنہا کیسے بیٹھتا ہوگا۔

انچارج نے ایک ٹکٹ تھما دیا ہے اور مردہ خانے کے وارڈ بوائے نے چابیوں کا گچھا میز پر سے اُٹھا لیا ہے۔ ہمیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا ہے۔ مدھوسودن آگے نہیں بڑھ رہا ہے۔ وہیں رک گیا ہے۔ وہ بہت حساس فن کار ہے۔ تم کہتے تھے اُس کا جمالیاتی ذوق بڑا نازک ہے اُس کے سامنے اگر کوئی بے ترتیبی سے کھانا بھی کھائے تو وہ اپنا کھانا چھوڑ کر میز سے اُٹھ جاتا ہے۔ تم نے اس کے کمرے کو دیکھا نہیں کتنی بڑے سلیقے سے رہتا ہے، شادی بھی اس لئے نہیں کرتا ہے کہ خدا جانے کوئی بد سلیقہ بیوی پلے پڑ گئی تو زندگی اجیرن ہو جائے گی۔

مدھوسودن کہتا ہے۔ AESTHETIC کے مناسب VOULGAR ہے جو گندا ہے وہی فحش ہے۔ اور جو سُندر ہے وہ شو ہے۔ شو کا مطلب ہوتا ہے۔ مفید کلیاں کاری۔ مدھوسودن کا خیال ہے۔ نہیں اُسے ڈر ہے کہ تمہارے سندر۔ خوبصورت جسم کے ساتھ اُنہوں نے جانے کیا سلوک کیا ہوگا۔

میں نے مدھوسودن سے کہا تم جاؤ۔ مہندر کا کمرہ خالی کرانا ہوگا۔ اور وہ کہہ رہا ہے میں آگے جاتا ہوں۔ یہ سب مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔ وہ چلا گیا ہے۔ اور میں دل میں کہہ رہا ہوں آگے جس کو جانا تھا وہ چلا گیا۔ اب تو سب پیچھے ہی جائیں گے۔

مُردہ خانے کے وارڈ کے تالے کھُل گئے ہیں۔ سرد خانے کی مشین کھٹ کھٹ چل رہی ہے۔ بہت سے لوگ یہاں ننگے دھڑنگے سو رہے ہیں۔ ادھوری اور ناکام زندگی کو پورا کر کے۔ تم اُن کے درمیان پڑے ہو۔ یہاں پلنگ نہیں ہیں۔ خانے بنے ہوئے ہیں۔ میں نے تمہیں دیکھا۔ پہچانا۔ اشارہ کیا یہی ہیں۔ اُس نے کارڈ کا نمبر دیکھا اور پھر لوہے کا اسٹریچر کھینچ لیا۔ تم دیوار سے ہٹ کر میرے قریب آگئے۔ جانے مجھے کیا ہوا۔ کہ تمباکو کھانے کی طلب ہوئی۔ میں نے جیب سے ڈبیا نکالی اور پھانک لیا۔ مُنہ میں کڑواہٹ کھُل گئی ہے۔ تلخی کو تلخی مار دیتی ہے نا۔

پچھلی طرف کا دروازہ کھول دیا گیا بڑا پھاٹک کار دار اسٹوڈیو کی طرف کا۔ ہم نے تمہیں چادر میں لپیٹ لیا ہے۔ تمہارا جسم واقعی خوبصورت ہے۔ چہرے پر مسکان ہے۔ مدھوسودن نے کہا تھا کہ ہسپتال کا ڈاکٹر کہتا ہے اس آدمی کا BODY بڑا

proportion میں ہے۔ میں کہتا ہوں اُس کی زندگی بھی بڑی پرپوشن میں تھی۔ تعلقات میں مناسبت، گھر میں مناسبت لکھنے میں مناسبت، تناسب ہی اُس کی زندگی کا مقصد تھا۔

جیون پرکاش اور میں دونوں شواہنی میں تمہارے ساتھ ہیں۔ کے۔ ای۔ ایم ہسپتال سے دادر تک جانا ہے۔ شواہنی جا رہا ہے۔ تمہارا جسم اُچھلتا ہے۔ میں تمہاری طرف نہیں دیکھتا

کرشن چندر گاڑی سے اُترے ہیں۔ عباس نے اُن کو سہارا دیا ہے۔ وہ خواجہ احمد عباس کے گلے لگ کر پھوٹ پڑے ہیں۔ سب لوگ ان کے گرد اکٹھے ہو گئے ہیں۔ میں دور کھڑا ہوں۔ میری آنکھ میں کوئی آنسو نہیں۔

تم اُس جگہ فرش پر پڑے ہو جہاں تمہارا پلنگ بچھا رہتا تھا۔ اب تم زمین پر ہو۔ کمرے میں کچھ نہیں ہے سامان باہر نکال دیا گیا ہے۔ تم ہو اور میں ہوں۔ بھابی دھاڑیں مار کر رو رہی ہے۔ وہ عورتوں کے ساتھ آئی ہے۔ میری تمہارے ساتھ سب باتیں ادھوری رہ گئیں۔ میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ دوڑ کر تم سے لپٹ گئی۔ تمہارے ساتھ جسے اُس نے پیار کیا تھا۔ اچھا مہندر تم اپنی درگا سے مل لو میں باہر جاتا ہوں۔ اُس بے چاری کو بات کرنے کا موقع کب ملتا تھا۔ سارا دن تم دوستوں کے بیچ گھرے رہتے تھے۔ موت کو بھی تمہیں فرصت نہیں ملتی تھی۔ میں نے دروازے کے پاس سے تمہیں پھر مڑ کر دیکھا شاید تم بیٹھنے کو کہو گے۔ لیکن سوائے بھابی کے زور سے رونے کی کوئی آواز نہیں آ رہی۔ میں مڑ کر زینہ اتر رہا ہوں اور رونے کی آوازیں میرا پیچھا کر رہی ہیں۔

ڈی پی موریا تمہارے فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کا سکریٹری کہہ رہا ہے میں پھول لینے جا رہا ہوں۔ ہار بھی لاؤں گا۔

پنڈت مکھ رام شرما کہہ رہے ہیں۔ ایسوسی ایشن کے ممبروں کے لئے پھول لے کر آنا موریا شردھانجلی دینی ہوگی۔

مدھوسدن کہتا ہے:۔ میں آگے جاتا ہوں شمشان میں وہیں ملوں گا۔ وہاں کا بھی انتظام کرنا ہوگا۔ میں اُس کی طرف دیکھتا رہ جاتا ہوں اور وہ چلا جاتا ہے۔

رنجن اور رام مورتی چترویدی کو میں نے تمہارے سفر کا سامان لینے بھیجا ہے۔

کرشن چندر اوپر جا رہے ہیں سب نے اُن کو سہارا دے رکھا ہے۔ عباس۔ ساحر سب ساتھ ہیں۔ میں نیچے ہی کھڑا ہوں۔ یہ سب تمہارے کمیونسٹ یار ہیں۔ کبھی تم ترقی پسند مصنفین کے بھی سکریٹری تھے۔ عزیز قیسی بھی اوپر چلے گئے ہیں اکیلا نیچے کھڑا ہوں سنے ورکرز فیڈریشن کے تمہارے ساتھی بھی آ گئے ہیں۔

کپور اپنے کمرے میں ہے۔ وہ کبھی کبھی بڑے زور سے رونے لگتا ہے۔ اُس کی آواز نیچے بازار میں سنائی دیتی ہے۔ لوگ اُس کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ سمجھاتے ہیں اور کوئی دھمکاتا بھی ہے کہ اگر تم یہ سب کرو گے تو ہم تمہیں اسپتال میں چھوڑ آئیں گے۔ وہ ہسپتال نہیں جانا چاہتا۔ اُسے بلڈنگ کے بچے بڑے پیارے لگتے ہیں۔ بچوں کی ناک صاف کرتا تھا۔ چھی چھی دھلوا دیتا تھا۔ اُن کو صاف ستھرا کر کے کپڑے پہنا دیتا تھا۔ اپنے پیسے سے اُن کو چیجی دلوا دیتا۔ اسکول تک چھوڑنے جاتا تھا اور اگر کسی بچے کی ماں نے بچہ پر ہاتھ اٹھا دیا تو اس کی کمبختی آ جاتی تھی۔ کپور صاحب آستین چڑھا کر لڑنے کو دوڑتے تھے۔ تم کپور کو سمجھایا کرتے تھے کہ بھئی۔ ماں بچے کو مارتی بھی ہے۔ تو کپور تم سے بھی منہ سُوا کر لیتا۔ بلڈنگ کی مائیں اپنے بچوں سے بے فکر تھیں۔ کپور بچوں کی دادی اماں بن گیا تھا بچے بیمار ہوتے تو کپور صاحب کے بستر پر سوتے تھے۔ دوا بھی کپور صاحب لاتے

غذا ابھی کپور صاحب دیتے۔ وہ اب ان بچوں کو چھوڑ کر اسپتال کیسے چلے جائیں گے۔ اور کپور صاحب اندر روئیں گے کیوں نہیں۔ اِک عمر کا ساتھی چھوٹا ہے۔

وہ اب چپ ہو گیا ہے۔ ڈائرکٹر سُریندر کول اُوپر سے نیچے آگئے ہیں۔ وہ کہہ رہے ہیں کپور کو غم ہو گیا ہے۔ میں چپ ہوں۔ سریندر نے بیڑی سلگائی ہے۔

میں نالی کے کنارے تمہاری چھبرا بلڈنگ کے دروازے پر بیٹھ گیا ہوں۔ جگہ بہت گندی ہے سریندر بھی شہری ساؤنڈ کی طرف بڑھ گیا ہے۔ سب چلے گئے ہیں۔ کچھ اوپر گئے ہیں۔ کچھ آگے بندوبست کرنے گئے۔ میں یہاں بیٹھا ہوں۔ اکیلا ہوں۔ اندر سے بالکل اکیلا۔

میں سوچتا ہوں تمہارے پاس روپیہ تو ہونا چاہیئے۔ ابھی تم نے ڈاکو منٹری بنا کر دی ہے۔ لیکن مدھوسدن کہتا ہے۔ اُس کے پاس کچھ نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو مجھے کیوں کہتا درگا کا دھیان رکھنا۔''

دھوپ اب اس طرف بڑھ رہی ہے۔ چھبرا بلڈنگ کے آگے والی نالی پر دھوپ آچکی ہے۔ وقت بیت رہا ہے۔ سامان لے کر نہیں آئے۔

ایک ٹیکسی رُکی ہے رام مورتی آگیا ہے۔ ٹیکسی پر سے بالسی اور کھپچیاں اتاری جا رہی ہیں۔

موریا ابھی تک پھول لے کر نہیں آیا۔ آج تمہیں میں دولہا بنانا چاہتا ہوں۔ تم نے ترقی پسندانہ شادی کی تھی۔ نہ بینڈ نہ باجا نہ سہرا نہ گھوڑی۔ تمہیں مہندی بھی نہیں لگائی گئی تھی۔ آج میں اُس میں کچھ رسمیں تو ضرور پوری کروں گا۔ تم دولہا بنوگے۔ دوست آج بول نہیں سکتے۔ بنا کے چھوڑوں گا۔

رام مورتی پوچھتا ہے کیا ہوا! ـــ ؟

موریا نہیں آیا ابھی تک ـــ ؟ رام مورتی بالسن جوڑنے بیٹھ گیا ہے۔ اور موریا ـــ موریا کی طرفداری تم بہت کرتے تھے۔ یاد ہے ایک دن رائٹر ممبر نے شکایت کی تھی کہ اسّی روپے کی ردّی تمہارے آفس والوں نے بیچ کھائی ہے۔ میں بیٹھا ہوا تھا۔ تمہاری طرف دیکھا اور پھر تم اُس رائٹر کے گلے پڑ گئے تھے۔ تم لوگ کسی کو سُکھی دیکھ ہی نہیں سکتے۔ سب کی شکایتیں کرتے ہو۔ دفتر میں اوّل تو کوئی بے ایمان ہو ہی نہیں اور اگر ہوتا ہے تو اُسے میرے نام لکھ دو ـــ ردّی بک گئی! ردّی آئی کہاں سے ـــ ؟

وہ آدمی شکایت کر کے چپ ہو گیا تھا۔ شرمندہ ہو رہا تھا۔ میری طرف اُس نے لجاجت سے دیکھا میں کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔ ناریل کے جھاڑ ہوا سے جھوم رہے تھے۔ وہ معافی مانگ کر چلا گیا۔ پھر تم نے میری طرف دیکھا تھا کہ میں اس پر کچھ رائے زنی کروں گا۔ میں نے کہا تھا کہ میرا تمہارا معاہدہ ہے مہندر۔ چیک پر۔ وو چر پہلے تم دستخط کروگے۔ پھر میں کروں گا۔ کیونکہ ایسوسی ایشن کی ذمہ داری تمہاری ہے۔ اور میرے بھروسے کی حفاظت بھی تمہارا کام ہے۔ ہاں جبکہ تم پر بھروسہ تھا۔ آج تم نے میرا بھروسہ توڑ دیا یار!۔

رام مورتی نے پھر پوچھا ہے۔ اشنان کرا دیا ـــ ؟

اب میں اوپر جانے کا ارادہ کرتا ہوں۔ چندر شیکھر اور منموہن کرشن دونوں نیچے آگئے ہیں۔ میرے پاس کھڑے ہیں۔ چندر شیکھر کہہ رہا ہے Death fund کی اسکیم کا کیا ہوا۔ اگر کوئی ایسوسی ایشن نہیں مانتی تو سِنے آرٹسٹ ایسوسی ایشن اور فلم رائٹرز ایسوسی ایشن مل کر Death fund بنا لیتے ہیں۔ میں نے ہاں کہیں

گردن ہلادی ہے۔

تمہیں یاد ہے ہم نے سوچا تھا۔ ہماری بیہودہ ایسوسی ایشن ہیں۔ اُن کے آٹھ ہزار ممبر ہیں جب کوئی ممبر کسی بھی ایسوسی ایشن کا بھگوان کے گھر چلا جائے تو اُس کے گھر والے کو ہر ممبر دو روپے دے اس طرح اُس کے گھر میں سولہ ہزار روپیہ پہنچ جائیگا تم نے ہنس کر کہا تھا کہ سولہ ہزار کے لئے تو لوگ خودکشی کرنے لگیں گے۔ میں نے کہا تھا کوئی نہیں کرے گا پیارے زندگی کو secure نہیں کر سکے۔ موت کو تو سیکیور کرلیں۔ اور پھر تم نے کہا تھا اسکیم بناؤ۔ وہ اسکیم یوں بنی تھی کہ ہر ایسوسی ایشن کا ممبر دس روپے پیشگی جمع کرادے۔ یہ پانچ آدمیوں کا Death sum کا ہمارے پاس جمع ہے۔ جیسے ہی کسی کے انتقال کی خبر آئے گی اُس کے گھر پر اُسی وقت سولہ ہزار روپیہ اُس کی ایسوسی ایشن کے توسط سے پہنچ جائے گا۔ ہماری ایسوسی ایشن نے فارم بنا کر اور اسکیم کو پاس کرکے فیڈریشن کے پاس بھیجا تھا لیکن یہ اسکیم منظور نہ ہو سکی تھی۔ سکریٹری صاحب نے کہا تھا یہ ممکن نہیں ہو سکتی۔ جو لوگ اپنی ایسوسی ایشن کا چندہ نہیں دے سکتے مرنے والے کے لئے دو روپے کہاں سے دیں گے۔ اور پھر ہماری ایسوسی ایشن نے ایک تجویز پاس کی تھی کہ جب کسی فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کے ممبر کا انتقال ہو اس کے گھر والوں کو فوراً پانچ سو کی رقم بھجوا دینی چاہیئے۔ لیکن مہندر پانچ سو سے کیا ہوتا ہے اگر وہ اسکیم پاس ہو گئی ہوتی تو اب درگا بھابی کے پاس سولہ ہزار روپے ہوتے لیکن خیر یار! یہ سپنا ہے۔ فلمی مزدوروں کی سیکوریٹی کا ایک نہ ایک دن تو پورا ہو ہی جائے گا۔

میں زینہ پار کرکے تمہارے کمرے میں پہنچا۔ تو دیکھا سب رو رہے ہیں۔ ابھی تک ان کے آنسو نہیں تھمے۔ میں نے کرشن جی کو تمہاری لاش پر سے اُٹھا لیا ہے۔ سب کو باہر جانے کے لئے کہا ہے کہ بھئی ذرا نہلا لینے دو۔ پھر آجانا۔

وشنو مہوترا بچھاڑیں کھا رہا ہے۔ میں اُسے چپ کرانے کی کوشش کرتا ہوں۔ وہ کہتا ہے۔ ارے نہیں کاوش جی! اب میں کس کے پاس آؤں گا۔ اپنا دکھڑا رونے۔ کون سُنے گا۔ مگر اب تو تم بھی نہیں سُن سکتے۔ مسکرا کیا رہے ہو تم — سچ کہہ رہا ہوں۔

سب باہر چلے گئے ہیں۔ ہم تمہیں نہلا رہے ہیں۔

پانی ڈالا جا رہا ہے۔ تولئے سے تمہارا منہ پونچھا جا رہا ہے۔ بدن صاف کیا جا رہا ہے۔

تمہارے دل پر ایک کالا سا نہیں۔ نیلا سا بڑا داغ سا بنا ہے۔

میں نے تمہارے نتھنوں سے روئی نکالی ہے۔ بڑی خراب لگ رہی تھی یار۔ ہاں اب ٹھیک ہے۔ اب خوبصورت لگ رہے ہو۔ کپڑے پہنانے کا مسئلہ درپیش ہے۔ تمہاری بلڈنگ کا ایک مسلمان اور ایک عیسائی نوجوان میرا ہاتھ بٹا رہے ہیں۔
تم نے کپڑے پہن لئے ہیں۔

ہاں اب تم تیار ہو گئے ہو۔ آخری سفر کے لئے۔

نیچے تمہاری سواری کا انتظام ہو رہا ہے۔

سارے لوگ مل کر بانس اور کھپچیوں کی پالکی بنا رہے ہیں۔

مہندر تم نے دیکھا۔ تمہارا ساحر بھی آیا ہے۔ تم اس سے ناراض تھے۔ اُس دن ایگزیکیٹو کمیٹی کی میٹنگ تھی تمہیں یاد ہے نا۔ ہم لوگ ایسوسی ایشن کے لئے فنکشن کرنے جا رہے تھے۔ ایک سوونیئر نکالنے کا پروگرام بنایا تھا۔ تم نے کہا جو سوونیئر کے لئے اشتہار لائے گا اُسے 5% فیصدی کمیشن ملے گی اور آنے جانے کے اخراجات بھی ملیں گے۔

ساحر ہمارا صدر تھا۔ اُس نے کہا تھا جو عہدیدار ہیں انہیں کچھ نہیں ملے گا۔ مجھے ساحر کی بات اچھی لگی تھی۔

تم نے مخالفت کی تھی۔ تم نے کہا تھا یہ غلط ہے۔ میں بھاگ نہیں سکتا۔ دوسرے لوگ جائیں گے نہیں۔ تو کام کون کریگا۔ ساحر کی بات رد ہو گئی تھی۔

میں نے تمہیں پھر کہا تھا۔ ہٹو لا۔ ساحر ٹھیک کہہ رہا ہے۔

تب تم نے جواب دیا تھا۔ اصول آدمی بناتا ہے آدمی کی بھلائی کے لئے۔ آدمی ہی نہیں رہے گا تو اصول کس کام آئیں گے پریکٹیکل بات یہ ہے کہ جو کام کرے گا۔ اُسے پیسہ ملیگا۔ ہمیں فنڈ چاہئیں غریب آدمیوں کی مدد کے لئے۔ کام بھی غریب ہی کریں گے۔ موٹروں والے ادیب اشتہار مانگنے نہیں جائیں گے۔ اپنی جیب سے روپے دیں گے۔

اُس دن میں نے سمجھا کہ تم بڑے پریکٹیکل آدمی ہو۔ میں نے تمہیں سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ ساحر کو تمہیں خوش رکھنا پڑے گا۔ گانے والے سنگیت کار اور اسٹار سب اُس کی مٹھی میں ہیں۔

تمہارے ماتھے پر شکن پڑ گئے تھے تم نے کہا تھا ساحر کی خوشی یا ایسوسی ایشن کی بھلائی ان میں ایک بات چن لو کاوش!

اور جس دن فنکشن تھا۔ اُس دن فون آ رہے تھے۔ تار آ رہے تھے اور جن کے نام مشتہر کئے تھے اُن کے پیغام بھی آ رہے تھے کہ ہم نہیں آ رہے۔ لوگوں میں مشہور ہو گیا تھا کہ بھرے مجمع میں مار پیٹ ہو گی۔ میں نروس ہو گیا تھا۔ تمہارا رنگ بدل رہا تھا۔ ہال میں پہنچے تو ٹکٹ بک چکے تھے۔ دوستوں نے صلاح دی ٹکٹوں کا روپیہ واپس کر دو۔ لیکن رام رکھ منہر نے کہا تھا آپ چنتا مت کیجئے میں سنبھال لوں گا۔ مجروح سلطانپوری۔ اختر الایمان نے مشاعرہ شروع کیا تھا۔ ہم نے پروگرام جم گیا تھا۔ ہال میں سب لوگ مزے لے رہے تھے۔ مگر انٹرول کے بعد تمہیں اختلاج ہونے لگا۔ تم بھابی کے ساتھ ہال سے چلے آئے تھے۔ رات کو دوبارہ تمہیں دیکھنے آیا۔ ٹھیک ہے مہندر! ایسوسی ایشن کو اس فنکشن میں بارہ ہزار روپیہ تو ملا لیکن کس قیمت پر ملا۔

آج وہی ساحر لدھیانوی آنکھوں میں آنسو لئے تمہارے پاس آیا ہے اور تم مسکرا رہے تھے۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے کہہ رہے ہو آؤ تمہارا راج!

میں نے کمرے کا دروازہ کھول دیا ہے۔ سوم ناتھ فیڈریشن کا آنس سکریٹری پھولوں کا ہار لے کر آیا ہے۔ تمہارے سنے ارے یہ ایک عورت سفید ساڑی میں آئی ہے۔ چہرے پر درد ہے۔ میں نے اسے کہیں دیکھا ہے۔ ہاں یاد آیا یہ تمہاری کہانی "جونکیں" کا کردار آشا۔ میں اسے غور سے دیکھ رہا ہوں میں نے پہچان لیا ہے۔ اس کا رنگ بالکل پیلا ہے۔ اس کے خاندان کی جونکیں اس کا سارا خون پی گئی ہیں۔ اس کا جسم کمہلا گیا ہے۔ اب کوئی آنند اس کو تار دیکر نہیں آئے گا۔ اسے بھی انتظار نہیں ہو گا —؟ یہ تو شاید اب بھی اُس کا انتظار کر رہی ہو گی۔ پتہ نہیں وہ لکڑی کے پتلے کی طرح جلتی ہوئی آئی ہے۔ اُس کے ہاتھ میں ایک بوتل ہے۔ تلسی کے کچھ پتے ہیں۔ مجھے کہہ رہی ہے گنگا جل منہ میں ڈال کر تلسی کے پتے منہ میں رکھ دیجئے۔

میں تمہاری طرف دیکھنے لگا ہوں۔ کہ تم کیا کہتے ہو۔ جو نہ دھرم کو مانتا تھا نہ خدا کو۔ لیکن تم انسانیت کو تو مانتے تھے۔ میں نے تلسی کا پتہ تمہارے منہ میں رکھ دیا ہے۔ گنگا جل دوں؟ لیکن وہ منہ سے باہر آ جائے گا۔ اندر کیسے جائیگا۔ تو بھی تم ادیب ہو انسان کے جذبات اور اُس کی بھاؤنا کو سمجھتے ہو۔ میں انکار نہیں کر سکتا۔ یہ تمہاری آشا ہے۔ تمہاری تخلیق ہے۔ تمہارا کردار ہے میں اس کی بات کیسے ٹال سکتا ہوں۔ میں نے گنگا جل تمہارے منہ ڈالا ہے۔ آشا نے اپنے سر پر پلو رکھا ہے۔ تمہارے چرن چھوئے ہیں۔ اور وہ غائب ہو گئی۔ اُس گنگا جل کی طرح جو میں نے ابھی ابھی تمہارے منہ میں ٹپکایا ہے۔

اب تمہیں نیچے اُٹھا کر لے کر آئے ہیں۔ تمہیں پالکی پر سوار کرا دیا گیا ہے۔ لوگ ہار چڑھا رہے ہیں۔ پھول نچھاور کر رہے ہیں۔ ساحر تمہارے لئے ڈھیر سا پھول لے کر آیا ہے۔

تمہاری پالکی اُٹھائی جارہی ہے۔ خواجہ احمد عباس، کرشن چندر، منموہن کرشن اور چندر شیکھر نے کندھوں پر اٹھالی ہے سب چپ ہیں۔ اللہ۔ بھگوان۔ رام کو کوئی یاد نہیں کر رہا ہے۔ خاموشی سے سب چلے جارہے ہیں۔ تمہاری پالکی کو ایمبولینس میں رکھ دیا گیا ہے۔ رنجن کے ہاتھ میں اگنی کنڈ ہے۔ میں تمہارے ساتھ بیٹھا ہوں ایمبولینس میں۔ ہم زندگی کی آخری منزل کی طرف جارہے ہیں

ایک دن ہم دونوں نے ایک ساتھ ایک ارتھی اٹھایا تھا۔ یاد ہے تمہیں، پربھاکر کی ارتھی۔ وہ ہمارا ممبر تھا اُس نے ایک اونچے مسلمان گھرانے میں شادی کی تھی۔ اُس کی بیوی فلم اسٹار تھی۔ اُس کی سالی بھی تو بڑی اسٹار تھی۔ پربھاکر کا ہارٹ فیل ہو گیا تھا۔ تمہیں اطلاع دی گئی۔ میں، تم۔ رام مورتی۔ چترویدی شستی بھوشن۔ اور جانے دو تین آدمی کون تھے۔ دوست ہی رہے ہوں گے۔ تمہاری طبیعت اُس دِن بھی خراب تھی۔ سب نے تمہیں منع کیا تھا۔ کہ تم مت جاؤ۔ تم نے کہا تھا۔ ہمارا ایک ممبر تھا پربھاکر۔ جاؤں گا کیونکہ اب نہ اُس کی بیوی اسٹار ہے اور نہ سالی کام کر رہی ہے۔ جانے وہاں کوئی ہوگا بھی یا نہیں۔

اور جب ہم باندرہ اُس کے گھر پہنچے تو کوئی نہیں تھا۔ میں نے تم نے اُسے نہلایا۔ کفن میں لپیٹ دیا۔ اُس کی بیوی اُس کی سالی سسر سب پہلی منزل کی بالکنی پر کھڑے دیدار کر رہے تھے۔ ہم نے ارتھی سجائی اور ایک گیس کی روشنی میں لے کر چل دیئے۔ جانی واکر بھی ہمارے ساتھ تھے۔

باندرہ ریلوے لائن کے پار شمشان ہے۔ رات کے سناٹے میں کُتے بھونک رہے تھے۔ لوکل گاڑیاں بند ہو چکی تھیں۔ جب ہم وہاں پہنچے تھے۔ راستے میں کندھا بدلنے کو بھی آدمی نہیں تھا۔ تھک گئے تھے ہم۔

رات کے دوسرے پہر میں ہم نے اس فلم ڈائرکٹر اور رائٹر کو چتا پر لٹا دیا اور پھر وہ فن کار چتا کی روشنی میں ہمیں نظر نہیں آیا۔ چتا کا شعلہ بن کر غائب ہوگیا تھا۔

شمشان کے کمپاؤنڈ میں پیپل کے پیڑ کے نیچے ہم لوگ بیٹھے تھے۔

تم نے پوچھا تھا۔ اس کی لو میرج تھی نا"۔؟

"ہاں۔" لو میرج تھی۔ میں نے جواب دیا تھا۔

وہ سب لوگ بالکنی میں کیوں کھڑے تھے۔ نیچے پربھاکر کی لاش کے پاس کیوں نہیں آئے۔؟

شاید اس لئے کہ وہ لوگ مسلمان ہیں۔ انہوں نے سوچا ہوگا ہندو چھوت چھات کرتے ہیں۔ اُس کی ارتھی کو ہمارا ہاتھ لگا.........؟

تم نے میری طرف تیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا تھا۔ تم بے وقوف ہو یا مجھے بے وقوف سمجھتے ہو؟

تمہارے تیور بدلے۔ میں تمہاری طرف ہی دیکھ رہا تھا کہ شعلوں کی تیز پرچھائیاں تمہارے چہرے پر کانپ رہی تھیں۔ تم نے ایک آہ بھر کر کہا تھا فلم کا ادیب ہو یا ڈائرکٹر کامیاب ہو تو اُس کی موت بھی سنور جاتی ہے۔ اور اگر ناکام ہو تو پربھاکر کی طرح ارتھی کا کندھا بدلنے والا بھی نہیں ملتا۔ پربھاکر کی چتا تو بجھ گئی۔ لیکن تمہارے اندر ایک شعلہ بھڑکتا رہا۔

تم نے ایک دن سوچا تھا۔ اور ریوتی سرن شرما سے مشورہ بھی کیا تھا کہ "میں جہاں رہتا ہوں" کہانی پر فلم بنانی چاہیئے۔ تم نے مجھے اُس کہانی کو پڑھنے کو بھی دیا تھا۔ مجھے وہ کہانی بہت اچھی لگی تھی اور میں نے مشورہ دیا کہ اگر کوئی فنانسر نہ ملے تو فلم فنانس کارپوریشن سے اس کے لئے روپیہ مل سکتا ہے۔ کرنجیا اور گجرال سے اس کے لئے بات کی جاسکتی ہے۔ تم کرانجیا سے کئی بار ملے۔ لیکن دوسری باتیں کر کے چلے آئے۔ "میں جہاں رہتا ہوں" کا ذکر تک نہیں کیا۔ گجرال سے ملے ادیبوں کے مکانوں کا ذکر کیا۔ تم نے اُن سے کہا تھا کہ آپ ہاؤسنگ منسٹر ہیں۔ ہماری ایسوسی ایشن کے ممبروں کے پاس رہنے کو مکان نہیں ہے،

انھوں نے وعدہ کیا تھا کہ میں مہاراشٹر گورنمنٹ سے کہہ کر ایک INTELECTUAL کالونی بنوا دیتا ہوں۔ سینٹر سے روپیہ دلوا دوں گا اور تم لوگ بیس سال میں وہ قرضہ اتار دینا لیکن وہ بات پوری نہ ہو سکی۔ اندر کمار گجرال ہاؤسنگ منسٹر سے انفارمیشن منسٹر ہو گئے اور مکانوں کا خواب پورا نہ ہو سکا۔ جہاں جو رہتا تھا وہیں رہتا رہا۔

مہاراشٹر ہاؤسنگ منسٹر سے خط و کتابت شروع کی۔ جواب نہیں ملا۔ ڈاکٹر رفیق زکریا کے پاس جانے کے لئے تمہیں مجبور کیا گیا۔ تم نے کہا بھائی صاحب کو بھیجیں گے۔

پھر میں نے کہا کہ تم دہلی جاؤ اور اندر کمار گجرال سے "میں جہاں رہتا ہوں" کی کہانی کی بات کرو۔۔ فنانس مل جائے تو فلم بناؤ اُس کو بھی تم ٹال گئے۔

ٹالتے کیوں نہیں بھائی۔ اُسے تم ذاتی کام مانتے تھے۔ اور ذاتی کام تم کر بھی نہیں سکتے۔ میں نے ایک دن کہا تھا تم اپنے لئے کچھ نہیں کروگے۔ اور جہاں رہتے ہو وہیں رہوگے۔ وہیں مروگے۔ تم مسکرا دیئے تھے۔ دیکھ لو میری بات سچ ثابت ہوئی نا۔

مگر بالکنی پر کھڑے ہو کر اوپر سے دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ اب میں یہ نہیں جانتا کہ تم کامیاب تھے یا ناکام۔

شو واہنی کے ڈرائیور نے بریک لگا دیا ہے۔ سامنے کا سگنل لال ہو گیا ہے۔ خطرے کا نشان۔ اب خطرہ کس بات کا ہے جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا ہے۔ ارے نہیں تم تو لال جھنڈے کے رکھوالے تھے نا۔ اس لئے لال نشان تمہارا سواگت کر رہا ہے شو واہنی رک گئی ہے۔ میرے خیالات بکھر گئے ہیں۔ جیسے آج تمہاری زندگی بکھر گئی ہے۔

نہیں زندگی کیسے بکھر سکتی ہے۔ وہ بکھرتا ہے۔ مگر تم آتما اور روح کے شاید قائل نہ تھے۔ مگر میں سوچ رہا ہوں یہ مادہ تو ابھی تھوڑی دیر میں بکھر جائے گا۔ چتا کے شعلے اسے راکھ بنا دیں گے۔

مگر مہندر تم بتا سکتے ہو۔ جب مکان کو آگ لگ جاتی ہے تو اُس مکان کا خلا کہاں جاتا ہے۔ مکان کے اوپر کی چھت بڑے آکاش کو الگ کر دیتی ہے۔ چھت مٹ گئی۔ مکان جل گیا تو وہ تو چھوٹا آکاش کہاں گیا وہ تو جلتا نہیں۔

ہندو فلسفی کہتے ہیں۔ چھوٹا آکاش بڑے آکاش میں مدغم ہو جاتا ہے۔ مکان کے اندر جو ہوا تھی وہ باہر چلنے والی ہوا کے ساتھ مل کر آگے کو بہنے لگتی ہے۔ ہوا تو ضائع نہیں ہوتی۔ مرتی بھی نہیں۔ چلنا اُس کی فطرت ہے۔ وہ چلتی ہے اُس کا سفر ختم نہیں ہوتا زندگی کا سفر بھی ایسا نہیں ہے کیا۔ ؟

زندگی ایک ندی ہے۔ اُس کے دو کنارے ہیں۔ آدمی ایک کنارے ڈوبتا ہے دوسرے کنارے پر اُبھر آتا ہے لیکن کہاں ابھرے گا یہ کوئی نہیں جانتا کیونکہ کنارہ بہت وسیع ہے۔ حدِ نظر سے بھی زیادہ اُس کا پھیلاؤ ہے۔ نظر اُس کا احاطہ نہیں کر پاتی۔ اس لئے ہم تم یا کوئی دوسرا موت کے بعد زندگی کا قائل نہیں۔ لیکن پیارے ماننے یا نہ ماننے سے فطرت کا نظام نہیں بدل سکتا وہ چلتا رہتا ہے۔ وہ دیکھو!۔

سگنل کے ٹھہراؤ کا وقفہ بیت گیا ہے۔ ہری روشنی چمکنے لگی ہے۔ مگر بڑی دھندلی ہے۔ ہم نے سگنل کو پار کر لیا ہے۔

یہ شمشان گھاٹ کا دروازہ ہے۔ سامنے سمندر ہے۔ ناریل کے پیڑ ہیں۔

تم نے اپنی کہانیوں میں ان کا بہت ذکر کیا ہے۔ سمندر کی لہریں کبھی اپنا سر پٹکتی تھیں۔ کبھی خاموش ہو جاتی ہیں۔ ناریل کے درخت تمہارے قلم کے اشارے پر کبھی اداس ہو جاتے تھے کبھی جھومنے لگتے تھے۔ ماحول کو بنانے میں تم نے ان سے بہت مدد لی ہے۔ لیکن یقین جانو آج یہ سچ مچ ساکت۔ سمندر بھی شانت۔ جیسے تم شانت ہو گئے ہو۔ شمشان کے دروازے پر ہم لوگ پہونچ گئے ہیں۔

سوداہنی کا دروازہ ڈرائیور نے کھول دیا ہے۔ کرشن چندر، عباس، کرشن نگم، پنڈت مکھ رام شرما گاڑیاں روک کر اترے ہیں۔ ایمبولینس سے تمہاری پالکی انہوں نے نکالی ہے۔

آخری منزل کے دروازے کے اندر بڑھنے لگے ہیں۔ پنڈت رام مورتی چترویدی کہہ رہے ہیں۔ یہاں دروازے کے قریب ارتھی کندھوں پر نہیں ہاتھوں پر جائے گی۔ سر اُتر کی طرف رہے گا۔ آگے کرو بھائی! ۔ سر آگے کرو۔

تم بڑھتے چلے جا رہے ہو۔ سب ساتھ ہیں۔ یہ ہماری تمہاری زندگی کی آخری منزل ہے۔ تم اب یہیں رہ جاؤ گے۔ ہم سب چلے جائیں گے۔

پالکی کو فرش پر رکھ دیا گیا ہے۔ اِدھر اُدھر دو تین چتائیں اور جل رہی ہیں۔ جہاں تم رہتے تھے چھپرا بلڈنگ میں وہاں زندگی جلتی تھی سلگتی تھی۔ اور موت کے بعد آدمی راکھ ہو جاتا ہے۔

نیاز حیدر تمہاری ارتھی کے پاس بیٹھ گیا ہے۔ اور اب پھوٹ پھوٹ کر رو رہا ہے۔ کرشن جی تمہارے سر پر پیار سے ہاتھ پھیر رہے ہیں۔ تمہیں پیار کر رہے ہیں۔ دیکھو یہ بڑے بھائی کا دستِ شفقت ہے۔ لیکن تمہیں ہمیشہ تم نے چھوٹا ہو کر بھی بڑے بھائی کی طرح احترام سے پُرشفقت کا ہاتھ ان کے سر پر رکھا۔ آج وہ اس سے محروم ہو گئے ہیں۔ تم ہمیشہ اُن کے دکھ میں دکھی ہو جاتے تھے۔ لیکن آج اُن کے آنسوؤں پر بھی تمہارا دل نہیں پسیجتا مسکرا رہے ہو۔

وہ دیکھو لکڑیاں رکھی جا رہی ہیں۔ اگنی کنڈ کے لیے۔ لیکن کوئی پنڈت نہیں ہے۔ اچاریہ نہیں ہے۔ دیا پاتر نہیں ہے صرف تمہارے دوست کھڑے ہیں۔ ہاں تمہارے دوست کیوں نہیں ہیں۔ ہم انہیں لیکر نہیں آئے جو ہر روز صبح تمہارے بستر کے پاس چائے کا پیالہ لے کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ آئیے چائے پی لیجئے۔ وہ نہیں آئے۔ جب ہم چھپرا بلڈنگ سے چلے تھے تب وہ بلک رہے تھے۔ آنے کے لیے بضد تھے۔ تم ہی کہو انہیں کیسے لاتے۔ دِل کے مریض کو لانا ٹھیک تھا۔ ؟ اُس نے تمہاری پالکی پر پھول چڑھائے تھے۔

لو سب کہہ رہے ہیں۔ چتا پر لٹا دو۔ اِس کام کے لیے کوئی آگے بڑھے گا۔ ہندوؤں کا یہ طریقہ بھلے ہی سائینٹفک ہو لیکن بڑا ہیبت ناک اور خوفناک ہے۔ زندگی بھر جس کو پالا پوسا اُسی کو اپنے ہاتھ سے چتا کا شعلہ بنا دیا۔

پنڈت مکھ رام شرما کہہ رہے ہیں۔ کرشن جی ہاتھ لگائیے۔ اُٹھائیے۔ رنجن نے تمہیں سہارا دیا ہے۔ چتا جلانے والے نے تمہارے بدن پر سے پھول ہار کھینچ لئے ہیں۔

سب نے مل کر تمہیں لکڑیوں کی سیج پر لٹا دیا ہے۔ اب تمہارے اوپر لکڑیاں رکھی جا رہی ہیں۔ چتا جلانے والا کہتا ہے بھاری لکڑی رکھو وزنی۔ میں اُسے کیسے سمجھاؤں یہ ادیب ہے۔ یہ تو ترچھی نظر اور تیز آواز کا بوجھ بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اتنی بڑی لکڑی کا بوجھ کیسے اٹھائے گا۔ لیکن تم چپ ہو۔ مسکرا رہے ہو۔ مسکراہٹ میں وہی طنز ہے جیسے کہہ رہے ہو۔ رکھ دو چہارا۔ تم بھی یہ بوجھ رکھ دو کوئی اور زیادہ بھاری ہو تو وہ لے آؤ!

رنجن نے جلتی لکڑی اٹھا کر چتا کو دکھا دی ہے۔ بیٹا آگ دیتا ہے نا۔ یہ ریت ہے۔ چاروں طرف آگ پھیل گئی ہے لوگ تمہاری چتا سے ہٹ کر ادھر آ گئے ہیں۔ اب تم اکیلے ہو۔ یہاں سے تمہارا سفر اکیلا ہی شروع ہوگا۔ لیکن نہیں۔

مہندر! دیکھو دیکھو! قدرت کی باہیں سُرخ باہیں چمکتی ہوئی دھرتی کی طرف سے اوپر کو لپک رہی ہیں۔ وہ لینے آ رہی ہے۔ تم اسی سے الگ ہو کر آئے تھے نا۔ وہ دیکھو! عظیم آکاش جھکتا ہوا آ رہا ہے اُس آکاش کو لینے کے لئے جو اُس سے الگ ہو گیا تھا۔ اب بیچ میں کوئی حدِ فاصل نہیں رہا۔ جب قدرت اور انسان کے بیچ میں کوئی حدِ فاصل نہیں رہتا تو آدمی امر ہو جاتا ہے۔

عاقل ہرناوی نے دھرتی کو چھو کر ہاتھ جوڑے ہیں وہ کہتا ہے۔ پتر آئت تتر گچھتی۔ (جہاں سے آیا وہاں چلا گیا) اور

اور چھیرا بلڈنگ کا مسلمان ؟ کاوش کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہہ رہا ہے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ط سب اُن کی طرف آتے ہیں چلے جاتے ہیں۔ ایک ہندو ہے اور ایک مسلمان۔ لیکن تم نہ ہندو تھے نہ مسلمان۔

تو تم کیا تھے ــــ ؟

لوگ پوچھتے ہیں۔ ؟

میں کہتا ہوں، "مہندر انسان بننے کی کوشش کر رہا تھا۔"

حقیقت ہے۔ افسانہ نہیں!

۱۲ر فروری ۱۹۷۶ء کی ایک شام تھی۔

مہندر کی کھولی میں نیاز حیدر، لکشمن کپور، صابر دت اور میں بیٹھے تھے۔ نیاز حیدر "مہندر ناتھ" کے عنوان سے نظم پڑھ رہے تھے لکشمن کپور بنا سمجھے ہی جھوم رہے تھے۔ میں چپ تھا۔ نظم مہندر کی تعریف میں تھی، مہندر ناتھ مسکرا بھی رہا تھا اور جھینپ بھی رہا تھا۔

صابر دت پائپ سے دھواں اڑا کر نیاز حیدر کے ساتھ چسکی لے رہے تھے کپور نے کہا "نظم سچی ہے" ــــ مہندر اور جھینپ گیا۔ نیاز حیدر بولے میں سچ لکھتا ہوں۔ میں نے کہا نیاز حیدر تو لکھتا ہی اچھا ہے لیکن یہ نظم چھپے گی کہاں۔ ؟

صابر دت نے ہاتھ بڑھا کر نظم اُچک لی۔ "میرے پرچے میں" آپ کا پرچہ۔ یہ خوش ؟ ہے کہاں ؟

"میں نکالوں گا"!

اردو کا پرچہ! ــــ میں ہنس پڑا۔

نیاز حیدر تاؤ میں آگئے کہنے لگے: اسی لئے بمبئی آیا ہوں کاوش! یہاں سے پرچہ نکلے گا۔ میں اب بمبئی میں ہوں گا۔ اور اردو ادب کی خدمت کروں گا۔ اٹھاؤ جام صابر دت نیاز حیدر چلائے پھر جام اٹھے چھلکے اور "فن اور شخصیت" کی بنیاد پڑ گئی۔

کچھ دنوں کے بعد لکشمن کپور دل کے دورے میں مبتلا ہو گئے۔ کپور مہندر کا پرانا یار تھا۔ اس کی بیماری مہندر کے دل کو جا لگی۔ ۲۰ مارچ کو کے۔ ای۔ ایم ہسپتال وارڈ میں بیڈ نمبر ۱۲ پر مہندر ناتھ بدھوار کی شام کو دل کے ہاتھوں زندگی ہار کر چلے گئے۔

نیاز حیدر ہسپتال سے لے کر شمشان تک مہندر کے ساتھ تھے۔ پھر میں نے انہیں نہیں دیکھا۔ ایکا ایک چوتھے کے دن نیاز حیدر الجھے بال اور پریشان حال، کنٹھک لاج میں اسٹیج پر آگئے۔ انہوں نے کہا میری نظم کا عنوان ہے۔

"میرے حبیب کا دل" وہ نظم پڑھنے لگے لوگ رونے لگے اور پھر وہ نظم بھی صابر دت کو تھما کر چلے گئے۔

میں نے روکا تو کہنے لگے "یار عرگیا اب میں یہاں نہیں رہونگا کبھی میں بالکل نہیں رہوں گا" اور غائب ہو گئے۔

مہندر کے دوست لکشمن کپور مہندر کی تیرھویں تک اپنے آپ کو سنبھالے رہے۔ پہلی اپریل کو ان کی حالت غیر ہو گئی۔ انہیں اسپتال لے جایا گیا۔ وہی اسپتال وارڈ وہی بستر نمبر ۱۲ وہی دن بدھوار اور وہی بیماری اور وہی شام جو مہندر ناتھ کے بچھڑنے کا وقت تھا کپور بھی اسی وقت اسی شام اسی دن دل کے ہاتھوں زندگی ہار کر چلے گئے۔

یہ اتفاق تھا۔ مریض کی مرضی تھی۔ قدرت کا منشا تھا۔ دوستی کا تقاضہ ؟ کون جانے ــــ ؟!!

یارانِ تیز گام نے منزل کو جا لیا

(کاوش)

مجروح سلطانپوری

ذکرِ مہندر

جیسے ہم نے پیار کیا اور جیسے ہم خاموش رہے
ذکرِ مہندر میں نہ کسی کے لفظ و بیاں ایسے کھو جائیں
جس دن سے وہ چھوڑ گیا ہے اب یہ ہے مجروح کا حال
جب جب اس کا نام سنیں اک آہ کریں اور چپ ہو جائیں

محمد طفیل
ایڈیٹر نقوش، لاہور (پاکستان)

خطوط کے آئینے میں

سنہ ۱۹۶۶ء میں مہندر ناتھ نے لکھا:

"حضور! آپ کو کرشن چندر پر مضمون لکھنا ہی ہوگا۔ یوں تو ایک ہی ملاقات کافی ہوتی ہے۔ ایک مضمون کے لئے آپ تو تین چار بار مل چکے ہیں کرشن جی سے! مجھے یقین ہے۔ جب آپ کرشن جی پر مضمون لکھیں گے تو واقعی ایک معرکے کی چیز ہوگی۔ اب ٹالنے کی کوشش نہ کیجئے گا۔ بس لکھئے!"

سنہ ۱۹۷۵ء میں کرشن چندر نے لکھا:

"بائیس مارچ کو مہندر جی کی پہلی برسی ہے۔ اس موقع پر ہم لوگ ایک خصوصی مہندر ناتھ یادگار نمبر شائع کر رہے ہیں۔ جس میں تمہاری شرکت اشد ضروری ہے۔ کوئی مضمون کوئی خاکہ جو چاہو بھجوادو۔ تمہارے پاس تو مہندر جی کے خطوط بھی ہیں۔ اُن کا حوالہ بھی اپنے مضمون میں دے سکتے ہو۔ تمہارے مضمون کا بے چینی سے انتظار رہے گا۔"

(جب مہندر ناتھ نے کرشن چندر پر مضمون مانگا تھا۔ نوعیت اور تھی۔ جب کرشن چندر نے مضمون مانگا ہے۔ صورت اور ہے ـــــ ایک غمگسار دور چلا گیا۔ بہت دور!)

سنہ ۱۹۵۸ء میں مہندر ناتھ نے لکھا:

گھر میں صرف میں ہوں اور میری بیوی۔ اور میری بیوی سیوا جی کی اولاد ہے۔ یعنی مرا ٹھن ہے۔ وہ بھلا کیا بیمار ہوگی۔ اِس لئے خدا کا قہر مجھ پہ ہی نازل ہوتا ہے۔ شاید دہریہ ہونے کی وجہ سے۔ اور کیا عرض کروں کہ قوتِ برداشت اتنی ہے کہ خدا سے بھی گلہ نہیں کر سکتا۔

(مہندر ناتھ کی عادت کسی سے شکایت کرنے کی نہ تھی وہ اپنی آگ میں خود بھسم ہونے کے قائل تھے)

سنہ ۱۹۶۱ء میں مہندر ناتھ نے لکھا:

"آپ کے ہونے والے بچوں کو سلام تا قیامت ملتا رہے گا۔ ہندوستان کی آبادی ۴۴ کروڑ ہو گئی ہے۔ ایک دو بچے پیدا کر کے میں کونسا تیر ماروں گا۔ خدا آپ کے اور باقی ادیبوں کے بچے سلامت رکھے۔"

(مہندر ناتھ کی کوئی اولاد نہ تھی۔ وہ بڑھتی ہوئی آبادی سے بھی پریشان تھے
یہی وجہ ہے کہ انھوں نے چپکے سے اپنے وجود کی نفی کر دی)

۱۹۶۲ء میں مہندر ناتھ نے لکھا:

"ادھر دو تین تازہ نمبر ملے۔ صرف لاہور نمبر نہیں ملا۔ اگر یہ بھیج دیا ہے تو یہ نمبر مجھے ملنا چاہیے تھا۔ لاہور سے میری یادیں وابستہ ہیں۔ بچپن اور جوانی کے دن اسی شہر میں گزرے۔ ایم۔ اے تک وہیں تعلیم حاصل کی۔ اس لئے لاہور نمبر سے مجھے محروم مت کرو۔ نہیں بھیجا ہے تو بھیج دو پیارے!"

(مہندر ناتھ نے لاہور کا نام لیا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی ——
اب میں انھیں ڈھونڈھنے بھی نکلوں تو ڈھونڈھ نہ سکوں گا۔)

۱۹۵۶ء میں مہندر ناتھ نے لکھا:

"اس وقت سورج درختوں کی اوٹ میں ہے۔ میرے کمرے کی دیواریں سورج کی روشنی میں جاگ رہی ہیں۔ ناریل کے پتے اس نرم ہوا میں ناچ رہے ہیں۔

آج کل بمبئی کا موسم بڑا ہی خوشگوار ہے۔ اتنی خوبصورت دھوپ! آسمان صاف شفاف اور روشن ہے کہ آدمی اپنا چہرہ آئینے کی بجائے آسمان میں دیکھ لے لیکن دیکھنے کی ہمت نہیں۔ آئینے میں چہرہ دیکھنا آسان ہے۔ لیکن آکاش کی کھلی بے داغ پیشانی کے سامنے اپنا چہرہ رکھنا حوصلے کا کام ہے۔

کچھ دنوں سے گرمی بہت کم ہے۔ سردیوں کا آغاز ہے۔ یہاں تو سردیوں کا موسم ہوتا نہیں۔ بڑی ہلکی ہلکی سی ٹھنڈک، بلکہ یوں کہا جائے تو بہتر ہے کہ گرم گرم سی ٹھنڈک!"

(انسانوں کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ جو شخص مناظر قدرت سے دلچسپی رکھتا ہے۔ وہ لغویات سے دلچسپی نہیں رکھتا اور یہ علامت ہے پوتر روح کی۔)

۱۹۶۰ء میں مہندر ناتھ نے لکھا:

"ادب عالیہ نمبر مل گیا ہے۔ یہ نمبر سب نمبروں سے بازی لے گیا۔ میں اس سے پہلے بھی یہ عرض کر چکا ہوں کہ خوب صورت، حسین اور حسین تر نمبر نکالنے کا سہرا تمہارے ہی سر پر ہے۔ اس سے پہلے اور شاید اس کے بعد کوئی ایڈیٹر اتنے شان دار، باوقار اور بامقصد نمبر نہ نکال سکے گا۔ نمبر نکالنے میں جس ذوق جمال کا تم نے ثبوت دیا، اور اردو ادب کی جیسی تم نے تاریخ مرتب کی۔ اس کی وجہ سے اردو ادب میں تم نو امر ہو گئے۔"

(کسی کی تعریف کرنا۔ دل گردے کا کام ہے۔ یہ شیوہ یا تو اوتاروں کا ہے
یا اُن کا جن کے دل کشادہ ہیں اور مزاج میں شرافت)

"میری ایک اور عرض ہے کہ مرنے سے پہلے تم ایک ایسا نمبر نکالو۔ جس کی وجہ سے تمہیں گالیاں ملیں۔ یعنی اتنا خراب، اتنا بدصورت، اتنا بے مقصد، اتنا لے معنی نمبر کہ اس سے بے ادبی کی شان دار روایات قائم ہوں۔ کبھی ہر بڑا افسانہ نگار یا شاعر اچھی خاصی بیہودہ نظمیں یا افسانے لکھتا ہے۔ اس لئے تمہیں پورا حق ہے کہ اس طرف بھی دھیان دو تاکہ اس میدان میں بھی تمہارا کوئی ثانی نہ ہو۔"

(یہ مزاجاً لقراط نہ تھے۔ بلکہ حسِ مزاح بھی رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ چہل کو کبھی اُن کی زندگی میں دخل تھا۔ ویسے بھی کردار کی بے عمل خوبیوں سے باعمل شرارتیں زیادہ قیمت رکھتی ہیں)

۱۹۵۴ء میں مہندر ناتھ نے لکھا:

"ادھر بیماریوں نے گھیرا۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ کرشن جی کی چھوٹی بچی پاگل ہوگئی ہے۔ وہ خود کچھ عرصے سے بیمار ہیں۔ ادھر میں بیمار ہوں۔ بھیا اس جھنجھٹ میں کچھ نہ لکھ سکا۔ اب یہ لکھا کہ کرشن چندر پر مضمون لکھ کر بھیجو یا کسی سے لکھواؤ۔ میں کرشن چندر پر مضمون تو لکھ سکتا ہوں لیکن مواد اتنا زیادہ ہے کہ وہ ایک کتاب ہی میں سما سکتا ہے۔"

(مہندر ناتھ سب سے پیار کرتے تھے۔ ہما شما سے بھی، لیکن کرشن چندر سے تو اُن کی محبت بے مثال تھی۔ جس کام کی مہلت مہندر جی کو نہیں ملی وہ کام اب کرشن جی کو مہندر جی کے لئے کرنا چاہیئے)

۱۹۵۹ء میں مہندر ناتھ نے لکھا:

"طبیعت ناساز تھی اور ابھی تک ہے۔ معدہ خراب ہے اور خراب رہتا ہے۔ ذرا گیس کی شکایت ہے۔ لوگ زیادہ شراب پی کر اپنا معدہ خراب کر لیتے ہیں۔ یہاں میرا الٹا ہی حال ہے یعنی شراب نہ پی کر معدہ خراب کر لیا ہے۔ خیر یہاں تو بھگوان کی کرپا سے شراب پینا ممنوع ہے۔ گو دیسی شراب ملتی ہے اور کافی سستی ملتی ہے لیکن ایسی شراب کا بھی کیا پینا جو معدے کے ساتھ ساتھ دماغ کو بھی خراب کر دے۔ تمہاری کوئی تازہ تخلیق؟ کتابی جسمانی یا روحانی، ادھر میں تینوں چیزوں سے منکر ہو گیا ہوں۔"

(کسی کا شراب نہ پینا، شرافت و نجابت کی دلیل تو نہیں مگر ایسے لوگ مجھے اچھے لگتے ہیں۔ مہندر ناتھ کے بارے میں میرا خیال تھا کہ چسکی لگا لیتے ہوں گے لیکن وہ تو مارِ ظلہٗ نکلے۔)

۱۹۶۶ء میں مہندر ناتھ نے لکھا:

"ایک زمانے کے بعد آپ کا خط ملا۔ یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ ہم سب زندہ ہیں۔ خدا کرے معاہدۂ تاشقند کی روح زندہ و تابندہ رہے اور دونوں ملکوں کے درمیان دوستی کی راہ و رسم جاری رہے اور اس فانی دنیا سے کوچ کرنے تک ہم ایک دوسرے سے مراسلات کا سلسلہ تو قائم رکھ سکیں۔"

(یہ سوچ کسی صلحِ کل قسم کے انسان ہی کی ہو سکتی ہے۔ اگر ان کی جگہ کوئی متعصب ذہن کا آدمی ہوتا تو وہ نہ جانے کیا کیا کچھ کہتا۔)

۱۹۶۲ء میں مہندر ناتھ نے لکھا:

"خدا کرے آپ مجھے قتل کرنے میں کامیاب ہوں۔ دراصل میں بیمار ہو کر مرنا نہیں چاہتا، شہید ہونا چاہتا ہوں۔ کسی ادیب کے ہاتھوں شہید ہو جاؤں تو میری موت کے بعد اچھے خاصے نمبر نکل سکیں گے۔ یوں سسک سسک کے مرنا کہاں کی شرافت ہے۔"

بہت سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ ابھی شہید ہونا عقلمندی نہیں۔ کچھ عرصہ اور انتظار کیا جائے۔ اس لئے کہ اس دوران میں ایک افسانہ ہو گیا اور وہ بھی بہت اچھا اور شاندار افسانہ، جسے پڑھ کر آپ ضرور میری درازیٔ عمر کے لئے خدا کی بارگاہ میں ہاتھ اٹھائیں گے اور قتل کرنے کی تمنا جو آپ کے دل میں ہے اُسے فوری طور پر ملتوی کر دیں گے۔"

(میں نے بے تکلفی کی فضا میں لکھا ہوگا کہ افسانہ بھیج دیجئے ورنہ قتل کر دوں گا۔ فن کار مرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ لیکن جب اچھی تخلیق کی آمد آمد ہو تو وہ اپنے ارادے کو ملتوی بھی کر سکتا ہے)

سنہ ۱۹۵۲ء میں مہندر ناتھ نے لکھا:

"ایک فلمی ادارہ میں نوکری کر لی تھی اور اسی مہینے اُس فلمی ادارے سے چھٹکارا نصیب ہوا ہے۔ ایک فلم "زلزلہ" تیار کی ہے۔ اس میں بہ طور ایک ایکٹر، ڈائیلاگ رائٹر اور ساتھ ہی چیف اسسٹنٹ ڈائرکٹر کے کام کیا ہے۔ یعنی پیٹ بھرنے کے لئے ایک ادیب کو کیا کچھ کرنا پڑتا ہے۔"

(فلمیں تو کئی بڑے ادیبوں نے بنائیں۔ مثلاً کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی اور خواجہ احمد عباس نے مگر بہ طور ایکٹر یا تو مہندر ناتھ نے کام کیا یا سعادت حسن منٹو نے)

سنہ ۱۹۵۲ء ہی میں مہندر ناتھ نے لکھا:

"اس دور ابتلا میں ذہن کے سامنے کئی تصویریں اُبھرتی ہیں۔ ماضی، حال اور مستقبل نگاہوں کے سامنے گھوم جاتے ہیں۔ زندگی کی مشکلات اتنی بڑی اور زیادہ ہیں کہ اُن کا سامنا آسان نہیں۔

بمبئی کے ادیب بھی آج کل بہت کم لکھتے ہیں۔ پیٹ کی بھوک نے لاچار کر دیا ہے اور ہم سب لوگ بے بس ہو کر رہ گئے ہیں۔ پھر بھی ہمت نہیں ہارتے۔"

(بمبئی کے ادیبوں سے ادب کو کوئی گلہ نہیں۔ جیسے تیسے بھی لکھا خوب لکھا اور اُن ناموں میں مہندر ناتھ کا نام نمایاں ہے۔ مفلسی زحمت ضرور ہے مگر ذلت تو نہیں۔)

سنہ ۱۹۵۸ء میں مہندر ناتھ نے لکھا:

"آپ کی والدۂ محترمہ کی اچانک موت کی خبر پڑھ کر بے حد رنج ہوا۔ ماں کی محبت عجیب و غریب ہوتی ہے۔ بڑی نایاب، حسین اور دل فریب چیز، یہ واقعی ایک المناک ٹریجڈی ہے جس کا سامنا ہر انسان کو کرنا پڑتا ہے۔ سوائے صبر کے اور کوئی چارہ نہیں۔ اپنے غم میں مجھے بھی شریک کر لو۔ کیونکہ ماں سب کی سانجھی ہوتی ہے۔"

(جو شخص کسی کے دکھ درد میں شریک ہو۔ صرف وہی شخص انسان کہلانے کا مستحق ہے باقی سب دوستی کے فریب، مہندر ناتھ اِن معنوں میں حد درجہ قابلِ پرستش تھے۔)

سنہ ۱۹۲۹ء میں مہندر ناتھ نے لکھا:

"آج کل ہندوستان میں مشاعروں کا زور ہے۔ اس دوران کافی غزل گو شعرا ادھر تشریف لائے۔

کاش آپ بھی شاعر ہوتے تو اس طرح آپ سے ملاقات ہو جاتی یا میں شاعر ہوتا تو اسی بہانے پاکستان کا ایک چکر لگاتا۔ "نہ ہوئی قرۃ لی۔"

(مہندر ناتھ یاروں کے یار تھے۔ متعدد مرتبہ مجھے بمبئی بلایا مگر میں ہمیشہ بات کو کل پہ ٹالتا رہا ـــــ اب تو بات واقعی کل پہ ٹل گئی ہے)

۱۹۶۶ء میں مہندر ناتھ نے لکھا:

"بمبئی میں پچھلے دنوں کافی ہنگامہ رہا۔ پانی کی اتنی قلت تھی کہ پینے کے لئے ذرا کم ملتا تھا۔ نہانے کے لئے سمندر ہے۔ لیکن پینے کے لئے کافی دوڑ دھوپ کرنی پڑتی ہے۔ مون سون دغا دے گئی تھیں۔ قیامت کا سماں تھا۔ لیکن اب بارش اتنے زوروں سے ہو رہی ہے کہ خدا بچائے۔ چاروں طرف پانی ہی پانی ہے۔ جھیلیں پانی سے بھری پڑی ہیں۔ اب ہر شخص خوش ہے۔ خدا نے اپنے وجود کا احساس انسانوں کو کرا دیا ہے۔ اب بھی لوگ اس کی ہستی کے منکر ہوں تو کیا ہو سکتا ہے۔"

(ایک خط میں مہندر ناتھ نے لکھا تھا کہ دہریہ ہوں۔ اس لئے خدا کا قہر مجھ پہ ہے۔ اقرار وہاں بھی خدا کی ہستی کا تھا۔ اقرار یہاں پہ بھی ہے۔ باقی اللہ جانے!)

۱۹۵۷ء میں مہندر ناتھ نے لکھا:

"تم وعدہ کیوں کرنے لگے۔ خطوط نمبر چھاپا۔ اس میں مہندر ناتھ کا نام غائب تھا۔ شخصیات نمبر چھاپا اس میں ہمارا نام غائب! ارے بھئی کیا ہماری شخصیت ہی نہیں؟ اتنی بے اعتنائی کیوں؟ پھر اتنا پیار کیوں؟ بتاؤ تو، کبھی کبھی تم سے گلے شکوے کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ویسے زندگی میں یہ پہلا موقع ہے کہ تم سے گلہ کر رہا ہوں یا کسی سے گلہ کیا ہے؟"

(مجھے یہ گمان تھا کہ مہندر ناتھ ابھی ہمارا لمبا ساتھ دیں گے۔ اس لئے کھسکنے والے دوستوں کو راضی کر لیا جائے یا اُن کا حق ادا کر دیا جائے مگر انہوں نے تو اتنی جلدی کی کہ میں شرمندہ ہو گیا۔)

۱۹۵۸ء میں مہندر ناتھ نے لکھا:

"ارے بھئی ایک عرصہ سے بیمار تھا۔ سلسلہ زکام سے شروع ہوا اور انجام بہت برا ہونے والا تھا کہ آپ ایسے دوستوں نے آواز دی۔ ٹھہر جانے والے راہی! کہ میں ٹھہر گیا اور پھر تن درست ہو گیا۔"

(افسوس کہ ۱۹۷۴ء میں ہم نے مہندر ناتھ کو آواز نہ دی اور وہ چلے گئے۔ دوستی کا باب ختم ہو گیا۔ ادب کی رونق مدھم پڑ گئی۔)

۱۹۶۲ء میں مہندر ناتھ نے لکھا:

"وقت سے پہلے مرنا بھی کونسی بہادری ہے۔ جب تک سانس آتا ہے۔ جئے جاؤ۔ مرنے کے بعد کس نے پوچھا ہے۔ کون پوچھے گا۔ اگر کوئی پوچھ بھی لے تو فائدہ؟"

(میری گزارش یہ ہے کہ غالباً وہ بھی میرے ہمنوا تھے کہ موت سے کیا ڈرنا، زندگی سے خبردار رہنا چاہیئے) ▲

ڈاکٹر ظ۔ انصاری

یار مہندر

یہ جو کہا ہے ناؔ میر نے:

بڑے سلیقے سے میری کٹی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

یہ اتنی سادہ سی بات نہیں جیسی سنائی دیتی ہے۔ ناکامیوں سے کام لے کر عمر بسر کر جانا ایسا "سلیقہ" مانگتا ہے جو غالباً لاکھوں آدمیوں میں کسی ایک آدھ کو ہی میسّر ہو گا۔" جواں مردی چاہیئے۔ بے نیازی چاہیئے، ارمان اور اُن سے درگزر دونوں کی ضرورت پڑتی ہے یوں جینے کو۔ میرؔ کا سلیقہ اُن کی فنی عظمت نے مشہور کر دیا "سلیقہ ہمارا مشہور ہے،" (میر) مہندر ناتھ اُسے بھی ٹال گئے۔

⁂

لو صاحب، مہندر بھی گئے!

آٹھ مجموعے افسانوں کے اور آٹھ ناول لکھے۔ ادبی دُون کی نہ لی۔ ادب پر اپنا دعویٰ دائر نہ کیا۔ جنھوں نے عمر بھر میں صرف چند صفحے سیاہ کئے ہیں، وہ بھی مہندر ناتھ پر یوں حق جتالیتے تھے جیسے ادب کا ہر جانہ انہی پر واجب نکلتا ہے کبھی کبھار کی جان پہچان والے جب جی چاہا مہندر کے گھر آنکلے، کھایا پیا، چلتے وقت ٹیکسی کا کرایہ، ورنہ زادِ راہ لیا اور یہ جا، وہ جا۔ یہاں شکر نہ شکوہ، کسی نے گرفت کی بھی تو بس مُسکرا کر رہ گئے۔ خالی جیب جی کر اتنا سیر چشم ہونا بھی دشوار ہے!

اصل میں اُن پر دوستی کا حق جتانے کی خاطر دوستی برتنا یا بنائے رکھنا کچھ ایسا ضروری نہیں تھا۔ دل ایک بار مل گیا، سو مل گیا۔ اب چاہے خود ملو نہ ملو، جب بھی اگلی ملاقات ہو گی، دوستی ویسی ہی تازہ دم ملے گی۔

⁂

"سرسوں کا ساگ اور پنجاب کا گندم" پچا کر، لو پچھ کی ٹھنڈی اور لاہور کی گرم ہوا کھا کر جب وہ یونیورسٹی کی ڈگری جیب میں لئے ہوئے پہلے پونا اور پھر بمبئی پہنچے تو دیکھنے میں قابل جوان تھے، ماتھا چوڑا، قد درازی مائل، بدن چھریرا، رنگ گیہواں، چمپئی، لباس بے داغ۔ تبسّم قہقہے میں بدلنے والا، دانت چمکیلے فلم پروڈیوسر کھابائی نے سیدھے سیدھے انہیں اپنی پہلی فلم کا ہیرو بنا دیا۔ کس چیز کی کمی تھی! کمی تھی تو یہ کہ جوڑ توڑ، اُٹھا پٹک، فون فاں، دربار داری اور معاملہ بندی کے آدمی نہ تھے۔ کسی اللہ والے کے تکیے میں رہ گئے ہوتے تو روز صبح شام انٹا ملائی ملتا۔ اور اپنے بعد ہزاروں مُرید

چھوڑ جاتے،

کسے خبر تھی کہ ہاکی کا کھلاڑی، یہ عاشق مزاج افسانہ نگار نوجوان اپنے وجود کی کوٹھری میں گرم راکھ کی ڈھیری لئے بیٹھا رہتا ہے، خانقاہی مزاج نے اِن کی "کمیونٹی" سے ایسا نباہ کیا کہ جیسے خانہ نشین مرد فقیر اقبال نے "شاہین" پرواز سے، مجھ پر تو یہ رمز بہت دیر سے کھلا کہ یہ صاحب، جو گھڑی میں بھوت، گھڑی میں اولیا ہو جاتے ہیں، جنھیں بھڑکتے اور ٹھنڈا پڑتے دیر نہیں لگتی بے فلسفہ نہیں جی رہے ہیں۔ انہوں نے "اثبات خودی" کو فلسفیانہ نہیں رہنے دیا، اسے اپنی روزمرہ زندگی کی کٹھالی میں ڈال کر اتنا پگھلایا، اتنا صاف کرلیا ہے کہ وہ "یک گونہ بے خودی" بن گئی ہے۔ سرد و گرم زمانہ دونوں کو ہموار کرلیا تھا اس جی دار آدمی نے!

مہندر سے بگڑ بیٹھنا آسان تھا، مگر بگاڑ رکھنا مشکل، اُن کی بس لے دے کے ایک ہی کمزوری تھی: کرشن چندر، کرشن چندر کے فن کو اُن کے تازہ افسانے کو، رُوپیہ اُٹھانے یا لٹانے کو، نئی پتلون کو، مضمون کو، جوتے یا عینک کو ذرا اشارۃً بھی طنز یا تفریح کا نشانہ بنا کر دیکھئے، مہندر ناتھ کی امر مسکان غائب۔ تیور بدلے ہوئے۔ اور بات آگے بڑھی تو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کی آستین جلدی جلدی الٹنے لگتے۔ مارنے مرنے کو تیار۔ دونوں بھائی ایک دوسرے پر فدا بھی تھے اور ایک دوسرے کی تکمیل بھی۔

کمیونزم کا نظریہ انہوں نے جنون کر اپنایا تھا اور وہ بھی اِن کی کمزوری بن چلا تھا، کئی ہم پیشہ، ہم عصروں کو انہوں نے اسی معاملے میں ناراض کیا، لیکن ۵۷-۱۹۵۵ء کے بعد سے طبیعت اعتدال پر آگئی اور نظریہ ایک اخلاقی برتاؤ، طبقاتی کش مکش کا اہم نکتہ دے کر خود کنارے ہو گیا۔ اب ان کی "وفاداری" میں "استواری" کی شرط نبھ رہی تھی۔ جارحانہ انداز نہیں رہ گیا تھا۔

ایسے عاشق ہم نے کم دیکھے جو ناز برداری کا بارڈالے یا جھنجھٹ مول لئے بغیر سالہا سال عشق کی واردات پر قدم جما کر گزرتے رہیں۔ دم نہ ماریں۔ مہندر کی زندگی کے اس باب پر وہ لکھے جو دانائے راز ہو۔ اُن کے ہاں عشق، جسے لوگ "سیل بلا" کہتے ہیں۔ جوئے رواں کی طرح دھیرے بہتا تھا — بے صدا، بے گرداب، بے آبشار۔

میں نے ایک پُرسکون شام میں اُن کی میز سے جام اُٹھایا اور کنکری اُٹھا کر "جوئے رواں" پر پھینکی، ہنس دیئے، مان گئے، اور جتنی کچھ گزری تھی، اطمینان سے، جیسے کچھ ہوا ہی نہیں — سُناتے چلے گئے۔ گویا اپنے افسانوں کے کسی مجموعے کا خلاصہ سُنا رہے ہیں۔ جہاں چاہو، روک کر تفصیل پوچھ لو۔ وہ بھی ٹوک دو ہاں۔ یقین نہیں آتا تھا کہ فلم نگری میں جیون کے ۳۰ برس بتا کر کوئی عشق ہارس پاور کرنٹ کو دونوں مٹھیوں میں تھام کر یوں مسکراتا ہوگا، کہ گھر گرہستی بھی چلتی رہے۔ معمول میں خلل نہ پڑے۔

مہندر — بقول G.B.S. واقعات کو اپنے اوپر نہیں بلکہ خود واقعات پر سے گذر جایا کرتے تھے چپ چاپ۔ گویا ہزار شیوہ زندگی کا معمول یہی ہو۔

اسی بات پر دو ایک بار ان کے میرے مراسم میں گرہ پڑی۔

ایک مرتبہ ۵۳-۱۹۵۲ء میں جب ترقی پسند مصنفین کی انجمن کا پہلا چلاؤ تھا۔ اس کے سکریٹری کا چناؤ طے پایا۔ میں اس خیال سے کہ، ایک آدھ کو چھوڑ کر سبھی تائید میں ہیں۔ سکریٹری شپ کے لئے کھڑا ہو گیا۔ مہندر ناتھ سامنے آئے،

ووٹنگ ہوئی، وہ چُنے گئے۔

جلسے کے بعد ہم لوگ کوٹھاری مینشن (بوری بندر) کے نیچے چائے خانے میں پہنچے، مہندر نے سب کا بل ادا کیا۔ دو آنے فی کپ چائے کا بل ہی کتنا! سکّے میز پر رکھتے وقت وہاں مہندر نے خود ہی بتا دیا کہ وہ خود تو الکشن لڑنے کے خلاف تھے۔ پہلے کبھی الکشن ہوتا ہی نہیں تھا۔) البتّہ پارٹی کا مرپلیڈر نے کہا کہ یوں ہو، تو ہیں نے مان لیا۔ واقعہ بھی یہی تھا۔

مہندر بڑے بے ریا، کھرے اور بے لوث آدمی تھے۔ نہ کسی غم کو پالتے تھے، نہ غموں سے بھاگتے تھے۔ غم ٹال جاتے تھے۔ وہ جو واقعہ ان کی موت پر اخباروں میں چھپا کہ

جن دنوں اندر کمار گجرال ہاؤسنگ کے وزیر تھے، انہوں نے لڑکپن کے دوست اور ہم سبق مہندر کے لئے تجویز کیا کہ سرکاری انتظام سے انہیں فلیٹ دلوایا جائے۔ مہندر یہ سن کر الف ہو گئے۔

مکان ہی دینا ہے تو... ۲ اہل قلم کو مکان دیں، میں اکیلا لے کر کیا کروں گا۔ وہ اتفاقی واقعہ نہیں — ان کی زندگی کا ڈھب یہی تھا۔

⁂

۱۹۵۴ء کے مئی مہینے میں "شاہراہ" کی ادارت کے لئے میں بمبئی چھوڑ کر دلی جا رہا تھا۔ مہندر آ گئے۔ کہا کہ یار گھر خالی کرنا ہے۔ کتابیں کہاں رکھوں؟ قرار پایا کہ بازار چلتے ہیں، لکڑی کے بکس (کھوکھے) خرید کر لاتے ہیں، رات بھر میں سب کتابیں بھر کر، دوا چھڑک کر، یہیں چھوڑ جائیں گے۔ دلّی راس آ گئی، تو بکس منگا لیں گے۔ راس نہ آئی تو خود آ جائیں گے۔

کھوکھے کی تلاش میں کدھر جانا ہے، ہم دونوں بے خبر۔ اگر کھوکھے مل گئے تو لائیں گے کیسے؟ نہیں معلوم۔ سڑکوں پر بھٹکتے اٹکتے صبح سے شام ہو گئی۔ وہ بدبخت کھوکھے ہاتھ نہ آئے۔ راستے میں مہندر کا گھر پڑا یعنی ہر ایک بے نہا تماں کی جائے پناہ وہاں بیئر کی بوتلوں پر کھوکھے والی فرضی رقم بہا کر، میں تو چل دیا۔

سیکڑوں کتابیں اسی مکان میں لاوارثی پڑی رہ گئیں۔ جنھیں بعد کے کرایہ دار نے مالِ مفت سمجھ کر ردی کے بھاؤ بیچا ہو گا۔

جب بھی مجھے وہ دن یاد آتا، میں مہندر سے (اپنی نہیں) اُن کی بے پروائی" اور "تن آسانی" کی دردبھری شکایت کرتا وہ ہنس کر جواب دیتے۔

یار، پرانی کتابوں کے اُس ڈھیر سے ہمیں کیا حاصل ہوا تھا جو کسی اور کو ملا ہو گا۔ شکر کرو۔ لو، بیئر پیو!

جاں نثار اختر

مہندر ناتھ۔ ایک یاد

مہندر سے میری پہلی ملاقات دسمبر 1948ء میں ہوئی جب ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں شرکت کے لئے وہ بھوپال آیا تھا۔ میں اس وقت حمیدیہ کالج بھوپال میں شعبۂ اردو کا صدر تھا۔ اس کانفرنس کا پروگرام بھی میری صدارت میں بنایا گیا تھا۔ بمبئی سے کرشن چندر، عصمت چغتائی، مہندر ناتھ، مجروح سلطان پوری، عادل رشید وغیرہ آئے تھے۔ کرشن چندر نے افتتاحیہ جلسہ کی صدارت کی جس کا افتتاح علامہ سلیمان ندوی نے کیا تھا۔ 28 دسمبر کی شام جو ادبی تخلیقات کا دوسرا اجلاس تھا اس کی صدارت مہندر ناتھ کے سپرد تھی۔ مہندر نے ادب اور جنس کے موضوع پر بہت بلیغ اور بصیرت افروز خطبۂ صدارت پڑھا اس موضوع کا تاریخی جائزہ پیش کرتے ہوئے مہندر نے اس کا اعتراف کیا تھا کہ ترقی پسند ادب اپنے ابتدائی دور میں جنسی مریضانہ ذہنیت کا علاج کرنے کے بجائے خود اس کا شکار ہو کر رہ گیا تھا، مہندر ناتھ نے افسانوں میں جنسی محبت کے ساتھ روحانی رفاقت اور خیال کی ہم آہنگی پر زور دیا۔ ایسی رفاقت جو ایک نئے سماج کی بنیاد بن سکے یہ پہلا دن تھا جب میں نے مہندر کو ایک باشعور ادیب کی حیثیت سے پہچانا مجھے جہاں تک یاد پڑتا ہے مہندر کا یہ مضمون رسالہ 'افکار' میں شائع ہوا تھا جو اُس وقت بھوپال سے نکلتا تھا۔ غالباً اس کے کسی مجموعے میں یہ مضمون شامل نہیں۔ میں نے اس وقت تک مہندر کی بہت کم کہانیاں پڑھی تھیں لیکن اس ملاقات کے بعد مجھے جس رسالہ میں اس کی کہانی مل جاتی ضرور پڑھتا تھا

مہندر سے دوسری ملاقات بھیمڑی کانفرنس میں ہوئی اور میں نے محسوس کیا کہ مہندر ایک ایسا جوشیلا اشتراکی ادیب ہے جو "لشکر کے پیش پیش مقابل میں ہم بھی ہوں" کا دلدادہ ہے۔ کانفرنس میں اس کا وجود ادیبوں اور فن کاروں کی فوج کے سپہ سالار کی حیثیت سے علیٰحدہ نظر آ رہا تھا۔ جب سارے ادیب اپنے اُن ساتھیوں کو جو جیل کی سلاخوں کے پیچھے بند تھے یا سیاسی مصلحتوں کی بنا پر روپوش تھے، نام لے لے کر پکار رہے تھے مہندر کی آواز سب سے اونچی اور الگ سنائی دے رہی تھی، ایسا لگ رہا تھا کہ یہ آواز تمام حد بندیوں کو توڑ کر ان تک ضرور جا پہونچے گی۔

اس کانفرنس کے مینی فسٹو میں جس انتہا پسندی کا مظاہرہ کیا گیا تھا اور ادیبوں کو جس طرح سرخ رنگ میں رنگ جانے کے احکام صادر ہوئے تھے اُس کے نتیجے میں بہت سے ساتھیوں کا انجمن سے الگ ہو جانا یقینی تھا۔ اس غلط اقدام پر میری اور مہندر کی خاصی بحث ہوئی۔ نہ مہندر مجھے قائل کر سکا نہ میں مہندر کو۔ میں تو خیر دو دن بعد بھوپال لوٹ گیا لیکن وقت نے خود بتا دیا کہ رنادیوے کی پالیسی پر مبنی ادیبوں کا منشور کتنا غلط تھا۔ میں نے اس زمانے میں بہت سوچا کہ مہندر ایک متوازن دماغ رکھتے ہوئے میری بات کیوں نہ مانا۔ آخر میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ اس میں پارٹی سے وفاداری کا جذبہ اس حد تک تھا کہ وہ اسے وقتی طور پر اندھا بنا دیتا تھا۔ میرے دل میں اس کی عزت بڑھ گئی کیونکہ جذبہ

چاہے کیسا ہی کیوں نہ ہو ہر چیز سے بڑا ہوتا ہے اور اس کی عظمت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو'

1950ء میں جب میں سنٹرل گورنمنٹ کے ایک آرڈی ننس کے تحت اپنی سروس چھوڑنے پر مجبور ہو گیا اور بمبئی چلا آیا تو مہندر ناتھ سے میری ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور مجھے اس کو پاس سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اس وقت وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کا سکریٹری تھا۔ انجمن کے اجلاسوں کا سلسلہ بہت باقاعدہ چلتا تھا۔ دلیودار ہال میں، پھر کوٹھاری مینشن میں، پھر عرب بلڈنگ میں ترقی پسند مصنفین کے جلسے ہوتے رہے جس کے لئے پوری دوڑ دھوپ مہندر کو کرنی پڑتی تھی۔ عرب بلڈنگ میں تو اکثر ہال کی صفائی کرتے اور دریاں بچھاتے ہوئے میں نے اسے دیکھا تھا بلکہ بعض اوقات مجھے اس کا ہاتھ بٹانا ہوتا تھا۔

مہندر شدید قسم کا جذباتی انسان تھا۔ اُس کی وہ کہانیاں جس میں اس کی جذباتیت اُبھر کر سامنے آئی ہے "جہاں میں رہتا ہوں"۔ "ڈیڑھ روپیہ"۔ "چائے کی پیالی"۔ "اگر میں مرجاؤں"۔ "جنوب کا ساتھی"۔ "چاندی کے تار"۔ "حنائی انگلیاں" اس کے ادبی شاہکار ہیں۔ وہ اپنی عملی زندگی میں بھی جذباتی تھا۔ جس کی سب سے بڑی مثال درگا سے اس کا زندگی بھر کا نباہ ہے۔ اس کی سب سے بڑی کمزوری کرشن چندر رہا، اُس کے معاملے میں وہ زندگی بھر جذباتی رہا۔ کرشن کا ہر دکھ درد اُس کا اپنا دکھ درد تھا۔ وہ کرشن کے خلاف ایک لفظ نہ سن سکتا تھا اور لڑنے پر تُل جاتا تھا۔ میں نے کئی موقعوں پر اُسے کرشن کے لئے لڑتے اور بگڑتے خود دیکھا تھا۔ وہ ہنس راج رہبر ہو یا کوئی اور وہ کرشن کے مخالف کو برداشت نہ کر سکتا تھا۔ 'شاعر' نے جب 'کرشن چندر نمبر' شائع کیا اُس وقت ایک مضمون محمد طفیل نے پاکستان سے بھیجا تھا جو سعادت حسن منٹو کا لکھا ہوا تھا اور جسے طفیل نے اپنے رسالے میں شائع کرنا مناسب نہ سمجھا تھا اور منٹو سے خرید کر اپنے پاس محفوظ کر لیا تھا۔ یہ مضمون بہت کچھ کرشن کے خلاف تھا۔ ظاہر ہے کہ مہندر کیسے گوارا کرتا کہ اسے کرشن نمبر میں شامل کیا جائے جس کی تکمیل اور ترتیب میں اس کا بڑا ہاتھ تھا۔ مہندر نے وہ مضمون مجھے دکھایا تھا اور بے طرح بگڑا ہوا تھا۔ میں نے کہا بھی کہ منٹو تو اب ہے نہیں، تم یہ ناراض کس پر ہو رہے ہو، نہیں چھاپنا چاہتے ہو تو نہیں چھاپو، بات ختم ہو جاتی ہے مگر وہ دیر تک نارمل نہ ہو سکا۔

اُس کی یہی جذباتیت تھی جس سے اس کے قریبی دوست پیار کرتے تھے۔ اپنے دوستوں کے لئے کیا غیروں تک کی مدد کے لئے وہ اُٹھ کھڑا ہوتا تھا اور جو کچھ اس سے بن پڑتا اُس سے دریغ نہ کرتا تھا۔ ایسا اس کی زندگی میں بہت کم ہوا کہ کسی مسئلے پر اس کا کسی دوست سے جھگڑا ہو گیا ہو۔ ایک مرتبہ جب ساحر فلم رائٹرس ایسوسی ایشن کے صدر تھے اور مہندر سکریٹری، اُن کا آپس میں اختلاف ہو گیا۔ مہندر میرا جتنا دوست تھا اُتنا ہی ساحر بھی تھا۔ میں نے مناسب سمجھا کہ بیچ میں پڑ کر ان دونوں کا آپس میں میل کرا دوں۔ اس سلسلے میں بات چیت کی غرض سے میں دو چار بار مہندر سے ملنے گیا۔ اس دوران مہندر مجھے خوش مذاقی سے U. Thant کہہ کر پکارنے لگا تھا۔ بہرکیف میل تو آخر میں ہونا ہی تھا البتہ اس تلخی کا اثر مہندر پر کافی دنوں تک رہا۔

ایک کمزوری جو مہندر میں زندگی بھر رہی وہ یہ تھی کہ وہ دوسروں کے حق کے لئے تو لڑ سکتا تھا اپنے حق کے لئے لڑنا نہیں جانتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی میں اسے کچھ نہ مل سکا۔ نہ کوئی انعام، نہ کوئی خطاب، نہ وہ شہرت جس کا وہ مستحق تھا۔ آخر زمانے میں البتہ مہندر میں کبھی کبھی تلخی ابھر آتی تھی۔ وہ جس طرح دوسروں کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتا تھا، شاید اس کے دل کے کسی گوشے میں یہ خواہش کبھی چھپی ہو کہ کوئی دوسرا بھی اس کے لئے کچھ کر دکھائے۔ اس کے انتقال سے پندرہ بیس دن پہلے کی بات ہے، میں اس شام اُس کے پاس بیٹھا تھا کہنے لگا الماری میں سے بوتل نکال لو۔ میں نے کہا تم نہ پیو گے تو میں بھی نہیں پیوں گا۔ بولا، "چلو یار! ایک پیگ آج میں بھی پی لیتا ہوں۔" نہ جانے شراب پیتے ہوئے اس میں کیا بات ابھر آئی۔ کہنے لگا "سمجھ میں نہیں آتا، ہم میں ایسی کیا کمی ہے کہ نہ ہماری کتابوں پر کبھی کوئی انعام ملتا ہے، نہ کوئی خطاب سے نوازتا ہے، نہ باہر کہیں سے کوئی بلاوا آتا ہے۔ اب اتنا بھی بُرا ہم نہیں لکھتے۔" میں نے ہنس کر کہا "یہ سارے انعام و اکرام ہم لوگوں کو کبھی ملیں گے

ضرور، لیکن ملیں گے سب Posthomus Awards۔ کہنے لگا "یار تم لکھ کر رکھ لو۔ یہ مرنے کے بعد بھی مجھے اور تمہیں کچھ نہیں دیں گے" آج جب مجھے سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ دیا گیا اور دو ہفتہ کے لئے روس آنے کی دعوت، تو مجھے بے طرح مہندر کی یاد آئی۔ کاش وہ تھوڑے دن اور انتظار کر لیتا۔

مہندر کے تعزیتی جلسوں میں میرے بہت سے دوستوں نے یہ بات بڑے فخر سے کہی کہ مہندر بیس سال تک انجمن ترقی پسند مصنفین کا سکریٹری رہا اور بارہ سال تک فلم رائٹرس ایسوسی ایشن کا سکریٹری رہا۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ یہ بات کم سے کم ہمارے لئے شرمناک ہے آخر وہ کون ہے جو یہ لکیر کھینچتا ہے کہ اس ادیب کو اس سے زیادہ آنر نہیں دیا جانا چاہیے۔ مہندر ناتھ فلم رائٹرس ایسوسی ایشن کا کبھی وائس پریسیڈنٹ یا پریسیڈنٹ کیوں نہیں چنا گیا۔ یہ حقیقت ہے کہ کوئی اعزازی عہدہ ہو، انعام ہو، خطاب ہو یا بیرونی ممالک کے دعوت نامے ہوں، اُن کے لئے بڑے جوڑ توڑ کرنے ہوتے ہیں۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ بغیر کچھ کوشش کئے سب کچھ مل جائے۔ مجھے اپنا کہا ہوا ایک شعر یاد آرہا ہے ؎

انعام ہو، خطاب ہو ویسے ملے کہاں
جب تک سفارشوں کو اکٹھا کیا نہ جائے

مہندر جہاں دوستوں کے دکھ درد میں شریک ہونا جانتا تھا وہاں اُن کی خوشیوں سے بھی خوش ہونا اُسے آتا تھا۔ میں نے ۱۹۶۳ء میں جب مہندر سے ایک دن بر سبیل تذکرہ کہا کہ میں ایک فلم پروڈیوس کرنے جا رہا ہوں تو وہ ہنسنے لگا کہ یہ عذاب تمہارے بس کا نہیں، لیکن جب میں نے [۲۰] بیس ہی دن بعد اُسے "بہو بیگم" کا مہورت کارڈ لے جاکر دیا تو وہ خوشی سے اُچھل پڑا اور کہنے لگا "یار تجھے مان گئے" پھر ہنس کر بولا۔ مہورت کا دن اور وقت جوتشی سے نکلوایا ہے یا خود ہی نکال لیا ہے۔" میں نے کہا، جوتشی کا تمہیں کیوں خیال آیا، کہنے لگا، یونہی، تمہارا بس چلتا تو تم مہورت ہی کیوں کرتے۔"

مہندر کبھی توہم پرست نہیں رہا لیکن نہ جانے ایک دفعہ کیوں لمحاتی طور پر وہم اس کے دل میں جاگ اٹھا تھا۔ یہ بات ہے اُس دن کی، جب مجھے پہلا دل کا دورہ پڑا تھا۔ آناً فاناً کتنے احباب گھر پہ جمع ہو گئے۔ مجھے جب اسٹریچر پر ایمبولنس کار میں اسپتال لے جانے لگے تو کسی نے مجھے چادر اُڑھا دینی چاہی، اُسی لمحہ مہندر نے چیخ کر کہا "نہیں، چادر نہیں اڑھاؤ۔"

مرنے سے آٹھ دن قبل اس نے مجھے افسانوں کا مجموعہ "تنہا تنہا" بھیجا تھا۔ اس مجموعے کی کئی کہانیاں مجھے پسند آئیں۔ میں نے سوچا تھا کہ میں زبانی مہندر سے ان کہانیوں کے بارے میں اظہار خیال کروں گا۔ لیکن وہ موقع نہ آسکا۔ اچانک رات کو مجھے خبر ملی کہ مہندر پر دل کا دورہ پڑا ہے اور اسے اسپتال منتقل کر دیا گیا ہے۔ میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ مہندر مر جائے گا۔ لیکن وہ واقعی مر گیا۔ بہت سے دوستوں نے اس کی میت پر پھول چڑھائے، مجھ سے یہ بھی نہ ہو سکا، میں تو صرف اپنے آنسوؤں ہی کے پھول اس کے نذر کر سکتا تھا۔

دنیا اتنی بے مروت اور زمانہ اتنا مصروف ہے کہ دوست دوست کو بھول جاتے ہیں، ادیب ادیب کو بھول جاتے ہیں، انسان انسان کو بھول جاتا ہے۔ البتہ تاریخ ادب ان ناموں کو ضرور اپنے سینے سے لگا کر رکھتی ہے جنھوں نے اپنی جذباتی اور ذہنی زندگی ادب کی آبیاری میں صرف کر دی۔ مہندر کا نام بھی ادبی تاریخ کے صفحوں میں زندہ رہے گا۔ وقت کے ساتھ ہر یاد دھندلی پڑ جاتی ہے۔ مجازؔ اور مخدومؔ جیسے ساتھیوں کی یاد کبھی کبھی ہمیں چونکا کر گزر جاتی ہے۔ یوسف ظفر جس کے بارے میں ہمارے بڑے افسانہ نگاروں کی رائے تھی کہ "اب اردو ادب میں ایک گورکی پیدا ہوا ہے۔" آج کسے یاد ہے۔ مہندر بے چارہ تو "گورکی" بھی نہ تھا اُسے اگر کوئی بھول جائے تو کس کو کس سے گلہ ہوگا۔ پھر بھی مجھے اعتبار ہے کہ مہندر بحیثیت ایک انسان اِک نہ اِک دل میں ضرور زندہ رہے گا۔ مجھے اپنے بیٹے سلمانؔ کا ایک مصرعہ یاد آرہا ہے۔ مہندر کا کوئی نشان مزار نہ سہی، کوئی کتبہ نہ سہی شاید اس سے زیادہ مناسب ہم اس کے لئے کچھ نہ سوچ سکیں گے۔ ؎

اک نہ اک دل میں تو یہ آدمی زندہ ہوگا

سلمان اختر

سردار جعفری

مہندر ناتھ اور سجّاد ظہیر

مہندر ناتھ اور سجاد ظہیر میں کوئی مماثلت نہیں تھی۔ دونوں ترقی پسند ادیب تھے لیکن الگ الگ شخصیتوں کے مالک۔ سجاد ظہیر نرم گفتار اور گرم دل، مہندر گرم گفتار اور نرم دل۔ لیکن اُن کے انتقال کے بعد معلوم ہوا کہ سجّاد ظہیر کی طرح مہندر ناتھ نے بھی اپنی زندگی کا بہترین حصہ ادب کی تخلیق کے بجائے ادیبوں کی خدمت میں صرف کر دیا۔ وہ بہت اچھے افسانہ نگار تھے لیکن اگر وہ اپنا زیادہ وقت افسانہ نگاری کو دیتے تو اس سے بھی اچھے شاہکار تخلیق کر سکتے تھے۔ جب سے مہندر بمبئی آئے تھے اُس وقت سے وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسوں کے سکریٹری رہے۔ ہر ہفتے باقاعدہ جلسے میں شریک ہوتے، اس کا حال لکھتے اور اخباروں میں شائع کراتے۔ کبھی کبھار خود بھی افسانہ پڑھتے ورنہ زیادہ تر دوسروں کی تخلیقات سنتے اور اُن کی بحث میں حصّہ لیتے۔ لیکن جب اخبار میں چھپنے کے لئے جلسے کا حال لکھتے تو اپنی رائے کو پس پشت ڈال دیتے اور دوسرے ہم عصروں کو آگے رکھتے۔ خدمت گزاری کے اس جذبے کے ساتھ وہ فلم رائیٹرس ایسوسی ایشن کے سکریٹری رہے۔ ہر انتخاب میں تمام عہدیدار بدل جاتے تھے لیکن مہندر بدستور سکریٹری رہتے تھے۔

جس چالی میں وہ رہتے تھے وہ غریبوں سے آباد تھی۔ وہاں بھی وہ خدمت گزار تھے اور اُن کے انتقال پر معلوم ہوا کہ اُن کے چاہنے والوں کی کتنی بڑی تعداد تھی۔

میں نے مہندر ناتھ جیسے بے لوث انسان کم دیکھے ہیں۔ جب تک وہ تھے تب تک کوئی بات نہیں تھی لیکن اُن کے چلے جانے کے بعد یہ محسوس ہو رہا ہے کہ محفل میں ایک چراغ تھا وہ بجھ گیا۔ زندگی کے دسترخوان پر جو آکر بیٹھتا ہے اُسے دعوت ختم ہونے سے پہلے موت کا جام پینا پڑتا ہے۔ مہندر نے بھی یہ جام پیا لیکن اس موت کے ساتھ جو کم لوگوں میں نظر آتی ہے۔ ہمارا محبوب دوست اور ساتھی اب ہمارے ساتھ نہیں ہے لیکن اُس کے افسانے ہمارے پاس ہیں جو آنے والی نسلوں کی امانت ہیں ان کو پڑھ کر مستقبل کے خوش حال انسان یہ اندازہ کر سکیں گے کہ جس ماحول میں رہ کر ترقی پسندوں نے ایک حسین مستقبل کے خواب دیکھے تھے وہ کتنا خوفناک تھا۔ مہندر ناتھ کے افسانوں میں ہماری شہری زندگی اپنے سارے ظلم و جبر کے ساتھ جلوہ گر ہوئی ہے اور ایک بلند حوصلہ ادیب کے قلم کے سامنے تھر تھرانے لگی ہے۔

مہندر ناتھ ترقی پسند ادب کو اتنا کچھ دے کر گئے ہیں جس پر ہمیں ہمیشہ ناز رہے گا۔

راجندر سنگھ بیدی

مہندر ناتھ!

مہندر ناتھ قریب قریب اسی زمانے میں آئے، جس میں، اشک منٹو، کرشن چندر اور عصمت آئیں۔ وہ اچھا لکھتے تھے، لیکن بس خط کے سامنے بڑا خط کھینچ جائے۔ وہ بغیر کچھ کیے بنے چھوٹا ہو جاتا ہے وہ بڑا نام کرشن چندر تھے، ایک طرف تو ان کی ولادت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا اور دوسری طرف ان کے ادبی قد کو۔ ان کی ہمشیرہ سرلا بھی افسانے لکھتی تھیں مگر حالات میں کم ہی ہوتا ہے کہ کوئی پورے کا پورا خاندان یکساں طور پر دنیائے ادب پہ مسلط ہو جائے۔ برونٹے بہنوں نے بھی ایملی نے جو "ونڈرنگ ہائٹس" لکھا، شارلٹ ان تک نہ پہنچ پائیں لیکن انگریزی ادب میں شارلٹ کا اپنا مقام تھا۔ بعینہٖ مہندر ناتھ کا ایک مقام تھا۔ مذکورہ حادثے کی وجہ سے جس کی طرف لوگوں نے کم توجہ دی ان کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ مہندر ایسے ناتھ بھی نہ تھے۔

منٹو، کرشن اور عصمت کی تثلیث ابھی ختم نہ ہوئی تھی کہ قرۃ العین حیدر کی پت جھڑ سنائی دینے لگی۔ اور مہندر ناتھ کی کیفیت اس بچے کی سی ہو گئی جو کہیں دو اولادوں کے بیچ پیدا ہو جاتا ہے۔ بڑے اور چھوٹے کے بیچ بٹ جاتا ہے۔ اسے اکثر کہا جاتا ہے۔ تمہارا بڑا بھائی ہے۔ اس کی عزت کرو۔ اور شرم نہیں آتی چھوٹے کو مارتے ہو۔؟ چنانچہ وہ بیچارہ مار سکتا ہے اور نہ مار کھا سکتا ہے۔ اور دنیا کے اس عجیب الخلقت انصاف کا رونا روتا ہوا رہ جاتا ہے۔

مہندر ناتھ نے سینکڑوں افسانے لکھے، ناول رقم کئے (جو اُردو ادب کی تہی دستی کی وجہ سے کوئی بھی رقم نہ بن پائے۔ جب سے ہم ادیب کو قلم اور فلم کے متعہ میں قاضی بننا پڑا ہے!) اور لُغت میں معنی پیدا کرتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ مہندر ناتھ نے پڑھنے والوں کو بوجھ سے نہیں وزن سے مارا ہے۔ ان کی تحریر میں ایک سادگی اور برجستگی تھی۔ تاثر کے لئے وہ بہاؤ اور بندش کا سہارا نہیں لیتے تھے۔ جو کہ ہمارے بڑے ادیب لیتے ہیں۔ اُردو کے افسانوی ادب میں چونکہ گریز کو بجز بیان کا نام دیا جاتا ہے۔ اسلئے پڑھنے والے تو ایک طرف، ناقد بھی انگھڑ اور صناعانہ تحریر میں تمیز نہیں کر پاتے۔ اسکے لئے انہیں مطالعے اور شعور اور بالآخر مکاشفہ کی ضرورت ہے۔ جس کے وہ اہل نہیں ہیں اور اگر کہیں کوئی اس قبیل کا آدمی ہے بھی تو اُردو ادب کا وہابی پن وضعِ احتیاط میں اکثر گلہ گھونٹ ڈالتا ہے۔

پھر، اچھا ادب کیا ہے؟ اگر آپ کوئی سا بھی عرف قائم کیجئے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ صرف اچھا ہو کر رہ جاتا ہے۔ جو کہ اچھا نہیں ہے۔ بڑے ادب کے معیار و حمد پر کسا جائے تو ہمارے بڑے سے بڑے ادیب کی تحریر چند جینوں کے خطوط، سے زیادہ نہیں رہ جاتی اس کا اکثر حصہ تو سیاست کی نذر ہو جاتا ہے۔ اور جو باقی بچتا ہے۔ خباثت کی روس کے پہلی شیدی جو کبھی دوڑ دوڑ کر اُردو ادیبوں کو ڈھونڈا کرتے تھے۔ اب صرف ہندی ادیبوں کی کھوج کھاج کرتے ہیں۔ یہاں کے ڈاکٹر بھارتی، جو اُردو کو ہندی کی ایک شیلی گردانتے ہیں لکھتے ہیں تو ایک بھی اُردو ادیب کا نام نہیں گنواتے۔ ان کی حیثیت اس بچے کی سی ہے، جو پردے کے پیچھے چھپ

کر باپ سے کہتا ہے — ابا میں کہاں ہوں : اور ابا پردے کے پیچھے اس کے پاؤں دیکھ لینے کے باوجود پکارتے ہیں — ارے بیٹے، مجھے کیا معلوم تم کہاں ہو — ۔ ۔ ان حالات میں مہندر ناتھ کہاں ہیں اور پھر کرشن چندر، منٹو اور عصمت بھی کہاں ؟

بحیثیت انسان مہندر ناتھ ایک شریف النسل اور اجلی آدمی تھے ۔ ان کے اصل نے نہیں باغی ہونے دیا اور نہ کنفارمسٹ ۔ وہ اردو ادب کے اجتماع کا حصہ ہو کر رہ گئے ۔ کوئی سا بھی تماشہ دیکھنے کے لئے مہندر ناتھ دوسروں کو کہنیاں لگا کر اگلی صف میں پہونچ جانے کا فن نہیں جانتے تھے ۔ وہ کم سخن تو تھے ہی ۔ لیکن امتداد زمانہ نے انہیں کم رفتار بھی بنا دیا ۔ کم اور کم ہوتے ہوئے وہ معدومیت کا راز پا گئے ۔ جگر کی تکلیف کے بعد انھوں نے شراب چھوڑی پھر سگریٹ چھوڑے اور باقی کی چیزوں کو بھی چھوڑنے کے انداز میں اپنایا ۔ اکثر وہ دادر سے ماتنگا تک پیدل چلتے ہوئے دکھائی دیتے تھے تاکہ صحت بنی رہے ۔ وہ اس بات کو نظر انداز کر گئے کہ صحت احتیاط اور بے احتیاطی کی مسلسل کشاکش کا نام ہے جسمیں پیٹ اکثر یہ کہتا ہوا سنائی دیتا ہے — بھائی، کیا ظلم کر رہے ہو ؟ اور آدمی پر جواب لازم ہے — کھانا پینا میرا کام ہے پھیا ہضم کرنا تمہارا کام ہے ۔ اور تھوڑے بہت احتجاج کے بعد بدن ذہن کی حکمرانی قبول کرنے لگتا ہے ۔ مہندر ناتھ نے بے احتیاطی کی بھی تو فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کی سمت، جبکہ وہ جنرل سکریٹری تھے اور جسے انھوں نے ایک ایسا ادارہ بنا دیا جس کی حیثیت مستحکم ہے ۔ اور جس سے آج ہم سب لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں ۔ مہندر ناتھ خود ایک بت — ایک ادارہ نہ ہو سکے کیونکہ وہ ان لوگوں میں سے تھے ۔ جن کی وجہ سے بت اور ادارے بنتے ہیں ۔ ان کی شخصی زندگی بے ریائی — ایثار اور طاعت کی حامل تھی ۔

جو آدمی دنیا میں آتا ہے ۔ کسی کا بیٹا ہوتا ہے ۔ کسی کا بھائی، کسی کا شوہر اور کسی کا دوست ۔ کوئی اسے نزدیک سے پیار کرتا ہے اور کوئی دور سے خاموشی کی زبان میں اسے سراہتا ہے ۔ ان کے چلے جانے کا رنج ہر کسی کو براہ راست اس کے ساتھ تعلق اور اس کی نوعیت سے ہوتا ہے ۔ اس لئے حافظ کے ساتھ مل کر کہا جا سکتا ہے ۔

دردے کہ من از غم تو دارم در دل
دل داند و من دانم، من دانم و دل

کنہیالال کپور

مہندر ناتھ سے پہلی اور آخری ملاقات

ایک شگفتہ اور شاداب چہرہ۔ ایک تندرست ذہن۔ نظامِ کہنہ کے خلاف ایک مسلسل صدائے احتجاج۔ یہ تھا مہندر ناتھ! عوام اس کی تحریریں بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ وہ جانتے تھے مہندر ناتھ کے پردے میں وہ خود بول رہے ہیں۔ عمر بھر اس نے وہ وقت قریب تر لانے کی کوشش کی جب عوام محکوم ہونے کے بجائے حاکم ہوں گے۔ وہ وقت جب بھی آئے گا تسلیم کرنا پڑے گا۔ اسے قریب لانے میں مہندر ناتھ کا نمایاں ہاتھ تھا۔

اس سے میری پہلی ملاقات 1936ء میں ہوئی۔ اس وقت وہ ایک جوان رعنا تھا۔ جسے دیکھ کر اردو مثنوی کے روایتی ہیرو کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ ملاقاتی سوچنے لگتا اسے تو پرستان میں ہونا چاہیئے تھا۔ یہ "ہندو ہوسٹل" (لاہور) میں کیسے آگیا۔

اس کے کتابی چہرے پر ہر وقت مسکراہٹ یوں کھیلتی رہتی جیسے وہ نہایت لاابالی طبیعت کا مالک ہو۔ دراصل یہ مسکراہٹ ایک نقاب تھی جس کے پیچھے ہزار ہا آنسو لرز رہے ہوتے، وہ اُن پختہ فکر نوجوانوں میں سے تھا جو موجودہ نظام سے غیر مطمئن تھے اور جنہیں عوام کی ناکامیوں اور نامحرومیوں کا احساس بے چین اور مضطرب ہونے پر مجبور کرتا تھا۔

طبعاً اور فطرتاً وہ اشتراکی اقدار کا حامی اور طرفدار تھا۔ تاہم وہ ایک منہ بسورنے یا آنسو بہانے والا "کامریڈ" نہ تھا۔ جہاں اُس کے ہم عصر سرمایہ دارانہ نظام پر دانت پیستے وہ اس پر زیرِ لب مسکراتا۔ یا لطیف چوٹیں کیا کرتا۔

اکثر وہ غمِ دوراں کی تلخی کو گوارا بنانے کے لئے غالبؔ کی غزلیں ترنم سے گایا کرتا۔ پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا۔ اُس کی پسندیدہ غزل تھی جسے جب وہ عالمِ سرشاری میں گاتا، سماں بندھ جاتا۔ سنگیت سے اُسے نہ صرف لگاؤ تھا اس کی نزاکتوں اور باریکیوں سے بھی کما حقہ واقفیت تھی۔ اِدھر کوئی گویا بے سُرا ہوا اُدھر اس نے پکار کر کہا۔ "اے حضور کیوں سنگیت کو الٹی چھری سے ذبح کر رہے ہیں۔

اُس کا تکیہ کلام تھا۔ دھنیہ ہو مہاراج۔ وہ جب کسی کو اوٹ پٹانگ باتیں کرتے دیکھتا، اسے ایک مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ مخاطب کرتے ہوئے کہتا۔ "دھنیہ ہو مہاراج" آپ کے استدلال کا بھی جواب نہیں۔ اُسے ہر قسم کی بناوٹ اور تصنع سے چڑ تھی۔ وہ دوست اسے ایک آنکھ نہ بھاتے تھے جن کا خمیر ریا کاری سے اٹھایا گیا تھا۔ دوست تو دوست اُسے وہ رشتہ دار بھی ناپسند تھے جن کے اقوال اور افعال میں تضاد پایا جاتا ہے۔

1936ء میں وہ بی اے کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا لیکن اس کا مقصد امتحان پاس کرنا نہ تھا اس کی تمامتر توجہ صرف اس امر پر مرکوز تھی کہ جس عظیم افسانہ نگار کو دریافت کرنے کا سہرا اس کے سر ہے اس کی حفاظت، خدمت اور سرپرستی کی جائے۔ وہ افسانہ نگار تھا کرشن چندر۔ اس میں مطلقاً شک نہیں کہ کرشن چندر کا سب سے پہلا پرستار اور نقاد مہندر تھا۔ عام طور پر کسی ادیب کو بامِ عظمت تک پہنچانے میں کسی خاتون یا فرد کی

نہیں بیوی) کا ہاتھ ہوتا ہے۔ کرشن چندر وہ واحد ادیب ہے جسے عظمت کی ابتدائی منازل طے کرنے کے لیے اپنے چھوٹے بھائی کا مرہونِ منت ہونا پڑا۔

مہندر ناتھ نے اگر کسی شخص یا دیوتا کی پرستش کی۔ اگر وہ کسی کی خاطر مرنے مارنے کو تیار ہوا تو وہ تھا کرشن چندر۔ کرشن چندر کی ہر ادا اُس کو پیاری لگتی تھی۔ یہاں تک کہ اس کی جھنجھلاہٹ بھی۔ جب کبھی کرشن چندر آپے سے باہر ہونے کی کوشش کرتے، حالانکہ ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا تھا، مہندر ناتھ کھلکھلا کے ہنستا اور فخر سے کہتا "خدا کا شکر ہے بڑے بھائی کو غصہ بھی آتا ہے۔ میں تو سمجھا تھا اُسے لکھنے کے علاوہ اور کچھ نہیں آتا۔"

کرشن چندر کے لئے مہندر ناتھ کا وجود بیک وقت لکشمن اور ہجرت کی حیثیت رکھتا تھا جس خلوص اور جانفشانی کے ساتھ مہندر نے ایک فرماں بردار بھائی، ہمدرد دوست اور وفادار محافظ کا رول ادا کیا۔ اس کی مثال فی زمانہ مشکل سے ملے گی۔ کرشن چندر 1936ء کے قریب ادبی دنیا میں داخل ہوئے اور آتے ہی اس پر چھا گئے۔ ان کی قابلِ رشک مقبولیت نے جہاں ان کے ہزاروں مداح پیدا کیے وہاں متعدد حاسدوں کو بھی جنم دیا۔ اسے مہندر ناتھ کی اخلاقی حمایت کا اعجاز سمجھئے کہ کرشن چندر ثابت قدم رہے اور انھوں نے ادب کو مستقل پیشہ بنانے کا جو عزم کیا تھا اس میں ذرا بھی لغزش پیدا نہ ہوئی۔

مہندر ناتھ نے لکھنا کیسے شروع کیا۔ یہ ایک نہایت دلچسپ داستان ہے 1940ء میں ایک دن جب وہ کرشن چندر کو محض چڑانے کے لیے راجندر سنگھ بیدی کا خاکہ اڑا رہا تھا (راجندر سنگھ بیدی کرشن چندر کی ایک بہت بڑی کمزوری تھے) کرشن چندر نے جھڑک کر کہا۔ "دوسروں کی خواہ مخواہ مذمت کرنے کا فائدہ؟ مزا تو تب ہے تم بیدی سے بہتر لکھ کر دکھاؤ۔" مہندر ناتھ نے دبی زبان سے کہا۔ "مجھے یہ چیلنج منظور ہے۔" اتفاق سے کچھ دنوں بعد کرشن چندر لاہور سے آل انڈیا ریڈیو دہلی میں چلے گئے۔ دسمبر 1940ء کی ایک شام کو مہندر ناتھ میرے یہاں آیا۔ اُس نے مسکراتے ہوئے اپنی جیب سے اپنا پہلا افسانہ نکالا اور مجھے سنانے لگا۔ افسانہ واقعی اچھا تھا میں نے دل کھول کر تعریف کی یہ افسانہ جو اس نے کرشن چندر سے چوری چھپے لکھا تھا رسالہ ہمایوں (لاہور) میں شائع ہوا۔ کرشن چندر نے جب اسے دہلی میں پڑھا انھیں مسرت کے علاوہ حیرت بھی ہوئی۔ انھوں نے مہندر ناتھ کو لکھا "یقین نہیں آتا یہ افسانہ تم نے لکھا ہے۔ اگر واقعی تم ایسے خوب صورت افسانے لکھ سکتے ہو، تو اب تک نہ لکھ کر اپنے علاوہ ادب پر بھی ظلم کرتے رہے ہو۔"

کرشن چندر سے داد پا کر اس کا دل کنول کی مانند کھل اٹھا۔ اس نے متعدد کامیاب افسانے لکھے۔ اس کے ایک افسانہ پر مولانا صلاح الدین احمد ایڈیٹر ادبی دنیا نے اپنے تعریفی نوٹ میں لکھا۔ مہندر ناتھ کے افسانے حقیقت سے اتنے قریب ہوتے ہیں کہ مصنف پر افسانہ طرازی کی تہمت نہیں لگائی جا سکتی۔

مہندر ناتھ کا شمار افسانہ نویسوں کی نئی نسل میں ہونے لگا۔ شہرت اور ہر دلعزیزی نے اس کے قدم چومے لیکن وہ خوش نہ تھا۔ اس کے حاسدوں نے خبر اڑا رکھی تھی کہ اس کے افسانوں کے مصنف کرشن چندر ہیں۔ ایک دن بڑے اداس لہجے میں کہنے لگا۔ "کرشن چندر کا چھوٹا بھائی ہونا بھی بڑی مصیبت ہے۔"

"کیوں؟"

"چاہے کتنا ہی زور مارو۔ لوگ یہی کہیں گے۔ مہندر کے افسانے کرشن چندر کے لکھے ہوئے ہیں۔"

"یہ تو ایک بہت بڑا خراجِ عقیدت ہے جو تمھیں پیش کیا جاتا ہے۔"

"لیکن لوگ یہ کیوں نہیں سمجھتے کرشن کا اپنا رنگ ہے میرا اپنا رنگ ہے۔"

"ممکن ہے تم نے کرشن چندر کا رنگ اڑانے کی کوشش کی ہو۔" میں نے شرارتاً کہا۔

"کرشن چندر کا رنگ جو ادیب بھی اڑانے کی کوشش کرتا ہے اس کا اپنا رنگ اڑ جاتا ہے۔"

"تمہارے خیال میں کرشن چندر اور تمہارے افسانوں میں کیا فرق ہوتا ہے؟"

"کرشن چندر فطرتاً شاعر، خطیب اور طنز نگار ہیں عموماً وہ سیکس (sex) سے دامن بچا کر گذر جاتے ہیں عافیت سمجھتے ہیں میں سیکس کو شجر ممنوعہ نہیں سمجھتا۔ سیکس اتنی ہی بڑی حقیقت ہے جتنی کہ بھوک یا پیاس۔ میں نثر میں شاعری نہیں کرتا میں سمجھتا ہوں نثر کو نثر ہی رہنے دیا جائے تو بہتر ہے۔"

چھ سال بعد اگست 1946ء میں مہندر ناتھ سے میری آخری ملاقات بمبئی میں ہوئی۔ اس وقت وہ کرشن چندر کی فلم "سرائے کے باہر" میں بطور ہیرو کام کر رہا تھا۔ بڑے تپاک سے ملا۔ باتوں باتوں میں کہنے لگا۔ "آخر بڑے بھائی نے مجھے ہیرو بنا دیا۔"

"لیکن تم نے تو کرشن چندر کو آج سے دس سال پہلے ہیرو بنا دیا تھا۔" میں نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ شاید اس نے حساب بیباق کرنے کے لئے ایسا کیا ہے۔"

"ہیروئن کون ہے؟"

"ایک مشہور فلم اسٹار ہے جس کی جوانی ڈھل چکی ہے۔"

"پھر تم سے تو خوب محبت کرتی ہوگی؟"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن لوگ کہتے ہیں مجھے ایڈی پس کمپلکس ہو گیا ہے۔ محبوبہ کی بجائے ایک ماں سے عشق کر رہا ہوں۔"

ان دنوں وہ دادر میں ایک علیحدہ فلیٹ میں رہ رہا تھا۔ میں نے پوچھا "کرشن چندر کے ساتھ کیوں نہیں رہتے جب کہ اس کے پاس بہت بڑی دو منزلہ کوٹھی ہے؟"

"یوں ہی۔"

"کیا کرشن چندر کو اعتراض ہے؟"

"نہیں۔"

"کیا بھابی اعتراض کرتی ہیں۔؟"

"نہیں۔"

"پھر تم خواہ مخواہ کرایہ کیوں ادا کر رہے ہو؟"

"کیوں کہ خیر سے اب میں شادی شدہ ہوں اور آپ جانتے ہیں جیسے ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں۔ ایک کوٹھی میں دو بیویاں زیادہ دیر اکٹھی نہ رہ سکیں گی ــــ خیر چھوڑیئے، آیئے آپ کا تعارف اپنی بیوی سے کراؤں۔"

وہ مجھے اپنے فلیٹ میں لے گیا۔ ایک پلنگ پر ایک اچھے خد و خال اور بھرے جسم والی خاتون سو رہی تھی۔ مہندر نے اُسے جگاتے ہوئے کہا۔ "انٹرنیشنل لیڈی اٹھو اور دیکھو تمہارے گھر میں کون آیا ہے۔"

وہ آنکھیں ملتی ہوئی اٹھی اور مجھے نمستے کرنے کے بعد کہنے لگی۔ "میں تو انھیں نہیں جانتی۔"

"یہ میرے بڑے بھائی ہیں۔"

"آپ کے بڑے بھائی تو کرشن چندر ہیں۔"

"یہ کرشن چندر سے بھی بڑے بھائی ہیں۔ کیا سمجھیں۔ انٹرنیشنل لیڈی۔"

میں نے مہندر سے پوچھا ۔" انٹرنیشنل لیڈی ۔اس ترکیب کا کیا مطلب ہے ؟"
اُس نے ہنستے ہوئے جواب دیا ۔" میں اسے انٹرنیشنل لیڈی کہتا ہوں ۔ یہ کلکتہ ، مدراس ، بنگلور اور خدا جانے کہاں کہاں رہی ہے ، بہت سی زبانیں جانتی ہے ، رات کو مجھے سونے نہیں دیتی اور دن میں بستر سے اٹھنے کا نام نہیں لیتی ۔"

" لیکن تم ایک ، دوسرے سے قریب کیسے آئے ۔؟"

" ہم لکڑی کے دو ٹکڑے تھے جو الگ الگ بحرِ زندگی میں بے مقصد بہے جا رہے تھے ، ساحل ہماری قسمت میں نہ تھا ایک لحت ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا جس نے ہمیں اکٹھا کر دیا ۔"

مسز مہندر ناتھ نے بڑی اچھی چائے پلائی ۔ ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں ۔ اتنے میں مسز مہندر ناتھ کی دو سہیلیاں جو ڈانسر تھیں ، وہاں آئیں ۔ ان میں سے ایک نے ڈانسنگ سے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے کہا ۔" میں تو کل سے ڈانسنگ چھوڑ رہی ہوں ۔"

مسز مہندر ناتھ نے پوچھا ۔" کیوں ؟"

" ڈانس کرتے وقت ذرا سی غلطی ہو جائے ڈانس ماسٹر بڑی بے دردی سے پیٹتا ہے ۔"

مسز مہندر ناتھ نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہا ۔" لیکن ۔ بس پٹنے سے ڈر گئیں زندگی میں جب تک آدمی اچھی طرح نہ پٹے کچھ نہیں بن سکتا اور پھر آرٹ تو ریاض چاہتا ہے ۔ اگر ریاض سے جی چراؤ گی تو آرٹسٹ کیسے بنو گی ۔؟"

مہندر ناتھ مسکرا کر بولا ۔" بات تو تم ٹھیک کہتی ہو ۔ میں کبھی سوچ رہا تھا افسانہ نویسی سے توبہ کر لوں ۔ لیکن اب نہیں کروں گا ۔ میں ریاض کروں گا ، پٹنے کے لئے ہمیشہ تیار رہوں گا ۔"

مہندر ناتھ نے جی توڑ کر ریاض کیا ۔ خوبصورت افسانوں اور جاندار ناولوں کے متعدد مجموعے شائع کئے ۔ لیکن اُسے آسودگی اور خوش اقبالی نصیب نہ ہوئی ۔ اُس کی ہر آرزو جوان ہونے سے پہلے دم توڑ گئی ۔ زندگی اس کو پیٹتی رہی ، وہ چپ چاپ پٹتا اور مسکراتا رہا ۔ بے تکلف احباب کے ساتھ محفلوں میں قہقہے لگاتا اور دھومیں مچاتا رہا ۔ اپنے آپ کو فریب دیتا رہا کہ گردش کے دن جلد یا بدیر ختم ہو جائیں گے ۔ حتیٰ کہ وہ خود ختم ہو گیا ۔ مجاز لکھنوی نے شاید اسی کے بارے میں یہ قطع کہا تھا ۔

دل کو بہلاتا تھا آخر دل کو بہلاتا رہا
میں بہ ایں سوزِ دروں ہنستا رہا گاتا رہا
مجھ کو احساسِ فریب رنگ و بو ہوتا رہا
میں مگر پھر بھی فریب رنگ و بو کھاتا رہا

کچھ سمجھ میں نہیں آتا یہ عقیدت کا خراج
قدرِ فن ہوتی ہے اِس دَور میں فن کار کے بعد

روحی علی اصغر

راہی معصوم رضا

حکیم ناشاد عرف مہندر ناتھ

جنوری ۷۴ء سنہ ۶۔ مہندر ناتھ تھے۔ جنوری ۷۵ء سنہ ۶ مہندر ناتھ نہیں ہیں۔ جب مہندر ناتھ تھے تو ان پر لکھنے کا خیال نہ آیا اور جب مہندر ناتھ نہیں ہیں تو لکھنے کی ہمت نہیں ہو رہی ہے۔ کیونکہ جس عہد میں ہم تمام ادیب اپنے آپ کو روشنائی کے لئے بیچ رہے تھے اس عہد میں مہندر ناتھ نے روشنائی کے لئے بھی اپنے آپ کو نہیں بیچا۔ ہم سب نے اپنے بکنے کا کوئی نہ کوئی جواز ڈھونڈ لیا۔

روشنائی کے لئے اپنے کو بیچا کئے ہم
تاکہ صرف اس لئے کچھ لکھنے سے باقی نہ رہے
کہ قلم خشک تھے اور لکھنے سے مجبور تھے ہم!

پر مہندر ناتھ نے کسی شرط پر حالات سے صلح نہیں کی۔ ایک شعر یاد آیا!

مصلحت کی شرطوں پر رہن دل نہیں رکھتے
جان بیچ دیتے ہیں، قرض اتارنے والے

مہندر نے جان دے کر زندگی کا قرض اتار دیا اور ہم لوگ آڈیٹوریم میں بیٹھے ہیرو کی ہیروئک موت پر خوش ہو کر تالیاں بجا رہے ہیں۔ رو رہے ہیں کہ وہ مر گیا۔ خوش ہیں کہ ہم نہیں مرے۔ ویسے بھی کھاتہ دیکھا جائے تو مہندر ناتھ کے مرنے سے نقصان کم ہوا۔ فائدے زیادہ ہوئے۔ درگا (مہندر کی بیوہ) کو ۲۴ انچ کا ایک ٹیلیویژن مل گیا۔ یہ ٹیلیویژن اسے مہندر ناتھ کی زندگی میں نہیں مل سکتا تھا۔ کیونکہ مہندر کے پاس ٹیلیویژن پر خرچ ہونے والے روپے ہی نہیں تھے۔ آج درگا کی تین چار سو روپے ماہوار کی مستقل آمدنی ہے۔ مہندر کی زندگی میں یہ آمدنی نہ تھی نہ ہو سکتی تھی۔ دوستوں کو غم غلط کرنے کے لئے شراب پینے کا بہانہ مل گیا۔ ریوتی۔ راہی معصوم رضا۔ آنند رومانی۔ نیاز حیدر ......سب کو مہندر کی زندگی پر تقریر کرنے کا موقع ——

اُس ہال کے دل پھر گئے جس میں مہندر زندہ تھے۔ اور بالکل شریف بہوؤں کی طرح جس ہال سے پھر ان کی لاش نکلی میرے خیال میں شری ساؤنڈ کے پیچھے والی گلی نے اپنی زندگی میں اتنی کاریں اور اتنے پڑھے لکھے لوگ نہ دیکھے ہوں گے فلمی اور غیر فلمی ادیب۔ ہندی۔ اردو۔ انگریزی اور مراٹھی کے صحافی۔ کئی بڑے ڈائرکٹر۔ کئی ہیرو۔ کئی بڑے رسالوں کے ایڈیٹر...... بڑا ہنگامہ تھا۔ بڑی چہل پہل تھی۔ لوگ الگ ٹکڑیوں میں کھڑے تھے۔ بات ہر جگہ مہندر کی بے وقت موت سے شروع ہوتی اور پھیل جاتی۔ فلمی اسکینڈلز۔ ریلیز ہونے والی فلمیں ......سلیم جاوید اور کے۔ نارائن وغیرہ کی برائی۔ درگا کی فکر۔ کرشن جی کی تنہائی کا خیال ...... ریوتی کہہ رہی تھی کہ وہ مہندر میموریل فنڈ کے لئے لاکھ دو لاکھ جمع کر سکتے ہیں۔ صابر دت اس مہندر نمبر کا ذکر کر رہے تھے جو مہندر کے اظہار تمنا پر انہوں نے ترتیب دینا شروع کر دیا تھا...... غافل ہرنالوی اپنی بھاری آواز میں اپنے آپ کو مہندر کا پرسہ دے رہے تھے۔ ادریس دہلوی چپکے چپکے ایک گروہ سے دوسرے گروہ شامل ہو رہے تھے۔ جیسے چل نہ رہے ہوں سرگوشی کر رہے ہوں......

اور مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ مرنا شاید جینے سے زیادہ دلچسپ اور کارآمد کام ہے کیونکہ شاید ہم سب کو مہندر کے مرنے کے بعد پتہ چلا کہ وہ کتنا اہم آدمی تھا۔ وہ دس پانچ برس پہلے مر گئے ہوتے تو جوانامرگ کا خطاب بھی مل گیا ہوتا۔ موت زیادہ دھوم دھام کی بھی ہوئی ہوتی کیونکہ تب انجمن ترقی پسند مصنفین کی پوری طاقت بھی بڑے اہتمام سے مہندر کا سوگ منا رہی ہوتی۔ پر یہ مہندر ناتھ اپنے بارے میں سوچتے ہی نہیں تھے یعنی آدمی مرنے کے لئے صحیح زمانہ تک انتخاب نہ کر سکا۔ مہندر میں دنیوی سمجھداری تھی ہی نہیں۔ سابق کلاس فیلو اور حال منسٹر آئی۔ کے۔ گجرال نے باندرہ میں دو بیڈ روم ہال کا فلیٹ دینے کا وعدہ کیا تو یہ پاگل آدمی سٹھن گیا کہ میں تو نہیں رہتا۔ چار سو فلیٹ دو۔ میں میں نہیں، فلم رائٹرز ایسوسی ایشن ہوں! .....“ٹھیک کہا ہیں آپ مہندر جی“: دو بیڈ روم ہال کا فلیٹ آپ سے بڑا تھا اور آپ کے مرنے کے بعد بھی آپ سے بڑا ہے۔ درگا آج اس فلیٹ کو بیچتیں تو لکھ پتی ہو گئی ہوتیں! پر مہندر کو تو یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ لاکھ روپے ہوتا کیا ہے۔ کیونکہ مہندر ناتھ پیدائشی پاگل تھے ان کے ناول رات اندھیری ہے، میں ایک کردار ہے حکیم ناشاد کا جو بڑے پرخلوص اور صاف گو آدمی،، تھے۔ یہ خیال ہے ناول کے ہیرو جگدیش کا جو بی اے پاس ہے۔ مہندر جی بھی بی اے پاس تھے! پر مجھے جگدیش سے زیادہ حکیم ناشاد میں مہندر کی جھلک ملی۔ حکیم ناشاد کی آواز بھی مہندر سے ملتی ہے۔ سنئے۔!

”اس کمرے میں بھی لکھتا ہوں۔ اس غربت کے باوجود کتابیں پڑھتا ہوں.....میں پاگل نہیں.....ہوش مند الشان ہوں کھرے کھوٹے میں تمیز کر سکتا ہوں۔ ہاں یہ ٹھیک ہے کہ میں کسی کی چاپلوسی نہیں کر سکتا۔ کیا کروں یہ میری فطرت ہے۔“

(رات اندھیری ہے ص: ٦١)

مہندر ناتھ کا المیہ یہی تھا کہ وہ پاگل نہیں، ہوش مند تھے، کھرے کھوٹے میں تمیز کر سکتے تھے۔ ہاں یہ ٹھیک ہے کہ کسی کی چاپلوسی نہیں کر سکتے تھے۔ مہندر ناتھ یہی تو ٹھیک نہیں تھا۔ کیونکہ یہی ان کی فطرت تھی —— ایسے ہی تو ٹھیک نہیں تھا!

وہ چلائی! جگدیش۔ جگدیش......اس کی آواز سارے محلہ میں پھیل گئی ایک آدمی دوسرے کمرے سے نکل آیا۔

”کیا بات ہے میڈم۔“

”یہ جگدیش دروازہ نہیں کھولتا۔“

”دیکھتی نہیں۔ دروازہ بند ہے۔ تالا لگا ہوا ہے۔ اندر کوئی نہیں۔ صرف روشنی ہے“

رات اندھیری ہے: ص۔ ١٣٦

اندر باہر کیا ہے مہندر جی۔ نہ دروازہ ہے، نہ تالا، نہ روشنی، نہ جگدیش ...... باہر تو صرف اندھیرا ہے اور پوچھ سے بھاگ کر مہندر ناتھ کے پاس آئی ہوئی کنواری آتما کا دم گھٹ رہا ہے.......... کوئی اسے چوتھے مالے سے نیچے ڈھکیل دیتا اور وہ مر جاتی تو شاید مہندر جی لیتے ...... پر مہندر اس قیمت پر جینا چاہتے ہی نہیں تھے۔ اچھا ہوا مر گئے کیونکہ اس جہانِ کم و بیش میں جینا ان کے بس کا روگ نہیں تھا۔

قرۃ العین حیدر

جہاں میں رہتا تھا

جس زمانے میں ترقی پسند تحریک زوروں میں جاری تھی۔ آئے دن رسالوں میں ایک سے ایک اچھے افسانے شائع ہوا کرتے تھے۔ اُن میں سے بہت سے افسانے آج "کلاسیک" کی حیثیت رکھتے ہیں (گو اردو نقادوں نے اس لفظ کی بھی کافی درگت بنائی ہے) ان افسانوں کے خالق بہت سے ادب سے ریٹائر ہو گئے۔ کچھ نے خود استعفےٰ دیدیا، بہت سوں کو زندگی کھا گئی۔ چند ایک کو موت نے آوازدی اور وہ اُدھر لپک گئے۔ مرنے والوں میں اکثر جوانمرگ تھے کہ بوجوہ اردو ادیب کا عمرِ طبعی تک پہنچنا کافی جان جوکھوں کی مہم ہے۔

جس زمانہ کی میں بات کر رہی ہوں شاید 'ساقی' میں ایک افسانہ چھپا تھا "جہاں میں رہتا ہوں"، بہت اچھا افسانہ تھا اسی وجہ سے اب تک یاد رہ گیا۔ مصنف کا نام مہندر ناتھ تھا۔ بمبئی کی ایک عمارت اور اس کے مکینوں کے متعلق تھا۔ اردو میں بمبئی کی فٹ پاتھوں، سیٹھوں، طوائفوں، فلم ایکٹرلیسوں، انڈر ورلڈ کے باسیوں اور "چالوں" کی زندگی کے متعلق ایک عظیم الشان لٹریچر تخلیق کیا جا چکا ہے لیکن جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، اس ہیبت ناک سماجی المیے کے بارے میں جس کا نام بمبئی ہے خصوصاً اس کی "چال سسٹم" کے متعلق یہ پہلا افسانہ تھا جو میں نے پڑھا۔

معلوم ہوا کرشن چندر کے چھوٹے بھائی ہیں فلموں سے وابستہ ہیں۔ پھر "سرائے کے باہر" کی چند تصاویر دیکھیں جن میں موصوف ہیرو تھے۔ خواجہ احمد عباس کی پہلی فلم "دھرتی کے لال" میں بھی کام کیا تھا۔

۱۹۵۶ء میں چندر دز کے لئے اپنی ایک دوست وملا سماّل سے ملنے بمبئی آئی تھی۔ ایک روز عصمت آپا نے باضابطہ ڈنر پر سب ادیبوں کو بلا کر ملوایا۔ مہندر ناتھ بھی تھے۔ حسبِ معمول بیحد ہُوحق کی محفل تھی لیکن مہندر ناتھ بہت کم گو معلوم ہوئے۔ رات گئے عصمت آپا کے انڈس کورٹ اے روڈ سے کمبا ٹا بلڈنگ، مسز سماّل کے گھر پہنچانے کے لئے لوگ ایروس تک پیدل آئے۔ چرچ گیٹ کے چوراہے پر مہندر ناتھ نے خدا حافظ کہا اور چرمی بیگ سنبھالے سر جھکائے سنسان سڑک پر فلورا فاؤنٹین کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس وقت مجھے اچانک خیال آیا اس ساری ہُوحق اور ہنگامہ آرائی کے بعد یہاں کے بیشتر رہنے والوں کی زندگی دراصل یہ ہے۔ مسلسل جدوجہد اور اکیلے راستے۔

پچھلے دس بارہ سال میں افسوس کہ مہندر ناتھ سے ملنے کا بہت ہی کم اتفاق ہوا۔ کرشن چندر کی علالت کے زمانے میں چھوٹے بھائی کی پریشانی اور وحشت دیکھی نہ جاتی تھی۔ اُن دنوں کرشن جی کی طبیعت کا احوال مہندر ناتھ کی صورت پر پڑھا جا سکتا تھا۔ اگر طبیعت بہتر نہیں تو موصوف بے حال۔ اگر کرشن جی کو افاقہ ہے تو آپ نہال نہال۔ کھِلے جا رہے ہیں۔ بھائی پر بس جان دیے دیتے تھے اور کرشن جی ان کی صورت دیکھ کر جیتے تھے۔

آخری ملاقات ۱۹۷۲ء میں السٹریٹیڈ ویکلی کے دفتر میں ہوئی۔ فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کے کسی کام سے آئے تھے۔ کسی سے جھگڑا ہو

گیا تھا اس کا ذکر کر رہے تھے، خفا تھے مگر نہایت وضع داری کے ساتھ۔

شہر بمبئی میں بڑے بڑے جغادری ادبا و شعرا، سے جب سال دو سال بعد اتفاقیہ کہیں ملاقات ہوتی ہے تو مکالمہ کچھ اس طرح ہوتا ہے:

میں: اور سنائیے۔ کیا حال چال ہیں، آج کل آپ کون کونسی فلمیں لکھ رہے ہیں؟

وہ: "ترپ چال" اور "حسین ڈاکو"۔

میں: آپ کا "چار سو بیس معشوق" تو ہٹ گیا۔

وہ: جی شکریہ۔ اب ہیما مالنی کو سائن کیا ہے۔ پکچر خود ڈائریکٹ کرنے کا ارادہ ہے۔

مہندر ناتھ کبھی فنا فی الفلم تھے مگر اردو ادب کو طلاق ثلاثہ نہیں دی تھی۔ اس فکر میں بھی رہتے تھے کہ ایک عدد رسالہ نکالیں گے۔

مہندر ناتھ کی شرافت اور نیک نفسی ان کی پوری شخصیت سے آشکار تھی۔ اپنے بڑے بھائی اور سارے خاندان اور اپنی پتی درتا بیوی درگا سے مہندر ناتھ کو جیسی محبت تھی وہ دیکھنے سننے میں ذرا کم ہی آتی ہے۔

میں بمبئی سے باہر گئی ہوئی تھی واپس آئی تو معلوم ہوا کہ مہندر ناتھ کا انتقال ہو گیا۔ شاہد لطیف کی روانگی کی طرح یہ بھی ایک بےحد اچانک، در بے وقت موت تھی۔ مجھے معلوم نہیں تھا مہندر ناتھ کہاں رہتے تھے کرشن جی اور سلمیٰ کے ساتھ ان کے ہاں گئی یعنی مہندر ناتھ کے گھر اُن کے مرنے کے بعد گئی۔ ایسا بھی صرف اسی شہر میں ہو سکتا ہے۔

بلڈنگ کے دروازے پر پہنچ کر معاً وہ برسوں قبل پڑھا ہوا افسانہ نظروں کے سامنے آ گیا —— جہاں میں رہتا ہوں —— وہی مکین، وہی اداسی اور بے رنگی اور غربت اور گھٹن اور سماجی ٹریجڈی۔ اس طویل عرصے میں دنیا بدل گئی۔ نئے دھن والوں نے اسی شہر میں ایسے محل بنوائے جن کے سوئمنگ پول کے بلوریں فرش کے نیچے ڈرائنگ روم ہوتے ہیں مگر اس اللہ کے بندے نے محض اصول پرستی کی خاطر اس چال کو نہ چھوڑا۔ لفظ 'چال' ہی بہت سے لوگوں کے لئے بڑا حجابات انگیز ہوگا یعنی گو آپ "ادب میں طبقاتی شعور" پر زبردست مقالے تصنیف فرمائیں لیکن عین ممکن ہے کسی کو یہ بتانا پسند نہ کریں کہ آپ کے اپنے رشتے دار یا قریبی دوست کسی 'چال' میں رہتے ہیں۔ بات یہ ہے صاحب کہ وہ انقلاب جس کی خبریں گرم تھیں کہ آنے والا ہے اس افواہ کو بھی ٹھنڈا پڑے زمانہ ہو گیا۔

مہندر ناتھ نے اپنے ایک افسانے "پتھر کے بت" میں جو ان کے مجموعے "تنہا تنہا" میں شامل ہے ایک شراب نوشی کی پارٹی کی منظر کشی کرتے ہوئے لکھا ہے:

"دیوندر کو اپنے آپ پر غصہ آیا۔ اپنے ساتھیوں پر نگاہ ڈالی۔ ان لوگوں کو کیا ہوا۔ یہ خاموش کیوں رہے۔ ہم نے اپنے متعلق کیا کچھ نہ سوچا تھا۔ دوسروں کے متعلق کیا کچھ نہ سوچتے تھے، ہم تو انقلاب کے نقیب تھے ہم میں سے بہت سے گولی کھا کر مر گئے۔ کچھ فاقوں کی تاب نہ لا کر چلتے بنے، کچھ زیادہ شراب پی کر راہی ملک عدم ہوئے۔ کچھ ایک فلیٹ اور کار لے کر مر گئے —— لیکن انسانیت، اخوت، مساوات، انقلاب اور لفظ ساتھی —— یہ ایک لفظ تھا۔ اس کا مفہوم کیا تھا۔ کس کی زبان سے نکلا تھا کیا ہم واقعی ایک دوسرے کے ساتھی تھے —— اور ہیں ——؟"

مہندر ناتھ کو اس لفظ ساتھی کے معنی معلوم تھے۔ ان کے مرنے کے بعد ہی لوگوں کو یہ پتہ چلا کہ ان کے پرانے دوست اندر گجرال نے انہیں اس چال میں دیکھ کر کہا تھا کہ تمہارے لئے ایک اچھے فلیٹ کا بندوبست کئے دیتا ہوں۔ مہندر ناتھ نے جواب دیا۔ آپ کو میرے لئے ایک نہیں تین سو (۳۰۰) فلیٹوں کا بندوبست کرنا پڑے گا کیونکہ میری طرح تین سو ادیب بمبئی میں اسی حالت میں چالوں میں رہتے ہیں۔

میں نے یہ واقعہ اندر ملہوترہ کو سنایا انھوں نے دوسرے روز "ٹائمز آف انڈیا نوٹ بک" میں اس کا تذکرہ کیا لیکن آج تک

کسی نے ایسی باتوں سے نصیحت حاصل کی ہے کہ لوگ مہندر ناتھ کی اصول پرستی اور انسان دوستی سے کوئی سبق سیکھیں گے۔

اور سرائے کے باہر ایک آخری تصویر: جوانمرگ مہندر ناتھ کی ارتھی اس سرائے سے اٹھا کر بن گنگا گھاٹ لے جائی جا رہی ہے جہاں رہ کر انھوں نے بدلتی ہوئی حیرت انگیز دنیا کا تماشا کیا ▲

اپنے بارے میں

میرے دو محبوب موضوع ہیں۔ ایک تو انسانوں کے "جنسی مسائل" اور دوسرا "عوام کی غربت"۔ ان دو موضوعات کے ارد گرد میں افسانوں اور ناولوں کے تانے بانے بنتا رہتا ہوں۔ اس ٹکنالوجی کے دور میں غربت تو مٹائی جا سکتی ہے جو ابھی تک ہندوستان سے نہیں مٹائی گئی۔ یوں میرا ایمان اشتراکیت پر ہے، ایسی اشتراکیت جہاں فرد کی انفرادی شخصیت پروان چڑھ سکے اور ہندوستان سے بھوک اور بیکاری کا خاتمہ ہو۔ جہاں تک ادب اور انسانوں کے بنیادی مسائل کا تعلق ہے انہیں کس طرح ادب میں سمونا چاہئے، اس کے بارے میں میں یہ عرض کروں گا کہ چاہے افسانہ ہو یا ناول، غزل ہو یا نظم — ان میں اگر جاذبیت نہیں، کشش نہیں، شگفتگی نہیں، جمالیاتی حسن نہیں ہے تو ادب پھیکا اور بے رس رہے گا۔ زبان کی لطافت اور چاشنی، اندازِ بیان، لفظوں کی نشست، تکنیک، جذبے اور خیال کا ہم آہنگ ہونا، کردار اس قسم کے تخلیق کئے جائیں کہ ہم کہہ سکیں، ایسے کردار ہم نے دیکھے ہیں یا ایسے کردار دنیا میں ہو سکتے ہیں۔ اگر ان تمام چیزوں پر نظر رکھی جائے تو ایسا ادب تخلیق کیا جا سکتا ہے — یوں اچھے ادب کی کنجی کسی کے ہاتھ میں نہیں ہوتی۔ بڑھیا گیہوں تو پیدا کیا جا سکتا ہے مگر بڑے ادیب کیسے پیدا ہوتے ہیں ابھی تک انسان کوئی ایسی مشین ایجاد نہیں کر سکا جس کی مدد سے وہ ٹالسٹائے، داستوؤسکی، غالب، کرشن چندر یا فیض احمد فیض پیدا کر سکے۔

مہندر ناتھ

مہندر ناتھ

جہاں میں رہتا ہوں

میں دن رات یہی سوچتا رہتا ہوں کہ تمہیں کیا لکھوں، وہ کون سا مضمون ہے، جس پر ادیبوں نے خامہ فرسائی نہیں کی۔ تم نے لکھا ہے کہ تم عورت کی محبت کے متعلق کیوں نہیں لکھتے، یہ قصہ بہت پرانا ہو چکا، اور میں نے عورت کی محبت کے متعلق اتنا لکھا ہے کہ میرا جی ان باتوں سے اُکتا گیا ہے، اب جی چاہتا ہے کہ میں اپنے متعلق لکھوں، کچھ اپنی اداسی، اپنے غم، اپنے دُکھ کی نسبت، شاید تم، اس اُداسی، اس غم، اس افسردگی میں اہلِ دل کی اُداس روح کی ایک جھلک دیکھ سکو۔!

یہ تو تمہیں معلوم ہی ہوگا کہ میں کتنی دور سے چل کر یہاں آیا ہوں، کشمیر کی حسین وادیوں کا چکر کاٹ کر، پنجاب کے حسن سے متاثر ہو کر، دہلی اور لکھنؤ کا طواف کر کے، اور پونا کے ملیریا بخار سے سیراب ہو کر بمبئی پہنچ گیا ہوں، آخر اتنا لمبا سفر کیوں ---؟ کیا اتنی پھیلی ہوئی دنیا میں میرے لئے کوئی مقام نہ تھا کہ میں ہندوستان کے ایک کونے سے چل کر دوسرے کونے تک پہنچ گیا ہوں۔ پھر بھی مجھے سکون نہیں ملتا، راحت نصیب نہیں ہوتی، خوشی محسوس نہیں ہوتی۔

لوگوں نے بمبئی کی عمارتوں کی تعریف کی ہے۔ بمبئی کی ٹراموں اور بسوں، اور ریلوں کو سراہا ہے۔ لیکن میں ان فلک بوس عمارتوں سے کبھی مرعوب نہیں ہوا، مجھے ان ٹراموں اور بسوں میں بیٹھ کر کبھی خوشی محسوس نہیں ہوئی، ہاں جب کبھی سمندر کے کنارے جاتا ہوں، تو دل کو سکون سا مل جاتا ہے، یہ پھیلا ہوا وسیع سمندر، اور اس پر کالے کالے جھکے ہوئے بادل، جیسے کسی دوشیزہ کے سیاہ بال --- اور دور، بہت دور، ایک کشتی لہروں پر ہچکولے کھاتی ہوئی ایک نامعلوم منزل کی طرف رواں، اور پھر سمندر کے کنارے ناریل کے درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ ناریل کے درخت خوب لمبے ہوتے ہیں، سرد اور یوکلپٹس کے درختوں سے بھی اونچے اور لمبے۔ جب ہوا زور سے چلتی ہے تو یہ درخت ہوا میں جھومتے اور لہراتے اور آپس میں ایک عجیب انداز سے سرگوشیاں کرتے ہیں اور رات کے وقت جب ہوا ان درختوں میں سے گزرتی ہے تو ایک عجیب سی سرسراہٹ پیدا ہوتی ہے۔ ان کے لانبے لانبے پتے ہوا میں لہراتے ہیں، کسی جوان لڑکی کے آوارہ بالوں کی طرح --- چاند کسی شرمائی ہوئی دلہن کی طرح ان لانبے درختوں کی اوٹ میں چھپا رہتا ہے، لیکن چاند کی شعاعیں کرنیں سمندر کی لہروں سے ہم آغوش ہوتی ہیں۔ ان کو چومتی ہیں۔ ان سے کھیلتی ہیں، لہریں بڑھتی ہیں اور ساحل سے ٹکرا کر پیچھے ہٹ جاتی ہیں۔ شور بڑھتا ہے اور پھر مدھم ہو جاتا ہے۔ ریت کے ذرے ان چمکتی ہوئی کرنوں میں چمک اٹھتے ہیں اور سمندر کی ٹھنڈی، تازہ، پاک اور صاف ہوا، ناریل کے درختوں میں سے گزرتی ہوئی ایک اداس نغمہ پیدا کرتی ہے۔

بمبئی میں مجھے تین چیزیں پسند آئی ہیں، سمندر، ناریل کے درخت، اور بمبئی کی ایکٹرس۔ اصل میں ان تین چیزوں سے بمبئی زندہ ہے، اگر ان تین چیزوں کو بمبئی سے نکال دیا جائے تو بمبئی بمبئی نہ رہے، شاید دہلی بن جائے، یا لاہور، دہلی ایک معمولی، بے کیف سا شہر ہے یہاں کیوں

آیا؟ اسکی وجہ تم جانتے ہی ہو، وہی پرانی، روزگار کی تلاش، پیٹ کا مسئلہ بہت بڑا ہے۔ گو انسانوں نے ابھی تک اس مسئلے کا کوئی حل ڈھونڈ نہیں لیا۔ اگر اس مسئلے کا کوئی خاطر خواہ حل ہوتا تو بنگال میں اتنی موتیں نہ ہوتیں، یہ ہولناک جنگ بپا نہ ہوتی، یہ بھوک، یہ غریبی، یہ پیاس نہ ہوتی، اس وقت میری جیب میں صرف چار آنے ہیں، اور باہر ناریل کے پتوں پر سورج کی کرنیں رقص کر رہی ہیں، اور دور گرجے کی صلیب پر ایک کوا کائیں کائیں کر رہا ہے۔ اور میری بھوک ہر لمحہ بڑھتی جا رہی ہے، لیکن مجھے روزی کی اتنی فکر نہیں، آخر پیٹ بھرنے کو کچھ نہ کچھ ضرور مل جاتا ہے، کہیں نہ کہیں تم ایسا دوست مل جاتا ہے اور پھر ہم دونوں کسی ریستوران میں چلے جاتے ہیں، اور کھانا کھاتے ہیں۔ میں کبھی کبھی اپنے دوستوں سے روپے ادھار لے لیتا ہوں، مگر یہ روپے کبھی واپس نہیں کرتا۔ کہو یہ کمینہ پن ہے۔ مجھے اس کی پروا نہیں، بھوک ہی کمینہ پن سکھاتی ہے، سرمایہ دار مزدور کی روزی چھین کر عالی شان محل تیار کرتا ہے، فیکٹریاں بناتا ہے اور بال بچوں کو تعلیم دلانے کے لئے یورپ بھیجتا ہے۔ تو کیا یہ کمینہ پن نہیں؟ جابر کمزور کو مغلوب کر کے ایک عالی شان سلطنت کی بنیاد رکھتا ہے، کیا یہ کمینہ پن نہیں؟ حاکم محکوم کو کچل کر، پیس کر، حکومت کرتا ہے، کیا یہ رذالت نہیں؟ اور اگر میں اپنے مالدار دوستوں سے چند ٹکے قرض لے لیتا ہوں تاکہ اپنی بھوکی انتڑیوں کو بہلا سکوں، تو کیا میں کمینہ ہو گیا؟ چھوڑو میاں۔ تمہارے سماج کی عجیب قدریں ہیں، اور میں ہر گام، ہر قدم پر اور ہر منٹ اور ہر سکنڈ ان کھوکھلی قدروں کو توڑنا چاہتا ہوں، ان قدروں کا مضحکہ اڑانا چاہتا ہوں۔ چاہے تم مجھے کمینہ کہو یا گنوار۔

پہلے میں شیواجی پارک میں رہتا تھا، یہ جگہ ایکٹر اور ایکٹرسوں کی پسندیدہ ترین جگہ ہے۔ شیواجی پارک کے چوک میں کھڑے ہو کر تم تمام ایکٹروں اور ایکٹرسوں کو دیکھ سکتے ہو۔ سڑک کی ہر نکڑ پر، کسی نہ کسی موڑ پر، حلوائی کی دوکان پر یا ایرانی کے ریستوران میں۔ تم ایکٹروں کو دیکھ سکو گے یہ لوگ ایسے ہی عامیانہ انداز سے رہتے ہیں جیسے تم یا میں۔ یہاں آکر ایکٹر اور ایکٹرسوں کو دیکھنے کو جی نہیں چاہتا، کیونکہ ہر روز تم انہیں دیکھ سکتے ہو، اور جو چیز ہر روز دیکھی جائے۔ اس کی دلکشی جاتی رہتی ہے۔

تم نے یونہی پرتیما کی تصویر مانگی ہے، ارے بھئی، چھوڑو ان ایکٹرسوں کو، کیوں دردسر مول لیتے ہو۔ بے چاری پرتیما اب کافی موٹی ہو گئی ہے، کسی اور ایکٹرس کا نام لو۔ کوئی ہو بھی تو۔ شاید مہتاب تمہیں پسند آئے۔ میری نگاہوں میں یہی ایک ایکٹرس ہے جسے ایکٹرس کا پارٹ دیا جا سکتا ہے، باقی تو پھول کر کپا ہو گئی ہیں، ہندوستان میں ایکٹر اور ایکٹرسوں کو اپنے جسم کا بالکل خیال نہیں رہتا۔ ایک بار ہیروئن کا رول مل گیا تو بس لگیں موٹی ہونے، نہ کمر رہی، نہ سینہ، نہ آنکھوں میں شوخی نہ بالوں میں چمک۔ گالوں پر گوشت چڑھنے لگا، یہاں تک کہ چہرے کے خطوط غائب ہو گئے۔ کولھے اتنے پھیلے کہ ٹانگیں ندارد، سینہ اتنا بڑھا کہ پیٹ بن کر رہ گیا۔ اب بتاؤ، کیا کرو گے ان کا فوٹو لے کر۔ کل ہی میں نے میٹرو کے سامنے ایک فلم کا اشتہار دیکھا، اشتہار پر مغربی ناچنے والی لڑکیوں کی ٹانگیں دکھائی گئی تھیں، صرف ٹانگیں۔ اُف کیا ٹانگیں تھیں، کتنی سڈول اور گداز۔ گداز اور سڈول، جیسے سانچے میں ڈھلی ہوں کتنی خوب صورت، دل کشی، توانا اور صحت مند۔ کتنی پُرفریب، جیسے نگاہوں میں جذب ہو رہی ہیں تمام ہندوستان چھان لو، اتنی خوب صورت، متناسب، موزوں ٹانگیں نہیں ملیں گی، میاں ان لوگوں سے پوچھو خوب صورتی کس چیز کا نام ہے، ان لوگوں سے پوچھو کہ خوب صورت ٹانگیں کس طرح تیار ہوتی ہیں، سڈول بازو، ابھری ہوئی چھاتیاں، صحت مند جسم کس طرح بنتا ہے، اور پھر یہ قوس، جو عورت کی خوب صورتی کی روح ہوتی ہے کہاں سے آتی ہے۔ کس طرح بنتی ہے۔ شرمانے کی کوئی بات نہیں، تم کہو گے، ہندوستان مفلس ہے، غریب ہے، لیکن یہ ایکٹرسیں تو غریب نہیں، یہ تو ہزاروں روپے ماہوار کماتی ہیں، لیکن خوب صورتی کا احساس کس کو ہے، یہاں تو عورت کو گٹھری بننے پر مجبور کیا جاتا ہے، اور اگر عورت گٹھری بن گئی تو سمجھو حسن کا مجسمہ تیار ہو گیا۔ یہاں تو خوب صورت جسم پر غلاف چڑھائے جاتے ہیں، مبادا ان ٹانگوں میں زندگی آجائے اور یہ ٹیڑھی سیدھی ٹانگیں چلنے پھرنے لگیں۔ مرنے اور جینے کے انداز ان مغربی لوگوں سے سیکھو میاں، ابھی ہم بہت پیچھے ہیں۔ بہت پیچھے۔

ارے کہہ رہا تھا بات پرتیما کی کہ ذکر آگیا براڈوے گرلز کی ٹانگوں کا۔ اگر اتنے ہی بے بس، اور مجبور ہو رہے ہو تو چند دنوں کے لئے بمبئی آجاؤ،

تمہارا ہندوستان کی تمام مشہور ایکٹروں اور ایکٹرسوں سے تعارف کرا دوں گا، یہ لوگ شہرت کے اسی قدر بھوکے ہیں جتنے تم انہیں دیکھنے کے لئے ترستے ہو۔ آخر یہ لوگ بھی انسان ہیں۔۔۔ میں یونہی ایکٹرسوں کے جھمیلے میں پڑ گیا۔ کہ رہا تھا ذکر اپنا، درمیان میں بے چاری ایکٹرس آ گئی۔ تم نے میرے مکان کا پتہ پوچھا ہے، میں تمہیں کیا بتاؤں میں کہاں رہتا ہوں۔ پہلے میں شیواجی پارک میں رہتا تھا۔ وہاں سے کیوں چلا آیا۔ لو اس کی وجہ بھی سنو۔ میں ایک دوست کے پاس قیام پذیر تھا۔ آج کل کسی کو دوست بنانا اتنا ہی آسان ہے، جتنا کہ دشمن ۔۔ میرا دوست، جس کا نام تم رکھ سکتے ہو، ایک نہایت ہی پہلوان قسم کا انسان ہے، جسم دیکھو، تو جی پھڑک اٹھے، ورزش کا بہت شوقین۔ وہ دن رات ورزش کرتا تھا، ہر وقت جسم کو مضبوط اور توانا بنانے کے خواب دیکھتا تھا۔ دراصل اس کا سپنا اب حقیقت بن چکا تھا۔ بچارے میں صرف ایک خامی تھی، یہ کہ وہ عورت کو دیکھ کر گھبرا جاتا تھا، اسی لئے وہ عورتوں کی طرف بالکل نہیں دیکھتا تھا۔ میرا مطلب ہے جوان عورتوں کی طرف۔ اگر میں کبھی کسی عورت کی طرف نگاہ کرتا تو وہ اس بات کو بُرا سمجھتا۔ کبھی کبھی میں خیال کرتا ہوں کہ میرے دوست کا نقطۂ نظر درست ہے۔ آخر یونہی اپنے دل و دماغ کو پراگندہ کرنے سے کیا فائدہ۔ ہر وقت عورت کے متعلق سوچنے سے کیا حاصل ہو سکتا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ ورزش کی جائے، ڈنڈ پیلے جائیں، من من، دو دو من کے پتھر ہر روز اٹھائے جائیں اور جب انسان پتھر اٹھا اٹھا کر تھک جائے تو سمندر کے کنارے سیر کرنے چلا جائے اور سمندر کی ان گنت لہروں کو گنتا رہے۔ ہر طرف لہریں ہی لہریں یا پانی ہی پانی ۔۔ دور، نظروں سے دور جہاں سمندر اور آسمان آپس میں بغل گیر ہوتے ہیں۔ سورج اپنی کرنوں کو سمیٹ کر سمندر کو چومتا ہے اور پھر گہرے نیلے پانی میں ڈوب جاتا ہے۔ ہر طرف سرخی ہی سرخی پھیل جاتی ہے، آسمان پر بھاگتے ہوئے بادل شفق کی سرخی سے چمک اٹھتے ہیں، اور ٹھنڈی، تازہ، زندہ ہوا بالوں کو چومتی ہوئی آگے بڑھ جاتی ہے، ناریل کے درخت پیار بھری نظروں سے جھانکتے ہیں، اور ان کی سوندھی سوندھی خوشبو ہوا میں تحلیل ہوتی جاتی ہے۔ اس نظارے کو چھوڑ کر کسی عورت کے پیچھے بھاگنا حماقت ہے، سراسر حماقت ہے۔

اگر تم میرے دوست کو دیکھو تو یہی کہو گے، یہ کتنا متناسب، حسین تراشا ہوا یونانی بت ہے، اس کی آنکھوں میں سرسبز گھاس کی نیلاہٹ ہے اور اس کے رخسار پکے ہوئے سیب کی طرح سرخ۔ اگر تم اس کے قریب بیٹھو، تو ایک عجیب صحت مند خوشبو اس کے جسم سے نکلتی ہے، جو صرف خالص گھی کھانے سے، دودھ پینے سے یا سرخ ٹماٹروں کے استعمال سے یا عورت کی طرف نہ دیکھنے سے پیدا ہوتی ہے، عورتیں اکثر میرے دوست کی طرف دیکھتی ہیں، نگاہوں میں آرزو ہوتی ہے، جسم کو چھونے کی خواہش ہوتی ہے، بس یہ دیکھنے کے لئے کہ اس بت میں کیا ہے، اس کے بازو اس قدر سڈول کیوں ہیں۔ اس کی چال میں کیوں ایک زندگی ہے۔ اس کی نگاہوں میں کیوں ایک چمک ہے لیکن میرا دوست عورتوں کی طرف نہیں دیکھتا۔ اکثر میں اسے لیکچر دیا کرتا ہوں کہ بھئی عورت سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ آخر عورت بنی کس لئے ہے، عورت سے اس قدر دور رہنے سے کیا فائدہ۔ آخر زندگی میں ہر شخص کا نصب العین ایک خوبصورت جسم بنانا تو نہیں ہے۔ میری طرف دیکھو، میں چاہتا ہوں کہ میری صحت اچھی رہے اور میں تندرست رہنے کے لئے تھوڑی بہت ورزش بھی کرتا ہوں۔ لیکن میں پہلوان بننا نہیں چاہتا۔ میں زندگی میں ورزش کے علاوہ کچھ اور بھی کرنا چاہتا ہوں۔ مثلاً میں اس لڑکی کو، جو اکثر بالکونی کے دروازے میں کھڑی رہتی ہے، نہایت قریب سے دیکھنا چاہتا ہوں، تم نے نہیں دیکھا اسے، دیکھا ہوگا، اور ضرور دیکھا ہوگا۔ میں نے تمہیں اکثر دیکھا ہے کہ تم چاند کی سیمیں روشنی سے متاثر ہو کر باغ میں چلے جاتے ہو اور ہری ہری گھاس پر ایک سفید چادر بچھا کر لیٹ جاتے ہو، اور اپنے جسم کو چاند کی ٹھنڈی کرنوں کے حوالے کر دیتے ہو، اور دیر تک ان سیمیں برفیلی کرنوں میں نہلاتے رہتے ہو۔ بھلا یہ کیوں۔ تم نے اس لڑکی کی طرف نہیں دیکھا۔ وہ بھی تو چاند ہی کا ٹکڑا ہے۔ اس کے جسم سے بھی کرنیں پھوٹتی ہیں۔ مگر یہ کرنیں عجیب سی ہوتی ہیں، میٹھی، ہلکی، نرم، گداز۔۔ نیند آ جاتی ہے ان کرنوں سے مجھے بھی نہانے دو ان کرنوں میں۔ تم نے کبھی چاند کو چھونے کی تمنا کی ہے! ضرور کی ہوگی۔ چاند اس کائنات میں مسرت کا سرچشمہ ہے، میں بھی اپنے کرنوں کے منبع کو چھونا چاہتا ہوں، میں اس لڑکی کو نہایت قریب سے دیکھنا چاہتا ہوں، میں اس کو خوف زدہ کرنا نہیں چاہتا، میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ اسے میری موجودگی کا علم ہو جائے کہ وہ انسان جو ہر روز اس کی بالکونی کے نیچے سے گزرتا ہے، اسے کتنا پسند کرتا ہے۔ یہ کوئی بری بات نہیں ہے بلکہ ایک نہایت پاک اور مقدس خواہش ہے۔ آخر اس لمبے بالوں والی لڑکی سے تمہیں کیوں نفرت ہے۔ کیا ہوا اگر اس نے

تمہاری طرف تعریفی نگاہوں سے دیکھا، کیا ہوا اگر وہ ایک دن تمہارے کمرے میں اچانک آگئی اور اس نے اپنے آپ کو تمہارے حوالے کرنا چاہا، لیکن تم نے اس کی بے عزتی کی، اور اسے گھر سے باہر نکال دیا۔ یہ کہاں کی شرافت ہے، تم سمجھتے ہو کہ تم نے ایک نیک کام کیا اور ایک لڑکی کی عصمت کو بچایا، لیکن تم نے اس کی محبت کا سرچشمہ ہمیشہ کے لئے خشک کر دیا۔ آج کل وہ کیوں اداس رہتی ہے، تم نے اس کے گالوں کی زردی کو نہیں دیکھا، تم نے اس کی نگاہوں کی تشنگی اور بھوک کا کبھی اندازہ نہیں کیا، تم ورزش کر کے اور گھی پی کر سو گئے اور وہ بے چاری محبت کی جھلستی ہوئی آگ میں جل بھن کر سوکھتی چلی گئی۔ مجھے ایسی شرافت پسند نہیں، میں جانتا ہوں کہ جب تمہیں عورت کی یاد ستاتی ہے تو تم کیا کرتے ہو، اس وقت تم کیوں ٹھنڈے پانی سے بار بار غسل کرتے ہو، مگر آخر کب تک؟ اگر دنیا کے تمام انسان ٹھنڈے پانی سے نہانا شروع کر دیں تو دنیا اس چیز سے محروم ہو جائے جسے محبت کہتے ہیں۔ محبت ہی زندگی کا محور ہے، اس کے بغیر زندگی بے جان ہے، بے کیف ہے۔

ہاں اس دن کی بات ہے کہ ایک نوجوان لڑکی میرے کمرے میں آگئی، میرے دوست نے اس لڑکی کو دیکھ لیا۔ اس نے اس بات کو ناپسند کیا۔ وہ یہ بات برداشت نہ کر سکتا تھا کہ کوئی لڑکی اس کے گھر کی طرف رخ کرے۔ میرے دوست نے اس لڑکی کو گالیاں دیں اور کہا کہ وہ رنڈی ہے، ایک بدمعاش عورت ہے۔ لڑکی بچاری تکتی رہ گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے نیا نیا دھندا شروع کیا تھا اور وہ ان لوگوں سے آشنائی کرنا چاہتی تھی جو کم از کم اسے اچھے لگیں۔ اس سے پہلے وہ ایک لڑکے سے محبت کر چکی تھی اور اب وہ میری طرف مائل پرواز تھی۔ میرے دوست نے لڑکی کو بے عزت کر کے گھر سے باہر نکال دیا اور میں دیر تک اس واقعہ پر غور کرتا رہا۔ اگر میرا دوست ان پڑھ ہوتا تو شاید میں اسے معاف کر دیتا، لیکن جو شخص پڑھا لکھا ہو اور پھر ایک طوائف کو گالی دے کہ وہ کیوں طوائف ہے، وہ کیوں اپنا جسم بیچتی ہے، تو صاف ظاہر ہے کہ وہ شخص زندگی کے بنیادی مسئلوں سے آگاہ نہیں، وہ انہیں بالکل نہیں سمجھتا اور اگر سمجھتا بھی ہے تو اپنے اصولوں کی خاطر ایک ایسی لڑکی پر حملہ کرتا ہے جو نہتی ہے، جو اکیلی ہے، جس کا وارث کوئی نہیں ہے، جس کے پیشے کا ذمہ دار ہمارا سماج ہے، حکومت ہے، موجودہ سامراج ہے۔ تم ہی بتاؤ ایسے شخص کو کیا سزا ملنی چاہئے۔ طوائفیت کے مسئلے کو حل کرنا، طوائفوں کو گالی دینے سے حل نہ ہو گا بلکہ عورتوں کو تعلیم دینے سے، عورتوں کی بھوک مٹانے سے، عورتوں پر دنیا کے دروازے کھولنے سے، عورتوں کو کام مہیا کرنے سے، عورتوں کو آزادی دینے سے، عورتوں کے اقتصادی مسئلوں کو حل کرنے سے جب تک یہ کام حکومت نہ کرے گی طوائفیں قائم رہیں گی۔ اور آج کے دن تک وہ واقعہ بھول نہیں سکا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دن اس لڑکی کی بے عزتی نہیں ہوئی تھی، میری بہن کی بے عزتی کی گئی تھی۔ اس دن میرے دوست نے اس لڑکی کی بے عزتی کر کے ظاہر کر دیا کہ مجھے بھی اس گھر میں نہیں رہنا چاہئے، ہو سکتا ہے کہ میں بھی اسی طرح اس گھر سے نکالا جاؤں۔ اس لڑکی نے جن قہر آلود نظروں سے میرے دوست کی طرف دیکھا تھا اس سے صاف یہی عیاں تھا کہ اگر وہ مرد ہوتی تو اسے تھپڑ مار کر اس کے ہوش ٹھکانے لگا دیتی۔ وہ کون شخص ہو گا، جو اچھی زندگی بسر کرنا نہیں چاہتا۔ آخر اس کو کیا غرض تھی کہ وہ اپنا جسم راہ گیروں کے ہاتھ بیچتی پھرے؟ کیا اس کے دل کے کسی گوشے میں یہ تمنا نہ تھی کہ اسے ایک ایسا شوہر ملے جو خوب صورت ہو، نیک ہو، اچھے پیسے کماتا ہو اور اس سے محبت کرتا ہو۔ اگر زندگی میں یہ چیزیں نہ ہوں، اور بھوک اور فاقوں سے مجبور ہو کر اپنے آپ کو فروخت کرنا پڑے تو اس لڑکی کا کیا قصور ——؟ وہ اداس شام میں کبھی نہیں بھول سکتا، وہ گالیاں ابھی تک میرے ذہن پر مرتسم ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر گالی میرے سینے میں ایک زخم پیدا کر گئی ہے، اس دن کے بعد میں اپنے دوست کے گھر سے چلا آیا۔

آج کل ماہم میں رہتا ہوں، سمرسٹ ماہم نہیں، منٹو کا ماہم نہیں بلکہ شیواجی پارک سے ایک اسٹیشن آگے۔ یہ جگہ مجھے بہت پسند ہے، اس جگہ نے میری اداسی میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے، میرے گھر کے سامنے ناریل کے درخت استادہ ہیں، یہ درخت ہوا میں جھومتے ہیں اور سمندر کی ہوا ناریل کے پتوں سے اٹکھیلیاں کرتی ہوئی آگے نکل جاتی ہے۔ آسمان ابر آلود رہتا ہے اور کبھی کبھی خوب زور سے بارش ہوتی ہے، میں اکثر بالکونی میں کھڑا رہتا ہوں اور ایک بھٹکے ہوئے انسان کی طرح ادھر ادھر دیکھتا رہتا ہوں، لوگ میری طرف دیکھتے ہیں اور ضرور سوچتے ہوں گے کہ یہ شخص یہاں کیوں کھڑا رہتا ہے، کیا یہ پاگل ہے، کیا اس کا دماغ ٹھیک ہے۔ اور میں ان کی طرف

دیکھتا ہوں۔ جیسے میں اُن کی ہر بات کو اچھی طرح سمجھتا ہوں، جیسے میں ان کے دل کی ویرانی، ان کی بے بسی، اُن کی ناچاری سے اچھی طرح آگاہ ہوں، مگر میں نے انھیں بتانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔

میرے مکان کے سامنے ایک ایکٹر کا مکان ہے میں نے اکثر ایک خوبصورت لڑکی کو اس کے کمروں میں گھومتے دیکھا ہے، سنا گیا ہے کہ یہ لڑکی EXTRA کا کام کرتی تھی، پھر اس ایکٹر نے یہ لڑکی پسند کر لی، اور اب وہ گھر کی چار دیواری میں بند کر دی گئی ہے۔ بمبئی میں عام طور پر لوگ ایکٹرسوں سے شادیاں کر لیتے ہیں، اور جب شادی کر لیتے ہیں تو اپنی بیویوں کو گھر کی چار دیواری میں بند کر دیتے ہیں۔ اُن میں سے اکثر لڑکیوں نے آزاد زندگی بسر کی ہوتی ہے۔ کہاں وہ پہلے کھلم کھلا ہر مرد سے مل سکتی تھیں، لیکن اب وہ کسی غیر مرد کی طرف نظر اٹھا کر دیکھ بھی نہیں سکتیں۔ یعنی ایک انتہا سے گذر کر دوسری انتہا کو پہنچ جاتی ہیں۔ نتیجہ، بے بسی، یاس، ایک ڈر جو ہمیشہ اُن کے گرد ایک چکر لگاتا رہتا ہے، مبادا اُن کے شوہر انھیں کسی غیر مرد سے باتیں کرتے دیکھ لیں اور اُن کا پھر وہی حشر ہو جس سے اُکتا کر اُنھوں نے اس زندگی کو قبول کیا تھا۔ ازدواجی زندگی کے چند سالوں کے بعد اُنھیں معلوم ہو جاتا ہے کہ اس زندگی میں اتنی ہی وحشت ہے، اتنا ہی زہر ہے، اتنی ہی تلخی ہے، اتنی ہی اُداسی ہے جتنی اُن کی پہلی زندگی میں تھی۔ کبھی کبھی ایکٹر کی بیوی میری طرف دیکھتی ہے، آنکھوں میں بے پناہ اُداسی ہے، چہرے پر ڈر کے آثار ہیں اور زندگی میں حسرت اور غم کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا، ہوا زور زور سے چلتی ہے، ناریل کے پتے ہوا میں ناچتے ہیں، آنکھیں چمکتی ہیں لمحہ بھر کے لئے، اور پھر وہی تاریکی چھا جاتی ہے۔

میرے مکان کے نیچے اکثر گندگی کا انبار لگا رہتا ہے۔ کہتے ہیں بمبئی نہایت صاف جگہ ہے۔ اگر کبھی ماہم آؤ تو تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ ماہم لاہور کی طرح گندا ترا شہر ہے۔ مکان کے بائیں طرف دھوبی گھاٹ ہے جہاں دن بھر دھوبی کپڑے دھوتے رہتے ہیں۔ رسیوں پر طرح طرح کے فراک لٹکے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ سُرخ فراک دیکھ لو، کسی جوان لڑکی کا ہوگا، اور وہ لٹکتا ہوا لمبا فراک، کسی بڑھیا کا ہوگا۔ رنگ برنگ کی ساڑھیاں، پاجامے، دھوتیاں، انڈرویئر، چادریں جابجا لٹکی ہوئی نظر آئیں گی۔ گلی کے قریب ہی ایک ناریل کا درخت گرا ہوا ہے، ذرا بچ کے چلنا، کہیں ٹھوکر نہ لگے، چند دن ہوئے بہت تیز و تند ہوا چلی تھی اور یہ ناریل کا درخت گر گیا تھا۔ بالکونی میں کھڑے ہو کر تمھیں ایک چھوٹا سا مندر دکھائی دے گا، دراصل یہ مندر نہیں ہے، صرف ایک ٹین کی چھت ہے جس کے نیچے ایک مورتی رکھ دی گئی ہے۔ بمبئی میں بہت کم مندر ہیں بہت کم گوردوارے ہیں بہت کم مسجدیں ہیں، ہاں گرجے زیادہ نظر آتے ہیں۔ تو ہاں، شاید ماہم کے ہندوؤں کو مندر کی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی، بے چاروں نے اسی ٹین کی چھت کے نیچے مورتی نصب کر دی، عورتیں صبح سویرے آتی ہیں اور پتھر کی پوجا کرتی ہیں۔ چند دن ہوئے ناریل کا درخت اس پتھر پر گرا تھا۔ میرا مطلب ہے اس خدا پر اس دیوتا پر۔ درخت بھاری تھا، دیوتا کچھ نہ کر سکا بچارا اور درخت کے بوجھ تلے دب کر رہ گیا۔ بیسویں صدی کے خدا بھی بے جان ہیں، جامد ہیں، غیر متحرک ہیں۔ آج کل جنگ کا زمانہ ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو کھانے پینے کے لئے کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے، نہیں تو اس بات پر ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا۔ ہندو کہہ سکتے تھے کہ مسلمانوں نے جان بوجھ کر درخت گرایا ہے، تاکہ ہندوؤں کے پرماتما کی بے عزتی کی جائے۔ آج کل ان مسئلوں کو کون پوچھتا ہے، جب پیٹ بھرا ہوا ہو تو پرماتما یاد نہیں آتا مذہب بچارا ——

میرا فلیٹ دوسری منزل پر ہے، اس لئے جب کبھی بالکونی میں کھڑا ہوتا ہوں تو ارد گرد کے مکانوں کو اچھی طرح دیکھ لیتا ہوں۔ میرے فلیٹ کے دائیں طرف ایک گجراتی رہتا ہے۔ گجراتی بچارا بوڑھا ہے، لیکن اُس کی بیوی جوان ہے۔ اگر خوب صورت ہوتی تو میں ضرور اس سے رومان لڑاتا، میری جمالیاتی حِس کی داد دو کہ میں یونہی ہر لڑکی سے محبت نہیں کر سکتا، بچاری نہایت ہی بدصورت عورت ہے۔ کاش اُس کے دانت باہر نکلے ہوئے نہ ہوتے تو شاید مجھے پسند آجاتی۔ وہ اکثر پھولوں کا ایک گچھا اپنے جوڑے میں باندھتی ہے۔ یہاں کی عورتوں کو پھولوں سے عشق ہے، معلوم ہوتا ہے عورت جتنی زیادہ بدصورت ہوتی ہے، اتنا ہی وہ پھولوں سے محبت کرتی ہے، یہاں تم ہر لڑکی، ہر عورت کو پھولوں سے لدی ہوئی پاؤ گے، لیکن پھر بھی حُسن عنقا ہے۔ حسین عورت بہت مشکل سے دکھائی دیتی ہے، اور پھول لگا کر یہاں کی عورتیں اور بدصورت نظر آتی ہیں، خوب صورتی میں اضافہ تو ہوتا نہیں، بدصورتی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ بہر حال اس گجراتن کو پھولوں سے محبت ہے۔ بوڑھا گجراتی اکثر باہر رہتا ہے، عورت دن بھر

چارپائی پر لیٹی رہتی ہے، بالکل اوندھی تکیئے پر منہ رکھ کر ٹانگوں کو دن بھر ہلاتی رہتی ہے۔ آج کل گجراتی نے ایک نوکر رکھ لیا ہے۔ آج میں نے نوکر کو گجراتن کے لبوں کو چُومتے ہوئے دیکھا، پھر دروازے کی چٹخنی بند کردی گئی، کچھ عرصے تک قہقہوں کی آواز آتی رہی۔ جب شام کے وقت گجراتن باہر نکلی، تو اُس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی، آنکھوں میں چمک تھی، جسم میں سے ناریل کی سوندھی سوندھی خوشبو آرہی تھی، آنکھوں میں خوشی کے لاکھوں پھول کھلے ہوئے تھے، لیکن یہ خوشی جلد ہی فنا ہوگئی، بوڑھے گجراتی کو اِس عشق کا علم ہوگیا اور اس نے نوکر کو نکال دیا۔ آج پھر گجراتن کے لب سُوکھے ہوئے تھے، اُس کی آنکھوں سے یاس ٹپکتی تھی، اُس کی مسکراہٹ میں اُداسی تھی، اُس کی باتوں میں غمی کی جھلک تھی۔ اور وہ اب اکثر بستر پر اوندھے منہ لیٹی رہتی ہے اور اُس کی سڈول پنڈلیاں ہلتی رہتی ہیں۔

تم کہو گے کہ میں محبت کا قصہ لے بیٹھا، سچ کہوں بُرا تو نہ مانو گے، میں ہر طریقے سے کوشش کرتا ہوں کہ عورت کے متعلق کچھ نہ سوچوں، عورت کے متعلق کچھ بھی نہ لکھوں، لیکن ہر بار جب لکھنے لگتا ہوں تو عورت سامنے آجاتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید عورت کے بغیر بات پھیکی رہے گی۔ اچھا آؤ، تمہیں عورت کی دنیا سے دُور لے چلتا ہوں، میں تمہیں اپنے دوستوں سے متعارف کراتا ہوں۔ جس جگہ میں رہتا ہوں وہ فلیٹ صرف ایک کسان کے رہنے کے لئے ہے، لیکن آج کل اُس فلیٹ میں سات انسان رہتے ہیں۔

اِن سے ملو، یہ ہیں مسٹر چیٹرجی۔ یہ بنگال کے ایک دُور اُفتادہ گاؤں سے چل کر بمبئی آئے ہیں۔ وہی تلاشِ روزگار ـــــ یہ کوئی نئی بات نہیں، انگریز اتنی دور سے چل کر آئے ہیں، اور اگر ایک بنگالی نوجوان بمبئی میں اپنی قسمت آزمانے آیا ہے تو اس میں کیا بُرائی ہے۔ چیٹرجی کا رنگ سیاہ ہے، اور جب کبھی وہ سیاہ سوٹ پہنتا ہے اور سگریٹ سلگا کر دُھواں منہ سے نکالتا ہے تو بالکل ریل کے انجن کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ عام بنگالیوں کی طرح دُبلا پتلا، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ تپِ دق کا مریض ہے، اس کے گال پچکے ہوئے ہیں۔ چہرے پر ہر وقت مُردنی سی چھائی رہتی ہے۔ بازو لمبے اور پتلے، ٹانگیں سوکھی ہوئی، آنکھیں بڑی بڑی سیاہ، مگر بے نور، بے جان، کھوئی کھوئی سی، کسی چیز کی جویا ایک آنے والے زمانہ کی اُمید پر زندہ۔ وہ زمانہ جب بھُوک اور بیکاری مٹ جائے گی، جب دنیا میں انسانیت کا راج ہوگا، جب ایک نئی زندگی کی صبح ہوگی۔

خیر ـــــ چیٹرجی نہایت ہوشیار آدمی ہے، ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہے، میں نے اُسے کبھی بے کار نہیں دیکھا۔ مگر حالت یہ ہے کہ آج تک اسے کوئی روزگار نہیں ملا، وہ بمبئی میں اس لئے آیا تھا کہ وہ ایک کامیاب کیمرہ مین بن سکے۔ اُس کا بھائی فوٹو گرافر تھا، اور اُس نے بھی فوٹو گرافی کا کام بھائی کی دوکان پر سیکھا تھا۔ وہ اُردو اچھی طرح بول سکتا ہے، ہندی بھی جانتا ہے، ٹوٹی پھوٹی انگلش بھی بول لیتا ہے اُس کے پاس یونی ورسٹی کی کوئی ڈگری نہیں لیکن ایک عام گریجویٹ سے بہتر انگریزی بول لیتا ہے۔ ایک بار ایک فلم میں کام ملا تھا، لیکن چند دنوں کے بعد اُسے نکال دیا گیا تھا۔ اب وہ ڈائرکٹر بننا چاہتا ہے اور اُس کے بعد پروڈیوسر۔ وہ کہتا ہے کہ وہ ایک دن پروڈیوسر بن کر دکھائے گا۔ اس کے پاس کھانے کے لئے پیسے نہیں ہوتے، کبھی کبھی وہ مجھ سے پیسے مانگ لیتا ہے۔ آج کل وہ ایک وقت کھانا کھاتا ہے، اس لئے اس کی صحت روز بروز گر رہی ہے۔ پچھلے ہفتے اسے زکام ہوگیا اور ساتھ ہی بخار۔ پہلے ہی کون سا طاقتور تھا۔ زکام اور بخار نے اسے اور لاغر کردیا۔ دو دن تک اُس نے کچھ نہیں کھایا۔ اُس کی بے نُور آنکھیں اندر دھنس چکی ہیں، اس کا چہرہ اور سیاہ ہوگیا ہے، اور جب وہ چلتا ہے تو اُس کی ٹانگیں کانپتی ہیں، باتیں کرتے وقت اس کا سانس بھُول جاتا ہے، لیکن اُس نے ابھی ہمت نہیں ہاری، وہ اب بھی کہتا ہے کہ وہ ایک دن پروڈیوسر ضرور بنے گا۔ وہ ایک دن فلم ڈائریکٹ ضرور کرے گا۔ کیا ہوا اگر اس کے پاس پیسہ نہیں، کیا ہوا اگر وہ ایک دن میں ایک بار کھانا کھاتا ہے، وہ فاقے کرے گا۔ وہ زندگی سے لڑے گا، وہ فلمی دنیا کے ہر شخص سے جنگ کرے گا۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ لوگ کس طرح پروڈیوسر بن جاتے ہیں۔ بمبئی میں اگر کوئی پروڈیوسر بننا چاہے تو اسے چاہیئے کہ وہ کسی خاتون کو پھانس لے، یا وہ خود اتنا حسین ہو کہ کوئی عورت اسے پھانس لے لیکن چیٹرجی نہ خوبصورت ہے نہ جوان، کوئی ذہین سمجھ دار خوبصورت عورت اس سے عشق نہیں کرسکتی مگر وہ اپنی دُھن کا پکّا ہے۔ اس کا ارادہ چٹان کی طرح مضبوط ہے مگر کبھی کبھی جب وہ بمبئی کے سٹوڈیوز کے چکّر لگا لگا کر تھک جاتا ہے تو کہتا ہے کہ وہ اِس زندگی سے اُکتا گیا ہے، وہ کب تک جدوجہد کرتا رہے، وہ کب تک لوگوں کی گھرکیاں سُنتا رہے

اُسے لوگوں سے نفرت ہوگئی ہے، اُسے خود زندگی سے نفرت ہوگئی ہے، وہ خودکشی کرلے گا! اور جب کبھی وہ کرسی پر بیٹھ کر خودکشی کے متعلق سوچتا ہے تو میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ پھر وہ ایک عجیب انداز سے مسکراتا ہے، اُف ان خشک لبوں پر ایک بے جان مسکراہٹ! یہ مسکراہٹ نہیں خون ہے، مسلسل فاقوں کی ایک تصویر ہے جو زندہ ہوکر اُس کے لبوں پر ناچتی ہے، کائنات کا ہر ذرہ خاموش ہے، بمبئی کا ہر سیٹھ زندہ ہے بمبئی کے ہر ہوٹل میں بجلی کے قمقمے جگمگاتے ہیں، بمبئی کے شراب خانوں میں تل دھرنے کو جگہ نہیں، ناچ ہوتے ہیں، نگاہوں میں پیاس اور ہوس کی بجلی کوندتی ہے۔ میرین ڈرائیو پر لاکھوں قمقموں کی روشنی پھیلتی ہے اور ہر طرف پھیلتی چلی جاتی ہے۔ سمندر کی لہریں بڑھتی ہیں، شور مچاتی ہیں اور پیچھے ہٹ جاتی ہیں، ٹراموں، بسوں اور موٹروں کی کھڑکھڑاہٹ مدھم نہیں ہوتی، لیکن یہ شخص اس بے نور کمرے میں بیٹھ کر کیوں اُداس دکھائی دیتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں کیوں مرنے کی تمنا ہے، مگر اس اندھی جدوجہد کا کیا مقصد ہے؟ آج کل چٹرجی کھانستا ہے، وہ ہلکی ہلکی کھانسی، خدا بچائے اس کھانسی سے۔ کیا اسے تپِ دق ہوگیا ہے؟ کیا وہ زندگی میں کبھی ڈائرکٹر نہ بن سکے گا، کیا اس کی خواہش کبھی پروان نہ چڑھے گی؟ میرے دوست اکثر چٹرجی کو چڑاتے ہیں، اُس سے مذاق کرتے ہیں کہ وہ کب ڈائرکٹر بنے گا، وہ کب پروڈیوسر بنے گا، پھر سب اسے گالیاں دیتے ہیں، اسے گھر سے نکال دینے کی دھمکیاں دیتے ہیں، محض اس لئے کہ اُس کا کوئی وارث نہیں، محض اس لئے کہ اس کے پاس پیسے نہیں اور وہ فلیٹ کا کرایہ ادا نہیں کرسکتا اور وہ اکثر دوستوں کا دست نگر رہتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اگر وہ اس فلیٹ سے نکال دیا گیا تو کہاں اور کدھر جائے گا۔ وہ کس جگہ رات بسر کرے گا۔

وہ غصے میں آکر خط لکھنے لگتا ہے۔ کس کو؟ شاید اپنے باپ کو ـــ جس نے اُسے پیدا کیا، شاید اپنی ماں کو جو کب کی مرچکی ہے، یا اپنے بھائی کو، جو ایک دور افتادہ گاؤں میں زندگی کے دن کاٹ رہا ہے، خط لکھو، لکھے جاؤ، دنیا کے ناخداؤں کو خط لکھو، چرچل کو خط لکھو، روزویلٹ کو ملا دو کہ وہ تمہیں روپے بھیجیں۔ سٹالن کو خط لکھو، جس نے ہندوستان کی آزادی کے متعلق کبھی کچھ نہیں کہا۔ دنیا کے ہر بڑے انسان کو خط لکھو کہ وہ تمہیں اس زندگی سے نجات دلائے۔ تم دنیا کے ہر بڑے شخص سے پوچھو کہ تم چٹرجی، کیوں اس دنیا میں اکیلے ہو، تم کیوں فاقے کرتے ہو، تم کیوں بھوکے رہتے ہو، تمہیں کیوں سونے کے لئے جگہ نہیں ملتی۔ لیکن خدا کے لئے خاموش نہ رہو۔ تم دوستوں کی گالیاں اس خاموشی سے نہ سُنو۔ تم کیوں اس ذلت کو برداشت کرتے ہو۔ یہ ذلت مجھے ناگوار معلوم ہوتی ہے، ناگوار ہی نہیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے۔ میں یہ سکوت برداشت نہیں کرسکتا ـــ اور کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ میں ان سب لوگوں کو بالکونی سے نیچے پٹک دوں، دنیا میں ہر شخص کمینہ ہے، رذیل ہے۔۔۔۔

دنیا میں ایسے نظام کی ضرورت ہے، ٹھہرو ـــ میں اشتراکی بننا نہیں چاہتا۔ میں فسطائیت کا حامی نہیں، میں کسی ازم کا پرچار کرنا نہیں چاہتا میں فسطائیت کا حامی نہیں۔ میں کہانی نہیں لکھ رہا ہوں، میں کہانی لکھنا جانتا ہی نہیں۔ میری کہانی میں نہ پلاٹ ہوتا ہے اور نہ میں ماحول تعمیر کرتا ہوں۔ نہ کردار نگاری کے معجزے دکھاتا ہوں۔ نہ رنگین عبارت لکھتا ہوں۔ میں اُردو ادب کی خدمت نہیں کرنا چاہتا۔ میں لفظ 'خدمت' سے نفرت کرتا ہوں۔ میں غلط زبان لکھتا ہوں، میں غلط محاورے لکھتا ہوں، مجھے مذکر اور مونث کی کوئی تمیز نہیں، میں نئی نئی تشبیہیں نہیں لکھتا میں دلکش سٹائل کا مالک نہیں، میں موپساں اور ٹالسٹائی کی طرح بڑا ادیب بننا نہیں چاہتا، میں شہرت کا قائل نہیں ـــ میرے پاس اس وقت صرف چار آنے ہیں صرف چار آنے ـــ میں جو کچھ کہوں گا، صاف صاف کہوں گا۔ میرے خیالات ایک فرد، ایک قوم کے نہیں بلکہ انسانیت کے ترجمان ہیں۔ میں انسانیت کا قائل ہوں اور اسی لئے پوچھتا ہوں کہ اس دنیا میں اتنا ظلم کیوں ہے، اتنی بے کاری کیوں ہے۔ اس کا جواب تم کیا دوگے! انسانی خداؤں اور رہنماؤں کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔ خیر ـــ ان سے ملو، ان کا نام ہری چند ہے، یوپی ان کا دیس ہے۔ جنگ شروع ہونے سے پہلے ہری چند اپنے مالدار چچا کے ساتھ سٹّہ کھیلتا تھا لیکن جوں ہی جنگ شروع ہوئی، اس کا چچا سٹے میں سب کچھ ہار گیا اور بیچارے ہری چند کو نوکری کی تلاش میں بمبئی آنا پڑا۔ کچھ عرصہ وہ ڈپو میں کام کرتا رہا لیکن ڈپو کی نوکری موافق نہ آئی، نوکری چھوڑ دی۔ کسی نے کہا تم ایکٹر بن سکتے ہو، بس پھر کیا تھا، ایکٹر بننے کا جنون سر پر سوار ہوگیا۔ بمبئی کی آدھی آبادی ایکٹر بننے کی تمنا کرتے کرتے مرجاتی ہے۔ بچارے ہری کو بھی یہی جنون سوار ہے کاش اسے اصلیت سے آگاہ کردیا جاتا۔ مگر انسان اپنے آپ کو دھوکا دینا چاہتا ہے، وہ اصلیت کا کبھی سامنا نہیں کرنا چاہتا۔ آج کل ہری دن میں دس بیس بار کنگھی کرتا ہے، آئینہ ہر وقت اُس کے ہاتھ میں رہتا ہے، اس کے جسم کی تشکیل میں

ایک عجیب نسوانیت کی سی جھلک ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ مرد کم ہے اور عورت زیادہ ہے۔ وہ بال عجب انداز سے بناتا ہے۔ غسل خانے میں وہ دو دو گھنٹے صرف کرتا ہے۔ اور جب نہا کر باہر نکلتا ہے تو کریم اور پاؤڈر کی آفت آتی ہے۔ چہرے پر کریم ملتا ہے، اور ملتا رہتا ہے اور پھر پنکھے سے ہوا کرتا ہے تاکہ چہرے کی جلد کے ہر مسام میں کریم جذب ہو جائے، لیکن کریم کے متواتر استعمال سے ابھی تک رنگت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ہری ہر روز دو گنی اُجرت پر کپڑے دھلاتا ہے اور روپے گھر سے منگوا کر گذارہ کرتا ہے لیکن کب تک۔ وہ پھر سٹّہ کھیلنا چاہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سرکاری نوکری کر کے کوئی انسان امیر نہیں بن سکتا۔ وہ ایک اچھے گھر میں رہنا چاہتا ہے، وہ ریڈیو خریدنا چاہتا ہے۔ وہ خوبصورت عورتوں سے محبت کرنا چاہتا ہے۔ بتاؤ ان باتوں میں کون سی بُری بات ہے۔ ہر عقل مند شخص ان ہی باتوں کی خواہش کرے گا۔ ہری چند جانتا ہے کہ ڈپو کی نوکری کر کے وہ یہ چیزیں حاصل نہیں کر سکتا، اس لئے وہ ایکٹر بننا چاہتا ہے، کیونکہ ایک ایکٹر آج کل ہزاروں روپے کماتا ہے۔ وہ سٹّہ کھیلنا چاہتا ہے کیونکہ سٹّہ کھیلنے سے یا وہ امیر بن جائے گا یا محض بھکاری۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ زندگی سے جوا کھیلنا چاہتا ہے — جن حالات، جس ماحول میں وہ رہتا ہے، اس ماحول میں اسے رتّی بھر خوشی نصیب نہیں ہوتی۔ روز بروز اس کا وزن کم ہو رہا ہے۔ سر کے بال گر رہے ہیں، آنکھوں میں مایوسی کے آثار نمایاں ہیں، وہ کچھ تھکا تھکا سا دکھائی دیتا ہے۔ آج ہری طاقت کی دوا خرید کر لایا ہے، وہ ہر روز اُسے استعمال کرے گا اور زندگی کی کشمکش جاری رکھے گا۔ دواؤں کے استعمال سے انسان کب تک زندہ رہ سکتا ہے، آخر کب تک —؟ جس ہوٹل میں وہ کھانا کھاتا ہے، وہاں کی خوراک میں غذائیت کا نام نہیں، صاف ظاہر ہے کہ وہ ان مسلسل مصیبتوں کا مقابلہ نہ کر سکے گا۔ میں نے اُس سے کئی بار کہا ہے کہ وہ پھر سے ڈپو کی نوکری کر لے، مگر وہ ہمیشہ نفی میں جواب دیتا ہے، اور آئینہ کو سامنے رکھ کر مسکراتا ہے اور اپنے بے جان کھُردرے بالوں میں کنگھی کرتا ہے، اور زور زور سے کریم ملتا ہے، اور پھر کہتا ہے کہ میں آہستہ آہستہ مرنا نہیں چاہتا۔ میں جانتا ہوں کہ "میں اب زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ شام کے وقت میری ٹانگیں ڈگمگاتی ہیں، سر جھکا تا ہے اور ہر روز رات کو بخار ہو جاتا ہے اور پھر ہلکی ہلکی کھانسی کی شکایت بھی ہے مجھے، لیکن میں ڈپو کی نوکری نہیں کر سکتا۔ وہ با مشقت قید ہے۔ میں یہ قید برداشت نہیں کر سکتا۔ دیکھو، اس ٹرنک میں میری بی اے کی ڈگری ہے۔ اگر میں مر گیا۔" وہ پھر ہنستا ہے۔ موٹے موٹے لبوں پر ایک کھسیانی سی ہنسی، جیسے وہ کبھی نہیں مرے گا۔ "تو یہ ڈگری لکھنؤ یونیورسٹی کو واپس بھیج دینا۔ زیادہ عرصہ اسے اپنے پاس نہ رکھنا۔ ڈگری کا کافی حصّہ دیمک چاٹ گئی ہے، اور باقی — ہے بھی کیا۔

اور میں اُسے سمجھاتا ہوں کہ بھائی نوکری کر لو۔ لیکن وہ بالکل نہیں مانتا۔ اس دورِ ابتلا میں عجیب انسانوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہر طرف ابتری پھیلی ہوئی ہے، اور ہر شخص ایک بہتر زندگی بسر کرنے کی فکر میں ہے، مگر وہ لوگ جن کے ہاتھوں میں دنیا کے انسانوں کی قسمت ہے، وہ چپ چاپ بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ اپنی شہرت عزت اور رتبے کو برقرار رکھنے کے لئے اسی راستے پر گامزن رہنا چاہتے ہیں جس پر چل کر کئی صدیوں تک اُن کے باپ دادا نے حکومت کی تھی۔

اور رگھبیر سے تعارف کرانا تو میں بھول ہی گیا۔ رگھبیر تمام دن باہر رہتا ہے، اور تقریباً رات کے بارہ بجے گھر آتا ہے، تم پوچھو گے کہ وہ کیا کرتا ہے، تو میں اس کا جواب کچھ نہیں دے سکتا، اس فلیٹ میں جو شخص بھی رہتا ہے، اُس کے متعلق میں یہ وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ کیا کام کرتا ہے، دراصل اس فلیٹ میں جو لوگ بستے ہیں، وہ کچھ کام نہیں کرتے — اوتار سنگھ کو چھوڑ کر، لیکن اس کا ذکر میں پھر کروں گا۔

رگھبیر کو تم نے نہیں دیکھا، وہ چھوٹا سا قد دُور سے دیکھو، ایک خوب صورت کھلونے کی طرح دکھائی دے گا۔ اس کے بال بھُورے، رنگ گورا، اس کی خوب صورتی اس کے سنہری بالوں میں پنہاں ہے۔ اسے اچھے کپڑے پہننے کا بہت شوق ہے اور جب کبھی وہ ایک اچھا سوٹ پہن کر اور نکٹائی لگا کر فلیٹ سے باہر نکلتا ہے تو گلی کی تمام جوان لڑکیاں اُس کی طرف آرزو مند نگاہوں سے دیکھتی ہیں، اور پھر رگھبیر ایک شعر گنگناتا ہے۔ "زندگی چاند سی عورت کے سوا کچھ بھی نہیں۔" رگھبیر شاعر ہے، لیکن اس کی کوئی نظم کبھی کسی رسالے میں نہیں چھپی، وہ ایک کامیاب ایکٹر ہے، لیکن کسی فلم میں ابھی تک اُسے کوئی پارٹ نہیں ملا۔ وہ ایک دلچسپ عاشق ہے۔ وہ ہر عورت سے عشق کر سکتا ہے، بلکہ وہ لڑکی سے عشق کرتا ہے، سڑک پر چلتے پھرتے ٹرام میں چڑھتے اُترتے، گلی کے موڑ پر، ہوٹل، سینما، باغ، اسٹیشن، ہر جگہ وہ لڑکیوں سے عشق کرتا ہے، وہ صرف

لڑکی کی طرف دیکھتا ہے اور پھر آہ بھرتا ہے، شعر کہتا ہے۔" زندگی چاند سی عورت کے سوا کچھ بھی نہیں۔" اپنی ناکام محبت کے فسانے دوستوں کو سناتا ہے جس لڑکی سے وہ عشق کرتا ہے اس سے ضرور شادی کا وعدہ کرتا ہے، چند دنوں کے بعد عشق کا جوش سرد پڑ جاتا ہے، مگر رگھبیر کی جنوں پرور نگاہیں کسی اور لڑکی کو تلاش کر لیتی ہیں۔

آج کل اسے ایک بنگالن سے عشق ہو گیا ہے، رگھبیر کہتا ہے کہ وہ واقعی عشق کر رہا ہے، لیکن ہمیں یقین نہیں آتا، ہم سب ہنس پڑتے ہیں ہم اس کی گہرائی اچھی طرح جانتے ہیں ہر روز وہ اپنی محبوبہ کو خط لکھتا ہے، اور وہ رات بھر جاگتا رہتا ہے، میں اکثر رگھبیر کی محبت کا مذاق اڑاتا ہوں، لیکن وہ مسکرا کر ٹال دیتا ہے اور کسی بات کا جواب نہیں دیتا۔ اس کی ہنسی میں واقعی کچھ مایوسی سی آگئی ہے۔ کیا رگھبیر بنگالن سے عشق کرتا ہے؟ رگھبیر نے بتایا کہ شروع میں بنگالن، جس کا نام گیتا ہے اس سے شادی کرنے کے لئے تیار ہو گئی تھی، گیتا ایک نرتکی ہے وہ ایک مشہور فلم سٹار کے ٹروپ میں کام کرتی ہے اور بچارا رگھبیر بھی اس ٹروپ میں شامل ہو گیا اور اس بنگالن کی خاطر تمام ہندوستان کا چکر لگاتا رہا۔ لیکن جب ٹروپ کلکتہ پہونچا تو گیتا نے صاف جواب دے دیا کہ وہ اس سے شادی نہیں کر سکتی۔ شاید گیتا کے چاہنے والوں نے اصرار کیا ہوگا کہ وہ کیوں ایک غریب آوارہ لونڈے سے عشق کر رہی ہے۔ ہماری طرف دیکھو، ان فلک بوس عمارتوں کو دیکھو، ان کاروں اور گاڑیوں کی طرف دیکھو، یہ چمکتے ہوئے ہیرے، یہ صوفہ سیٹ، یہ رنگین پردے، یہ نوکر، یہ لونڈیاں، یہ باندیاں، اور طرح طرح کے کھانے — وہ شاعر تمہیں کیا دے گا، فقط چند شعر، اور کچھ نہیں۔ اگر تم اس سے شادی کرو گی تو بھوکی مر جاؤ گی۔ وہ خود بھوکا ہے، وہ تمہیں کیا کھلائے گا. اور پھر وہ بنگالی نہیں ہے، شمالی ہند کی ایک گھٹیا سی ریاست کا باشندہ ہے، اپنے دیس میں رہو، اس کلکتہ میں رہو، یہاں ناچو، گاؤ، لوگوں کو اُلّو بناؤ اور زندگی کے دن ہنسی خوشی ... بسر کرتی چلی جاؤ — اور بے چارا رگھبیر، جب سے وہ کلکتہ سے واپس آیا ہے اُس کا حلیہ بگڑ گیا ہے۔ عورت کی بے وفائی نے اُسے بری طرح اُداس کر دیا ہے۔ اب وہ ہر روز شراب پیتا ہے اور رات کے بارہ بجے گھر آتا ہے پہلے وہ اپنے مستقبل کے متعلق بہت پُر اُمید تھا لیکن اب اُس کے حوصلے بہت پست ہو گئے ہیں۔ اُس کے دل کی ویرانی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ آج وہ رات کے بارہ بجے گھر واپس آیا۔ اُس نے کافی شراب پی رکھی تھی، اور اس کے منہ سے شراب کی بُو آ رہی تھی اُس کے کھوئے بال بکھرے ہوئے تھے۔ اُس کی پینٹ میلی اور ڈھیلی ہو گئی تھی، کوٹ پر دھبے پڑ گئے تھے۔ آنکھیں سُرخ تھیں، وہ ہنسنا چاہتا تھا، لیکن ہنسی ہونٹوں کے قریب ہی رک گئی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا کرسی پر گر گیا اور بڑبڑانے لگا۔ یہی کہ وہ بمبئی میں نہیں رہ سکتا، وہ واپس شملہ جائے گا، اُسے کیا معلوم کہ شہری لڑکیاں اتنی چالاک ہوتی ہیں۔ اُس نے بوٹ اُتار دئے اور پسینے سے بھیگی ہوئی جرابوں کو سونگھنے لگا، اور پھر جرابوں کو اُس نے ایک کونے میں پھینک دیا۔ وہ شملہ کی حسین وادی میں اپنا مسکن بنائے گا، وہ یہاں نہیں رہ سکتا۔ وہ شملہ کی ایک انجان الھڑ لڑکی سے شادی کرے گا اور نمک اور تیل کی دوکان کھول لے گا۔ اب رگھبیر نے کوٹ اُتار دیا تھا، قمیص اتارتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا، اسے فلمی دنیا سے نفرت ہو گئی ہے، اور پھر اُس نے پتلون بھی اُتار دی اور صرف انڈرویئر پہنے کرسی پر ڈھیر ہو گیا —

اسے اس زندگی سے نفرت ہو گئی ہے، وہ زندگی کو دوبارہ شملہ میں زندۂ جاوید کرے گا۔ وہ شملہ کی پہاڑیوں کو کبھی بھول نہیں سکتا اور پہاڑوں پر پھیلی ہوئی دھند سفید، ٹھنڈی، نرم و نازک، اور اُس کے ذہن میں اُس الھڑ لڑکی کے نقوش اُبھر آئے جس نے اُسے شہر جانے سے روکا تھا۔ لڑکی کی آنکھوں میں آنسو تھے، اور دھند چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی، اور وہ دونوں دھند میں اڑے جا رہے تھے کدھر، کہاں۔ رگھبیر نے لڑکی کو اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ لڑکی کی چھاتیاں اُس کے سینے سے ٹکرائیں اور ایک غیر فانی نغمہ پیدا کرتی گئیں لڑکی کے دل کا طوفان اس کی طرف بڑھ رہا تھا اور دھند چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی — لیکن وہ کیا کرتا۔ اُس نے لڑکی کے گرم جلتے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دئے۔ اور وہ دھند کی انتہائی گہرائیوں میں کھو گیا۔ وہ نرم نرم پتلے ہونٹوں کا مزہ۔ وہ لڑکی کے سینے کا طوفان، اسکی آنکھوں کی عاجزی، رگھبیر کبھی نہیں فراموش کر سکتا۔ رگھبیر لڑکی کو بے یار و مددگار چھوڑ کر چلا آیا، اور اب وہ پھر واپس جانا چاہتا تھا۔ کیا وہ لڑکی اب بھی انتظار کر رہی ہوگی۔ شاید — کون کہہ سکتا ہے، کہ ان ابدی بوسوں کا مزہ ابھی تک لڑکی کے ہونٹوں پر ہو، لیکن — کون کہہ سکتا

ہے کہ کسی زمیندار نے اُس لڑکی سے شادی نہ کر لی ہوگی۔ ایسی حسین لڑکیوں کو کون کنواری رہنے دیتا ہے۔ شہر اور گاؤں کی زندگی میں کوئی فرق نہیں، دونوں جگہ ظلم ہے۔ ہر جگہ محنت کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے اور ظلم و استبداد کی پھیلی ہوئی سیاہی انسانوں کے دلوں کو اور سیاہ کر دیتی ہے۔ رگھبیر نے اب انڈرویئر بھی اُتار دیا ہے، اور اب وہ مادر زاد ننگا ہے، اس کا سر ایک طرف لڑھک گیا ہے؛ اور اس کے منہ سے شراب کی بدبو بدستور آرہی ہے۔ باہر ناریل کے درخت پر اُلّو چیخ رہا ہے۔ اور ہوا زور زور سے سائیں سائیں کر رہی ہے۔

بیچارا رگھبیر..... اور پھر اوتار سنگھ ـــــ بڑی دلچسپ شخصیت رکھتا ہے۔ اوتار سنگھ ایک سرکاری ڈپو میں نوکر ہے، وہ صبح چھ بجے گھر سے نکل جاتا ہے اور شام کے آٹھ بجے واپس آتا ہے وہ ایک ایسے ڈپو میں کام کرتا ہے جہاں جتنا زیادہ کام کیا جائے، اتنی زیادہ تنخواہ ملتی ہے، اوتار سنگھ زیادہ سے زیادہ روپے کمانا چاہتا ہے۔ وہ پنجاب کے ایک مالدار جاٹ کا لڑکا ہے۔ اوتار سنگھ کہتا ہے کہ آج کل اسے ترقی ملنے والی ہے، اور ترقی ملنے کی وجہ صرف اُس کے صاف اور ستھرے کپڑے ہیں اور خاص کر اس کی نیلی نکٹائی جو اُس کے سپرنٹنڈنٹ کو بہت پسند ہے۔ دفتر کا سپرنٹنڈنٹ ایک انگریز ہے، دفتر میں باقی کلرک دھوتی یا پاجامہ پہن کر آتے ہیں، اس لئے وہ زیادہ پسند نہیں کئے جاتے۔ اور چونکہ دفتر میں سردار ہی سب سے زیادہ خوش پوش انسان ہے، اس لئے اُسے جلد ہی ترقی ملنے والی ہے، اوتار سنگھ خدا پر ایمان نہیں رکھتا، وہ گوردوارے نہیں جاتا، اور اکثر قینچی سے داڑھی کے بال بھی کاٹ لیتا ہے۔ مگر سکھوں کے متعلق کوئی ریمارک پاس کیا جائے تو وہ بُرا مانتا ہے۔ وہ سکھوں کے خلاف کوئی بات سننا پسند نہیں کرتا۔ وہ ایک مجموعۂ اضداد ہے، اور آزاد خیال ہوتے ہوئے بھی سخت رجعت پسند ہے۔

آج کل وہ بھی زندگی سے تنگ آگیا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس فلیٹ کی ہوا میں اُداسی رچ گئی ہے، وہ کہتا ہے کہ اُسے ڈپو کی زندگی پسند نہیں۔ آخر کب تک وہ دن رات کام کرے اور کیوں، ڈپو کی کلرکی انسان کو غلام بنا دیتی ہے۔ اور یہ نوکری کتنی ذلیل ہے۔ اندر جانے کے لئے شناختی کارڈ لانا ضروری ہے، کارڈ دکھا کر اندر جانا پڑتا ہے۔ پھر رجسٹر پر حاضری لگانی پڑتی ہے اور کوئی کلرک ایک دو منٹ دیر سے پہنچے تو اُس کی تنخواہ میں سے پیسے کاٹ لئے جاتے ہیں۔ یہ زندگی نہیں دوست، یہ موت ہے۔ اور پھر ان لمحوں میں کبھی خوشی نصیب نہیں ہوتی، کبھی تو انسان جی بھر کر ہنس لے، کسی عورت سے مسکرا کر بات کر لے، اُس کے حسین زندہ بالوں سے کھیل لے۔ کبھی تو عورت کے حسین خطوط کی داد دے سکے۔ کبھی تو عورت کی دل فریب مسکراہٹ سے لُطف اندوز ہو سکے، کبھی تو انسان عورت کے جسم کی گرمی، اس کے بالوں کی خوشبو، اُس کی آنکھوں کی دل کشی، اس کی باتوں کی موسیقی سے ہمکنار ہو سکے۔ لیکن اس فلیٹ میں عورت کہاں۔

یہاں تو ہم سب بھوت رہتے ہیں۔ عہدِ پارینہ کے انسان۔ تم نے بمبئی آنے کے لئے لکھا ہے، آؤ۔ بڑے شوق سے آؤ اور میرے پاس ٹھہرو، جب اسٹیشن سے اُترو تو بس میں بیٹھ کر شیواجی پارک کا ٹکٹ خرید لو، اور پھر ماہم پوسٹ آفس، ماہم پوسٹ آفس کے سامنے ایک گلی ہے، بس چلے آؤ اس گلی کی طرف، جو دوسرا مکان نظر آئے اس کی طرف نگاہ اٹھاؤ، آشیانہ بلڈنگ کا نام پڑھ لینا ـــ اور جوں ہی داخل ہو گے، تمہیں، ایک پاگل آدمی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ گھبرانا نہیں، یہ پاگل خانہ نہیں، یہاں انسان بستے ہیں۔ یہ پاگل اکثر دروازے کے باہر پڑا رہتا ہے، یہ کیا کرتا ہے، روٹی کہاں سے کھاتا ہے؟ اس کا مجھے کوئی علم نہیں، لوگ اسے پاگل کہتے ہیں، لیکن میں نے کبھی اُسے کوئی ایسی حرکت کرتے نہیں دیکھا، جس سے یہ ظاہر ہو سکے کہ یہ شخص پاگل ہے۔ اکثر یہ شخص آوارہ پھرتا رہتا ہے۔ ایک کالی، سیاہ پھٹی ہوئی قمیص پہنتا ہے، اُس کے سر کے بال بکھرے رہتے ہیں اور اُن میں مٹّی جمی رہتی ہے مسلسل فاقوں کی وجہ سے یہ انسان بہت دُبلا ہو گیا ہے۔ میں نے اسے کبھی کسی سے بات کرتے نہیں دیکھا۔ وہ اکثر خاموش، چپ چاپ لیٹا رہتا ہے، اور جب لیٹے لیٹے رہنے سے تنگ آجاتا ہے تو گلی میں آکھڑا ہوتا ہے، اور سر کو جھٹک کر چلنا شروع کرتا ہے۔ یا کبھی پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے۔ جیسے زندگی کا سرمایہ کہیں بھول آیا ہے۔ اُس کے ساتھ تم ایک کتّے کو دیکھو گے، کتّا تمہیں دیکھ کر بھونکے گا۔ کتّے کو دیکھ کر خوف زدہ نہ ہونا، یہ کتّا ہر نو وارد کو دیکھ کر بھونکتا ہے، اُس کی سُرخ آنکھوں میں تم غم و غصّہ کی جھلک دیکھو گے۔ اُس کے جسم کو دیکھ کر تم آشیانہ بلڈنگ کے رہنے والوں کی بھوک کا

اندازہ لگا سکو گے۔ صاف ظاہر ہے کہ جس گھر کا کتا بھوکا ہے، وہاں کے رہنے والے خود کتنے بھوکے ہوں گے۔

نچلی منزل میں ایک میوزک ماسٹر رہتے ہیں۔ اُنھوں نے ایک طوائف کو پھانس رکھا ہے۔ میں نے اُس عورت کو اکثر روتے دیکھا ہے۔ اکثر یہ عورت سلاخوں والی کھڑکی میں بیٹھ کر اِدھر اُدھر جانے والے لوگوں کی طرف پریشان نگاہوں سے دیکھتی رہتی ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ یہ میوزک ماسٹر ایسی عورت کہاں سے لے آیا اور کس طرح لے آیا۔ میوزک ماسٹر کی شکل ایک بھٹیارے سے ملتی جلتی ہے لیکن اُس کے گھر کے باہر ایک موٹر کھڑی رہتی ہے۔ یہ موٹر اکثر خراب ہو جاتی ہے۔ جب رات پڑتی ہے تو میوزک ماسٹر عورت کو کار میں بٹھا کر کہیں لے جاتا ہے اور رات کے بارہ بجے کے بعد گھر آتا ہے۔ میں نے دونوں کو کبھی خوش نہیں دیکھا۔ ہر روز کمرے میں سے لڑائی جھگڑے کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ میوزک ماسٹر کی بیوی زور زور سے روتی ہے، چیختی ہے، چلّاتی ہے اور کہتی ہے کہ وہ یہاں سے چلی جائے گی۔ وہ یہاں نہیں رہ سکتی۔ دونوں خوب زور زور سے باتیں کرتے ہیں، لیکن دوسرے دن دونوں پھر اُسی کمرے میں رہتے ہیں، سوتے ہیں اور عورت کھڑکی میں بیٹھ کر لوگوں کی طرف دیکھتی ہے، معلوم نہیں کیوں۔!

اب ذرا سیڑھیاں چڑھو، دیکھ کر چڑھنا۔ پھسلن ہوگی۔ یہاں ٹھہر جاؤ ذرا دم لے لو۔ ایک ہی بلڈنگ میں تمام ہندوستان کو دیکھ سکو گے۔ یہاں ایک کرسچین لڑکی رہتی ہے۔ یہ لڑکی ہے یا عورت ہے یا ماں یا کسی کی بیوی، اس کا مجھے کوئی علم نہیں۔ کہتے ہیں اس کے تین بچے ہیں۔ یہ تینوں بچّے سیڑھیوں میں کھیلا کرتے ہیں۔ بچّوں کے جسم پر پھوڑے نکلے ہوئے ہیں۔ کرسچین لڑکی دروازے میں کھڑی ہو کر اپنے بچوں سے انگریزی میں باتیں کرتی ہے۔ اس کرسچین لڑکی کا نام کیا ہے۔ نام پوچھنے کی ضرورت کیا ہے۔ بچاری کی حالت ابتر ہے، گو رنگ سفید ہے، لیکن جسم پر گوشت نہیں ہے۔ چہرے کی ہڈیاں اُبھری ہوئی ہیں اور اُوپر والے جبڑے کے تین دانت آگے بڑھے ہوئے ہیں۔ کرسچین لڑکی فراک پہنتی ہے، کاش شلوار یا دھوتی پہنا کرے تو کم از کم اُس کی پنڈلیاں تو ہماری نظروں سے اُوجھل رہیں، نہایت پتلی پتلی سی ٹانگیں اور کچھ مڑی ہوئی، جیسے جسم کے بوجھ سے مڑ گئی ہوں۔ میں نے اُس کے خاوند کو کبھی نہیں دیکھا یعنی میں نے اس گھر میں کسی مرد کو نہیں دیکھا۔ بہرحال کوئی مرد تو اس گھر میں آتا ہوگا۔ ورنہ یہ بچّے کہاں آ گئے۔ اور بچاری کرسچین لڑکی گذارہ کس طرح کرتی ہوگی۔ جب تم پہلی بار آؤ گے، تو تم کرسچین لڑکی کو دروازے میں کھڑی پاؤ گے۔ وہ تمہاری طرف دیکھے گی اور پھر مُنہ موڑ لے گی۔ وہ ہر روز کس کا انتظار کرتی ہے، اس کا مجھے علم نہیں لیکن اس کی آنکھوں میں اس کے نہ آنے والے محبوب کا انتظار ضرور ہے، وہ کب تک انتظار کرے گی۔ میں کیا بتا سکتا ہوں۔ میں نے ہمیشہ اس لڑکی کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن میں نے ہمیشہ اُسے دروازے پر کھڑی دیکھا ہے۔

کرسچین لڑکی کے دروازے کے سامنے چند مدراسی عورتیں رہتی ہیں، بلکہ ایک بیوہ عورت رہتی ہے، جس کی بہت سی لڑکیاں ہیں۔ لڑکیاں جوان ہیں۔ لیکن وہ شباب ہی کیا جو تمہیں اپنی طرف نہ کھینچ لے، وہ عورت ہی کیا جس کی طرف ایک نظر دیکھنے کو جی نہ چاہے۔ عورت کے حسن میں کشش ہونی چاہیے، اگر تم ایک بار دیکھ لو، تمہیں یہ محسوس ہو جائے کہ تم ایک زندہ، متحرک دائرے کے اندر کھڑے ہو، لیکن آشیانہ بلڈنگ میں حُسن مُردہ ہے، شباب عنقا ہے، زندگی جامد ہے، میں سمجھتا ہوں کہ زندگی حُسن سے پیدا ہوتی ہے، خوبصورت چیز کو دیکھ کر خوبصورت بننے کو جی چاہتا ہے۔ یہاں تو بدصورتی کا مقابلہ ہے۔ لڑکیوں کی ماں بیوہ ہے، اور اُس نے اپنی بیوگی کے تمام قوانین اپنی لڑکیوں پر عائد کر رکھے ہیں۔ میں نے لڑکیوں کو کبھی مسکراتے نہیں دیکھا، اُن کے گھر سے کبھی قہقہوں کی آواز نہیں آئی، گھر کے دروازے بند رہتے ہیں، اور جب کبھی مدراسن کے گھر کا دروازہ کھلتا ہے، تو اُس میں سے ایک بیوہ کا چہرہ تمہیں ڈھونڈتا ہے، دو موٹی موٹی آنکھیں لمحہ بھر کے لئے چمکتی ہیں، پھر ایک جوان سڈول بازو آگے بڑھتا ہے، اور پھر یہ تمام جسم پیچھے حرکت کرتا ہے۔ تم نے بیوہ کا چہرہ نہیں دیکھا۔ چہرے پر نفرت کی جھرّیاں ہیں، مٹتے ہوئے شباب کے آخری لمحے، بیوگی کی تلخیاں، زندگی سے انتہائی نفرت اور ایک نہ مٹنے والی پیاس اور تشنگی کا اظہار، جو اکثر مدراسن کی آنکھوں سے جھلکتا ہے۔ صرف مدراسن کی آنکھوں ہی سے نہیں، بلکہ اُس کا پرتو تم اُن جوان لڑکیوں کی آنکھوں میں دیکھ سکتے ہو، صرف آنکھوں میں ہی نہیں، بلکہ اس نفرت

اس پیاس، اس بھوک، اس تشنگی اور بیوگی کی تشکیل تم ان لڑکیوں کے جسموں میں دیکھ سکتے ہو۔ لڑکیاں اکثر خاموش اور اُداس رہتی اور ناریل کے درختوں کی طرف دیکھتی رہتی ہیں۔ ہم سب اپنے کمرے کی چابی اِن مدراسنوں کو دے جاتے ہیں۔ اگر تم اِن لڑکیوں کی جنسی بھوک کا اندازہ کرنا چاہو، تو تم ایک دن کمرے کی چابی خود اُنھیں دینا، تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ وہ کمرے کی چابی لینے کے لئے کتنی بے قرار رہتی ہیں۔ دروازہ اکثر بند رہتا ہے، آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹاؤ، فوراً دروازہ کھُل جائے گا اور ایک بدصورت چہرہ تمہاری طرف دیکھے گا۔

چہرہ، بالکل بدصورت چہرہ، صاف سلیٹ کی طرح، جذبات سے عاری، نہ ہنسی، نہ خوشی، نہ غم، نہ زندگی نہ موت، بالکل بے حس، بے جان چہرہ، اور پھر ایک میلا گندا سا ہاتھ تمہاری طرف بڑھے گا، میری انگلیاں کئی بار غیرارادی طور پر ان بدنُما انگلیوں سے مس ہوئیں، لیکن ایک بار بھی ایسی دھڑکن پیدا نہ ہوئی جو ایک جوان لڑکی کے جسم سے مس ہو کر پیدا ہوتی ہے۔ اِن سب لڑکیوں کی شکلیں ایک جیسی ہیں، اُن کے جسم اُن کے چلنے پھرنے کے انداز اُن کے دیکھنے کا طریقہ ایک ہی ہے۔ وہ تمہاری طرف بار بار دیکھیں گی، لیکن نگاہوں سے یہ پتہ لگتا ہے کہ جوانی میں شکست کا احساس ہو چکا ہے۔ اگر ان لڑکیوں کی تربیت، ان کا ماحول، ان کے رہنے سہنے کے طریقوں کو ایک نئی تربیت ایک نئی تشکیل دی جائے تو ممکن ہو سکتا ہے کہ یہی لڑکیاں آفت کا پرکالہ بن جائیں، اور اِس سوئی ہوئی زندگی میں شعلہ بن کر چمکیں۔

اگرچہ ان کا رنگ سیاہ ہے، لیکن جوانی کو رنگ سے کیا نسبت۔ دور کیوں جاؤ، ہمارے محلّے میں ایک اور لڑکی رہتی ہے جس کا رنگ بالکل ان مدراسنوں سے ملتا ہے، مگر اُس کے حُسن میں کتنی کشش ہے، کتنی جاذبیت ہے، اس کا اندازہ میں ہی لگا سکتا ہوں۔ یہ لڑکی اکثر سفید ساڑھی پہنتی ہے، سیاہ رنگ اور سفید ساڑھی۔ سفید ساڑھی اور سیاہ رنگ — سیاہ رنگ سفید ساڑھی میں خوب چمکتا ہے، خوب پھبتا ہے۔ لڑکی کو ساڑھی پہننے کا طریقہ خوب آتا ہے۔ جسم کا ہر خط اتنا واضح ہو جاتا ہے کہ لڑکی کو بار بار دیکھنے کو جی چاہتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لڑکی ایک مصوّر ہے جو ساڑھی کو مصوّر کے برش کی طرح استعمال کر سکتی ہے۔ ایک ہلکا سا جھٹکا، کہ انسانی جسم نے ایک نئی طرز اختیار کی۔ وہ ہر روز ساڑھی بدلتی ہے، کبھی کبھی آسمانی جیسے ناریل کے سبز پتّے، کبھی کبھی اُسوہتھ جیسے شفق کی لالی، سرمئی، مٹیالا رنگ بدلتے ہیں، حُسن بدلتا ہے، جوانی بدلتی ہے، ہر چیز بدل جاتی ہے، لیکن لڑکی کا حُسن اسی طرح قائم ہے۔ آؤ، میرے قریب آؤ۔ وہی لڑکی آ رہی ہے، لو وہ آ رہی ہے اور آشیانہ بلڈنگ کے سکنڈ فلور کے رہنے والے بالکونی میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لڑکی کے ہر قدم کی آواز اُن کے دل کی دھڑکن سے ہم آہنگ ہو رہی ہے۔ دُور کبوتر ہوا میں پرواز کرتے ہیں۔ ناریل کے پتے ہوا میں جھومتے ہیں، سورج کی سُنہری کرنیں بالکونی پر ناچتی ہیں — نگاہیں لڑکی کی طرف لپکتی ہیں، ساڑھی جسم سے چپکی ہوئی ہے، جسم کا ہر خط واضح ہے۔ پنڈلیوں سے اُوپر رانوں تک اور پھر کولھوں کا سنگم۔ کتنا دل فریب، کتنا دل کش ہے، مصوّر کو داد دو، اس کی حنائی انگلیوں کو چُوم لو، اگر چوم سکتے ہو۔ نظر کمر تک جاتی ہے، کمر پر زیادہ گوشت نہیں، اور پھر سینے کا پھیلاؤ، چھاتیوں کا زیر و بم — اور سمندر لہریں مار رہا ہے، لہریں آتی ہیں، ساحل سے ٹکراتی ہیں اور واپس چلی جاتی ہیں، اور اوپر — ایک چھوٹا سا خوبصورت چہرہ، چھوٹے چھوٹے پتلے ہونٹ اور کسی کی زبان اُن پتلے ہونٹوں پر پھرتی ہوئی، نچلا ہونٹ کچھ کھنچا ہوا، آنکھیں سیاہ، پلکیں جوانی کے بوجھ سے جھکی ہوئی — یہ جانتے ہوئے کہ لوگ دیکھ رہے ہیں، لڑکی شرماتی نہیں، آنکھوں میں مستی ہے، کامرانی ہے۔ لڑکی کو احساس ہے کہ وہ اپنے حُسن سے لوگوں کو مسحور کر سکتی ہے۔ کتنا صحت مند احساس ہے، وہ آگے بڑھتی ہے، ہری چند اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ایک آہ بھرتا ہے اور کہتا ہے، مار ڈالا۔ مار ڈالا۔ ہائے مار ڈالا۔ اور چٹرجی کی ہنسی جیسے مُردہ زندہ ہو گیا۔ اور اوتار سنگھ کا جھک کر دیکھنا اور رگھبیر کا شعر پڑھنا۔ "زندگی چاند سی عورت کے سوا کچھ بھی نہیں۔" اور پھر سب کا پیچھے ہٹ جانا اور کرسیوں پر بیٹھ کر گالیاں بکنا۔ خدا کو تہذیب کو — سرمایہ داروں کو، حکومت کو، ماں باپ کو، سب کو۔ رگھبیر کا عریاں ہو کر کمرے میں پاگلوں کی طرح چکّر لگانا، چٹرجی کا کرسی میں دھنس جانا، اوتار سنگھ کا اپنی پگڑی اُتارنا اور لمبے لمبے بدبودار بالوں میں کنگھی کرنا — اور میرا لڑکی کی طرف دیکھتے رہنا — دیکھتے رہنا — یہاں تک کہ حُسن نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ شباب کی خوشبو ہوا میں گم ہو جاتی ہے، اور کسی کے قدموں کی مدھم چاپ آہستہ آہستہ خاموش ہوتی جاتی ہے — اور صرف گالیوں کی آواز مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح دماغ سے ٹکراتی رہتی ہے، ابے او حرامزادے، ابے او اُلّو کے پٹھے ......

میں
خراجِ عقیدت پیش کرتا ہوں

اُس مخلص ادیب کو جو انسانیت کی

بہتری کے لئے جیا اور مرا

اُسے ادبی دنیا ——

مہندر ناتھ

کے نام سے جانتی ہے

رحمٰن نیّر

مدیر "روبی" نئی دہلی

مدھو سودن

جہاں وہ رہتا تھا

مہندر ہی آخری آدمی تھا جو رات آشیانے میں لوٹا۔ رندھیر اس رات گھر نہیں آیا تھا۔ وہ اکثر رات کو گھر نہیں آتا تھا۔ مہندر نے اندھیرے میں ٹٹول کر بجلی کا بٹن دبایا لیکن روشنی نہیں ہوئی۔ شاید آج پھر فیوز اُڑ گیا تھا۔ آشیانے میں اندھیرا تھا۔ مہندر نے کسی کو آواز نہ دی۔ اُسے معلوم تھا کہ باقی سب چھت پر سوئے ہوئے ہوں گے۔ درمیان کے دروازے سے گزر کر وہ اندر کمرے میں چلا گیا۔ جہاں گلی کے لیمپ پوسٹ کی روشنی آتی تھی۔ آشیانہ بلڈنگ کا یہ فلیٹ ایک کمرے اور کچن پر مشتمل تھا اور اس میں پانچ نوجوان رہتے تھے۔ مہندر جس وقت بھی مکان کے اندر آتا تھا، یہاں کی بے ترتیبی اور سامان کی بھیڑ کو دیکھ کر اُسے جگہ کی قلت کا ایک گھٹا گھٹا ہوا سا احساس ہوتا تھا۔ چھ مہینے یہاں رہنے کے باوجود یہ احساس زائل نہ ہوا تھا۔ وہ اس کا عادی نہ ہوا تھا۔

گلی میں سے آتی ہوئی لیمپ پوسٹ کی روشنی میں وہ کپڑے بدلنے لگا۔ کمرے میں ایک ہلکی سی روشنی تھی جس سے سامان کی زیادتی کا احساس ہوتا تھا۔ کواڑوں پر، کھونٹیوں پر، زمین پر پڑے ہوئے میلے کپڑے، بے ترتیبی سے بکھرا ہوا سامان، جوتے، کتابیں، ٹرنک سب اس طرح پھیلے پڑے تھے جیسے کسی کو ان کی پروا نہ ہو، کسی کو ان کی پروا نہ تھی۔ ایک عجیب سی بے پروائی اس فلیٹ کے رہنے والوں پر چھائی ہوئی تھی، جسے مہندر اب آہستہ آہستہ سمجھنے لگا تھا۔ اس فلیٹ کے رہنے والے پانچوں نوجوان اپنی زندگی کی بہتری کے لئے ایک بھیانک کشمکش میں مبتلا تھے اپنے گھروں کو چھوڑ کر یہاں بمبئی میں آئے ہوئے تھے، اس چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے جو صرف ایک جوڑے کے لئے بنایا گیا تھا۔ پے در پے ناکامیوں نے انہیں بے پروا بنا دیا تھا۔ انہیں ذمہ داری سے نفرت ہو گئی تھی، سلیقے سے نفرت ہو گئی تھی۔ انہیں اب نہ صفائی کی چاہ رہی تھی نہ ترتیب کی۔ مہندر ان لوگوں میں ابھی نیا تھا اور اس ماحول میں ایک گھٹن سی محسوس کرتا تھا۔ وہ ادیب تھا اور فلم میں نوکری کرنے آیا تھا، لیکن پچھلے چھ مہینے کوشش کرنے کے باوجود کسی پروڈیوسر نے اسے موقعہ نہ دیا تھا۔ آج وہ خوش تھا۔ آج ایک دوست نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کے لئے کچھ کرے گا۔ اور آج اسے ایک لڑکی ملی تھی۔

کپڑے بدل کر اس نے سوچا کہ جا کر اوپر چھت پر سو رہے، لیکن اس وقت وہ اکیلا رہنا چاہتا تھا، اکیلا رہ کر سوچنا چاہتا تھا۔ مستقبل کے بے پایاں اندھیرے میں جو ایک چراغ کی لَو اٹھی تھی۔ اس سے محظوظ ہونا چاہتا تھا۔ بستر کو جھاڑ کر اس نے کھڑکی کے سامنے کھینچا اور لیٹ گیا۔ باہر ناریل کے اونچے اونچے درخت ہوا میں ہل رہے تھے اور ان کے عقب میں آسمان پر ایک ہلکی سی سفیدی پھیلی ہوئی تھی۔ ناریل کے درختوں کو دیکھ کر اسے ایک خوب صورتی کا احساس ہوا۔ آج اسے کِٹی ملی تھی۔

شام وہ اداس تھا۔ آشیانے کے دوست باہر گئے ہوئے تھے، وہ اکیلا تھا۔ تنہائی میں اکثر اس کے دل میں اداسی کا بے ذائقہ تیزاب پھیل جاتا تھا۔ زندگی کی ناکامرانی ایک مغموم دھند بن کر چھا جاتی تھی۔ اس وقت وہ اکثر سمندر کے کنارے ٹہلنے چلا جاتا تھا۔

لیکن جب دل اُداس ہو تو نہ سمندر کی بے چین لہریں خوب صورت ہوتی ہیں، نہ شفق کے زرّیں حسن میں وہ جاں بخش تازگی۔ اور سمندری افق پر چھایا ہوا دھندلکا۔ اُسے ایک بے پناہ یاسیت میں لپیٹ دیتا۔ اسے محسوس ہوتا کہ تمام کائنات ماتم میں ہے، یہ انسان کی دنیا دکھی ہے اور رگ و پے میں کرب و اضطراب کی ایک دیرپا لہر دوڑ جاتی، زندگی سے مایوسی ہو جاتی۔

شام وہ بہت اُداس تھا۔ یہ کیوں ہوتا ہے کہ انسان ناکامیوں سے ٹکرا کر جان دے دیتے ہیں، یہ کیوں ہوتا ہے کہ انھیں زندگی میں کبھی خوشی نہیں ملتی اور مسرت کی ایک نوخیز کرن کو دیکھنے سے پہلے موت کے بے کراں اندھیرے میں ڈوب جاتے ہیں؟ یہ زندگی موت سے بدتر ہے، نہ روپیہ پاس ہے، نہ عورت ہے، نہ محبت ہے، نہ خوشی ہے۔ سمندر کا حسن بیکار ہے، لہروں کا شور بے معنی ہے، شفق کی سُرخی بے سود ہے۔ اس تہذیب کی دنیا میں روپیہ چاہیے۔ روپے کے بغیر خوبصورتی متاثر نہیں کرتی، حسن اثر نہیں کرتا۔ یہ چیزیں تمہارے لئے نہیں ہیں۔ نادار ہو کر تم دنیا کے دکھ کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کر سکتے۔ تمام انسانیت کا دکھ تمہارے سینے میں سمٹ آیا ہے۔ آج وہ بہت اُداس تھا اور سوچ رہا تھا اور اندھیرے کے ذرّات فضا میں بکھرتے گئے، ناریل کے درختوں پر تاریکی چھاتی گئی۔ اور کمرا ایک اُداس، بے مصرف، سنسان اندھیرے سے معمور ہوتا گیا۔

اچانک اس نے ایک آواز سُنی۔ کھنّہ اسے نیچے گلی میں سے بلا رہا تھا۔ مہندر نے جھانک کر بالکنی سے دیکھا۔ کھنّہ کے ساتھ کار میں دو پارسی لڑکیاں بیٹھی تھیں، لڑکیوں نے شوخ رنگ کے فراک پہنے ہوئے تھے۔ کھنّہ اوپر آگیا۔ اس نے مہندر کو ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ وہ یونہی سیر کو جا رہے تھے۔ یہ لڑکیاں اسے دادر پر ملی تھیں، ایک بار مسکرائی تھیں، دوسری بار کہنے پر کار میں آ بیٹھی تھیں۔ کھنّہ اکیلا تھا، لڑکیاں دو تھیں۔ وہ مہندر کا ساتھ چاہتا تھا۔ مہندر ان کے ساتھ چلا گیا۔

اور آج شام کتنی خوبصورتی سے گزری تھی۔ وہ اداسی نہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھی۔ ایک عورت کے قرب نے دل کی پژمردہ کیفیت کو دور کر دیا تھا۔ یہ ریشمی کپڑوں کے نیچے اس کے جسم کا لمس تھا، اس کے جسم کی حرارت تھی، ملائمیت تھی، کچھ تھا جس نے اس کی رگوں میں زندگی کی مضطرب لہر دوڑا دی تھی۔ پچھلی سیٹ پر کیٹی اس کے ساتھ تنہا تھی اور کار باندرہ کے پُل پر اُڑی جا رہی تھی۔ سمندر کا پانی نیلا تھا، آسمان کی طرح نیلا، دور ایک کشتی اپنے سفید بادبان پھیلائے جا رہی تھی، ہوا سے کیٹی کے بال اُڑ رہے تھے۔ ساحل پر ناریل کے درخت کھڑے تھے دور سے نظر آ رہے تھے جیسے ابھی اپنے بچپن میں ہوں۔ اور کار باندرہ پُل پر بھاگی جا رہی تھی۔ کیٹی نے آہستہ سے جھک کر اس کے کان میں کہا "آئی لَو یو" مجھے تم سے عشق ہے۔ مہندر نے اپنا بازو اس کی کمر کے گرد ڈال لیا۔ اور کیٹی اس کے قریب سمٹ آئی۔ مجھے تم سے عشق ہے، تمہارے اس جسم سے عشق ہے جس کی حرارت میری روح میں جذب ہو رہی ہے۔ تمہارے اس فقرے سے جیسے کہ تم نے میرے سینے میں سوئی ہوئی اس شدت کو جگا دیا ہے اور کیٹی کی کمر کے گرد اس کے بازو کا حلقہ تنگ ہو گیا۔ وہ کیٹی پر جھکا، اس کے سُرخ ہونٹوں کو چوم لینے کے لئے۔ کیٹی مسکرائی اور اس نے اپنا چہرہ ہٹا لیا۔ کار ساحل پر رک گئی تھی۔ وہ کار سے اتر کر ساحل پر ٹہلنے چلے گئے۔ آج ساحل پر بھیڑ نہ تھی۔ سمندر کے وسیع کنارے پر صرف چند آدمی نظر آ رہے تھے۔ وہ ساحل پر ٹہلتے رہے۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ سمندری افق پر ایک ہلکی سی سرخی کا سایہ باقی تھا اور سمندر کی بسیط سطح پر ننھی ننھی کشتیاں اپنے بادبان پھیلائے بہہ رہی تھیں۔ کیٹی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا، وہ ساحل پر ٹہل رہے تھے۔ کیٹی باتیں کر رہی تھی۔ وہ باتیں کرتے رہے، بے معنی باتیں۔ مہندر کو بُرا لگا جب کیٹی نے کہا کہ یہاں سمندر کے سیر کرنے میں کوئی لطف نہیں۔ وہ کار میں بیٹھ کر سیر کرنا چاہتی تھی، وہ واپس کار میں آ بیٹھے۔ گھر سے چلتے ہوئے کھنّہ نے پٹرول ڈلوا لیا تھا۔ رات تک وہ کار میں بیٹھے سمندر کے کنارے کنارے بمبئی کی کشادہ سڑکوں پر گھومتے رہے۔ مہندر خواہش کی آگ میں تپتا رہا۔ اور کیٹی نے اسے اپنے ہونٹوں کو چومنے کا موقعہ نہ دیا۔ انہوں نے کافے میں جا کر کھانا کھایا۔ کیٹی اب جانا چاہتی تھی۔ اس نے کہا ہمیں وہیں چھوڑ دو جہاں سے ساتھ لیا تھا۔ کھنّہ نے انہیں دادر میں اتار دیا۔ کیٹی نے اگلے دن ملنے کا وعدہ کیا اور کار سے اترتے ہوئے پھر مہندر کے کان میں کہا آئی لَو یو۔ اور مسکراتی ہوئی چلی گئی۔

گھر آتے ہوئے کھنہ اور مہندر بحث کرتے رہے۔ یہ لڑکیاں کون تھیں، کس طبقے سے تعلق رکھتی تھیں، بہت پڑھی لکھی نہ تھیں، انگریزی کے چند فقرے انہیں یاد تھے۔ ہندوستانی وہ ٹھیک سے بولتی نہ تھیں، ان کی زبان گجراتی تھی اور اپنی زبان سے آگے انہیں کچھ نہیں آتا تھا۔ پھر اس طرح مسکرا کر کار میں آجانا، شاید وہ طوائفیں ہوں۔ مگر انھوں نے کچھ بھی تو نہیں مانگا۔ پھر کچھ بھی ہو۔ وہ خوبصورت تھیں، ایک شام ان کے ساتھ رہی تھیں اور اس شام کا نشہ اب تک ان کے ذہن پر طاری تھا۔

اگر وہ طوائفیں ہی ہوئیں، مہندر نے بستر پر لیٹے ہوئے سوچا، تو کم از کم اس کے متعلق تو انہوں نے ضرور دھوکا کھایا۔ وہ کھنہ کی کار پر ریجھ گئیں۔ لیکن اگر وہ اوپر آجاتیں، یہاں آکر اس مکان کو دیکھ لیتیں تو کٹی کے ہونٹوں سے "آئی لو یو" نہ نکلتا۔ اگر وہ طوائفیں نہ ہوتیں تب بھی اس مکان کو دیکھ کر دوبارہ بات کرنا گوارا نہ کرتیں۔ ہماری زندگی میں انسانی برتری کا معیار ایک کار ہے۔ مہندر نے دہرایا۔ ایک کار انسان کو نظروں میں اٹھا دیتی ہے، ایک کار نہ ہو تو انسان، انسان نہیں رہتا، ایک کلرک، ایک مزدور، ایک سپاہی رہ جاتا ہے۔ کٹی نے سوچا ہوگا۔ کار کے مالک کھنہ کا دوست مفلس نہ ہوگا اسے کیا معلوم کہ آشیانے کا ہر ایک فرد اپنا سرمایہ ختم کر چکا ہے۔ اچھا ہوا وہ آشیانے میں نہیں آئی، ورنہ اس کا ہاتھ کٹی کی کمر کے گرد نہ جا سکتا۔

چھ مہینے پہلے جب رندھیر بمبئی میں وارد ہوا تھا تو اسے خواب میں بھی یہ خیال نہ تھا کہ رندھیر کی آشیانہ بلڈنگ مقابل ماہم پوسٹ آفس میں یہ حالت ہوگی۔ یہاں آکر دیکھا کہ آشیانہ بلڈنگ میں اس کے پاس ایک کمرہ اور کچن پر مشتمل ایک فلیٹ ہے، جس میں پہلے ہی پانچ آدمی رہتے ہیں، وہ چھٹا آدمی تھا جو آشیانے میں رہنے کے لئے آیا۔

آشیانہ ماہم میں واقع ہے۔ ماہم شہر میں بدنام علاقہ ہے لوگ کہتے ہیں۔ ماہم کے ہر مکان میں ایک طوائف ضرور رہتی ہے۔ ان مکانوں میں زیادہ تر عیسائیوں کی آبادی ہے۔ شروع شروع میں مکانوں کی بالکنیوں سے لٹکتی ہوئی ہر عورت کی سانولی، کالی یا بدصورت شکل کو دیکھ کر مہندر کو اس پر طوائف ہونے کا شبہ ہوتا۔ بمبئی آکر اسے محسوس ہوتا تھا جیسے وہ طوائفوں کے شہر میں آگیا ہے۔ اپنے اس احساس کا اسے جواز نہ ملتا تھا۔ وہ خوش تھا کہ بمبئی نسبتاً آزاد خیال شہر ہے۔ یہاں عورتوں کو گھروں کی چار دیواری میں گھونٹ کر نہیں رکھا جاتا۔ یہاں عورتیں بھی سمندر کے کنارے سیر کرنے جاتی ہیں، یہاں عورتیں بھی بسوں میں، ٹراموں میں، ریلوں میں سفر کرتی ہیں۔ لیکن اکثر کسی عورت کو دیکھ کر اسے احساس ہوتا کہ یہ طوائف ہے۔ طوائفوں کی اتنی کثیر تعداد کو دیکھ کر اسے خیال آتا کہ انسان جتنا زیادہ مہذب ہوتا جاتا ہے طوائفیں بڑھتی جاتی ہیں اور یونہی بڑھتی جائیں گی۔ اگر عورت کو مرد سے اور مرد کو سرمایہ دار کے چنگل سے آزاد نہ کیا گیا۔

آشیانہ بلڈنگ ایک عرصے تک مہندر کے لئے ایک طلسم رہی تھی۔ کچھ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ اس عمارت میں رہنے والے کیسے رہتے ہیں، کیا کرتے ہیں۔ فرشی منزل پر بائیں طرف ایک گجراتی رہتا ہے، خاموش، بعید۔ مہندر نے آج تک اسے کسی سے بات کرتے نہیں سنا۔ بمبئی کے آدمی، وہ سوچا کرتا ہے، ایک مخصوص تاجرانہ ذہنیت کے مالک ہیں۔ وہ انسان دوستی پر اعتقاد نہیں رکھتے۔ یہاں دو آدمیوں کے درمیان انسانیت کا رشتہ نہیں۔ روپہلی تاروں کا رشتہ ہے۔ انسان کے جذبات بھی جنس بن گئے ہیں۔ ہر شخص اپنی دھن میں مست ہے۔ ہر شخص کو اپنی پڑی ہے۔ ریلوں میں، بسوں میں، ٹراموں میں، گاڑیوں میں، ہر جگہ لوگ اپنے مطلب سے چلے جا رہے ہیں۔

فرشی منزل پر یہ گجراتی اپنی بیوی اور ایک بچے کے ساتھ رہتا ہے۔ چند مرتبہ اس نے گجراتی کی بیوی کو کھڑکی کی سلاخوں سے لگے دیکھا ہے اس کا چہرہ زرد ہے، چہرے پر ایک عجیب بے رونقی چھائی رہتی ہے، جیسے اس کی رگوں میں خون کی بجائے تیل بھرا ہوا ہو۔ شام ہوئے وہ ٹائیلیٹ کرتی ہے، نہاتی ہے، شام سے پہلے اس نے گجراتی کی بیوی کو کبھی ٹائیلیٹ کئے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ دن میں جب بھی نظر آتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ابھی سو کر اٹھی ہے۔ عمارت میں کسی اور سے گفتگو کرتے ہوئے بھی مہندر نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔ اکثر اندھیرا ہو جانے کے بعد اوپر بالکنی میں کھڑا ہوا مہندر دیکھتا ہے کہ کوئی کار، کبھی وہ ٹیکسی ہوتی ہے کبھی ذاتی کار گلی کے موڑ پر رکتی ہے گجراتی اس میں سے اتر کر گھر میں آتا ہے، پھر چند منٹ بعد بیوی کار میں آبیٹھتی ہے، کار چلی جاتی ہے۔

مہندر نے اکثر یہی ہوتے دیکھا تھا، اور ایک تجسّس اس کے دل میں جڑ پکڑتا گیا۔ پھر ایک دن برابر کے فلیٹ میں رہنے والے پنجابی نوجوان نے بتایا کہ گجراتی کی بیوی طوائف ہے، اور گجراتی؟ وہ اس کا شوہر ہے اور اپنی بیوی کا ایجنٹ بھی۔ مہندر کو یک لخت یقین نہیں آیا۔ پھر اُسے یقین آ گیا۔ پھر غصّہ آیا، پھر رحم آیا۔

اس شخص کی وہ غیرت کہاں گئی جو اس نے اپنے بزرگوں سے پائی تھی، وہ حمیت کہاں گئی، عزّت کا وہ احساس کس جہنّم میں جھلس گیا جو انسان کو انسان بنائے رکھتا ہے۔ ایک دلال، ایک بھکاری، ایک فقیر بننے سے بچاتا ہے۔ وہ کونسی منحوس ضرورت تھی۔ جس نے سینے سے سب کچھ نوچ لیا۔ اور ذلت بھر دی، مہندر نے سوچا، اور ایک بھیانک حقیقت اس کے دل میں اجاگر ہونے لگی۔ بھوک، بھوک، اور گجراتن کا بے رونق چہرہ اس کے سامنے آ گیا۔

یہ فرشی منزل کا پہلا فلیٹ ہے، اس میں ایک گجراتی رہتا ہے اور اس کی بیوی، اُن کا ایک بچّہ ہے۔

گجراتی کے مقابل کے فلیٹ کا دروازہ ہمیشہ بند رہتا ہے۔ یہ فلیٹ مالک مکان نے اپنے لئے رکھا ہوا ہے۔ وہ صرف ہفتے کی شام کو آتا ہے، اس کے ساتھ ایک عورت ہوتی ہے۔ یہ عورت ہمیشہ نئی ہوتی ہے لیکن اس کی مسکراہٹ، اس کے انداز، اس کی روح ہمیشہ ایک ہوتی ہے۔ عورت مالک مکان کے ساتھ اندر چلی جاتی ہے۔ مالک مکان کی کار اگلی شام تک باہر کھڑی رہتی ہے۔ اس کار کو کھڑا دیکھ کر بار بار مہندر کے دل میں بغاوت اور تشدّد کا ایک شدید جذبہ اٹھتا ہے اور وہ بالکنی سے ہٹ کر اندر کمرے میں چلا جاتا ہے۔

دوسری منزل پر پہنچنے سے پہلے ایک کتا بھونکتا ہے۔ اس کتّے کو دائمی خارش ہے، اس کی آنکھوں میں ہمیشہ کیچڑ بھری رہتی ہے۔ آنے جانے والے پر وہ اس طرح بھونکتا ہے جیسے وہ اس کی تنہائی میں مخل ہوا ہو۔ مہندر نے اس کتّے کو دوسری منزل کی سیڑھیوں سے ہٹ کر اور کہیں نہیں دیکھا۔ یہ کتا بھونکنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کرتا۔ چند بار بھونکنے کے بعد خود ہی سرنگوں ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ اسے دیکھ کر اکثر ایک ہمدردی سی ہو جاتی ہے۔ یہ کتّا دوسری منزل کے اس عیسائی خاندان کا ہے۔ مہندر کو اکثر خیال ہوتا ہے کہ یہ لوگ عیسائی نہیں پارسی ہیں، لیکن اُسے کبھی یہ پوچھنے کا موقعہ نہیں ملا۔ شوہر شاید بہت جلد اپنے کام پر چلا جاتا ہے اور بہت دیر میں واپس آتا ہے۔ دو تین مرتبہ کے علاوہ مہندر نے شاذ ہی اسے دیکھا ہو گا۔ لیکن اس کی وہ چند تصویریں ذہن پر مرتسم ہو گئی ہیں۔ ایک بار مہندر نے دیکھا تھا کہ عیسائی (اگر وہ پارسی نہیں ہے) سیڑھیوں پر کھڑا ہوا خارش زدہ کتّے کو پیار کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اس وقت غم گساری، دوستی اور ہمدردی کا ایسا جذبہ تھا کہ مہندر آج تک اسے بھول نہ سکا۔ مہندر کو دیکھ کر اس نے صرف ایک بار اپنی آنکھیں اٹھائیں اور پھر کتّے کو پیار کرنے لگا۔ اور وہ ایک نظر آج تک مہندر کے سینے میں محفوظ ہے، جیسے وہ تمام دنیا کا دکھ، تمام دنیا کا غم اپنے دل میں لئے ہوئے ہو۔

عیسائی کے کوٹ اور پتلون کو دیکھ کر ہمیشہ ایک مفلسی کا احساس ہوتا ہے۔ اُڑے ہوئے رنگ کی ایک سیاہ ٹائی ہمیشہ اس کے بشاشت سے محروم چہرے کو بے جان بنائے رکھتی ہے۔ عیسائی کے کئی بچے ہیں، لیکن نجانے وہ کس طرح رہتے ہیں کہ گھر کے اندر سے کوئی آواز نہیں آتی۔ دروازہ بند رہتا ہے۔ کبھی کبھی دیکھا جاتا ہے کہ دروازہ کھلا ہوا ہے اور عیسائن دروازے کے پاس بیٹھی ہوئی سبزی فروش سے سودا کر رہی ہے۔ عیسائن ہمیشہ ٹخنوں تک نیچا ایک فراک پہنے رہتی ہے۔ اس کی جلد سفید ہے لیکن جسم پر گوشت نام کو نہیں ہے۔ اُس وقت اگر کوئی پاس سے گزرے تو وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں، جو اس کے بے گوشت چہرے پر اور بھی بڑی معلوم ہوتی ہیں، اٹھا کر دیکھتی ہے، بے مقصد، بے معنی نگاہ۔ ایک بچہ اکثر اس کی گود میں ہوتا ہے یا اُس کا سایہ پکڑے پاس کھڑا ہوتا ہے۔ سبزی والے کے جانے کے بعد دروازہ پھر بند ہو جاتا ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ مہندر کے زینے پر چڑھنے کی آواز سن کر اچانک دروازہ کھلا ہے اور اسے دیکھ کر پھر بند ہو گیا ہے۔ اس وقت مہندر کو احساس ہوتا ہے جیسے یہ لوگ کسی کا انتظار کر رہے ہیں، کسی ایسے شخص کا انتظار جو انھیں آ کر نجات دلائے گا۔

۳۵۱
(بقیہ صفحہ پر)

مہندر ناتھ

زندگی چاندی سی عورت کے سوا کچھ بھی نہیں

اس نے نیا سوٹ پہنا۔ اور قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا جائزہ لیا۔ سر کے بال کچھ بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے برش سے بالوں کو اپنی جگہ جمایا ـــــــ اور سر کو جھٹک کر پھر آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا ـــــــ اسے اپنی ناک کچھ لمبی سی دکھائی دی۔ کاش اس کی ناک اتنی لمبی نہ ہوتی۔ تو اس کی زندگی خوشگوار ہو جاتی۔ سر پر فلیٹ رکھ کر اس نے ایک شعر گنگنانا شروع کیا۔ بیگ میں کچھ کاغذات رکھے۔ اور نوکر کو چند ہدایات دینے کے بعد سیڑھیاں اترنے لگا ـــ آج وہ خوش تھا اس کے نوکر نے نہایت ہی لذیذ کھانا پکایا تھا۔ اور اس نے پیٹ بھر کر کھایا تھا ـــ وہ جلدی سیڑھیاں اتر گیا۔ اور اپنی پرانی کار کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ گو کار پرانی تھی لیکن آج کل کار سستے داموں میں کہاں ملتی ہے۔ بڑی کوششوں کے بعد اسے یہ کار ملی تھی۔ کار خریدنے کے بعد لوگوں میں اس کی عزت اور توقیر بڑھ گئی تھی۔ کہاں تو دوست یار اسے انشورنس ایجنٹ کہہ کر ذلیل کرتے تھے۔ کہاں اب وہی دوست اس سے ملنا اپنی عزت سمجھتے ہیں۔ اور اس نے کار کا دروازہ کھولا۔ اور ہینڈل کو رومال سے صاف کرنے لگا۔ اس نے سوچا کہ وہ کدھر جائے۔ یونہی اسے خیال آیا۔ کہ پہلے کار میں بیٹھ جائے۔ پھر سوچے گا کہ اسے کدھر جانا ہے۔ کار میں بیٹھے ہوئے اسے چند سیکنڈ ہی گذرے تھے کہ اسے پسینہ آنے لگا۔ اس نے ہینڈل گھمایا اور کار کو اسٹارٹ کر دیا۔ اور ایک جھلملاتی ہوئی نگاہ ساتھ والے مکان پر ڈالی۔ یہاں اس کا دوست سریندر رہتا تھا۔ کیوں نہ اسے بلا لے۔ اور دونوں سیر کرنے چلیں۔ کمبخت سو رہا ہوگا یا کوئی کتاب پڑھ رہا ہوگا۔ یا کوئی بیہودہ سی کہانی لکھ رہا ہوگا۔ کہتا ہے کہ میں افسانہ نگار ہوں۔ ایسے افسانہ نگار بہت دیکھے ہیں اس کی زندگی اس فلیٹ میں گذر جائے گی۔ کسی سے ملتا بھی تو نہیں۔ ترقی کیسے کرے گا۔ لعنت بھیجو اس پر ـــ مرنے دو کمبخت کو۔ اسے اپنی اقتصادی حالت کو دوسروں سے بہتر دیکھ کر خوشی محسوس ہوئی۔ ہینڈل کو گھماتے ہوئے وہ کار کو آگے لے گیا۔ اب کار آہستہ آہستہ جا رہی تھی اور وہ سگرٹ کا دھواں کار میں بکھیر رہا تھا۔ آج وہ خوش تھا۔ بے حد خوش تھا۔ زندگی گذر رہی تھی۔ اچھی گذر رہی تھی۔ جب انسان کا پیٹ بھرا ہوا ہو اور بٹوے میں چاندی کے سکے ہوں اور کار بھی ہو۔ اور وہ دیکھ رہا ہو کہ اس کے بھائی پیدل چل رہے ہیں اور اس کی کار خراماں خراماں آگے بڑھ رہی ہے تو اس کی خوشی کی کیا انتہا ہو سکتی ہے۔ اس نے سوچا کہ وہ ان سب سے بہتر ہے۔ احساس برتری سے اس نے گردن کو اکڑا لیا اور سگرٹ کے دھوئیں کو زور سے چھوڑتے ہوئے کار کی رفتار کو تیز کر دیا۔ ہوا خوشی سے گاتی ہوئی اس کے قریب سے گذر گئی۔ اب دادر قریب آ رہا تھا۔ اور قریب آ رہا تھا۔ اب خداداد سرکل آ گیا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے اس نے بائیں طرف دیکھا۔ دو خوبصورت آنکھیں اسے دیکھ کر مسکرا رہی تھیں " مجھے " اس نے سوچا جیسے اسے ان آنکھوں پر یقین نہ آیا ہو۔ اور وہ کار کو گھما کر آگے بڑھ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ اور کار آگے بڑھ رہی تھی۔ وہ کیا

کیا کرے۔ کیا واپس مڑ کر لڑکی کے قریب سے گزرے۔ شاید وہ پھر مسکرائے۔ لیکن اسے خیال آیا کہ اس کی ناک لمبی ہے۔ کوئی لڑکی اسے دیکھ کر مسکرا نہیں سکتی۔ کئی بار وہ اس کار میں بیٹھ کر اس سرکل کے قریب سے گزر رہا ہے لیکن کسی لڑکی نے اس کی طرف مسکرا کر نہیں دیکھا تھا لیکن اس وقت اس کا دل بار بار کہہ رہا تھا کہ میاں چلو ایک بار پھر اسی لڑکی کے قریب سے گزرو۔ اس نے ہینڈل کو گھمایا اور کار پھر واپس چلی۔ اب کے لڑکی پھر مسکرائی۔ اس نے کار روک لی۔ اور پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ اس کی پریشانی کی حد نہ رہی جب معلوم ہوا کہ ایک کے بجائے دو لڑکیاں پچھلی سیٹ پر آگئی تھیں۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اس نے نہایت پھرتی سے کار کا دروازہ بند کیا۔ اور لڑکیوں پر اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالتے ہوئے کار اسٹارٹ کر دی۔ لڑکیاں پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ اور وہ اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا کار کو آہستہ آہستہ چلا رہا تھا ایک مرد اور دو عورتیں یہ ایک خطرناک مثلث تھی۔ وہ تو صرف ایک لڑکی چاہتا تھا۔ دو کس طرح اور کیوں آگئیں۔ وہ ان سے کیا کہے۔ بڑے سوچ بچار کے بعد اس نے "ہیلو" کہا۔ اور اس کی پیشانی پر پسینہ آگیا اس نے مڑ کر دیکھا دونوں لڑکیاں پھر مسکرا رہی تھیں وہ کچھ گھبرا سا گیا ہینڈل ایک طرف کو مڑ گیا۔ اور ساتھ ہی ایک چیخ سنائی دی۔ اس نے فوراً بریک لگا دی۔ ایک اینگلو انڈین لڑکی کار کے نیچے آتے آتے بچ گئی تھی۔ اینگلو انڈین لڑکی نے قہر آلود نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

"یو فول" ————

"آئی۔ ایم۔ ساری" اس نے کہا۔ اور کار کو پوری رفتار سے چھوڑ دیا۔ دونوں لڑکیاں آپس میں باتیں کر رہی تھیں لیکن ان کی باتیں اس کی سمجھ سے باہر تھیں۔ اس نے کنکھیوں سے لڑکیوں کی طرف دیکھا۔ اب کے اس کے ہاتھوں نے بڑی مضبوطی سے ہینڈل پکڑ رکھا تھا۔ لڑکیاں اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ مسکرا رہی تھیں۔ ایک لڑکی نے آنکھوں کو مٹکاتے ہوئے کہا۔ "ہیلو"۔ یہ سنتے ہی وہ خوش ہو گیا۔ اور اسے محسوس ہوا کہ آج اس کی ناک چھوٹی ہو گئی ہے۔ اور اگر لڑکیاں اس طرح اس پر مہربان ہوتی گئیں تو ایک دن اس کی ناک بالکل غائب ہو جائے گی۔ لیکن اس خطرناک مثلث کا کیا علاج ہو گا۔ ایک مرد اور دو عورتیں وہ ان سے اکیلا کیا بات کرے۔ دونوں لڑکیاں پارسین تھیں۔ دونوں خوش شکل تھیں۔ خوبصورت تھیں۔ دونوں مسکرا رہی تھیں۔ دونوں کے بال کٹے ہوئے تھے۔ اور دونوں نے سکرٹ پہنی ہوئی تھیں۔ دونوں کی ٹانگیں ننگی تھیں۔ سپید تھیں۔ آنکھوں میں شوخی تھی۔ شرارت تھی۔ لبوں پر لپ اسٹک تھی۔ سیاہ بالوں میں جوانی کی چمک تھی۔ آج تک کسی خوبصورت عورت نے اس سے بات تک نہ کی تھی۔ یوں تو فارس روڈ پر وہ کئی بار چکر لگا چکا تھا۔ لیکن وہ پڑھی لکھی لڑکیوں خوش پوش پارسنوں اور خوبصورت لڑکیوں کی محبت سے بالکل بیگانہ تھا۔ اگر ایک لڑکی ہوتی تو وہ اسے اپنے پاس بٹھا لیتا۔ یہ سوچتے سوچتے وہ اپنے گھر کے قریب آگیا۔ اور کار کو روک لیا۔

اگلی سیٹ سے اتر کر وہ لڑکیوں کے قریب گیا۔ دونوں مسکرا رہی تھیں۔

"تمہارا نام —— ؟"

"کٹی" لڑکی نے جواب دیا ——"

"اور تمہارا ——" ؟

"لٹی ——"

"کٹی اور لٹی۔ لٹی اور کٹی ——" وہ بڑبڑایا۔ کٹی لٹی سے زیادہ خوبصورت تھی۔ زیادہ چالاک تھی۔ اس کی آنکھوں سے شرارت جھلکتی تھی۔ اس نے زبان کو لبوں پر پھیرتے ہوئے کہا۔

"آؤ چلیں —"

"کہاں —"؟

"بس یونہی سیر کرنے۔"

"لیکن میں اکیلا ہوں۔" اس نے اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔

"تمہارا اور کوئی دوست نہیں —"؟ کٹی نے چمک کر کہا۔

اور اس کی جان میں جان آئی۔ اس نے سریندر کو آواز دی، سریندر آواز سن کر پہچان گیا۔ کہ سالا ایجنٹ ہوگا۔ اور اس کو ایجنٹ سے نفرت تھی۔ لیکن وہ ایجنٹ کی کار سے محبت کرتا تھا۔ وہ انڈرویر پہن کر فرش پر لیٹا ہوا تھا۔ جلدی سے اُٹھ کر اس نے بالکونی سے نیچے دیکھا۔ گوپال اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اس نے وہیں کھڑے ہو کر سخت لہجے میں پوچھا۔

"کیا بات ہے؟"

ایک لڑکی نے سر نکالا اور اس کی طرف دیکھا۔

گوپال نے آنکھ ماری۔ اور رعب دار لہجے میں کہا —— کپڑے پہن کر فوراً آؤ۔"

سریندر نے ایک نئی ہیٹ نکالی۔ بالوں میں تیل لگایا۔ مانگ نکالی اور سیڑھیوں سے نیچے اُتر گیا ——

گوپال نے کٹی اور ملٹی سے تعارف کرایا، سریندر نے لڑکیوں کو دیکھا ہوا اور اسے محسوس ہوا کہ ان لڑکیوں کو کہیں دیکھا ہے، شاید وہ اور سریندر کے قریب یہ ایک بار مسکرائی تھیں۔ اس نے ایک بار لڑکیوں کا تعاقب کیا تھا۔ لیکن وہ لڑکیوں سے بات نہ کر سکا تھا۔ دونوں لڑکیاں اسے پسند تھیں۔ لیکن کٹی اسے زیادہ پسند تھی ——

کٹی اُٹھ کر فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اور وہ ملٹی کے ساتھ بیٹھ گیا۔ سریندر خوش شکل تھا۔ شاید اسی لئے لڑکیاں اس کی طرف جلدی مخاطب ہوئیں۔ لڑکیاں باتیں کم کرتی تھیں۔ مسکراتی زیادہ تھیں۔ اس نے اپنی فلیٹ ملٹی کے سر پر رکھ دی۔

ملٹی نے کہا —— "تھینک یو ——" اور اس کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگی اور زبان لبوں پر پھیرنے لگی۔ کٹی نے گوپال کو ہلکی سی چپت لگائی اور کار کو اسٹارٹ کرنے کے لئے کہا۔ گوپال نے سریندر کو دیکھا۔ جیسے وہ پوچھ رہا ہو کدھر چلیں۔

"آپ کچھ کھائیں گی"؟

دونوں نے سر ہلایا۔ اور سریندر نے گوپال کو کسی نزدیک کے ایرانی ہوٹل میں چلنے کے لئے کہا۔ گوپال نے کار اسٹارٹ کر دی اور چند منٹوں میں وہ ایک ایرانی کے ہوٹل میں داخل ہو کر ایک فیملی روم میں بیرے کو بلا کر چائے اور آملیٹ کے لئے آرڈر دیا۔ اب کے سریندر ملٹی کے قریب بیٹھ گیا۔ اور گوپال کٹی کے قریب۔ چاروں ایک دوسرے کے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ اب چاروں خاموش تھے۔ چپ چاپ تھے۔ اور ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

یہ خاموشی عجیب سی خاموشی تھی۔ سریندر نے اس خاموشی کو توڑتے ہوئے ملٹی سے کہا۔

"آپ کے ہاتھ بہت ہی خوبصورت ہیں۔"

"آپ مجھ سے ایسی باتیں نہ کیجئے۔" ملٹی نے جل کر کہا۔"

گوپال کٹی کے بالوں سے کھیل رہا تھا۔ ایکایک اس کا ہاتھ کٹی کے گالوں سے چھو گیا،

LEARN - MANNERS کٹی نے گھورتے ہوئے گوپال سے کہا۔

گوپال کچھ کھسیانہ سا ہو گیا۔ اتنے میں بیرے نے چائے اور آملیٹ میز پر رکھ دیئے۔ اور وہ سب کھانے لگے۔ سریندر کا ہاتھ یکایک ملٹی کی سفید ٹانگوں سے جا لگا اور ملٹی نے سریندر کا ہاتھ زور سے جھٹک دیا اور پھر آملیٹ کھانے لگی۔ گوپال نے اپنی کرسی ۔ کٹی نے اپنی کرسی اور دور کر لی۔ اور پھر مسکرانے لگی۔ گوپال نے کرسی قریب کر کے کٹی کے کمر میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی۔ کٹی نے اس کا ہاتھ زور سے جھٹک دیا۔ اس جھٹکے سے آملیٹ کی پلیٹ نیچے گر گئی۔ دونوں کی آنکھوں سے شعلے برسنے لگے۔

کٹی نے قہر آلود نگاہوں سے گوپال اور سریندر کی طرف دیکھا اور کہنے لگی۔

میں سمجھتی تھی کہ آپ لوگ شریف ہوں گے۔ لیکن آپ تو بہت ہی بدتمیز ہیں۔"

گوپال اور سریندر خاموش رہے۔

"اگر آپ ہمیں اسی طرح تنگ کریں گے تو ہم ابھی چلی جائیں گی۔"

اور وہ دونوں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ سریندر نے دونوں کی منت سماجت کی کہ اب دوبارہ کسی قسم کی حماقت نہ ہو گی۔ خدارا تم دونوں بیٹھ جاؤ ——

اس منت سماجت کا اثر ضرور ہوا۔ اور وہ دونوں پھر چائے پینے لگیں۔

چائے پینے کے بعد وہ ریسٹورنٹ سے باہر نکلے۔

دونوں اپنے کئے پر نادم تھے۔ لیکن جب چاروں سڑک پر آ گئے۔ تو لوگ انہیں گھور گھور کر دیکھنے لگے۔ گوپال اور سریندر کو ایسا محسوس ہوا کہ سبھی لوگ انہیں خوش قسمت سمجھتے ہیں۔ کہ ان کے ساتھ دو پارسی لڑکیاں ہیں اور اور وہ بھی کتنی خوبصورت۔ اس احساس سے ان کے دل میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اور وہ گزری ہوئی باتوں کو بھول کر کار میں بیٹھ گئے۔

اس بار ملٹی گوپال کے ساتھ بیٹھی۔ اور کٹی سریندر کے ساتھ۔ دراصل سریندر خود کٹی کے ساتھ بیٹھنا چاہتا تھا کٹی کو وہ پسند کرتا تھا۔ وہ ملٹی سے زیادہ باتیں کرتی تھی۔ ملٹی سے زیادہ چالاک تھی۔ اس کی مسکراہٹ میں جاذبیت تھی اور جس انداز سے وہ دو موٹے ہوئے دانتوں کے بیچ سے زبان نکالتی تھی وہ اسے بے حد پسند تھا۔ دونوں کی شکلیں ایک دوسرے سے بہت ملتی جلتی تھیں۔ دونوں کے انداز سے یہ ظاہر ہوتا تھا۔ کہ وہ ابھی نو عمر ہیں۔ ان کی شرارتیں۔ ہنسی۔ دبی دبی مسکراہٹ اور کنکھیوں سے دیکھنا اکثر ان کی حرکتوں کو زیادہ جاذب نظر بناتا تھا۔ گوپال نے کار کو پوری رفتار سے چھوڑ دیا۔ اور سریندر کٹی کے قریب سرک گیا۔ اس کی ٹانگیں کٹی کی برہنہ ٹانگوں سے چھو رہی تھیں۔ وہ ایک حسین خوبصورت لڑکی کی موجودگی کے احساس سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اور وہ لڑکی بھی اس کی جمالیاتی حسن پر پوری اترتی تھی۔ ہوا کے جھونکے بھرتی ہوئی گزر رہی تھی اور کٹی کے سیاہ بال ہواؤں میں لہرا رہے تھے۔ گوپال ملٹی سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ اور وہ ہنس ہنس کر باتیں کیوں نہ کرتا۔ اس کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا۔ جب کہ اسے ایک خوبصورت لڑکی کا قرب حاصل ہوا تھا۔ اور یہ لڑکیاں بھی کتنی فراخ دل تھیں۔ ان کے ساتھ ریسٹورنٹ میں گئی تھیں۔ انہوں نے خود سیر پر جانے کے لئے کہا تھا۔ گو وہ خود شہر کے شور و غل سے دور جانا چاہتے تھے۔ اب وہ شہر سے دور جا رہے تھے۔ مکانات پیچھے چھوٹ گئے تھے۔ اور اب ایک سرمئی سڑک نظر آ رہی تھی۔ جس کے ساتھ سمندر کا گہرا نیلا پانی ٹکرا رہا تھا۔ سڑک بالکل

ویران دکھائی دیتی تھی - گوپال نے کار کی رفتار کو کم کر دیا - اب ایک چھوٹا سا میدان آگیا جہاں پر ناریل کے درخت استادہ تھے - گوپال نے کار کو ناریل کے درختوں کے قریب پارک کر دیا -

قریب ہی جھونپڑی سے دو عورتیں نکلیں - اور ان کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگیں - جیسے کہہ رہی ہوں - تم کتنے خوش قسمت ہو - تمہارے پاس ایک کار بھی ہے - تمہارے چہرے سے صاف عیاں ہے کہ تم نے پیٹ بھر کے کھانا کھایا ہے - اور ادھر ہم ہیں کہ صرف ناریل کا پانی پیتے ہیں - اور ان گنت سمندر کی لہروں کو دیکھتے ہیں - اور زندگی بے جان اور بے کیف ہوتی جا رہی ہے - اور تم لوگ ہماری بالکل پروا نہیں کرتے - "

گوپال اور سریندر نے ان عورتوں کو نظر انداز کر دیا - کیوں کہ ان کے پہلو میں اتنی جاذب نظر چیزیں تھیں کہ وہ دوسری طرف دیکھنا گناہ سمجھتے تھے - سریندر نے کٹی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا - اور کہنے لگا -"

" تمہاری قسمت بتاؤں - " ؟

" ہاں بتاؤ - "

" تم زندگی میں کبھی شادی نہ کرو گی "

کٹی نے ایک قہقہہ لگایا اور کہنے لگی " بس اور کچھ نہیں - "

" اور ہاں تمہارے دل کی لکیر یہ صاف بتاتی ہے کہ تم نہایت ہی اچھی لڑکی ہو لیکن - "

" لیکن کیا - " ؟

" حالات کچھ ایسے ہیں - کہ تمہیں اس قسم کی شرارتیں کرنی پڑتی ہیں - "

" اچھا یہ بتاؤ - کہ میرے کتنے بچے ہوں گے - " کٹی نے دانتوں کے درمیان زبان ہلاتے ہوئے کہا -

" ایک بھی نہیں - "

" ہوں - "

" جی - "

" اور پھر تم ایک شخص سے محبت کرو گی - جو تم سے انتہائی محبت کرے گا - "

کٹی نے ایک ہلکی سی چپت اس کے منہ پر لگائی - اور اپنا ہاتھ کھینچ لیا -

اب سریندر نے ملٹی کا ہاتھ دیکھنا شروع کیا - " دیکھو تمہارے ہاتھ سے صاف ظاہر ہے کہ تم باتیں کم کرتی ہو اور مسکراتی زیادہ ہو - اور جو کچھ تمہارا دل کہتا ہے وہ تم نہیں کرتیں - بلکہ جو کچھ کٹی کہتی ہے - وہ کرتی ہو - تم زندگی میں تین شادیاں کرو گی - اور تمہارے گیارہ بچے ہوں گے - "

یہ سن کر ملٹی ہنس پڑی - اور کہنے لگی - " شٹ اپ - "

گوپال نے ملٹی کو ستانا شروع کیا - لیکن ملٹی نے اس سے صاف کہہ دیا کہ وہ اس قسم کی حرکتیں نہ کرے - چند لمحوں تک ناریل کے درختوں کے قریب ٹہلتے رہے - سورج دور سمندر میں ڈوب رہا تھا اور ان کی خونی کرنیں سمندر کو سرخ کر رہی تھیں - ناریل کے درخت آکاش کی طرف دیکھ رہے تھے - اور ہوا خوشی سے جھومتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی - اور سریندر کٹی کے قرب سے اپنے آپ کو محظوظ کر رہا تھا - زندگی کتنی دلکش ہے - اس نے سوچا - اگر ایک حسین عورت پہلو میں ہو تو جی چاہتا ہے کہ زندگی اس کے پہلو میں بیٹھ کر گزار دی جائے - کچھ عرصے کے بعد کٹی اس کے قریب سے

اُٹھ کر گوپال کے پاس چلی گئی۔ سُریندر سوچنے کہ زندگی اتنی یاس انگیز نہیں، زندگی اتنی مصنوعی نہیں۔ اتنی بے کیف نہیں اور وہ ملتی کی طرف حسرت زدہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ ملٹی کی آنکھوں میں معصومیت کی جھلک تھی۔ اس کے لبوں کے کونوں پر ایک دلفریب مسکراہٹ ناچ رہی تھی، بالکل اسی طرح جس طرح سورج کی الوداعی کرنیں سمندر کی سطح پر ناچ رہی تھیں۔

اتنے میں گوپال نے سریندر سے پوچھا۔

"تمہارے پاس کچھ روپے ہیں۔"؟

"کون مانگتا ہے؟

"کٹی۔" ؟

"کتنے روپے۔"

"صرف دس روپے۔ وہ کہتی ہے کل واپس کر دوں گی۔"

سریندر نے دس روپے دیدیئے۔ اس کے پاس کل پندرہ روپے تھے خیر کوئی بات نہیں اس نے سوچا۔ ابھی تک اس کی جیب میں پانچ روپے ہیں۔ اس کی نگاہوں میں لمحہ بھر کے لئے مایوسی چھا گئی اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے موسم بہار میں خزاں کا جھونکا آیا ہو۔ لیکن دوسرے لمحہ میں کٹی اس کے قریب کھڑی ہو گئی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگی۔

کم بخت لڑکی کتنی حسین ہے۔ اس نے سوچا۔

"دیکھو جی۔ اب دیر ہو رہی ہے۔ ڈیڈی میرا انتظار کر رہا ہو گا" آج ماں ضرور پیٹے گی۔"

دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگیں۔ اور چپکے سے کار میں بیٹھ گئیں۔

کٹی نے سریندر کی فلیٹ لے لی۔ اور اپنے سر پر رکھ لی۔ اور کہنے لگی "میں کیسی دکھائی دیتی ہوں۔"؟

"بہت ہی خوبصورت سریندر نے مُسکرا کر کہا۔

اور وہ خوشی سے جھومنے لگی اور گوپال نے کار کی رفتار تیز کر دی۔

سریندر نے اپنا ہاتھ کٹی کے زانوں پر رکھا۔ ایک لمحہ ہاتھ وہاں رہا۔ دوسرے لمحے میں کٹی نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اور اس کی طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ وہ گھبرا کر ایک طرف سرک گیا۔

اب اندھیرا آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔ سڑک پر بجلی کے قمقمے روشن ہو چکے تھے۔ ہوا میں نمی اور ٹھنڈک زیادہ ہوتی جا رہی تھی۔ اور فیکٹریوں کا دھواں گرد و پیش چھایا ہوا تھا۔ وہ حیران تھا کہ کیا کرے۔ کیا کہے۔ نہ وہ آگے جا سکتا تھا نہ پیچھے ہٹ سکتا تھا۔ عجیب سی لڑکی ہے۔ اس نے سوچا۔ ہنستی ہے۔ مُسکراتی ہے۔ دوسروں کے ساتھ اکیلی سیر کرنے جاتی ہے۔ ہوٹل میں کھانا کھاتی ہے لیکن جسم کو ہاتھ تک نہیں لگانے دیتی اس کی نگاہوں میں شرارت ہے۔ آنکھوں میں خمار ہے چال میں نزاکت ہے۔ بالوں میں شباب کی خوشبو ہے۔ کتنی پیاری ہے یہ لڑکی کتنا دلفریب ہے۔ اس کا حسن۔ کتنی تازگی اور لذت ہے اس کی آواز میں کتنی بے باکانہ ہے۔ اس کی باتیں۔ اور وہ یہ سوچ رہا تھا کہ کار ایک جگہ پر آ کر رُک گئی۔

دونوں لڑکیاں کار سے اُتریں۔

"اب کب ملو گی۔؟"

"جب کہو۔" کٹی نے فوراً جواب دیا۔"

"کل تین بجے کوئی فلم دیکھیں گے۔ اسی جگہ پر آنا۔"

دونوں نے سر ہلایا اور نظروں سے اوجھل ہوگئیں۔

اس رات سریندر بالکل نہ سو سکا۔ وہ سونے کی کوشش کرتا لیکن کٹی کی دلکش تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگتی۔ کٹی کی ہنسی اس کی مسکراہٹ۔ اس کی باتیں بار بار اس کے کانوں سے ٹکراتیں۔ کٹی کے ملائم جسم پہ ملس بار بار اس کے ذہن میں گھر کرتا۔ وہ اکیلا سو رہا تھا۔ چاروں طرف اندھیرا تھا۔ لیکن اس اندھیرے میں زندگی تھی۔ شباب تھا۔ ایک عجیب قسم کی خوشی کا احساس تھا۔ ایک لڑکی کے قرب نے اس کی سوئی ہوئی زندگی میں حرکت پیدا کر دی تھی۔ لڑکی حسین نہ ہوتی تو شاید سریندر چپکے سے سو جاتا۔ لیکن لڑکی کی جسمانی دلکشی اور اس کا شوخ حسن اسے رہ رہ کر یاد آتا۔ کٹی کی شرارتیں۔ اس کی مسکراہٹ۔ اس کی باتیں۔ اس کا مذاق۔ اس کی ہر حرکت اس کی آنکھوں کے سامنے بار بار آرہی تھی۔ اور وہ لبستر پر اکیلا تھا۔ چاروں طرف اندھیرا تھا اور وہ سوچ رہا تھا۔ اگر وہ لڑکی اس کے پاس ہوتی۔ تو آج وہ کتنا خوش ہوتا۔ اس سے زیادہ خوش ہوتا۔ وہ خوشی۔ وہ لذّت۔ وہ انبساط۔ وہ راحت جس سے وہ آج تک محروم تھا۔ اسے ضرور ملتی وہ اس لڑکی کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ یہ لڑکی اب اس کی ہو کر رہے گی۔ یہ لڑکی اب کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔ اور اس کے ذہن میں بار بار یہ الفاظ گونجنے لگے "یہ لڑکی میری ہے۔ اگر دن بھر کی واردات میں اسے کسی بات کا افسوس تھا تو صرف دس روپوں کا اگر وہ امیر ہوتا تو دس روپے کیا۔ سو روپے تک دے دیتا۔ لیکن سریندر کی آمدنی بہت قلیل تھی۔ وہ جتنے روپے کماتا تھا۔ اس سے صرف اس کے کھانے پینے یا مکان کے کرائے کا انتظام ہو سکتا تھا۔ اکثر مہینے کے آخر میں اُسے قرض لینا پڑتا تھا۔ یہ روپے جو اس کے پاس تھے اسے ہوٹل والے کو دینے تھے۔ اور ہاں کٹی تو اس سے دس روپے مانگ کر لے گئی ہے۔ وہ ضرور دس روپے واپس کر دے گی۔ خیر اگر وہ واپس نہ بھی کرے۔ تب بھی کوئی بات نہیں۔ دس روپوں کی حقیقت کیا ہے۔ وہ آج سے جی لگا کر محنت کرے گا۔ خوب روپے کمائیگا۔ اور اگر کٹی نے اس سے روپے مانگے تو ضرور اسے اور روپے دے گا۔ وہ کسی کو کسی حالت میں بھی نہیں چھوڑ سکتا نہیں چھوڑ سکتا۔ یہ سوچتے سوچتے اُسے نیند آگئی۔

جب صبح ہوئی تو اس نے نئے بلیڈ سے حجامت کی۔ ایک نیا سوٹ نکالا اور پہن کر گوپال کے گھر گیا۔ گوپال اس کا انتظار کر رہا تھا۔

"کیوں رات کیسی کٹی۔؟" گوپال نے پوچھا۔

"بالکل نیند نہیں آئی۔"

"اور تم۔؟"

"سونے کی بہت کوشش کی مگر سو نہ سکا۔ لڑکیاں شریف گھرانے کی دکھائی دیتی ہیں ـــــ"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔"

"اب زندگی اچھی کٹ جائے گی۔"

"میاں لطف آجائے گا۔ لیکن یہ تو بتاؤ کل کتنا خرچ ہوا"؟

"کل بیس روپے خرچ ہوئے۔"

"وہ کیسے۔" ؟

"دس روپے کٹی کو دیئے۔ دس روپے ہوٹل والے کو ــــ اور دس روپے کا پٹرول خرچ ہوا۔ لیکن سرنیدر مال خوب ہے۔ خدا کی قسم اس سے بہتر لڑکی ساری بمبئی میں نہیں مل سکتی۔ دیکھو جب خدا دیتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ کٹی تمہاری ہے اور ملٹی میری ٹھیک ہے۔"

"سولہ آنے درست ــــ"

"اور آج کا کیا پروگرام ہے"؟

"فلم دیکھیں گے۔"

سرنیدر نے سر ہلا لیا۔

"اور ہاں روپوں کا انتظام کر لینا۔"

"کتنے روپوں کا انتظام کروں ؟"

"فلم دیکھیں گے ہوٹل میں کھانا کھائیں گے۔ خود ہی حساب لگا لو۔"

"دیکھو جی۔ اس میں شرم کی کوئی بات نہیں۔ آدھے پیسے تمہارے آدھے میرے۔"

"اب تو ایسا ہی کرنا پڑے گا۔"

"اچھا میں نہا لوں۔"

اور اس طرح دوپہر ہو گئی۔ گوپال اور سرنیدر نے ہوٹل میں کھانا کھایا۔ اور مقررہ وقت پر دونوں لڑکیاں وقت مقررہ پر پہونچ گئی تھیں۔ آج کٹی نے آسمانی رنگ کا فراک پہنا ہوا تھا۔ اور کم بخت ملٹی نے سیاہ رنگ کا فراک۔ سیاہ رنگ کا فراک اس کے سفید رنگ جسم پر خوب چجتا تھا۔ کٹی نے سرنیدر کو دیکھا۔ سرنیدر نے کار میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ دونوں چپکے سے کار میں بیٹھ گئیں۔

"کہاں چلیں۔"؟

"جہاں تمہاری مرضی۔" کٹی نے کہا۔

"پکچر دیکھو گی"؟

کٹی نے مسکرا کر سر ہلا دیا۔

اور وہ سب ایک پکچر ہاؤس میں پہنچ گئے۔ چار ٹکٹ خرید لئے گئے۔ پکچر شروع ہونے سے پہلے وہ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

"کوئی دیکھ نہ لے ــــ" کٹی نے کہا۔

"کیا دیکھ لے گا۔"؟ سرنیدر نے کرخت لہجے میں کہا۔

"ارے یہ پارسی۔"

"تو پھر کیا ہو گا"؟

"اگر انہوں نے ہمیں تمہارے ساتھ باتیں کرتے یا ہنستے ہنساتے دیکھ لیا تو ہمارا سوشل بائیکاٹ کر دیں گے ہمیں اجازت نہیں ہے کہ کسی غیر پارسی کے ساتھ گلچھرے اڑائیں۔"

یہ سنتے ہی سریندر کچھ خاموش سا ہوگیا۔ جیسے چھاتی پر ایک سل رکھ دی گئی ہو۔ یہ ہندو مسلم کی تفریق یہ پارسی غیر پارسی کی تفریق۔ یہ ہندوا ور کرسچین کی تفریق یہ کالے اور گورے کی تفریق۔ یہ یہودی غیر یہودی کی تفریق۔ کس طرح انسانیت کا خاتمہ کر رہی ہے۔ ہر نسل میں ایک زہر بھر رہی ہے اور انسانوں کی زندگیوں کو تلخ سے تلخ تر بنا رہی ہے۔ وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ پکچر شروع ہوگئی۔ دراصل وہ پکچر دیکھنے نہ آیا تھا وہ صرف کٹی سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کی مسکراہٹوں سے محظوظ ہونا چاہتا تھا۔ اس کی شرارتوں سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کٹی کو اپنی باہوں میں کھینچ لے۔ اس کے جسم کو سر سے لے کر پاؤں تک چومے اس کی سپید سپید رانوں پر ہاتھ پھیرے۔ وقت گذر رہا تھا اور وہ سوچ رہا تھا۔ وہ ہچکچا رہا تھا کہ کیا کرے۔ کس طرح کہے۔ کہ وہ اسے چھونے کے لئے بے قرار ہو رہا ہے۔ اس نے اپنا ہاتھ چپکے سے اس کی ننگی ران پر رکھ دیا۔

کٹی نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

وہ ڈر گیا۔ کہیں کٹی اس سے ناراض نہ ہوجائے پھر وہ اس سے باتیں بھی نہ کر سکے گا۔

وہ خاموش ہوگیا۔ صرف ایک لمحے کے لئے ہاتھ پھر بڑھا۔ کٹی نے اب کے ہاتھ پھر زور سے جھٹک دیا۔

وہ پھر خاموش ہوگیا۔

وقت گذر رہا تھا۔ پکچر جلد ہی ختم ہوجائے گی۔ یہ اندھیرا کب تک رہے — یہ میٹھا گداز — اندھیرا۔ وہ کیا کرے۔ وہ کس طرح اپنی سسکتی ہوئی روح کو تسکین دے۔ وہ کس طرح اس اندھی خواہش کی تکمیل کرے۔ وہ کس طرح اس جنونی کیفیت کو ٹھنڈا کرے۔ وہ سوچ رہا تھا لیکن اس کے ذہن میں کچھ نہ آتا تھا۔

ایکا ایک اسے شرارت سوجھی۔

"کٹی —" ؟

کٹی نے اس کی طرف دیکھا۔

"ذرا ادھر جھکو —"

وہ ذرا جھکی۔

"ذرا اور — میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں —"

کٹی نے اپنا سر اس کے قریب اور جھکایا۔ اب کٹی کا چہرہ اس کے بالکل قریب تھا۔ اس نے چپکے سے اپنے کانپتے ہوئے ہونٹ اس کے گالوں پر رکھ دیئے۔

کٹی فوراً سرک گئی۔ اور زور کی چپت اس کے منہ پر ماری۔

سریندر شرم سے پانی پانی ہوگیا۔ اسے اپنی اس بیہودہ حرکت پر بہت غصہ آیا۔ کٹی کوئی طوائف نہ تھی اس نے اس قسم کی حرکت کیوں کی۔ وہ ایک شریف گھرانے کی لڑکی تھی۔ وہ اسے صرف ایک دوست سمجھ کر اس کے ساتھ آئی تھی۔ واقعی اسے بات کرنے کی تمیز نہ تھی۔ یہ کہاں کی شرافت تھی۔ یہ کہاں کی تہذیب ہے۔ کہ ایک لڑکی کے ساتھ آپ سینما دیکھنے کیلئے آئیں اور اس کی مرضی کے بغیر آپ اس کا منہ چوم لیں۔ یہ واقعی بے ہودہ حرکت ہے۔ اسے اس قسم کی حرکت نہیں کرنی چاہیئے تھی۔ وہ رنجیدہ سا ہوگیا۔ اور ایک طرف کو سرک گیا۔

کٹی نے اس کی طرف کنکھیوں سے دیکھا۔"

"ناراض ہو گئے"؟

وہ پھر خاموش ہو گیا۔

"اچھا اپنا چہرہ ادھر کرو۔"

اس نے دایاں گال اس کی طرف کر دیا۔

"ذرا اور......"

اب کٹی کے گال اس کے قریب تھے۔ کٹی کا گرم سانس اس کے لبوں کو چوم رہا تھا۔ اس نے زور سے ایک پھونک ماری اور مسکرا پڑی اور کہنے لگی۔

"آئی لو یو"

"کیا تم مجھ سے محبت کرتے ہو"؟

اور سریندر نے سر ہلا دیا۔

"تب تم مجھے چوم سکتے ہو۔"

اور سریندر نے اپنے تپتے ہوئے ہونٹ کٹی کے نرم اور گرم گالوں پر رکھ دیئے۔ اس بوسے نے اس کے جسم میں ارتعاش پیدا کر دیا۔ اس کے جسم میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ایکا ایک اس نے محسوس کیا کہ کٹی اچھی لڑکی ہے اور اس سے محبت کرتی ہے۔ وہ واقعی اس سے محبت کرتی ہے۔ سریندر ہر شخص کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ یہ لڑکی اسے محبت کرتی ہے۔ کٹی واقعی اچھی لڑکی ہے۔ وہ اس سے پیار کرتی ہے۔ اب وہ دونوں اکٹھے رہیں گے۔ اگر اکٹھے نہ رہیں گے تو کم از کم ہر روز ملا کریں گے۔ کٹی صرف اچھی ہی نہیں۔ اچھی تو بہت سی لڑکیاں ہوتی ہیں وہ خوبصورت بھی ہے حسین بھی ہے۔ وہ باتیں کر سکتی ہے اور جب وہ دو لوٹے ہوئے دانتوں کے بیچ سے زبان کی نوک نکالتی ہے۔ تو اس وقت کتنی شوخ اور بے باک دکھائی دیتی ہے۔ آج وہ خوش تھا۔ اگر اس کے بس کی بات ہوتی۔ تو وہ کٹی کو ملکہ بنا دیتا۔ لیکن وہ خود قلاش تھا۔ وہ صرف محنت کر کے اپنا پیٹ پال سکتا تھا۔ یہی سوچتے سوچتے دو گھنٹے گذر گئے۔ لیکن اس دوران میں سریندر کچھ نہ دیکھ سکا۔ اس کی نگاہیں کٹی کی طرف تھیں۔ اس کے ہاتھ کٹی کی طرف بار بار جاتے وہ کٹی کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیتا۔ اور دبانے لگتا۔ کبھی وہ کٹی کے بالوں کو چھیڑنے لگتا۔ کبھی وہ کٹی کے رانوں پر ہاتھ رکھتا۔ کبھی وہ کٹی کے گالوں کو پیار سے کھینچتا۔ اور اسی نوک جھونک میں فلم ختم ہو گئی۔ وہ کار میں بیٹھ کر ایک ہوٹل میں چلے گئے۔ گوپال کچھ رنجیدہ خاطر نظر آتا تھا۔ ایسا دکھائی دیتا تھا کہ ملٹی کا رویہ اس کے ساتھ اچھا نہیں رہا۔ کار میں بیٹھ کر گوپال نے سریندر کو بتایا کہ ملٹی نے اسے ہاتھ تک نہیں لگانے دیا۔ ایک بار گوپال نے ملٹی کو چومنے کی کوشش کی لیکن ملٹی نے گوپال کی اس حرکت پر بہت برا بھلا کہا۔ مجھے کچھ نہیں آتا۔ یہ لڑکیاں کس قسم کی ہیں۔ اور کیا چاہتی ہیں۔ کم بخت ہاتھ تک تو لگانے نہیں دیتیں۔ اور سریندر نے دھیرے سے کہا۔

"میاں صبر کرو صبر۔"

اور پھر چاروں نے ہوٹل میں چائے پی اور ٹوسٹ کھائے۔ کٹی نے نہایت پیار سے سریندر کو ٹوسٹ کھلائے وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکراتی رہی۔ کبھی کبھی اپنی چھوٹی سی پتلی زبان لبوں سے نکال کر سریندر کو چڑاتی۔ کبھی چائے کا پیالہ چھین کر اسے چائے پلانے لگتی۔ اور کبھی کبھی یوں ہی ہنسنے لگتی۔ ملٹی اکثر خاموش رہتی۔ وہ کم باتیں کرتی۔ دراصل

ملٹی پرکٹی کی شخصیت کا بہت اثر تھا ملٹی کو معلوم تھا کہ وہ کٹی سے زیادہ حسین نہیں ہے۔ زیادہ چالاک نہیں ہے۔ اگر لوگ ملٹی کو گوارا کرتے تھے۔ تو وہ محض کٹی کی وجہ سے لیکن گوپال ملٹی کو پا کر بھی خوش تھا۔ ملٹی اس کی طرف دیکھ کر مسکراتی، ہنستی، لیکن اس ہنسی خوشی میں ایک طنز تھا۔ جیسے وہ گوپال کو پسند نہیں کرتی۔ جیسے وہ گوپال کو بدصورت سمجھتی اور یہ بات گوپال کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ زندگی میں بہت سی ایسی باتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں جو انسان برداشت کرنا نہیں چاہتا لیکن وقت کی ضرورت ان باتوں کو سہنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ چائے پینے کے بعد وہ سب کار میں بیٹھ گئے۔ آج ہوٹل کا بل ضرورت سے زیادہ تھا سریندر کی رہی سہی پونجی ہوٹل کی نذر ہو گئی۔ اور اس کی جیب بالکل خالی ہو گئی۔ اس خیال کے آتے ہی وہ کچھ اداس سا ہو گیا۔

کٹی نے اس کے منہ پر ہلکی سی چپت لگائی، اور کہنے لگی، "تم کچھ اُداس نظر آتے ہو۔"

"نہیں تو۔۔۔"

"اب کدھر کا ارادہ ہے۔"؟

"تم کہاں جانا چاہتی ہو۔"؟

"ہم تو گھر جانا چاہتے ہیں۔ ڈیڈی اور ماما انتظار کر رہے ہوں گے۔

"ڈیڈی اور ماما" سریندر نے یہ دو الفاظ پھر دہرائے۔ ڈیڈی اور ماما۔ یہ دونوں عجیب ڈیڈی اور ماما ہیں ان کی لڑکیاں سربازار غیروں کے ساتھ پھرتی ہیں۔ گلچھرے اڑاتی ہیں۔ سیر کرتی ہیں۔ لیکن ان کی اماں ان سے کچھ نہیں کہتی۔ یہ عجیب قسم کے لوگ ہیں۔ خیر اسے ان باتوں سے کیا تعلق۔؟

اتنے میں گوپال اس کے قریب آیا۔ اور کہنے لگا۔ "کٹی روپے مانگتی ہے۔"

"روپے کیسے۔"؟

"وہ مانگ رہی ہے۔"

"لیکن کس بات کے۔"؟

"مجھے کیا معلوم۔۔۔"

"میرے پاس تو ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔ جتنے روپے تھے ہوٹل والے کو دیدیئے۔۔۔"

"اور جو میرے پاس تھے سینما میں خرچ ہو گئے۔ کم بخت عجیب لڑکی ہے۔ مجھے تو ملٹی نے ہاتھ تک لگانے نہیں دیا۔ اور اس چکر میں تقریباً ستر۔ اسی روپے خرچ ہو گئے۔ مجھے تو کچھ ایسی ویسی لڑکیاں دکھائی دیتی ہیں

کٹی پھر قریب آئی۔ اور مسکرا کر گوپال سے روپے مانگنے لگی۔

"روپے نہیں ہیں۔۔۔" سریندر نے جواب دیا۔

"کیوں نہیں ہیں۔۔۔" کٹی نے غصے میں آ کر کہا۔

"اس وقت روپے نہیں ہیں۔ نہیں ہیں۔ کل ضرور دیں گے"۔

"مجھے آج ہی ضرورت ہے۔ اس وقت اگر خالی ہاتھ واپس جاؤں گی تو ڈیڈی کیا کہے گا ماما کیا کہے گی۔"

"اگر جیب میں روپے نہ ہوں تو کہاں سے لا کر دوں۔"

"تو پھر تم ہمیں یہاں لائے کیوں تھے۔؟"

"تم اپنی مرضی سے آئی تھیں۔ ہم زبردستی پکڑ کر نہیں لائے تھے۔"؟

"زبردستی۔" کٹی نے شرربار نگاہوں سے سریندر کی طرف دیکھا اس کے چہرے کے نقوش خلط ملط ہو گئے تھے۔ اس کے خوبصورت ہونٹ بالکل سکڑ گئے۔ چہرے کی ملائمیت جاتی رہی۔ آنکھوں کی شوخی، شرارت بالکل مفقود ہو گئی۔ اب وہ بالکل فارس روڈ کی رنڈی دکھائی دیتی تھی۔

"اگر روپے نہیں دوگے تو میں شور مچاؤں گی۔ میں ان لوگوں کو بتاؤں گی۔ کہ ان لوگوں نے ہمارے ساتھ بُرا کام کیا۔ اور اب یہ لوگ ہمیں روپے نہیں دیتے۔"

"روپے نہیں ہیں۔" سریندر نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"تمہیں دینے پڑیں گے۔" کٹی نے چیخ کر کہا۔

"کس بات کے روپے؟ آخر کوئی وجہ بھی ہو۔"

"تم نے آج کا دن ضائع کیا۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ تم غنڈے ہو" کٹی نے چمک کر کہا۔

غنڈے کا لفظ سنتے ہی۔ سریندر کا ہونٹ دانتوں کے نیچے آ کر کٹ گیا۔ ایکا ایک سریندر کے دماغ میں خیال آیا۔ اگر اس لڑکی نے ایک لفظ اور نکالا۔ تو وہ اس کو جان سے مار دیگا۔ حرافہ کہیں کی ۔۔۔۔ اس لڑکی میں کتنا زہر ہے۔ ناگن کی طرح ڈنگ مارتی ہے۔

سریندر کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ کٹی موقع کی نزاکت کو بھانپ گئی۔ اور گالیاں بکتی ہوئی آگے نکل گئی۔

کٹی کے چلے جانے کے بعد سریندر کو احساس ہوا۔ کہ اس کے ہرے بھرے کھیت میں آگ لگ گئی نیا نیا محل آن واحد میں گر پڑا لیکن سریندر کا خون کھول رہا تھا۔ وہ کچھ سوچنا چاہتا تھا لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا وہ کٹی کے روپے کا جواز چاہتا تھا۔ کٹی نے اس طرح کیوں BEH AVE —— "کیا وہ کٹی کی اس شخصیت سے بالکل بے خبر تھا وہ کبھی خیال بھی نہ کر سکتا تھا۔ کہ لڑکی اتنی بے غیرت ہو سکتی ہے۔ گلاب کی کلی میں اتنا زہر ہو سکتا ہے۔ وہ ابتک صرف اس کٹی کو جانتا تھا۔ جو ہنستی تھی مسکراتی تھی۔ خوبصورت تھی۔ جس کے ریشمی بال تھے۔ جس کا جسم متناسب تھا جس کی آنکھوں میں شرارت تھی جس کی چال میں شباب تھا۔ جس کی آواز میں شہد جیسی مٹھاس تھی۔ لیکن آج کی کٹی بالکل مختلف تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک فارس روڈ کی لونڈی ہے۔ اس کی باتوں میں زہر تھا۔ بچھو کا ڈنگ تھا۔ آنکھوں سے وحشت ٹپکتی تھی اس کے لب اکڑ گئے تھے۔ چہرے پر کرختگی کے آثار تھے اس شہد میں کتنی کڑواہٹ تھی۔ اس حسن میں کتنی گندگی تھی اس آواز میں کتنی تلخی تھی۔ اس جسم میں کتنی بو تھی۔ یہ سب کچھ کیوں ہوا۔ وہ کیوں آن واحد میں بدل گئی اور اس سے پہلے جو کچھ کٹی نے کہا تھا کیا وہ غلط تھا۔ کیا وہ جھوٹ تھا۔ فریب تھا۔ وہ محض دل لگی تھی۔ دکھلاوا تھا۔ لیکن اس دکھلاوے میں ایک Tact تھا۔ ایک سلیقہ تھا۔ ایک ترتیب تھی۔ ایک تسلسل تھا۔

اتنے میں کار گھر کے قریب رکی۔

" بہت ہی چالاک تھیں یہ لڑکیاں۔ گوپال نے شکست خوردہ آواز میں کہا۔
" مجھے تو اس قسم کے سلوک کی ہر گز توقع نہ تھی۔ سریندر نے سر کو نیچا کر کے کہا۔
" بھائی سچ بات تو یہ ہے کہ میں تو ان سے ملنے سے رہا۔ ایک تو روپے ضائع کروں اور پھر گالیاں کھاؤں۔ آج سے میں ان کے ساتھ گھومنے نہیں جاؤں گا۔ اچھا خدا حافظ۔"
سریندر نے ہیٹ اٹھایا اور چل دیا۔

سریندر رات بھر نہ سو سکا۔ اُسے رہ رہ کر اپنے آپ پر غصّہ آرہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ دوبارہ اُن سے کبھی نہ ملے۔ واقعی ان لڑکیوں سے کبھی نہیں ملنا چاہیئے۔ ان لڑکیوں نے اس کی بے عزتی کی ہے۔ اس کے منہ پر تھوکا ہے۔ اسے اُلو بنانے کی کوشش کی ہے۔ بلکہ اُلو بنایا ہے۔ اسے ان لڑکیوں سے کبھی نہیں ملنا چاہیئے۔ لیکن دل کے دوسرے کونے سے ایک اور ہی آواز آرہی تھی ایک اور ہی تصویر اُبھر رہی تھی۔ اُس کے نقوش سریندر کے دل کی سطح پر بہت گہرے پڑ گئے تھے۔ وہ نقش تھے کٹی کے۔ اس خوبصورت لڑکی کے جو اس کی طرف دیکھ کر مسکراتی تھی۔ جس نے اس کے گالوں کو ہلکی سی چپت لگائی تھی۔ جب سینما ہال میں بیٹھ کر کہا تھا۔"
آئی لو یو ــــ جو اکثر چھوٹی سی پتلی زبان دانتوں کے درمیان سے نکال کر اسے چڑاتی تھی۔ یہ تصویر رہ رہ کر اُسے یاد دلاتی تھی سریندر جذباتی تھا۔ گوپال سے زیادہ ذہین اور حساس تھا۔ شاید اُسے عورت کے قرب کی زیادہ ضرورت تھی۔ شاید اُسے کٹی سے عشق ہو گیا تھا۔ عشق ــــ وہ ہنسنے لگا۔ جی ہاں۔ کتنا فرسودہ لفظ ہے۔ اب تو بالکل بے جان ہو کر رہ گیا ہے اس مشینی دور میں عشق کا مذاق اڑانا ہے۔ نہیں بھائی عشق نہیں تھا۔ بلکہ وہ لڑکی کا جسم چاہتا تھا۔ عجیب سی بات ہے۔ نہایت صاف سی بات ہے۔ جی ہاں۔ سریندر کو کٹی سے عشق ہو گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ کٹی کے قریب رہے اس سے باتیں کرے۔ اس سے مذاق کرے اور وہ مذاق کرتی رہے اور کہتی رہے آئی لو یو ــــ آئی لو یو ــــ نہیں وہ کٹی کو نہیں جانے دیگا وہ اسے اوجھل نہیں ہونے دے گا۔ کٹی اس کی روح ہے۔ اس کی خوشی ہے وہ کٹی کو پکڑ سکتا ہے۔ اسے اپنے پاس رکھ سکتا ہے۔ لیکن کس طرح ــــ اس نے سوچنا چاہا ــــ اور بار بار یہی جواب ملا۔ کہ وہ قلاش ہے۔ غریب ہے۔ وہ ہر روز بیس یا تیس روپے کٹی پر خرچ نہیں کر سکتا۔ لیکن وہ کٹی کو چاہتا ہے۔ وہ روپے ضرور حاصل کرے گا۔ وہ لوگوں سے مانگے گا۔ دوستوں کے آگے ہاتھ پھیلائے گا۔ وہ دن رات کام کرے گا۔ وہ ہر مالدار آدمی کے آگے ناک رگڑے گا۔ اور اگر کہیں سے روپے نہ کما سکا تو وہ چوری کرے گا ــــ ڈاکہ ڈالے گا ــــ لیکن کٹی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیگا۔ نہیں جانے دیگا۔

جب صبح اُٹھا ــــ تو دل کا غبار کچھ ہلکا پڑ گیا تھا۔ عشق کی جگہ کچھ خود داری نے لے لی تھی۔ اور اس کے دل میں یہ خیال آرہا تھا۔ کہ اسے دوبارہ کٹی سے نہیں ملنا چاہیئے۔ اور وہ مل بھی نہیں سکتا اس کے پاس روپے نہیں وہ چوری نہیں کریگا لیکن وہ دوستوں سے روپے ضرور مانگے گا وہ زیادہ کام کر سکتا ہے۔ اور اس طرح سے وہ کافی روپے کما سکے گا۔ لیکن اب کٹی اس سے بات نہیں کرے گی۔ بھلا وہ کیوں اس سے ملے گی۔ وہ اس سے بالکل ناراض ہو گئی ہے۔ یہ سوچتے سوچتے وہ خداداد سرکل کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس دن وہ خداداد سرکل میں نہ آئیں ــــ وہ ہر روز اس سرکل کے قریب جاتا۔ لیکن مایوس واپس لوٹتا ــــ کمرے میں بیٹھ کر اپنے آپ کو کوسنے لگتا۔ اور خاص کر اس ماحول کو جس میں وہ رہتا تھا۔ کاش اس کے پاس روپے ہوتے ــــ

یا کوئی ایسا کام کر سکتا۔ جس سے اس کی جیب میں سو سو کے نوٹ ہوتے۔ وہ نوٹ لے کر کٹی کے پاس جاتا اور اس کے منہ پر مارتا اور کہتا ۔۔ "یہ لو نوٹ ۔ اگر تمہیں ان سے محبت ہے تو یہ لو ۔۔۔ ایک نہیں دس نوٹ ۔ دس نہیں سو سو کے نوٹ ۔ ان کو لے جاؤ اور اپنے ڈیڈی اور ممی کو دو ۔ اور اس کے بعد کبھی مجھ سے نہ ملنا۔" یہ سوچتے سوچتے اسے اپنے آپ پر غصہ آجاتا۔ اس سسٹم پر غصہ آجاتا۔ اس زندگی پر غصہ آجاتا۔ ان نامراد لڑکیوں پر غصہ آجاتا۔ اور اس طرح وہ اپنی زندگی میں زہر گھولتا رہا۔ آخر وہ اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ کبھی کبھی اپنے آپ کو گالی بھی دینے لگتا۔ ارے کمبخت تو کٹی کو دس روپے نہ دے سکا۔ شاید اس کے ڈیڈی ماما کو ضرورت ہو۔ اگر وہ کسی دوست سے مانگ کر اسے روپے دیدیتا۔ تو کٹی اس سے کبھی ناراض نہ ہوتی ۔ خیر کوئی بات نہیں وہ ضرور اُسے منائے گا۔ اور اُسے روپے دے گا۔ اور بہت سے روپے دیگا۔

ایک دن کٹی اُسے خداداد سرکل میں مل گئی۔

کٹی نے اُس کی طرف دیکھا۔

سریندر نے کٹی کو دیکھا۔

کٹی مسکرا پڑی۔ اور اس نے اپنی زبان دو ٹوٹے ہوئے دانتوں کے درمیان سے نکالی اور پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"ہیلو ۔۔۔"

"ہیلو ۔۔۔"

کٹی ۔ ملٹی اور وہ ایک ہوٹل میں چلے گئے۔ اس دوران میں وہ گزری ہوئی باتیں بھول گئے۔ اب زندگی پھر خوشگوار ہو رہی تھی۔ اب پھر اس زندگی میں آگ تھی۔ لبوں پر پھر مسکراہٹ تھی۔ وہ تینوں گرم چائے پی رہے تھے۔ اور زندگی خوشگوار ہو رہی تھی۔ ملٹی نے گوپال کے متعلق پوچھا۔ اور سریندر نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ وہ کئی دنوں سے گوپال سے نہیں ملا۔

سریندر نے ہوٹل کا بل ادا کیا ۔۔۔ اور ملٹی نے اس سے پکچر دکھلانے کے لئے کہا ۔۔۔ اور وہ مان گیا ۔۔۔

پکچر شروع ہو گئی۔

کٹی اس کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ کٹی جس کی تلاش میں نیند حرام ہو چکی تھی۔ جس کی یاد میں وہ اکثر رو چکا تھا۔ جس کو پانے کے لئے وہ چوری تک کرنے کو تیار تھا۔ جس کو حاصل کرنے کے لئے وہ دوستوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے کو تیار تھا۔ جس کے لئے وہ مالدار آدمیوں کے سامنے اپنا دامن تک بیچنے کے لئے تیار تھا۔ وہ آج اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ کٹی نے فراک پہنا ہوا تھا۔ کٹی اسی طرح ہنس رہی تھی کھیل رہی تھی مسکرا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ کو دبا رہی تھی۔ اس کا گرم سانس اس کے گالوں سے مس ہو رہا تھا۔ وہ خوش تھا۔ آج وہ بہت خوش تھا۔ ایک عرصہ کے بعد کٹی اسے مل گئی تھی۔ وہ کٹی کو پالے گا۔ وہ کٹی سے شادی کرلے گا۔ وہ کٹی کو کبھی نہیں چھوڑ سکتا۔ کٹی صرف اس کی ہے۔ صرف اس کی ہے۔ وہ کٹی کو بہت روپے دیگا وہ دن رات محنت کرے گا۔ کٹی خوبصورت ہے۔ بہت ہی خوبصورت ہے۔ کٹی جوان ہے۔ بہت ہی جوان ہے۔ وہ کٹی کو راہ راست پر لے آئے گا۔ اگر کٹی میں کچھ خامیاں ہیں تو وہ انہیں دور کرنے میں کٹی کی مدد کرے گا۔ کٹی کو آج تک کوئی اچھا انسان نہیں ملا۔ اسے شریفوں کی محفل میں بیٹھنے کا موقع نہیں ملا۔ اس لئے اس کی شخصیت دو حصوں میں بٹ گئی ہے۔ اسی لئے اس کی تصویر کے دو رخ ہیں۔ اگر ایک رخ اچھا ہے تو دوسرا بہت ہی برا ہے۔ اگر ایک سے پیار ہے۔ تو

دوسرے سے نفرت۔ وہ اچھے رُخ کو اُبھارے گا۔ وہ کٹی کی زندگی کو بہتر بنائے گا۔ وہ کٹی کو بتائے گا کہ تمہاری ایک اچھی شخصیت بھی ہے۔ اس شخصیت سے کٹی بیگانہ ہے۔ اسے شخصیت کا کچھ علم نہیں۔ خیر اسے اسوقت کچھ نہیں سوچنا چاہیئے۔ آہستہ آہستہ کٹی کا ہاتھ اُس کے سینے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

وہ کیا چاہتی ہے۔

کٹی کا ہاتھ سُریندر کے کوٹ کی اندرونی جیب میں چلا گیا۔

کٹی نے اس کا بٹوہ نکال لیا۔

وہ خاموش رہا۔

کٹی نے بٹوہ میں سے روپے نکال لئے ___

اور وہ خاموش ہوگیا۔

کٹی نے سب نوٹ اپنی جیب میں رکھ لئے۔

وہ بالکل خاموش ہوگیا۔

کٹی نے ریزگاری بھی اپنی جیب میں رکھ لیا۔ وہ خاموش بیٹھا رہا۔

کٹی نے خالی بٹوہ اس کی جیب میں رکھ دیا۔

اور وہ خاموش بیٹھا رہا۔ اس نے کچھ نہیں کہا۔ پکچر ختم ہوگئی اور وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ کٹی نے اجازت مانگی اور اس نے سر ہلا دیا۔ اور وہ دونوں اس کی نگاہوں سے اوجھل ہوگئیں۔

اس کے بٹوے میں تین روپے اور کچھ آنے تھے۔ وہ سب کٹی نے نکال لئے۔ اس کے پاس بس کے لئے کرایہ بھی نہ تھا اور وہ سڑک پر پیدل چلتا رہا۔ اس کے قریب سے لوگ گزر رہے تھے۔ لیکن اسے کسی کی موجودگی کا احساس نہ تھا۔ وہ صرف آج کے حادثہ پر غور کر رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اچھی بھلی لڑکیاں آن واحد میں کس طرح طوائف کا روپ دھارن کر لیتی ہیں۔ وہ سوچ رہا تھا۔ اور لوگ چلے جا رہے تھے۔ آگے بڑھ رہے تھے۔ پیچھے ہٹ رہے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا لیکن زندگی افسردہ اور بے کیف ہوتی جا رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا اور کٹی دور جا چکی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا اور یکایک اسے محسوس ہوا کہ وہ کٹی جس سے اسے محبّت تھی مر چکی ہے۔ صرف ایک طوائف اس کے سامنے ہاتھ پھیلائے اپنے جسم کی قیمت مانگ رہی ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور وہ آگے بڑھتا گیا۔

کتاب گالی۔ نومبر ۱۹۴۸ء

مہندر ناتھ

ڈیڑھ روپیہ

جس عمارت کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ ظاہری طور پر بڑی باوقار، سنجیدہ اور بارعب دکھائی دیتی ہے لیکن اندر سے بڑی گندی اور غلیظ ہے۔ مجھے یہاں رہتے ہوئے کافی عرصہ ہو گیا ہے اس لئے میں اس کے حدود اربعہ سے اچھی طرح واقف ہوں گراؤنڈ فلور میں دن کو بھی اندھیرا رہتا ہے۔ یہاں سورج کبھی نہیں چڑھتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ایک مسلسل رات ہے۔ جو دن رات چھائی رہتی ہے۔

گراؤنڈ فلور کو مختلف کمروں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ کمروں کے باہر غلاظت کے ڈھیر لگے رہتے ہیں اور لوگ اُن کی غلاظت کے قریب چارپائیاں بچھا کر سوتے ہیں۔ کوئی دن کو سوتا ہے اور رات بھر کام کرتا ہے اور کوئی رات بھر سوتا ہے۔ اور دن بھر کام کرتا ہے۔ بہرحال چارپائیاں اپنی جگہ پر بچھی رہتی ہیں اور لوگ مزے سے اُن پر سوتے ہیں اور خراٹے لیتے ہیں۔ گراؤنڈ فلور میں رہنے والوں کی اکثریت نچلے طبقے کی ہے۔ اور مجھے اس قسم کے لوگوں سے سخت نفرت ہے اپنے خاصے کشادہ کمروں کو انہوں نے گندی چالوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ ایک ایک کمرے میں تین تین خاندان رہتے ہیں۔ وہیں سوتے ہیں روتے ہیں ہنستے ہیں۔ شادیاں کرتے ہیں اور پھر ہر سال بچوں کی تعداد میں اضافہ بھی کرتے ہیں۔ یہ بچے ننگ دھڑنگ اپنے کمروں کے دروازوں سے باہر عین سڑک کے بیچ دن بھر کھیلتے ہیں اور آنے جانے والی موٹروں کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ ان کی ایک آدھ ٹانگ یا ہاتھ کچل دیں تاکہ باقی عمر بھی چین اور آرام سے نہ کٹ سکے۔

میں اس عمارت کے پہلے فلور پہ رہتا ہوں۔ یہ فلور گراؤنڈ سے کافی صاف ستھرا ہے۔ ایک کمرے میں صرف ایک پریوار رہتا ہے عورتیں مرد اور بچے مقابلتاً صاف اور اجلے کپڑے پہنتے ہیں اندر کی دیواریں کافی ستھری ہیں اور پلستر سے کافی آراستہ نظر آتی ہیں۔ لیکن کمروں کے باہر کی دیواریں کافی گندی اور غلیظ ہیں لوگ اپنے اپنے کمروں میں سوتے ہیں۔ دن کو بھی رات کو بھی۔

دوسرے فلور کے لوگ پہلے فلور۔ اور گراونڈ فلور کے رہنے والوں سے زیادہ خوشحال اور فارغ البال نظر آتے ہیں۔ گو کمروں کی لمبائی چوڑائی میں کوئی فرق نہیں، لیکن صفائی اور رکھ رکھاؤ اور رہنے سہنے کے طریقوں نے انہیں الگ حیثیت بخش دی ہے۔

سکنڈ فلور کلاس میں رہنے والوں کی لڑکیاں اسکول اور کالجوں میں پڑھتی ہیں۔ بھڑکیلی ساڑیاں اور رنگین فراک پہنتی ہیں۔ چہرں پہ شگفتگی اور شادابی ہے اور کافی سمارٹ اور صحت مند نظر آتی ہیں بلڈنگ کے پھیلے ہوئے اندھیرے میں اجالے کا کام دیتی ہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا۔ مجھے افلاس کے مارے ہوئے لوگوں سے سخت نفرت ہے۔ ان کے ساتھ رہ کر بڑی ذہنی کوفت ہوتی ہے۔ میرے دوست رام دیال جو مزدوروں کے لیڈر ہیں اور انقلابی بھی ہیں وہ اکثر کہا کرتے ہیں کہ مزدوروں کی اگوائی میں ایک

نیا ہندوستان جنم لے گا — میں اس گراونڈ فلور کے رہنے والوں کی طرف اشارہ کرکے بتلانے کی کوشش کرتا ہوں کہ بھئی۔ یہ ترستے جیتا ہیں پہلے ان کی طرف دیکھو۔ پھر انقلاب کی بات کرنا۔ وہ اکثر میری بات سن کر ہنس دیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں "میاں تم بوڑھا ہو بوڑھا تمہارے دل میں عام آدمیوں کے لئے نفرت کے سوا کچھ نہیں" دراصل یہ نفرت میرے دل میں یوں ہی جاگزیں نہ ہوئی تھی اس کی بنیاد بڑی پکی اور پائدار ہے میں قصے کو لمبا کرنا نہیں چاہتا۔ اس لئے یہی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے ایک نوکر کو بچپن سے لیکر جوانی تک پالا۔ اور ایک دن میں نے اسے ڈھائی سو روپے کا چیک کیش کرانے کے لئے بینک میں بھیجا مگر اس دن کے بعد سے وہ کبھی واپس نہ آیا۔ میں اس سے صرف یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ بھئی میں نے تم سے کیا بدسلوکی کی تھی جس کے عوض تم نے مجھے یہ سزا دی تم نے میری شرافت اور انسانیت کا یہی صلہ دیا؟

اس نوکر کے رفوچکر ہونے کے بعد میں نے ایک اور بچے کو نوکر رکھا۔ جس کی عمر آٹھ سال سے زائد نہ تھی۔ چھ سال رہنے کے بعد اب اس نے اپنی خاصی صحت بنالی۔ تو ایک دن مجھ سے کہنے لگا "میں آپ کی نوکری نہیں کروں گا۔ آج بی بی جی نے میری بے عزتی کی ہے۔ میں بازار جاکر چوڑیوں کا دھندہ کرلوں گا۔ محنت مزدوری کرلوں گا۔ دیسی شراب کا بیوپار کرلوں گا۔ لیکن آپ کی نوکری نہیں کروں گا۔" یہ کہہ کر وہ میرے گھر سے باہر نکل گیا۔

ویسے بھی مجھے غریب، مفلوک الحال اور تلاش آدمیوں سے ایک چڑ سی ہے۔ جب کوئی انسان میرے پاس آکے چند روپوں کے لئے گڑگڑاتا ہے۔ اور اپنی بھوک بے بسی و بے روزگاری کا رونا روتا ہے تو مجھے بے حد مسرت ہوتی ہے۔ میں اسے اس حالت میں دیکھ کر کتنا خوش ہوتا ہوں اس کا آپ اندازہ نہیں کرسکتے دل ہی دل میں کہتا ہوں۔ اور انقلاب لاؤ۔ یہ لوگ دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہی رہیں گے تو اچھی بات ہے۔

اس بلڈنگ میں بڑے دلچسپ لوگ آتے ہیں۔ ایک صاحب مہینے میں صرف ایک بار آتے ہیں وہ مالک مکان کے منشی ہیں اور کرایہ داروں سے صرف کرایہ وصول کرتے ہیں۔ آتے ہی کنڈی اس زور سے کھٹکھٹائیں گے جیسے کہیں آگ لگ گئی ہو کچھ بھی کیجئے کرایہ وصول کئے بغیر واپس نہ جائیں گے۔

اس منشی کے علاوہ اس عمارت میں بھنگی کا کام دو نوجوان چھوکرے کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ ان کی بوڑھی ماں بھی آتی۔ دونوں لڑکے تقریباً ہر روز مجھ سے ایک یا دو آنے چائے پینے کے لئے مانگ کر لے جاتے۔ وہ نہایت ہی مسکین صورت بناتے ہوئے میرے سامنے آتے جھجک اور شرم کے لبادے کو اوڑھ کر وہ مجھ سے مخاطب ہوتے یہ بچے ہمیشہ ڈرے ڈرے اور سہمے سہمے سے رہتے میں ان کے پھٹے ہوئے کپڑوں اور ان کے میلے اور گندے چہروں۔ اور اُن کے ننگے پاؤں کو دیکھ کر حقارت سے منہ موڑ لیتا۔ ان کی میلی کچیلی ہتھیلیوں پر جو متواتر جھاڑو دینے سے کافی کھردری ہوگئیں تھیں۔ از راہ کرم ایک دو آنے رکھدیتا۔ ان لوگوں کا یہی حشر ہونا چاہیئے۔ میں زیر لب کہتا۔

دراصل میں ان لوگوں میں سے ہوں۔ جو دوسروں کو اچھی حالت میں دیکھنا پسند نہیں کرتے ہیں۔ میں خود ایک پرسکون، خوشحال زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن دوسروں کو محنت مزدوری کرتے دیکھ کر مجھے بے حد مسرت ہوتی ہے۔ میں ہمیشہ یہ چاہتا ہوں کہ یہ لوگ میرے دست نگر رہیں۔ یہ لوگ میرے آگے ہاتھ پھیلائیں۔ گڑگڑائیں۔ ناک رگڑیں اپنے غم والم کا قصہ سنائیں اور میں اُن پر ترس کھاکر ان کی مدد کرتا رہوں۔

کچھ دن اسی طرح گزر گئے۔ ایک دن یہ معلوم ہوا کہ اُن دو بھنگیوں کی جگہ ایک نیا بھنگی مامور کیا گیا ہے۔ دراصل بھنگی اور سفیر کبھی ایک جگہ نہیں رہتے۔ اکثر اپنی جگہیں بدلتے رہتے ہیں ابھی تک میں نے اس نئے بھنگی کو نہیں دیکھا تھا

ایک دن میرا بھی اس نئے بھنگی سے آمنا سامنا ہو گیا وہ واقعی عجوبۂ روزگار تھا۔ گو اس کا قد لمبا اور رنگ کالی مٹی کی طرح سیاہ تھا۔ جسم دبلا پتلا۔ متفکر چہرہ جیسے کسی معلم کا ہوتا ہے۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں۔ پلکیں آپس میں چپکی ہوئیں اور چہرے پر ایک عجیب وحشت طاری تھی اس ملاقات کے بعد جب کبھی میں نے اسے دیکھا ہمیشہ کام کرتے ہوئے نظر آیا۔ یہ واقعی حیرت کا مقام تھا۔ بھنگی اور اپنے کام کا اتنا پابند اور پھر اتنا سنجیدہ۔ ایک دن اچانک میری نگاہ اس کے پاؤں پر پھسل گئی۔

بڑے بھدے اور بے ڈھنگے پاؤں تھے پاؤں کا انگوٹھا۔ راس کماری کی طرح آگے بڑھا ہوا تھا۔ باقی انگلیاں بھی ٹیڑھی میڑھی۔ اتنے لمبے اور بے ڈول پاؤں میں نے اپنی عمر میں بہت کم دیکھے تھے۔ جو لوگ جسمانی محنت زیادہ کرتے ہیں ان کے ہاتھ اور پاؤں اکثر بے ڈول اور بے ڈھنگے ہوتے ہیں۔ انسان تو ان سے انتقام لیتا ہی ہے مگر قدرت بھی ان سے انتقام لینے میں باز نہیں آتی۔

پہلی ہی ملاقات میں مجھے اس بھنگی سے نفرت سی ہو گئی۔ ویسے عام آدمیوں سے نفرت میرا ذاتی مشغلہ ہے اور یہی نفرت میری انا کو ابھارتی ہے۔ میرے لئے بھنگی کا توہین آمیز رویہ ناقابلِ برداشت تھا۔ یعنی جب کبھی میں اس کے قریب سے گذرتا وہ میری طرف آنکھ اٹھا کے بھی نہ دیکھتا۔ نہ کبھی سلام کرتا۔ نہ نگاہ سے نگاہ ملاتا۔ نہ آداب بجا لاتا۔ عجیب چغد ہے۔ تعظیم و تکریم جس پر میرا آبائی حق ہے۔ اسے بھی نظر انداز کر رہا ہے۔ میری باوقار شخصیت سے بالکل بیگانہ تھا۔ نہ جانے اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے۔ دو کوڑی کا بھنگی اور اکڑ فوں۔ اتنی۔

سچ ہے نیچ ذات کے لوگوں کو سر پر نہیں چڑھانا چاہئے۔ خیر۔ غریب انسان ہے۔ کہاں جائے گا۔ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ کبھی نہ کبھی یہ میرے آگے ہاتھ پھیلائے گا جب گھر میں بھوک بڑھے گی تب۔ لیکن صاحب اسے کام کرتے ہوئے ایک سال گذر گیا۔ ہولی آئی وہ بھنگی میرے پاس نہ آیا۔ پھر عید آئی جب بھی وہ بھنگی میرے قریب نہ آیا۔ اور اسی طرح دسہرہ۔ دیوالی۔ کرسمس آئی اور چلی گئی۔ لیکن اس دو ٹکے کے بھنگی نے میرے آگے کبھی ہاتھ نہ پھیلائے۔ میرے ہی آگے کیا۔ بلڈنگ کے کسی آدمی کے آگے اس نے دستِ سوال دراز نہ کیا۔ ایسا بھنگی میں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ ضرور کوئی انقلابی ہو گا۔ میں نے سوچا۔

اس کی بے جا اکڑ فوں خودسری۔ خود اعتمادی۔ اور نامعقول انا کو دیکھ کر میں آپے سے باہر ہو گیا۔ میں انا کو صرف اپنی ملکیت سمجھتا ہوں۔ دوسروں کی انا کو نظر انداز کرتا میں نے کافی غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ کچھ دیر اور انتظار کیا جائے۔ شکار اگر خود جال میں پھنس جائے جبھی لطف ہے۔ ویسے غریب اور مفلس لوگوں سے ٹکر لینے سے کیا فائدہ؟ بڑوں کا مقولہ ہے کہ ہمیشہ ان سے ٹکر لو جو اپنے سے بڑے ہوں۔ میں نے سوچا خود کسی نہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائے گا۔ مجھ سے بچ کر شاید چلا جائے۔ لیکن اس زندگی کی بیہودگیوں شکستوں اور ناکامیوں سے بچ کر کہاں جائے گا؟

اور وہی ہوا جس کا مجھے انتظار تھا۔ میرے کمرے کے ساتھ والا غسل خانہ کافی گندا ہو گیا۔ گندا تو پہلے ہی تھا۔ لیکن اب زیادہ گندا ہو گیا۔ یہ غسل خانہ بھی کیا تھا۔ بیک وقت برتن مانجھنے، کپڑے دھونے نہانے اور گانے کا کام اس غسل خانے سے لیا جاتا۔ برتنوں کی ساری راکھ اور صبح و شام کی بچی ہوئی غلاظت اس موری میں ڈالی جاتی۔ آہستہ آہستہ اس کا پائپ راکھ سے بھرنے لگا پھر ایک دن سارا غسل خانہ پانی سے بھر گیا۔ کیونکہ موری مٹی اور راکھ سے لبالب بھر گئی۔ اور اب پانی کے نکاس کے لئے کوئی راستہ نہ تھا۔

جب اس مسئلے پر پہلے فلور کے رہنے والوں نے بحث کی۔ تو پتہ چلا کہ موری کے اوپر کی چھلنی غائب ہے۔ اگر بازار سے چھلنی خرید کر فوری طور پر لگا دی جائے تو پائپ میں مٹی نہ بھرے گی۔ اور اس طرح غسل خانہ صاف اور ستھرا رہے گا۔

اس گھٹیا کام کو کون کرے؟ گھٹیا کام کو گھٹیا آدمی ہی کر سکتا ہے۔ ہم تو بڑے آدمی ٹھہرے۔ اس لئے میں اس بھنگی کی طرف رجوع ہوا۔ اگلے دن میں نے بھنگی سے کہا۔ "جس کے نام سے میں آج تک ناواقف تھا اور نہ جاننے کی کبھی کوشش کی۔ صرف بھنگی پکار کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتا تھا۔ میں نے کہا۔ اے ذرا اس پائپ میں سے مٹی نکال دے تاکہ غسل خانہ پانی سے نہ بھرے۔"

اس نے بڑی لاپرواہی سے میری طرف دیکھا اور کہنے لگا "ساری بلڈنگ کے برتن اس غسل خانہ میں صاف کئے جاتے ہیں۔ یہ غسل خانہ پانی سے نہ بھرے تو کیا ہو۔ جب تک چھننی نہ آئے گی۔ غسل خانہ صاف نہ ہو سکے گا۔" یہ کہکر وہ پھر جھاڑو دینے لگا۔

"چھننی کون لائے گا؟" میں نے بارعب لہجے میں کہا۔

"آپ پیسے دیجئے میں چور بازار سے لادوں گا۔" اس نے میری طرف لاپرواہی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کتنے روپے"

"ڈیڑھ روپیہ"

میں نے فوراً ڈیڑھ روپیہ اپنی قمیض کی جیب سے نکالا اور اس کی سیاہ اور کھردری ہتھیلی پر رکھ دیا۔

تین دن اور گذر گئے۔ چھننی نہ آئی۔

چوتھے دن میں نے بھنگی سے پوچھا کہ "چھننی کیوں نہیں لائے"

"کل لاؤں گا آج بھول گیا۔" اس کی آنکھیں ندامت سے جھک گئیں۔ اور میری طرف نہ دیکھتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

ایک ہفتہ اور گذر گیا مگر بھنگی چھننی نہیں لایا۔ اب یہ بھنگی صبح ہی آتا اور میرے جاگنے سے پہلے غسل خانہ اور باقی جگہ کو صاف کر کے چلا جاتا۔ اس کی حرکتوں سے صاف عیاں تھا کہ بھنگی میرا ڈیڑھ روپیہ ہضم کر گیا۔ لاشعور میں جو تھوڑی بہت خفیہ عقیدت مجھے نچلے طبقے سے تھی۔ وہ بھی جاتی رہی۔ دراصل بھنگی کی اس لغزش پر میں خوش ضرور ہوا۔ مگر ساتھ ہی غصے کی ایک لہر اُبھر آئی۔ بڑی اکڑ فون دکھاتا تھا۔ کہاں جائے گا۔ ہمارے مزدوروں کے نیتا۔ شری رام دیال سوشلسٹ سماج کے کرتا دھرتا۔ ذرا اپنے ساتھیوں پر نگاہ ڈالیں۔ جی ہاں نچلے طبقے کا اخلاق بڑا بلند ہوتا ہے۔ متوسط طبقے کے لوگ بے پیندے کے لوٹے ہیں جدھر پانی بہتے دیکھا بہہ نکلے۔

ابھی ذرا اپنے ساتھیوں پر تو نگاہ ڈالئے کیا یہی لوگ قوم کے معمار بنیں گے؟ کیا سمجھ رکھا ہے اس نے میرا ڈیڑھ روپیہ ہضم کر لیا اور ڈکار تک نہ لی۔ میں اسے بالکل معاف نہیں کروں گا۔ کہتا تھا کہ چور بازار سے چھننی خرید کر لاؤں گا۔ ارے تو خود چور ہے" تو چور بازار سے کیا لائے گا۔ دو ہفتے سے میرا منہ نہیں دیکھا چھپتا پھر رہا ہے۔ محنت کش طبقہ، عوامی قدریں، نیا سماج، اخوت جدلیاتی مارکسزم مائی فٹ۔ سب کچھ ڈھونگ۔ اصلی کرتوت اور کردار دیکھ لیا نا آپ نے۔ میرا ڈیڑھ روپیہ ہضم کر گیا۔ میں اس کی پول کھول کر رکھ دونگا۔

ویسے میں بھی دوستوں سے روپے ادھار لیتا ہوں۔ اور انہیں واپس نہیں کرتا مگر میری بات اور ہے۔ مجھ میں اور بھنگی میں کافی فرق ہے۔ میں نے کئی بار رشتہ داروں سے جھوٹ بول کر روپے ادھار لئے اور پھر کبھی واپس نہ کئے۔ میرے دوست مجھ سے بیس تیس روپے مانگ کر لیجاتے ہیں اور پھر کبھی واپس نہیں کرتے۔ دوستوں کی بات اور ہے۔ وہ روپے واپس نہیں کرتے تو کم سے کم چاپلوسی تو کرتے ہیں لیکن اس شخص کو کوئی حق نہیں کہ وہ میرے ڈیڑھ روپے پر ہاتھ صاف کر دے۔ کیا سمجھ رکھا ہے اس نے؟

اگلی صبح وہ مجھے غسل خانہ صاف کرتے ہوتے مل گیا۔ میں لپک کر اس کے قریب پہنچا۔ جیسے باز اپنے شکار پر جھپٹتا ہے۔

"کیا ہوا۔ اس چھننی کا" میں نے کڑک کر کہا۔

"جی۔ منشی نے کہا تھا کہ تمہیں لانے کی ضرورت نہیں۔ میں لا دوں گا۔ اسی لئے میں چور بازار نہیں گیا۔"

"ارے کیوں جھوٹ بولتے ہو" میں غصے سے لال پیلا ہو گیا۔ تم نے کہا تھا کہ تم خرید کر لاؤ گے میں نے تمہیں روپے دیئے اور سب کے سامنے دیئے ڈیڑھ روپے تمہاری گندی ہتھیلی پر رکھے اور تم ہفتے سے چھننی لا رہے ہو۔ بددیانتی کیوں کر رہے ہو۔ سب مجھے اُلو بنا رہے ہو۔ صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتے کہ تمہیں روپوں کی ضرورت تھی۔ اور تم نے روپے خرچ کر لئے۔ کیا میں ہی اس بلڈنگ دھو کے بازی

اور فریب کاری کے لئے رہ گیا ہوں۔ سن! اگر کل تک چھلنی لا کر نہ دی تو میں پولیس کے حوالے کر دوں گا۔ نوکری سے برخاست کرا دوں گا سمجھے؟" میں غرور اور فتح مندی کے لہجے میں بولا۔

"میں کل چھلنی لا دوں گا۔ آپ اونچی آواز میں بات نہ کیجئے۔ میں بہرہ نہیں۔" وہ جھاڑو سے زمین صاف کرتے ہوئے بولا۔

دیکھئے جناب! میں نے محلے والوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ اس عرصے میں کافی لوگ میرے ارد گرد جمع ہو گئے تھے۔ اور میری باوقار شخصیت سے مرعوب ہو رہے تھے اور بڑی حقارت سے اس بھنگی کو دیکھ رہے تھے جناب آنکھیں کھول کر دیکھئے اور کان کھول کر سنئے۔ اسے کہتے ہیں الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ روپے میں دوں اور اونچی آواز میں بات بھی نہ کروں۔ یعنی میں آپ کے کان میں رس ٹپکاؤں۔ آپ ہی فیصلہ کیجئے! قصور وار کون ہے؟ خیر میں کل تک کی مہلت دیتا ہوں۔

اس نے سب کچھ سنا۔ اور کچھ نہیں بولا۔ خاموشی سے آہستہ آہستہ جھاڑو دیتا رہا۔ وہ زمین کو یوں سنوار رہا تھا۔ جیسے شاعر اپنی غزل کو سنوارتا ہے یا کوئی افسانہ نگار اپنے قلم سے ایک نیا شاہکار لکھتا ہے۔ میں نے سوچا یہ بھنگی نہیں کوئی شاعر ہے۔ افسانہ نگار ہے اسے اپنے کام سے اتنی لگن کیوں ہے۔ یہ اتنا کم گو متین اور سنجیدہ کیوں ہے یہ سوچتا ہوا بڑبڑاتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

کمرے میں میرے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ یہ بھی اچھا ہوا۔ میری اہلیہ محترمہ شاید کسی دوسرے کمرے میں برج کھیل رہی تھیں میں نے کھلی فضا دیکھ کر خود بخود بڑبڑانا شروع کر دیا۔ آج کل کسی پر اعتبار کرنا گناہ عظیم ہے۔ مزدور دیانتدار بنتے ہیں۔ کیا کہنے۔ شریف ہوتے ہیں مگر اپنا تجربہ تو الٹ ہی ہے اپنے قول و فعل کے پکے ہوتے ہیں۔ کسے انکار ہے۔

اخلاق کے پاسباں ہوتے ہیں۔ دیکھ لیا۔ ان کا اخلاق۔ میں سوچتے سوچتے اور بولتے بولتے کانپ گیا۔ جی میں بلند آواز سے باتیں کر رہا تھا، اور آپ بڑے نرم اور شیریں لہجے میں مجھ سے ہم کلام تھے۔ جیسے آپ کسی کالج کے پرنسپل ہیں۔ کہاں ہیں وہ رام دیال آزادی اور اخوت کے پرستار! میرے سامنے تو آئیں۔ کل چھلنی نہیں لایا تو سالے کو جان سے مار دوں گا۔ کتنی سنجیدگی سے بات کرتا ہے۔ جیسے آپ کرسی صدارت پر تشریف فرما ہیں۔ سارے عملے کے سامنے بے عزتی کر دوں گا اور بتا دوں گا کہ ایک شریف انسان کے ساتھ کیسے دھوکا کیا جاتا ہے۔ میں اس قسم کی توہین برداشت نہیں کر سکتا۔ بلڈنگ کے بھنگی میرا کہا نہ مانیں اور مجھے الّو بنا دیں۔ کیسا زمانہ ہے۔ ایسے بڑے آدمیوں کو تو بددیانتی کرنے اور دوسروں کو الّو بنانے کا حق ہے لیکن چھوٹے لوگوں کو مفلس اور نادار انسانوں کو۔ بیمار مدقوق لوگوں کو بددیانتی کرنے کا کوئی حق نہیں۔" میں غرایا: "میں اس بے عزتی کا بدلہ لوں گا۔

میرا خون کھول گیا" "میں جانتا ہوں۔ وہ کل سے اس بلڈنگ میں نہیں آئے گا۔ اس کا کیا ہے۔ کسی دوسری بلڈنگ میں جھاڑو دینے چلا جائے گا۔ مگر میں اس بدمعاش کا پیچھا کروں گا۔ میں تا قیامت اسے نہیں چھوڑوں گا۔ میرا ڈیڑھ روپیہ جناب۔ یہ ڈیڑھ روپے کی بات نہیں۔ یہ میری عزت، شرافت، انا اور شخصیت کا سوال ہے۔ یہ ڈیڑھ روپیہ ڈیڑھ لاکھ روپئے کے برابر ہے۔ یہ میرے گاڑھے پسینہ کی کمائی ہے۔ میں۔ میں کسی کو امانت میں خیانت کرنے کا حق نہیں دیتا۔ اور خاص کر اس بھنگی کو۔ میں ٹہلتا ہوا بولتا گیا اور میرا خون کھولتا گیا۔ اچھا ہوا۔ اس وقت کمرے میں میرے سوا اور کوئی نہ تھا۔ نہیں تو اس قسم کے جنونی آدمیوں کو سیدھا پاگل خانہ بھیج دیا جاتا ہے۔

دوسرے دن وہ سیڑھیاں صاف کر رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا اور اس کے ہاتھ سے جھاڑو گر گیا۔ گناہ کا احساس بیچارہ ڈر گیا میری شخصیت کی پرچھائیں کا اثر ہونے لگا تھا۔ سیڑھیاں اتر کر میرے قریب آیا۔ اور کہنے لگا کہ لیجئے اپنا ڈیڑھ روپیہ کون اس بکھیڑے میں پڑے۔ منشی کہتا تھا میں خرید کر لاؤں گا۔ تم نہ لانا۔ اس لئے میں چھلنی بازار سے خرید کر نہ لایا۔ آپ مجھے جھوٹا اور مکار سمجھتے ہوں گے کوئی بات نہیں۔"

اس نے اپنی میلی قمیض کی جیب میں اپنا میلا ہاتھ ڈالا۔ اور میری شفاف ہتھیلی پر ڈیڑھ روپیہ رکھ دیا۔ جب یہ ڈیڑھ روپیہ میری

ہتھیلی پر گرا تب مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی سانپ نے ڈنک مارا ہو۔ ایک لمحہ کے لئے سارا جسم لرز گیا۔ میری بنائی ہوئی قدروں کا محل دھڑام سے نیچے گرا۔ میں اس وقت اس بھنگی کے سامنے اتنا چھوٹا اور حقیر سا ہو گیا تھا کہ جی چاہتا تھا کہ زمین میں دھنس جاؤں۔ زندگی میں پہلی بار کسی معمولی آدمی نے مجھے شکست کا احساس دلایا تھا۔ میں بخشش کے طور پر اسے ڈیڑھ روپیہ دینا چاہتا تھا لیکن اس پرخلوص باوقار شخصیت دیانت دار شخصیت کے سامنے مجھ میں اتنی جرأت نہ ہوئی کہ میں اسے بخشش دینے کی کوشش کرتا اگر اس نے نا کر دی تو میرا حال کیا ہوگا۔ میں اپنی خفت اور ندامت کو چھپانے کے لئے سیدھا اپنی بیوی کے پاس پہنچا۔ اور اسے یہ المناک خبر سنائی تھی یہ خبر سننے کے لئے تیار نہ تھی۔ ایک لمحہ کے لئے بھونچکی سی رہ گئی۔

"لو یہ ڈیڑھ روپیہ بھنگی نے واپس کیا ہے"۔

"نہ۔ نہ۔ اسے اپنے ہی پاس رکھو۔ میں اسے ہاتھ نہیں لگاؤں گی۔

"کیوں ؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اسے بھنگی نے چھوا ہے"۔

لیکن یہ میرا روپیہ ہے میں نے اُسے دیا تھا۔ اس پر حکومت ہند کی مہر ثبت ہے دیکھتی نہیں۔ یہ باقار اشوک کا ستون اور اس کے اوپر شیر یہ میری جیب میں سے گیا تھا"۔ میں خفا ہو کر چلایا۔

"آپ کی جیب کی بات اور ہے۔ وہ نرم لہجے میں بولی۔ جیسے کسی بڑی سچائی کو بے نقاب کر رہی ہو۔ میری بیوی نے فوراً نوکرانی کو بلایا اور کہا۔ اُٹھا لے یہ ڈیڑھ روپیہ اور دھو کر لا۔ یہ گندا ہے"۔

میں اپنی بیوی کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا۔ ایک لمحے کے لئے سکتے میں آ گیا۔ میں نے اپنے دماغ کو جھنجھوڑنا چاہا۔ اچانک میرے ذہن میں یہ خیال بجلی کے کوندے کی طرح لپکا۔ کہ ان سکوں کی میل تو شاید پانی کے دھونے سے اتر جائے۔ لیکن یہ دلوں کی میل کیسے اُترے گی۔

مہندر ناتھ

"طوفان کے بعد"

میں تمہیں ایک عرصے سے خط لکھنا چاہتی تھی۔ گو تم سے جُدا ہوئے ابھی چند مہینے ہی ہوئے ہیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں تم سے بہت دور چلی گئی ہوں اور شاید اب میری اور تمہاری ملاقات کبھی نہ ہو۔ گو اس بات کا اظہار ایک حماقت فعل ہے۔ اور یہ باتیں تم پر کوئی اثر نہیں کر سکتیں، لیکن میں کیا کر سکتی ہوں۔ میں جو کچھ چاہتی وہ نہ ہوا۔ یہ خط تمہیں ملے گا بھی یا نہیں، اس کا بھی مجھے پتہ نہیں۔ کیونکہ میں سمجھتی ہوں کہ تم اب اس مکان سے کب کے بھاگ چکے ہوگے۔ جس طرح کہ میں اس رات اپنے مکان سے بھاگ آئی تھی۔ مجھے اپنے کئے پر بالکل ندامت نہیں، شاید ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ جیسا کہ ہوا۔ اور آج جبکہ میں تمہیں اپنا آخری خط لکھ رہی ہوں تو اس کا یہ مطلب نہ سمجھ لینا کہ میں محبت کے زیر اثر اپنا سب کچھ گنوا بیٹھی۔ دنیا کی نظروں میں شاید میں اپنا اثاثہ لٹا چکی ہوں۔ اور ماں باپ کی نگاہوں میں کافی گر گئی ہوں۔ لیکن دنیا میں صرف ماں باپ ہی نہیں ہوتے۔ دنیا میں صرف دنیا والے ہی نہیں ہوتے۔ اپنا آپ بھی کچھ ہوتا ہے۔ اپنی انفرادی حیثیت بھی کچھ ہوتی ہے۔ اس خط کا صرف، واحد مقصد یہ ہے کہ میں تمہیں بتا دوں کہ مجھے تم سے بالکل محبت نہ تھی۔ کہیں تم اس نشہ میں چور نہ رہو۔ اور اپنے دوستوں سے اس مہم کو سر کرنے کی کہانیاں سناتے رہو کہ کس طرح ایک لڑکی تم پر فدا ہو گئی۔ اور وہ سب کچھ لٹا بیٹھی۔ گو میں سمجھتی ہوں کہ ہندوستان میں جہاں عورت کو اس کی عصمت پر خرید اجاتا ہے۔ میں عورت کی عصمت کی قیمت کو جانتی ہوں۔ اور یہ جانتے ہوئے میں نے اپنے آپ کو کیسے تمہارے حوالے کر دیا۔ اس کی بہت سی وجوہات ہیں۔ ہر بات کی وجہ ہوتی ہے۔ شاید تمہیں اپنی چالاکی ریاکاری یا لڑکیوں کو پھنسانے کی ترکیبوں پر ناز ہوگا اور تم سمجھتے ہوگے کہ تم نے ایک تعلیم یافتہ لڑکی کو اپنی ہوس کا شکار بنا لیا۔ لیکن میں سمجھتی ہوں کہ تم غلطی پر ہو۔ تم نے مجھے غلط سمجھا۔ اگر میں یہ کہدوں کہ تم مجھے سمجھ ہی نہ سکے تو یہ صاف بیانی ہوگی۔ اگر میں نے اپنے آپ کو تمہارے حوالے کیا تو اس کا باعث تم نہ تھے۔ بلکہ وہ ماحول جس میں ہم پلتے رہے۔ اور جس ماحول میں تم ایکا ایکی آئے۔ اور میرے جذبات کو تم نے پھر سے بیدار کیا۔ جیسا کہ تم جانتے ہو کہ میں متوسط طبقہ میں پیدا ہوئی ہوں اور متوسط طبقہ اپنے اخلاق کا خاص طور پر خیال رکھتا ہے۔ متوسط طبقہ کے لوگ اخلاق کی ترازو پر اپنے آپ کو جانچتے ہیں۔ اُن کے پاس سونا ہو یا نہ ہو۔ رتبہ ہو یا نہ ہو لیکن اخلاق کا طوق اپنی گردن میں ہمیشہ پہنے رہتے ہیں۔ اور کبھی کبھی اخلاق کی یہ لمبی زنجیر اُن کے لئے موت کی زنجیر بن جاتی ہے۔ یہ نام نہاد اخلاق جو ہمارے متوسط طبقے کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ ہمارے لئے مضر رساں ہے۔ میں وعظ کرنا نہیں چاہتی۔ نہ ہی سماج کی خامیاں کہنا چاہتی ہوں۔ مجھے سماجی خامیوں سے کیا واسطہ۔ میں تو یہ بات ذہن نشین کرنا چاہتی ہو کہ میں نے جو قدم اٹھایا وہ ہمارے سماجی ماحول کے عین مطابق تھا۔ اس میں نہ تو تمہارے حُسن کی کشش کا اثر تھا اور نہ ہی تمہاری ذہانت اور ذکاوت کا ہاتھ۔

اور مجھے تمہاری ذہانت کا کچھ اتنا علم بھی نہیں کہ میں تو یہ بھی نہیں جانتی کہ تم ذہین ہو۔ میں اتنا جانتی ہوں کہ تم نے بی۔ اے یا ایم۔ اے کرلیا ہے۔ وہ ذہین یا کاہل ہو سکتا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے اور نہ تھا۔ اور نہ ہی مجھے ان یونیورسٹیوں پر اعتبار ہے۔ یہ امتحان جو چند کتابوں کے رٹنے پر لئے جاتے ہیں۔ ہماری ذہانت کا ثبوت نہیں۔ بلکہ ہماری سماجی بیوقوفی پر دلالت کرتے ہیں۔ خیر مجھے اس سے کیا واسطہ کہ تم ذہین ہو یا نہیں ہو۔ میں تو کہہ رہی تھی کہ تم کہیں یہ نہ سمجھ بیٹھو کہ تمہاری خوبصورتی پر مرتے ہوئے میں تمہاری خواہشوں کا شکار ہوئی۔ اگر ایسا کرنا ہوتا تو کالج میں کسی حسین اور خوبصورت لڑکے سے محبت کرلیتی۔ شاید اس وقت محبت کرسکتی تھی۔ اب تو محبت سے کوسوں دور بھاگتی ہوں۔

تو میں کہہ رہی تھی کہ تم اتنے حسین نہ تھے۔ کہ میں تمہارے بغیر زندہ نہ رہ سکتی تھی۔ اور آن واحد میں میں نے اپنے جسم کو تمہارے حوالے کردیا۔ اور تم نے بغیر کسی حیل وحجت کے قبول کرلیا۔ ہاں میں کہہ رہی تھی۔ کیا کہہ رہی تھی۔ ذہن میں خیالات اُمڈے چلے آتے ہیں اور کسی وقت خیالات گڈ مڈ ہو جاتے ہیں۔ اور ذہن کی سطح پر پوری طرح نہیں اُبھرتے۔ ٹھہر جاؤ۔ ذرا سوچنے دو۔ ہاں میں کہہ رہی تھی کہ متوسط طبقے کے لوگوں کو اپنے اخلاق سے زیادہ محبت ہے۔ وہ ہر چیز کو اخلاق کے کانٹے پر پرکھتے ہیں۔ یعنی اُن کی لڑکی اگر کسی نوجوان لڑکے سے گفتگو کرنے لگے۔ تو وہ جھٹ اس بات کو اخلاق پر تولتے ہیں۔ اگر گھر والوں کی نظروں میں یہ بات اخلاق پر پوری نہیں اُترتی جیسا کہ صاف ظاہر ہے کہ نہیں اُترے گی۔ تو وہ اپنی لڑکی کو اس جوان لڑکے سے گفتگو نہیں کرنے دیں گے۔ یہ تو صاف ظاہر ہے کہ گھر والوں نے مجھے کبھی کسی غیر شخص سے کلام کرنے کی اجازت نہ دی، اور نہ ہی میں نے ایسی اجازت طلب کرنے کی جرأت کی۔ اگر میں چاہتی تو ان باتوں کے لئے راستہ نکال سکتی تھی۔ لیکن دل ان باتوں کے لئے تیار نہ تھا۔ برسوں کی ذہنی غلامی نے دماغ پر ایک آہنی غلاف چڑھا دیا تھا۔ جس کو مغربی تعلیم کی بی۔ اے کی ڈگری بھی نہ توڑ سکی۔ تم تو پوچھ سکتے ہو کہ بھلا میں خود بی۔ اے میں پڑھتی رہی اور وہ بھی بھگوان داس کالج میں جہاں لڑکے اور لڑکیاں اکٹھے پڑھتے ہیں۔ تو پھر بھی مجھے یہ جرأت نہ ہو کہ کسی لڑکے سے آشنائی کرلیتی۔ محبت کی پینگیں بڑھاتی۔ رات کے اندھیرے میں کسی کے ساتھ سینما چلی جاتی اور بہانہ بنانا تو مشکل بات نہیں۔ گھر والوں سے کہہ دیا کہ کالج میں لڑکیوں کا ڈرامہ ہے۔ یا فلاں پروفیسر کو لٹریچر پر شاندار لیکچر دینا ہے۔ ہزاروں بہلانے بنانے جا سکتے ہیں جو میں یہاں نہیں لکھنا چاہتی۔ اور کسی شام کو اپنے نئے ساتھی کے ساتھ لارنس باغ کی سیر کو جاتی۔ عورتیں بہترین ساڑیاں پہنے ہوئے اس جنت مقام پر آتی ہیں۔ ہر طرف پھول کھلے ہوئے ہوتے ہیں۔ مہکی مہکی خوشبو۔ رنگ برنگ کی ساڑیاں۔ نیلی پیلی ارغوانی۔ ہوا میں لہراتے ہوئے بال اور لڑکوں کا جمگھٹا۔ بہترین سوٹوں میں ملبوس ٹائیاں ہوا میں اڑ رہی ہیں اور غول کے غول ادھر اُدھر لڑکیوں کے پیچھے بھاگے جا رہے ہیں۔ لڑکیاں خوش ہوتی ہیں۔ بنتی ہیں دل میں اُمنگیں اُٹھتی ہیں۔ جسم میں گدگدی ہوتی ہے۔ کسی سے آنکھیں ملتی ہیں ۔ جسے تم نہیں جانتے۔ اور شاید وہ پھر مل نہ سکے۔ اور کبھی ملتے بھی نہیں۔ لیکن کسی کی آنکھیں بار بار تمہاری طرف اٹھتی ہیں۔ تمہارے قدم جلد ہی جلدی اُٹھتے ہیں اور اپنی سہیلیوں کو ساتھ لے کر وہ اوجھل ہو جاتی ہیں۔ باتیں ہوتی ہیں اور ہر روز ہوتی رہیں گی چاہے متوسط درجے کے لوگ چیخ چیخ کر مر جائیں۔ چاہے وہ دنیا کے بہترین شاعروں کی غزلوں کو آگ کی نذر کردیں۔ چاہے وہ فحاشیوں کی کتابوں کو قابل ضبطی قرار دیں۔ لیکن یہ کشش جو ایک جوان عورت اور مرد کے درمیان ایک دوسرے کو دیکھنے سے ہوتی ہے۔ یہ کبھی نہیں مر سکتی یہ ایک فطری ضرورت ہے جس سے تم بھی انکار نہیں کرسکتے۔ یہ متوسط طبقے کے لوگ جن پر اخلاق ایک ہوّا بن کر چھا گیا ہے۔ یہ چاہتے ہیں کہ ان کی بہو بیٹیوں کے دماغ میں ایسے خیالات نہ آئیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ گو وہ ہر سال ایک بچّہ پیدا کریں۔ لیکن ان کی لڑکیوں کو یہ پتہ نہ چلے کہ یہ بچے کہاں سے آتے ہیں، کسی کا گرم سانس انہیں نہ چھو جائے۔ کسی غیر انسان کی آنکھیں ان کی لڑکیوں پر

نہ پڑ جائیں۔ یہ گندے ناولیں نہ پڑھیں۔ یہ عشقیہ نظمیں نہ سُنیں۔ یہ کسی خوبصورت لڑکے کو دیکھ کر خوش نہ ہوں۔ یہ موسیقی کی طرف رجوع نہ ہوں۔ یہ ناچ کو نہ اپنائیں۔ لیکن اس کے باوجود بھی سب کچھ ہو رہا ہے۔ لڑکیاں ناچتی ہیں۔ گاتی ہیں۔ کسی کی خمار آلود نگاہوں کے تلذذ سے محظوظ ہوتی ہیں۔ رات کی تاریکیاں ان کے لیے بوجھل بن جاتی ہیں۔ اور وہ تصورات کی دنیا میں کھو جاتی ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ جو کچھ وہ چاہتے ہیں کبھی نہیں ہو سکتا۔ اور نہ ہو کر رہے گا۔ یہ متوسط طبقے اپنے بچّوں کی زندگیوں کو برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اُف یہ اخلاق! لیکن تمہیں اخلاق سے کیا تعلق تم اخلاق سے کوسوں دور بھاگتے ہو۔ میں کتنی خوش ہوں کہ تم اخلاق سے بالاتر ہو۔ اور تم نے مجھے اخلاق سے بالاتر کر دیا۔ لیکن کیا دنیا میں اخلاق کوئی چیز نہیں۔ بحث کی ضرورت نہیں۔ پند و نصیحت کا وقت نہیں اور میں کیا نصیحت کر سکتی ہوں اور نہ ہی میں نصیحت پر یقین رکھتی ہوں۔ میں اُن ناصحوں سے کوسوں دور بھاگتی ہوں۔ "یہ نہ کرو۔ وہ نہ کرو۔ فلاں بزرگ نے یہ کہا ہے کہ فلاں کتاب میں یہ لکھا ہے۔ مذہب اس کی اجازت نہیں دیتا۔ کتابیں۔ مذہب۔ بزرگ ....."

خیر میں کہہ رہی تھی کہ طالب علمی کے زمانے میں کسی نوجوان نے مجھ سے محبت کرنے کی ہمت نہ کی اور اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ میں بدصورت تھی، تھی نہیں بلکہ ہوں، اس کا تمہیں علم بھی ہے۔ اور میری بدصورتی کا فائدہ تم نے جس طرح اٹھایا ہے میں اُس کی بھی داد دیتی ہوں۔ میں بدصورت کیوں ہوں اس کی بھی وجہ ہے۔ تم شاید میری باتوں سے چڑ جاؤ اور خط کو پڑھے بغیر پھینک دو۔ اور دل میں سوچو کہ کیا ہر بات کی کوئی وجہ ہوتی ہے۔ لیکن میرا آخری خط پڑھنے میں تمہیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ یہ میرا آخری خط ہے۔ تمہیں ان خوبصورت لمحوں کی قسم جن کی یاد میرے ذہن پر مرتسم ہے۔ سچ کہتی ہوں میں وہ لمحے زندگی بھر یاد رکھوں گی۔ میں ان حسین لمحوں کو کبھی بھول نہیں سکتی۔ وہ میری زندگی بھر کا بہترین سرمایہ ہیں۔ وہ میری جوانی کی اوّلین اور آخری اُمنگوں کا نچوڑ ہیں، میں نے اِن لمحوں سے کتنا حظ اٹھایا تھا۔ اس کا میں بھی ذکر کروں گی۔ چاہے متوسط درجے کے لوگ مجھے فاحشہ ہی کیوں نہ کہدیں۔ پہلے میں یہ بتا دوں کہ میں بدصورت کیوں ہوں میری ماں تم نے دیکھی ہے نا! مجھے اپنی ماں سے محبّت ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اپنی ماں کی برائیوں کو نہیں جانتی۔ اُس کے عیب مجھ سے چھپے نہیں ہیں۔ وہ نہایت موٹی اور بھدّی عورت معلوم دیتی ہے۔ نہایت ہی بھونڈی۔ گو اس کے چہرے کے خدوخال اتنے بُرے نہیں۔ لیکن اُس کے جسم کی ساخت اتنی بُری ہے کہ وہ بڑی بھدّی عورت معلوم دیتی ہے کہو تو اُس کے جسم کی ہر نقش کو یہاں بیان کر دوں۔ لیکن مجھے متوسط درجے کے لوگوں کا خیال ہے۔ کہ کہیں مجھے زندہ پھانسی پر نہ لٹکا دیں۔ صرف اس قصور پر کہ ایک بیٹی ہو کر اپنے ماں باپ کے نقائص بیان کرتی ہے۔ اور میرا باپ میری ماں سے بھی بدصورت چھوٹا قد، چہرہ لٹکا ہوا۔ گال اندر دھنسے ہوئے۔ پتلا سا جسم۔ جس میں ہڈیاں تک نظر آتی ہیں۔ اور اُس کے ساتھ ہی خدا نے میرے باپ پر ایک کرم اور کیا۔ کہ اُس کی دائیں ٹانگ بائیں ٹانگ سے چھوٹی بنا دی۔ جب وہ چلتے تو نہیں "وہ چلنا" یہاں لکھنا چاہتی ہوں۔ لیکن مجھے دنیا والوں کے اخلاق کا پاس ہے۔ جب وہ چلتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے ---- جیسے لگڑ بھگڑ یا چرغ۔ خیر یہ میرے باپ کی دوسری شادی ہے۔ پہلی شادی سے کوئی لڑکا نہ تھا۔ لیکن میرے باپ کو یہ فکر ہوئی کہ اتنی جائیداد کون سنبھالے گا۔ اتنا بڑا دو منزلہ مکان۔ ایک کنواں۔ اتنی زمینیں جو اپنا خون چوس چوس کر خریدی گئی تھیں۔ ان کا کون مالک ہوگا۔ اور پھر دنیا والوں کے طعنے۔ اور کیا طعنے تھے۔ کہ میرا باپ کمزور ہے۔ اس لئے وہ بچّہ پیدا کرنے کے ناقابل ہے۔ لیکن کس طرح ہو سکتا ہے۔ کہ ایک انسان ہو، گورنمنٹ سروس کرتا ہو، زمین ہو، مکان ہو اور لڑکا نہ ہو۔ اور طعنے۔ مجبوراً میرے باپ نے دوسری شادی کی۔ اور خدا بھلا کرے۔ ان محلّے والوں کا کہ دو لڑکے اور ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ خدا خدا کر کے لوگوں نے طعنے دینے بند کئے اور متوسط

درجے کا اخلاق بامِ عروج پر پہنچ گیا۔ میرے باپ کی عزت رہ گئی۔ اور اُجڑا ہوا گھر بس گیا۔ اکثر میرے ماں باپ میں لڑائی ہوا کرتی تھی۔ اکثر میری ماں کہا کرتی تھی۔ کہ انہیں اپنی صحت کا خیال نہیں۔ دن رات دفتر کے کام میں لگے رہتے ہیں۔ گھر کا ذرا خیال نہیں۔ بس ایک چپاتی کھاتے ہیں۔ ایک روٹی سے کیا بنتا ہے۔ فروٹ جوس نہیں پیتے۔ دودھ نہیں پیتے مکھن نہیں کھاتے اور تو کیا تیل کی مالش نہیں کرتے۔ ہمارے پڑوس میں انہی کے عمر کے بابو رہتے ہیں۔ کیا نام ان کا۔ بھلا سا نام ہے۔ میں نے ان کی شکل تک بھی نہیں دیکھی۔ مجھے کیا واسطہ ان کی شکل سے۔ لیکن نہایت خوبصورت اور خوش شکل ہیں، جسم بھرا ابھرا سا۔ چوڑا چکلا سینہ۔ بازو موٹے موٹے گٹھے ہوئے۔ اور آنکھیں۔ آنکھوں میں چمک۔ گال سُرخ اور کیا بتاؤں کتنی اچھی صحت ہے۔" اور میں دل میں سوچتی ماں کو یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ ابھی ابھی وہ کہہ رہی تھیں۔ کہ انہوں نے بابو صاحب کی شکل تک نہیں دیکھی۔ لیکن اس وقت تو وہ بابو صاحب کے ہر حصّے کو اس طرح پہچانتی ہیں جیسے انہوں نے اس کا ڈاکٹری معائنہ کیا ہے۔ لیکن یہ سوال کرنا اخلاق سے بعید ہے۔

ازبس یہ کہ تم میری بدصورتی کی وجہ سمجھ گئے۔ یہ وراثت سے ملی ہے۔ اس میں میرے باپ کا قصور نہیں۔ کہ انہوں نے کیوں ایک دوسرے سے شادی نہ کرتے تو کوئی اور میری ماں سے شادی کرتا۔ میں اگر حساس نہ ہوتی یا خوبصورتی سے مجھے اتنا لگاؤ اور دلچسپی نہ ہوتی تو شاید مجھے اپنے بھدّے پن پر اتنا ناز تھا کہ جتنا ایک خوبصورت عورت کو اپنی خوبصورتی پر ہوتا ہے۔ لیکن میں کیا کرتی۔ میرے سوچنے کا ڈھنگ ہی نرالا تھا۔ مجھے بدنما چیز اچھی نہیں لگتی۔ مجھے خود اپنے آپ سے نفرت تھی۔ گو میں اتنی بدصورت نہ تھی۔ جتنی کہ میں بن رہی ہوں۔ تو شاید تم میری طرف مائل نہ ہوتے۔ میری طرف مائل ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں آج تک کسی طرف مائل نہ ہوئی تھی۔ سچ جانو کہ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد تک میں مرد کے گرم سانس سے نا آشنا تھی۔ اور جب میں بی۔ ٹی کر چکی تو میری خواہش کچھ مُردہ ہو چکی تھی۔ زندگی کی پیہم شکستوں نے مجھے بے جان کر دیا۔ گھٹے ہوئے ماحول نے اُمنگوں کا کچومر نکال دیا۔ جوانی آئی اور آتی بھی کیونکر۔ جسم کی ہر رنگینی جذبات کے مسلے جانے سے فنا ہو گئی۔ اعصاب پورے طریقے سے نشوونما نہ پا سکے۔ آنکھوں کی چمک کسی انتظار میں غائب ہو گئی۔ شباب کی رنگینی جو ایک کنواری عورت کے چہرے پر ہوتی ہے۔ آہستہ آہستہ اُڑ گئی۔ ہونٹ خشک ہوتے گئے۔ باہوں پر گوشت نہ چڑھ سکا۔ اب مجھے ان دنوں کسی سے محبت نہ تھی۔ لیکن ذہن میں ایک پریشانی سی رہتی تھی۔ سر پر ایک جنون سوار رہتا تھا۔ میرے خیالات اگر متوسط درجہ کے اخلاق پر تولے جائیں تو مجھے کہنا پڑے گا کہ میرے خیالات ہمیشہ پراگندہ رہتے تھے۔ یہ پراگندگی میرے جسم کا حصّہ بن گئی۔ میرے جسم کے ہر حصّہ پر چھا گئی۔ پھر آہستہ آہستہ اس پراگندگی کی یہ تشکیل ہوئی کہ میں اس جوتے کی طرح دکھائی دینے لگی جو عرصہ تک دھوپ میں پڑا رہنے سے بدوضع اور بیڈول ہو جاتا ہے۔ میرے ذہن میں خیالات مردہ ہو چکے ہیں۔ اور پراگندگی کا اثر اعصاب پر ہو چکا تھا۔ جنسی خواہشیں ایک طرح سے ————" ہو چکی تھیں یا یوں کہا جائے کہ جنسی خواہشوں کو ماحول نے ابھرنے نہ دیا لیکن فرائڈ کے کہنے کے مطابق جنسی خواہش مرتی نہیں۔ دبائی جاتی ہے۔ شاید یہی حالت تھی کہ احساسات۔ اُمنگیں۔ آرزوئیں اُبھر ابھر کر شل ہو چکی تھیں۔ لیکن ایک چنگاری کسی کونے میں دبی ہوئی تھی۔ میری حالت اُس جلے ہوئے اُپلے کی طرح تھی۔ جو اوپر سے بالکل راکھ دکھائی دیتا ہو۔ لیکن جس کے ———— اندر ہی اندر چنگاری سلگتی رہے۔

کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ تم نہ آتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ لیکن پھر خیال آتا ہے کہ تم نہ آتے تو تمہاری جگہ کوئی اور آجاتا ———— تم اتنے خوش شکل تو نہ تھے کہ تم مجھے بھا جاتے۔ گو تمہارا قد کافی لمبا تھا۔ تمہارا جسم بھرا ہوا لیکن تمہارا

چہرہ عجیب بیڈول سا بے ڈھنگا سا۔ یوں مجھے کچھ بھایا نہیں۔ سچ کہتی ہوں۔ بُرا نہ مانو۔ اور پھر تم نے میری جانچ پڑتال بھی نہ کی، میں پہلے ہی سمجھ گئی کہ تم جیسے لڑکے مجھے ہمیشہ نظر انداز کر دیتے۔ کیوں؟ میں ایک ہی نظر میں بھانپ گئی تھی کہ تمہیں اپنی خوبصورتی کا ناز ہے۔ اور پھر تمہارے دوست بھی کتنے بھونڈے اور بھدے تھے۔ وہی واسدیو اس کی شکل مجھے کبھی نہیں بھولتی۔ وہ مجھے گھور گھور کر دیکھتا تھا۔ اور کئی بار راستہ میں کھڑا ہو ہو کر ہنستا رہتا تھا۔ یا کبھی مسکرا دیتا تھا۔ یا کبھی اپنے دوست کو آواز دیتا۔ تاکہ میں اُس کی طرف دیکھوں۔ اور کتنے ہی جیلے جتن کرتا۔ مگر آج کل کی لڑکیاں یوں نرغہ میں نہیں آتیں۔ اور پھر واسدیو جیسے نامعقول آدمیوں سے اُنہیں کیا لگاؤ ہو سکتا ہے۔ تم اکثر چپ رہتے تھے۔ یوں کم سم جیسے تمہیں میرے وجود کا علم ہی نہیں اور نہ ہی میں تمہیں اپنے وجود کا احساس کرانا چاہتی تھی۔ مجھے تم سے محبت نہ تھی اور نہ ہو سکتی تھی۔ یہ علٰحدہ بات ہے کہ ماحول نے ہم دونوں کو غیر شعوری طور پر ایک دوسرے کا احساس کرا دیا۔ یہ کس طرح ہو سکتا تھا۔ کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے وجود کا احساس نہ کرتے اور اس وجود کا احساس دن بدن شدید ہوتا گیا۔ جوں جوں دن گذرتے گئے تمہارا وجود میرے ذہن پر ایک کابوس بن کر چھا گیا اور جب تم اکیلے رہ گئے۔ اور تمہاری اماں کسی ضروری کام سے کسی دوسرے شہر چلی گئیں تو تمہارا وجود میرے لئے ایک بوجھل غبارہ بن گیا۔ درمیانی طبقے کی گرفت کچھ ڈھیلی نظر آئی۔ اگر تم مجھے بالکل تنہا اور اکیلے نظر آتے۔ اکثر تم رات کے وقت دیر تک پڑھتے رہتے تھے۔ پتہ نہیں کیا پڑھتے رہتے تھے۔ لیکن یہ مجھے صاف یاد ہے کہ تم اکثر اس وقت بجلی بجھاتے جب میں بیڈنگ لیمپ کو بجھاتی۔ میں نے پہلے اس بات کو یونہی نظر انداز کر دیا۔ لیکن بعد میں سوچنے لگی۔ کہ تم کیوں جاگتے ہو۔ لیکن میں نے کبھی یہ خیال نہ کیا کہ میں کیوں جاگتی رہتی ہوں۔ میں کیوں پہلے نہیں سو جاتی۔ اور کیوں تمہارے لیمپ کی روشنی کی طرف دیکھتی رہتی ہوں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم دونوں ایک ہی لیمپ کی روشنی میں پڑھ رہے ہیں۔ اور جب لیمپ کی روشنی بجھ جاتی اور میرے اردگرد اندھیرا ہو جاتا تو میں گھبرا جاتی۔ اور میں سوچتی کہ میں اکیلی ہوں اور کبھی آسمان کی طرف دیکھتی کہ جو ستاروں سے اَٹا ہوا معلوم ہوتا اور کبھی کبھی کوئی ستارہ لوٹتا اور افق کی طرف بھاگتا ہوا چلا جاتا۔ اس کے پیچھے پیچھے روشنی کی ایک لکیر آہستہ آہستہ معدوم ہو جاتی۔ دور اُس پار محلے کے کتّے کے بھونکنے کی آواز چوکیدار کے چلّانے کی آواز میں مدغم ہو جاتی۔ ذہن پر ایک تاریکی چھا جاتی اور میں دیر تک جاگتی رہتی۔ حتیٰ کہ مشرق سے سورج انگارہ بن کر نکل آتا۔ اور اس کی نکیلی کرنیں میرے پریشان۔ تھکے ہوئے چہرے پر پڑتیں۔ اکثر میں سوچتی کہ میں اکیلی ہوں اور تم اُس کمرے میں اکیلے ہو اور پھر ہم دونوں اکیلے ہیں۔ یہ کیوں ہے، ایسا کیوں ہے؟ مجھے تم سے محبت بالکل نہ تھی۔ اور اب بھی نہیں ہے۔ لیکن غیر شعوری طور پر میں تمہاری طرف کھنچی چلی گئی۔

اور پھر اُس دن کی بات ہے۔ دن نہیں بلکہ رات تھی۔ کیا تاریخ تھی؟ تمہیں یاد نہ ہو گی۔ مجھے یاد ہے۔ ۱۹ مارچ ۱۹۴۷ء شاید تم اس تاریخ کو بھول گئے ہو گے۔ لیکن مجھے یہ رات نہیں بھول سکتی۔ اس رات صدیوں کے بنائے قوانین ایک عورت کو نہ جکڑ سکے۔ اس رات مجھے یہی خیال آ رہا کہ تم اکیلے ہو۔ اور میں تمہارے پاس چلی آؤں اور کہوں کہ آؤ مجھے پیار کرو۔ تو تم کیا کہو گے۔ ہو سکتا ہے کہ اگر تم کسی رات میرے پاس آ جاتے تو چیخ اٹھتی اور کہتی کہ یہ چور ہے اس نے میری عصمت کو چھینا ہے۔ لیکن میں تمہارے پاس اکیلی آ جاؤں اور میں یہ سوچتے سوچتے پڑھنے لگی۔ لیکن دماغ میں الفاظ پھیلتے چلے گئے۔ اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا۔ جیسے میں ایک بڑی چٹان سے پھسل رہی ہوں۔ تم ابھی تک نہ آئے تھے۔ پہلے تو تم آ جاتے تھے۔ آج تم نے کیوں میری بلا سے ——

میں نے سوچا مجھے کیا پروا۔ تم آؤ یا نہ آؤ۔ میں نے سونے کی کوشش کی لیکن دل جاگنے پر مُصر تھا۔ دل کہہ رہا تھا انہیں آنے دو۔ ابھی آ جائیں گے۔ نوکر نے دروازہ بند کر دیا۔ وہی بڑا دروازہ۔ میں نے سوچا۔ اب تمہارے آنے کا کوئی امکان نہیں۔ اب مجھے سو جانا چاہیئے۔ میں نے لیمپ گُل کر دیا اور بستر پر دراز ہو گئی۔ آسمان پر تارے میرا منہ چڑانے لگے۔ یہ اندھیرا یہ گھپ اندھیرا

روشنی کہیں بھی نہیں گھڑیاں نے بارہ بجائے۔ نیچے دالان میں کسی کے فراٹے کی آواز آنے لگی۔ ساری دنیا سو رہی ہے۔ لیکن میری آنکھوں میں نیند عنقا تھی۔ اور پھر یہ ذہنی پریشانی۔ جیسے میں کسی دلدل میں دھنستی جا رہی ہوں۔ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ پھر کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں چپ رہی۔ کتا ہوگا۔ میں نے سوچا۔ پھر کسی نے آواز دی۔ یہ تمہاری آواز تھی۔ میں نے سوچا لوکر دروازہ کھول دے گا۔ لیکن تم آوازیں دیتے رہے اور صحن سے خراٹوں کی آواز آتی رہی۔ میں نے سوچا۔ کیوں نہ دروازہ کھول دوں۔ دل نے کہا اور میں چپکے سے اُٹھ کر نیچے چلی گئی۔ اور دروازہ کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی تم نے ٹارچ جلائی۔ جیسے کوئی بھولا بھٹکا راستہ ڈھونڈ رہا ہو۔

"ادھر اوپر" میں نے زیر لب کہا کہ۔ دل دھک دھک کرنے لگا۔ ٹانگوں میں ایک بجلی کی لہر دوڑ گئی۔ کنپٹیاں جلنے لگیں اور گلے سے ایک لیس دار لعاب نکلتا ہوا معلوم ہوا۔ اور پھر تاریکی .... اس تاریکی میں کیا ہوا۔ یہ تم جانتے ہو۔ شاید اس سے پہلے تم کسی عورت سے ہمکنار ہو چکے ہو گے۔ لیکن میرے لئے یہ پہلا موقع تھا۔ تمہارے ہونٹ خشک اور باسی تھے۔ اور اُن میں بیئر کی خوشبو آ رہی تھی۔ اُس دن مجھے معلوم ہوا کہ تم بیئر بھی پیتے ہو۔ میں اُس دن زندگی کی مٹھاسوں سے آشنا ہوئی۔ تمہارے وجود نے جو میرے جسم سے ہمکنار تھا۔ میری روح پر ایک نشہ سا طاری کر دیا تھا۔ اور تم دیر تک میرے پریشان بالوں سے کھیلتے رہے۔ میں نے تمہارے ہونٹوں کو چوما۔ تمہارے گالوں۔ تمہاری گردن حتیٰ کہ تمہاری گردن چوم چوم کر چور ہو گئی اور سچ کہتی ہوں آج تک تمہارے ہونٹوں کا مزہ میرے ہونٹوں پر موجود ہے۔ ابھی تک میرے ذہن میں تمہارے جسم کی بساند تر و تازہ شیریں اور گرم۔

دور آسمان پر تارے مسکرا رہے تھے۔ ہوا میں ایک نیند سی رچی ہوئی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ تمام دنیا اسی طرح سوتی رہے اور یہ رات ایک مسلسل رات بن جائے مجھے کتنا سکون نصیب ہوا۔ مجھے کتنی خوشی ہوئی اُسے میں ہی جانتی ہوں۔ چاہے تو اسے مٹتے ہوئے شباب کی تاثیر سمجھ لو۔ یا ایک جوان عورت کی بیوقوفی کا مرقع۔ لیکن وہ ضرور خوشی کے لمحے تھے۔ مجھے زندگی بھر کبھی اتنی مسرت حاصل نہ ہوئی تھی۔ میری زندگی کے تار کبھی اس طرح کانپے نہ تھے۔ اُس دن تم نے مجھ سے محبت کر کے اس لازوال مسرت کی لذت کو آشنا کر دیا۔ کیا اچھا ہوتا کہ یہ محبت جاودانی ہو جاتی۔ یہ رشتہ ہمیشہ کے لئے پکا ہو جاتا۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ دن گذرتے گئے اور مجھے اپنی وحشیانہ غلطی کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ میں نے تم سے کہا کہ تم میری مدد کرو۔ تم نے انکار کر دیا۔ مجھے تمہارے انکار سے حیرت نہیں ہوئی۔ مجھے اُمید تھی کہ تم ایسا ہی کرو گے۔ اور پھر ایسا کیوں ہو۔ کیا دنیا میں کبھی ایسا نظام نہ ہوگا۔ جہاں مرد اور عورت تاروں کی چھاؤں میں اکٹھے رہ سکیں گے۔ اور دنیا کے یہ بنائے ہوئے قانون کبھی رخنہ انداز نہ ہو سکیں گے۔ جس صبح میں بھاگی۔ اُس وقت چاروں طرف میلا میلا اندھیرا تھا۔ ہوا میں اسی گھٹے ہوئے ماحول کی بدبو آ رہی تھی اور آسمان پر چاند یاس و حسرت کا مرقع بنا ہوا تھا۔ ایکا ایک چاند پر سیاہ بادل چھا گئے۔ اور چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ کسی نے مجھے نہ بلایا۔ اور تم کہاں تھے؟ اس نے سوچنے کی کوشش کی۔

میں اب کیا کہوں اور کیا کرتی ہوں شاید تم جاننا چاہو۔ ؟ میں ایک معمولی سے اسکول میں استانی ہوں۔ اور میرے ایک بچہ ہے۔ ایک چھوٹا سا پیارا سا بچہ۔ اس کی آنکھیں تم سے ملتی ہیں لیکن تمہیں اس سے کیا غرض۔ !

کبھی کبھی وہ آسمان کی طرف انگلی اُٹھا کر کہتا ہے "اں۔ ابا۔ ؟ ابا۔ ؟ اور میں کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ کیا ہی اچھا ہو۔ کہ اس دنیا میں نہ مائیں ہوں نہ باپ صرف انسان اور بچے۔"

مہندر ناتھ

چاندی کے تار

اب جبکہ تمہاری شادی ہو چکی ہے اور تم ایک دوسرے شخص کی آغوش میں جا چکی ہو، مجھے تمہیں خط لکھنے کا حق حاصل ہو گیا ہے۔ گویا ایک عجیب سی بات ہے کہ جب تم خط لکھتی تھیں تو میں جواب دینے سے قاصر تھا۔ اور اب میں تمہیں خط لکھ رہا ہوں لیکن تم اس خط کا جواب دینے سے معذور ہو گی۔ میرے لئے یہ بوجھ بھی ناقابل برداشت ہے کہ میں ایک شادی شدہ عورت کو خط لکھوں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اس خط کا تمہارے خاوند پر کیا اثر ہو گا۔ اگرچہ میں اس امر کی پوری کوشش کروں گا کہ یہ خط سیدھا تمہارے پاس پہنچے اور تمہارے خاوند کو اس خط کا علم ہی نہ ہو۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ یہ خط تمہارے شوہر کو مل جائے۔ یوں ہی ڈاکیہ غلطی کر سکتا ہے اور اس کے بعد جو کچھ ہو گا اس کا تصوّر بھی کر سکتا ہوں۔ کیونکہ ایک ہندوستانی شوہر یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی دوسرا مرد اس کی بیوی کو خط لکھے۔ اور پھر یہ حقیقت اس پر آشکار ہو کہ اس کی بیوی کسی اور سے محبت کرتی ہے اور اب تک یہ راہ و رسم جاری ہے۔ اس بھید کا کسی ہندوستانی خاوند پر کھُلنا، کوئٹہ کے بھونچال کے مترادف ہو گا۔ وہ اپنے شباب کی غلطیوں کو نظر انداز کر سکتا ہے۔ آخر ہر شخص شادی سے پہلے محبت کرنا چاہتا ہے، اور کرتا ہے، اگر اسے موقع مل جائے لیکن یہ حق شاید عورت کو حاصل نہیں۔ وہ تو محض ایک جانور تصور کی جاتی ہے جو ماں باپ کی کڑی نگاہوں میں مقیّد رہتی ہے۔ ایسی عورتوں کے لئے شوہر ایک مقدس چیز ہے۔ اجنتا کی تصویر کی طرح محض ایک دیوی جس پر جذبات کا اثر نہیں ہو سکتا۔ جس پر ماحول کبھی حاوی نہیں ہو سکتا۔ جس پر زمانے کے نشیب فراز کا کوئی اثر نہیں۔ آجکل کی لڑکیاں اس امر کی گواہ ہیں کہ زمانے کی بدلتی ہوئی رَو نے حالات اور ماحول نے اُن پر کیا اثر کیا ہے۔ اور اگر ان باتوں کو لوگ سمجھ جائیں تو شاید دنیا میں خودکشی کرنے والوں کی تعداد آدھی رہ جائے۔ خاوند عورتوں کو پیٹنا چھوڑ دیں۔ اور ہر گھریلو جھگڑے کے بعد طلاق کی دھمکی نہ دیا کریں۔ خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ اگر یہ خط تمہارے خاوند کو مل جائے اور تمہیں وہ لعنت ملامت کرے یا پیٹے تو ان باتوں کو نظر انداز کر دینا۔ اور ان تکلیفوں کو ماضی کے خوشگوار لمحوں کی خاطر سہہ لینا۔ گو میں سمجھتا ہوں کہ اس قسم کی توقع کرنا محض بے وقوفی ہے کیونکہ تم مجھے گالیاں دو گی۔ لعنت بھیجو گی اور کہو گی کہ کیوں بیٹھے بٹھائے ایک فتنہ اُٹھا دیا لیکن میں اس فتنے کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنا چاہتا ہوں، گو تمہارے لئے یہ فتنہ اسی دن ختم ہو گیا جس دن تمہاری شادی ہوئی۔ لیکن میں ابھی تک کنوارا ہوں۔ اور یہ فتنہ سو سو کر جاگ اُٹھتا ہے۔ اور مجھے بار بار پریشان کرتا ہے۔ یہ پریشانیاں میری نشوونما کے لئے اچھی نہیں۔ یہ کسک جو بار بار دل میں اٹھتی ہے اُسے ایک بار کیوں نہ نیست و نابود کر دوں۔ تمہاری محبت کا قصّہ میرے لئے اتنی ہی اہمیت رکھتا ہے جتنا کہ ایک سائنسداں کے لئے جراثیم کی کی ایک نئی سلائیڈ، جو اُس نے ابھی ابھی تیار کی اور خوردبین کے نیچے رکھ کر اسے نہایت انہماک سے دیکھ رہا ہو۔ گو تمہاری محبت کا قصّہ پُرانا ہو گیا اور اُس پر شادی کا رنگ چڑھ گیا۔ لیکن میرے پاس چند ایسی چیزیں ہیں جو مجھے بار بار تمہاری یاد دلاتی ہیں۔ تمہاری چند مسکراہٹیں۔ تمہارے خط۔ تمہارا ریشمی رومال جو تم نے دیوالی کے روز اپنی ننھی بنّو کے ہاتھ بطور تحفہ بھیجا تھا۔ گو تمہاری مسکراہٹوں کی جگہ

اب نئی مسکراہٹیں آ چکی ہیں۔ اُن کی جگہ اب اور دلفریب ہونٹوں نے لے لی ہے اور ان کا اثر میرے کمزور اعصاب پر زیادہ پڑتا ہے لیکن ان مسکراہٹوں میں بناوٹ ہے اور ان میں وہ شے لطیف نہیں جو تمہارے تبسم میں تھی۔ تمہارا تبسم بالکل البیلا۔ انوکھا اور نرالا تھا۔ شاید تم نے پہلی بار مسکرانا سیکھا تھا۔ اس مسکراہٹ میں ایک نیا پن تھا۔ جس میں آنے والے شباب کی صبح تھی۔ ایک انجان معصوم مسکراہٹ، بناوٹ سے کوسوں دور ایک بھیگی ہوئی صبح کی طرح شگفتہ تر و تازہ، شبنم کی طرح ٹھنڈی اور چمکدار شعلہ کی طرح سُرخ اور آگ لگانی والی ـــــــ و ـــــــ ر ـــــــ لیکن میں اب ان مسکراہٹوں کو بھول چکا ہوں۔ اب صرف ان کا تجزیہ کر سکتا ہوں۔ بالکل ایک ڈاکٹر کی طرح جو ایک مرض کو دوسرے مرض سے تشخیص کر لیتا ہے۔ اب بھی کوئی نہ کوئی میری طرف دیکھ کر مسکرا لیتا ہے اور یہ مسکراہٹ بجلی کے کوندے کی طرح مجھ پر حملہ کرتی ہے۔ حملہ نہایت شدید ہوتا ہے۔ سر تا پا ایک جھرجھری سی آ جاتی ہے۔ لیکن دوسرے لمحے میں مَیں سنبھل جاتا ہوں اور اس مسکراہٹ کا تجزیہ کرنے لگتا ہوں۔

ہم ایک مشینی دَور سے گذر رہے ہیں، ہم اس زمانے میں پیدا ہوئے جب پانی اور ہوا پر انسان نے قابو پا لیا ہے۔ ہم وقت، رفتار اور فاصلے پر حاوی ہو چکے ہیں۔ اب روحانی باتوں کا زمانہ نہیں۔ بالکل مادی چیزوں کا تذکرہ ہوتا ہے اور اس نئے مسکراہٹیں بھی مادی ہو گئی ہیں۔ اور جب کوئی میری طرف مسکرا کر دیکھتا ہے تو سوچنے لگتا ہوں کہ اس مسکراہٹ کا کیا مطلب ہے۔ اگر میں بھی مسکرا دوں تو مجھے کیا فائدہ پہنچے گا۔ اور اگر نہ مسکراؤں تو کیا نقصان ہوگا۔ آج کل ہر چیز نفع اور نقصان کے معیار پر پرکھی جاتی ہے، لیکن تمہاری مسکراہٹوں میں وہ بات نہ تھی، اگر ہوتی تو آج مجھے یوں نہ یاد آتیں تم اسی بات کو لو کہ صرف ایک مسکراہٹ پر کتنا جھگڑا اچل رہا ہے۔ آج کل تو بال کی کھال اتاری جاتی ہے۔ ہر چیز کا نفسیاتی پس منظر تلاش کرنا پڑتا ہے اور اس کا اثر اعصاب پر دیکھنا پڑتا ہے۔ اور پھر تجزیہ۔ اب یہ محبت نہیں ہے، محض سر دردی ہے، ایک بہانہ ہے اپنے آپ کو ختم کرنے کا، لیکن کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ شاید یہ اقدار پرانی اقدار سے اچھی ہیں، ہو سکتا ہے، اگر ہم ان اقدار کو اپنے آپ حاوی ہونے دیں، آہستہ آہستہ عمل پذیر ہونے دیں، تو شاید زمانہ بدل جائے اور ہم ایک نئی دنیا بسا لیں۔ لیکن مجھے اس قسم کے روحانی فلسفے سے کوئی سروکار نہیں۔ اور نہ ہی مجھے آج ان "S M S" پر بحث کرنی ہے کہ فلاں چیز اچھی ہے یا بُری ہے۔ میری مرکزِ نگاہ تو آج تم ہو۔ اور تمہیں بھول کر ان خشک بے جان فلسفوں پر بحث کرنا بے وقوفی ہے شاید مجھے کچھ دن اور زندہ رہنا ہے کیونکہ ایک جوتشی نے چند دن گزرے مجھے بتایا کہ میں جلد مر جاؤں گا۔ میں جوتشی کے چہرے کی طرف برسوں سے جھوٹ بولنے سے اس کے خدوخال مسخ ہو گئے تھے، چہرے پر ایک قسم کی نحوست برس رہی تھی۔ اور اس پتھریلی سڑک پر بیٹھے ہوئے نہ جانے اُسے کتنے برس ہو گئے تھے۔ اور کون جانتا ہے کہ اُس نے کتنوں کے ہات دیکھے۔ اور ان کی قسمت کا جائزہ لیا۔ کتنوں کو اُس نے امیر بنایا۔ کتنوں کو اُنھوں نے محبوب کو پانے کی اُمیدیں دلائیں۔ کتنوں کو اُس نے ناامیدی کے کنوئیں میں ڈھکیلا۔ اور کتنوں کو اُس نے اس ناامیدی کو سر کرنے کی ترکیبیں بتائیں لیکن سڑک پر گذرنے والے نے کبھی یہ سوچا، کہ وہ کیوں بیس سال سے اس خاک آلود سڑک پر بیٹھا ہوا ہے۔ جہاں گندگی اور غلاظت کے انبار لگے ہیں اور پیشاب کی بو سے بھیپھڑے جھلس جاتے ہیں۔ کیا ان بیس سالوں میں اُس کی قسمت کا ستارہ کبھی بلند نہ ہوا۔ کیا وہ ترکیبیں تجویزیں جو وہ دوسروں کو بتاتا تھا۔ کبھی اُس نے اپنے اُوپر نہیں آزمائیں۔ کیوں یہ پتھریلی زمین اُس کی بنجر زندگی کا ایک اہم جزو بن گئی۔ کیا یہ سڑک یوں ہی پتھریلی رہے گی۔ اور اُس پر چلنے والوں کا ستارہ کبھی بلند نہ ہوگا۔ میں نے چاہا کہ اس جوتشی کو کھری کھری سناؤں۔ اور اسے کہہ دوں کہ وہ کیوں جھوٹ بول کے اپنی رُوح کو گزند پہنچاتا رہا ہے۔ لیکن زندگی میں صرف رُوح ہی ہوتی تو میں اس سے یہ بات پوچھ لیتا۔ لیکن زندگی میں رُوح کے علاوہ پیٹ بھی ہے۔ جو رُوح سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ روحانی تسلی کو خیرباد کہا جا سکتا ہے۔ لیکن پیٹ کی بھوک کو خیرباد کہنا مشکل ہے۔

مگر تمہیں ان جوتشیوں اور راہ گیروں سے کیا واسطہ یہ لوگ تو ان انسانوں کے لئے وقف ہیں جنھیں اور کوئی کام نہیں ہوتا۔ تمہیں تو اس زندگی سے بہت سے کام لینے ہیں۔ اور ایک کام یہ بھی کرنا ہے کہ تمہیں میرا یہ بے سروپا خط بھی پڑھنا ہے۔ یہ ایک احمقانہ بات ہے کہ قصّہ تو محبت کا شروع ہوا اور میں پیٹ کا قصّہ لے بیٹھا۔ دراصل یہ دونوں چیزیں ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں۔ ان دونوں پر انسانی زندگی کا دارو مدار ہے۔ اگر انسانی زندگی کا دارومدار نہیں تو کم از کم میری زندگی کا انحصار انہی دو چیزوں پر ہے۔ اگر میں تمہیں اپنا نہ بنا سکا تو اس میں تمہاری محبت کا قصور نہیں۔

بلکہ ان حالات کا جن پر میں قابو نہ پا سکا۔ اور اگر حالات پر قابو پا لیتا تو آج شاید تم میری آغوش میں ہوتیں۔ اور مجھے یہ خط لکھنے کی زحمت نہ اٹھانی پڑتی

میں نے تمہیں پہلی بار اس وقت دیکھا۔ جب تم پانچویں جماعت میں پڑھتی تھیں۔ یوں ہی تم ایک دن میرے کمرے میں آ گئیں۔ یوں ہی نہیں بلکہ تمہیں ایک کام تھا۔ اس وقت گو تمہارا قد چھوٹا تھا۔ پتلا سا جسم اور خد و خال نہایت تیکھے۔ تمہارے خد و خال نے مجھے بالکل نہیں اکسایا۔ بلکہ اس بے باکی، اس بے تکلفی نے جو تم نے میرے ساتھ برتی۔ تم نے بغیر کسی جھجک کے کہہ دیا۔ کہ "بہن جی انگلش ریڈر مانگتی ہیں"۔ میں تمہاری صورت کا جائزہ لے رہا تھا۔ تم نے خود ہی الماری کھولی اور کتاب تلاش کرنے لگیں۔ میں تمہاری بے باکی پر اور بھی حیران ہوا۔ تمہارے سر سے دوپٹہ سرک گیا تھا اور تمہارے سیاہ بال میری نظروں میں الجھنے لگے۔ اس دن مجھے تمہارے بال اچھے لگے۔ کتنے سیاہ اور لمبے تھے۔ تم نے جلدی ہی کتاب ڈھونڈ لی۔ اور پھر چلی گئیں۔ یہ تھی پہلی ملاقات۔ کتنی بے جان بے لذت اور فروعی۔ جس کا ذکر کرنا نہایت فضول معلوم ہوتا ہے۔ صرف ایک لفظ میں اس ملاقات کے اثر کو بیان کیا جا سکتا ہے۔ اور وہ یہ کہ تم اس دن نہایت بے باک تھیں۔ اور تمہارے بال سیاہ اور لمبے تھے۔ اور دو سال کے بعد جب تم مجھے ملیں تو میں تمہیں پہچان نہ سکا۔ ان دو سال میں تم کیا سے کیا ہو گئی تھیں۔ اس دن مجھے تمہارے بال اچھے لگے تھے۔ آج تمہارا قد بیخ کی طرح لانبا اور نازک اندام میں نے سرو سے اس لئے تشبیہہ نہیں دی کہ یہ تشبیہہ پرانی ہو چکی اور زیادہ استعمال سے اس لفظ کی خوبصورتی مٹ چکی ہے۔ بیخ کا درخت تم نے نہیں دیکھا ہوگا، کیونکہ شہروں میں بیخ کے درخت نہیں ہوتے۔ سرو بہت ہوتے ہیں۔ اور میں تمہارے تصور کو بہت دور لے جانا چاہتا ہوں تاکہ شادی کے ماحول سے نکل کر تم چند ساعتوں کے لئے اس دنیا میں آ جاؤ جہاں میں سانس لے رہا ہوں تاکہ تم بھی ماضی کے واقعات سے میری طرح لطف اندوز ہو سکو۔ تم اگر اکیلی ہوتیں تو میں تمہیں زیادہ انہماک سے دیکھتا۔ اور ایک نقاش کی حیثیت سے تمہارے خد و خال کا جائزہ لیتا۔ لیکن تمہارے ساتھ ایک اور بھی لڑکی تھی جس کا حسن صبیح تمہاری موہنی صورت پر حاوی ہو رہا تھا۔ اس کا کھلا ہوا چہرہ غلافی آنکھیں۔ اور رس بھرے ہونٹ تمہارے لمبوترے چہرے اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں اور پتلے پتلے ہونٹوں کے مقابلے میں زیادہ اچھے لگے تم اس دن شرم و حیا سے سمٹی ہوئی تھیں اور وہ زیادہ بے باک نظر آ رہی تھیں۔ اسے اپنے جسمانی حسن کا احساس تھا۔ اسی لئے وہ اٹھلا اٹھلا کر چلتی تھی۔

اور اس کا ابھرا ہوا سینہ مجھے زیادہ پسند آیا۔ جس میں شباب کی ساری تازگی پنہاں تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جوانی ایک سیلِ آتشیں کی صورت میں ان بلندیوں کے نیچے کروٹیں لے رہی ہے۔ اور ایکا ایک اس دن مجھے معلوم ہوا کہ اس مشینی دور میں بھی عورت کا شباب زندہ ہے۔ ازل سے لے کر ابد تک اس شباب میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ انسانوں کی حرکات، سکنات، ان کا نصب العین ان کی معاشرت (ان کی اخلاقی سیاسی قدریں بدلتی رہی ہیں۔ لیکن عورت کا شباب اسی شدت سے محسوس کیا جاتا ہے۔ صدیوں کا آہنی چکر شباب کی رعنائیوں لطافتوں اور کیفیتوں کو نہیں کچل سکا۔ اب بھی بیسویں صدی میں ایک مرد ایک عورت کے لئے پاگل ہو سکتا ہے ایک عورت کے لئے تخت و تاج چھوڑ سکتا ہے۔

لیکن تمہاری سہیلی کو اس بات کا احساس نہ تھا کہ اس کا حسن کتنے تباہ کن نتائج پیدا کر سکتا ہے۔ وہ ایسے چلتی تھی گویا اسے لوگوں کی کوئی خاص پرواہ نہ تھی۔ اگر لوگوں کی نظریں اس کے سینے پر پڑتی تھیں تو پڑتی رہیں۔ اور اگر اس کا کرتا ضرورت سے زیادہ ابھرا ہوا ہے تو اس میں اس کا کوئی قصور نہیں اور تم ——— تمہارا قد لمبا تھا۔ جسم پتلا سا ترناری کی بیل کی طرح لچکتا ہوا۔ اور پھر تم کچھ حد سے زیادہ شرمیلی ہو گئی تھیں۔ تمہارے چلنے کا انداز نہایت ہی بھدّا تھا! گردن نیچے کر کے کبھی کبھی مڑ کر دیکھنا کبھی چھپ کر کنکھیوں سے۔ کبھی ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے تو کبھی لب جامد ہیں۔ کبھی تمہارا سر ہلتا تھا تو کبھی ہات اور اپنی سہیلی کے ساتھ کھسر پھسر کرنا اور اس کے ساتھ لپٹ لپٹ کے چلنا مجھے اچھا معلوم نہیں ہوا۔ اور جب تم گلی کے موڑ پر پہنچیں تو تم نے مجھے ہاتھ سے نمستے کی۔ مجھے امید تھی کہ تم اس طرح کرو گی۔ تم ایسی لڑکیاں نہایت ہی جذباتی ہوتی ہیں۔ تم پوچھ سکتی ہو کہ مجھے کیونکر معلوم ہوا کہ تم ایسا ہی کرو گی۔ محض تجربے کی بنا پر مجھے معلوم ہے۔ جو لڑکی زیادہ شرمیلی اور خاموش ہوتی ہے وہ اکثر تصور کی دنیا میں ڈوبی رہتی ہے۔ اسے خود نمائی کی زیادہ ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کے خیالات زیادہ حسین اور رنگین ہوتے ہیں لیکن جو لڑکی زیادہ

ہنستی ہے، جیسے اپنے حسن کا ضرورت سے زیادہ احساس ہوتا ہے وہ جذباتی کم اور کاروباری زیادہ ہوتی ہے۔ ایسی لڑکیاں اشارے کم کیا کرتی ہیں، خط کم لکھتی ہیں۔ شاید وہ سمجھ جاتی ہیں کہ آخر انھیں ایک دن شادی کرنا ہے تو پھر ان جھنجھٹوں سے کیا حاصل۔ ان اشاروں اور خطوں سے کیا ملے گا۔ چھپ چھپ کر ملنا، مڑ مڑ کر دیکھنا۔ نگاہوں سے مسکرانا۔ ایسی باتیں انھیں فضول لگتی ہیں۔ وہ جی بھر کے ہنس لیتی ہیں وہ مردوں سے کم ڈرتی ہیں اور شرم ڈر اور جھجک کے غلاف کی پناہ نہیں لیتیں۔ ان کی جنس کا اظہار ان کی خود نمائی میں ہوتا ہے اور شاید یہ طریقہ دوسرے طریقوں سے بہتر ہے۔ لو ———— میں پھر نفسیاتی چکر میں اُلجھ گیا۔ مجھے اس سے کیا کہ فلاں عورت جذباتی ہے فلاں نمائش پرست ہے یا فلاں عورت ایسی ہو سکتی ہے یا ہو جائے گی۔ ان باتوں کے لئے میرے پاس وقت نہیں۔ تو ہاں اس ملاقات کے بعد تمہاری عادات بدل گئیں۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے تم نے اپنے آپ کو اور زیادہ سکیڑ لیا ہے۔ بالکل لاجونتی کی بیل کے پتوں کی طرح جو ذرا سے لمس سے سکڑ جاتے ہیں۔ اگرچہ تمہارا قد لمبا ہوتا جا رہا تھا اور تمہاری آنکھوں میں ایک نئی چمک پیدا ہو رہی تھی لیکن تم ضرورت سے زیادہ گھٹی گھٹی نظر آنے لگیں۔ ایسا معلوم ہوتا کہ تمہارے ذہن پر ایک بوجھ سا ہے جس کا احساس تمہیں نہایت شدت سے ہو رہا ہے۔ مجھے کیا معلوم کہ گھر والوں سے تمہارا کیا رویہ تھا۔ شاید تم گھر میں ہنستی ہوگی۔ کھل کر باتیں کرتی ہوگی لیکن میں کامل وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اس ملاقات نے بعد جب بھی تم گلی میں ملیں تو تم مجھے دیکھ کر گھبرا گئیں اور پھر مجھے دیکھ کر بھاگ گئیں اور ایک دن میں نے تمہارا تعاقب بھی کیا کہ معلوم کروں کہ تم مجھے دیکھ کر کیوں بھاگتی ہو۔ لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ تم نے دو تین بار اس طرح کیا اور میں بہت سر پٹایا کہ آخر یہ کیا ماجرا ہے۔ تمہاری یہ حرکتیں کیا معنی رکھتی ہیں۔ ان چند مہینوں میں کیا کچھ ہو گیا کہ تم مجھے دیکھ کر ٹھٹھک جاتیں یا پھر جلدی سے بھاگ جاتی ہو اور پھر ایک دن عقدہ کھلا۔ جب ماں نے مجھ سے کہا کہ بڑے چودھری کے گھر سے سگائی کے لئے کہہ رہے ہیں۔ "تمہاری کیا رائے ہے"۔ پھر میں سمجھ گیا کہ تم کیوں جھینپ جاتی ہو اور مجھے دیکھ کر گھبرا جاتی ہو اور میری نظروں سے فوراً اوجھل ہو جاتی ہو۔ تمہارے حسنِ تخیل کی میں داد دیتا ہوں کہ منٹوں ہی منٹوں میں تم مجھے کہاں سے کہاں لے گئیں۔ اماں نے پھر پوچھا کہ "تمہاری کیا رائے ہے" ان کا مطلب تھا کہ میں ہاں کر دوں۔ میں اُن دنوں بی اے فیل ہو چکا تھا اور اپنے چچا کی دوکان پر بیٹھا کرتا تھا۔ میرے چچا شہر کے مشہور ڈاکٹر تھے اور ان کی یہ رائے تھی کہ میں بھی اس دوکان پر کام کروں اور اسی طرح ڈاکٹری سیکھ لوں، اور پھر اس شہر میں ڈاکٹری کی دوکان کھول لوں۔ تجویز کتنی معقول تھی۔ لیکن مجھے بالکل ناپسند تھی۔ اصل بات یہ ہے کہ مجھے عطائیوں سے نفرت ہے۔ گو میں یہ بات جانتا ہوں کہ اگر میں ڈاکٹری سیکھ لیتا تو اس وقت تک کافی روپے کمائے ہوتے۔ ڈاکٹر گردھاری لال اور ڈاکٹر تارا سنگھ دونوں نے میرے سامنے ہی پریکٹس شروع کی۔ دونوں نے ڈاکٹری کا امتحان کہیں سے پاس نہ کیا تھا لیکن جاہل لوگوں کو جاہل تر بنانا کوئی مشکل کام نہیں۔ چند دوائیں ایک چھاتی دیکھنے کا آلہ اور تھرمامیٹر خرید کر انسان ایک مکمل ڈاکٹر بن جاتا ہے۔ اور اس کے بعد وہ مریضوں کو جہنم میں بھیجے یا جنت میں۔ لیکن مجھے یہ طریقے پسند نہیں۔ میں ہر چیز کو مکمل طور پر دیکھنا چاہتا ہوں اس لئے میں نے ڈاکٹر بننے کا خیال ترک کر دیا۔ لیکن تمہارے والد کا اصرار بڑھتا گیا۔ اور وہ سگائی پر زور دینے لگے۔ تمہارے پیغام بھی مجھے ملتے رہتے تھے اور جو کچھ تم نے اپنے رشتہ دار ہرنس سے کہلوا دیا۔ وہ مجھے یاد ہے "ان سے کہو کہ وہ سگائی کریں۔ میں اس بے باکی کی داد دیتا ہوں کہ تم نے مجھے ہمیشہ کے لئے منتخب کر لیا اور تم نے ہر ممکن طریقے سے کوشش کی کہ سگائی ہو جائے اور آخر یہ باتیں شہر میں پھیل گئیں اور شہریوں کی زبان پر چرچا ہونے لگا۔ اس چھوٹے شہر میں تمہارے والد کا کافی رسوخ تھا۔ اس لئے اس بات نے کافی اہمیت اختیار کر لی اور اکثر دوستوں نے مجھ سے کہا۔ بھئی سنا ہے تمہاری سگائی ہو گئی ہے۔ بھئی خوب ہے اچھی نبھے گی۔" میرے دوستوں نے تمہیں اکثر دیکھا ہوگا اور تمہارے حسن کی بے باکیوں نے انھیں پریشان بھی کیا ہوگا۔ اُن کے تعریفی فقرے جو وہ ہم دونوں پر کستے تھے۔ اُن میں ان کی جنسی بھوک کا وحشیانہ اظہار تھا۔ اب تم نے ہمارے گھر آنا بند کر دیا۔ کیونکہ ماں نے ہاں کر دی تھی۔ اور تمہیں اس بات کا پورا یقین ہو گیا تھا کہ اب تمہاری شادی اس گھر میں ہوگی۔ تمہارے پیغام میرے پاس پہنچتے تھے۔ گھر کا دروازہ ذرا اونچا کرا لو۔ میں روز بروز لمبی ہوتی جا رہی ہوں۔"

"پرسوں آپ نہایت ہی گندے کپڑے پہنے ہوئے تھے" "کیا شہر میں نائی کوئی نہیں" آپ نے میری طرف دیکھا نہیں اور میرے قریب سے گذر گئے" میں اکثر چھ بجے شام کو گلی والے درخت کے قریب کھڑی ہوتی ہوں۔ اور اپنی سہیلیوں سے باتیں کرتی ہوں۔ تم بھی اپنے دوستوں کے ساتھ وہاں سے گذر جایا کرو۔ اور اسی طرح کئی اور احکام جو میں کبھی نہ بجا لا سکا۔ اس کی بہت سی وجوہ ہیں۔ مجھے کچھ اس قسم کے عشق سے نفرت ہو گئی ہے گو میں سمجھتا ہوں کہ تمہارے لئے یہ بات نئی تھی بالکل نئی کیونکہ تمہارے جسم کی تشکیل یہ ظاہر کر رہی تھی کہ یہ جوش بالکل نیا ہے۔ یہ اُبال شاید پہلا اُبال ہے اسکی اُٹھان بہی نرالی ہوتی ہے اور انسان اس حالت میں اتنا بے قابو ہو جاتا ہے کہ اُسے اُونچ نیچ کی پرواہ نہیں رہتی۔ اگر میری بھی اوّلین محبت ہوتی تو شاید میں بھی یہی کرتا اور ہم دونوں نہ جانے کیا کر بیٹھتے۔ لیکن میں اس سے پہلے ایک عورت سے محبت کر چکا تھا اور وہ بھی ایک شادی شدہ عورت سے۔ اگر چہ یہ پڑھ کر ہنسو گی کہ ایک مجرد انسان ایک شادی شدہ عورت سے کیونکر محبت کر سکتا ہے۔ تمہاری طرح میرے دوست بھی مجھ پر ہنستے ہیں۔ ہندوستان میں محبت کی قدریں ابھی پرانی ہیں۔ یہاں ایک شادی شدہ عورت کی طرف دیکھنا ایک فعل بد سمجھا جاتا ہے۔ سماج کہتا ہے۔ وہ عورت تو دوسرے کی ہو چکی' اب تمہارا اُس پر کیا حق ہے۔ اب تم اس کی طرف کیوں دیکھتے ہو۔ شادی شدہ عورت کی شخصیت تو ایک شخص کی ملکیت ہو چکی۔ اب تم کیوں جھک مارنے پر تُلے ہوئے ہو۔ لیکن یہ سچ ہے کہ مجھے اس عورت سے محبّت تھی اور اُس کے بعد آج تک کسی اور سے محبت نہ کر سکا۔ اگر تم اُس عورت کو دیکھتیں تو اس عورت کو دیکھ کر مُنہ پھیر لیتیں۔ وہ خوبصورت نہ تھی۔ لیکن میں نے اُس سے جی بھر کر محبت کر لی یہ میرے شباب کا اوّلین عکس تھا جس شدت سے میں نے اس عورت کو چاہا۔ وہ گرمی وہ تڑپ وہ اضطراب میرے جسم میری رُوح میں پھر کبھی نہ آ سکا۔ یہ ایک لمبی سرگذشت ہے۔ جس کا انجام نہایت بھیانک ہے۔ اس عورت کے لئے میں بہت بدنام ہوا اور اُسے بھی میرے لئے کافی ذلت اُٹھانی پڑی۔ پانچ سال ہوئے وہ مر گئی۔ لیکن اُس کی یاد ابھی تک زندہ ہے' اس کی محبت کی تپش باقی ہے جس سے میں اکثر بے چین ہو جاتا ہوں۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ جس طرح تم اپنے آپ کو میرے لئے پریشان کرتی رہی ہو اس طرح میں اپنے آپ کو اس عورت کو پانے کے لئے پریشان کرتا رہا۔ میں تو خیر بامُراد رہا۔ مگر تم میرے ہاتھوں کے لمس سے بیگانہ رہیں۔ لیکن محبت اور شادی میں فرق ہے۔ میں اس عورت سے محبت کر سکتا تھا شادی نہیں۔ اور تمہارے ساتھ میں شادی کر سکتا تھا محبت نہیں۔ میں نے کوشش کی میں تم سے محبّت کر سکوں۔ لیکن ایسا نہ کر سکا۔ اکثر تمہارے خدوخال میری آنکھوں کے سامنے آ جاتے اور میں نہایت باریکی سے اُن کا تجزیہ کرتا اور اُن میں طرح طرح کے نقص نکالتا۔ اور یہ سوچتا کہ کیا ہی اچھا ہوتا اگر تمہاری آنکھیں بڑی بڑی ہوتیں اور تمہاری ٹھوڑی ضرورت سے زیادہ لمبی نہ ہوتی اور اگر تمہارا نچلا ہونٹ ذرا موٹا ہوتا تو زیادہ خوبصورت ہوتا۔ اور اگر تمہاری آنکھوں کی پلکیں زیادہ گھنی ہوتیں تو تمہاری آنکھوں کی چمک زیادہ نمایاں ہو جاتی اور پھر تم نہایت بے ڈھنگے پن سے لمبی ہوتی جا رہی تھیں گردن اور کمر میں کوئی تناسب نہ تھا۔ اگر کمر پتلی تھی تو کولہے متناسب نہ تھے۔ اور باقی جسم پر بھی اتنا گوشت نہ تھا کہ تمہارے اعضاء زیادہ متناسب ہو جاتے۔ اس قسم کے گھناؤنے خیال جو شرافت سے قطعاً کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ مجھے ستایا کرتے۔ اس عمل کو روکنا میرے بس میں نہ تھا۔ لیکن ان خامیوں کے باوجود تم میں جاذبیت تھی۔ اتنی جاذبیت کہ میں تم سے شادی کر سکتا تھا۔ لیکن محبت نہیں۔ محبت کے لئے کچھ اور چاہیئے۔ ایک خاص قسم کا حُسن — ایک قسم کا — کیا کہوں —!

تم تو مجھے پسند تھیں۔ صرف پسند۔ میں تمہیں پسند کر سکتا تھا۔ اور تمہیں پسند کر سکتا ہوں۔ اور شادی بھی کر لیتا۔ اگر حالات اجازت دیتے۔ ہاں حالات — شاید تم ہنس دو۔ اور کہو کہ ہندوستان میں ہر انسان شادی کر لیتا ہے خواہ اُس کے حالات اچھے ہوں یا بُرے۔ شادی تو اُن کے لئے اتنی ہی ضروری ہے جتنی کہ موت۔ لیکن زندگی میں موت گوارا نہیں کی جاتی۔ میرے تمام دوستوں نے شادیاں کر لی ہیں۔ گو اُن کے اقتصادی حالات مجھ سے بہتر نہ تھے۔ تو کیا میں شادی نہ کر سکتا تھا۔ اب تو میں نے بی۔ اے بھی کر لیا تھا۔ اور اگر چاہتا تو کسی بنک یا گورنمنٹ کے کسی محکمے میں ملازم ہو جاتا۔ اور تمہارے دل کی آرزوؤں کو پورا کر دیتا۔ لیکن میں ان چیزوں سے بہت گھبراتا ہوں' تمہارے والد نے مجھے سگرٹوں کی ایجنسی لینے کے لئے کہا تھا' کہنے لگے کہ سگریٹوں کی ایجنسی میں بہت فائدہ ہے۔ گورنمنٹ کی نوکری میں کیا دھرا ہے۔ یہ ایجنسی لے لو۔ اور کام کرتے جاؤ۔ ساری دنیا

سگریٹ سستی ہے اور خاص کر اس شہر کے لوگ تو سگریٹ اور نسوار کا خوب استعمال کرتے ہیں۔ اور اگر ایجنسی کے ساتھ نسوار کا بھی ٹھیکہ لے لو تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔ چند ہی برس میں میری طرح ایک عالیشان مکان بنوا لو گے۔ اور لڑکوں اور بچوں کے درمیان ایک باعزت انسان بن جاؤ گے۔ سگریٹ کی ایجنسی اور ——— نسوار ——— نسوار سے مجھے نفرت ہے۔ لیکن میں سگریٹ پیتا ہوں اور جب کبھی حد سے زیادہ مغموم ہو جاتا ہوں تو کمرے میں بیٹھ کر سگریٹ کا دھواں فضا میں بکھیرتا رہتا ہوں۔ فضا میں دُھواں پھیلتا رہتا ہے۔ بکھرتا رہتا ہے اور میرے پریشان آوارہ خیالات دھوئیں کی سفید سفید لہروں میں تحلیل ہوتے رہتے ہیں۔ کچھ اس طرح مجھے تسکین ہو جاتی ہے۔ یوں ہی چھوٹی سی فردمی باتوں سے تسکین ہو جاتی ہے۔ نہ جانے کیوں۔ لیکن ایجنسی لینے سے تو رہا ——— نسوار ——— توبہ توبہ ——— مکان بنانے کی خواہش نہیں اور باعزت انسان بننا میں نے کبھی قبول نہیں کیا۔ ان دنوں میں خود بھی نہیں جانتا تھا کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔ اور کیا کروں گا۔ ایک بے کیف سی آوارگی۔ میرے دل و دماغ میں بسی رہتی، کوئی چیز پسند نہ آتی تھی۔ دوکان پر کام کرتے کرتے تنگ آگیا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ شہر چھوڑ کر بھاگ جاؤں۔ آخر میں کیا چاہتا ہوں اس کے متعلق میں سوچتا رہتا۔ کاش میں کہیں کلرک ہی بھرتی ہو گیا ہوتا اور ساٹھ روپے ماہوار لے کر تم سے شادی کر لی ہوتی۔ اور ان چھ سالوں میں کم از کم چھ بچے پیدا کئے ہوتے۔ شاید مجھے تسکین ہوتی اور لوگوں سے کہہ سکتا کہ میں نے بھی دنیا میں کچھ کام کیا ہے۔ آخر میں اپنے دوستوں کے نقش قدم پر کیوں نہ چلوں۔ اگر انھیں حق حاصل ہے کہ وہ ہر سال ہندوستان کی آبادی میں ایک فرد کا بغیر سوچے سمجھے اضافہ کر دیں تو میں کیوں دریا کے کنارے کھڑا رہوں۔ کیوں نہ اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھوؤں۔ لیکن میں ایسا نہ کر سکا۔ اور میں اکثر سوچتا رہتا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ میں کیوں پریشان ہوں اور آہستہ آہستہ مجھ پر یہ بات آشکار ہونے لگی کہ مجھے کلرکی سے نفرت ہے۔ مجھے ان ساٹھ روپوں سے نفرت ہے۔ مجھے ان بچوں سے نفرت ہے۔ مجھے انسانوں کی کمینگی سے نفرت ہے۔ یہ کیوں ہر طرف غلاظت ہی غلاظت نظر آتی ہے۔ کیوں ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہوتا ہے چھتوں پر اندھیرا۔ برتنوں پر اندھیرا۔ چولھے پر اندھیرا۔ روٹیوں پر اندھیرا اور آہستہ آہستہ یہ اندھیرا بڑھتا جاتا ہے۔ کائنات کے ذرے ذرے پر چھا جاتا ہے۔ انسان کے ریشے ریشے میں سمائے جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ مجھے اس نظام سے نفرت ہونے لگی۔ جہاں اس قسم کا اندھیرا پھیلا رہتا ہے۔ کیوں نہ میں اس اندھیرے کو چیر دوں۔ اس اندھیرے کی قبا کو پھاڑ دوں، تاکہ روشنی کا منبع اعظم پھوٹ پڑے کم از کم ان چھوٹے مکانوں میں روشنی تو آجائے۔ اِن چھوٹے کمروں میں جہاں ایک جگہ میاں بیوی اور بچے رہتے ہیں چمک آجائے۔ جہاں مہینے میں ساٹھ روپے ملتے ہیں۔ اور کھانے والے افراد آٹھ ہوتے ہیں۔ جہاں شادی کے بعد عورتیں جلد بوڑھی ہو جاتی ہیں۔ جہاں ان کی آنکھوں کی چمک بہت جلد غائب ہو جاتی ہے اور اُن کی ملائم مخروطی انگلیاں برتن صاف کرتے کرتے ٹیڑھی ٹیڑھی ہو جاتی ہیں۔ جہاں ان کے چہرے کی ہڈیاں باہر نکل آتی ہیں اور ہڈیوں پر چمڑا اتنا سخت اور کھردرا ہو جاتا ہے کہ دیکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ جہاں ان کے گالوں کے گڑھے اتنے گہرے ہو جاتے ہیں کہ اُن میں جنسی بھوک کسمسی ہوئی چمگادڑوں کی طرح کراہتی رہتی ہے۔ وہ سیاہ بال جن پر ان کا خاوند جان چھڑکتا تھا۔ آج بوٹ پالش کے برش کی طرح خشک اور کھردرے ہو گئے ہیں۔ آنکھوں کی تابانی کہاں گئی۔ وہ میٹھی شہد جیسی آواز کہاں غائب ہو گئی۔ اور انسان کیوں گنوار اور حیوان بن جاتے ہیں۔ بے رُوح۔ صرف چلتی پھرتی ٹانگیں۔ اور اُن پر کپڑوں کے خول اور اندر کچھ بھی نہیں ——— دکھائی نہ دینے والا انسان۔ اور آہستہ آہستہ یہ حقیقتیں مجھ پر بار گراں ہو گئیں۔ دل میں اس نظام کے خلاف ایک جذبہ بھڑکنے لگا لیکن اس دوران میں چند لمحے ایسے بھی آئے کہ میں اپنے آپ کو کوسنے لگا۔ تمہاری یاد کا جال آہستہ آہستہ مضبوط ہو رہا تھا۔ اور اِس شہر میں رہتے ہوئے یہ ناممکن تھا کہ میں تمہیں بھول جاتا یا نظر انداز کر دیتا۔ تمہاری باتیں اکثر مجھ تک پہنچتیں۔ تم اکثر مجھے کہیں نہ کہیں مل جاتیں۔ کبھی کبھی اپنے نوکر کے ساتھ۔ کبھی سہیلیوں کے ساتھ۔ اور کبھی اماں کے ساتھ۔ تمہاری آنکھوں کا حزن و ملال تمہاری نگاہوں کی ذرا سی جنبش مجھے کبھی کبھی پریشان کر دیتی۔ اور پھر تمہارے والد نے کچھ عرصے سے مختلف تحائف ہمارے گھر بھیجنا شروع کر دیئے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ سگائی کی بات پکی ہو گئی لیکن میں جانتا تھا کہ یہ کام ہونے والا نہیں۔ گھر والے اکثر مجھے نوکری کے لئے مجبور کرتے، لیکن میں گھر والوں کو یہ کہہ کر ٹال دیتا کہ نوکری ابھی ملتی نہیں اور اس طرح آنے والے خطرے کو ٹالتا رہا۔ آخر تمہارے والدین نے

تنگ آکر مجھ سے پوچھ ہی لیا — کہ میری کیا رائے ہے؟ کب تک شادی کرنے کا ارادہ ہے:" پہلے پہل میں نے سوچا کہ میں انھیں گول مول جواب دے دوں۔ کیونکہ میں تم سے رشتہ ناطہ توڑنا نہ چاہتا تھا۔ کون چاہتا ہے کہ اس سنہری جال کو توڑ دیا جائے جس میں آرزوؤں تمناؤں اور خواہشوں کا تانا بانا لگا رہتا ہے۔ کم از کم میں تو نہیں چاہتا تھا کہ تم میرا کورا جواب سُن کر مجھ سے رُوٹھ جاؤ۔ اور میں تمہاری مسکراہٹوں سے اتنی جلدی محروم ہو جاؤں، تمہاری نگاہوں کی نوازش سے محظوظ نہ ہو سکوں۔ تمہاری باتیں اکثر مجھ تک پہنچ جاتی تھیں۔ جن سے میرے جذبۂ مردانگی کو کچھ تقویت ملتی تھی۔ لیکن میں یہ بھی نہ چاہتا تھا کہ تمہارے والدین کو ہمیشہ کے لئے تاریکی میں رکھوں۔ اگر میں شادی کرنا نہیں چاہتا تو کم از کم ہندوستان میں اور نوجوان موجود ہیں۔ جو تمہارے لبوں کو چومنے کے لئے بے قرار ہیں۔ اس لئے میں نے تمہارے والد سے صاف صاف کہہ دیا کہ جب تک میں اپنے لئے کوئی اچھا سا کام تلاش نہ کر لوں، شادی نہیں کروں گا۔ تمہارے والد نے کہا۔ شادی کر لو اور شادی کے بعد لڑکی ہمارے گھر رہے گی۔ اور جب تک تم کسی اچھے عہدے پر فائز نہیں ہوتے لڑکی کے اخراجات کے ہم ذمہ دار ہوں گے۔ تجویز کتنی معقول تھی کہ خرچ تو تمہارے والد کریں اور بچے میں پیدا کرتا جاؤں۔ لیکن یہ کب تک ہو سکتا تھا۔ آخر ایک نہ ایک دن مجھے اپنے بچوں کا باعزت باپ بننا پڑے گا۔ میرا ضمیر اس ذلت کو برداشت نہ کر سکا۔ کیونکہ اس نظام میں ایک اچھی جگہ حاصل کرنا ایک مہم سر کرنا ہے۔ اور چونکہ میں ایک متوسط طبقے سے تعلق رکھتا ہوں اور طبقاتی کشمکش کی بہیمیت اور شقاوت ہر روز بڑھتی جا رہی ہے ہر شخص ایک دوسرے کا گلا گھونٹنے کے لئے تیار ہے اور اگر متوسط طبقے کا کوئی فرد اس خلیج کو پاٹنا چاہے یا یہ کوشش ہی کرے تو اُس کے ساتھ ہی اس کی ٹانگ کھینچتے ہیں اور عرشی طبقے والے لوگ کب یہ گوارا کرتے ہیں کہ کوئی زمینی آدمی ان کے محلوں میں قدم رکھ سکے۔ اور اس کرب انگیز کشمکش میں وہ انسان نہیں رہتا۔ ایک بے رُوح بے جان لوتھ بن جاتا ہے اور مجھے تو اس روشنی کے مینار کو پانے کے لئے کافی جدوجہد کرنی تھی۔ میرے پاس کسی بڑے آدمی کی سفارش نہ تھی۔ رشوت اور تحفوں کے لئے اتنا روپیہ نہ تھا اور انگلینڈ سے کوئی ڈگری بھی لے کر نہ آیا تھا۔ کوئی رشتہ دار کسی اعلیٰ عہدے پر فائز نہ تھا۔ تو ان حالات میں مَیں کیسے ایک اچھی جگہ حاصل کر سکتا تھا۔ صرف کلرکی اپنا منہ کھول رہی تھی اور وہ بھی ساٹھ روپوں کی کلرکی جو آج کل جنگ کے زمانے میں ٹکے پر بکنے لگی ہے۔ اور پھر ہر پڑھا لکھا نوجوان کلرک بن کر اپنے آپ کو افلاطون سمجھتا ہے اور بچے پیدا کرنے سے ذرا نہیں جھجھکتا۔ اور کبھی کبھی تمہاری سنہری آرزوؤں کا جال میرے قریب آجاتا تو میرے صبر کے بند ٹوٹ جاتے۔ اور میں سوچتا کہ مجھے کیا غرض ہے کہ میں اپنے آپ کو یوں برباد کر دوں۔ ازل سے لیکر ابد تک یہ اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ اور آج تک کوئی شخص اس اندھیرے کو دُور نہ کر سکا بلکہ یہ اندھیرا دن دن زیادہ گہرا ہوتا گیا۔ اور میں اس روشنی کے مینار کو پانے کی بے سود کوشش کر رہا ہوں کیوں نہ میں اپنے آپ کو اس اندھیرے کے وسیع اور بے پایاں سمندر میں پھینک دوں اور ہمیشہ کے لئے اس میں غرق ہو جاؤں اور پھر اس اندھیرے میں تمہارے ہونٹ چمکنے لگتے۔ تمہارے گال تمتانے لگتے۔ تمہارے لانبے بال سر سے لیکر پاؤں تک چھا جاتے۔ تمہاری آنکھوں میں سنہری آرزوئیں ناچنے لگتیں۔ اور میں تمہیں پکڑنے کی کوشش کرتا تاکہ تمہارے سیاہ بالوں میں اپنے آپ کو چھپا لوں۔ اور تمہاری آتشیں خواہشیں مجھے چاروں طرف سے گھیر لیں۔ اور ہم دونوں اس اندھیرے سمندر میں باقی انسانوں کی طرح لڑھکتے رہیں۔ کم از کم تمہارے ہونٹوں کا لمس مجھے ہمیشہ کے لئے اُن اقتصادی جھنجھٹوں سے آزاد کر دے گا۔ لیکن میں نے سگڑوں کی ایجنسی لے کر شادی کرنا گوارا نہ کیا — جاہل!

شاید مجھے عام انسانوں کی طرح زندگی گزارنے کی کبھی آرزو ہوئی، بلکہ مجھے ان لوگوں سے نفرت سی ہو گئی ہے اور اس طرز بود و ماند سے اس معاشرت سے۔ اس تہذیب و تمدن سے میں روشنی کے مینار کو پانا چاہتا ہوں۔ اور اس کی نورانی کرنوں کو دنیا میں بکھیرنا چاہتا ہوں تاکہ اس پھیلے ہوئے بے پایاں اندھیرے میں کچھ کمی ہو جائے۔ لیکن آج تک روشنی کے مینار کو کون پا سکا ہے۔ یہ سرمایہ دار قوتیں ہمیں اس روشنی کے مینار کے نزدیک پھٹکنے نہیں دیتیں۔ میں یوں ہی اس بحث میں پڑ گیا۔ جیسے لوگ سرمایہ دارانہ نظام کو نہیں سمجھتے۔ ان باتوں سے

کچھ بنتا ہے ناحق میں اپنے دماغ کو پریشان کر رہا ہوں۔ اب تم شوہر والی ہو۔ ایک بچے کی ماں ہو۔ اور تمہارا گھر ہے۔ اور معلوم نہیں تم کیا ہو۔ اور کیا ہو جاؤ گی۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارا شوہر لوہے کا بیوپار کرتا ہے۔ آج کل لوہے کی اشد ضرورت ہے اور لوہے کی قیمت تو سونے کے برابر ہے۔ آجکل تمہاری چاندی ہے۔ کہاں سرمایہ دارانہ نظام کی باتیں اور کہاں لوہا اور سونا۔ دراصل ہماری ذہنیت بھی سرمایہ دارانہ ہو گئی ہے۔ ہم خطوں میں بھی ان چیزوں کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ اس کے بعد کیا ہوا۔ تم جانتی بھی ہو۔ تم نے میرا انتظار کیا۔ ایک سال۔ دو سال۔ دو سال۔ تین سال۔ شاید کہیں نوکری مل جائے۔ لیکن میں نوکری کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے نوکری کہاں ملتی۔ آخر تمہارے والدین نے تنگ آکر تمہارے لئے بھر ور ڈھونڈھنا شروع کر دیا۔ اور میں اس دوران میں تمہارے طعنے سنتا رہا۔ اور آخر تم کب تک میرا انتظار کرتیں۔ ہر مرد ایک آسودہ زندگی گذارنا چاہتا ہے تو پھر تمہیں حق تھا کہ تم اپنے رویے کو بدل دیتیں۔ اور اپنی زندگی ایک نئے قالب میں ڈھالتیں۔ اور پھر ایک دن تمہاری بارات آگئی۔ میں اس دن اسی شہر میں تھا۔ تمہارے والد نے مجھے مدعو نہ کیا۔ شاید یہ ناراضگی کا اظہار تھا۔ کہ میں نے کیوں شہر کے ایک بڑے آدمی کی بات نہ رکھی۔ اور ناطہ توڑ دیا۔ تم جس طرح مجھے بھول گئیں میں اس کی تعریف کرتا ہوں اور جس خوشی سے تم نے اپنے خاوند کے گلے میں ہار ڈالا اسکی بھی داد دیتا ہوں۔ تمہاری سہیلیوں نے مجھے بتایا کہ تم بہت خوش تھیں۔ یہ باتیں سن کر مجھ پر صدمہ ہوا لیکن تمہاری اس نئی روش نے مجھے ذہنی تقویت بھی دی۔ زندگی کے ایک نئے زاویے سے آگاہ کر دیا۔

تم نے میری یاد کو دل و دماغ سے اس طرح خارج کر دیا جس طرح ایک نئی دلہن شادی کے چند مہینوں بعد اپنا لال جوڑا اتار پھینکتی ہے مجھے معلوم ہے تم ہنستی کھیلتی اپنے خاوند کے ساتھ چلی گئیں۔ تم مجھے بیر پور کے اڈے پر ملیں۔ جب تم گونے کے بعد واپس آرہی تھیں تمہارا خاوند تمہارے ساتھ تھا۔ وہ کچھ وجیہہ نہ تھا یہ محسوس کر کے مجھے خوشی ہوئی۔ کم از کم وہ مجھ سے زیادہ خوش شکل نہ تھا بلکہ میں تو نہایت فراخدلی سے اسے بھدّا کہہ سکتا ہوں۔ لیکن تم خوش تھیں تم نے ایک نہایت قیمتی ساڑی پہن رکھی تھی۔ جس کا روپہلی کنارہ تمہارے سیاہ بالوں کو چوم رہا تھا۔ تمہارے چہرے کا صرف ایک حصہ مجھے دکھائی دے رہا تھا اس لئے میں تمہاری خوشی اور انبساط کا پورا اندازہ نہ کر سکا۔ تم نے مجھے دیکھ کر آنکھیں پھیر لیں اور جوار کے لہلہاتے کھیتوں کی طرف دیکھنے لگیں۔ اور پھر لاری چل پڑی۔ تم نے شادی کر کے اس گھریلو زندگی کو اچھی طرح دیکھ لیا ہوگا۔ یہ زندگی کوئی اتنی اچھی نہیں۔ اس میں کوئی خاص جاذبیت نہیں۔ ساس اور نند کے جھگڑے۔ ساس اور بہو کے جھگڑے خاوند اور بیوی کے جھگڑے، اور پھر اقتصادی جھگڑے، مزاج کی ناموافقت اور طرح طرح کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ لیکن تم ایک ہندوستانی عورت ہو اور ہندوستانی عورت کے لئے شادی ہی زندگی کا سب سے بڑا عطیہ ہے اور اسی لئے تم نے اس زندگی کو اپنا لیا ہوگا۔ نہیں تو اس کے سوا کیا چارہ ہے۔

میں ابھی تک اکیلا ہوں، بالکل اکیلا اور تنہا۔ دن رات روشنی کا مینار میری آنکھوں کے سامنے ناچتا رہتا ہے۔ میں اسے چھو نہیں سکتا۔ اس تنہائی میں کبھی کبھی تم یاد آجاتی ہو صرف تم ہی نہیں بلکہ کچھ اور عورتیں بھی۔ جن سے میں محبت کر چکا ہوں۔ اب اُن سب کی یاد معدوم ہوتی جا رہی ہے۔ اور اب یہ حالت ہے کہ نہ تو میں محبت کر سکتا ہوں اور نہ شادی۔ اب صرف ایک جسم سے پیار کر سکتا ہوں جہاں میں آجکل رہتا ہوں وہ جگہ شہر سے الگ تھلگ ہے اس کے باوجود اس جگہ میں اتنی کشش ہے کہ بیان نہیں کی جا سکتی شاید اس جگہ میں اتنی کشش اور جاذبیت نہ ہوتی اگر سامنے والی کوٹھی میں ایک لڑکی نہ رہتی ہوتی جس کا میں ذکر کرنے والا ہوں۔ ہمارے یہ پڑوسی نہایت امیر و کبیر ہیں۔ ایک عالیشان کوٹھی میں رہتے ہیں باہر ہمیشہ کاریں کھڑی رہتی ہیں لیکن مجھے ان کاروں اور عالیشان کوٹھیوں سے دلچسپی نہیں بلکہ ایک لڑکی سے ہے جو اس کوٹھی میں رہتی ہے میں نے اجتک ایسی حسین و جمیل لڑکی کہیں نہیں دیکھی یہ لڑکی نہیں بلکہ ایک مکمل عورت ہے۔ عورت اور لڑکی میں فرق ہوتا ہے بس وہی فرق جبتک تمہاری شادی نہیں ہوئی تھی تم لڑکی تھیں جب تم نے شادی کر لی تم عورت بن گئیں لیکن ہماری پڑوسن شادی کے بغیر ایک مکمل عورت ہے۔ یہ ایک بیسوی صدی کا معمہ ہے —

ایک دن وہ مجھے بس میں مل گئی۔ جس حقارت سے اُس نے میری طرف دیکھا وہ آج تک میرے سینے میں بچھو کے ڈنک کی طرح رینگ رہی ہے۔ اُس نے یوں ہی سرسری نظروں سے میرے کپڑوں کا جائزہ لیا۔ جیسے میری رُوح کپڑوں میں مقید ہے اور میرا جسم ایک بے جان شئے ہے۔ وہ میری سُرخ نکٹائی دیکھ کر مسکرائی۔ جس کی گرہ زیادہ استعمال کی وجہ سے میلی ہوگئی تھی پھر اُس کی نظر میرے ہیٹ کی طرف گئی جس کا اوپر والا حصّہ کافی دبا ہوا تھا۔ میں نے پتلون کی کریز کو درست کیا لیکن میرے بوٹ جن پر دو ماہ سے پالش نہ ہوئی تھی میری سراسیمگی پر خشمگیں ہو گئے۔ اس دن میں نے جرابیں بھی نہ پہنی تھیں۔ دراصل میں جرابیں پہنتا بھی نہیں اُس دن مجھے اپنے جمالیاتی مذاق پر بہت غصّہ آیا۔ پتلون کے نچلے حصّے اور بوٹوں کے درمیان میری ٹانگوں کا حصّہ برہنہ تھا جس پر سخت سخت بال اُگے ہوئے تھے۔ بوٹوں کے تسمے میری آوارگی پر ایک قہقہہ لگا رہے تھے۔ شرم سے میں عرق عرق ہو گیا اور ٹوٹی ہوئی کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔ میں نے اپنے بھونڈے پن کو چھپانے کی بہت کوشش کی۔ لیکن مجھ میں اور اس لڑکی میں کافی تفاوت تھا۔ ایک وسیع خلیج حائل تھی۔ اس کو پاٹنا میرے لئے ناممکن تھا۔ اس خلیج میں کاریں۔ کوٹھیاں، ڈنر سٹ، نوکر نوکرانیاں، چاندی کے سکّے۔ بنک کے نوٹ، خوبصورت عورتیں، حریری پردے، وہائٹ ہاؤس۔ چھری کانٹے سب کچھ تیر رہے تھے اور میں دوسرے کنارے پر کھڑا ہوا تھا۔ اس کی اس تمسخر آمیز مسکراہٹ کا مطلب سمجھ گیا۔ لیکن اس کی آنکھیں جن پر وہ ہمیشہ ایک آسمانی رنگ کا چشمہ چڑھائے رہتی ہے اصلیت کو چھپا نہ سکیں۔ وہ آنکھیں مغموم تھیں۔ اُن آنکھوں نے دنیا کی خلاء کو دیکھ لیا تھا۔ اتنی دولت ہوتے ہوئے اور حُسن کی فراوانی کے باوجود یہ آنکھیں بے چین تھیں۔ یہ آنکھیں اُداس تھیں ان میں زندگی کی لاحاصلی سمایاں تھی جیسے وہ کسی کا انتظار کرتے کرتے تھک گئیں لیکن زندگی نہ ہو سکیں۔ چاندی کے سکّے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ ان سکّوں سے خوشی کے لمحے خریدے جا سکتے ہیں۔ شاید اس نے بھی کسی کو چاہا اور اُس کی محبت پروان نہ چڑھ سکی۔ لڑکی نے منہ پھیر لیا اور ساتھ والی کرسچین لڑکی سے گفتگو کرنے لگی۔ لڑکی کی آنکھیں افسردہ ہوتی گئیں۔ اُس کے دل کی گہرائیوں کا عکس اس کی آنکھوں میں تیر رہا تھا۔ اور آنکھیں صاف کہہ رہی تھیں۔ کیوں جوانی کی اُمنگوں کو کچلا جائے۔ یہ جوانی کب تک رہے گی۔ یہ دنیا ہر چیز کو بھول جاتی ہے۔ انسان اپنے آپ کو بھول جاتا ہے۔ کیوں نہ اپنے آپ کو ان رنگین پردوں میں چھپایا جائے۔ یہ سنہری تار یہ تھرکتے ہوئے بازو یہ ناچ گھر آنکھوں میں بیر کا ہلکا ہلکا نشہ۔ ٹانگوں کا تھرکنا اور کسی کے بازو کمر میں حمائل اور ناچنا پھر ناچ کر چُور ہو جانا۔ کیوں نہ اس زندگی کو اپنایا جائے۔ لیکن یہ نشہ ہر وقت قائم نہیں رہتا اور ٹوٹ جاتا ہے اور اس کی جگہ افسردگی لے لیتی ہے۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں، مجھے کیا، یہ عورت میرے دائرے سے باہر ہے۔ میرے حلقے سے باہر ہے۔ میں کبھی اُس کے جسم کو چھو نہیں سکتا میں کسی کو پانے کی ناکام کوشش کرتا ہوں۔ جس کو حاصل کر سکتا تھا۔ جس کے ہونٹوں کو چوم سکتا تھا۔ اُس کو دوسرے کے حوالے کر دیا۔ اور آج ایک ایسی عورت کو پانے کی تمنا رکھتا ہوں۔ جس کے ہونٹ دوسرے انسانوں کے لئے وقف ہو چکے ہیں لیکن انسان ہمیشہ اس چیز کو پانے کی کوشش کرتا ہے جو اُسے ملتی نہیں۔ میں اپنی بے وقوفی پر ہنستا ہوں اور سوچتا ہوں کہ کیوں اکیلا ہوں۔ میں کیوں سایوں کے پیچھے بھاگتا ہوں میں کیوں نہ کسی کے جسم کو ہمیشہ کے لئے خرید لوں تاکہ اس نہ ختم ہونے والی افسردگی اور تنہائی سے رہائی پا سکوں۔ کیا میں ایسا کر سکوں گا۔ اور اگر کر بھی لیا تو تمہیں کیا ــــ ؟

▲▲

مہندر ناتھ

حنائی انگلیاں

"ایک زمانے میں ساحر لدھیانوی صاحب کو میری یہ کہانی زبانی یاد تھی۔ ــــــــــ"

مہندر

"کیا کرتے ہو راجندر بھیا ـــ؟" "کچھ نہیں بی اے پاس کر چکا ہوں" "اب کیا کر رہے ہو؟" "ایم اے کی تیاری کر رہا ہوں ـ ہوں ــــ" "پھر کیا کرو گے بی اے کا امتحان پھر دوں گا ـــ آہا ـــ آہا ـــ آہا ـــ ہاہاہاہا ـــ سالی نوکری نہیں ملتی ـ بہت کوشش کر چکا ہوں ـ جھوٹ بکتے ہو ـ رات دن گھر میں رہتے ہو ـ اور اپنے ماں باپ کا خزانہ خالی کر رہے ہو اور پھر کہتے ہو بہت کوشش کر چکا ہوں ـ تم کیا کوشش کرو گے ـ تم میں کام کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ـ تم کام کر ہی نہیں سکتے ـ جو کام کرنا چاہتے ہیں ـ وہ کام لے آتے ہیں ـــ تم ـــ تم ــــ تم کاٹھ کے اُلّو ہو ـ تم کیا کرو گے ـ بوٹ پالش کر دو بوٹ ـــ سُنا تم نے ـــ کیا کبھی کسی سے ملنے گئے ـ کسی کی سفارش حاصل کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارے ـــ کسی کی ہاں جوتیاں چٹخائیں ـ کسی کے لڑکے کو مفت پڑھایا ـ کسی کی چاپلوسی کی، کسی کی تعریف میں قصیدے پڑھے ـ اور پھر کہتے ہو بہت کوشش کر چکا ہوں، جاہل بے وقوف ـــ کیا نوکری اس طرح ملا کرتی ہے ـ آج کل کے لڑکے کام تو کرتے نہیں ـ وہ تو چاہتے ہیں کہ بیٹھے بٹھائے کوئی کام مل جائے، ہزاروں کی تھیلی ہاتھ میں آجائے اور پھر وہ گلچھرے اُڑائیں ـ ناک سے دھواں نکالیں ـ سینما دیکھیں اور لنسبت روڈ پر لڑکیوں سے دل لگی کریں ـ بدمعاش ـ شہدے کہیں کے ـ

میری طرف نہیں دیکھتے، سوکھ کر کانٹا ہو گیا ہوں، جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا ہے ـ یہ کس طرح ہوا ـ کیوں کر ہوا ـ تمہاری طرح ہی تھا ـ موٹا ـــ تازہ ـــ آنکھوں میں چمک تھی ـ جسم گوشت سے بھرا ہوا تھا ـــ چہرے پر لالی تھی ـــ کیا مر گئی ـ؟ ـــ کیا کیا ـــ؟ جونک پی گئی ! ـــ کہا نہ تھا ـ محنت کرو خوب دل لگا کر پڑھو ـــ ایم اے میں سیکنڈ ڈویژن لو ـ تم کیا جانو نوکری کس طرح ملتی ہے ـ جاؤ ڈنڈ پیلو ـ اکھاڑے میں جاؤ ـ مالش کرو ـــ آئے پڑھنے اور پھر کہتے ہو نوکری نہیں ملتی ـــ

کام کرنے سے نوکری ملتی ہے ـ میاں! پروین گھوش کی طرح ـ آنکھیں اندر دھنس چکی ہیں ـ چھاتی دکھتی ہے ــــ پھیپھڑوں سے خون آتا ہے ـ گورنمنٹ نے انھیں پی ایچ ڈی کی ڈگری دی ہے ـ اور ایک ہزار روپے ماہوار تنخواہ دے گی سولن جا رہے ہیں ـ ایسے نوکری ملتی ہے ـــ

تمہیں تپ دق چاہیئے ـ یا نوکری ـ آہا ـ آہا ـ اوہ ـ ہو ـ تپ دق ہو جاؤ ـ سولن وارڈ میں رہو ـ اور لوگوں سے پوچھو کہ انہیں کیوں تپ دق ہو گیا ـــ وٹامن کھانے کو نہیں ملتا ـــ دودھ پینے کو نہیں ملتا ـ اور صاف ہوا

سانس لینے کو نہیں ملتی، نوکر ہو کر کیا کرو گے۔ شادی کرو گے۔ کیا تمہیں دنیا میں اور کوئی کام نہیں ــ نوکری کے بعد شادی۔ عورت ـــ عورتیں تو بازار میں پھرتی ہیں، کسی ایک کو پکڑ لو ـــ ارے جوتیوں سے ڈرتے ہو، جوتیوں سے یا عورت سے۔ میرے اللہ غلام بھی کوئی نہ ہو۔ عورت سے ڈرتے ہو۔ غلام کہیں کے۔ آزادی نہیں ملتی، ملے کیوں کر ـــ اچھا آؤ۔ ایک اور راستہ دکھاؤں، جاؤ اس بازار میں جہاں عورتیں بکتی ہیں، سمجھ گئے۔ میں کئی بار گیا ہوں، جب تک شادی نہیں کی تھی، ہر روز جاتا تھا۔ ارے کیا کہا سوزاک، سوزاک سے ڈرتے ہو، دہلی کا دواخانہ موجود ہے، کویراج شاما اس موجود ہے یا گل ہجو میرے پاس ایک مجرب نسخہ ہے ـــ ایک دن میں پیپ چلن بند۔ ایک بار مجھے بھی ہوا تھا۔ سنا تم نے، سوزاک نہیں، آتشک، کچھ بھی نہیں ہوتا ـــ خون خراب ہو جاتا ہے جسم پر پھوڑے نکل آتے ہیں۔ اور پھر ـــ پھر ـــ علاج کراؤ تو مکتی مل جاتی ہے۔ کتنا سہل طریقہ ہے مکتی حاصل کرنے کا عورت کے ذریعے مکتی۔

⁂

کیا کہا کوڑھ ہو جائے گا۔ کوڑھ سے ڈرتے ہو۔ ارے میاں تم بہت ڈرپوک ہو، ہر روز جذامیوں کو راستے میں لیٹے ہوئے دیکھتے ہو اور پھر بھی اُن سے ڈرتے ہو۔ میں سمجھ گیا تم عورت سے ڈرتے ہو۔ تم نروان حاصل کرنا نہیں چاہتے۔ میں ـــ میں ـــ چھ بچوں کا باپ ہوں۔ اور بچوں کو میں نے آتشک دیا ہے۔ ایک کی آنکھیں اندھی ہو گئیں ہیں اور دوسرے کی ٹانگیں، ٹیڑھی ہو گئیں ہیں ــ اور میری بیوی کو بھی آتشک ہو گیا ہے۔ لائیلپور لیکر گیا تھا، لیڈی ڈاکٹر کہنے لگی۔

تم اچھی لڑکی ہو۔ تمہارا کوئی کسور نہیں ــ سارا تمہارے خاوند کا قصور ہے وہ بدمعاش ہے۔ تم مت رو۔ اچّھا ہو جائے گا۔ خدا غارت کرے اس لیڈی ڈاکٹر کو۔ ارے میری بیوی کو اچھا کر دیا کیوں ـــ مجھے اپنی بیوی سے نفرت ہے کتنی بدصورت ہے میں ایک آرٹسٹ ہوں، مجھے خوبصورتی پسند ہے، خوبصورت عورتیں گول گول مکھن کی طرح سپید بازو۔ دلکش نکھری ہوئی رنگت، آنکھیں جیسے۔ کیا کہا کوئلے کی طرح کیا کہا۔ مر گئی ـــ نہیں نہیں۔ میری بیوی زندہ ہے اور میں بھی زندہ ہوں۔ لیکن پھر بھی اس بازار میں جاتا ہوں، جہاں عورتیں بکتی ہیں، اجناس کی طرح، تم تو کہتے تھے، کہ جانا بند کر دیا ـــ جھوٹ بکتا تھا۔ مجھے حُسن چاہیئے۔ خوبصورت عورتوں کے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتا۔

کیا کہا آس پاس کے گلی کوچوں میں ــ ارے کبھی نہیں ـــ شریف آدمی پھانس سکتے ہیں۔ میں رات کے اندھیرے میں جاتا ہوں۔ لوگ رات کو جاتے ہیں۔ میں ایک اچھے عہدے پر فائز ہوں۔ کیا کہا۔ رات کو جاؤں۔ ہاں سمجھ گیا تمہاری چالاکی۔ دفتر سے نکلوانا چاہتے ہو اور میری جگہ حاصل کرنا چاہتے ہو۔ کبھی نہیں، میں دن کو جاؤں گا۔ رات کو بدمعاش جاتے ہیں۔ میں شریف ہوں۔ میں نے شادی کی ہوئی ہے۔ میرے بال بچے ہیں۔ میں دِن کو جاتا ہوں۔

⁂

اوہ ـــ تم نے مس شمی نہیں دیکھی، خدا کی قسم ـــ نری مورت ہے، سونے کی مورت، تم کیا جانو ـــ اس میں کتنی کشش ہے، اس کی گول گول بانہوں میں کتنی لطافت ہے، اس سپید سپید ـــ مرمریں ہاتھوں میں کتنا سکون ہے۔ اور پھر مس جلو ـــ اُف اس کی آنکھیں تیر کی طرح کلیجہ میں پیوست ہو جاتی ہیں۔ اور ہاں یاد آیا مس بالو ـــ خدا اس کی عمر لمبی کرے۔ ارے دیکھو لوٹ پوٹ ہو جاؤ۔ اسے مجھ سے کتنی محبت ہے۔ بے انداز محبت ـــ ایک دن میں اس کے کوٹھے پر ایک ہفتے کے بعد گیا۔ کہنے لگی میں تجھ سے محبّت کرتی ہوں، حرامزادے تو ـــ تو دوسری رنڈیوں کے پاس جاتا ہے۔ بتاؤ مجھ میں کیا کمی ہے۔ کیا تو مجھے حیوان سمجھتے ہو۔ کیا میں محبت نہیں کر سکتی۔ کیا میں جذبات سے مبّرا ہوں، کیا میں محسوس نہیں کر سکتی۔

حرامی، گدھے، میں کتنے عرصے سے تیرے فراق میں گھل رہی ہوں، آج ہتھے چڑھا ہے میرے ہاتھ —— میں تمہیں خوب پیٹوں گی۔ کیوں جاتے ہو کسی کے گھر، بولو، کہو، نہیں نہیں۔ معاف کردو۔ اب کبھی نہ جاؤں گا۔ اب کہیں نہ جاؤں گا۔ اب معاف کردو۔ لیکن اس نے میرا بوٹ چھپالیا۔ اور کہنے لگی جاؤ —— مردود —— بے حیا —— دوسری رنڈیوں کے پاس جاتا ہے،، میں نے اس کے پاؤں پکڑ لئے۔ خدارا —— کیوں دفتر سے نکلواتی ہو۔ کہاں جاؤں ننگے پاؤں، ننگے سر کسی نے دیکھ لیا تو —— تو کہہ دیگا کہ پاگل ہوگیا ہوں۔ حیوان ہوں۔ کیا کہا —— میں پاگل ہوں۔ کیا میں پاگل ہوں، میں بالکل پاگل نہیں، ہجڑا ہوں، ہجڑا۔ نہیں —— نہیں —— نہیں میرے چھ بچے ہیں۔ مجھے کون ہجڑا کہتا ہے، میں چھ بچوں کا باپ ہوں۔

⁂

اور میں بھول گیا۔ تم بھی چلو گے، ارے بھئی ایک اور پرانی واقف کار آئی ہے بالکل نئی، راولپنڈی سے آئی ہے، دیکھو تو تڑپ اٹھو۔ کانوں میں چمکتے ہوئے آویزے۔ باہوں میں سبز رنگ کی چوڑیاں اور بدن پر سرسراتی ہوئی آسمانی رنگ کی ساڑی۔ کاش تم اسے دیکھ سکو۔ اوہ تم بازار جانے سے ڈرتے ہو۔ عورتوں سے۔ مردوں سے۔ بڑے آدمیوں سے۔ بچوں سے اور اپنے آپ سے بھی۔ چلو میرے ساتھ۔ اس نے ایک محلہ میں جگہ لی ہوئی ہے۔ میں ہر روز وہاں جاتا ہوں۔ کوئی پوچھتا ہے تو کہتا ہوں کہ میرے رشتہ دار کا گھر ہے، میرے ماموں کی لڑکی رہتی ہے، میری سالی رہتی ہے۔ ہنس رہے ہو۔ کیا کہا —— روپیہ نہیں —— پاگل چوری کرو۔ ڈاکہ ڈالو۔ پولیس سے ڈرتے ہو۔ ارے ارے ہر آدمی سے ڈرتے ہو۔ تم تو خدا سے بھی خوف کھاتے ہو۔ کیا کہا —— بیماری بیماری سے ڈرتے ہو۔ ڈاکٹروں سے ڈرتے ہو۔ اٹھو چلو بھی۔ کتنے عرصے سے تمہارے یہاں بیٹھا ہوا ہوں، کچھ تو خیال کرو۔ دنیا دیکھ لو۔ میاں ارے ارے رو رہے ہو۔ بیماری —— بیماری اتنا بھی کیا ڈر۔ دیکھو میں بھی بالکل تندرست ہوں۔ صحت مند ہوں۔ کیا ہوا۔ کہ جسم پر گوشت نہیں۔ کیا ہوا کہ ایک قلم کی طرح دبلا پتلا ہوں۔ دیکھ سالن برابر آ جا رہا ہے۔ ہر روز روٹی کھاتا ہوں اور تم کیا کرتے ہو۔ دن رات گھر پر پڑے رہتے ہو۔ مکھیاں مارتے۔ ہو، ہوش کی دوا کر۔ راجیندر بھائی۔

⁂

گھر گھر —— میاؤں میاؤں، کون بول رہا ہے۔ اختر بھائی۔ بلیاں۔ بلیاں ارے چوہے کہاں ہیں۔ ارے چوہے کہاں ہیں! وہ تم یہ بھی نہیں دیکھتے۔ تمہارے سامنے۔ تمہارے آگے۔ تمہارے دائیں بائیں۔ اوپر نیچے۔ ہر روز دیکھتے ہو، گلیوں میں، بازاروں میں، ارے ۳۵ لاکھ چوہے ہیں —— آہا —— آہا —— آہا —— بی —— بی —— بی —— ۳۵ لاکھ چوہے ہیں۔؟ ارے بلیاں کدھر گئیں۔ وہ دیکھو سامنے۔ میں آنکھیں بند کرلیتا ہوں۔ کہاں ہیں، دکھائی نہیں دیتیں۔ ارے بلیاں کہاں ہیں دکھائی نہیں دیتیں۔ کھا جائیں گی۔ کھانے دو۔ میں آنکھیں بند کئے لیتا ہوں۔ مجھے کوئی نہیں کھا سکتا۔ ۳۵ لاکھ چوہے آہا —— آہا —— بی۔ بی۔ بی۔

کیا کہا —— کیا کہا —— اختر بھائی، ہاں، تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں ادیب ہوں۔ نہایت حساس واقع ہوا ہوں، لوگوں کو دیکھ کر مجھے رونا آتا ہے۔ تمہاری صورت دیکھ کر بھی، ارے تمہیں کیا ہوگیا۔ آج کچھ نہیں کھایا۔ کچھ تو کھا لو۔ پانی پی لو —— اختر بھائی ٹھنڈا پانی۔ ہندو پانی۔ مسلم پانی۔ کونسا پانی پیو گے۔ پانی پی لو اختر! سن سٹروک نہیں ہوگا۔ لو نہیں لگتی۔

⁂

ہاں میں ادیب ہوں۔ کہانیاں لکھتا ہوں، شعر کہتا ہوں۔ ارے دیکھتے نہیں مزدوروں کی حالت کتنے مضمحل اور افسردہ نظر آتے ہیں، چہرے پر رنگت نہیں، لب مسکراہٹ سے عاری۔ اور کیا کہا —— زندگی بے کیف،، بے مزا۔

ہر وقت کا رونا۔

کہانیاں لکھتا ہوں، میں ترقی پسند ادیب ہوں۔ مزدوروں پر شعر کہتا ہوں۔ لوگ سُنتے ہیں تو سر دھنتے ہیں واہ بھئی واہ۔ خوب لکھا مزدور کا کلیجہ نکال دیا۔ اب بھیجا باہر نکالو۔ کیا کہا۔ کیا ملتا ہے۔ ارے مزدور کو کیا ملتا ہے کہ ان پر لکھنے والوں کو کچھ ملے۔ مزدور بھی فاقے کرتے ہیں اور ہم لکھنے والے بھی ترقی پسند ——— ارے نام ہوتا ہے عوام میں مشہور ہو گیا ہوں۔ یہ کون جا رہا ہے۔ ترقی پسند ادیب ——— ارے اس کی حالت ——— چہرے کا رنگ زرد ——— گال اندر کو پچکے ہوئے۔ گردن سوکھی ہوئی۔ چال ڈھال میں مردنی۔ آنکھوں میں وحشت۔ اندھا کیا جانے بسنت کی بہار۔ میں مزدور بننا چاہتا ہوں۔ ایک نئے ادب کی تخلیق کرنا چاہتا ہوں۔ جب تک میں ان کی طرح زندگی بسر نہ کروں۔ ان کے احساسات ان کی امنگوں ان کی زندگی کی ترجمانی کس طرح کر سکتا ہوں۔ میں مزدور بن رہا ہوں۔ ہر روز ——— دن بدن ——— کیا کہا۔ تپ دق ہو جائے گا۔ ہونے دو۔ مجھے پروا نہیں۔ میرا نام روشن ہو جائے گا۔ مزدوروں کا ترجمان۔ ان کا واحد نمائندہ ——— آج مزدور اکٹھے ہوں گے۔ کہاں ——— موچی دروازے کے باہر ——— دنیا کے مزدور اکٹھے ہوں گے۔ دنیا کے مزدور اکٹھے ہو جاؤ ——— تمہارے لئے کچھ نہیں بنے گا۔ صرف زنجیریں بنیں گی۔ کیا کہا۔ دنیا کے مزدور اکٹھے ہوں گے۔ موچی دروازے کے باہر ——— ارے کون بھونک رہا ہے۔ کتّا ——— نہیں ——— نہیں اُلّو ——— ارے اُلّو تو رات کو بولتے ہیں۔ یہ کل جُگ ہے۔ آج کل دن کو اُلّو بولتے ہیں۔

❖

ہاں ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ مجھے اپنی بیوی پسند ہے۔ اور تمہیں اختر بھائی۔ اوہ۔ تم نے تو شادی بھی نہیں کی۔ کیا کہا۔ میری بیوی بدصورت ہے۔ تو کیا ہوا ——— مجھے اس کی اُنگلیاں پسند ہیں۔ تم نے اس کی انگلیاں نہیں دیکھیں۔ وہ ہر روز پالش کرتی ہے۔ بوٹ پالش نہیں۔ ناخنوں کی پالش۔ ارے ہر روز حنائی انگلیاں۔ خوبصورت، دل کو لبھانے والی۔ اور پالش کے بعد ایسی معلوم ہوتی ہیں۔ جیسے سونے کی قاشیں۔ ارے سونے کی قاشیں تو ٹھنڈی ہوتی ہیں۔ ان میں خون کھولتا ہے۔ نرم اور گرم ہاتھ۔ مخروطی انگلیاں۔ چغتائی کا شاہکار۔ کیا کہا۔ کام کون کرتا ہے۔ میری بیوی توبہ توبہ۔ میری بیوی… کیوں کام کرے۔ ارے نوکر۔ اتنی ہمت نہیں۔ کہ نوکر رکھ سکوں۔ ٹھیک کہا۔ تم بہت سیانے ہو۔ کالے کوّے کی طرح۔ میرے دل کی بات جان لیتے ہو۔ اس کی ایک ساس ہے وہ کام کرتی ہے۔ دن رات۔ میاں تمہاری کیا لگی۔ میری بیوی کی ساس۔ میری کیا لگی ٹھہرو۔ سوچ کر بتاتا ہوں۔ ہاں یاد آیا میری کچھ بھی نہیں۔ اسے میری بیوی کی ساس میری کیا لگی۔ دن رات وہ کرتی ہے۔ بہت اچھا کام کرتی ہے۔ دن رات برتن صاف کرتی ہے۔ فرش صاف کرتی ہے۔ جھاڑو دیتی ہے۔ روٹی پکاتی ہے۔ گھر کا سارا کام میری بیوی کی ساس کے سپرد ہے۔ ایک دن بڑھیا کہنے لگی تمہاری بیوی کام نہیں کرتی۔ میں نے ہنس کر ٹال دیا۔ خوب کہا۔ ایسا ہی کرنا چاہیئے۔ کہتی ہے میری بیوی کام نہیں کرتی ہے۔ برتن صاف نہیں کرتی۔ کھوسٹ بڑھیا نہیں جانتی۔ اگر حنائی انگلیاں برتن صاف کرتے کرتے خراب ہو جائیں۔ تو بتاؤ۔ میری بیوی کی حنائی انگلیاں بدنما ہو جائیں تو اس کا کون ذمہ دار ہو گا۔ میں کس کے سہارے زندہ رہ سکتا ہوں۔ کیا کہا۔ سارا کام بڑھیا سے لیتا ہوں۔ کیا وہ انسان نہیں۔ ارے انسان وہ بڑھیا۔ ۶۰ سال کی وہ بڑھیا۔ چلنے پھرنے سے وہ عاری۔ ہاتھ کانپتے ہوئے۔ کہتی ہے مُنہ سے پیپ آتی ہے۔ دانت ہلتے ہیں۔ مسوڑے خراب ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر کو بُلا لاؤ۔ دانت نکلوا دو سارے میاں۔ جہاں خون ہوتا ہے وہاں سے پیپ بھی آ سکتی ہے۔ اور ساٹھ سال کی عمر میں پیپ نہ آئے۔ شہد نکلے گا کیا ——— کہتی ہے مروں گی نہیں۔ تمہارا کام کروں گی۔ سو سال تک

زندہ رہوں گی۔ مرنے میں نہیں آتی۔ اتنا کام دیا ہوا ہے۔ پھر بھی مرنے میں نہیں آتی۔ کتنی سخت جان ہے۔ مجھے اپنی بیوی کی انگلیاں پسند ہیں۔ نہایت خوبصورت اور حسین۔ ریشم کے تاروں سے زیادہ ملائم بھلا وہ برتنوں کو صاف کرے۔ انگلیاں بدنما ہو جائیں تو میں کیا کروں گا۔ اختر بھائی —— تم مجھے کوستے ہو۔ بتاؤ میں کس کے سہارے جی سکتا ہوں۔ یہی تو میرا زندگی کا سرمایہ ہے اگر یہ مٹ جائے تو پھر —— میں ادیب ہوں۔ نہایت حساس ہوں۔ بڑھیا کام کرے اور خوب کرے .... اور وہ حنائی انگلیاں......

کیا کہا۔ ارے بولو۔ کبھی میرے کان تو بہرے نہیں ہیں۔ کو دماغ میں بھوسہ بھرا ہوا ہے۔ کہیں کان تو بہرے نہیں۔ اختر میاں تم کیا جانو۔ شادی کے مزے میں ان حنائی انگلیوں کو خراب نہیں ہونے دوں گا۔

کہتی ہے میرا خیال کرو۔ کیا کہا۔ کون ارے وہی۔ میری بیوی کی ساس کہتی ہے میں نے تمہیں جایا۔ پالا پوسا۔ پڑھایا مجھ پر احسان جتاتی ہے۔ شرم نہیں آتی۔ اختر میاں میں نے کبھی احسان جتایا۔ میں جس پر احسان کرتا ہوں .... جو احسان کرکے جتلانے لگے .... تمہیں دو سال سے پڑھا رہا ہوں۔ تم ہی بتاؤ۔ کبھی تمہیں کچھ کہا۔ کہو بولو۔ کہتے کیوں نہیں۔ چپ کیوں ہو گئے۔ زبان کیوں گنگ ہو گئی۔ بولتے کیوں نہیں۔

ارے کون بھونک رہا ہے۔ بازاری کتے۔ گولی سے اڑا دو۔ یہ کتے آدمی کو کاٹتے ہیں۔ کتوں کو گولی سے بھیجدو۔ کیا کہا —— اونچی آواز میں کہو —— میں ہوں اور تو کوئی نہیں۔ میرے باپ کے متعلق پوچھتے ہو۔ اس کی نظر کمزور ہو گئی ہے۔ وہ عینک مانگتا ہے۔ کتنی عمر ہے اس کی ۶۵ سال۔ بی۔ بی۔ بی ۶۵ سال کا بوڑھا عینک مانگتا ہے۔ کایا کلپ چاہتا ہے۔ بوڑھے نوجوان سے دو قدم بڑھ گئے۔ پھر کہو —— آواز نہیں آتی۔ باز کی آنکھیں لا دوں۔ عقاب کی آنکھیں۔ خوب کہا۔ اختر —— میری بیوی کو دیکھنا چاہتا ہے۔ عقاب کی آنکھیں۔ عینک چاہتا ہے۔ بینائی چاہتا ہے۔ عینک پر پندرہ روپے قبر میں پیر لٹکے ہوئے ہیں، پھر بھی بینائی چاہتا ہے۔ کہاں سے لا دوں۔ ہاں کایا کلپ پنڈت مالویہ —— روپے کہاں ہیں۔ پندرہ روپے نہیں ملتے۔ ہاں ٹھیک کہتے ہو۔ پندرہ روپوں سے پندرہ فلمیں دیکھ سکتا ہوں پندرہ عورتیں۔ خوبصورت رسیلے ہونٹ، نشیلی آنکھیں۔ ابھرا ہوا سینہ۔ بوڑھا کھوسٹ عینک مانگتا ہے۔ ۶۵ سال کے بعد آہا —— آہا —— آہا —— بی۔ بی۔ بی۔

پھٹ پھٹ پھٹ۔ دھم —— دھم —— دھم —— کون آیا بم گرا۔ کہاں لندن میں۔ لیکن آواز یہاں آ رہی ہے۔ کانوں میں انگلیاں ڈالو۔ حنائی انگلیاں سونے کی قاشیں۔

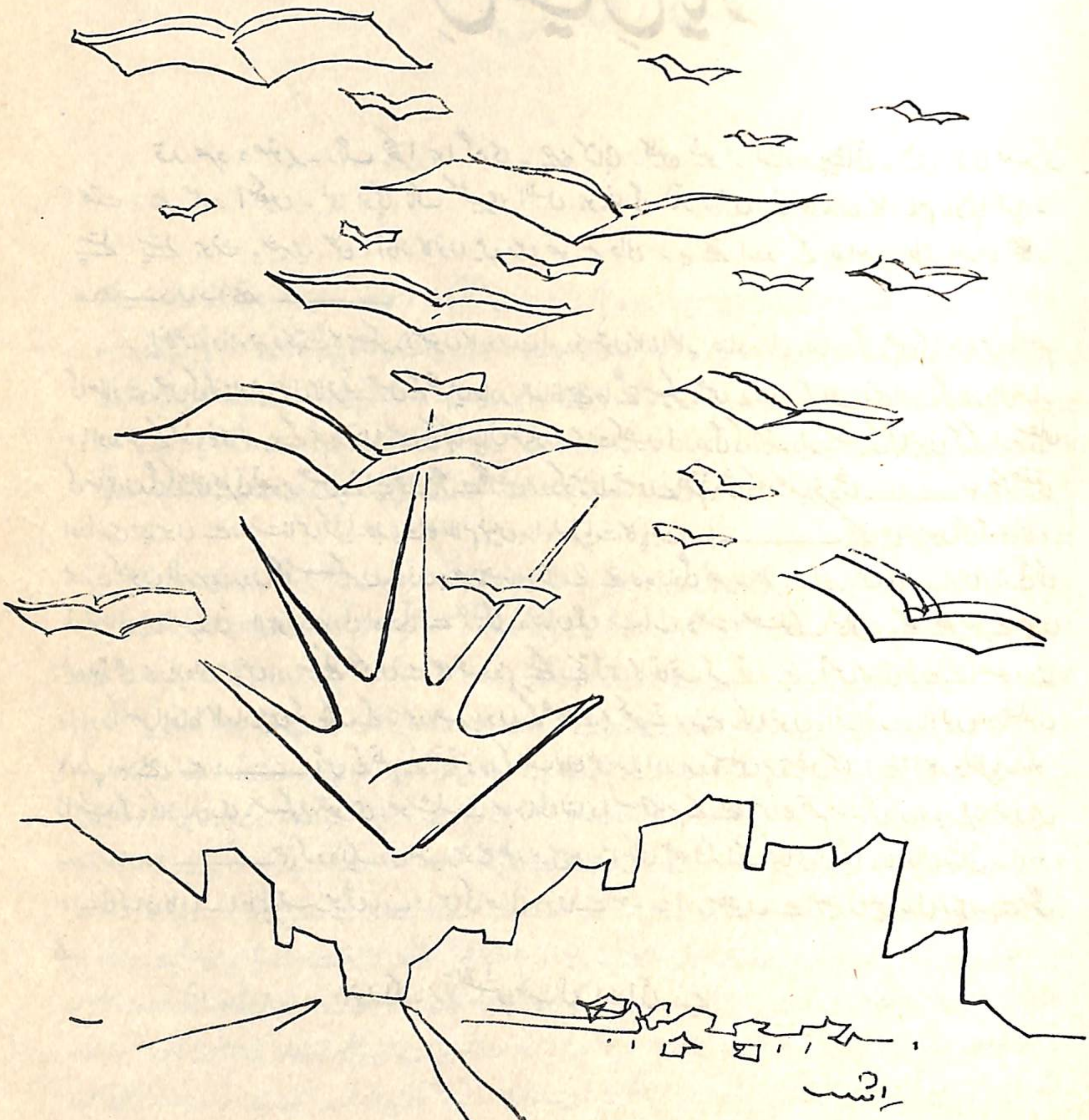
آزادی۔ لارڈ ایری کا بیان۔ انڈیا منٹ۔ کیا کہا۔

خوب کہا۔ کون تقریر کر رہا ہے۔ چرچل۔ ہم آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں۔ ہم غلامی کو اس دنیا سے مٹانا چاہتے ہیں، ہم فرانس کو دوبارہ زندہ کرنا چاہتے ہیں۔ ہم لڑیں گے۔ ہر جگہ —— زمین پر خشکی پر۔ سمندر پر۔ آسمان پر۔ اپنی زمین پر۔ کینیڈا میں۔ آسٹریلیا میں۔ ہم سب کو آزاد کرنا چاہتے ہیں۔ نہیں —— نہیں میں بھول گیا۔ ہم یورپ کو ہٹلر کے پنجے سے چھڑانا چاہتے ہیں، کیا یورپ میں ہندوستان بھی شامل ہے ....

خوب زور سے تالیاں پیٹو۔ اختر میاں۔ آزادی مانگتے ہو —— آزادی مانگنے سے نہیں ملتی —— اور کچھ مانگو کیا کہا —— موت —— ابھی لو —— اسی وقت لو —— چلاؤ —— خوب زور سے چلاؤ۔

ہاں کہو۔ مسجد مندر بن گئی ۔ مسجد مندر بن گئی۔ وہ دیکھو سامنے ۔ بازار بند ہونے لگے۔ بنئے گھروں میں گھس گئے لاٹھیاں چلنے لگیں۔ پتھر برسنے لگے۔ ہائے میرا لال ۔ کسی ہندو نے گولی مار دیا۔ ہائے میرا بچہ ——— کسی مسلمان نے چھرا گھونپ دیا ——— دیکھا ——— دیکھتے نہیں۔ خون کی ندیاں۔ کہاں ——— وہ دیکھو ——— مندر مسجد بن گیا ——— انڈیا فسٹ مت چلاؤ ——— آزادی ——— ہٹلر کے بعد۔ اور موت ابھی لو ——— اسی وقت ——— جب جی چاہے ———

فن کا اُجالا ہوتا ہے



خوشتر گرامی
مُدیر "بیسویں صدی" دہلی

نقشِ خیالِ یار

قد سرو و صنوبر۔ رنگ نکھرا ہوا گندمی ۔ چہرہ کتابی ۔کلین شیو ۔ کشادہ پیشانی ۔ بڑی بڑی مہر و محبت سے معمور آنکھیں ۔ لمبی اونچی ناک کشمیری النسل ہونے کی غماز ۔جس نے خاندان کا نام اونچا کیا ۔ پتلے پتلے ہونٹ ۔شیریں سخن ۔ آواز کانوں میں رس گھولنے والی ۔ یہ تھے اردو کے صاحبِ طرز افسانہ نگار مھیندر ناتھ ــــــــــ

اخلاص ، وفا ، مہر و محبت کا پیکر ۔ دشمنوں کا دوست اور دوستوں کا فدا کار ۔صاف دل ، صاف گو ۔ جس کی رفتار میں بادِ نسیم کی حلاوت ۔جس کی گفتار میں غزل کا ترنّم ۔جس کے قلم میں جادو ، الفاظ جیتے جاگتے پیکر ۔جس نے اردو کے افسانوی ادب کو لازوال سرمایہ دیا اور دنیا کے افسانوی ادب کے ہم پلہ بنایا ۔جس کی کہانیاں غریبوں ، محنت کشوں کی زندگی کی آئینہ دار ۔جس کی کہانیوں کے کردار ہندوستان کی سماجی زندگی کی چلتی پھرتی تصویر ۔جس نے اپنے خونِ جگر سے گلشنِ اردو کو سینچا ۔جس نے قلم فروشی کی نہ ضمیر فروشی ــــــ سماج کو حقیقی اور ابدی سچائیوں سے روشناس کرایا ۔جذبات کا غلام نہیں بنا ، نظریات کا پابند رہا ــــــــ بچپن میں غریبوں کی آہ و بکا ، محنت کشوں اور مزدوروں کی سسکیوں نے دل پر جو زخم لگائے تھے وہ زندگی بھر نہ بھرے اور اس کی ساری زندگی اُن کی ترجمانی میں بسر ہوئی ۔ لاہور سے دلّی اور دلّی سے بمبئی وہ جہاں گیا خراب و خستہ ، مفلوک الحال ، بجھے بجھے چہرے ، جوانی میں بوڑھی ہونے والی عورتیں اور سوکھے ٹکڑوں سے بھی محروم بلکتے بچّے اُس کا تعاقب کرتے رہے ۔ اُس کا دل خون کے آنسو روتا رہا اور آنسو الفاظ کا جامہ پہن کر ملک کے نامور جریدوں کے صفحات پر بکھرتے رہے ۔کہانیوں ، افسانوں ، ناولوں اور فلموں کا روپ بدلتے رہے ــــــــ اُس کے قلم نے حقیقتوں کو افسانوں میں بدلا اور پردہ سیمیں پر پیش کیا ۔ اپنے افکار و نظریات کو ڈائیلاگ کی زبان دی ۔ سیکولر ، جمہوری ، سوشلسٹ سماج کی بقا و استحکام کے لیے اس کا قلم سر گرداں رہا ۔ کہانیوں میں یہ جذبہ نمایاں رہا ــــــــ حتیٰ کہ وہ ایک دن غیر متوقع طور پر ہمیں روتا بلکتا چھوڑ کر ایک کہانی بن گیا ۔ لازوال کہانی ۔ اردو ادب کی کہانی کا ایک ناقابلِ فراموش باب ۔اس کی جدائی دنوں سے ہفتوں اور ہفتوں سے مہینوں میں بدل رہی ہے مگر

ع

ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے

احتشام حسین مرحوم

مہندر کا فن

"یہ افسانے آپ کو پسند ہیں ؟"

"ہاں مجھے تو پسند ہیں ۔ اور آپ کو ؟"

"مجھے پسند نہیں ہیں ۔"

اگر تنقید ۔ تبصرہ یا رائے زنی کی منزل یہیں ختم ہو جایا کرتی ۔ تو میں بھی اتنا کہہ کر خاموشی اختیار کر لیتا کہ مہیندر ناتھ کے افسانے مجھے پسند ہیں ۔ لیکن خوش قسمتی یا بد قسمتی سے ہم ایک ایسے دور میں ہیں جس میں ہر بات کا سبب دریافت کیا جاتا ہے ۔ کسی چیز کو اچھا یا بُرا کہنے کی وجہ پوچھی جاتی ہے اور اگر کوئی نہ پوچھے تو بھی کہنے والے کو اس دَورِ عقل و معقولات میں زمانہ کی عام روش کا خیال رکھنا پڑتا ہے ۔ انفرادی ذوق کے نقطۂ نظر سے ادب کے ساتھ یہ عملِ جراحی مناسب نہیں معلوم ہوتا لیکن ادب کو اس کے جماعتی رشتہ میں سمجھنے کے لئے کوئی معیار ضرور قائم کرنا پڑے گا ۔ کسی نہ کسی طرح ایک عمومی رائے بنانی پڑے گی ۔ جو بالمقصد لکھے ہوئے افسانوں کے سمجھنے اور پرکھنے میں مدد دے ۔ خاموش پسندیدگی سے آگے بڑھ کر تنقید اور تجزیہ کی منزل ہے ۔

جدید اردو افسانوں کی عمر ابھی چھوٹی ہے اور مہیندر ناتھ کے افسانوں کی عمر تو بہت ہی کم ہے لیکن اُن کے اندر اُن کے پیش روؤں کی پیدا کی ہوئی پختگی اُن کی لبسائی ہوئی خوشبوئیں ۔ ان کی لائی ہوئی لطافتیں جمع کرنے کی کوشش ضرور معلوم ہوتی ہے ۔ مہیندر ناتھ کی افسانہ نویسی کا دَور چند مشہور افسانہ نگاروں کا دور ہے جنہوں نے فن اور مواد دونوں کی حیثیت سے افسانہ نویسی کو پریم چند سے آگے بڑھایا ہے اور ایسی ہی حد پر پہنچ کر ایک ہونہار اور ترقی کرنے والے افسانہ نگار کے جوہر کُھلتے ہیں ، اس کی پرواز کا حال معلوم ہوتا ہے ۔ مہیندر کے لئے یہ کشمکش بہت سخت تھی ۔ کہ جب افسانہ نویسی ترقی کی اس رفتار سے چل رہی ہے تو ان کا کیا راستہ ہونا چاہئے ۔ اور خوشی کی بات یہ ہے کہ تقلید کی راہ سے بچ کر مہیندر نے کردار نگاری کی ایک مخصوص جھلک دکھائی ہے ۔ انھوں نے اپنے لئے وہ دنیا منتخب کر لی جس کے بارے میں انھیں اچھی طرح علم تھا ، ہندوستان کا متوسط طبقہ اپنی بعض خصوصیات کی وجہ سے اپنے اندر بڑی متضاد کیفیتیں رکھتا ہے ۔ وہ آگ بھی ہے وہ پانی بھی وہ برف بھی ہے شعلہ بھی ۔ وہ روایت پرست بھی ہے اور روایت شکن بھی ۔ وہ آگے بھی بڑھ رہا ہے اور پیچھے بھی ہٹ رہا ہے ۔ وہ فضا میں معلق بھی ہے ، اوپر بھی جا سکتا ہے ، نیچے بھی گر سکتا ہے ۔ ایسا اہم طبقہ نہ صرف انفرادی حیثیت سے بلکہ جماعتی حیثیت سے افسانہ کا کردار بننے کی بڑی صلاحیت رکھتا ہے ۔ لیکن افسانہ نگار کے ہاتھ اگر اس سیّال مواد کو کہانی کے سانچے میں ڈھالنے کی قدرت نہیں رکھتے تو افسانہ ایک معمہ بن جائے گا ۔ اور افسانہ ہو یا نظم موضوع اسی وقت معمہ بنتا ہے جب لکھنے والے کو اپنے موضوع کا پورا علم نہ ہو ۔ لیکن مہیندر ناتھ نے متوسط طبقہ کی خواہشوں اور امنگوں ، فریب کاریوں اور دشواریوں کو خوب سمجھا ہے اور اس تضاد کو بھی سمجھا

ہے جو انھیں سب سے زیادہ متحرک بنائے ہوئے ہے۔

متوسط طبقے میں سب سے بڑی کشمکش آج پیدا ہوئی ہے۔ جب زندگی کے تمام اداروں کی جانچ پڑتال نئے سرے سے شروع ہوئی ہے۔ خانگی زندگی، جنسی معاملات، تعلیم، شادی بیاہ، مفلسی، حقیقت اور خیال کی جنگ، سوتے جاگتے خواب، بہتر زندگی کا خواب، ان خوابوں کی تعبیر۔ ان مسائل سے جوانوں کے دماغ بسے ہوئے ہیں۔ وہ مشکلوں کو حل کرنا اور گتھیوں کو سلجھانا چاہتے ہیں وہ زندگی کو نچوڑ کر اس سے زیادہ سے زیادہ حاصل کرنا چاہتے ہیں اور جب اس میں رکاوٹیں پڑتی ہیں تو وہ اجتماعی اور انفرادی بغاوتوں کے خواب دیکھنے لگتے ہیں۔ چونکہ معاشی نظام بدل ہی نہیں رہا ہے۔ اس لئے خواب خواب ہی رہ جاتے ہیں۔ مہیندر ناتھ کے افسانوں میں یہ ساری کشمکش زندہ اور متحرک دکھائی دیتی ہے۔ عمل ہے، پسپائی ہے، شکستیں ہیں، سپنے ہیں، محبت اور نفرت ہے۔ یہ تمام باتیں مہیندر ناتھ نے بے باک کردار نگاری کی مدد سے انجام دی ہیں ۔۔۔ حقیقت اور طنز کے میل سے واقعات پر تیز روشنی پڑتی ہے اور نئی حقیقت نگاری جنم لیتی ہے۔

"لیکن امانت ۔۔۔ امانت ہی ہوتی ہے، اگر کپلا چچی کی امانت ہے تو میری بھی امانت ہے۔ اس میں خیانت کرنے کا مجھے کوئی حق نہیں۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے تو کون ذمہ دار ہوگا چچی منہ دکھانے کے لائق نہ رہے گی۔ شادی کرنے سے تو میں رہا۔ یہ تو کپلا بھی جانتی ہے۔ کہ وہ مجھ سے شادی نہیں کر سکتی۔ وہ میری چچی کی رشتے دار ہے اور میں اس کی چچی کا رشتہ دار ۔۔۔ اور درمیان میں چچی حائل ہے۔ چین کی دیوار کی طرح۔ ان گنت صدیوں کا تعصب اور جہالت راستہ روکے کھڑی ہے۔ اس ماحول سے نکلنا مشکل ہے۔ چاہے امنگیں کچلی جائیں، خواہشیں مردہ ہو جائیں۔ عورتیں جوانی میں بوڑھی ہو جائیں۔ لیکن چین کی دیوار قائم رہے اور قائم رہے گی۔" (تاریکی اور روشنی)

حقیقت اور طنز اگر یہ دونوں نہ ملتے تو چچی صرف کپلا کی رہ جاتی۔ ایک مثال نہ بنتی۔ متوسط طبقہ کا تضاد نمایاں نہ ہوتا اور کردار نگاری مکمل نہ ہوتی۔ حقیقت ایک بہت ہی مرکب اور پیچیدہ چیز ہے۔ بعض لوگ غلطی سے صرف خارجی منظر نگاری اور خارجی بیان کو حقیقت سمجھ لیتے ہیں۔ بعض لوگ جذبات کو پیچیدہ طور پر بیان کر دینے ہی کو حقیقت نگاری کہتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ حقیقت میں دونوں کی آمیزش ہوتی ہے۔ خارجی اور داخلی طور پر کردار کی پیچیدگی کو سمجھنا اور سمجھانا کردار نگاری اور اثر آفرینی کا راز ہے اسی اظہار بیان سے ملی ہوئی تجزیہ کی منزل ہے اور مہیندر ناتھ تجزیہ کرتے نہیں تھکتے۔ اس لئے ان کے افسانوں کے بعض حصے اثر کا خزانہ بن جاتے ہیں۔ مسکراہٹ کا تجزیہ بالکل ایک ڈاکٹر کی طرح، جو ایک مرض کو دوسرے مرض سے تشخیص کر لیتا ہے۔ ان داخلی اور خارجی عناصر سے مل کر بنتا ہے جن سے حقیقت نگاری میں جان پڑتی ہے۔

"ہم ایک مشینی دور سے گزر رہے ہیں۔ ہم اس زمانے میں پیدا ہوئے جب پانی اور ہوا پر انسان نے قابو پالیا ہے۔ ہم وقت، رفتار اور فاصلے پر حاوی ہو چکے ہیں۔ اب روحانی باتوں کا زمانہ نہیں۔ بالکل مادّی چیزوں کا تذکرہ ہوتا ہے اور اس لئے مسکراہٹیں بھی مادّی ہو گئی ہیں۔ اور جب کوئی میری طرف مسکرا کر دیکھتا ہے تو سوچنے لگتا ہوں کہ اس مسکراہٹ کا مطلب کیا ہے۔"

(چاندی کے متاد)

اور پھر اسی افسانے میں ایک اور لطیف تجزیہ!

"ایک جوتشی نے چند روز گزرے مجھے بتایا، کہ میں جلد مر جاؤں گا۔ میں جوتشی کی طرف دیکھنے لگا۔ برسوں سے جھوٹ بولنے سے اُس کے خد و خال مسخ ہو گئے تھے۔ چہرے پر ایک قسم کی نحوست برس رہی تھی۔ اور اس پتھریلی سڑک پر بیٹھے ہوئے نہ جانے اُسے کتنے برس ہو گئے تھے اور کون جانتا ہے اس نے کتنوں کے ہاتھ دیکھے اور ان کی قسمت کا جائزہ لیا......

لیکن سڑک پر گزرنے والوں نے کبھی یہ نہ سوچا کہ وہ کیوں بیس سال سے اس خاک آلود سڑک پر بیٹھا ہوا ہے۔ جہاں گندگی اور غلاظت کے انبار لگے ہوئے ہیں اور پیشاب کی بو سے پھیپھڑے جھلس جاتے ہیں۔ ان بیس سال میں اس کی قسمت کا ستارہ کبھی بلند

نہ ہوا۔ کیا وہ ترکیبیں، تجویزیں جو وہ دوسروں کو بتاتا تھا کبھی اس نے اپنے اوپر نہیں آزمائیں۔ کیوں یہ پتھریلی زمین اس کی بنجر زمین کا ایک اہم جزو بن گئی۔ کیا یہ سڑک یوں ہی پتھریلی رہے گی اور اس پر چلنے والوں کا ستارہ کبھی بلند نہ ہوگا۔ میں نے چاہا کہ اس جوتشی کو کھری کھری سناؤں۔ اور اس سے کہہ دوں کہ وہ کیوں جھوٹ بول کر اپنی روح کو گزند پہنچا رہا ہے۔ لیکن زندگی میں صرف روح ہی ہوتی تو میں اس سے یہ بات پوچھ لیتا۔ لیکن زندگی میں روح کے علاوہ پیٹ بھی ہے جو روح سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ روحانی تسلی کو خیرباد کہا جا سکتا ہے لیکن پیٹ کی بھوک کو خیرباد کہنا مشکل ہے۔"

ایسا تجزیہ جس میں داخلیت اور خارجیت اس طرح مل جائیں مکمل نقش بناتا ہے۔ یہ وہ خوبی ہے جس کا ذکر میں خاص طور سے اس لئے کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے نئے افسانہ نگار جب تک زندگی کی اس پیچیدگی کو نہ سمجھیں گے وہ یا تو فنی حیثیت سے اس کمزوری کا اظہار اس طرح کریں گے کہ افسانہ پروپیگنڈے کی سرحد سے مل جائے گا یا پھر صرف جذباتی اور تخیلی ہو کر بے مقصد ہو جائے گا۔ اور دونوں صورتیں کامیاب افسانہ نگاری کے لئے تباہ کن ہیں۔ تجزیہ ایک طرح کا اشارہ اپنے مقصد کی طرف ہونا چاہیے۔ تنقید ہونی چاہیے۔ امرت اور زہر جو کچھ بھی پیش کرنا ہے اسی کے اندر سمویا ہوا ہونا چاہیئے۔ یعنی حیات کی راہیں جتنی پیچیدہ ہیں اتنی ہی پیچیدگی افسانہ میں بھی ہو۔ لیکن اس کا اظہار پیچیدہ نہ ہو۔ ثریا پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ ایک جگہ کالج کے لڑکوں کا تجزیہ کرتی ہے۔

"یہ کالج کے لڑکے بھی عجیب ہوتے ہیں۔ ان کا عشق بھی نرالا۔ برسوں کی غلامی نے ان کے عشق کو بھی بے زبان کر دیا ہے۔ یوں ہی لڑکیوں کی طرف ہمیشہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھیں گے۔ نہ منہ سے بولیں گے نہ سر سے کھیلیں گے۔ بہت ہوا تو کسی سے کندھا بھڑا دیں گے۔ کسی کو کوسنا دے کر واہیات سا مذاق کر دیں گے یا کسی لڑکی کے سامنے سے گزرتے ہوئے کھانس دیں گے۔ یہ سب حرکات اُن گونگے انسانوں کی طرح کی جاتی ہیں جن کی زبان سی دی گئی ہو۔ جن کی ذہنی قوتیں برسوں کی غلامی سے کند ہو گئی ہوں اور جن کی زندگیاں بے لذت اور تلخ ہو گئی ہوں۔ اور یہ گونگے عاشق۔"

(خلاء)

حقیقت شعور و لاشعور دونوں سے مرکب ہے۔ "بغاوت" میں چندا بڑی بہن کا حال سن کر بڑی تیزی سے زندگی کی ایک منزل سے دوسری منزل میں پہنچ جاتی ہے۔ اس کا اثر بڑا ڈرامائی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ "ہاتھ کا بڑھنا" میں رتنی کی آنکھیں پوری داستان کہتی ہیں جسے وہ سمجھ سکتا ہے جس کی روح رتنی کی آنکھوں میں در آتی ہے۔

مہندر ناتھ کے افسانوں کی اصل خوبی یہی ہے جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے۔ اس کے بہت سے نمونے ان افسانوں میں ملتے ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ جب وہ افسانہ کسی پلاٹ کو سامنے رکھ کر لکھتے ہیں اور باقاعدہ مکالمہ کے ذریعہ سے کرداروں کے خدوخال پیش کرتے ہیں تو پڑھنے والے پر اتنا اثر نہیں پڑتا لیکن جب کوئی پلاٹ نہیں ہوتا بلکہ صرف زندگی کا پیچ خاکہ ہوتا ہے تو مکالمہ ہی افسانے کی جان بن جاتا ہے۔ اس حیثیت سے "حنائی انگلیاں" ایک کامیاب تجزیہ ہے۔

یہ تو میں کہہ چکا ہوں کہ مہندر ناتھ کے افسانوں کا پس منظر متوسط طبقہ ہے۔ یہ زمین بڑی زرخیز ہے۔ اس کے بسنے والوں میں بہت تنوع ہے۔ اس میں ہر طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ جن کی گفتار اور کردار میں ہندوستانی زندگی کا پورا بہاؤ دیکھا جا سکتا ہے۔ یہاں کی معاشرتی اور اقتصادی حالت سیاسی غلامی، جنسی فضا، سب پر پردہ سا پڑا ہوا ہے۔ جس سے حقیقتیں چھپ جاتی ہیں لیکن تیز نگاہیں اس کے باہر اور اندر بھی دیکھ سکتی ہیں۔ وہاں ایک اور دنیا ہے۔ اس کے لئے شاید ہم ثریا کے ساتھ کہہ سکیں۔

"موسم کتنا خوشگوار ہے، ہوا کیسی ٹھنڈی اور سکون بخش ہے، پھولوں میں کتنی تازگی ہے، اور ہرے ہرے پتوں میں کتنی چمک ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر طرف بہار کی دلہن اپنے ہاتھوں سے حسن بکھیر رہی ہے۔ یہ لانبے لانبے درخت۔ یہ خوبصورت اور حسین پرندے۔ یہ پھیلا ہوا آسمان۔ یہ سورج کی کرنیں۔ یہ سب حسن کس کے لئے ہے۔ آؤ میری ثریا محبت کریں۔"

(خلاء)

یہ محبت کے لائق دنیا ہماری موجودہ دنیا میں کہیں چھپی بیٹھی ہے اور اس وقت نکل سکتی ہے جب ہم اس پرانی دنیا سے نفرت کر کے اس نئی دنیا کے لئے اپنے دل میں جگہ بنائیں۔ جب تک یہ پرانی دنیا ہے پریشانی ہوگی، چاہے ہم پریشانی کا سبب سمجھ سکیں یا نہ سمجھ سکیں۔

"میں اکثر سوچتا رہتا ہوں کہ میں کیا چاہتا ہوں، میں کیوں پریشان ہوں اور آہستہ آہستہ مجھ پر یہ بات آشکار ہونے لگی کہ مجھے کلرکی سے نفرت ہے۔ مجھے ان ساٹھ روپوں سے نفرت ہے، مجھے ان بچوں سے نفرت ہے، مجھے اس گھٹے ہوئے ماحول سے نفرت ہے، مجھے ان چھوٹے چھوٹے مکانوں سے نفرت ہے، مجھے انسانوں کی کمینگی سے نفرت ہے۔ یہ کیوں ہر طرف غلاظت ہی غلاظت نظر آتی ہے، کیوں ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہوتا ہے۔ چھتوں پر اندھیرا، برتنوں پر اندھیرا، چولہے پر اندھیرا، روٹیوں پر اندھیرا اور آہستہ آہستہ یہ اندھیرا پھیلتا جاتا ہے۔ کائنات کے ذرے ذرے پر چھا جاتا ہے۔ انسان کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ مجھے اس نظام سے نفرت ہونے لگی۔ جہاں اس قسم کا اندھیرا پھیلا رہتا ہے، کیوں نہ میں اس اندھیرے کو چیر دوں۔ اس اندھیرے کی قبا کو پھاڑ دوں، تاکہ روشنی کا منبع اعظم پھوٹ پڑے کم از کم ان چھوٹے مکانوں میں روشنی تو آجائے"۔

(چاندی کے تار)

جب افسانہ نگار اور ادیب فکر کی اس منزل سے گزرتا ہے تو اس کے یہاں مواد اور ہیئت دونوں مل کر خوبصورت افسانے بنتے جاتے ہیں اور یہ بات قابلِ اطمینان ہے کہ مہندر ناتھ نے اپنے افسانوں کی بنیاد ٹھوس مواد پر رکھی ہے اور صرف جوانی کے ہیجان سے متاثر ہو کر کہانیاں نہیں کہی ہیں۔ ۱

مہندر ناتھ کے افسانوں کا موضوع اب بھی انسانی زندگی کا معاشی پہلو، اُس کی آرزوئیں اور ناکامیاں، ذہنی الجھنیں، پیٹ کی بھوک اور اُس سے بھی بڑی جنسی بھوک ہے۔ افسانہ نگار نے ان سب مسائل کو کبھی پورے فنی لطف و لذت سے اور کبھی پورے تبلیغی جوش سے افسانوں میں جگہ دی ہے اور کبھی کبھی اِن دونوں میں ایسا امتزاج اور توازن پیدا کیا ہے کہ فن میں بھی لطافت اور گھلاوٹ پیدا ہوگئی ہے۔

وقار عظیم

(داستان سے افسانے تک)

ممتاز حسین مرحوم

تجزیہ

۱۹۵۶ء تک

مہندر ناتھ کی کہانیاں کچھ ایسی ہیں جو مہندر کے نئے سمت کو متعین کرتی ہیں۔ میں مہندر کی قوت اسی سمت میں دیکھ رہا ہوں۔ مہندر نے اسی نئی سمت کے دریافت کرنے میں کافی وقت لیا ہے۔ وہ خود اپنے تجربوں سے اس منزل کی طرف بڑھا ہے۔ یہ سمت زندگی کی نامیہ طاقت کی عکاسی ہے۔ پہلے مہندر بھی ہمارے عام متوسط طبقے کے ادیبوں کی طرح جنسیات کا شکار رہا ہے نوجوانی کے دنوں میں یہی حقیقت اسے ستاتی رہی۔ اپنے مختلف پہلوؤں کو اُس کے سامنے اُجاگر کرتی رہی۔ اس حقیقت کا ہر نقش حسین اور ہیبت ناک تھا۔ مہندر نے ان دونوں ہی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ مہندر کبھی بھی شدید قسم کی رومانیت میں ڈوبا نہ تھا۔ اس نے اپنے کو کبھی بھی محبت کی نرم اور لطیف لے پر بہنے نہیں دیا ہے —— اس نے ہر حسین صورت کو روک کر اس کے اوپری غازے کو اتارا ہے۔ اور یہ پوچھا ہے۔ کیا تم واقعی خوش ہو۔ مہندر کا یہ رجحان بہت پرانا ہے۔ جب مہندر بمبئی میں فلمی دنیا سے متعارف ہوا۔ ڈائرکٹر، آرٹسٹ، ایکٹرس اور ایکٹرلیسوں سے ملا تو اُسے اس اوپری آب و تاب اور ظاہری جھجک کی حقیقت کا پتہ چلا۔ اس نے ایکسٹرا لڑکیوں کی عصمت فروشی کے راز کو سمجھا۔ ان کی دیوانگی، فریفتگی، حزن آمیز قہقہوں کے پیچھے شکست خوردہ شخصیت کا پتہ چلایا۔ اس حقیقت کا پورا مرقع آپ کو "ایک دو تین"، میں ملے گا۔ یہ تینوں جو دیکھنے میں الگ الگ ہیں۔ اپنے جسم کے تقاضوں میں الگ ہیں اپنی روح کے کوب میں چھپی ہوئی ہیں۔ ایک ہی حقیقت کی غمازی کرتی ہیں۔ ہمیں فریب دیا گیا۔ ہمیں زندہ رہنے کے لئے عصمت بیچنے پر مجبور کیا گیا ہے

فن کار کو یہی حقیقت خود اپنی زندگی کی تلخی جانچنے پر مجبور کرتی ہے۔ وہ سماج کے ہر طبقے کے لوگوں کو دیکھتا ہے۔ اس کے الگ الگ مشغلوں کا جائزہ لیتا ہے۔ اپنی نگاہ کو مادی لذتوں کے ہر نقش و نگار پر لوٹنے دیتا ہے۔ لیکن غمگین نگاہ کو تسکینِ جاں نہ پاتے ہوئے اسی حقیقت تک بہت جلد پہنچ جاتا ہے کہ وہ خود جس طبقے سے تعلق رکھتا ہے اقتصادی اعتبار سے موچیوں اور "بھیا" کے طبقوں سے الگ نہیں ہے۔ اس کی اپنی زندگی کی تمام تلخی اور ارد گرد کے ماحول کی تمام گندگی، غربت اور افلاس اسی چراغ کا اندھیرا ہے جو اُن کے سروں پر رکھ کر جلایا جاتا ہے۔ وہ سر اٹھا کر ملابار کی زرق برق زندگی کو دیکھنا چاہتا ہے۔ لیکن نہ تو چراغ ہٹتا ہے اور نہ وُہ اپنا ہی سر اُٹھا پاتا ہے جب یہ تلخی مہندر کے کام و دہن میں اور زیادہ رچ جاتی ہے تو وہ خالی "جیب" ہو کر اس حقیقت کو ذہنی طور پر ماننے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ کہ انسانیت کا مستقبل مزدوروں کے ہاتھ میں ہے۔

اس حقیقت تک پہنچنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ لیکن لطف تو جب ہے کہ فن کار خود اپنے تجربوں اور مشاہدوں کے ذریعے اس حقیقت تک پہنچے۔ مہندر نے ہوسناکی کی تمام منزلیں طے کی ہیں، بے شمار ایکٹرسوں پر فریفتہ ہوا ہے، کیک اور پیسٹری پر پھیلا ہے، وہسکی کی سرور آمیز کیفیتوں میں ڈوبا رہا ہے، انگریز، عیسائی، پارسی، ہندوستانی لڑکیوں کی عشق بازی کو غور سے دیکھتا رہا ہے۔

لیکن خود اپنی زندگی میں ان چیزوں کا فقدان محسوس کرتا رہا۔ وہ لالچ سے بھری ہوئی بیخودی میں راہ گیروں سے ٹکرا بھی گیا ہے لیکن اس نے اپنی ذات کو ان نظر فریب مناظر میں کھونے نہیں دیا ہے۔ اس نے سماجی زندگی کی افراتفری میں اس بنیادی تضاد کا پتہ چلا ہی لیا کہ یہ سب سرمایہ داری کا دیا ہوا ہے۔ اس نے اپنی ذہنی اور جسمانی آسودگی کو ایک مرض میں تبدیل نہیں کیا۔ اس نے فرائیڈ کے فلسفے کا سہارا نہیں لیا اور نہ اس نے عریاں نگاری سے لذت ہی لینی چاہی۔ یہ بات مہندر کو جنسیات پر لکھنے والوں سے ممتاز کر دیتی ہے حالانکہ بعض موقعوں پر آپ کو ایسی عبارتیں ملیں گی جن میں اکتساب لذت کا شائبہ پایا جاتا ہے لیکن اختتام تک پہنچتے پہنچتے اس کیفیت کی نفی ہو جاتی ہے۔ فطرتاً مہندر ناتھ رومانوی افتادِ طبع کا واقع ہوا ہے۔ وہ فلمی کہانیوں کی طرح رومانس اور محبت کا ایک پرونے والا دھاگا اپنی ہر کہانی میں قائم رکھتا ہے لیکن اپنے تجزیے اور چیزوں کی جانچ میں اس قدر بے لاگ ہے کہ اس کی رومانیت پاش پاش ہو جاتی ہے۔

"اس کی جیت" میں یہی کیفیت ملتی ہے۔ وہ ایک بھرپور رومانی فضا قائم کرتا ہے۔ اسے تمام دنیاوی مصیبتوں سے الگ کر دیتا ہے۔ پھر یکایک ایک لاش دکھا کر ان کے ذہن کو اس بری طرح مجروح کر دیتا ہے کہ چاندنی رات کا خیمہ ٹوٹ کر گر پڑتا ہے۔ مہندر کے دل میں جو خارجی دنیا کو دیکھنے کی خواہش ہے۔ اپنی زندگی سے ہٹ کر جو دوسروں کی زندگی دیکھنے کی خواہش ہے اُسے اس بات پر مجبور کرتی رہی ہے کہ وہ سماجی زندگی کے حادثات کا بھی جائزہ لے۔ مہندر نے اسی کوشش میں فساد کے عنوان کو بھی چھوا ہے۔ فساد کے موضوع پر "ندامت" مہندر کی پہلی کہانی ہے۔ یہاں مہندر کا رومانوی مزاج غالب ہے۔ فساد محبت کی راہ میں حائل ہے۔ فساد کے تباہ کن اثرات کے سامنے یہ ایک بڑی چھوٹی سی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ موضوع کے لحاظ سے یہ کہانی بھرپور نہیں ہے لیکن اس کی دوسری کہانی "انسان کی لاش" پہلی کہانی کے مقابلے میں بہت زیادہ اچھی ہے۔ بملا اور استانی دونوں ہی مصیبت زدہ ہیں لیکن وہ اپنا ذہنی توازن نہیں کھوتی ہیں۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ مصنف خود بھی اپنا ذہنی توازن نہیں کھوتا ہے۔ وہ ہندو اور مسلمان دونوں ہی کو رہزن بتاتا ہے۔ دونوں ہی کے درمیان انسان کی لاش رکھ کر یہ جتاتا ہے کہ اس فساد میں نہ صرف ہندو اور مسلمان مارے گئے بلکہ انسانیت کو بچانے والے بھی مارے گئے ہیں۔

مہندر نے اپنی تیسری کہانی کا موضوع یہیں سے لیا ہے "پاکستان سے ہندوستان تک" کا یہ موضوع یہ نہیں ہے کہ اس فساد میں کتنی بہیمیت اور بربریت کا مظاہرہ ہوا ہے بلکہ یہ کہ بہت سے لوگوں نے اپنا ذہنی توازن۔ اپنی انسانیت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ سماج نے باعصمت عورتوں کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھا۔ گھر والوں نے ترک موالات کر دیا اور شوہر نے تو دھتکار کر نکال دیا پھر بھی "پشپا" مستقبل کی روشنی کے سہارے ایک چٹان کی طرح کھڑی رہی۔ اس کہانی میں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ صفدر اور پشپا کے عشق کو پیش کرنا کہاں تک ضروری تھا۔ اس کو جاننے کے لئے مصنف کے نقطۂ نظر کو جاننا ضروری ہے۔ مہندر عشق کو پیش کر کے اس بات پر خاص طور پر زور دینا چاہتا ہے کہ صفدر کی انسانیت کی جانچ کڑی سے کڑی منزل میں کی جا سکے۔ صفدر کو پشپا مل جاتی ہے وہ اگر چاہتا تو اسے رکھ لیتا اور اپنی دیرینہ محبت کے جذبے کو تسکین دیتا لیکن اس نے اس عظیم خواہش کو بھی انسانیت کے نام پر تج دیا۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مہندر محبت میں زیادہ آئیڈیلسٹ نہیں ہے۔ ورنہ صفدر کی کشمکش کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ مہندر کی یہ کہانی بہت کامیاب کہانی ہے۔ مہندر نے اس کہانی میں انسانیت کی بجھتی ہوئی شمع کو اپنے دامن میں بچایا ہے۔ فساد کے موضوع پر لکھنے والوں نے اس پہلو کو تقریباً بالکل ہی نظر انداز کر دیا ہے۔

اس کہانی کی کامیابی تو ایک طرف۔ مجھے مہندر کے بارے میں ایک اور حقیقت کا انکشاف ہوا۔ اگر مہندر آئیڈیلسٹ نہیں ہے تو وہ رومان پرست بھی نہیں ہو سکتا ہے۔ یہ حقیقت بھی ہے کہ مہندر کے افسانوں میں رومانیت خود اس کی اپنی رومانیت نہیں ہے بلکہ اُس کے طبقے کے اس مطمح نظر کا نتیجہ ہے جو سنہرے مواقعے تلاش کیا کرتا ہے۔ یہ متوسط طبقہ اسی معنی میں کہنے کو تو رومان پرست ہے لیکن دراصل بڑا ہی حقیقت شناس ہے۔ مہندر اپنے اس طبقے کی خصوصیت کو بڑی اچھی طرح جانتا ہے

مہندر کا افسانہ ہے "مجھے خرید لو" اس میں اس طبقے کے اخلاق، عصمت اور عزت کی بنیاد کو بُری طرح بے نقاب کیا گیا ہے۔

بالعموم لوگوں کا یہ خیال ہے کہ یہ طبقہ اپنی قدروں کے بارے میں زیادہ قدامت پسند ہے۔ لیکن مہندر نے تو اس حقیقت کی بھی پول کھول دی ہے۔ مہندر کی یہی حقیقت بیں نگاہ اسے یہ کہنے پر مجبور کرتی ہے کہ " فٹ پاتھ کی زندگی سے لے کر گھریلو زندگی تک وہی بے حسی، گندگی اور وہی بھوک ہے۔"

یہ ہیں مہندر کے افسانے جو آپ کی خدمت میں پیش کئے جا رہے ہیں۔ مہندر اپنے فن کے ارتقائی دور میں ہے۔ اس نے پہلے کے مقابلے میں بڑی ترقی کی ہے۔ اس کا مشاہدہ اور تجربہ ہمہ گیر وسعتوں کا حامل ہو گیا ہے لیکن اُسے اپنے فن کو اور کسنے کی ضرورت ہے۔ موضوع کے انتخاب میں اور زیادہ وُسعت دینے کی ضرورت ہے۔ یہ تو میرا مشورہ ہوا۔ میری تنقیدی رائے یہ ہے کہ مہندر رومان پرست نہیں ہے بلکہ حقیقت نگار ہے۔ مہندر نے اپنی زندگی کے تجزیہ سے دوسروں کی زندگی کا پتہ چلایا ہے۔ اسی وجہ سے اس کے بیان میں تلخی، شدت اور احساس ناسودگی ہے وہ انسانیت کے باب میں رومان و محبت کی ہلکی پھلکی شعاعوں سے گزر کر طبقات کے اقتصادی کس بل کو بھی دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ نیا رجحان مہندر کو مزید دعوتِ فکر دے رہا ہے۔ ▲

شمیم احمد شمیم
ممبر پارلیمنٹ (سرینگر)

اعتراف

'بڑے بھائی' کا 'چھوٹا بھائی' ہونے میں یوں تو بہت سی قباحتیں ہیں لیکن سب سے بڑی قباحت یہ ہے کہ اگر بڑا بھائی زیادہ مقبول مشہور اور معروف ہو تو چھوٹے بھائی کی اپنی شہرت، شخصیت اور انفرادیت سب کچھ مانگے کا اجالا معلوم ہوتا ہے اور عام طور پر دنیا کو اس کی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ نہیں ہو پاتا۔ اس کی اپنی حیثیت اس کا مقام اور مرتبہ متعین کرنے میں ہمیشہ اس کے 'بڑے بھائی' کی دوستی یا دشمنی کو ملحوظِ خاطر رکھا جاتا ہے اور چھوٹے بھائی کو زندگی بھر اپنے چھوٹے بھائی ہونے کی قیمت چکانی پڑتی ہے۔ کم از کم ادب کی دنیا میں ایسا نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن ایسا ہوا ہے اور اردو کے ایک منفرد، صاحب اسلوب اور بالغ نظر ادیب کے ساتھ ہوا ہے۔ میرا اشارہ مہندر ناتھ کی طرف ہے کہ جنہیں زندگی بھر کرشن چندر کا بھائی ہونے کی قیمت ادا کرنی پڑی۔ اور جو موت کے بعد بھی کرشن چندر کے بھائی کی حیثیت سے یاد کئے جا رہے ہیں۔ یہ مہندر ناتھ ہی کا نہیں، کرشن چندر کا بھی المیہ ہے۔ اور اس کا اظہار، میرے نام ایک خط میں کرشن چندر نے یوں کیا ہے۔ "مہندر ایک ترقی پسند ادیب تھا، بارہ سال بمبئی ترقی پسند مصنفین کی انجمن کا سکریٹری رہا۔ انجمن اسی کے دم سے چلتی رہی، جس دن وہ سکریٹری شپ کے عہدے سے علیحدہ ہوا، انجمن ٹھپ ہو گئی۔ اس نے کوئی ڈھائی سو افسانے اور پندرہ ناول لکھے، لیکن میری وجہ سے دنیا نے اس کو وہ خراجِ عقیدت پیش نہیں کیا، جس کا وہ حقدار تھا۔ اس کا سب سے بڑا دشمن میں تھا۔"

مہندر ناتھ کا نام میں نے پہلی بار کب سنا تھا، مجھے ٹھیک سے یاد نہیں۔ لیکن ان کی جس کہانی نے مجھے پہلی بار متاثر کیا اس کا نام تھا، 'جہاں میں رہتا ہوں'۔ یہ کہانی میں نے ۱۹۵۰ء کے لگ بھگ پڑھی تھی اور جب سے اب تک ۲۴ برس گزر گئے ہیں۔ لیکن اس کا مجموعی تاثر۔ اس کی ساری فضا اور ماحول آج بھی میرے ذہن میں تازہ ہے۔ اور مہندر ناتھ کا نام سنتے ہی میری نگاہوں کے سامنے وہ دنیا بکھر جاتی ہے۔ کہ جو اس کہانی کا مرکز اور محور ہے۔ ہندوستان کی سیاسی آزادی، اس کے سماجی نظام اور اقتصادی ڈھانچے پر اس سے بڑھ کر کیا تنقید ہو سکتی ہے کہ آزادی کے ۲۷ برسوں میں وہ دنیا، جس کا نقشہ مہندر ناتھ نے اپنی اس کہانی میں پیش کیا تھا آج پہلے سے بھی زیادہ بدصورت، ناقابل برداشت، ناہموار اور ناقابل اعتبار بن گئی ہے۔ اور مہندر ناتھ جیسے کئی حساس قلم کار، اس کی ناہمواریوں اور ناانصافیوں کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ 'جہاں میں رہتا ہوں'، غالباً ۱۹۴۵ء میں لکھی گئی ہے لیکن آج برسوں بعد اسے اٹھا کر پڑھ لیجئے تو یوں معلوم ہو گا کہ یہ کل کی نہیں، آج کی کہانی ہے۔ یہ صرف مہندر ناتھ کی نہیں، ایک پوری نسل کی کہانی ہے۔ اس میں اس عہد کا سارا دکھ، اس نظام کی ساری کراہٹ اور اس کھوکھلے سماج کے سارے تضادات سما گئے ہیں۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ یہ مہندر ناتھ کی بہترین کہانی ہے۔ لیکن یہ اُن کے مزاج، ان کے اسلوب اور ان کی شخصیت کی سب سے نمائندہ کہانی ہے اور اپنے اس دعوے کے ثبوت میں۔ صرف شہادت پیش کر سکتا ہوں کہ ان کے اڑھائی سو افسانوں میں، جن میں چائے کی پیالی، چاندی کے تار، جنوب کا ساتھی، ڈیڑھ روپیہ، بنیا بھکاری اور دوسرے بہت سے

مشہور افسانے شامل ہیں۔ میرے ذہن میں آج بیس برس بعد صرف 'جہاں میں رہتا ہوں' کا تاثر ہی محفوظ ہے۔

مہندر ناتھ سے میں صرف ایک بار ملا ہوں، لیکن اس ملاقات سے بہت پہلے، میں ان کی شخصیت میں دلچسپی کھو بیٹھا تھا۔ ان کے بہت سے افسانے پڑھنے کے بعد، میں ان کے جاندار اسلوب اور ان کی بے رحم حقیقت نگاری سے بہت متاثر ہوا تھا۔ اور یہ ان دنوں کی بات ہے جب ترقی پسندی صرف ایک تحریک کا ہی نہیں بلکہ نوجوانوں کے لئے ایک نئے فیشن کی علامت تھی۔ اور مہندر ناتھ کا نام ترقی پسند ادیبوں کی پہلی نہ سہی دوسری صف میں نمایاں تھا۔ پھر انہی دنوں میں نے کہیں یہ پڑھا کہ یہ جو مہندر ناتھ نام کا افسانہ نگار ہے یہ مشہور و معروف افسانہ نگار کرشن چندر کا چھوٹا بھائی ہے۔ اور اس انکشاف نے مہندر ناتھ سے وابستہ میرے سارے رومانوی اور افسانوی تصورات چکنا چور کر دئے! اور میں نے دل ہی دل میں ان کے متعلق یہ فیصلہ کر دیا کہ یہ جو اُن کا نام ترقی پسند ادیبوں کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ کرشن چندر کو خوش کرنے کے لئے کیا جاتا ہے اور یہی نہیں، میں نے اس نئے انکشاف سے یہ گمراہ کن نتیجہ بھی اخذ کر لیا کہ مہندر ناتھ کے نام سے چھپنے والے بیشتر افسانے دراصل اس کا بڑا بھائی کرشن چندر لکھتا ہوگا۔ میرے اس بے بنیاد شبہ کے لئے میرے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا لیکن جس طرح میں کسی عورت کے بارے میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ وہ اچھے شعر کہہ سکتی ہے۔ اور جب بھی کوئی خاتون شاعرہ کسی مشاعرے میں اپنا کلام سناتی ہیں میں یہی سمجھتا ہوں کہ وہ اپنے شوہر یا کسی عاشق کا کہا ہوا کلام پڑھ رہی ہیں۔ اسی طرح میں اکثر بڑے بھائیوں کے چھوٹے بھائیوں کی تخلیقی صلاحیتوں کو شک و شبہ کی نگاہوں سے دیکھتا ہوں۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ میں جانتا ہوں۔ لیکن میں ایسا ہی کرتا ہوں۔ میں مانتا ہوں اور مجھے افسوس ہے کہ بہت دنوں تک، میں مہندر ناتھ کے ساتھ یہ ناانصافی کرتا رہا۔ اس سے زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ اور بھی بہت سے لوگوں نے مہندر ناتھ کے ساتھ یہی زیادتی کی ہے، ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ اتنا باصلاحیت فن کار اور صاحب طرز افسانہ نگار، اپنے فن اور اپنے Contribution سے زیادہ، کرشن چندر کے چھوٹے بھائی کی حیثیت سے جانا جائے۔ یہ صحیح ہے کہ مہندر ناتھ کے فن پر کرشن چندر کے اسٹائل اور آہنگ کی چھاپ ہے۔ لیکن یہ چھاپ صرف مہندر ناتھ پر ہی نہیں اس دور کے سینکڑوں افسانہ نگاروں پر ہے۔ قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ مہندر ناتھ نے ان کا چھوٹا بھائی ہوتے ہوئے بھی اپنی تحریر اور اپنی شخصیت میں ایک ایسی انفرادیت پیدا کر لی تھی کہ افسانوی ادب کے سنجیدہ طالب علم، بڑی آسانی کے ساتھ، ان کے رنگ اور آہنگ کو پہچان سکتے ہیں۔ میں نے اپنی یاد تازہ کرنے کے لئے جب ابھی، اُن کے کچھ افسانے پڑھے، تو مجھے تعجب ہوا کہ میں نے کس جہالت پر اپنی بصیرت کی بنیادیں قائم کی تھیں۔

میں نے ابھی مہندر ناتھ سے اپنی پہلی اور آخری ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ یہ ملاقات ۱۹۶۹ء میں بمبئی میں ہوئی تھی۔ یہاں جب کرشن چندر کی صدارت میں ایک کل ہند کنونشن ہوا تھا۔ اور اس میں وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی بھی شریک ہوئی تھیں۔ انہی دنوں کنونشن میں شریک باہر سے آئے ہوئے کچھ مہمانوں کے اعزاز میں ساحر لدھیانوی نے ایک دعوت دی تھی۔ جس میں کچھ مقامی شعراء اور ادیب بھی شامل تھے۔ باہر سے آئے ہوئے ادیبوں میں مجھے اس وقت صرف پنجابی زبان کی مشہور شاعرہ اور افسانہ نگار امرتا پریتم کا نام یاد آرہا ہے۔ نائو نوش کی محفل ہو، شاعروں اور ادیبوں کا اجتماع ہو اور وہ بھی بمبئی جیسے رنگین شہر میں، امرتا پریتم جیسی مہمان اور ساحر جیسا میزبان ہو، اور کسی کو کیا چاہئے۔ آدھی رات تک ہر مہمان چہکتا اور بہکتا رہا، لیکن ایک شخص بڑی سنجیدگی سے، بڑے لئے دئے انداز میں، اس پورے ماحول کا حصہ ہوتے ہوئے بھی اس سے الگ تھلگ سا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ایک عجیب سی تھکن اور اس کے چہرے سے ایک بیزاری سی ٹپک رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے یہاں زبردستی لایا گیا ہے اس محفل طرب میں کس کو یہ فرصت تھی کہ وہ اس شخص کی تنہائی اور اس کی بیزاری کا سبب پوچھے۔ بہت رات گئے جب محفل اکھڑنے لگی اور مہمانوں کو واپس بھیجنے کی تیاریاں شروع ہوئیں تو مجھے اور اس بیمار اور بیزار سے مہمان کو ایک ہی کار میں بٹھا دیا گیا۔ انھوں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ "میں مہندر ناتھ

ہوں۔" اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ مہندر ناتھ نے مجھے چوری کرتے ہوئے پکڑا ہے۔ مجھے یوں لگا کہ وہ بھانپ گئے ہیں کہ میں انہیں بہت دنوں تک کرشن چندر کا قلمی نام سمجھتا رہا ہوں۔ یہ میرا وہم تھا لیکن اس وہم نے مجھے ایک شدید احساسِ گناہ میں مبتلا کر دیا۔

مہندر ناتھ دادر پہنچ کر گاڑی سے اتر گئے۔ رخصت ہوتے وقت انھوں نے کہا "مجھے آپ کی کل والی تقریر بہت پسند آئی۔ آپ سے پھر ملاقات ہونی چاہیئے۔ اور آپ جب بھی بمبئی آئیں، مجھے ضرور اطلاع کرا دیجیئے۔

یہ میری اُن سے پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ اور مجھے ان کی موت سے زیادہ اس بات کا دکھ ہے کہ میں ان کے جیتے جی، اُن کے سامنے، اپنے گناہ کا اعتراف بھی نہ کر سکا۔ ▲

غلام رسول رینزو
سری نگر

مہندر میرا بھائی

مہندر ناتھ سے میری پہلی ملاقات اردو کے عظیم فن کار کرشن چندر کے گھر پر ہوئی۔ کرشن چندر، مہندر ناتھ کے بڑے بھائی بھی تھے اور ادبی دنیا میں گورو بھی۔ اُن کو اپنے بڑے بھائی اور گورو کے ساتھ وارفتگی کی حد تک محبت اور عقیدت تھی۔ اس کا اندازہ میں نے مہندر ناتھ کے ساتھ اپنی پہلی ملاقات میں ہی کر لیا۔ کرشن جی کے گھر پر تھوڑی سی بات چیت کے بعد ہم لوگ کہیں باہر گھومنے چلے۔ میری کار میں کرشن چندر، علی سردار جعفری اور مہندر ناتھ تھے۔ خوب ہنسی مذاق ہو رہا تھا۔ کرشن جی نے مجھے اپنا تازہ ناول "آئینے کے سامنے" دے دیا تھا۔ انھوں نے اس ناول کا انتساب اپنی رفیقہ حیات سلمیٰ جی کے نام کیا تھا اور عبارت کے طور پر فارسی کا یہ مشہور شعر لکھا تھا۔

از کفر و ایماں ساختم　　از آذری پرداختم
من قبلۂ خود ساختم　　بر روئے محرابِ کسے

علی سردار جعفری نے بھی اپنی تازہ تخلیق "ایک خواب اور" اپنی بیگم سلطانہ جعفری کے ساتھ یہ شعر لکھ کر منسوب کی تھی ؎

"کہ گل بدستِ تو از شاخ تازہ تر ماند"

میں نے کار میں یہ دونوں شعر دہرائے اور مذاق کے طور پر کہا "اچھا ہے۔ آج کل آپ حضرات اپنی بیگمات کی تعریف میں شعر تراشتے ہیں۔"

کرشن چندر نے چھوٹتے ہی کہا: "کیا کریں بھائی وہ جو ہر روز ہم کو تراشتی ہیں!"

سب لوگ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

مہندر ناتھ نے کرشن جی کی موجودگی سے کچھ مرعوب سا ہو کر دھیمے سے کہا تھا۔ "رینزو صاحب ان باتوں کا تذکرہ نہ کیجئے۔ یہ تو Tactics کے زمرے میں آتی ہیں" کار ایک بار پھر قہقہہ زار بن گئی۔ اور ہم کافی دیر تک ہنستے رہے۔

اس کے بعد مہندر اور میں اس قدر گھل مل گئے کہ گویا برسوں کی ملاقات تھی۔ اور ان دو بھائیوں میں تیسرا بھائی میں شامل ہو گیا تھا۔

ان ہی دنوں کا ایک اور واقعہ یاد آتا ہے۔ میں، کرشن چندر اور مہندر ناتھ، بمبئی کے نٹ راج ہوٹل کے "کباب کارنر" میں دن کا کھانا کھا رہے تھے کہ اتنے میں راجندر سنگھ بیدی ایک صاحب کے ساتھ ہال میں داخل ہوئے۔ علیک سلیک کے بعد ہم نے اُن

کو کھانے کی دعوت دی۔ بیدی صاحب بار بار معذرت کرتے رہے۔ کرشن جی ذرا "موڈ" میں تھے۔ کھانے کو نظر انداز کر کے بحث میں الجھ گئے۔

"ارے بھئی کچھ وجہ تو بتاؤ۔ تم جو اس ہوٹل میں کھانا کھانے کے لئے داخل ہو گئے۔ ہمارے ساتھ کھانے میں آخر کیا دقت ہے تم تو ......"

بیدی صاحب مسکراتے ہوئے پھر بھی معذرت کرتے رہے "نہیں صاحب آپ لوگ شوق فرمائیے۔ میں ابھی کھانا منگواتا ہوں۔ آپ فکر نہ کیجئے۔"

مگر کرشن جی اپنی لے میں بہے جا رہے تھے اور مصر تھے کہ بیدی صاحب ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھالیں۔ آخر مہندر ناتھ نے نہایت ہی متانت سے کہا۔

"بھائی صاحب! یہ سمجھتے ہیں کہ شاید ان کو ہمارے کھانے کا بل بھی ادا کرنا پڑے گا۔" بس پھر کیا تھا "کباب کارنر" قہقہہ کدہ بن گیا۔

بیدی صاحب بھی کب ہار ماننے والے تھے۔ انھوں نے جھٹ سے فقرہ کسا۔ "نہیں بھائی میں تو حلال کھانے کا قائل ہوں آپ کی طرح جھٹکا تھوڑے ہی ہوں۔" ہنسی کے فوارے پھر پھوٹنے لگے۔ اس کے بعد بیدی صاحب نے ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھالیا اور واقعی ہمارا بل بھی ادا کر دیا۔

کسے معلوم تھا کہ اردو کا یہ ممتاز، خندہ ذہن اور خوش فکر ادیب مہندر ناتھ اتنی جلدی عدم کی راہ لے گا۔ اور اردو ادب کو ایک نقصان عظیم کا متحمل ہونا پڑے گا۔ مہندر ناتھ کے ساتھ میں اس لئے بھی الفت تھی کہ وہ جموں و کشمیر کی ریاست میں پیدا ہوئے تھے۔ یہاں کے چیڑ اور چناروں نے ان کے فکر و فن کو تازگی بخشی تھی۔ ان کے والد علاقہ پونچھ کے ایک مشہور ڈاکٹر تھے۔ اسی علاقہ میں مہندر ناتھ کا جنم ہوا۔ یہیں انھوں نے اپنا لڑکپن گزارا۔ اور یہیں انھوں نے علم و ادب کی وادی میں بھی قدم رکھا۔ مجھے یاد ہے، مرنے سے چند ماہ قبل انہوں نے اپنی اس جنم بھومی (پونچھ) کا آخری دورہ کیا۔ کرشن چندر پر مرکزی سرکار کی طرف سے ایک فلم بن رہا تھا۔ مہندر ناتھ اس کے پروڈیوسر تھے جب اس فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں وہ کرشن چندر، سلمیٰ جی، بہن سرلا دیوی اور اپنی رفیقہ حیات کے ساتھ پونچھ چلے گئے۔ اور وہاں کے سب شہریوں سے ملے۔

پونچھ کے بعد اسی قسم کی شوٹنگ وادی کشمیر میں بھی ہوئی۔ اور مجھے مہندر ناتھ کو اور بھی قریب سے دیکھنے اور ان سے ملنے کا موقعہ ملا۔ وہ بنیادی طور پر ایک ادیب تھا۔ سادگی اور معصومیت میں لپٹا ہوا۔ ایک ایسا فن کار جو زندگی کی صبح کے خواب دیکھتا رہتا ہے اور ایک نئے نور اور ایک نئی تابندگی کا منتظر رہتا ہے۔ لیکن عملی دنیا میں اس کی سادگی اور معصومیت قدم قدم پر ابھر کر اس کا راستہ روک لیتی ہے۔ آج کل کی مادی دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے حد سے زیادہ شاطر اور اچھل کود کی ضرورت رہتی ہے۔ مہندر ناتھ اس سے نابلد تھا۔ وہ ایک خواب دیکھنے والا فن کار اور ایک نئی زندگی اور نئی دنیا کا مصور تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مادی دنیا کی شاطرانہ طریقے اسے کبھی نہ آئے۔ اور وہ اپنے پیچھے دولت قسم کی کوئی بھی چیز نہیں چھوڑ گیا۔

اس کی سادگی اور معصومیت کا ایک واقعہ سنئے۔ کرشن چندر پر فلم کی شوٹنگ کے دوران کام کرنے والوں کی جو پارٹی مہندر ناتھ کے ساتھ دورہ کر رہی تھی ظاہر ہے اس کے لئے سب انتظامات کی ذمہ داری پروڈیوسر کی حیثیت سے اسی پر تھی۔ لیکن یہ بھولا بھالا ادیب اس جھمیلے سے اس قدر گھبرا جاتا تھا کہ اس کی معصومیت پر ترس آتا تھا۔ اسے معلوم ہی نہ تھا کہ کھانا تیار کرنے کے لئے چاول، آٹے اور دال کی ضرورت رہتی ہے اور نہ ہی اس بات کا علم تھا کہ یہ چیزیں خریدی کیسے جاتی ہیں۔ چنانچہ ہر پڑاؤ پر وہ ہڑبڑا جاتا تھا۔ اور اس کی گھبراہٹ قابل دید ہوتی تھی۔ ایسے لگتا تھا کہ ایک بال یوگی کو گرہست کے ساتھ باندھ دیا گیا ہو۔ وہ اس سے بھاگنا چاہتا ہے مگر یہ مادی

دنیا اس کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ مہندر ناتھ جیسے درجنوں ادیب ہمارے ملک میں ہیں جن کو زندہ رہنے کے لئے نہ معلوم کیا کیا پیشہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ کوئی اور ملک ہوتا تو ان فن کاروں کو زندگی کی ہر سہولت مہیا ہوتی اور ان کا ادب اور ان کی تخلیقات ہی ان کو زندگی کا ہر سکھ مہیا کر سکتی تھیں لیکن وہ انوارِ سحر ابھی قریب نظر نہیں آتا اور مہندر ناتھ اسی نور کی تلاش میں تھک کر خود ہی اندھیارے میں کھو گیا۔ یہ ہمارے موجودہ سماج کا سب سے بڑا المیہ ہے جس کا ہمارے پاس ابھی کوئی جواب نہیں۔

میں یہاں مہندر ناتھ کی ادبی حیثیت پر بحث نہیں کرنا چاہتا۔ حقیقت یہ ہے کہ پچھلے دس گیارہ برس سے اردو کے ادیبوں کی تخلیقات مہیا کبھی نہیں ہوتیں۔ اِکّے دُکّے کہیں رسائل میں کچھ چھپا تو دیکھ لیا۔ لیکن ان کی چھپی ہوئی کتابیں کم از کم کشمیر میں نہیں ملتیں۔

مرنے سے پہلے البتہ مہندر ناتھ نے اپنی تخلیقات کا ایک پورا سیٹ سرینگر میں مجھے پیش کیا تھا۔ اس کے بعد ہی وہ بمبئی لوٹ گئے اور چند ہی دن بعد وہ اس سفر پر روانہ ہو گئے جہاں سے ؎

جانے والے کبھی نہیں آتے
جانے والوں کی یاد آتی ہے

مہندر ناتھ کی کتابوں کا یہ سیٹ ابھی بھی میری الماری میں میرے سامنے رہتا ہے۔ اور میں جب بھی اِن کتابوں کو دیکھتا ہوں تو دل ہی دل میں ہوک اٹھ کے ذہن کہتا ہے۔

”مہندر تم مرگئے۔ نہیں نہیں بھائی! تم مر کیسے سکتے ہو۔ تم تو زندہ ہو۔ وہ میری الماری میں بیٹھے مجھ سے ہم کلام ہو۔ مَیں تیرے خواب کی تعبیر کا منتظر ہوں۔ مَیں اس نور کی تلاش میں ہوں جس کو تم ڈھونڈ رہے تھے۔ وہ سحر ضرور آئے گی مہندر۔ تمہارے فکر کے گلِ تر پھر بہار لے کر آئیں گے۔ تو موجِ صبا کے ساتھ جشنِ بہار لے کر آنا۔ ہم کشمیر کی سرزمین میں اُس جشن کے موقع پر تمہیں بلائیں گے۔ تم ضرور آ جانا میرے بھائی۔ کشمیر کے چنار تمہارا انتظار کریں گے۔ مَیں بھی تمہارا منتظر ہوں۔ تمہارے بھائی کشمیری تمہیں یاد کرتے ہیں۔ وہ تمہاری راہ دیکھتے رہیں گے۔“

”عورت کا شباب بھی چند روزہ ہوتا ہے۔ جب چڑھتا ہے تو طوفانی ندی کی طرح خس و خاشاک کو بہا کر لے جاتا ہے اور جب اترتا ہے تو پھٹے ہوئے غبارے کی طرح چُرمُر ہو کر رہ جاتا ہے۔

— مہندر ناتھ

اُوپندر ناتھ اشک

کاش مہندر میرا بھی بھائی ہوتا

۱۹۳۸ء کے موسم گرما کی جس صبح میں ہندو ہاسٹل رشی نگر (لاہور) کے آنگن کی بالکنی میں کرشن چندر سے ملا اسی صبح میں نے مہندر ناتھ کو بھی دیکھا۔ سامنے کے ایک کمرے کی چوکھٹ پر وہ کنہیا لال کپور کے ساتھ کھڑا باتیں کر رہا تھا اور اسی سے میں نے کرشن کے کمرے کا نمبر پوچھا تھا۔ اس کے بعد لاہور کے زمانے میں جب جب میں کرشن کے گھر گیا، مہندر نے دروازہ کھولا یا کرشن کے بارے میں خبر دی یا بیٹھک میں کرشن کے ساتھ باتیں کرتے کوئی چیز لاتے یا لے جاتے اس کی جھلک مل گئی۔ لیکن اسے نزدیک سے جاننے اور چاہنے کا موقع مجھے آل انڈیا ریڈیو دلی کی اپنی نوکری کے تین برسوں میں ہی ملا۔ لاہور میں مہندر ناتھ صرف کرشن کا چھوٹا بھائی تھا۔ اور ہمارے متوسط درجے کے سماج میں چھوٹے بھائی سے جو ہلکی سی دوری قائم رہتی ہے وہی لاہور کے زمانے میں، میرے اور اس کے درمیان بھی رہی۔ پھر وہ ہلکی سی مغائرت کی دیوار کیوں کر یکسر منہدم ہو گئی اور کرشن کا چھوٹا بھائی مہندر، کرشن کی بہ نسبت میرے قریب تر ہو گیا — میرا دوست اور میرا رازدار بن گیا۔ یہ بتانے کے لئے مجھے اپنی زندگی کے ایک نہایت تلخ لیکن اس کے باوجود قدرے شیریں باب کی نقاب کشائی کرنی ہوگی — قدرے تفصیل کے ساتھ!

۱۹۳۶ء میں، میری پہلی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا۔ شروع شروع میں میں اُس سے بے حد نالاں رہتا تھا لیکن ایک ہی برس میں میری اس بھولی بھالی فراخ دل اور ہنس مکھ بیوی نے مجھے پوری طرح اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ یہاں تک کہ جب چار سال بعد دِق کے عارضہ میں مبتلا ہو کر، ایک طویل علالت کے بعد وہ مجھے چھوڑ گئی تو میں نے من ہی من کہا۔ کہ میں اب دوبارہ شادی نہیں کروں گا۔ ویسی سادہ لوح، خوش مزاج اور محبت کرنے والی بیوی کے ساتھ چند برس گزارنے کے بعد کسی دوسری عورت کے ساتھ نباہنا مجھے بہت مشکل دکھائی دیتا تھا۔ لیکن اس کی وفات کے سال ڈیڑھ سال بعد ہی لاہور کی ایک کانگریسی لڑکی کے چکر میں پھنس گیا۔ میں دوسری شادی کرنے کے ذرا بھی موڈ میں نہ تھا جب مجھے محسوس ہوا کہ اگر وہ اور ہفتہ بھر میرے ہاں آتی رہی تو میں مجبوراً اس سے شادی کر لوں گا۔ اور پھر زندگی بھر اسے اور اپنے آپ کو کوستا رہوں گا۔ تو ایک دن میں نے اُسے بری طرح ڈانٹ دیا۔ اس کے دل کو اس قدر ٹھیس لگی کہ اس نے انہی دنوں افریقہ سے شادی کی غرض سے آئے ہوئے ایک مالدار لڑکے سے شادی کر لی اور ہفتے پندرہ دن میں میری زندگی سے نکل گئی۔

یہ سب کچھ جیسے ہوا، جس طرح وہ اپنی سگائی سے پہلے ایک دن مجھ سے ملنے آئی اور پورا دن مغموم صورت بیٹھی رہی اور اس کی شادی کے بعد لاہور کے ہندی داں حلقے میں جو شور مچا اور دوستوں نے مجھے اس کو لے کر جتنا پریشان کیا، اس سے لاہور مجھے کاٹ کھانے کو دوڑنے لگا اور میں نے اسے چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ انہی دنوں کا کا صاحب کالیلکر نے کسی تعلیمی اسکیم کے سلسلے میں مجھے واردھا بلایا اور میں نے ان کی پیش کش منظور کر لی۔ عجیب بات ہے کہ جب تک وہ لڑکی لاہور رہی، اُس کے لاکھ زور دینے پر میں نے کھادی نہیں پہنی، لیکن اس کے جانے کے بعد میں نے لٹھے کی تہمد، زین کی نکر اور سوٹ بوٹ — سب کو تلانجلی دے دی اور موٹی کھادی کے کرتے سلوا لئے۔ یوپی کے ایک ہندی

ادیب سے دھوتی باندھنا بھی سیکھ لیا اور وار دھا جانے کے لئے تیار ہو گیا۔

لیکن وہاں جانے سے چند دن پہلے، پنجابی کے مشہور شاعر اور میرے دوست سردار موہن سنگھ نے مجھے خبردار کرتے ہوئے کہا ــ "اشک تم قہقہہ لگاتے ہو تو چھت پھٹتی ہے، وہاں اتنے زور سے ہنسو گے تو مہاتما گاندھی کی یکسوئی میں خلل آجائے گا۔ اور اس آشرم کے ڈسپلن میں تم گھٹ کر رہ جاؤ گے۔ تم کو چاہیئے کہ تم پریت نگر جاؤ۔"

جب میں نے کہا کہ میں وہاں کسی کو نہیں جانتا تو انھوں نے پریت نگر کے بانی، سردار گوربخش سنگھ کے نام ایک خط لکھ دیا۔ بواپسی ڈاک ان کا جواب آگیا اور وار دھا جانے کی بجائے میں پریت لڑی کے اردو ہندی اڈیشنوں کا ایڈیٹر ہو کر پریت نگر چلا گیا۔

وہ بستی، لاہور سے ۲۲ میل اور امرتسر سے ۱۶ میل دور، وسط پنجاب میں نئی نئی بس رہی تھی ــ نئے ڈھنگ اور نئے نصب العین کے تحت ــ پہلی ہی نظر میں، مجھے اس کی کھلی کھلی فضا، صاف پاکیزہ ہوا، معدودے چند خوب صورت کوٹھیاں، سب کی چھتی روشیں، ستھری کشادہ سڑکیں اور ارد گرد کے قدرتی مناظر کی بے مثال خوبصورتی بہت اچھی لگی اور میں نے دل ہی دل میں طے کیا کہ میں اس بستی میں رہ کر اپنے ادب کی تخلیق میں من لگاؤں گا اور بقیہ زندگی یہیں بسر کروں گا ــ اور یوں اسکیم بنا کر میں نے اپنا مشہور ناول "گرتی دیواریں" لکھنا شروع کر دیا۔

لیکن سال گزرتے نہ گزرتے وہاں بھی ایک سکینڈل ہو گیا اور مجھے شدت سے اس بات کا احساس ہوا کہ ہمارے سماج میں میرے جیسے کسی کنوارے یا رنڈوے کے لئے سکون اور طمانیت کے ساتھ زندگی بسر کرنا مشکل ہے۔ اپنا ناول میں شروع کر چکا تھا اور پریت نگر کی خوب صورتی کے پیش نظر اسے میں چھوڑنا نہ چاہتا تھا۔ اس دماغی پریشانی اور دل برگشتگی میں میں نے یہی سوچا کہ میں دوسری شادی کر لوں تاکہ میرے بارے میں کوئی سکینڈل نہ ہو اور نہ کوئی واقعہ میرے ادب کے راستے میں رکاوٹ ڈالے! اور میں نے فوراً اپنے بھائی کو سارا قصہ بتلاتے ہوئے لکھا کہ کہیں میری سگائی کر دیں۔

میرے بھائی میرے معاملے میں الجھنا نہیں چاہتے تھے۔ میں نے ان پر زور دیا تو انھوں نے کہیں دور دراز کے رشتے میں میری سگائی کر دی۔ انہی دنوں لاہور میں کرشن سے ملاقات ہوئی۔ اس نے کہا۔ "تم عجیب احمق ہو جو بغیر لڑکی دیکھے تم نے سگائی منظور کر لی۔ میری رائے ہے کہ اپنی ہونے والی بیوی کو دیکھے بغیر ہرگز شادی نہ کرنا۔ ورنہ میری طرح پچھتاؤ گے۔"

اس وقت تو میں کرشن کی بات کو خاطر میں نہیں لایا۔ لیکن جب کچھ مہینوں کے بعد دماغ ٹھنڈا ہوا اور اس دوران کوشلیا سے جان پہچان ہوئی جو جلد ہی دوستی میں بدل گئی تو مجھے کرشن کا مشورہ یاد آیا اور میں نے بھائی کو لکھا کہ وہ سگائی رد کر دیں۔

لیکن سگائی انھوں نے میرے چھوٹے بھائی کی سسرال کے کسی رشتے میں کی تھی اسے یوں توڑ دینا سہل نہ تھا۔ تب ایک بار، جب میں کوشلیا سے ملنے لاہور گیا (وہ رینالہ خورد ضلع منٹگمری سے، جہاں وہ ہیڈ مسٹریس تھی لاہور آئی تھی اور میں پریت نگر سے وہاں جاتا تھا) میرے بھائی ایک دن جالندھر گئے ہوئے تھے میں نے کوشلیا سے کہا۔ "آؤ چپ چاپ شادی کر لیں۔"

کوشلیا شادی کرنے کو تیار تھی لیکن چپ چاپ نہیں۔ اس نے کہا۔ "میں آج سب رشتے داروں سے کہہ دوں گی، جس کی مرضی آئے، جس کی مرضی نہ آئے۔ کل آپ شادی کے لئے پنڈت سے کہہ دیجئے۔" لیکن میرے بھائی شام کو واپس آنے والے تھے، پھر مجھے پریت نگر بھی واپس جانا تھا۔ میرے پاس وہی ایک دن تھا۔ رات جب بھائی صاحب واپس آئے تو میں نے ان پر زور دیا۔ وہ نہیں مانے۔ میری دوسری شادی کا دن تو سگائی کے ساتھ ہی طے ہو گیا تھا۔ جھک مار کر اپنی پہلی بیوی کی وفات کے صرف پانچ سال بعد، بادل ناخواستہ مجھے وہیں دوسری شادی کرنی پڑی اور چند دن بعد میں اپنی دوسری بیوی کو لے کر پریت نگر آگیا۔

پریت نگر آ تو گیا لیکن اس شادی کے بعد میں زیادہ دن وہاں نہ رہ سکا۔ اس نیک بخت نے ایک ڈیڑھ مہینے ہی میں اپنی بے مثال عقل کے وہ کرشمے دکھائے کہ مجھے لگا ــ اگر میں اس عورت سے جلد ہی نجات نہیں پاتا تو زندگی بھر جہنم کی اذیت برداشت کروں گا۔ میں اسے لاہور چھوڑ آیا اور اپنے بھائی سے کہہ آیا کہ میں اس عورت کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ وہ نیک بخت دو تین دن بعد ہی میرے چھوٹے بھائی

کو لے کر واپس پریت نگر پہنچ گئی۔

اس بار میں نے نوکری چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا اور ایسی حرکت کی کہ مجھے ایک مہینے کا نوٹس مل جائے۔ میں نے اس سے کہا کہ میری نوکری چھوٹ گئی اور میں نے اسے اس کے میکے بھیج دیا۔ اور بنگلور ایک ٹیوشن لے لی۔ قسمت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ جو شادی میں نے اس لئے کی تھی کہ مجھے پریت نگر نہ چھوڑنا پڑے اسی نے مجھے وہ خوب صورت بستی چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔

پریت نگر کی نوکری سے مستعفی ہونے کے بعد میں نے کرشن کو دلی میں ایک خط لکھا (اس دوران وہ آل انڈیا ریڈیو دہلی میں پروگرام اسسٹنٹ ہو گیا تھا) کہ تمہارا مشورہ نہ مان کر میں نے جو فاش غلطی کی ہے اس کا خمیازہ بھگت رہا ہوں۔ ایک مہینے کا نوٹس دے دیا ہے۔ اس کے ختم ہوتے ہی بنگلور چلا جاؤں گا۔

کرشن نے بواپسی ڈاک جواب دیا کہ بنگلور جانے سے پہلے دو دن کو دلی آ جاؤ! کون جانے تمہیں اتنی دور جانا ہی نہ پڑے۔

اس دوران میں نے سارا فرنیچر بیچ دیا تھا۔ بیوی تو میکے چلی ہی گئی تھی۔ کرشن کا خط پاتے ہی میں دلی پہونچا۔ کرشن سے ملا۔ اس نے دوسرے ہی دن مجھے آل انڈیا ریڈیو میں ہندی صلاح کار اور ڈرامہ نگار کے طور پر نوکر رکھوا دیا۔ اور پندرہ دن بعد اپنے سالے دھوتی کرتے چھوٹے بھائی کو دے کر میں دلی پہنچ گیا۔

تیس ہزاری دلی میں بھیرو کے مندر کے سامنے لالہ منوہر لال بھارگو نے چھبیس چھوٹے چھوٹے کوارٹر بنوا رکھے تھے جو بھارگو کوارٹرز کہلاتے تھے اور سڑک سے ان تک جو چھوٹا سا راستہ آتا تھا وہ منوہر لال بھارگو اسٹریٹ کہلاتا تھا۔ دلی ریڈیو اسٹیشن ان دنوں بھارگو اسٹریٹ کے نزدیک ہی علی پور روڈ پر تھا۔ اسی لئے اس بستی میں کرشن کے علاوہ دلی ریڈیو سے وابستہ کچھ دوسرے دوست بھی رہتے تھے۔ نمبر ا میں ن م راشد تھے۔ جن کی جدید نظموں کی دھوم تھی اور جن کی نظم — اے میری ہم رقص مجھ کو تھام لے — مجھے ازبر تھی۔ کرشن ۵ نمبر کے کوارٹر میں مہندر اور اپنے پریوار کے دوسرے ممبروں کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کے بعد کی قطار میں روزانہ بھیشم (لاہور) میں میرے ساتھ کام کرنے والے مزاحیہ نگار ساگر چند گورکھا قیام پذیر تھے۔ ذرا پرے ۲۱ نمبر میں میرے افسر اور دوست محمد اقبال تھے۔ جنہوں نے ریڈیو لاہور میں سب سے پہلا میرا ناٹک "پاپی" نشر کیا تھا۔ میں نے شروع کا ایک ہفتہ کرشن کے ساتھ ہی بسر کیا۔ پھر اس نے ۱۷ نمبر کا کوارٹر کرایہ پر لے دیا۔

لاہور کے زمانے میں خواہ کرشن سے گاہے بگاہے ملاقات ہوتی تھی لیکن ویسی قربت نہ تھی لیکن وہ ہفتہ جو میں نے اس کے ہاں گزارا ہمیں بہت قریب لے آیا۔ حالانکہ دوسری شادی کی ناکامی کے باعث میری طبیعت خاصی مکدر اور پژمردہ تھی۔ لیکن میں عادتاً خوش باش اور یار باش آدمی ہوں اور میری یہ پرانی عادت ہے کہ جب خود اداس ہوتا ہوں تو دوست احباب کو خوب ہنساتا ہوں — کچھ برس پہلے تک میں باقاعدہ اسٹیج پر اترتا تھا اور ڈراموں میں ایکٹ کرتا تھا۔ یار دوستوں اور پڑوسیوں کی بیسیوں نقلیں مجھے یاد تھیں۔ دلی کے اس پہلے ہفتے میں جب میں اور کرشن ریڈیو اسٹیشن سے گھر آتے تو چائے کے دوران بات سے بات نکل پڑتی۔ ان چند دنوں میں میں نے اتنی نقلیں اتاریں، ہم اتنا ہنسے کہ لاہور کے زمانے میں ملاقاتوں کے باوجود ہمارے درمیان جو دوری تھی وہ یکسر غائب ہو گئی۔ کرشن تو خاموش اور متین طبیعت کا آدمی ہے لیکن مہندر اور مجھ میں گہری چھننے لگی۔

مجھے اس زمانے میں باقاعدہ سیر کرنے کی عادت تھی۔ میں شام کو مہندر کے ساتھ سیر کو نکل جاتا۔ منوہر لال اسٹریٹ سے باہر ہوتے ہی ہم بولورڈ روڈ پر ہو لیتے۔ اس سڑک کے دائیں طرف پریڈ گراؤنڈ کا وسیع میدان تھا (جہاں آج کل کچہری ہے) سڑک پر دو رویہ املی کے گھنے درخت تھے۔ شام کو اس کشادہ اور صاف و شفاف سڑک پر ایک دم سناٹا ہو جاتا۔ ہم دنیا جہاں کی باتیں کرتے ہوئے قدسیہ گارڈن تک ہو آتے۔ دلی ریڈیو پر ان دنوں اردو ادیبوں کا جمگھٹ تھا۔ ترقی پسند تحریک عروج پر تھی۔ باتوں کے لئے موضوعوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ کبھی ہم ادبی بحث میں الجھ جاتے۔ کبھی ہم ایک دوسرے کو اپنی زندگی کے تجربات، سپنے، عزائم سناتے۔ مہندر مجھ سے کرید کرید کر میری زندگی کے واقعات کے

بارے میں پوچھتا اور میں سناتا چلا جاتا۔ یوں بھی میں بہت باتونی آدمی ہوں اور مہندر کے ہاں بے حد صبر اور متانت تھی — چند دنوں میں وہ میرا دوست ہی نہیں ہمراز بھی بن گیا۔

مجھے ایک ہمراز کی ضرورت بھی تھی کیونکہ ان دنوں میری زندگی بے حد الجھی ہوئی تھی۔ دوسری بیوی کو میں چھوڑ آیا تھا۔ یعنی میں نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ اب اس کے پاس نہ پھٹکوں گا اور کوشلیا کے سلسلے میں کچھ طے نہیں کر پا رہا تھا۔ دلّی آنے سے پہلے میں لاہور میں اس سے ملا تھا۔ میں نے اس سے گلہ کیا تھا کہ اگر اس نے مجھ سے چپ چاپ شادی کر لی ہوتی تو وہ سگائی اپنے آپ ٹوٹ جاتی اور میری زندگی یوں تباہ نہ ہوتی۔ کوشلیا نے کہا تھا کہ میں تو تیار تھی، آپ ہی پیچھے ہٹ گئے۔ بہرحال اس سے باتیں کرتے ہوئے مجھے محسوس ہوا تھا کہ میں اگر اب بھی فیصلہ کروں تو وہ شادی کرنے کو تیار ہوگی۔ ... لیکن فیصلہ کرنا آسان نہ تھا، اسے عملی جامہ پہنانا مشکل۔ میری ماں ان دنوں دلّی میں میرے پاس تھی اور تیسری شادی کے سخت خلاف تھی اور ماں کی خواہش کے خلاف کچھ بھی کرنا مجھے منظور نہ تھا۔ سب سے چھوٹے کو چھوڑ کر میرے تمام بھائی دوسری بیوی کو چھوڑ کر شادی کرنے کے مخالف تھے۔ اور بھی کئی طرح کی نفسیاتی الجھنیں تھیں — لوور ڈروڈ کی ان لمبی سیروں میں میں نے مہندر کو شروع سے لے کر آخر تک سارا قصہ سنایا اور اپنی تمام الجھنیں اس کے سامنے رکھیں۔

تمام باتیں سن کر مہندر نے پوچھا۔ "کیا آپ کوشلیا جی کو دلّی بلا سکتے ہیں؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو اس نے کہا کہ آپ کوشلیا جی کو بلایئے اور اگر وہ آجاتی ہیں تو ان سے شادی کر ڈالئے۔ ورنہ اگر ماتا جی یہاں بھی آگئیں تو پھر آپ دلّی چھوڑ کر کہاں جائیں گے؟"

مہندر نے کرشن سے بات کی۔ اس نے بھی کہا کہ اگر تم جلدی کوشلیا سے شادی نہیں کر لیتے تو پھر زندگی بھر مایا کے جنگل سے نہ نکل پاؤ گے۔ میں نے کوشلیا کو خط لکھا۔ وہ کچھ دن بعد آگئی۔ میں نے اسے کرشن اور مہندر سے ملایا۔ انھوں نے رائے دی کہ بغیر شادی کئے اسے واپس نہ جانے دو —۔

میں کوشلیا سے شادی تو کرنا چاہتا تھا لیکن دوسری بیوی کو چھوڑ دینا مجھے گناہ کے مترادف بھی لگتا تھا۔ ایک شام بات چلنے پر میں نے کرشن سے کہا۔ "یار تم مجھ پر اتنا زور دیتے ہو، تمھیں بھی تو اپنی بیوی پسند نہیں، تم کیوں نہیں اسے چھوڑ کر دوسری شادی کر لیتے؟"

کرشن نے جھٹ کہا۔ "مجھے کوئی ایسی لڑکی ملے تو میں فوراً کر لوں۔" اور میں لاجواب ہو گیا۔

مجھے پورا یقین ہے کہ اگر ان دنوں کرشن اور مہندر میرے پڑوسی نہ ہوتے میں بھارگو کوارٹرز میں قیام پذیر نہ ہوتا، وہاں کچھ ہمدرد دوست نہ ہوتے تو میں کبھی وہ قدم نہ اٹھا پاتا۔ کرشن اور مہندر کے علاوہ محمد اقبال نے بھی وہی بات کہی جو کرشن نے کہی تھی کہ تمھیں اتنی اچھی لڑکی ملتی ہے تم فوراً شادی کر لو۔ ساگر چند گورکھا نے اپنا قصہ سنایا کہ کس طرح تیرہ سال بھٹکنے اور تین بچے پیدا کرنے کے باوجود انھیں بیوی چھوڑنی پڑی اور اب جا کر ان کی زندگی استوار ہوئی۔ "تم جتنا ٹالو گے اتنا ہی تکلیف پاؤ گے"، گورکھا نے کہا۔ "فیصلہ کر ڈالو اور اس تذبذب سے نجات پاؤ۔"

مہندر مجھ سے روز پوچھتا کہ میں نے کوشلیا جی سے بات کی ہے یا نہیں۔ آخر میں نے اس سے بات کر لی۔ وہ تیار بھی ہو گئی۔ لیکن چونکہ وہ باقاعدہ شادی کرنا چاہتی تھی، پنڈت بلا کر اور سات پھیرے لے کر۔ اس لئے سوال پیدا ہوا کہ لڑکی کا دان کون کرے! ہوتی تو اس کی پرنسپل ہی تیار ہو جاتی، لیکن دلّی میں کس سے کہتے؟ کوشلیا نے پوچھا کہ کرشن کیا میرے بڑے بھائی کے طور پر وہاں کھڑے نہیں ہو سکتے؟ میں نے کرشن سے پوچھا۔ اس نے ہنس کر کہا۔ "وہ بھائی کے طور پر کہتی ہے، بننے کو تیار ہوں۔"

...... اور ایک شام میں نے پنڈت کو بلوا لیا۔ کچھ دوست آگئے۔ کرشن چونکہ عمر میں کوشلیا سے ایک آدھ سال ہی بڑا ہے اس لئے اسے باپ بننے کی زحمت نہیں کرنی پڑی بھائیوں کے طور پر اس نے اور مہندر نے بیاہ منڈپ میں کھڑے ہو کر کوشلیا پر کھیلیاں (لائی

کے دانے) چھڑک دے اور ہماری شادی ہو گئی ۔

حالانکہ اس شادی میں کوشلیا کے بھائیوں کے طور پر کرشن اور مہندر کا شامل ہونا محض ایک دوست کی مدد اور رسم کی ادائیگی سے زیادہ کچھ نہ تھا، لیکن میری بیوی، جو ایک زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتی ہے اور نہایت تکلف پسند اور جذباتی ہے اُن کے احسان کو کبھی نہیں بھولی. کرشن کو اس نے ہمیشہ ایک بڑے بھائی کی عزت دی اور مہندر کو چھوٹے بھائی اور دیور کا پیار ! شادی کے بعد دوسرے تیسرے وہ دونوں میرے ہاں آتے تھے. اوّل تو کرشن خاموش اور متین طبیعت کا مالک ہے ، پھر کوشلیا اس کی عزت بھی کرتی تھی لیکن مہندر کے سامنے کچھ دیسی جھجک نہ تھی اور ہم کئی بار بحث میں الجھ پڑتے ۔ دراصل شادی کے اُن پہلے چھ مہینوں میں ہماری ازدواجی زندگی نارمل نہ تھی ۔ میرا دماغ ہر وقت تنا رہتا تھا کوشلیا کے تمام رشتے دار ناراض، میرے والدین اور بھائی ناراض ۔ میری دوسری بیوی کے کچھ رشتے دار دلّی میں تھے جو ہر دوسرے تیسرے کوئی نہ کوئی شوشہ چھوڑتے رہتے ۔ ملاپ لاہور کے ہندی اڈیشن اور ارجن (دلّی) میں لگاتار ہمارے خلاف آرٹیکل نکلتے ۔ پھر کوشلیا کے اور میرے معیار میں بھی زمین آسمان کا فرق ۔ اِس یا اُس بات کو لے کر تناؤ پیدا ہو جاتا ، مہندر ہمیشہ کوشلیا کے نقطہ نظر سے مجھے سمجھاتا ، مجھے شرمسار کرتا اور آخر کار میرا غصہ فرو کر دیتا ۔

میری یہ تیسری شادی نہایت غیر معمولی حالات میں ہوئی تھی. اس میں کچھ ایسا تھا جو نہایت گرد تیک اور مضحکہ خیز تھا. پہلی بات تو یہ ہے کہ اگرچہ میں نے کسی نہ کسی طرح ماں کو منا لیا تھا ، لیکن وہ شادی کی رسم میں شامل نہ ہوئی تھی اور گھونگھٹ نکالے رسوئی گھر میں بیٹھی رہتی تھی کہ وہ اپنی آنکھوں سے یہ پاپ ہوتے نہ دیکھ سکتی تھی ۔ پھر میرے دماغ پر چند باتوں کا بہت زیادہ بوجھ تھا ۔ دلّی آنے سے پہلے ، کوشلیا لاہور میں ، میرے ہی کام کے سلسلے میں میرے چند دوستوں سے ملی تھی ۔ اُن سب کو معلوم تھا کہ میں کوشلیا سے شادی کرنا چاہتا ہوں ۔ کوشلیا نے شادی کر لی ہوتی تو شاید کسی کو اعتراض نہ ہوتا لیکن جب میں نے دوسری شادی کر لی تو میرے (اور اس کے) رشتے داروں کی طرح میرے دوستوں کو بھی یہ پسند نہ تھا کہ کوشلیا میرے چکر میں پھنسی رہے اور انھوں نے اُسے مجھ سے بدظن کرنے کے لئے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی ۔ کوشلیا نے اُن کی باتیں ہنسی ہنسی میں مجھے بتا دی تھیں ۔ میں بے حد حسّاس آدمی ہوں ۔ اِن تمام باتوں کا بوجھ میرے دماغ پر تھا. اسی دماغی تناؤ کی وجہ سے میں نے دفتر سے چھٹی نہ لی تھی اور کسی طرح کی خوشی کا بھی اظہار نہ کیا تھا ۔ یوں بھی میری تیسری شادی تھی اور پہلی دو کی ناکامی کا بار میرے دل و دماغ پر تھا ۔ اور میں بہت سیدھے سادے ڈھنگ سے ، بغیر کسی شور شرابے کے ، شادی کر لینا چاہتا تھا'. . . لیکن کوشلیا کی تو پہلی شادی تھی وہ خوش بھی تھی اور میرے ایک دوست کی بنگالی بیوی نے اسے بالکل اس طرح سجا دیا تھا جیسے رام لیلا میں سیتا کو سجایا جاتا ہے . . . . . شادی کی رسم کے ذرا پہلے میں کوشلیا کو کمرے میں لے گیا اور میں نے اسے اپنی تمام خامیاں بتا دیں اور اُن باتوں کا بھی ذکر کر دیا ، جن کے بارے میں آئندہ ہمارے تعلقات کے کشیدہ ہونے کا امکان تھا . . . . کوشلیا نے میری صاف گوئی کا یہی مطلب لگایا کہ میں وعدہ کر کے پیچھے ہٹنا چاہتا ہوں اور وہ رونے لگی کہ اب وہ ریناله واپس نہیں جائے گی ۔ دلّی میں بھی نہیں رہے گی اپنی سہیلی کے پاس پٹنہ چلی جائے گی ۔ وغیرہ . . وغیرہ . . . لیکن میں تو شادی کرنا چاہتا تھا میں چپ چاپ منڈپ میں اپنی جگہ جا بیٹھا کچھ لمحے بعد وہ میرے برابر آ کر بیٹھ گئی تو اس کے چہرے کا سنگار آنسوؤں سے قدرے پونچھ گیا تھا اور اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں ۔

شادی کے بعد دوسرے دن شام کو سیر کرتے ہوئے میں نے مہندر کو سارا قصہ بتایا تو اس کے جذبات کو بہت ٹھیس لگی ۔ اس نے دبی زبان سے احتجاج کیا اور کہا آپ بہت ظالم ہیں ۔ آپ کو کوشلیا جی سے وہ سب نہیں کہنا چاہئے تھا (حالانکہ کوشلیا کے ساتھ ازدواجی زندگی کے تقریباً ۳۵ سال گذارنے کے بعد میں یہ بات آج بھی محسوس کرتا ہوں کہ اگر میں نے وہ سب باتیں شادی سے پہلے نہ کہہ دی ہوتیں تو ہمارے تعلقات کب کے ٹوٹ گئے ہوتے ۔ اس وقت کوشلیا نے کہا تھا کہ ان باتوں کو لے کر ہم میں کبھی جھگڑا نہیں ہو گا ، لیکن وہ سادہ لوح ، آدرش وادی

لڑکی تھی ۔ اس کی بہ نسبت میں زندگی کی تلخ حقیقتوں کو بہتر جانتا اور سمجھتا تھا ۔ گذشتہ تیس پینتیس برسوں میں ہم میں جب بھی کشیدگی ہوئی ہے اُنہی مسئلوں کو لے کر ہوئی ہے لیکن میں نے ان سب کا پہلے ہی ذکر کر کے اپنی بات کہہ دی تھی اس لئے معاملے سلٹ گئے ہیں اور تعلقات اتنے نہیں کھنچے ہیں کہ ٹوٹ جائیں ۔ لیکن مہندر خود جذباتی نوجوان تھا اسے وہ سب قصہ سن کر بجا طور پر تکلیف ہوتی ۔ میں نے اسے اپنی بات سمجھائی کہ میں نہیں چاہتا ، میری تیسری شادی بھی ٹوٹ جائے ۔ دوستوں نے اس کے کان بھر رکھے تھے ، اس لئے میں نے سب سچ سچ کہہ دیا ۔ اسے ضرور تکلیف ہوئی لیکن وہ تکلیف تعلقات منقطع ہو جانے کے بعد کی تکلیف سے کہیں کم ہے ۔

بہر حال شادی کے بعد میری زندگی بدستور چلنے لگی ۔ میں دفتر سے آکر چائے پینے کے بعد مہندر کو اس کے گھر سے لیتا ہوا سیر کو نکل جاتا ۔ وسط ستمبر کے دن تھے ۔ دن بھر خاصی گرمی رہتی لیکن سر شام ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا بہنے لگتی ۔ میں ننگے بدن ، ننگے پیر (چیا کہ میں لاہور کی آزاد ، فری لانسنگ کی زندگی میں رہتا تھا) صرف کمر میں ایک تہمد باندھے ، مہندر کے ساتھ باتوں میں غلطاں بولورڈ روڈ کے سناٹے میں ، دین و دنیا سے بے خبر بڑھے جاتا ۔ اور ہم قدسیہ گارڈن پہنچ کر ہی واپس پلٹتے ۔

مہندر کو شاید یہ عجیب لگتا کہ ہماری نئی نئی شادی ہوئی تھی اور میں اپنی بیوی کو ساتھ لئے بغیر سیر کو چل دیتا ۔ ایک شام جب میں اُسے بلانے گیا تو مہندر نے زور دیا " بہن جی کو بھی لے لیجیے " لمحہ بھر کے لئے اپنے کوارٹر کے باہر اسے روک کر میں اندر گیا کوشلیا نہ جانے کیا کر رہی تھی ۔ میں نے کہا ۔ " چلو جان تمہیں سیر کرا لائیں ۔"

کوشلیا نے عجیب سی حیرت ، ہلکے سے غصے اور استہزا سے بھری نظر مجھ پر ڈالی اور بولی ۔" کپڑے تو پہن لیجیے ۔"

" اس ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں ننگے بدن سیر کا جو لطف آتا ہے ......"

لیکن اس نے مجھے بات نہیں ختم کرنے دی ۔ بولی ۔" آپ ہی جائیے ۔"

اور میں دوسری بات کئے بغیر باہر آگیا اور مہندر سے بولا ۔ " چلو یار "

جب مہندر نے پوچھا کہ بہن جی کیوں نہیں آئیں تو میں نے وہی دو فقروں کی گفت گو دوہرا دی جو مجھ میں اور اس میں ہوئی تھی مہندر کو بہت برا لگا ۔ اس نے کہا ۔" آپ کو کپڑے بدل کر ، بہن جی کو ساتھ لے کر آنا چاہیئے تھا ۔ اس سراپے میں وہ کس طرح آپ کے ساتھ آسکتی تھیں ۔ آپ کے یوں چلے آنے سے انہیں کتنی تکلیف نہ ہوئی ہو گی ۔"

" دوسری صورت میں مجھے ہوتی ! " میں نے قہقہہ لگایا اور بات کا رخ پلٹ دیا ۔

لیکن جب کوشلیا کچھ دن دلی گزار کر واپس ریناله چلی گئی اور وہاں اپنی نوکری سے مستعفی ہو کر مع ساز و سامان واپس آئی تو ایک ڈیڑھ مہینے کے اندر اندر میری کایا پلٹ ہو گئی اور اسے ہمارے ساتھ سیر کو جانے میں اعتراض نہیں رہا ۔

ہوا یوں کہ ایک شام ہم ۔ میں اور مہندر ۔ بولورڈ روڈ پر سیر کو نکلے ۔ میں حسب عادت صرف ایک تہمد پہنے ننگے پیر ننگے بدن تھا ۔ شام قدرے گہرا گئی تھی اور سڑک پر بے حد سناٹا تھا ۔ جبھی سامنے سے ہمارے میوزک ڈپارٹمنٹ کے انچارج فیروز نظامی ، اپنے خیال میں مگن ، ذرا سا ٹیڑھا سر کئے ، آسمان میں آنکھیں جمائے کوئی دھن بناتے اور گنگناتے چلے آرہے تھے ۔ اپنی دھن میں مست انھوں نے ہمیں نہیں دیکھا ۔ جب وہ ہمارے قریب آگئے تو میں نے ایک قدم بڑھا کر زور سے ان کے کندھے پر ہاتھ جمایا ۔

" کہیے نظامی صاحب کہاں گم ہیں ؟ "

نظامی صاحب کی گنگناہٹ یکلخت بند ہو گئی ۔ انھوں نے مجھے نہیں پہچانا ۔ میں نے زور سے قہقہہ لگایا ۔ اور نظامی صاحب کی نظر مہندر ناتھ پر پڑی تو وہ پہچان گئے ۔ کچھ ہی دن پہلے ، قریب ہی برج پر ایک قتل ہو گیا تھا ۔ انھوں نے مجھے سبزی منڈی کا غنڈہ سمجھا ۔ ان کا چہرہ زرد ہو گیا تھا ۔ اس وقت تو یہی بات کہہ کر وہ ہنستے رہے لیکن دوسرے دن نمک مرچ لگا کر انھوں

نے یہ بات اقبال صاحب سے کہہ دی۔

دوسری شام مہندر کہیں چلا گیا تھا۔ میں وہیں کوارٹروں کے آگے، پہاڑی کے نیچے خالی چوک میں گھوم رہا تھا کہ سامنے سے اقبال صاحب آ گئے۔ میں نے سلام کیا تو میرے پاس آ کر رک گئے اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑی نرمی سے انھوں نے کہا کہ آپ اب ریڈیو کے ذمے دار کن ہیں آپ کو یوں لفنگوں کی طرح نہیں گھومنا چاہیئے۔ کل نظامی صاحب آپ کو دیکھ کر ڈر گئے اور سمجھے کہ کسی غنڈے نے اُن کا راستہ روک لیا ہے۔"

"میں نے اُن کا نام لے کر پکارا تھا"! میں نے کمزور سی صفائی دینے کی کوشش کی۔

"اپنی دھن میں انھوں نے آپ کی آواز نہیں سنی ہوگی اور آپ کا یہ سراپا دیکھ کر ڈر گئے ہوں گے۔

اقبال صاحب میرے مہربان دوست تھے۔ میں نے ان سے وعدہ کر لیا کہ اس بات کا خیال رکھوں گا۔"

کچھ عرصہ بعد کوشلیا رینالہ خورد سے واپس آ گئی تو میں نے ہنستے ہنستے اس واقعہ کا اس سے ذکر کیا۔ اس نے مجھے ادب اور تہذیب پر جو لیکچر دیا، وہ تو دیا، ساتھ ہی اس بات کا بھی اصرار کیا کہ میں ایک گرم سوٹ اور اچکن سلواؤں۔ میرے پاس ایک پرانا گرم کوٹ تھا اور مجھے نیا سوٹ سلوانے کی کوئی ویسی ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی۔ سردیاں تو آئی تھیں اور میں وہی پہننے لگا تھا لیکن کوشلیا اپنی تنخواہ کے سلسلے میں کوئی تین سو روپے اپنے ساتھ لائی تھی۔ اس نے مجھے ایک سوٹ اور ایک اچکن سلوا دیا۔ میں بھی کچھ مہذب ہو گیا۔ اس کے بعد یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ کوشلیا بھی ہمارے ساتھ سیر میں شامل ہونے لگی۔

میری اس کایا پلٹ کے بعد کبھی کبھی میں اور کوشلیا اکیلے سیر کو جاتے، لیکن کئی بار جب ہم کناٹ پیلیس کا پروگرام بناتے، کوشلیا کہتی۔ "دیکھئے ذرا مہندر بھائی خالی ہوں تو انھیں بھی لے لیں"۔ اور میں اُسے جا کر بلا لاتا۔ ان دنوں کی ایک دلچسپ یاد آج بھی تازہ ہے۔

شاید چھٹی کا دن تھا ایک شام ہم نے کناٹ پیلیس جانے کی سوچی۔ مہندر کو ساتھ لے لیا۔ ہماری شادی کو سال سوا سال ہو چکا تھا کوشلیا کے رشتے دار ملنے ملانے لگے تھے میرے گھر والوں کا غصہ بھی قدرے کم ہو گیا تھا اور مایا کے رشتے دار بھی تھک گئے تھے اور انھوں نے بالآخر صورت حال سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ ہماری خوشی بھی واپس آ گئی تھی۔ میں اگر اس کی طرح ادب اور تہذیب سیکھ رہا تھا تو اس کی تکلف پسند طبیعت بھی کچھ کچھ بے تکلفی سیکھ رہی تھی۔ ہم اچھے موڈ میں تھے۔

جب ہم منوہر لال اسٹریٹ سے نکل کر پریڈ گراؤنڈ کے پاس پہنچے تو سینٹ اسٹیفن ہسپتال کو جانے والی سڑک کے سرے سے ہمیں پریڈ گراؤنڈ کے اس پار کناٹ پیلیس کو جانے والی بس کھڑی دکھائی دی۔ وہاں سینٹ اسٹیفن ہسپتال کے سامنے، پریڈ گراؤنڈ کے اس کنارے بس کا اڈہ تھا جہاں سے ہر آدھ گھنٹہ کے بعد بس قطب روڈ اور پہاڑ گنج ہوتی ہوئی مرینا ہوٹل لے جاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ اگر ہم خراماں خراماں چلتے ہوئے وہاں تک پہنچتے تو بس چلی جاتی اور دوسری بس کے انتظار میں ہمیں آدھ گھنٹے تک وہیں بور ہونا پڑتا۔ اچانک میں نے کہا۔ "آؤ بھاگ کر بس پکڑ لیں"۔

بھاگ کر بس پکڑنے کا مطلب بولوُرڈ روڈ سے ہسپتال تک پوری سڑک پار کرنا تھا۔ مہندر ایسے ہنسا، جیسے کوئی انہونی بات کر رہا ہوں۔ لیکن کوشلیا نے ساڑی کی بجائے شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور بھاگنے لگا۔

"ارے اشک صاحب، آپ کیا کرتے ہیں؟" مہندر نے دو قدم بڑھ کر احتجاج کیا اور چال دھیمی کر لی۔

لیکن کوشلیا سچ مچ میرے ساتھ بھاگنے لگی۔ آخر با دل ناخواستہ مہندر بھی بھاگنے لگا۔ بس گھرگھرا رہی تھی کہ ہم اس پر سوار ہو گئے۔

راستے بھر مہندر میری اس حرکت پر مجھے کوستا رہا۔

مہندر ناتھ طبعاً کم گو آہستہ رو، بے انتہا صابر اور سلیقے والا، ہمدرد، درد مند اور جذباتی آدمی تھا۔ میرے گھر میں اس کی حیثیت میرے چھوٹے بھائی کی بھی تھی اور کوشلیا کے چھوٹے بھائی کی بھی۔ وہ اسے بھابی نہیں کہتا تھا۔ بہن جی یا کوشلیا جی ہی کہتا تھا۔ وہ ان دنوں ایم اے کر چکا تھا۔

کہیں ملازمت نہ کرتا تھا۔ جیسی ملازمت اس کی خود دار طبیعت پسند کرتی تھی ویسی اسے ملی نہ تھی۔ جو بھی ہو۔ میری شادی کے پہلے چھ مہینوں میں، جب ہم — میں اور کرشن — دفتر چلے جاتے اور کوشلیا گھر میں اکیلی رہ جاتی تو اگر اسے کوئی دقت ہوتی تو وہ کسی نہ کسی طرح اسے کہلا دیتی اور مہندر فوراً وہ کام سر انجام دے دیتا۔

اس زمانے میں تھوڑی نہیں، کوشلیا کو کافی دقت کا سامنا تھا۔ بات یہ ہے کہ کرشن کی ماں کی طرح میری ماں بھی پرانے خیال کی تھی اور کوشلیا کو پسند نہیں کرتی تھی اور ان شرطوں میں جو میں نے شادی سے پہلے کوشلیا کے سامنے رکھیں، ایک یہ بھی تھی کہ ماں اس کے بارے میں کچھ بھی سوچے یا دبی زبان سے کوئی تیکھی بات کہے (وہ بہت دھیمے بات کرتی تھی لیکن ایسی بات کہہ دیتی تھی جو تن من جلا دے) کوشلیا سن لے گی، لیکن پلٹ کر جواب نہیں دے گی۔ کوشلیا ماڈرن لڑکی، فولادی قوت ارادی کی مالک، جو اپنے تمام متمول رشتے داروں کی مرضی کے خلاف، رینالہ خورد کی ہیڈ مسٹرسی چھوڑ کر مجھ جیسے ملنگ کے ہاں چلی آئی۔ میں اس کے جذبات کو سمجھتا تھا لیکن میری ماں نے میرے سخت گیر والد کے ہاتھوں بڑے دکھ سہے تھے نہایت نامساعد حالات میں ہم چھ بھائیوں کو پالا، پوسا اور پڑھایا تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ میری ماں کو میرے گھر میں ذرا بھی تکلیف ہو۔ خصوصاً اس وقت، جب میں جانتا تھا کہ وہ زیادہ عرصہ دنی نہیں رہ سکتی۔ اس کے علاوہ تین چار دوستوں کو چھوڑ کر سارا محلہ (جو نچلے اور متوسط لوگوں ہی سے بھرا تھا) کوشلیا کے خلاف تھا۔ طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہوتی تھیں اور محلے کے مرد عورتیں اسے دس طرح سے پریشان کرتے تھے۔ کرشن کی ماں بھی خوش نہیں تھی۔ اسے خوف تھا کہ اس کا لڑکا بھی اسی راستے پر گامزن نہ ہو جائے۔ میں نے اس دوران ۱۷ نمبر کا کوارٹر بدل لیا تھا اور کرشن کے قریب ۳ نمبر میں آگیا تھا۔ نمبر ایک میں راشد رہتے تھے۔ ان کی بیگم نیک سجاد کی بہن تھیں، سمجھ خاتون تھیں۔ ان سے کوشلیا کی جان پہچان تو ہو گئی تھی لیکن ایک تکلف بھرا ناطہ تھا وہ سہیلی پنا، جو ایک سال بعد ان دونوں میں ہو گیا تھا، اس وقت ناپید تھا اور کوشلیا کو ان شروع کے دنوں میں کئی طرح کی دقت پیش آتی تھی۔

انہی دنوں کی بات ہے۔ اسے لاہور جانا تھا اور کچھ خرید و فروخت کرنی تھی۔ میں نے مہندر سے کہا۔ "یار تمہیں تکلیف تو ہو گی لیکن اگر تم کوشلیا کو چاندنی چوک لے جاؤ اور کچھ سامان خرید وا دو تو بہت اچھا ہو۔ یہ عورتیں دس دکانیں دیکھتی ہیں اور ایک چیز خریدتی ہیں اور مجھ میں اتنا صبر نہیں، تم یہ کام کر دو تو میں بہت مشکور ہوں گا۔"

مہندر اسے چاندنی چوک لے گیا۔ جتنی دکانیں کوشلیا نے دیکھنی چاہیں، اس نے دکھا دیں اور بڑے صبر اور دھیرج کے ساتھ اس نے کوشلیا کی ساری من پسند چیزیں خرید وا دیں۔ کوشلیا نے اس واقعہ کا ذکر کر کے نہ جانے کتنی بار میری بے صبری اور متلون مزاجی کی یاد دلائی ہے اور یہ مضمون سنتے ہوئے، اس دن کی یاد میں اس نے پھر آنکھیں بھر لی ہیں۔

اس تمام صبر، متانت، خودداری اور سلیقے کے علاوہ مہندر کے ہاں کچھ ایسی چیز بھی تھی جسے میں ایک نہایت باریک قسم کی نفاست پسندی کہنا چاہوں گا۔ رومانیت آدمی کے جذباتی ہونے کی علامت ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ جو آدمی جذباتی اور رومانیت پسند ہو، وہ نفاست پسند بھی ہو۔ لیکن مہندر میں یہ نفاست اس کے جذباتی پن اور رومانیت کے باوجود موجود تھی۔ اس سلسلے میں مجھے ایک نہایت دلچسپ قصہ یاد آتا ہے۔

منوہر لال اسٹریٹ پر بھارگو کوارٹرز کے شروع میں ایک سہ منزلہ سرخ مکان تھا۔ میں نے اس کے مالک کو کبھی نہیں دیکھا۔ لیکن اسے لالہ (ڈاکٹر) صاحب سوہن لال کا مکان کہتے تھے۔ میں نے یہ بھی سنا تھا کہ انھوں نے ایک عیسائی عورت سے شادی کی تھی اور عیسائی ہو گئے تھے۔ اس مکان میں ان کی وہ انگریز بیوی اور ان کی لڑکی رہتی تھی۔ مجھے لڑکی کا نام بھی معلوم نہیں۔ اسے سب مس سوہن لال کہتے تھے لیکن عام لوگوں میں وہ پری کہلاتی تھی اور وہ مکان بھی عام لوگوں میں پری کا مکان ہی مشہور تھا۔

یہ مس سوہن لال کسی کانونٹ (یا اسکول) میں پڑھاتی تھی اور سچ مچ پری سی خوبصورت تھی۔ لانبا قد۔ چھریرا جسم، تمام خطوط نمایاں بے حد گورا رنگ، بیضوی چہرہ، تیکھی ستواں ناک، پتلے ہونٹ، سر پر سنہری بالوں کے لہریئے — جب وہ سبک سا چھاتا لئے گھر سے نکلتی تو اسے ایسے زاویے پر ہلکا سا جھکا لیتی کہ دائیں بائیں چلنے والوں کو اس کا چہرہ دکھائی نہ دیتا۔ جب وہ چھاتا لئے، سڑک کو گویا ماپتے ہوئے چلتی تو لگتا جیسے

وہ اسی تھپاتے کے سہارے بہشت بریں سے اتر کر لوبھار روڈ پر چلنے لگی ہے۔

ایک دن میں اور مہندر سیر سے آرہے تھے کہ وہ ہمارے قریب سے اسی قیامت خیز چال سے اٹھلاتی ہوئی نکل گئی۔ اچانک میں نے ہنس کر مہندر سے پوچھا۔ "یار تم نوجوان ہو، غیر شادی شدہ ہو اور یہ پری تمہارے اتنے نزدیک رہتی ہے، اس سے عشق وشق نہیں ہوا تمہیں۔۔؟"

مہندر اپنی مخصوص ملائمیت سے ہنسا۔ "اشک صاحب! جب ہم شروع شروع میں دلی آئے تھے تو پہلی ہی نظر میں میں اسے دل دے بیٹھا تھا۔ صبح گھر سے اس کے نکلنے سے کہیں پہلے میں یہیں سڑک کے کنارے آکھڑا ہوتا اور اسے گزرتے دیکھتا اور اس کے چلے جانے کے کتنی دیر بعد تک میرا دل دھڑکتا رہتا۔"

اور وہ لحظہ بھر کے لئے چپ ہو گیا۔ "پھر" میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

مہندر کے ہونٹوں پر استہزا بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے سر کو ذرا سا جھٹکا دیا اور بولا "پھر ایک دن میں نے اسے صدر بازار میں ایک چاٹ کی دوکان پر عام عورتوں کی طرح آلو چھولے کھا کر پتہ چاٹتے ہوئے دیکھ لیا۔ اسی لمحے میرا سارا عشق ہوا ہو گیا۔"

میں زور سے قہقہہ مار کر ہنسا۔ "تم بھی یار خوب ہو، تم کیا سمجھتے تھے کہ کوئی خوبصورت لڑکی چاٹ کھا کر پتہ نہیں چاٹ سکتی۔"

لیکن مہندر نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے نہ جانے کہاں گم ہو گیا۔

آج میں محسوس کر سکتا ہوں کہ اس پری زاد کو آسمان کی بلندیوں سے (جہاں کہ مہندر کے تصور نے اسے بٹھا رکھا تھا) اتر کر دھرتی کی بیٹیوں کی طرح چاٹ کھاتے دیکھ کر مہندر کی نفاست پسندی کو گونہ صدمہ پہنچا ہوگا اور اس کی ساری رومانیت اڑنچھو ہو گئی ہوگی۔"

لیکن اسی نفاست پسند مہندر نے جب ایک معمولی شکل وصورت والی ایکسٹرا لڑکی درگا کو اپنی بیوی بنا لیا تو مجھے حیرت نہیں ہوئی مہندر، جیسا کہ میں نے پہلے کہا جذباتی، خوددار اور باوقار انسان تھا۔ بمبئی کے شروع کے دنوں میں، جب وہ بیکار رہتا ایک بار سخت بیمار ہو گیا۔ اس وقت جب اس کی مدد اور مزاج پرسی کرنے والا کوئی نہ تھا اس لڑکی نے اس کی اتنی خدمت کی کہ مہندر نے سنبھال سنبھال کر رکھا ہوا اپنا دل اس کی نذر کر دیا۔ اُسے اپنی بیوی بنا لیا۔ مہندر کے والد ڈاکٹر تھے۔ وہ کھتریوں کے بڑے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ امیر گھرانے میں کسی خوب صورت لڑکی سے شادی کرنا اس کے لئے مشکل نہ تھا۔ لیکن کسی انجانی لڑکی سے محبت کرنا شاید اس کے لئے مشکل تھا۔ درگا کی صورت پر نہیں اس کی سیرت پر وہ مرمٹا۔ یہی نہیں اس نے زندگی بھر اس رشتے کو نباہا اور کبھی شکایت نہیں کی۔ عارضی جذبے کی اضطراری کیفیت کے زیر اثر کوئی بھی نوجوان کسی لڑکی سے شادی کر سکتا ہے، لیکن اس رشتے کو دل وجان سے نباہنا، اس پر فخر کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ۔۔۔ ان تمام وجوہات سے، جن کا ذکر میں نے تفصیل سے اپنی تیسری شادی کے سلسلے میں کیا ہے، مہندر کے لئے میرے دل میں ہمیشہ عزت رہی ہے۔ لیکن جب میں ایک بار بمبئی گیا اور میں نے اس سے سارا قصہ سنا اور اس کی بیوی کو دیکھا تو مہندر کے کیریکٹر کی عظمت ہمیشہ کے لئے میرے دل پر نقش ہو گئی۔ میں جب بھی بمبئی گیا، کسی اور سے خواہ نہ ملا ہوں لیکن مہندر سے ضرور ملا ہوں اور چند لمحے اس کے ساتھ گزار کر انسان کی انسانیت اور دردمندی میں میں نے اپنے ایمان کو تازہ کر لیا ہے۔ کیونکہ لوٹ کھسوٹ، دغا فریب، جھوٹ، ریاکاری، خود غرضی اور خود فریبی کی اس دنیا میں مہندر جیسے لوگ مستثنیٰ ہی ہوتے ہیں۔

بمبئی کی فلمی دنیا میں جا کر بہت لوگ بدل گئے۔ یہاں تک کہ کچھ دوستوں کی تو صورت تک پہچاننا مشکل ہو گیا ہے لیکن جب جب میں بمبئی گیا مہندر سے ضرور ملا یا وہ بیدی کے گھر مجھ سے ملنے آ گیا۔ میں نے اس کو بالکل ویسا ہی پایا۔ اس نے دو ایک بار یہ بتانے کی کوشش بھی کی کہ وہ بدل گیا ہے، اس نے چالاکی ہوشیاری سیکھ لی ہے لیکن مجھے نہیں لگا کہ اس میں کوئی فرق آیا ہے۔ آیا ہوتا تو پہلی ملاقات ہی میں مجھے پتہ چل جاتا۔۔۔۔۔ ایک بار میں اور کوشلیا خداداد سرکل کے فٹ پاتھ پر کھڑے تھے ہم شاید دادر سے کچھ خرید و فروخت کر کے پیدل ہی

پل پار کر کے آئے تھے اور کوشلیا غالباً تھکی تھی وہاں دائیں طرف کو کچھ آگے ایک گلی مہندر کے مکان کو جاتی تھی۔ ہم سوچ ہی رہے تھے کہ اسی وقت اس کے ہاں جائیں یا دوسرے دن۔ کوشلیا کی تھکان دیکھ کر میں نے طے کیا کہ ٹیکسی لیتے ہیں اور گھر چلتے ہیں۔ مہندر سے کل ملیں گے۔

لیکن تبھی سامنے سے مہندر آتا ہوا مل گیا۔ ہمیں دیکھ کر اس کا ماتھا کھل گیا۔ پہلے اس نے گھر لے جانے کا اصرار کیا۔ میں نے کہا یہ کوشلیا بہت تھک گئی ہے، ہم کل آئیں گے۔ لیکن ہمیں چائے پلائے بغیر وہ کسی طرح چھوڑنے کو تیار نہ تھا قریب ہی کوئی ریستوران نہیں تھا۔ وہ ہمیں ایک بار ہی میں لے گیا اور بغیر کھلائے پلائے اس نے ہمیں نہیں چھوڑا۔

مہندر کو اپنے بڑے بھائی سے بہت محبت اور عقیدت تھی۔ ادیب اور انسان دونوں حیثیت سے۔ وہ اس کے پریوار کو بہت چاہتا تھا اور ہمیشہ اس سلسلے میں فکر مند رہتا تھا لیکن کئی بار اپنی بھابی کے سلسلے میں، جسے کرشن اتنا پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ اپنے بھائی کی کسی حرکت سے بے حد پریشان ہو جاتا تھا۔ مجھے ایک بار کی یاد ہے۔ جب میں فلمستان بمبئی میں کام کرتا تھا اور ملاڈ میں رہتا تھا اور کرشن درسوا روڈ پر چار بنگلے میں، مجھے شام کو کرشن کا ایک رقعہ ملا کہ ضروری کام ہے میں صبح صبح ہی اس سے ملوں۔ چونکہ میں دس بجے اسٹوڈیو چلا جاتا تھا اور کرشن کا گھر اندھیری اسٹیشن سے میل ڈیڑھ میل دور تھا۔ اس لئے میں صبح جلدی تیار ہو کر اس کے ہاں پہنچا۔ کرشن ابھی سو رہا تھا۔ مہندر اور بھابی کھانے کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ مہندر مجھے وہیں لے گیا۔ اس نے بتایا کہ اسی نے مجھے بلوایا ہے اور ایک ضروری مسئلہ در پیش ہے۔ اور اس نے مجھے ساری بات بتائی۔ اب سچی بات یہ ہے کہ میں کرشن کے من کو جانتا تھا اس لئے میں نے اس سلسلے میں کرشن پر کسی طرح کا زور دینے سے انکار کر دیا۔ مہندر نے مجھے دس دلیلیں، بھابی کی بات کو چھوڑ کر بچوں اور ان کے مستقبل کی بات کی۔ بالآخر میں مان گیا۔ میں نے کہا کہ میں کرشن سے اس بارے میں کچھ نہیں کہوں گا۔ اگر وہ اس سلسلے میں کسی طرح کی دقّت کی بات کرے گا تو میں اس مسئلے کی ساری ذمہ داری اپنے اوپر لے لوں گا۔ اور تم جو چاہتے ہو۔ وہی ہوگا۔ کرشن سو کر اٹھا اور بات چلی تو جیسے میں نے وعدہ کیا تھا۔ ویسا ہی کیا۔ حالانکہ مجھے اس بات کا اعتراف بھی ہے اور قلق بھی کہ اس سب سے کرشن کی زندگی کچھ پریشان ہی ہوئی (اس کے پریوار کو جو بھی راحت ملی ہو) لیکن مہندر کو جذبات اور اخلاق کا یہی تقاضہ لگتا تھا۔

اس سب کے بعد میں یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ کرشن، اس کی ادبی اور اخلاقی زندگی اور اس کے بیوی بچوں کی بہبودی کے لئے مہندر کی اس فکر مندی اور پریشانی کو دیکھ کر مجھے بارہا کرشن سے حسد ہوا ہے اور میں نے سوچا ہے ــــ کاش میرا بھی کوئی ایسا بھائی ہوتا، جو میرے یا میرے بیوی بچوں کے لئے یوں پریشان ہو سکتا۔

یہ سب بیان کرنے کے بعد اگر میں نے مہندر ناتھ کی دنیاوی کامیابیوں یا کامرانیوں، یا ادیب کے طور پر اس کی عظمت کا ذکر نہیں کیا تو کوئی غلط بات نہیں کی۔ دنیاوی طور پر کامیاب اور کامران ادیب میں کئی بار وہ خوبیاں نہیں ہوتیں جو ایک شریف اور درد مند انسان کا خاصہ ہوتی ہیں۔ اور میرے خیال میں اُن بظاہر کامیاب اشخاص کی خوبیوں سے بہتر ہوتی ہیں۔

اور میں نے مہندر کو کسی دنیاوی طور پر کامیاب انسان کے روپ میں نہیں، ایک نیک انسان، محبت کرنے والے بھائی اور مخلص دوست کے طور پر جانا اور چاہا ہے ▲

کشمیری لال ذاکر

درد کا رشتہ

میرا اور مہندر ناتھ کا رشتہ دراصل درد کا رشتہ تھا جب میری اس سے پہلی ملاقات ہوئی۔ اُن دنوں میں اور وہ دونوں ہی ایک شدید ذہنی اور قلبی درد کے دَور سے گزر رہے تھے اور جب اس سے میری آخری ملاقات ہوئی۔ وہ جب بھی درد کے ہی ایک گھٹے ہوئے ماحول میں سانس لے رہا تھا۔ مہندر ناتھ سے میری پہلی ملاقات بھار گولین، تیس ہزاری، دہلی میں ہوئی تھی جہاں اس کا بھائی ادم رہتا تھا۔ یہ غالباً مارچ ۱۹۵۰ء کی بات ہے ان دنوں اس کے والدِ محترم کا انتقال ہوا تھا۔ کرشن جی بھی بمبئی سے آئے ہوئے تھے۔ گھر میں موت کے بعد جو ایک غمگین اور یاس آلود فضا ہوتی ہے وہ چھائی ہوئی تھی۔ سرلا دیوی بھی تھیں، ریوتی سرن شرما بھی تھے اور کچھ دوسرے احباب بھی تھے جن کے نام مجھے اس وقت یاد نہیں آرہے ہیں۔ یہ آج سے تقریباً ۲۵ سال پہلے کا واقعہ ہے۔ مہندر ناتھ اس وقت جوان تھا۔ اس نے قمیص اور پتلون پہن رکھی تھی۔ اس کے چہرے پر صحت مندی کی چمک تھی لیکن والد کی موت نے غم کا ایک بادل سا پھیلا دیا تھا اس کے اردگرد۔ یہ اس کے شدید طور پر حساس ہونے کی علامت تھی۔ اُنھی دنوں میری شریکِ حیات بہت سخت بیمار تھی اور میں اسے چھوڑ کر کچھ دیر کے لئے کرشن جی اور اُن کے خاندان کے افراد کا غم بانٹنے کو آگیا تھا۔ یہی وہ منزل تھی جب دو نوجوان ادیب درد اور غم کے ایک لمحے کو مل کر گزار رہے تھے۔ مہندر ناتھ اور مجھ میں پہلی ملاقات ہی میں ایک ایسا رشتہ قائم ہو گیا تھا جو ان ۲۵ برسوں میں دھیرے دھیرے مضبوط ہوتا رہا ہے!

یہ ایک عجیب بات ہوئی کہ مہندر ناتھ اور میں آپس میں بہت کم ملے اور خط و کتابت کا سلسلہ بھی بہت زیادہ نہیں رہا۔ اس کے باوجود ہم ایک دوسرے کے مداح اور پرستار تھے۔ مہندر ناتھ اسی طبقے کے دکھ درد اور مسئلوں کے بارے میں لکھتا تھا جس طبقے کے خمیر سے میں اپنی کہانیوں کے لئے مواد حاصل کرتا ہوں۔ ہم دونوں کے ادب کی جڑیں سماج کی اسی دھرتی سے غذا حاصل کرتی تھیں جس میں ہم جی رہے تھے اور جس کی آب و ہوا ہمیں بہت ہی بوجھل لگتی تھی۔

جب میں درگا بھابی سے پہلی بار ملا تو مجھے لگا جیسے مہندر ناتھ کی کہانیوں اور ناولوں میں جو عورت ہمیں چلتی پھرتی اور سانس لیتی دکھائی دیتی ہے وہ دراصل درگا بھابی ہی کے مختلف روپ تھے۔ جو مہندر ناتھ کے تحت الشعور میں رہ رہی تھی۔ کبھی کبھار وہ اس کی شخصیت کے کسی روزن سے باہر بھی جھانک لیتی تھی اور وہ جو اس کی ایک آدھ جھلک اس وقت نظر آجاتی تھی۔ اسی کے رنگوں سے مہندر ناتھ کی کہانیوں اور ناولوں کو خوبصورتی عطا کرنے والی عورتوں کے پیکر بنتے تھے۔ درگا بھابی کا خاموش ایثار ایک دھیرے دھیرے دھکتی ہوئی آگ کی طرح مہندر ناتھ کو اندر ہی اندر جلاتا رہا۔ وہ ایک دم بھبک سے جل کر بجھا نہیں بلکہ آہستہ آہستہ تپتا اور چٹختا رہا اور راکھ ہوتا رہا اور اب اس کی موت کے بعد اسی راکھ کے چھوٹے چھوٹے ذرّے اِدھر اُدھر اُڑ کر ان سب کی آنکھوں میں پڑ رہے ہیں جو مہندر ناتھ کے دوست تھے اور اس کے اپنے ہونے کا دعوےٰ کرتے تھے اور راکھ کے یہ ذرّے بڑی تلخی سے انہیں یہ احساس دلا رہے ہیں کہ کاش ان سب نے مہندر ناتھ کو یوں دھیرے دھیرے راکھ ہو جانے

سے روکا ہوتا۔

مہندر ناتھ ایک خاموش فقیر کی طرح اپنی دھونی رما کر بیٹھا رہا اور سب کے دکھ درد بانٹتا رہا۔ جو بھی اس کے پاس اپنا کوئی درد لے کر آیا اس نے اپنے خلوص کی جلتی ہوئی دھونی سے چٹکی بھر راکھ اٹھا کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دی لیکن کسی سے کبھی کوئی امید یا توقع نہ رکھی۔ وہ اپنے دوستوں کی اپنی سادہ اور پرخلوص مسکراہٹ کے علاوہ جو بھی کوئی تواضع کر سکتا تھا کرتا اور جب اس کا کوئی دوست اس کے گھر آجاتا تو اس کے چھوٹے سے گھر کی دیواریں جگمگا اٹھتیں۔ وہ یوں خوش ہوتا جیسے اس کے گھر جو مہمان آیا ہے وہ خدا کا درجہ رکھتا ہے اور اس لئے اس کا بھرپور احترام کرنا چاہیئے۔ کاش اس کے دوست اور اس کا سماج بھی اس سے وہی سلوک کرتے جو سلوک وہ ان سے کرتا رہا ہے وہ بھی اگر چاہتا تو اپنے آرام و آسائش اور دنیاوی وقار حاصل کرنے کے لئے اہلِ اقتدار لوگوں سے سمجھوتے کر لیتا اور ٹھاٹھ کی زندگی گذارتا لیکن وہ تو آخری وقت تک اسی طبقے کی نمائندگی کرتا رہا جس کی خاطر اس نے اپنا تمام ادب تخلیق کیا تھا وہ اسی طبقے کے ایک عام فرد کی طرح جیا اور اسی طرح مر بھی گیا۔

کوئی دو برس پہلے جب میں ایک بار بمبئی گیا تو وقت بہت ہی کم ہونے کے باوجود کچھ دیر کے لئے مہندر ناتھ سے ملنے گیا۔ فلم رائیٹرز ایسوسی ایشن کے دفتر میں ہی، جہاں وہ بڑی باقاعدگی سے اپنا طے شدہ وقت گذارتا تھا اور ایسوسی ایشن کے لئے کام کرتا تھا میرے ساتھ صابر دت تھا جس کی کوشش ہی سے یہ مہندر ناتھ یادگار نمبر مرتب ہوا ہے۔ اس بار میں مہندر ناتھ سے کئی برسوں کے بعد ملا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میری طرف لپکا اور بازوؤں میں لے کر گلے سے لگا لیا۔ اس کے دل کی تیز دھڑکن میرے دل کے قریب تھی۔ ہم بہت دیر باتیں کرتے رہے۔ نئی کہانیوں اور نئی فلموں پر بحث کرتے رہے۔ لیکن مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ مہندر ناتھ کے چہرے کی چمک دھندلی پڑ گئی تھی اور اس کی شخصیت کے گرد جو ایک ہلکا سا بادل میں نے اکثر چھایا ہوا دیکھا تھا اب اس کا رنگ گہرا ہو گیا تھا۔ اب وہ ایک گھٹا کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ مجھے دھڑکا ہوا کہیں یہ گھٹا کبھی کھل کر برس ہی نہ پڑے۔ اس کی بے پناہ خواہش کے باوجود میں اس کے گھر نہ جا سکا اور وہیں دفتر میں ہی چائے کی ایک پیالی پر اکتفا کی۔ اس کے دفتر سے باہر آنے سے پہلے میں خود بھی فلم رائیٹرز ایسوسی ایشن کا ممبر بن چکا تھا۔ یہ اس کی خواہش بھی تھی اور یہ ایک دوسرے کے قریب رہنے کی ایک سبیل بھی تھی۔ اب مجھے فلم رائیٹرز ایسوسی ایشن کے خطوط کے ساتھ ساتھ مہندر ناتھ کی مختصر سی ذاتی تحریر بھی مل جایا کرتی تھی

مہندر ناتھ سے میری آخری ملاقات فروری ۱۹۷۶ء میں ہوئی۔ میں اپنے بھائی سنیل دت کے پاس ٹھہرا ہوا تھا۔ بمبئی میں میرا قیام پہلے کی طرح اب بھی مختصر ہی تھا لیکن اس بار میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ایک شام ضرور مہندر ناتھ کے ساتھ گذاروں گا۔ بمبئی میں میرے تین ہی ٹھکانے ہوتے ہیں۔ مستقل طور پر سنیل دت کا گھر اور کیمپ آفس جاں نثار اختر کا اور ویدراہی کا گھر۔ ان دنوں میرا ایک اور کیمپ آفس بھی بن گیا تھا وہ تھا پروڈیوسر آر کے بدھا کا گھر جو ان دنوں 'عزیزی ہٹاؤ' فلم کی تکمیل میں مصروف تھا۔ مجھے اگر کسی شام کہیں باہر جانا ہوتا تو سنیل دت اور بھابی نرگس دت سے تو اجازت لینا ہی پڑتی تھی اسی کے ساتھ جاں نثار اختر اور ویدراہی سے بھی پوچھنا پڑتا تھا۔ اس بار جب صابر دت نے مہندر ناتھ سے یہ فیصلہ کر لیا کہ میں اگلے روز رات کا کھانا اس کے ساتھ کھاؤں گا تو پھر جاں نثار اختر اور ویدراہی کا مشترکہ پروگرام گڑبڑ ہوتا تھا چنانچہ یہ طے ہوا کہ ہم تینوں مہندر ناتھ کے گھر اکٹھے ہوں گے۔ ویدراہی کسی مجبوری کے کارن نہ آ سکا لیکن جاں نثار اختر اور میں صابر دت کے ساتھ مہندر ناتھ کے گھر پہنچ گئے۔ مہندر ناتھ کی وہی جانی پہچانی خلوص بھری مسکراہٹ ہمارے سواگت کو دروازے پر موجود تھی اور اس کے پرانے نیم اندھیرے گھر کی دیواریں جگمگا اٹھی تھیں۔

اتفاق سے کنور مہندر سنگھ بیدی بھی اس دن بمبئی میں تھے۔ شہید اعظم بھگت سنگھ کی والدہ کے اعزاز میں ایک مشاعرہ ہو رہا تھا۔ اس میں شرکت کے لئے کنور صاحب نے مجھے بھی کہہ رکھا تھا۔ جاں نثار اختر اور صابر دت کو تو خیر وہاں جانا ہی تھا۔ لیکن مہندر ناتھ کے گھر پہنچ کر مشاعرے میں جانے کا میرا ارادہ تو ایک دم بدل گیا۔ البتہ جاں نثار اختر اور صابر دت کچھ دیر تک اپنے ارادے پر قائم رہے۔ مگر جوں جوں رات

بڑھتی گئی اور ہم ادب اور فلم اور دوسرے مسئلوں میں الجھتے گئے۔ اُن دونوں حضرات کا ارادہ بھی ڈگمگانے لگا۔ مہندر ناتھ نے حال ہی میں کرشن جی پر ایک ڈاکومنٹری مکمل کی تھی اور اب وہ ایک دوسری ڈاکومنٹری بنانا چاہتا تھا طے یہ ہوا کہ وہ مجھے اس سلسلے میں ایک طویل خط لکھے گا۔ اور ڈاکومنٹری کا بجٹ اور اس سے متعلقہ دوسرے امور پر ایک نوٹ بھیجے گا۔ اور اس کے بعد ہم اس پروجیکٹ کی روپ ریکھا بنائیں گے۔ لیکن مجھے اس بار بڑی شدت سے احساس ہوا کہ جس مشترکہ لمحہ میں آج سے پچیس سال پہلے ہم ملے تھے اور ایک رشتہ کی بنیاد رکھی تھی وہ لمحہ مہندر ناتھ کی زندگی میں دوبارہ آگیا تھا۔ اس بار اس کی نوعیت مختلف تھی۔ روپ ضرور الگ تھا۔ لیکن تاثر پہلے سے زیادہ شدید تھا میرے اور مہندر ناتھ کے درد کے رشتے کا ایک نیا موڑ سامنے کھڑا تھا۔ اور اب اس کی باتوں میں وہ پہلا سا حوصلہ اور مخالف قوتوں سے ٹکر لینے کا عزم اتنا مضبوط نہیں رہا تھا۔ لگتا تھا فقیر کی دھونی آہستہ آہستہ ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ اگرچہ راکھ کی چٹکی لینے والوں کی بھیڑ اب بھی اتنی ہی تھی۔ جب آدھی رات کے بعد مہندر ناتھ نے ہم تینوں کو الوداع کہی اور میرے گلے سے لگ کر مجھے ایک طویل خط لکھنے کا وعدہ کیا تو جانے کیوں میری آنکھیں گیلی ہوگئی تھیں۔ یہی غنیمت تھا کہ میری آنکھوں کے اس گیلے پن کو کسی نے نہیں دیکھا تھا۔

اور کوئی تین ہفتوں کے بعد مہندر ناتھ کا سبز سیاہی سے لکھا ہوا طویل خط مجھے چنڈی گڑھ میں ملا جس میں اس نے نئی ڈاکومنٹری بنانے کا ذکر کیا تھا اور بجٹ اور دوسرے امور کے بارے میں ایک ٹائپ شدہ نوٹ بھی ساتھ اٹیچ کیا تھا۔ میں اس کے خط کا مکمل جواب دینے کے لئے اس کے تمام سوالات کے جواب تلاش کرتا رہا تاکہ ڈاکومنٹری بنانے کی اسکیم سرے چڑھ جائے کہ اچانک ایک دن مجھے صابر دت نے تار سے اطلاع دی کہ مہندر ناتھ ہم سب کو چھوڑ کر جا بھی چکا تھا۔ وہ مارچ کی بائیس تاریخ تھی اور یہی تاریخ میری شریک حیات کی موت کی بھی تھی۔ جس کی موت پر میں نے اپنا ناولٹ "سیندور کی راکھ" لکھا تھا۔

اس رات میں بہت رویا۔ میں نے مہندر ناتھ کے خط کا جواب دینے میں بہت تاخیر کی تھی۔ میں اس کے سوالوں کے جواب ہی ڈھونڈ تا رہا اور وہ ایک بڑا سا سوالیہ نشان میرے سامنے چھوڑ کر اپنی خلوص بھری مسکراہٹ سے یہ کہتا ہوا چلا بھی گیا تھا،

'ڈاکٹر تم نے جواب دینے میں بہت دیر کر دی۔ میں اور انتظار نہیں کر سکتا۔ لیکن عوام سے جو میرا اور تمہارا رشتہ ہے اُسے ضرور قائم رکھنا۔ یہ رشتہ درد کا رشتہ ہے'

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

وشوامتر عادل

قہوہ خانے سے سرائے کے باہر تک

پرانی دلی کے ایک چھوٹے سے قہوہ خانے میں حسب معمول بیٹھا ہوا میں قہوہ پی رہا تھا۔ اور کھا جا کھار ہا تھا۔ میری میز کے ارد گرد تین بید کی کرسیاں خالی پڑی تھیں۔ باہر بازار میں لوگ آجا رہے تھے۔ پرے باغ میں درخت تھے، عمارتیں تھیں اور اس سے پرے کسی کارخانے کی لمبی ناک سے اٹھتا ہوا کثیف دھواں ـــــ میں یونہی ادھر اُدھر کی بے معنی ـ بے ربط ـ بے سرو پا باتیں سوچ رہا تھا۔ وقت کی پتیاں، ننھی ننھی زرد زرد آہستہ آہستہ گرتی ہوئی۔ ہماری تہذیب دب جائے گی، گم ہو جائے گی۔ قبریں بن جائیں گی اور پھر انسان کے مضبوط ہاتھ انھیں کھودیں گے۔ بے شمار ننھے ننھے شگوفے، نئی نئی کونپلیں، چمکتے ہوئے پھول صبح کے اجالے میں مکڑی کے جالے۔

میں نے قہوے کے پیالے پر ہونٹ رکھ دیے۔ قہوہ کسی قدر ٹھنڈا ہو چکا تھا لیکن قہوہ پھر قہوہ تھا۔ میں پینے لگا۔

"لو"۔ پتلے چہرے، کھردرے گالوں اور بے ترتیب بالوں والے سلام نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

میں نے پیالہ میز پر رکھتے ہوئے کہا ـــ "بیٹھو یار"

"انھیں جانتے ہو۔؟"

"نہیں۔ پر میرا خیال ہے شاید کہیں دیکھا ہے۔"

"آپ ہیں مہندر ناتھ ـــ"

"خوب۔ بیٹھیے صاحب۔"

"مہندر ناتھ، کرشن چندر کے چھوٹے بھائی ہیں۔"

"کرشن چندر کے چھوٹے بھائی۔ بیٹھیے نا صاحب بیٹھیے۔ آخر تکلف کیا ہے؟" میں نے گرمجوشی سے جلدی جلدی کہنا شروع کیا۔ آخر یہ مہندر ناتھ۔ مشہور افسانہ نگار کرشن چندر کے چھوٹے بھائی تھے۔ کرشن چندر کے افسانے دو فرلانگ لمبی سڑک، جہلم پر ناؤ میں۔ ڈاچی والیا موڑ مہار وے۔ آنگی! آنگی!! آنگی!!! آنسو بھری کالی آنکھوں والی آنگی کے خالق کرشن چندر کے چھوٹے بھائی ـــ

دیکھیے مہندر ناتھ صاحب۔ میں ذرا بے تکلف واقع ہوا ہوں۔ وہ ـ وہ طلسم خیال پر ـــ ہیں۔ میرا مطلب ہے کرشن چندر پر جب میں نے پہلا مضمون کالج میگزین راوی میں لکھا تو آپ جانتے ہیں (ہنستے ہوئے) آپ سمجھتے ہیں۔ کرشن چندر سے میری پہلی ملاقات اس کے بعد ہوئی۔"

"ہو سکتا ہے۔ ایسا اکثر ہو جاتا ہے۔" مہندر نے اطمینان سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اور پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"ہو نہیں جاتا صاحب ہوا۔ اور کرشن چندر۔ میرا مطلب ہے آپ کے بڑے بھائی۔"

"ابے یونہی بکتا جائے گا؟ ذرا بیرے کو آواز دے"۔ سلام نے ٹوکتے ہوئے کہا اور پھر خود ہی چلّایا۔ "بیرا۔ بیرا۔"

مجھے سلام پر بے حد غصہ آیا۔ بدتمیز کہیں کا۔ لیکن چپکا ہو رہا اس لئے کہ ان دنوں مجھ پر سلام کا بے حد رعب تھا۔ سلام مقامی نشرگاہ میں پروگرام مرتب کرتا تھا اور میں اس کے ساتھ تین چار عورتوں کو ـــــ چاہے وہ طوائفیں ہی تھیں۔ دیکھ چکا تھا۔

"آپ پالیٹکنک میں پڑھاتے ہیں؟" مہندر نے بات کرنے کی خاطر پوچھا۔

"آپ کو کیسے معلوم ہوا۔؟ واللہ آپ تو جوتشی ہیں جوتشی"۔ میں نے چونک کر کہا۔ "صاحب میں بھی اکثر لوگوں کے چہرے دیکھ کر یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرتا ہوں کہ وہ کیا کرتے ہیں۔"

"لیکن مجھے تو سلام نے بتایا ہے۔ کہ آپ پڑھاتے ہیں۔ میں جوتش ودتش کا قائل نہیں ہوں"۔ مہندر نے نہایت متانت سے کہا۔ میں جل بھن کر کباب ہی تو ہو گیا۔ عجیب مسخرے کو یہ سلام کا بچہ پکڑ لایا ہے۔ اپنے آپ کو افلاطون، لبقراط، جالینوس کی دُم سمجھتا ہے بات یوں کرتا ہے گویا ساری دنیا کی عقل اس کی کھوپڑی میں پڑی ہے۔

"لیکن مہندر صاحب! چہروں سے لوگوں کے ناموں کا اندازہ لگانا تو واقعی نہایت دلچسپ کھیل ہے"۔ میں نے خفت مٹاتے ہوئے کہا

"وہ کیسے؟" مہندر نے پوچھا۔

"کیا پیو گے"۔ سلام نے مہندر سے پوچھا۔

"پانی ـــ" مہندر بولا۔

"پانی نہیں صاحب قہوہ پیجیے قہوہ"۔ میں نے کہا۔

"نہیں۔ قہوہ پینے سے مجھے دل کی دھڑکن شروع ہو جاتی ہے"۔ مہندر نے کہا۔

سلام نے میرے اور اپنے لئے قہوہ۔ مہندر کے لئے پانی کا ایک گلاس اور کچھ کیک منگائے۔

"ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا"۔ میں مہندر سے مخاطب ہوا۔

"چہرے"

"جی ہاں۔ چہرے۔ مثلاً جب میں کسی گول سڈول چہرے والی لڑکی کو دیکھتا ہوں تو مجھے خیال ہوتا ہے کہ اس کا نام "اوشا" یا "چمپا" ہوگا۔

"چاہے اس کا رنگ کالا ہی کیوں نہ ہو"۔ سلام بولا۔

"نہیں بے۔ کالے رنگ سے مجھے نفرت ہے۔ کالے رنگ کی عورتوں کو تو میں دیکھتا تک نہیں۔ اور ہاں۔ اگر کسی لڑکی کا چہرہ پتلا ہونٹ تیکھے، ناک ستواں اور آنکھیں بڑی بڑی خواب آلود ہوں تو مجھے خیال ہوتا ہے کہ اس کا نام سیما۔ آنگی یا کملا ہوگا"۔

"تو نام چنتے وقت آپ کو مذہب کا خیال نہیں آتا ـــ"۔ سلام نے پھر ٹانگ اڑائی۔

"نہیں بے نام کا مذہب سے کیا تعلق۔ خوب صورت کو دیکھتے ہی جو نام سوجھ جائے۔ بس وہی ٹھیک ہوتا ہے"۔ میں نے خشکی سے کہا۔

"خیر ایک بات بتائیے عادل صاحب"۔ مہندر نے پھر اپنی متانت کے گھونسلے سے سر نکالتے ہوئے کہا۔

"جی ارشاد ـــ"

"کبھی کوئی کملا یا بملا یا اوشا آپ کے ہاتھ لگی بھی۔؟"

"صاحب میں جسمانی عشق کا قائل نہیں۔ میں تو سوچتا ہوں کہ اگر ایک بار مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ عورت کا جسم کیا ہے تو میرے لئے عورت ہمیشہ کے لئے ایک بے جان لاش بن کر رہ جائے گی۔"

"تو آپ کا خیال ہے کہ عورت صرف دیکھنے کے لئے بنائی گئی ہے۔"

"نہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ عورت کو عورت ہم مرد بناتے ہیں، ورنہ وہ گوشت اور پوست کا ایک ڈھانچہ ہے۔"

"مجھے اسی ڈھانچے میں عورت نظر آتی ہے۔"

"آپ کا مطلب؟"

"مطلب یہ ہے کہ عورت۔ عورت کے سوا کچھ نہیں۔ جیسے پھول پھول ہی ہوتا ہے درخت درخت ہی ہوتا ہے۔ مرد، مرد ہی ہوتا ہے۔"

"جناب پروفیسر صاحب۔ آیا کچھ آپ کی الٹی کھوپڑی میں۔" سلام نے چلا کر کہا۔ "بچوں کو پڑھانا اور بات ہے عورت کو سمجھنا اور بات ہے۔"

"پر اگر آپ کو یہ چلتی پھرتی عورتیں شادی سے پہلے نہ ملیں۔؟" میں نے مہندر سے پوچھا۔

"تو انھیں خریدا جا سکتا ہے۔"

"آپ نے کبھی۔؟"

"ہاں ایک بار۔ اور مجھے کبھی ندامت نہیں ہوئی۔"

میں حیرت سے مہندر کا منہ دیکھنے لگا۔ ماتھا ابھرا ابھرا۔ آنکھیں گھورتی ہوئی۔ ناک سیدھی لکیر کی طرح۔ ہونٹ ....؟ پر مردوں کے ہونٹ کون دیکھتا ہے۔ ٹھوڑی کسی قدر چپٹی۔ گردن بھری ہوئی۔ یہ مہندر ہے اس کے چہرے سے اس کے نام کا پتہ لگانا مشکل ہے۔ اس کے چہرے سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ عورت کو صرف عورت سمجھتا ہے اور ضرورت پڑے تو اسے خرید بھی سکتا ہے ندامت کے بغیر۔

سنا ہے مہندر بی اے پاس ہے اور اب ایم اے کی تیاری کر رہا ہے۔ ضرور کر رہا ہوگا۔ ورنہ اس کے گھر میں انگریزی ادب کی کتابیں کیوں ہوتیں۔ اور یہ بھی سنا ہے کہ جب یہ مہندر، جواب مضبوط اور توانا ہے لیکن جس کا دل قہوہ کے نام سے دھڑکنے لگتا ہے دسویں جماعت میں پڑھتا تھا تو دبلا پتلا ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا۔ پھر اس مہندر نے ورزش شروع کی۔ کشتی لڑی، ڈنڈ پیلے، شاید مگدر بھی گھمائے ہوں اور ہو سکتا ہے ہر روز صبح اٹھ کر مکھن کے ساتھ پانچ بادام بھی کھائے ہوں گے۔ اور اب یہ مہندر ایک مضبوط اور توانا مرد ہے۔ ریڈیو کے لئے ڈرامے بھی لکھتا ہے اور آج تازہ خبر یہ سنی ہے کہ اس مہندر نے افسانے بھی لکھنا شروع کر دیئے ہیں۔ اچھی صاحب افسانہ نویس کا بھائی ہے صرف بی اے پاس۔ ہو سکتا ہے بھائی کا کوئی غیر مطبوعہ ردی افسانہ اٹھا لیا ہوگا۔ افسانہ نویس بن بیٹھا۔ افسانہ نویس بنتے دیر تھوڑی ہی لگتی ہے۔

شام کا وقت۔ تیس ہزاری میں بھیروں کے مندر کے سامنے کرشن چندر کا مکان۔ باہر برآمدہ۔ اندر دو کمرے۔ ایک ڈرائنگ روم۔ دوسرا پردہ میں چھپا ہوا۔ ڈرائنگ روم میں نہ میز ہے نہ کرسی۔ ایک قالین بچھا ہوا ہے۔ مہندر کے سامنے چند کاغذات فرش پر بکھرے ہوئے ہیں۔ پاس سلام بیٹھا ہے۔ کرشن چندر ابھی آیا نہیں۔ میں نے کہا۔ "مجھے پیاس لگی ہے۔" مہندر کی بہن تھوڑی دیر بعد شربت کے تین خوب صورت گلاس فرش پر رکھ کر چلی گئی۔

میں نے شربت پیتے ہوئے کہا۔ "اچھا تو سناؤ۔"

مہندر نے کہا۔ "لو سنو۔ ادم۔ (اپنے چھوٹے بھائی سے) ذرا یہ لیمپ جلا دو۔"

بجلی کا لیمپ روشن ہو گیا۔ مہندر پنجابی انداز میں کہانی پڑھتا رہا۔ سلام شربت کا گھونٹ کبھی کبھی پی لیتا۔ میں بار بار

سوچ رہا تھا کہ یہ کرشن چندر کا بھائی ہے۔ کہانی کا عنوان تھا "دو بیل"۔ کہانی سیدھی سادی تھی۔ بوڑھا احمد بیس دن سے بیمار تھا بھوکا تھا — گھر میں پھوٹی کوڑی نہ تھی۔ وہ اپنا دو دن سے بھوکا بیل اور چھکڑا لے کر مزدوری کرنے گیا۔ کہ راستے میں سپاہی نے جانور پر ظلم کرنے کے جرم میں اسے انسدادِ بے رحمی کے محکمے کے حوالے کر دیا۔ بیل زبردستی ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔ بوڑھا احمد بھوک سے اور زیادہ نڈھال ہو کر دفتر سے باہر نکل آیا۔

اور جب بوڑھا احمد دروازے سے باہر نکلا تو اس نے سوچا کہ کیا اس دنیا میں کوئی ایسا ہسپتال نہیں ہے جہاں ان انسانوں کو داخل کیا جائے جن پر بے رحمی کی جاتی ہے ...... اس کے کانوں میں ٹراموں، کاروں اور رکشاؤں کی ٹن ٹن کی آوازیں تھیں۔ لیکن یہ شور لمحہ بہ لمحہ کم ہوتا گیا — میں نے دیکھا کہ مہندر کا چہرہ پڑھتے پڑھتے غصے کے جذبات سے سرخ ہو گیا۔ اس کے کان سلگ سے اٹھے اور پھر جب کہانی ختم ہوئی تو وہ ٹھنڈی راکھ کی طرح خاموش ہو گیا۔

"سنی تم نے —" سلام بولا۔

"ہاں —" میں نے کہا۔

"کیسی ہے —؟" اس نے پوچھا۔

"عشقیہ نہیں" میں نے کہا۔

"میں نے عشقیہ کہانی تو نہیں لکھی" مہندر نے دل برداشتہ ہو کر کہا۔ "اور پھر صرف عشقیہ کہانی ہی تو کہانی نہیں ہوتی"

"یہی تو میں کہتا ہوں میرے دوست۔ آج کل جب سب لوگ عورت — عورت — اور صرف عورت پر کہانیاں لکھتے ہیں، تم نے عورت پر کہانی نہیں لکھی ہے"

"اس لئے کہ عورت خریدی جا سکتی ہے" سلام نے کہا۔

"نہیں بے وقوف اس لئے کہ مہندر کے دل میں عورت کی اتنی اہمیت نہیں جتنی انسان کی"

میں نے دیکھا کہ مہندر کی آنکھوں میں کامیابی اور خوشی چمک رہی تھی۔

اس کہانی کے بعد مہندر نے اور بہت سی کہانیاں لکھیں۔ ان کہانیوں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ مہندر متوسط طبقہ سے تعلق رکھتا ہے۔ مہندر نے جو زندگی دیکھی ہے۔ اس میں ہندوستانی ماحول کا پورا ہاتھ ہے۔ یہاں معاشرتی اور اقتصادی زنجیریں ہیں۔ غلامانہ ذہنیت بار بار پلٹتی ہے۔ جنسی بھوک کی مکڑیاں خوبصورت جالے بنتی ہیں۔ مہندر اس ماحول میں گھٹن محسوس کرتا ہے اور بعض اوقات شدت احساس سے تنگ آ کر چیخ اٹھتا ہے لیکن پھر خود ہی خاموش ہو جاتا ہے، بے بس ہو جاتا ہے۔ یہ خاموشی، یہ طوفان کے بعد کا سکوت قرار نہیں۔ بزدلی نہیں بلکہ ایک نئے طوفان کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔

میں اکثر سوچتا رہتا تھا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ کیوں پریشان ہوں اور آہستہ آہستہ مجھ پر یہ بات آشکار ہونے لگی کہ مجھے کلرکی سے نفرت ہے۔ مجھے اس گھٹے ہوئے ماحول سے نفرت ہے۔ مجھے ان چھوٹے چھوٹے مکانوں سے نفرت ہے۔ مجھے انسانوں کی کمینگی سے نفرت ہے۔ پھر کیوں ہر طرف غلاظت ہی غلاظت نظر آتی ہے کیوں ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے، چھتوں پر اندھیرا، برتنوں پر اندھیرا، چولہے پر اندھیرا روٹیوں پر اندھیرا! اور آہستہ آہستہ یہ اندھیرا پھیلتا جاتا ہے۔ انسان کے ریشے ریشے میں سمائے جاتا ہے۔

کیوں نہ میں اس اندھیرے کو چیر دوں۔ اس اندھیرے کی قبا کو پھاڑ دوں۔ تاکہ روشنی کا منبع اعظم پھوٹ پڑے، کم از کم ان چھوٹے چھوٹے مکانوں میں تو روشنی آ جائے۔"

مہندر مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ تم جس روشنی کی تلاش میں ہو۔ اس پر تمہارا حق ہے لیکن میں دیکھتا ہوں کہ اندھیرے کا یہ

لبادہ پرانا ہو چکا ہے، تار تار ہو چکا ہے لیکن ابھی ہماری اور تمہاری زندگی کے مدقوق جسم سے نہیں اترا۔ میں جانتا ہوں تم اسے اتارنے کی کوشش کروگے۔ تم اور افسانے لکھوگے، اور طرح کے افسانے لکھوگے اور آخر کامیاب ہو جاؤگے۔

مہندر ایم اے پاس نہ کر سکا۔ مہندر اپنی روزی آپ کمانا چاہتا ہے، جتنی جلدی اس سے ہو سکے۔ اور اس نے لکھنا شروع کیا۔ رسالوں میں لکھ کر روزی نہیں کمائی جا سکتی تھی۔ مہندر نے ریڈیو کے لئے لکھنا شروع کیا۔ اور پھر دہلی ریڈیو اسٹیشن کے خداوندانِ بست و کشاد نے ایک دن یہ اعلان کر دیا کہ مہندر کی چیزیں دہلی اسٹیشن سے اس لئے براڈکاسٹ نہیں ہو سکیں گی کہ اس کا بھائی کرشن چندر وہاں ملازم ہے۔ مجھے یاد ہیں وہ دن، مہندر دانت پیس کر رہ گیا۔ لیکن کر بھی کیا سکتا تھا۔ کچھ عرصہ بیکار بیٹھا رہا۔ پھر ایک دوسرے ریڈیو اسٹیشن کے لئے لکھنے لگا۔ اور کسی نہ کسی طرح گزر اوقات ہوتی گئی۔

۱۹۴۹ء — مہندر بمبئی آ گیا۔ فلمی دنیا میں روزی کمانے کے لئے۔ لیکن ہر جگہ ناکامی اور مایوسی کا منہ دیکھنا پڑا۔ لوگ خوشامد پسند کرتے ہیں۔ مہندر خوشامد نہیں کر سکتا تھا۔ لوگ سفارش چاہتے ہیں۔ مہندر کے پاس دو کتابوں اور اپنی لکھی ہوئی چیزوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ مہندر صرف ریڈیو سے کماتا — کڑھتا — کبھی کبھی اختلاج قلب سے پریشان ہو جاتا — اور چپ رہتا۔

ایک کمرے میں ہم چھ سات انسان بستے تھے۔ مہندر بھی اُن میں سے ایک تھا — سب کے سب بھوکے، جنس کے بھوکے، روپے کے بھوکے، انسانیت کے بھوکے۔ اور ان میں سب سے زیادہ بھوکا مہندر تھا۔ مہندر کا بہترین افسانہ "جہاں میں رہتا ہوں" اسی ماحول اور انہی دنوں کی پیداوار ہے۔

چڑجی کئی کئی دن بھوکا رہتا، چپکے سے سیڑھیوں پر آ کے سو رہتا۔ صبح اٹھتا، ہم سب پیسے جمع کر کے سامنے ایرانی کی دوکان سے چائے منگواتے، چڑجی کبھی پیسے نہ دیتا — اس کے پاس ہوتے تو دیتا۔ ہم سب اسے گالیاں دیتے، اسے کمینہ کہتے، وہ خاموش بیٹھا رہتا، صرف کبھی کبھی مہندر کی طرف دیکھ لیتا، اور جب وہ چلا جاتا، تو مہندر سب کو ڈانٹتا۔ "شرم نہیں آتی تمہیں۔ اس کے پاس پھوٹی کوڑی نہیں اور تم ....."

"ہمارے پاس کہاں کا خزانہ ہے۔" سردار جی کہتے۔

مہندر اُبل پڑتا۔ "سردار پھر کبھی ایسی بات کی تو دانت توڑ دوں گا — ٹرنک اٹھا کر نیچے پھینک دوں گا۔ میں کئی دنوں سے دیکھ رہا ہوں تمہاری حرکتیں —"

سردار مہندر کو خفا دیکھ کر بھیگی بلی بن جاتا۔

ہری قلاش ہوا — مہندر نے روٹی کھلائی۔ سردار بھوکا مرا۔ مہندر کے پاس آیا — رندھیر کو رنڈی کے مکان پر کسی شرابی نے پیٹا مہندر کو سیڑھیوں پر لے گیا — حال سنایا اور آنکھوں میں آنسو بھر لایا — مدھوسودن نے افسانہ لکھا۔ مہندر کو سنانے چلا آیا۔ میں اکثر سوچتا یہ لوگ صرف مہندر کے پاس کیوں آتے ہیں؟ مجھے ان سے حسد سا ہو جاتا۔ لیکن جب مجھے میری تنہائی ستاتی، جیب میں پیسہ نہ ہوتا تو میں بھی مہندر کے پاس چلا آتا۔

"باہر چلوگے —؟"

"چلو —"

ہم دونوں بازاروں میں گھومتے، لڑکیوں پر طعنے کستے، ننگی پنڈلیوں کی تعریف کرتے، اشتراکیت پر بحث کرتے، اور پھر سمندر کے کنارے جا کر گول گپے کھاتے اور ناریل کا رس پیتے۔ مہندر ایسے موقعوں پر خوب ہنستا۔ خوب شور مچاتا۔ خوب باتیں کرتا۔ اور پھر کبھی کبھی

ہم دونوں چپ چاپ گھومتے، منہ سے لفظ تک نہ نکلتا۔ اور ہم رات کو گھر واپس چلے آتے۔

جب میں نے ہنسنا چاہا ہے، مہندر کبھی اداس نہیں رہا۔

جب میں نے بولنا چاہا ہے، مہندر کبھی چپ نہیں رہا۔

جب میں نے خاموش رہنا چاہا ہے، مہندر کبھی نہیں بولا۔

لیکن پھر بھی مہندر اپنی انفرادیت لئے ہوئے ہے، جب مہندر اپنے افسانوں میں عورت — جنس — کے لئے بیتاب ہوتا ہے تو آپ بھی اس کے لئے بیتاب ہو جاتے ہیں۔ آپ کے دل میں خوبصورت ٹانگیں، نرم رانیں، ابھری ہوئی چھاتیاں اور مسکراتے ہوئے ہونٹ گدگدی لیتے ہیں، پھر بھی آپ مہندر پر خفا ہوتے ہیں کہ وہ بدمعاش ہے عریاں نگار ہے، جنس کا بھوکا ہے۔ آپ ہی بتایئے قصور کس کا ہے؟

مہندر — متوسط طبقے کے مہندر سے شاید کسی عورت نے پیار نہیں کیا۔ مہندر اپنے افسانوں میں جھوٹ کیوں بولے؟

مہندر کے افسانوں میں قہقہے کم ہیں، آنسو زیادہ۔ آپ کو شکایت ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کیا اس میں بھی مہندر کا قصور ہے؟ ان حالات کا نہیں جو ان آنسوؤں کے ذمہ دار ہیں۔؟

مہندر کے افسانوں کے کردار سب غریب ہیں، بھوکے ہیں، نادار ہیں، آپ کہتے ہیں کہ آپ کو ایسے کرداروں سے چڑ ہے۔ مہندر کہتا ہے آپ کو بجلی کے کھمبے سے لٹکا دینا چاہیئے۔

آج کل مہندر فلم اسٹار بن گیا ہے۔ خوب صورت کپڑے پہنتا ہے۔ کاروں میں گھومتا ہے، ہوٹلوں میں کھانا کھاتا ہے لیکن افسانے وہ اب بھی لکھتا ہے۔ خوب صورت کپڑوں پر نہیں — کاروں پر نہیں — ہوٹلوں پر نہیں۔ بلکہ پھٹی ہوئی دھوتیوں پر جن میں سے آپ کو بھوکی عورت کا جسم دکھائی دیتا ہے۔ اور آپ جھلاتے ہیں۔ پچکے ہوئے گالوں پر۔ چوسی ہوئی ایکسٹرا لڑکیوں پر، جو پیٹ بھرنے کے لئے اپنا جسم بیچتی ہیں۔ آتشک زدہ بھکاریوں پر جو کار والوں سے بھیک مانگتے ہیں، آپ پوچھیں گے کیوں؟ آخر کیوں؟ اب مہندر کو کیا پڑی ہے۔ ایسی چیزوں کا ذکر کرے۔؟ اس کا جواب مہندر کے کپڑوں کے پاس نہیں۔ مہندر کی کاروں کے پاس نہیں۔ مہندر کی امارت کے پاس نہیں، بلکہ مہندر کے پاس ہے جس نے پہلا افسانہ "دو میل" لکھا تھا۔ اور پھر "جہاں میں رہتا ہوں"؟ آپ نہیں جانتے کہ مہندر اب بھی جب کبھی کسی کو مجبور اور ناکام دیکھتا ہے تو اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ اور وہ چاہتا ہے کہ آرام و آرائش کے سب سامانوں کو سب انسانوں میں برابر برابر بانٹ دے اور اگر ایسا نہ ہوسکے تو انھیں جلا کے راکھ کر دے۔

اگر اب بھی آپ اس افسانہ نویس سے خفا ہیں۔ تو یقین جانیئے اسے آپ کی ذرا بھی پرواہ نہیں —▲

سامنے نقشہ لٹک رہا تھا۔ ہندوستان کا نقشہ۔ ایک طرف ہندو۔ دوسری طرف مسلمان۔ ایک دل کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے۔ ایک ہی وطن، جس کی تقسیم میں خون کی ندیاں بہہ نکلیں، نہ ہندو بڑا تھا نہ مسلمان دونوں رہزن تھے۔ دونوں حیوان تھے۔

— مہندر ناتھ

فکر تونسوی

ایک معذرت نامہ

پیارے صبا بردت !

تمہارا عقیدت نامہ ملا - میرے اس خط کو معذرت نامہ سمجھئے - کیونکہ میرے ایسے نااہل کے لئے معذرت طلبی ہی مناسب ہے - مہندر ناتھ پر لکھنے کے لئے میں دنیا کا سب سے غیر موزوں انسان ہوں -

تم مرحوم کے فن اور شخصیت پر ایک خاص نمبر مرتب کر رہے ہو - عام فہم زبان میں ایک ٹھیک خیال ہے ایک نیک ادیب جب تک انتقال نہیں کرتا اُس وقت تک اُسے بلند پایہ تسلیم کرنا آسان کام نہیں ہوتا - کیونکہ ہمارے یہاں اس کی روایت ہی نہیں ہے اور ہماری مُردہ پرست قوم روایات کا بے حد احترام کرتی ہے -

تمہیں شاید یہ بات قدرے تلخ سی لگے - مگر اس زہر کو گوارا کر لو - کہ ہم صرف ادیب کی موت کے بعد ہی سوچتے ہیں کہ اُسے کس طرح عالی مرتبہ ثابت کیا جائے - مہندر ناتھ زندگی میں بھی عالی مرتبہ تھا - لیکن چونکہ نیک نفس تھا اِس لئے اُس نے اپنی عالی مرتبہ ہونے کا ڈھنڈورا کبھی نہیں پیٹا تھا - ڈھنڈورے کے بغیر کون کسی کو مانتا ہے - میں بھی جانتا ہوں - اور تم بھی کہ ہمارے ادب میں ڈھنڈورے کی ہی پردھانتا قائم ہو چکی ہے - کئی ایسے ادیبوں کو ہم عالی مرتبہ تسلیم کر چکے ہیں جو ڈھنڈورے کا ہی فن جانتے ہیں - وہ ڈھنڈورے اور مرتبے کو ایک دوسرے سے اس طرح مدغم کر دیتے ہیں کہ یہ پتہ ہی نہیں چلنے دیتے کہ ڈھنڈورا کہاں سے شروع ہوتا ہے اور مرتبہ کہاں سے ؟ بلکہ مرتبہ شروع بھی ہوتا ہے یا نہیں -

اور ہم نے ڈھنڈورے کو ہی مرتبہ سمجھ کر قبول کر لیا - بقول حفیظؔ جالندھری ؎

حفیظؔ ! اہل سخن کب مانتے تھے
بڑے زوروں سے منوایا گیا ہوں

عالی مرتبہ مہندر ناتھ کے مزاج میں ڈھنڈورا نہیں تھا اس لئے کوئی ساہتیہ اکیڈمی، کوئی پدم شری، کوئی لٹریری ایوارڈ اُس کی طرف بڑھنے کا حوصلہ نہیں کر سکا - ہمارا تہذیبی المیہ یہ ہے کہ ہم نے ایوارڈوں کو ہی ادب کا پیمانہ بنا رکھا ہے - یہ جانتے ہوئے بھی کہ ؏

طوقِ زرّیں ہمہ در گردنِ خر می بینم

ہم اِس پیمانے کی گرفت میں ہی پھنستے چلے گئے - اُسے اپنے گلے کا طوق بناتے چلے گئے جبکہ مہندر ناتھ بڑی صاف سُتھری خاموشی سے تماشائے اہل کرم دیکھتا رہا، مگر لکھتا رہا - لکھتا رہا اُس نے شور نہیں مچایا - کیونکہ متانت اور سادگی کا حسن

اُس کی فطرت میں تھا کہ حالانکہ اُس کی ادبی تخلیقات کی تہوں میں ایک اضطراب تھا بے چینی تھی ۔ طنازی بھی تھی ۔ اُسے سماج اور انسان کے تعلقات کا بھونڈا پن بھی ستاتا تھا ۔ لہٰذا اُس کا قلم تڑپتا تھا ۔ اُس کے اظہار میں ایک کرب تھا ۔ لیکن یہ سب کچھ انتہائی دھیمے، انتہائی نفیس، انتہائی مہین، انتہائی سنجیدگی کے ساتھ تھا ۔ چھچھوراپن نہیں تھا وہ اپنے اضطراب کا راگ بھی بے تاب دھیمے دھیمے سُروں میں گاتا تھا ۔ وہ نہ کسی کو اذیت دیتا تھا اور نہ اذیت کا شور وغل مچاتا تھا ۔ اُس کے محسوسات میں ایک اذیت ضرور ہوتی تھی ۔ لیکن وہ اس اذیت کو لاؤڈ اسپیکر نہیں بنا دیتا تھا ۔

نتیجہ یہ ہوا کہ اُس نے درجن بھر کتابیں لکھ ڈالیں ۔ لیکن کسی ڈھنڈورا باز کو جرأت نہیں ہوئی کہ اُسے عالی مرتبہ فن کار کہہ سکے ۔ شور وغل کے بغیر ڈھنڈورا باز کو کوئی چیز ہضم نہیں ہوتی ۔

مگر میں تمہیں اس ڈھنڈورے کے قافلے میں شمار نہیں کرتا کیوں کہ میں جانتا ہوں ۔ کہ تم نے جب اس خاص نمبر کا منصوبہ بنایا تھا ۔ اس وقت جہندر ناتھ زندہ تھا ۔ اور تم مردہ پرستی کی روایت توڑ کر ایک نئی طرح ڈالنا چاہتے تھے مگر یوں کہو کہ یہ نئی طرح ڈالی جا چکی تھی اور تم اس میں ایک اور اضافہ کرنا چاہتے تھے ۔ نئے ادب کے معمار جہاں ادب میں انقلاب لا رہے تھے یہ ایک صحت مند رجحان تھا جو صرف ترقی پسندوں کی دین تھا ۔

لیکن جہندر ناتھ کا اچانک ہارٹ اٹیک...... ؟ ایک اندوہناک سانحہ پر یقین کرنے کے لئے بھی سنگ و آہن کا کلیجہ چاہیئے ۔ ذہن و دل کی طنابیں کھنچ جاتی ہیں لہٰذا مجھے کبھی یقین نہیں آیا ۔ کیونکہ جہندر ناتھ کے ساتھ ہمارا جذبۂ عشق کا رشتہ تھا ہم سنگ و آہن کے مجسمے نہیں تھے بلکہ احساسات میں گوندھے ہوئے انسان تھے ۔ اور جب میں نے سوچا کہ اب تمہیں جہندر ناتھ کے انتقال کے بعد ہی یہ خاص نمبر منظرِ عام پر لانا پڑے گا ۔ تو مجھے یوں لگا جیسے وہ ہارٹ اٹیک نہیں تھا ۔ بلکہ فرسودہ روایت پر ایک زبردست طنز تھا ۔ (شاید) جہندر ناتھ نے یہ مناسب نہیں سمجھا کہ اُس کے زندہ رہنے کی وجہ سے ملک کی ایک پاپولر روایت کو ٹھیس پہنچے ۔ اس لئے وہ ملک سے ہی اُڑ گیا ۔ تاکہ مُردہ پرست حضرات کی باچھیں کھل اُٹھیں ۔ شاید اُس نے سونگھ لیا ۔ کہ اگر زندہ ادیب کی قدر و منزلت کو ایوارڈ کے پیالے پر پلنے والے "شرفاء" کو سخت اعصابی صدمہ پہونچے گا ۔ جہندر ناتھ ایک نیک نفس انسان تھا ۔ کسی کو صدمہ پہنچانا ۔ اُس کا شیوہ نہیں تھا ۔ اُس نے سوچا ہوگا کہ اگر میری موت سے صاحب اقتدار ادب بازوں کی باچھیں کھلتی ہیں ۔ تو کیوں نہ کھلیں ۔ اُس کے جنازے پر اگر وہ شہنائیاں بجانے کی مسرت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو کیوں نہ کریں ۔ وہ منظر ان کے لئے کتنا خوشگوار اور لذیذ ہوگا جب وہ تالیاں بجا کر تعزیتی ریزولیوشن پاس کریں گے ۔ اور میز پر مکّے مار مار کر تقاضا کریں گے کہ :-

۱- مرحوم کی یاد یادگار قائم کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنائی جائے ۔

۲- مرحوم کے پسماندگان کی کھوج کی جائے اور کھوج سے پہلے اُن کے لئے چندہ اکٹھا کیا جائے ۔

۳- مرحوم کی تصاویر کیلنڈروں پر چھاپی جائیں ۔

۴- تعزیت کے اعزاز میں رسائل اور جرائد کے خاص نمبر شائع کئے جائیں ۔

۵- وزراء اور امراء کو تاریں بھیجی جائیں ۔ کہ جہندر ناتھ چل بسا اور اطلاعاً عرض ہے کہ وہ ایک اعلیٰ مرتبہ رائٹر تھا ۔

۶- اور اگر اس میں راج نیتی کو کوئی فائدہ پہونچتا ہو تو چوک میں اُس کا بُت بھی نصب کیا جائے ۔

ہاں صاحب دت ! جہندر ناتھ کا ہارٹ اٹیک مردہ پرست روایات پر ایک بہت بڑا طنز تھا ورنہ جہندر ناتھ مرنے کے اہل ہی کب تھا ۔ اُسے مرنے کی بھی کیا جلدی تھی ؟

مجھے یقین ہے۔ کہ اب تمہارے خاص نمبر میں جولانیاں دکھانے کے لیے ادبی زعمائے کرام کچھ دقت محسوس نہیں کرینگے اُن کے آنسوؤں میں تابندگی پیدا ہو جائے گی اور یوں لگے گا، جیسے یہ فکر کسی کی تابندگی ہے وہ خلوص جس کے لئے مہندر ناتھ عمر بھر ترستا رہا۔ اُسے مرنے کے بعد نصیب ہوا۔ تو کیا ہرج ہے۔ مرنے کے بعد تو عشاق کے مقبروں پر محبوباؤں کے دیئے جلانے کا عام رواج ہے۔

لیکن خلوص کی اس تشنگی کا مہندر ناتھ عادی تھا۔ وہ عیّاری اور مکاری جو اس کے گردو پیش میں بکھری ہوئی تھی، انسانوں کے رشتوں میں، جذبوں میں، سیاسی شاطروں اور سماجی ناخداؤں میں، قدروں میں اور حسن میں اور عشق میں —— وہ ہر چیز میں جس پھیلے ہوئے تضاد کو دیکھتا اور محسوس کرتا تھا اُسے کہانیوں کے روپ میں ڈھال دیتا تھا۔ اور جیسے ایک آرٹسٹ کا قلب وجگر نہایت دھیمے سُر میں چلّا کر کہتا تھا۔ ,, دوستو! زندگی کو اپنی عیاریوں سے بھونڈا مت بناؤ، خلوص کے نام پر کم خلوصی کے تھرڈ ریٹ مظاہرے مت کرو۔ انسان کے چھوٹے چھوٹے جذبوں کو روند کر ان کو مصنوعی اور خود ساختہ جذبوں کے جھانسے مت دو۔ کہ انسان فطری طور پر نیک ہے سادہ مزاج ہے، اُس کی سادگی اور نیکی میں ہی حسن ہے۔ اس معصوم قسم کے حسن کو بڑی بڑی فلسفوریوں اور نظریوں کا شکار بنا کر غلیظ مت کرو۔

مجھے یاد ہے۔ اُس نے اپنی ایک کہانی ,, چائے کی پیالی ,, میں لکھا تھا کہ :-

,, میں اپنی بیوی سے بے حد خوش ہوں۔ گو قانونی نقطۂ نگاہ سے وہ میری بیوی نہیں ہے۔ بلکہ میری محبوبہ ہے یا آپ اُسے میری داشتہ بھی کہہ سکتے ہیں، سب سے بڑی بات، جس کی وجہ سے میں اُس کا پرستار ہوں۔ یہ ہے کہ وہ ہر صبح چائے کی پیالی بنا کر مجھے دیتی ہے۔ اور جب میں پلنگ پر لیٹ کر اور کبھی بیٹھ کر اُس چائے کو آہستہ آہستہ پیتا ہوں تو دنیا کی تمام لطافتیں بھول جاتا ہوں۔ صرف چائے کا مزہ میری زبان پر رہ جاتا ہے۔ . . . . . ,,

اس مختصر سے پیراگراف میں ہی مہندر ناتھ کے سوچنے کا ڈھنگ سمٹ کر آگیا ہے۔ کہ وہ انسانی رشتوں میں صرف بے ساختہ محبت کو ہی سپریم سمجھتا ہے۔ ہمارے سماج میں شادی کا سسٹم بھی ہے، قانون کا سہارا بھی ہے۔ مگر وہ سسٹم اور سہارے اُس وقت تک کھوکھلے ہیں۔ جب تک اُن میں عورت اور مرد کی محبت کا رس شامل نہیں ہے، ہم ڈھول تاشے، شہنائیاں، جہیز، زرق برق لباس اور گھوڑی اور سہرے کی چمکیلی جھالریں شادی کے ارد گرد لٹکا دیتے ہیں اور ان سے سوسائٹی میں بے حد معزز بن جاتے ہیں۔ اخباروں اور رسالوں میں شادی شدہ جوڑے کے فوٹو چھپواتے ہیں، وزیر اور لیڈر تک کو بلا لاتے ہیں آشیرواد دینے کے لئے لیکن یہ سب تصنع ہے، فریب ہے۔ کیونکہ مرد اور عورت کے درمیان وہ چائے کی پیالی غائب ہے جس میں رس اور خوشبو ہوتی ہے۔ آپ اُس مرد و عورت کو میاں بیوی کہہ دیں یا داشتہ کہہ دیں۔ کوئی بھی شکل عطا کر دیں لیکن ایک انسان دوسرے انسان کے رسیلے اور بے ساختہ عشق میں مبتلا نہیں ہے تو قانون کی نگاہ میں چاہے وہ میاں بیوی کہلائیں۔ سماج کے باوقار اور ذیشان و شوکت والا جوڑا کہہ کر ابھرنے کی کوشش کریں مگر ان کے درمیان انسانی رشتہ غائب ہے۔ چائے کی پیالی غائب ہے۔ اور مہندر ناتھ کی سوچ کہتی ہے کہ بناوٹی کوشش تو محبت کہلانے کی مستحق نہیں ہے۔ اُس سے تو وہ داشتہ اچھی، جو چائے کی پیالی بنا کر دیتی ہے اور اُس میں عشق کی تمام لطافتیں گھول دیتی ہے۔

انسانی رشتہ، رسیلے اور متوالے جذبوں کا رشتہ ہوتا ہے۔ قانون اور رسم و رواج اور برہمن کے منتروں میں سے اور سب کچھ وجود میں آسکتا ہے۔ جذبے جنم نہیں لے سکتے۔ جذبے ان رنگین جھالروں کے محتاج نہیں ہوتے اور میں نے دیکھا ہے کہ مہندر ناتھ کی یہی سوچ تھی جو اُس کے ہر افسانے اور ہر ناول کے روپ میں

بڑی دھیمی دھیمی اور نرم نرم لہجے میں اُبھرتی رہی۔ پالیٹکس ہو یا دھرم، سوشل رسوم و رواج ہوں یا عشق و حسن کی روایتیں مہندر ناتھ کا خیال تھا کہ ان سب چیزوں کے گرد چمکتی دمکتی جھالریں لٹکا دی گئی ہیں جن میں ہم سب کی آنکھیں چندھیائی جا رہی ہیں۔ ان چندھیا دینے والی چیزوں نے ہم سے وہ انسان چھین لیا ہے جو دوسرے انسان سے لطیف محبت کرتا ہے۔ ہم محبت کو گم کر بیٹھے ہیں۔ حتیٰ کہ خود محبت کو بڑے عیّارانہ معنی پہنا دیئے ہیں۔ ہم انسان اپنے کسی بھی فیلڈ میں فطری نہیں رہے، غیر فطری زندگی گذار رہے ہیں۔ جنسی رشتوں تک کو ہم نے سُنہری نقش کاروں اور رنگا رنگ لفاظیوں سے ملوّث کر دیا ہے۔ مہندر ناتھ اپنی آرٹسٹک تخلیقوں کے ذریعے اُن رنگین جھالروں کو ایک طرف کر کے ہمیں مسلسل ہمارا کھوکھلا پن اور ہمارا تصنّع اور ہمارا استحصال پسندانہ رویّہ دکھاتا رہا۔ مگر نہایت لطیف، نفیس اور دھیمے لہجے میں۔ اُس نے مُکّے نہیں دکھائے شور نہیں مچایا۔ جہاں کبھی ہمارے بگڑے ہوئے سُر دیکھے، اُنہیں خوبصورت اور سادہ اشاروں میں فطری آہنگ دیتا رہا ہم نے جتنے نقاب اوڑھ رکھے تھے۔ اُن کو آہستگی سے اُٹھانے میں مصروف رہا۔ سماج جن چیزوں کو اپنے مصنوعی پیمانے سے ناپ کر ناک سکوڑ دیتا تھا۔ مہندر ناتھ اپنے آرٹ کی ایک نازک سی ادا سے اُن چیزوں کو سینے سے لگا لیتا تھا۔ اور کہتا تھا، "اپنے پیمانے کو بدلو۔ تو یہی چیزیں ہماری ناک رکھ لیں گی۔ ہمیں فطری حسن اور بلندی عطا کر دیں گی۔"

ہاں صاحب دوست! مہندر ناتھ کے آرٹ کو سمجھنے کے لئے وہی نرم نرم محبت اور بے لاگ خلوص چاہیئے جسے انسان کے اندر ایک بار پھر بیدار کرنے کے لئے وہ دنیا میں آیا تھا۔ اگر وہ اپنی متین اور دھیمی آواز کی بجائے ڈھنڈورا پیٹتا۔ تو آج وہ سلطنتِ ادب کا شہنشاہ بن جاتا، لیکن اُس نے ایسا نہیں کیا۔ اپنی رسیلی آوازیں سُنا کر وہ چلا گیا، اور یہی اُس کی غلطی تھی مگر یہی اُس کی فطرت تھی۔ اور وہ سچے معنوں میں انسان کی محبوب فطرت کا آرٹسٹ تھا۔ تم اُس کے اعزاز میں خاص نمبر شائع کر رہے ہو۔ میری دُعا ہے کہ ہم اُس نمبر سے اُس کے وہ گھونٹ حاصل کر سکیں۔ جس کے لئے مہندر ناتھ کی سوچ ہمیشہ ترستی رہی، میں معذرت چاہتا ہوں کہ مہندر ناتھ سے میری عقیدت نے مجھ سے وہ شاید تلخ باتیں اگلوا دیں جن پر کچھ بلند پایہ ادیب تنہائی میں ناک سکوڑ لیں اور کہیں، مہندر ناتھ اتنا عظیم ادیب ہوتا۔ تو کیا ہم اُسے سر پر نہ چڑھا لیتے۔

ہاں، اس اعتبار سے، مہندر ناتھ پر لکھنے کے لئے میں دنیا کا سب سے غیر موزوں انسان ہوں۔

مہندر ناتھ

چائے کی پیالی

کامنی میری بیوی ہے۔ اُس کے ساتھ رہتے ہوئے مجھے تقریباً بارہ سال ہو گئے ہیں، اور آپ یہ پڑھ کر حیران ہوں گے کہ ان بارہ برسوں میں میری اور کامنی کی آپس میں کبھی لڑائی نہیں ہوئی۔ گو یہ عرصہ اتنا لمبا ہے کہ لڑائی تو ہونی چاہیے تھی۔ اگر اس عرصے میں طلاق کی نوبت آ جاتی تو بھی اچنبھے کی بات نہ تھی۔ لیکن میری بیوی کی بات اور ہے اس قسم کی بیویاں ذرا مشکل سے ملتی ہیں۔ کامنی سے میری ملاقات آج سے بارہ برس پہلے ایک خوبصورت دوپہر کو ہوئی تھی۔ ایک ایسی دوپہر، جب سورج ٹھیک سر پر تھا۔ اور اس نے ہم دونوں کو اتنا قریب کر دیا کہ آخر میں ہم دونوں کو ہمیشہ کے لئے ایک ہونا پڑا۔

اگر آپ میری بیوی کو دیکھیں گے تو آپ اسے قبول صورت ضرور کہیں گے۔ جب میں نے اُسے دیکھا تھا تو وہ مجھے بے حد حسین اور خوبصورت نظر آئی تھی۔ میں نے سوچا کہ ایسی لڑکی دنیا کے کسی کونے میں نظر نہیں آئے گی۔ اس کی نیلی نیلی آنکھیں، جو اب پیلی پیلی ہو گئی ہیں لیکن اب بھی مجھے نیلی ہی نظر آتی ہیں، اُس وقت بڑی پُرکشش اور دل آویز دکھائی دیں اور جب میں نے اسے سر سے لے کر پاؤں تک دیکھا تو ایسا محسوس ہوا جیسے سر سے لے کر پاؤں تک قیامت دیکھ لی۔ میرے سارے بدن میں ایک کپکپی دوڑ گئی تھی۔ ایسا سُندر اور سڈول جسم میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ آپ میرے ان لفظوں کو ناپسند کریں، جو میں نے اپنی بیوی کے بارے میں استعمال کئے ہیں۔ اور مجھے اپنی بیوی کے بارے میں استعمال نہیں کرنے چاہئیں، لیکن میں آپ سے عرض یہ کر دوں کہ میری بیوی میری محبوبہ بھی ہے۔ اور محبوبہ کے بارے میں اس قسم کے جملے لکھنا کوئی بے ادبی نہیں ہے۔

جہاں تک میری بیوی کی سیرت کا تعلق ہے وہ بے مثال ہے۔ صورت اور سیرت کی وجہ سے میں اس کے اتنا قریب آ گیا کہ پھر پیچھے نہ ہٹ سکا۔

جب ہم پہلی بار اس چلچلاتی دھوپ میں ملے تو نہ جانے کامنی نے اس طرح میری طرف دیکھا جیسے وہ مجھے سب کچھ سونپنے کے لئے تیار ہے۔ بغیر کسی جھجک کے اتنا بھروسہ کسی انسان پر نہیں کرنا چاہئے ——— خاص کر پہلی ملاقات میں۔ لیکن یہی ادا مجھے پسند آئی اس ادا نے مجھے ہمیشہ کے لئے اس کا گرویدہ بنا لیا۔ شاید اسی کو محبت کہتے ہیں۔ کامنی کو جتنی محبت مجھ سے تھی یا ہے یا جتنی محبت مجھے اُس سے ہے یا ہونی چاہئے، اس کا ذکر بے کار ہے۔ لیکن ایک بات صاف ظاہر ہے کہ اس محبت کا انجام بہت خوشگوار ہوا یعنی کچھ عرصے کے بعد ہم دونوں اکٹھے اکٹھے رہنے لگے، اور ہم دونوں نے ایک دوسرے کو خاوند بیوی تسلیم کر لیا۔

اس میں کوئی شبہ کی بات نہیں کہ سب سے پہلے مجھے اس کی صورت پسند آئی اور پھر سیرت ——— اور دس سال گزرنے کے بعد مجھے یہ احساس ہوا کہ میری بیوی کی صورت اور سیرت تو گوارا تھی، دراصل پس پردہ جنسی بھوک کارفرما تھی۔ جس نے مجھے اس کی سیرت

اور صورت دونوں کا عاشق بنا دیا تھا۔

ہیں شروع ہی سے خود سر واقع ہوا ہوں، جو جی میں آتا ہے کرتا ہوں، مَیں نہیں چاہتا کہ کوئی آدمی میرے معاملات میں دخل دے، لیکن دوسروں کے معاملات میں ضرور دخل دیتا ہوں۔ میں کسی کی نصیحت سننا نہیں چاہتا، لیکن دوسروں کو نصیحت ضرور کرتا ہوں دراصل یہ بات اتنی اہم تھی کہ مجھے اپنے والدین سے مشورہ کر لینا چاہیئے تھا اور اگر صلاح نہ لے سکا تھا تو کم سے کم خبر تو ضرور کرنی چاہیئے اور اگر میں اپنے ماتا پتا سے صلاح نہ لے سکا تو کم سے کم اپنے بڑے بھائی سے مشورہ کرنا چاہیئے تھا یا اُن بزرگوں سے بات کرنی ضروری تھی جن کے کندھوں پر دھرم اور اخلاق کا بوجھ ہمیشہ پڑا رہتا ہے اور جو نوجوانوں کو نصیحت کرنے کے لئے ہمیشہ بیتاب نظر آتے ہیں تاکہ اِن کا یہ اخلاقی بوجھ کسی طرح کم ہو سکے۔ لیکن میں نے کسی کی پروا نہ کی۔

میں نے سوچا کہ کامنی سے میں محبت کرتا ہوں اور کامنی مجھ سے محبت کرتی ہے۔ اب بھلا کسی کو بتانے کی کیا ضرورت ہے؟ بے چاری کامنی اتنی بھلی مانس کہ میرے والدین کے بارے میں کچھ نہ پوچھا۔ میں نے سوچا کہ میری بیوی اگر اتنی ترقی پسند ہے تو مجھے رجعت پسند بننے کی کوئی ضرورت نہیں (بعد میں معلوم ہوا کہ کامنی کے ماتا پتا ایک زمانہ ہوا مر کھپ گئے تھے اور بے چاری اس دنیا میں بالکل اکیلی اور شاید تنہا تھی۔ شاید اسی لئے اس نے میرے والدین کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا تھا) بہرحال ہم دونوں کو ایک دوسرے پر اتنا بھروسہ تھا کہ ہم کسی تیسرے کو بیچ میں لانے کے لئے تیار نہ تھے۔

جب ہم دونوں اکٹھے رہنے لگے تو اس اکٹھے رہنے کو ہم نے شادی کا نام دے دیا ــــ جی ـ شادی اور کس بلا کا نام ہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ ہم دونوں کسی پنڈت کے پاس نہیں گئے اور نہ ہی ہم نے سول میرج کی۔ مَیں نے سوچا، دو دلوں کا میل ہے اور ہم ایک دوسرے پر بھروسہ کرتے ہیں، اس سے زیادہ اور کیا چاہیئے؟

اِس دوران میں کامنی نے کبھی اس قسم کی خواہش ظاہر نہ کی جس سے کہ مجھے یہ معلوم ہو جاتا کہ وہ قانونی طور پر شادی کرنا چاہتی ہے ــــ ہو سکتا ہے کہ اس نے اپنے دل میں کبھی سوچا ہو۔ لیکن اُس نے مجھ سے کبھی نہیں کہا نہ ہی اس نے اس بارے میں کبھی شکایت کی مَیں اپنی بیوی سے بے حد خوش ہوں۔ گو قانونی نکتہ نگاہ سے وہ میری بیوی نہیں ہے بلکہ میری محبوبہ ہے یا آپ اُسے میری داشتہ کہہ سکتے ہیں۔ سب سے اچھی بات اس میں یہ ہے کہ جس کی وجہ سے میں اس کا پرستار ہوں کہ وہ ہر صبح چائے کی ایک گرم گرم پیالی مجھے بنا کر دیتی ہے۔ جب مَیں آنکھیں کھولنے کی کوشش کرتا ہوں اور پلنگ پر لیٹ کر اور کبھی بیٹھ کر، اس چائے کو آہستہ آہستہ پیتا ہوں تو دنیا کی باقی تمام لطافتیں بھول جاتا ہوں۔ صرف چائے کا مزا میری زبان پر رہ جاتا ہے۔

تقریباً بارہ برسوں سے ہر صبح کامنی چائے بنا کر مجھے دیتی ہے۔ ہر صبح آسمان نیلا ہو یا آسمان پر نیلے بھورے بادل چھائے ہوں۔ بارش برس رہی ہو یا کسی طوفان کی آمد ہو وہ صبح اٹھتے ہی اسٹوو سلگا کر، چائے بنا کر پیالی میرے ہاتھوں میں دے کر پھر سو جائے گی۔

ان بارہ برسوں میں کئی انقلاب آئے۔ ہندوستان کا بٹوارہ ہوا، اور ہمارے تین بچے بھی ہو گئے۔ بڑے پیارے اور خوب صورت بچے ہیں۔ مجھے اپنے بچوں پر بڑا ناز ہے۔ میرے بچوں کو مجھ پر فخر ہے یا نہیں، اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بڑے خوبصورت بچے ہیں میرے، آپ کی کیا رائے ہوگی، اگر آپ انھیں دیکھ لیں، اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔

کامنی اتنی پڑھی لکھی بھی نہیں ــ لیکن اتنی ان پڑھ بھی نہیں کہ آپ کی باتیں نہ سمجھ سکے۔

یہ اور بات ہے کہ کسی وجہ سے وہ آپ کی باتوں کا جواب نہ دے۔ ہماری ازدواجی زندگی مزے سے گزر رہی تھی۔ دراصل ایک عام انسان کو اور کیا چاہیے؟ ایک اچھی بیوی، تین بچے، تین کمروں کا فلیٹ، کماؤ خاوند، ہر ماہ ایک پکچر دیکھ لینا۔ میاں بیوی کا آپس میں خوش و خرم رہنا۔ بس یہی کچھ زندگی ہوتی ہے، اور کیا چاہیے؟

جھگڑا ہم دونوں کا آپس میں کبھی نہیں ہوا۔ لیکن ایک دو سال کے بعد جب کبھی میری اماں ادھر آتیں تو گھر میں ذرا بدمزگی سی پیدا ہو جاتی۔ میری اماں ذرا پرانے خیالات کی ہیں۔ شروع میں پروٹسٹ کے طور پر دو تین سال وہ میرے فلیٹ میں نہیں آئیں۔ پھر وہ غصے کو پی گئیں۔ ماں کی ممتا بیٹے کی خودسری پر غالب آ گئی اور وہ میرے گھر بہو کو دیکھنے چلی آئیں۔ لیکن انھوں نے اس بہو کو اپنی اصلی بہو کبھی نہیں مانا۔ اور وہ اکثر اس بات کا چرچا کرتیں۔

اس بار کہنے لگیں۔ "بیٹا اب بھی سمے ہے شادی کر لو۔"

"ماں تم بھی کیسی عجیب باتیں کرتی ہو؟ ہم دونوں کو اکٹھے رہتے ہوئے بارہ برس ہو گئے ہیں۔ تین بچے ہیں جنھیں ہر روز تم دیکھتی ہو ـــ اور پھر کہتی ہو کہ شادی کر لو۔ ....."

"ارے، یہ کوئی شادی ہوتی ہے؟ نہ برات آئی، نہ پنڈت بلایا، نہ باجے بجے، نہ پھیرے پڑے۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ اسے شادی نہیں کہتے۔ ابھی سمے ہے شادی کر لو۔ تین بچوں کے باپ ہو۔"

میں کامنی کی طرف دیکھتا، وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا دیتی اور میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا کتنی سمجھ دار تھی میری کامنی کتنا بھروسہ تھا اسے مجھ پر، کبھی کبھار میری ماں کامنی کی طرف داری کرتی اور کہتی:

"اگر تم نے کامنی کو چھوڑ دیا تو بیچاری کہاں جائے گی؟ اس کا خرچا پانی کون دے گا؟ کورٹ میں جا کر دعویٰ نہیں کر سکتی، اس کے پاس کیا ثبوت ہے کہ واقعی تم نے اس سے شادی کی ہے؟"

"ماں ہم دونوں ایک مکان میں رہتے ہیں، ایک ہی چھت تلے زندگی کے بارہ برس گزار دیئے ہیں۔ پرماتما کی کرپا سے تین بچے ہیں۔ اور کیا ثبوت چاہیئے؟"

"بچے تو کسی داشتہ کے بھی ہو سکتے ہیں۔" وہ جھنجھلا کر کہتیں۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ کیا میں اس طرح کا آدمی ہوں؟ کیا میں اتنا گر سکتا ہوں کہ کامنی کو چھوڑ دوں گا۔"

"گرے ہوئے نہیں ہو، لیکن گر سکتے ہو" وہ بحث کو آگے بڑھاتیں۔

ایسے موقعوں پر کامنی بیچ میں ٹوک دیتی ـــ ماں جی! مجھے ان پر بھروسہ ہے۔"

"اری مرد کی ذات پر اتنا بھروسہ نہیں کرنا چاہیے ـــ تم دونوں شادی کر لو۔ دیکھو تو کتنا مزا آئے گا؟" وہ کامنی کو بھی میری طرف دیکھ کر اس عمر میں لالچ دیتیں۔

اس طرح چھوٹی موٹی لڑائیاں اکثر ہوتی رہتیں۔ ذرا کچھ دنوں تک بدمزگی سی رہتی۔ اور جب اماں گھر واپس چلی جاتیں تو ہم ان باتوں کو بھول جاتے، دراصل یہ بات چند قریبی رشتہ داروں کو ہی معلوم تھی اور بہت کم لوگوں نے میری اس خودسری کو سراہا تھا۔ میں نے بیاہ شادی کی تمام رسومات کے پرخچے اڑا دیئے تھے اور انسان کی شرافت پر زیادہ بھروسہ کیا تھا۔ اگر میری بیوی سمجھ دار نہ ہوتی تو اچھا خاصہ خون خرابہ ہو جاتا۔ شامت اعمال سے ان ہی دنوں میرے چچا زاد بھائی اسی شہر میں وارد ہوئے۔ بد قسمتی سے وہ وکالت کرتے تھے جب اس نئے شہر میں ان کی وکالت کہیں اور نہ چلی تو وہ گھر میں میری بیوی کی وکالت کرنے لگے۔ ہم دونوں

ایک ہی اسکول، ایک کالج اور ایک ہی ہوسٹل میں اکٹھے رہتے تھے، بھلا میں انھیں کیا کہتا، اگر میں کچھ کہتا بھی تو کیا وہ میری بات سنتے۔

ایک دن وہ کامنی سے کہنے لگے :۔

"اگر تمہارا پتی اس دنیا سے اچانک چل بسے تو قانونی طور پر تم اپنے خاوند کی جائداد کی مالکن نہیں بن سکتیں، اور نہ ہی تمہارے بچے قانونی طور پر اپنے باپ کی جائداد کے وارث بن سکتے ہیں۔"

میں نے یہ بات سن لی اور فوراً بولا :۔ "ارے بھئی کوئی جائداد ہو تو اس کا کوئی وارث بنے گا۔"

"اچھا نہ سہی جائداد۔ ان تین کمروں میں جو سامان رکھا ہے اس کا وارث کون ہوگا؟"

"میری بیوی۔"

"یہ تمہاری بیوی نہیں ہے۔"

"تو کس کی ہے؟" میں نے جل کر کہا۔

"میں قانونی نقطۂ نگاہ سے کہہ رہا ہوں، پیارے۔"

"تمہارے قانون سے کیا ہوتا ہے، کیا تمہاری وکالت کہیں اور نہیں چلتی؟ دنیا بھر کے قانون یہیں چھانٹتے پھرتے ہو۔" میں نے غصے میں آکر کہا

"کسی اور وکیل سے پوچھ لو، اگر مجھ پر یقین نہ ہو۔"

"میں مرنے سے پہلے وصیت کر جاؤں گا۔"

"اگر اچانک ہارٹ فیل ہوگیا؟ — جیسا کہ آج کل لوگوں کا ہو رہا ہے، تو؟"

"تو پھر کیا ہوا؟ یہ سب کچھ ان ہی کا ہے۔" میں نے کامنی کو یقین دلایا۔

"تمہارے آفس کے فنڈ کا کیا ہوگا؟" انھوں نے نیا سوال کھڑا کر دیا۔

"وہ میری بیوی کو ملے گا۔"

"کیسے ملے گا؟"

"آفس والوں کو کیا معلوم کہ میں نے قانونی طور پر کامنی سے شادی نہیں کی ہے۔"

"اگر معلوم ہو جائے تو ——— ؟" انھوں نے "تو" کو اس طرح کھینچا جیسے جیتنے کے ہاتھ میں کھلاڑی زور سے ترپ کا پتہ پھینکتا ہوا"

"میں جاکر خبر کردوں، یا تمہارا بھائی۔"

"میں تم سے اس بات کی امید نہیں کرتا — اور میرے بھائی اتنے اوچھے نہیں ہیں۔"

"اگر ہو جائیں گے تو ان کا کیا کر لو گے —؟ تم اپنے بچوں کا مستقبل تباہ کرنا چاہتے ہو؟"

"فی الحال میرے بچوں کا کوئی مستقبل نہیں ہے، ویسے میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ ہر بچہ خود اپنا مستقبل بناتا ہے"

"کمیونزم کا پرچار مت کرو، ٹھنڈے دل سے اس بات پر غور کرو۔ اور سوچو!"

یہ صاحب تو لڑ جھگڑ کر چلے جاتے، لیکن فضا میں زہر گھول جاتے اور اس کا اثر اب اڑوس پڑوس میں پھیلنے لگا۔ اس واقعہ کے بعد میری بیوی نے اپنی سہیلی کملا سے یہ بات کہہ دی۔ یہ سنتے ہی وہ ہکا بکا رہ گئی۔ بے چاری میری بہت عزت کرتی تھی۔

یہ سنتے ہی اس نے کچھ ایسے تیور بدلے کہ وہ مجھے چور اور بدمعاش سمجھنے لگی۔ ایک دن وہ میری بیوی سے بولی:۔

"ہائے رام ـــــ آپ دونوں نے ابھی تک شادی نہیں کی؟ کئی برسوں سے آپ دونوں اکٹھے رہتے ہیں۔ اور پھر آپ دونوں نے بچّے بھی پیدا کر لئے ـــ یہ ـــ یہ تو ـــ حرامی بچّے ہیں۔" آخر اس کے دل میں آئی ہوئی گالی زبان پر آ ہی گئی۔

یہ سن کر کامنی کو بہت غصہ آیا۔ اس نے اپنی سہیلی کو ڈانٹ کر کہا:۔

"خبردار! اگر دوبارہ ایسی بات کہی۔ نہیں تو زبان کھینچ لوں گی۔"

"زبان تم کھینچ لو، لیکن سچی بات کہنے سے نہیں ڈروں گی۔" یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے کی طرف چل دی۔

یہ بات محلّے میں ایسی پھیلی کہ لوگوں نے نگاہیں پھیر لیں۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ رام اور سیتا اجودھیا نگری میں بارہ برس کے بعد لوٹے ہیں، دھوبیوں کو سیتا پر بھروسہ نہ رہا تھا۔ راون کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے، جیسے ہم دونوں نے ایک بہت بڑا گناہ کیا تھا۔ چونکہ ہم دونوں کا من صاف تھا، ہم نے لوگوں کی کانا پھوسی کی پرواہ نہ کی۔ بدقسمتی سے انہی دنوں میرے ماتا پتا تشریف لے آئے، اور پھر محلّے کے دھوبیوں کی ایک سمٹ کانفرنس ہوئی کہ میں لاجواب سا ہو گیا۔ سب نے بچوں کے مستقبل کے بارے میں ایسی خطرناک باتیں کہیں کہ مجھے اُن کی ہاں میں ہاں ملانا پڑی۔ لیکن اس دوران میں کامنی نے اس خیال کی پُرزور تائید نہ کی۔ میں جانتا تھا کہ کامنی کو مجھ پر بھروسہ ہے۔

اب بات خطرناک حد تک بڑھ چکی تھی والدین نے زور دے کر مجھے اس بات پر راضی کر لیا کہ قانونی طور پر اب شادی کر لینی چاہیے۔ یعنی ایک پنڈت کے سامنے!

یہ کچھ عجیب سی بات لگ رہی تھی کہ میں اپنی بیوی کے ساتھ شادی کروں۔ اور وہ بھی بارہ برس کے بعد ـــ اور جب کہ ہم تین بچوں کے ماں باپ بن چکے ہوں۔

میری ماں کہنے لگی "میں بینڈ بجواؤں گی، لڈو بانٹوں گی، سارے محلے کی عورتیں بلوا کر گیت گواؤں گی۔"

"یہ بکواس نہیں ہوگی ماں۔"

اور یہ تیری بکواس چلے گی؟ رہنے دے اپنے گھر کے قانون۔ تمہارا کیا ہے جب جی میں آئے گا بے چاری کو چھوڑ دو گے۔ میں اس طرح نہیں ہونے دوں گی۔"

خیر بڑی مشکل سے میں شادی پر راضی ہوا۔ شادی ہوگی، لیکن بینڈ نہیں بجے گا، لڈّو نہیں بانٹے جائیں گے۔ صرف پانچ چھ قریبی رشتہ داروں کو بلایا جائے گا۔ پنڈت آئے گا اور میری ماں میری بیوی کو دلہن بنا کر گھر لائے گی۔ پھر میں اپنی دلہن کا چہرہ دیکھوں گا۔

اس لڑائی جھگڑے میں کامنی کچھ نہ بولی۔ شادی کا دن آ گیا۔ ایک ہال میں منڈپ بھی بن گیا۔ سات آٹھ براتیوں کے سامنے کامنی دلہن بن کر آئی۔ اُس دن کامنی مجھے بہت اچھی لگی۔ وہ لال رنگ کی ساڑی پہنی ہوئی تھی، بانہوں میں لال رنگ کی چوڑیاں، جو میری ماں خرید کر لائی تھی۔ آنکھوں میں حیا کے ڈورے، کچھ شرمائی ہوئی، لجائی ہوئی، سر کو ڈھانپتی ہوئی، بدن چُراتی ہوئی، ماتھے پر بندیا۔ کچھ نئے گہنوں سے لدی ہوئی۔ وہ میرے پاس بیٹھ گئی۔ جی میں آیا کہ زور سے ایک قہقہہ لگاؤں، لیکن چپ ہو گیا۔ کامنی کا چہرہ دمک اٹھا تھا۔ اس کے رخسار حیا سے تمتما اٹھے تھے۔ اتنی کمسن اور معصوم وہ مجھے کبھی نہ لگی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ابھی کنواری ہے اور مجھ سے تین بچے پیدا کرنے ہوں گے۔

پھر باقاعدہ شادی ہو گئی۔ پنڈت کے سامنے میری ماں میری بیوی کو بہو بنا کر لائی۔ محلّے کی عورتیں بھی آئیں۔ اچھا خاصہ

ہنگامہ ہوگیا۔ دوسرے دن میرے ماتا پتا چلے گئے۔

شادی کے تیسرے دن کی بات ہے۔ صبح کا وقت تھا۔ میری آنکھ ابھی تک کھلی نہ تھی۔ ادھ کچی نیند تھی اور چائے کی پیالی کا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے آنکھیں ملتے ہوئے اپنی دلہن بیوی کی طرف دیکھا، وہ بڑے مزے سے سو رہی تھی۔ میں نے باورچی خانے کی طرف نگاہ ڈالی۔ اسٹو و ٹھنڈا پڑا تھا۔ میں اپنی چارپائی سے اُٹھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ بارہ برسوں میں پہلی بار سوئی ہو۔ اتنی پرسکون نیند شاید اسے کبھی نہ آئی تھی۔ خاوند کے حق کو آزمانے کی خاطر میں نے نئی نویلی دلہن کی چادر کھینچ کر کہا۔ "اے اٹھو تو ــــ چائے بنا کر لاؤ۔ کیا تماشہ ہے؟ ابھی تک سو رہی ہو؟"

کامنی نے چادر کو اپنے جسم پر تانتے ہوئے کہا۔ "جی ہاں بارہ برس سے ہر صبح آپ کے لئے چائے بناتی رہی ہوں بارہ برس تک میں آپ کی محبوبہ رہی۔ آج سے میں آپ کی بیوی ہوں، ذرا چائے بنا کر مجھے پلاؤ ــ"

یہ کہہ کر وہ بڑے مزے سے کروٹ بدل کر چادر سے اپنے جسم کو ڈھک کر سو گئی۔ میں سفید چادر کی طرف تکتا رہ گیا۔

دنیا میں گناہ اور ثواب، نیکی اور بدی، اچھائی اور برائی انسان کے بنائے ہوئے اصول ہیں۔ یا قدریں ہیں۔ یا قوانین ہیں۔ انہیں قدروں پر ہم انسانوں کو تولتے ہیں۔ اور جو کام بھی اچھا نہیں لگتا اسے گناہ کہتے ہیں یا اُسے بُرا کہتے ہیں۔ اور جس کام کو ہم پسند کرتے ہیں۔ اُسے اچھا کہتے ہیں۔ نیکی اور بدی کا چکّر محض اضافی ہے اور اضافت محض خباثت ہے۔

ــــ مہندر ناتھ

مہندر ناتھ

دو بیل

رات آخری ہچکیاں لے رہی تھی، اور دور مشرق میں اُفقی لکیر پہ روشنی جاگ رہی تھی۔ جوں جوں وقت گزرتا جاتا تھا۔ کرۂ ارض پر سورج کی ہلکی سفید روشنی چھائی جاتی تھی۔ بوڑھے احمد نے کھڑکی کھولی اور جھانک کر سامنے نگاہ دوڑائی، پورے بیس دن کے بعد اُس نے اس کھلے میدان کو دیکھا تھا، وہ اپنی زندگی میں بہت کم بیمار ہوا تھا، غریبی میں بیماری آجائے تو سمجھو کہ غریب موت کی نذر ہوا۔ جو آدمی دن بھر کام کرے صبح سے لے کر شام تک سڑک پہ پتھر کوٹتا رہے، یا دن بھر کسی فیکٹری میں گذارے، یا گندی نالیوں کو صاف کرے، بھلا وہ بیمار ہو جائے تو اس کی تیمارداری کون کرے۔ اور تیمارداری کے لئے روپیہ چاہیئے۔ اور روپے کے لئے محنت۔ بیماری میں محنت کب ہو سکتی ہے۔

بوڑھے احمد نے اٹھنا چاہا، لیکن ٹانگیں لڑکھڑا گئیں، بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی، اور کانوں میں سائیں سائیں کی سی آوازیں آنے لگیں۔ کھانسی زکام اور تیز بخار نے اُس کا تمام خون چوس لیا تھا، اور اب وہ اُس گنّے کی طرح سوکھا اور سکڑا ہوا معلوم ہوتا تھا جس کا رس نچوڑ لیا گیا ہو، بدن ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ اور چہرے پر سیاہی مائل رنگت چھا گئی تھی، گو آج بخار اور زکام سے آرام تھا۔ لیکن کھانسی بدستور تھی۔ یہ سالی کھانسی نہیں چھوڑتی، کسی دن جان لے کر رہے گی، اور کھانستے کھانستے اُس کی چھاتی دُکھنے لگتی۔ آنکھیں انگارے کی طرح لال ہو جاتیں، اور چہرے پر زردی چھا جاتی، لیکن آج بوڑھے احمد کو کچھ افاقہ تھا۔ کھڑکی سے مڑ کر اُس نے کمرے پر نگاہ ڈالی، کمرے کی حالت دیکھ کر اُسے بہت کوفت ہوئی، ہر طرف پھٹے پرانے کپڑے، ٹوٹے ہوئے برتن، پھٹی ہوئی دریاں، گندے لحاف اور ہر طرف اُس کی بلغم کے نشان، کمرے کی دیوار پر، زمین پر، کپڑوں، برتنوں پر، وہ کیا کرتا رہا ہے۔ سوائے تھوکنے کے اُسے کوئی کام نہ تھا۔ اُس نے باہر کھڑکی سے جھانک کر دیکھا، آسمان کتنا صاف اور نیلا تھا، دور مشرق کی طرف سفید براق بادل ہوا میں تیر رہے تھے، ہوا کتنی خوشگوار اور بھلی معلوم ہوتی تھی، گو وہ اس ہوا سے بچنا چاہتا تھا، کیوں کہ ہوا ٹھنڈی تھی، اس لئے اسے اندیشہ لاحق تھا کہ کہیں بیماری کا دوبارہ حملہ نہ ہو جائے یہ موذی نمونیہ کمرے کی اس غلاظت اور گھٹے ہوئے ماحول کو دیکھ کر بڈھے گا احمد کو اپنے افلاس کا تلخ احساس ہوا، اُسے معلوم ہوا کہ آج اُس کا دیوالہ نکل گیا ہے، اور شاید یہ ٹھیک بات تھی۔ اس بیماری میں اس کا تمام اثاثہ لگ گیا۔ پہلے اُس کا اثاثہ تھا ہی کتنا صرف چند روپے یا بانو کے گہنے، بانو نے ۱۳ دفعہ اپنی چاندی کے گہنوں کو بھی بیچ دیا تھا، بچاری بانو! اگر بانو نہ ہوتی تو وہ کب کا قبر میں ہوتا، بچاری نے کتنی تن دہی سے اس کی تیمارداری کی تھی، دن رات ایک کر دیا تھا، کئی راتیں جاگ کر کاٹیں

دوا دارو خود لاتی رہی، اس رات کو وہ کب بھول سکتا ہے۔ جب اس کے سینے میں زبردست درد اٹھا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے پھیپھڑوں میں ایک خنجر چبھو دیا گیا ہے، رات کے اندھیرے میں اُس نے اپنے آپ کو قابو میں لانا چاہا، لیکن درد بڑھتا گیا، آخر وہ چلانے لگا، اور بیچاری بانو خدا اس کی عمر دراز کرے وہ غریب رات کے دو بجے جاکر دوا لائی، اور اُسے دوا پلائی۔ تب جاکر کہیں آرام ہوا، کتنا ایثار ہے، کتنی بے لوث محبت ہے، بیچاری بانو اُس افلاس نے اُسے کتنا نحیف کر دیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غربت کے بے رحم غار نے اُس کے جسم کی تمام خوبیوں کو فنا کر دیا ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے پچیس سال پہلے کی تصویر کھنچ گئی ——— جب بانو پہلی بار اُس کے گھر میں دلہن بن کر آئی تھی، وہ لال رنگ کا لہنگا پہنے ہوئے تھی، اور پیازی رنگ کی انگیا، اور یہ لمبا گھونگھٹ جس میں اس کی شوخ نگاہیں اُسے جھانک رہی تھیں۔ اُس کے آنے سے گھر میں پیسے کی ریل پیل ہو گئی تھی، بھلا گھر میں لکشمی آئے اور دولت منہ نہ چومے۔ اتنا کام کرنے کو ملتا تھا۔ کہ اُسے کام سے انکار کرنا پڑتا تھا۔ اور بانو کا بھرا بھرا سا جسم باہوں کا گداز پن اور چہرے کے متناسب خدوخال، گو اُس کا رنگ کالا تھا لیکن وہ کون سا گورا چٹا تھا، اور پھر اس کی آواز میں اتنی مٹھاس تھی، جو اس نے چاوڑی بازار کی طوائفوں میں بھی نہ پائی تھی، اور آج بانو کیا رہ گئی ہے۔ ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ، آنکھوں کی چمک غائب، باہوں کا گداز معدوم، آواز میں کرختگی اور چال میں نقاہت، بوڑھا احمد کچھ سوچ ہی رہا تھا، کہ کسی کے پاؤں کی آہٹ آئی، سامنے دیکھا تو بانو کھڑی تھی، ایثار اور محبت کا مجسمہ حسین اور خوبصورت جوان اور رسیلی، بوڑھے احمد نے اپنے سر کو زور کا جھٹکا دیا، اور آنکھوں کو اپنے ہاتھوں سے ملا، اور پھر بانو کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔

" جانتے ہو آج کھانے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے، بچہ صبح سے رو رہا ہے، اور تم بستر پر سے ....؟

" بانو میرے قریب آؤ "

" کیوں کیا کہتے ہو "

" یہی کہ میں چھکڑا لے کر بازار میں جاؤں گا۔ میں سسک سسک کر مرنا نہیں چاہتا "

بانو نے گردن ایک طرف جھکا لی، اور آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ اور پھر سسکیاں بھر کر رونے لگی۔

" میرے پاس جو کچھ تھا تمہاری بیماری پر لگا دیا۔ حتیٰ کہ اپنے گہنے بیچ ڈالے، اب کیا کروں، کہاں جاؤں، بازار میں گئی تھی کہ کوئی کام مل جائے، لیکن بڑھیا کو دیکھ کر کون دیتا ہے، چھکڑا چلانا تو آتا نہیں، ورنہ خود چلی جاتی ....." اتنا کہہ کر وہ چپ ہو گئی۔

" بانو گھبراؤ مت، جب تک زندہ ہوں، تم بھوکی نہ رہو گی۔ اللہ کی قسم جب تم روتی ہو تو میرا کلیجہ چھلنی ہو جاتا ہے، اور اگر تم زیادہ روئیں تو میں چھکڑا لے کر باہر چلا جاؤں گا "

" لیکن تم جاؤ گے کس طرح، کیا چھکڑا چلا لو گے کیا اتنی طاقت ہے ؟

" آخر کیا کیا جائے بھوک سے مرا تو نہیں جاتا "

اتنا کہہ کر بوڑھا احمد اُٹھ کھڑا ہوا، اُس کی بوڑھی رگوں میں ایک توانائی سی آ گئی۔ گھر میں بھوک سے سسک سسک کر مرنے سے یہ بہتر ہے کہ ان بوڑھے ہاتھوں سے کچھ کام کیا جائے۔ جب وہ گھر سے باہر نکلا تو اُس کی نگاہ اپنے بیل پر پڑی جو میدان میں ننگ دھڑنگ کھڑا تھا۔ وہ اس درخت کی طرح تھا، کہ جس کے سائے تلے ہزاروں سستاتے ہوں لیکن اُسے کوئی فائدہ نہ پہنچاتے ہوں، بیل دو دن سے بھوکا تھا۔ مالک کو دیکھ کر اس نے کان کھڑے کئے، بیل کے نتھنے پھول گئے۔ ٹانگیں ہلنے لگیں، اور دُم کو اپنے کھردرے جسم پر پھیرتے ہوئے اُس نے امید بھری نظروں سے بوڑھے احمد کی طرف دیکھا۔ جیسے کہ وہ کہہ رہا ہو۔ کچھ تو دو۔ دو دن کا بھوکا ہوں۔ لاؤ کیا لائے ہو۔

بوڑھا احمد بیل کے پاس جاکر چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ وہ نہیں سمجھتا تھا کہ وہ اس بے زبان جانور سے کس طرح اپنے دل کا حال کہے احمد نے بیل کی آنکھوں میں نمی کی جھلک دیکھی۔ اس کا دل کانپنے لگا۔ وہ کیا کرے۔ اس بیل نے زندگی بھر مدد دی ہے، یہ بیل کبھی بیمار نہیں ہوا

اور ہمیشہ کام کرتا رہا ہے۔ لیکن یہ بھی دو دن سے بھوکا ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ہیں آنسو ہیں، شاید اس کے ایمان کی دیواریں بھی شکستہ ہو گئی ہیں۔

بوڑھے احمد کو اس بیل سے بہت محبت تھی۔ یہ بیل اُس کا روزی رساں تھا۔ یہ ابھی بچھڑا ہی تھا کہ احمد نے اُسے خرید لیا تھا۔ بوڑھے احمد نے اُسے اپنے ہاتھوں سے کھلایا۔ پلایا۔ پالا پوسا۔ اور بڑا کیا۔ جب تک احمد کی زندگی میں نازبو وارد نہ ہوئی تھی، احمد بیل کو منّو منّو کہہ کر پکارتا تھا اُسے اِس بیل سے محبّت سی ہو گئی تھی، ایک محبوبانہ محبت۔ جس دن احمد پیسے زیادہ کماتا۔ تو وہ منّو کو خوب کھلاتا۔ اُس کے جسم پر مالش کرتا اور اُس سے ہنس کر باتیں کرتا۔ اور جب کبھی رات کی تاریکی میں وہ اکیلا ہوتا، تو منّو کے پاس چلا جاتا، اور گھنٹوں اُس کے پاس بیٹھتا۔ کبھی کبھی منّو اس کے سر کو چاٹنے لگتا تھا۔ جیسے کوئی نرم نرم انگلیوں والی لڑکی اس کے سر کو سہلا رہی ہو۔ لیکن بانو کے آنے سے اُس کی زندگی میں ایک نمایاں تبدیلی پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن اس جانور اور احمد کے درمیان جو محبت کا رشتہ پیدا ہو گیا تھا، وہ ٹوٹنے کا نہ تھا، گو وہ منّو کو اب اس شدت سے پیار نہ کر سکتا تھا کیونکہ بانو کی رسیلی باتیں منّو کی ابدی خاموشی سے کئی درجے بہتر تھیں۔ وہ یہی باتیں سوچ رہا تھا، کہ بیل نے پیر مارنے شروع کئے۔ شاید وہ کہہ رہا تھا۔ " بوڑھے میاں ماضی کے اوراق کیوں پلٹتے ہو، جانے دو۔ مجھے بھوک لگی ہے۔ تم کس سوچ میں ہو۔"

احمد نے بیل کو چھکڑے میں جوتا۔ اور بیل چھکڑے کو آہستہ آہستہ کھینچنے لگا۔ نہ بوڑھے احمد میں اتنی ہمت تھی، کہ بیل کو تیز کر دیتا۔ اور اور نہ بیل میں اتنی سکت تھی کہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا۔ سورج نصف النہار پر آ چکا تھا، گو سردیوں کے دن تھے، لیکن کافی گرمی ہو گئی تھی۔ بوڑھے احمد کے کھوکھلے جسم میں یہ دوپہر کی کڑکتی دھوپ بجلی کی مانند سرائت کرنے لگی۔ اُس کے تمام جسم پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ شاید یہ دھوپ کا اثر تھا۔ وہ منٹو روڈ سے ہوتا ہوا اسٹیشن کی طرف بڑھا، پاس سے ایک جوان خوبصورت گھسیارن سُرخ لہنگا پہنے ہوئے گذری چال میں بلا کی شوخی، آنکھوں میں بے پناہ کشش۔ وہ دیر تک گھسیارن کو دیکھتا رہا حتیٰ کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اُس نے سوچا کبھی میری بانو بھی ایسی ہی تھی۔

بوڑھے احمد نے دور سے آنے والے ایک چھکڑے کی طرف نگاہ ڈالی۔ چھکڑا تیز ترکی سے بھرا ہوا تھا سبزی کو دیکھتے ہی بیل کے قدموں کی رفتار تیز ہو گئی۔

بوڑھے احمد نے بیل کو پچکارتے ہوئے کہا۔ " یہ سبزی تمہارے لئے نہیں، یہ سبزی انسانوں کے لئے ہے۔"

متواتر چار گھنٹے تک بوڑھا بیل کو ہانکتا ہوا اِدھر اُدھر کام کے لئے گھومتا رہا، دھوپ میں چلنے پھرنے سے اُس کا بوڑھا دماغ چکرا گیا تھا۔ اس بیماری نے پھیپھڑوں کو کیا دماغ تک کو کمزور کر دیا تھا۔ صبح سے اُس نے کچھ کھایا نہیں تھا۔ بیماری کی کمزوری اور نقاہت کیا کم تھی، کہ بھوک اور فاقے نے اسے نڈھال کر دیا۔ اب شام ہونے کو تھی۔ ہوا میں خنکی سی آ گئی تھی، کبھی کبھی جب ٹھنڈی ہوا اُس کے سینے سے ٹکراتی تو اُسے کھانسی کا دورہ پڑ جاتا۔ اور وہ چھکڑے پر ہی کھانسنے لگتا حتیٰ کہ اُس کی آنکھیں باہر نکل آتیں، منہ انگارے کی طرح گرم ہو جاتا۔ اور کنپٹیاں جلنے لگتیں۔ اور بچارا بیل حیران ہو جاتا۔ کہ آج میرے مالک کو کیا ہو گیا ہے۔

جوں جوں شام کی تاریکی بڑھتی جاتی، اُس کے دل کی اُداسی بڑھتی جاتی تھی، بوڑھے احمد کو روشنی اچھی لگتی تھی، یہ اندھیرا، یہ ابدی اندھیرا، زندگی کو تاریک کر دیتا ہے، پھیپھڑوں کو جلا دیتا ہے، ہوا کو غلیظ کر دیتا ہے، محبت کو بے زبان اور جوانی کو بوڑھا کر دیتا ہے، یہ اندھیرا نہیں، موت کی نشانی ہے، اُسے روشنی اچھی لگتی ہے۔ اور وہ روشنی میں کام کر سکتا ہے لیکن آج کام نہیں ملتا، لوگ کہتے ہیں جنگ زوروں پر ہے، روزگار عام ہے، یہاں سے مال باہر جاتا ہے، باہر سے مال یہاں آتا ہے، لیکن پھر بھی کام نہیں ملتا، اور بھئی ٹھنو تو کہتے تھے کہ آجکل چھکڑے والوں کی ریل پیل ہے۔ آدمی کام کرنے والا ہو دن میں بیسیوں روپے کما سکتا ہے۔

شام کی تاریکی رات کی سیاہی میں تبدیل ہو گئی، آسمان پر ستارے چمکنے لگے، سڑکوں پر بجلی کے قمقمے روشن ہو گئے، اور اب بوڑھے احمد نے سوچا کہ اُسے واپس گھر چلنا چاہیئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کاروان راستے میں رہ جائے اور اس میں اتنی طاقت بھی نہ رہ جائے کہ وہ اپنے آخری لمحے اپنے گھر پہ گزار سکے، وہ سوچتا تھا کہ وہ بانو سے کیا کہے گا، اُس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا، کہ وہ کیا کرے۔ اتنی وسیع زمین پر اُسے کام

نہیں ملتا، لوگ بے تحاشہ اِدھر سے اُدھر بھاگے جا رہے ہیں۔ یہ ٹرامیں بسیں، یہ لاریاں کدھر جا رہی ہیں، یہ لوگوں کا ہجوم یہ رنگ رلیاں یہ سبز ساڑھیاں، یہ موٹریں، یہ تانگے، یہ گھوڑے پالکیاں، یہ پھل پھولوں کی دوکانیں، یہ سبزیوں کے چھکڑے یہ آٹے کی بوریاں۔ گندم کے گودام۔ گھی کے پیپے کہاں جاتے ہیں۔ یہ کہاں صرف ہوتے ہیں، وہ کیوں بھوکا ہے۔ اس کا بیل کیوں بھوکا ہے۔ اُس نے اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔ ستارے مسکرا رہے تھے۔ اُسے نہایت غصّہ آیا۔ اُس کا جی چاہتا تھا کہ اُس کے پاس اتنی لمبی مشعل ہو کہ وہ ان مسکراتے ہوئے تاروں کا منہ جھلس دے۔ صدیوں سے غریب کی غربت پر مسکرائے جا رہے ہیں بے شرم۔ ڈھیٹ۔ بے حیا۔

یکایک فضا کو چیرتی ہوئی ایک آواز آئی: "او چھکڑے والے"۔

بوڑھے احمد نے مُڑ کر ایک موٹی توند والے انسان کو دیکھا۔

"کام کرو گے"؟

"کیوں نہیں حجور"۔

"دس من سامان ہے۔ کیا لو گے"؟

"دس آنے حجور"۔

"پانچ آنے ملیں گے" موٹی توند والا آگے بڑھ گیا۔

"ٹھہریئے بابو صاحب، مجھے پانچ آنے منظور ہیں"۔

"اچھا تو اسٹیشن پر جاؤ۔ گودام میں دس بوریاں ہوں گی۔ یہ لو فارم اسے سنبھالو۔ یہ کاغذ دے کر بوریاں لے آنا۔ سیدھے چاندنی چوک رام رکھا مل کی دوکان پر پہنچنا"۔

بوڑھا احمد یہ کام پا کر خوش ہوا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اُسے قارون کا خزانہ مل گیا ہے۔ بجھتے ہوئے دیئے میں ایک بوند تیل کی بھی دیئے کی روشنی کو بڑھا دیتی ہے۔ اور بوڑھا احمد اپنی زندگی کو بڑھانا چاہتا تھا۔ یہ پانچ آنے نہیں پانچ روپے ہیں۔ آج خدا نے اُس کی دُعا سُن لی ہے۔ وہ چھ پیسے سے بیل کے لئے گھاس خریدے گا۔ دو پیسے کا بچے کے لئے دودھ۔ دو آنے کے چنے اور ایک آنے کا گڑ۔ لو آج کا کھانا تیار ہو گیا۔ لیکن یہ لوگ کھانا بھی چھیننا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ غریب ہوا میں رہے۔ ہوا کھائے اور ہوا پہنے۔ بوڑھے احمد نے بیل کی رسّی کھینچی اور بیل دوڑنے لگا۔ شاید بیل سمجھ گیا تھا۔ کہ اُس کی آخری دوڑ ہے۔ اگر آج اس میں رہ گیا تو کہیں کا نہ رہے گا۔ وہ موڑ گزر کر داہنے ہاتھ کی طرف بڑھ گیا۔ یہاں سڑک پر روشنی کم تھی، اور دو درختوں کی پھیلی ہوئی ٹہنیوں نے سڑک کو اور بھی تاریک کر دیا تھا۔ سڑک پر سنّاٹا تھا۔ یا کبھی کبھی دور سے لاری کے ہارن کی آواز آتی تھی، ہوا سرد اور بھاری ہو چلی تھی، سامنے کی طرف دھوئیں کا غبار تھا۔ جو آنکھوں کو چندھیائے دیتا تھا۔ بوڑھا احمد سردی کی وجہ سے سکڑ کر بیٹھا ہوا تھا۔ ٹانگوں کو اکٹھا کئے وہ سر کو ٹانگوں سے ملائے ہوئے ایک عجیب انداز میں بیٹھا ہوا تھا، کہ کسی کی آواز آئی: "ٹھہرو چھکڑے والے"۔

آواز بھاری تھی اور ہوا میں گونجتی ہوئی آواز میں ایک قسم کا رعب تھا، جو یکلخت بوڑھے کے جسم پر طاری ہو گیا۔ ہاتھ رک گئے اور ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کسی غیبی طاقت نے اُس کے ہاتھ شل کر دیئے ہیں۔ اُس نے بائیں طرف دیکھا۔ تو ایک لحیم شحیم سپاہی کھڑا تھا۔ سپاہی نے عقابی نظروں سے بوڑھے کو تاکا، اور پھر بیل پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی، ایکاایک سپاہی کی نظریں بیل کی ٹانگوں پر جم گئیں اور پھر اس کی آنکھوں میں معنی خیز شرارت ٹپکی۔ اب وہ اس جرنیل کی طرف جس نے ایک عظیم الشان مہم سر کی ہو اسے تے پوٹوں کی ایڑیوں پر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"کیوں بڈھے، تجھے شرم نہیں آتی، کہ اس غریب جانور پر اتنا ظلم ڈھاتا ہے"۔

حجور کیا بات ہے "؟

"حجور کا بچہ" سپاہی نے کڑک کر کہا۔ اُس کی کڑک میں حکومت کی طاقت پنہاں تھی "خود کھا کھا کر موٹا ہوتا جاتا ہے، اور دیکھتا نہیں بیل کی طرف کتنا دُبلا پتلا ہے۔ بے زبان جانور پر تشدّد کرتے ہوئے تجھے شرم نہیں آتی، دیکھ اس کے پاؤں کی طرف خون بہے جا رہا ہے۔ کیا آنکھوں سے اندھا ہے۔ بینائی ختم ہو چکی ہے "۔

"حجور آپ مائی باپ ہیں۔ بھلا دیکھوں تو کہاں سے خون بہہ رہا ہے، صبح تو بھلا چنگا تھا"۔

"دیکھو اس پاؤں کی طرف"۔

سپاہی نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ اور کسی کو نہ پا کر بوڑھے کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔ یہ نگاہیں کچھ مانگ رہی تھیں۔

بوڑھا اس بے زبان کی بات سمجھ گیا۔ لیکن بیچارہ کیا کر سکتا تھا۔ اُس کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ اور اگر ہوتی تو آج اس نقاہت اور کمزوری میں گھر سے باہر کیوں نکلتا۔ اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا "حجور آج کچھ نہیں ہے۔ کل آپ کی مدد کروں گا"۔

سپاہی کی آنکھوں میں سے شرارے نکلنے لگے، اُس کا منہ غصّے سے لال ہو گیا۔ اُس نے بوڑھے کی طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھا اور زمین پر تھوکتے ہوئے کہا "بے زبان جانوروں پر ظلم کرتے ہو۔ جی چاہتا ہے تمہارا بھیجا نکال دوں۔ حرامی، بوڑھا کھوسٹ۔ میں ابھی بتاتا ہوں کہ جانوروں پر ظلم کرنے سے کیا سزا ملتی ہے"۔

سپاہی نے بوڑھے کو چھکڑے سے نیچے اترنے کو کہا، اور بیل کو چھکڑے سے علیحدہ کر کے آگے ہانکنے لگا "رہنے دو۔ چھکڑے کو یہیں رکھو۔ تم لوگ جانوروں پر ظلم کرنے سے باز نہیں آؤ گے۔ جب تک تمھیں پوری سزا نہ ملے"۔

دوسرے دن جب بوڑھا احمد انسدادِ بے رحمی کے محکمے میں گیا تو اسے معلوم ہوا کہ بیل ہسپتال میں معائنے کے لئے بھیجدیا گیا ہے۔ اس لئے اُسے بے رحمی کے ہسپتال میں جانا چاہیئے۔ وہ خود حیران تھا کہ، وہ کیا کرے اگر اُس کا بیل اُس سے چھن گیا، تو وہ کیا کرے گا۔ زندگی کی آخری کرن ہمیشہ کے لئے مفقود ہو جائے گی۔

جب وہ بے رحمی کے ہسپتال میں پہنچا تو اس نے اپنے سامنے ایک گورے چٹے انسان کو دیکھا جو ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کی آنکھوں پر عینک لگی ہوئی تھی؟"

"کیا یہ تمہارا بیل ہے؟"

"جی حجور" بوڑھے نے بیل کی طرف نگاہ ڈالی۔

"ہم نے اس کا معائنہ کیا ہے، اس کے خون میں تپدق کے جراثیم ہیں، تم لوگ بہت بدمعاش ہے، بہت بے رحم ہے، کتنا ظلم کرتا ہے جانور پر۔ یہ جانور تمہیں روٹی دیتا ہے۔ لیکن تم اُسے مارتا ہے۔ اور دن رات بھوکا رکھتا ہے۔ اسے پوری خوراک نہ ملنے کی وجہ سے یہ بیماری ہو گئی ہے"۔

"حجور ایسی بات تو نہیں ہے، میرا بیل بھلا چنگا ہے، اسے کوئی بیماری نہیں ہے، کل تک یہ راضی خوشی تھا، بیمار تو میں ہوں۔ بیس دن سے بیمار ہوں میرے پاس کچھ نہیں ہے، میری بیوی بھوکی ہے، میرے بچے بھوکے ہیں"۔

ڈاکٹر نے غضبناک ہو کر کہا "کیا ہم جھوٹ بولتا ہے۔ بے شرم کہیں کا، چپڑاسی اس بوڑھے کو دھکے دے کر باہر نکال دو۔ اس بیل کو ہسپتال میں پہنچا دو، اور وارڈ میں داخل کر دو، اس کا علاج ہم کریں گے۔

"حجور ہم بھوکے مر جائیں گے۔ میری بیوی میرے بچے"

"سرکار تمہارے بال بچوں کی ذمہ دار نہیں۔ ہم کیا کریں۔ نکل جاؤ۔ چپڑاسی نکال دو اس بوڑھے کو"

اور جب بوڑھا احمد دروازے سے نکلا تو اس نے سوچا کہ کیا اس دنیا میں کوئی ایسا ہسپتال نہیں ہے، جہاں اُن انسانوں

کو داخل کیا جائے جن پر بے رحمی کی جاتی ہے، وہ اب اکیلا تھا، بالکل تنہا۔ اس درخت کی طرح جو صحرا میں اکیلا ہو، اس نے جانا کہ وہ اس پرندے کی طرح ہے جس کے پر ہمیشہ کے لئے کاٹ دئے گئے ہیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے دنیا گھومتی ہوئی نظر آئی۔ اس کے کانوں میں ٹراموں، کاروں، اور رکشاؤں کی ٹن ٹن کی آوازیں تھیں۔ لیکن یہ شور لمحہ بہ لمحہ کم ہوتا گیا۔ وہ اب اس زمین کے قریب جا رہا تھا جہاں ابدی اندھیرا ہو جاتا ہے، اور روشنی کی کرن ہمیشہ کے لئے معدوم ہو جاتی ہے۔

"بمبئی اور ہوٹل"

یہ ہمارا بمبئی کا مقبول ترین بےحد خوبصورت ریستوران۔ دیواروں پر ننگی تصویریں ہیں۔ عورت اور مرد کے اختلاط کی تصویریں، خوبصورت چھاتیوں کی تصویریں، لچکتی ہوئی کمر کی تصویریں، گول گول سڈول اور گنبد نما کولہے اور پنڈلیوں کی تصویریں، رخساروں کی تصویریں۔ غزالی آنکھیں، بادامی آنکھیں۔ نرگسی آنکھیں، گیسو جو کھل جائیں تو گھٹا بن کر برسیں مختلف چہرے کلاسیکی نقوش۔ آرین اور رومن نقوش کی آمیزش، کہیں ہیلن آف ٹرائے ہے تو کہیں کلوپیٹرا کا کلاسیکی چہرہ۔ دیواروں پر افرو ایشیائی چہروں کی نمائش کی ہے۔ پرانے زمانے میں مندر ہماری تہذیب و تمدن کا نمونہ ہوئے تھے۔ آج کل یہ ہوٹل اور ریستوران پرانی تہذیب سے لے کر جدید تہذیب و تمدن کی آماجگاہ ہیں۔ ننگی تصویروں کی بہتات ہے، چند پینٹنگ ہیں قابل تعریف، مجھے اس ننگے پن میں کوئی بداخلاقی نظر نہیں آتی۔

(مہندر ناتھ)

مہندر ناتھ

دی بلیو پرنٹ

ڈیئر ایڈیٹر!

۲۲ ستمبر ۱۹۷۹ء

میں آپ کو ایک افسانہ کا مواد بھیج رہا ہوں، مجھے کاغذ کے یہ چند اوراق کہاں سے ملے۔ ان کا میں بعد میں ذکر کروں گا۔ پہلے میں آپ کو یہ بتا دوں کہ میں افسانہ نگار نہیں ہوں۔ ایک دفتر میں ایک معمولی سا کلرک ہوں۔ اس دفتر میں کلرکی کرتے ہوئے تیس برس گزر گئے ہیں۔ میری ایک بیوی ہے اور بد قسمتی سے میرے چھ بچے ہیں۔ میری تنخواہ اس وقت ایک سو بیس روپے ہے۔ پینتالیس روپے پر نوکر ہوا تھا۔ آج سے بیس سال پہلے۔ میرے دل میں تمنائیں تھیں۔ آگے بڑھنے کی آرزو تھی۔ ایک خوبصورت، صاف ستھرا گھر بنانے کی خواہش تھی۔ اسی جوش میں آکر شادی کر لی تھی۔ انہیں آرزوؤں کو پروان چڑھانے میں بیس برس گزر گئے اور میری حالت پہلے سے بھی ابتر ہوتی گئی۔ اور اب میں قبل از وقت بوڑھا ہو گیا ہوں۔ سر کے بال سفید ہو گئے ہیں، میری آرزوئیں بھی اب بوڑھی ہو گئی ہیں۔ جس کھولی میں میں رہتا ہوں وہاں نل ہے نہ بجلی۔ رات کو Kerocene oil کا لیمپ جلاتا ہوں اور دن میں سورج کی روشنی میں چلتا پھرتا ہوں۔ یہ مواد میں آپ کو کیوں بھیج رہا ہوں۔ اس کے بھیجنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس شخص کی تمنائیں، آرزوئیں میری طرح کی تھیں۔ اس نے اپنی زندگی کا Blue Print بنایا ہوا تھا۔ اور میں نے بھی۔ مجھے یہ شخص آرٹسٹ دکھائی دیتا ہے۔ لیکن شاید زندگی نے ساتھ نہ دیا۔ حالات نے اسے موت کے منہ میں جا دھکیلا۔

یہ اس بھیانک رات کی بات ہے جب اس شہر میں ایک زبردست طوفان آیا تھا۔ رات کا وقت تھا کسی نے میرا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں اس وقت جاگ رہا تھا۔ میری بیوی جاگ رہی تھی اور میرے بچے رو رہے تھے۔ کچھ خوف کی وجہ سے اور کچھ بھوک سے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا اور مجھے ایک کالا کلوٹا آدمی نظر آیا۔ اس نے مجھے باہر آنے کے لئے کہا۔ اور میں چپکے سے اس کے ساتھ ہو لیا۔ جب ایک فرلانگ کا فاصلہ طے کر لیا، تو اس نے مجھے ایک جھونپڑی کی طرف اشارہ کیا۔ اور ہم دونوں اس جھونپڑی کے اندر چلے گئے اور باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ ہوا تیز اور تند تھی اور اندر چارپائی پر ایک شخص لیٹا ہوا تھا۔ اس کے سرہانے ایک لالٹین جل رہی تھی۔ میں نے قریب جا کر لیٹے ہوئے آدمی کی طرف دیکھا۔ ایسا معلوم ہوا کہ وہ سویا ہوا ہے۔ میں نے جگانے کی کوشش کی۔ لیکن ساتھ والے آدمی نے اشارے سے کہا کہ وہ ہمیشہ کے لئے سو گیا ہے۔ سونے والے کے دونوں ہاتھوں میں چند اوراق تھے جو اس نے اپنے سینے کے ساتھ چمٹا رکھے تھے، جو میں آپ کو بھیج رہا ہوں۔ میں نے خود بھی ان کو پڑھ لیا ہے۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ سب لوگ پڑھیں۔ میں نے وہ کاغذات لے لئے اور لاش پر چادر ڈال دی۔ چھت ٹپک رہی تھی۔ کمرے میں ایک چارپائی تھی، سرہانے کے قریب

ایک ٹرنک تھا، دیواروں پر غالب، ٹیگور اور پریم چند کی تصویریں تھیں، جو کافی گندی اور میلی ہوگئی تھیں۔ یہ شخص کس طرح مرا، کیوں مرا، اس کی عمر کتنی تھی؟ غالباً مرنے والے کی عمر زیادہ نہ تھی، شاید پچیس سے اوپر نہ ہوگی۔ لیکن چہرے سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کافی لاغر اور کمزور تھا میں نے وہ کاغذات اٹھا لئے اور صبح میونسپلٹی کو اطلاع دیدی ______ اور آج میں آپ کو یہ اوراق بھیج رہا ہوں۔ کاش میں افسانہ نگار ہوتا تو ان واقعات کو سامنے رکھ کر ایک افسانہ لکھتا اور لوگوں کو بتاتا کہ اس زندگی میں تمنائیں کس طرح کچلی جاتی ہیں اور آرزوئیں بھوتوں کا روپ دھار کر بڑھاپے میں زندگی حرام کرتی ہیں:

ذرا ٹھہر جائیے۔ میرا بچہ رو رہا ہے۔ اسے خسرہ نکل آیا ہے۔ بیوی راشن لانے کے لئے دوکان پر گئی ہوئی ہے اس لئے میں بچے کو پہلے دودھ پلا آؤں۔ پھر خط ختم کروں گا۔

۲۲ ستمبر ۱۹۴۹ء

اُس دن میں خط ختم نہ کر سکا، بچہ متواتر روتا رہا۔ میں ڈاکٹر کے پاس گیا۔ وہاں سے دوائی لایا۔ اتنے عرصے میں معلوم ہوا کہ باقی بچوں کے بھی خسرہ نکل آیا ہے۔ یہ کوئی چھوت چھات کی بیماری ہے، بچوں کو بخار تیز ہے۔ اگر آپ نے شادی کی ہوئی ہے تو آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ چھ بچوں کے باپ کی کیا حالت ہو سکتی ہے۔

وہ اوراق میں نہیں بھیج رہا ہوں، ان کی نقل بھیج رہا ہوں۔ ممکن ہے آپ کو مواد پسند آئے یا نہ آئے۔ آپ اسے ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیں۔ آپ کوئی شاید جلسی افسانہ چھاپنا پسند کریں یا بڑے بڑے افسانہ نگاروں کے افسانے چھاپیں اسی لئے میں ان اوراق کی ایک نقل بھیج رہا ہوں ___ لیکن چار جگہ میں نے چند لفظوں کا ردوبدل کیا ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو ان الفاظ کو رکھیئے گا، ورنہ آپ انہیں کاٹ سکتے ہیں:۔

THE BLUE PRINT

خواب گاہ:۔

دیواروں پر گہرا آسمانی رنگ، تین دیواروں پر نیچے سے دیوار کی تقریباً دو تہائی اونچائی چھوڑ کر گز بھر کی شفق رنگ کی ایک پٹّی، جس پر نگاہِ محبوب کی طرح جھکی جھکی ڈالیاں منقش ہوں اور سامنے والی دیوار پر صرف شفق رنگ کی پٹی جس کے وسط میں سورج آدھا نیچے نیلے رنگ کے سمندر میں ڈوبا ہوا نظر آئے۔ اس پٹّی کی صرف نچلی لائن چاروں طرف دیواروں پر واضح ہوگی، اوپر کی نہیں، کیونکہ اوپر کا نیلا رنگ آسمان کو ظاہر کرے گا جس میں شفق آسمان کے رنگ میں کھوئی ہوئی نظر آئے۔

کمرے میں نیلی روشنی کا بلب ایک خوبصورت شیڈ کے ساتھ اور فرش پر دری، دری پر شفق رنگ کا قالین۔

ایک طرف پلنگ بچھا ہوا۔ پلنگ کے ایک طرف ایک نازک سی میز پر ایک پیاری سی بلور کی طشتری میں موتیا، زرد یا سفید چمیلی یا مولسری کے پھول (جس کا بھی موسم ہو) ساتھ میں پانی کا ایک گلاس طشتری سے ڈھکا ہوا، اور ایک کتاب مطالعہ کے لئے رکھی ہوئی۔ پلنگ کے دوسری طرف ایک چوڑی سی میز پر ریڈیو رکھا ہوا، سرہانے کے اتنے قریب کہ سوتے وقت ہاتھ بڑھا کے بند کیا جا سکے۔ ریڈیو پر لسنر پڑا ہو۔!

سرہانے سے گز بھر کی اونچائی پر دیوار میں ایک اور بجلی کا خوبصورت سا لیمپ لگا ہوا ہو جو پلنگ پر جھکا ہوا ہو۔ لیمپ میں بھی نیلا بلب ہو، جس کا ہولڈر تکیے کے نیچے رکھا ہو، تاکہ سوتے وقت ہاتھ بڑھانے کی بھی زحمت نہ کرنی پڑے۔

کمرے کے ایک کونے میں ایک طرف Latest ڈیزائن کا وارڈروب، اور ایک طویل شو ہینگر۔

دوسرے کونے میں ایک جدید ترین وضع کی بڑی سنگار میز۔ اس پر سنگار کا سامان سجا ہوا، اور پاس ہی ایک ماڈل ہینگر۔

چوتھے کونے میں یعنی پلنگ کے متوازی لکھنے کی میز اور ایک آرام کرسی، میز کے اوپر دیوار میں ایک چھوٹا بک شلف چڑھا ہوا جس کے پٹ شیشے کے ہوں۔ تاکہ ان میں رکھی ہوئی گنتی کی چند تازہ ترین کتابوں کے گرد پوشوں پر نام پڑھے جاسکیں، اور کسی کتاب کے ڈھونڈنے میں دقت نہ ہو۔

میز پر ماہوار رسالے انگریزی اور اردو زبانوں کے رکھے ہوئے، اور ایک گھڑی اور لکھنے کا سامان قرینے سے سجا ہوا۔ اور ایک الیکٹرک لیمپ نیلے بلب کا ایک نازک سے شیڈ کے ساتھ میز پر جھکا ہوا۔

بک شلف کے اوپر اور شفق رنگ کی پٹی کے نیچے چند ملکی رہنماؤں کی تصویریں لگی ہوں۔

میز پر شیشے کے نیچے اپنے پسندیدہ ادیبوں کے فوٹو رکھے ہوں۔

کھڑکیوں پر پردے شفق رنگ کے ہوں۔

پلنگ کا بچھونا :۔

گدے کے اوپر دری، اس پر نیلی ساٹن کی توشک اور توشک پر ریشمی کام کی چادر پائینتوں ساٹن کا لحاف۔ دو رنگا بیچ میں شفق رنگ، حاشیے کی نیلے رنگ کی پٹی اور گوٹ بھی شفق رنگ کی اور اسی نیلے رنگ کا سرہانے دو تکیے، تیتروں کے پروں کے جن پر دلآویز کڑھے ہوئے غلاف چڑھے ہوں۔ پائینتوں کبھی نیلا اور کبھی گلابی سلکن لباس شب خوابی تہہ کیا ہوا رکھا ہو۔ ایک تکیے کا غلاف نیلے رنگ کا ہوگا جس پر شفق رنگ پھول کڑھے ہوں گے، اور دوسرے تکیے کا غلاف شفق رنگ کا ہوگا۔ اس پر نیلے پھول ہوں گے۔

دن کے وقت نیلی رنگی ہوئی ململ کا پلنگ پوش بستر پر پڑا رہا کرے، اور پائینتوں خرگوش کی کھال کی سلیپر رکھی رہے۔

ٹاول ہینگر :۔

تولیہ اور سلکن یا اونی نائٹ گاؤن پڑے ہوں نیلے اور شفق رنگ، موسم کے لحاظ سے۔

شو ہینگر :۔

دو درجن جوتے دو قطاروں میں ٹنگے ہوں۔ شو شائن اور برش پالشنگ کلاتھ ساتھ رکھا ہو۔

وارڈروب کا سامان :۔

اس کے دروازوں میں اندر کی طرف دونوں جانب قدِ آدم شیشے لگے ہوں گے۔ اندر سے وارڈروب اونچائی میں دو حصوں میں منقسم ہو، بیچ میں ایک پارٹیشن وال سے ہر ایک سوٹ اور شیروانی لٹکانے کے لئے قلابے لگے ہوں جن میں ہینگر لٹکائے جائیں گے اور نیچے سینے پرونے کا سامان رکھا ہوگا۔ اور ایک کیمرہ اور دوربین۔ دوسرے حصوں کو پھر دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہو۔ لیکن اس دفعہ چوڑائی میں۔ بیچوں بیچ، اوپر کے حصے میں دو درجن قمیصیں رکھی جائیں گی اور نیچے کے حصے میں دراز کی طرح کی ایک چیز لگی ہوگی، مگر اندر تختہ نہ ہو، بلکہ لکڑی کے چوبیس پتلے پتلے رول سے ہوں، جن پر پتلونیں اور ٹائیاں لٹکائی جائیں گی، اور نیچے دو درجن رومال اور موزے بنیان اور انڈر ویئر اور تولئے رکھے ہوں گے۔

سنگار میز کا سامان :۔

چنبیلی کا تیل، کنگھے، برش، پاؤڈر، کریمیں، لوشنز وغیرہ وغیرہ اس کی دراز میں نیل کٹر اور ٹائلٹ کا مزید سامان رکھا ہو۔

لکھنے کی میز کا سامان :۔

جدید قسم کا قلم دان، بلاٹنگ، پنچ مشین، پنز کوشن، پیپر ویٹس، کلپس، پیڈ اور لفافے، فٹ رول، پنسلیں، کلینڈر

ربڑ وغیرہ وغیرہ

میز پر لکھنے کی جگہ ایک گز شیشے کی مستطیل، اس کے نیچے اپنے ان دل پسند شعراء، افسانہ نگاروں اور نقادوں کی تصویریں رکھی ہوں:۔

غالب ٹیگور پریم چند اقبال فراق کرشن چندر

راجندر سنگھ بیدی سعادت حسن منٹو عصمت شاہد لطیف قرۃ العین حیدر

جوش مہندر ناتھ علی سردار جعفری کیفی اعظمی

میز پر دائیں ہاتھ کے کونے میں یہ رسالے چنے ہوں:۔

اردو	ماہنامہ	ادب لطیف	انگریزی	ماہنامہ	موڈرن ریویو
"	"	نگار	"	"	فلم انڈیا
"	"	جاوید	"	"	ساؤنڈ
"	"	ہمایوں	"	"	فلم پکٹوریل
"	"	پریت لڑی	"	"	ٹرنڈ
"	"	فسانہ	"	"	لائف
"	"	نقوش	"	"	فوٹو پلے
"	دماہی	شاہراہ	"	اسپیشل	اسکوائر
"	"	سویرا	"	"	کوریر
(جب بھی نکلے)		نیا ادب			

میز کے سامنے والے بائیں ہاتھ کے کونے میں اپنے محبوبہ کا فوٹو۔

بُک شلف کے اوپر کی فریم شدہ تصویریں:۔

گاندھی جی، قائد اعظم، پنڈت نہرو، سبھاش بابو، راجہ جی، وجے لکشمی پنڈت
سروجنی نائیڈو۔

ڈرائنگ روم:۔

سفید مذاق، دیواروں میں نیچے سے دو تہائی اونچائی پر ایک گز بھر کی ہلکے آسمانی رنگ کی پٹی پڑی ہوئی۔ اس ہلکے آسمانی رنگ کے پس منظر میں سبز بیلوں میں سفید پھول کھلے ہوئے۔ کمرے کے چاروں کونوں میں دیوار گیر اور ان میں آسمانی رنگ کے بلب لگے ہوئے۔ سامنے کی دیوار کی پوری لمبائی میں اور دائیں اور بائیں کی آدھی لمبائی میں شیشے کا ایک بڑا بک شلف جڑا ہوا دو خانوں والا۔ اس میں ایک اپٹوڈیٹ ادبی لائبریری سجائی جائیگی جو اردو اور انگریزی دونوں زبانوں کی مستند کتابوں پر مشتمل ہوگی۔ بک شلف کے اوپر بدھ کا اور گاندھی جی کا مجسمہ رکھا ہوا ان کی پیشانیوں سے ارغوانی رنگ کی بجلی کا نور پھوٹ رہا ہو۔ اور ان سروں کے بیچ اسی رنگ کے ہالے ہوں اور ان دونوں کے بیچ میں تاج محل رکھا ہو اس میں سے دودھیا روشنی پھوٹ رہی ہو۔

فرش پر دری اور دری پر آسمانی رنگ کا قالین۔ کمرے میں دروازے کے سامنے آسمانی رنگ کے چمڑے کے کور کا صوفہ سیٹ رکھا ہوا۔ دائیں اور بائیں دونوں طرف کی دیواروں کے ساتھ دیوان بچھے ہوئے، آسمانی کور والے۔

بیچ میں ایک گول میز، شیشے کی سطح والی اور چھ کرسیاں، میز کے اوپر چھت سے لٹکتا ہوا ایک چاند تارا، بجلی کی روشنی کا آسمانی بلب، اور میز پر روزانہ اور ہفتہ وار اخبارات۔

دو انگریزی روزانہ اخبار

ہفتہ وار (اردو) شاہد اور (انگریزی) بلٹز، مارچ، انڈیا اور السٹریٹیڈ ویکلی۔

کمرے کی دیواروں پر اُس آسمانی رنگ کی پٹی کے نیچے چاروں طرف چغتائی آرٹ اور خوبصورت سین سینری کی تصاویر نازک فریموں میں جڑی ہوئی۔

کمرے کے چاروں کونوں میں اونچے اونچے اسٹینڈ، ان پر گلدان جن میں موسم کے پھول رکھے ہوں۔

ڈرائینگ روم:۔

سادہ فرش اور سادہ دیواریں۔

کمرے میں پارٹیشن کرٹن پڑا ہوا

پردے کے پیچھے سوٹ کیسز میں غیر موسمی کپڑے، ہولڈال، برساتی چھتری، گم بوٹس، چھڑی اور گھر کا تمام سامان قرینے سے رکھا ہوا اور دو بڑے جستی صندوق جن میں موسم سرما گذر نے پر اون اور روئی کے کپڑے اور دیگر اشیا محفوظ رکھی جائیں گی۔

ڈرائنگ روم میں پردے کے آگے ایک طرف دیوار کے ساتھ شیشے کی ایک الماری جس میں ظروف رکھے ہوئے ہوں۔ پلیٹیں، چمچے کانٹے، ڈشیں، چائے کے سیٹ، گلاس وغیرہ وغیرہ

دوسری طرف ایک شیشے کی الماری میں سرکہ، اچار، مربے، چٹنیاں اور پھل وغیرہ رکھے ہوں۔

پردے کے آگے وسط میں ایک میز۔ اس پر ایک ریکارڈ کبرڈ اور ایک گراموفون، کبرڈ میں کلاسیکل اور فلمی دونوں طرح کے چیدہ چیدہ ریکارڈ رکھے ہوں گے۔

ڈرائنگ روم کے وسط میں ایک چوکور میز، کھانا کھانے کی، اس پر ایک سفید براق میز پوش۔ بیچ میں گلدان، سرخ پھولوں کا اور گلاسوں میں سفید نیپکنز رکھے ہوئے اور نمک اور کالی مرچوں کی شیشیاں اور مسٹرڈ پوٹ

کمرے کی دیواروں پر فوٹوگرافی کے چند اچھوتے نمونے۔

باتھ روم:۔

پھول دار ٹائل، سفید دیواروں کی ایک تہائی اونچائی تک۔

وسط میں ایک دودھیا رنگ کا بلب لٹکتا ہوا۔

ٹب اور شاور لگا ہوا۔

ایک کونے میں دیوار کے ساتھ شیشے کی ایک مستطیل لگی ہوئی۔ اس پر ٹوتھ پیسٹ اور برش اور شیونگ کا اور نہانے کا تمام سامان رکھا ہوا، معہ کھلی کے ڈبے کے۔

شیشے کی مستطیل کے ساتھ دیوار میں آئینہ جڑا ہوا۔ اور ایک طرف کھونٹیاں لگی ہوئی، کپڑے لٹکانے کے لئے۔

گھر کے سامان کی فہرست، قیمتوں کے ساتھ:

خواب گاہ:۔

دیواروں پر رنگ روغن ۲۰۰ روپے، فرشی دری ۴۰ روپے، قالین ۳۰۰ روپے، پلنگ ۱۰۰ روپے، مکمل بستر ۴۰ روپے،

دو ڈریسنگ گاؤن ۵۰ روپے، خرگوش کی کھال کے چپل ۲۰ روپے، کتاب، پانی کا گلاس اور پھول رکھنے کی میز ۳۰ روپے، ریڈیو کی میز مع بڑے ریڈیو ۵۰۰ روپے، وارڈروب ۶۰۰ روپے، شو ہینگر ۲۰ روپے، سنگار میز ۴۰۰ روپے، ٹاول ہینگر ۲۰ روپے، کیمرہ ۳۰۰ روپے، دو درجن ۲۰۰ روپے، ڈیڑھ درجن سوٹ اور دوسرا لباس ۴۸۰۰ روپے، لکھنے کی میز مع اسٹیشنری کے ۲۴۰ روپے، چھوٹا بک شلف ۷۵ روپے، دو الیکٹرک لیمپ مع شیڈ کے ۱۰۰ روپے، تصویروں کے فریم ۵۰ روپے ۵۰ روپے، میزان ۸۵۲۵ روپے۔

ڈرائینگ روم :۔

دیواروں پر رنگ روغن ۲۰۰ روپے، فرشی دری ۳۵ روپے، قالین ۳۱۵ روپے، چار دیوار گیر ۲۰۰ روپے، کتابیں ۵۰۰ روپے، بڑا بک شلف، شیشے کا کتابوں کے لئے ۵۰۰ روپے، مرمر کا تاج محل، بدھ اور مہاتما گاندھی کے مجسمے ۵۰۰ روپے، دو دیوان ۶۰۰ روپے، صوفہ سٹ ۵۰۰ روپے، بیچ کی گول میز ۲۵۰ روپے، آٹھ کرسیاں ۲۵۰ روپے۔ چاندتارا ۱۵۰ روپے، تصویروں کے فریم ۵۰ روپے، چار بڑے گلدان مع اسٹینڈ کے ۱۲۵ روپے۔ میزان ۴۱۷۵ روپے۔

ڈائننگ روم :۔

میز اور کرسیاں ۱۵۰ روپے، شیشے کی الماریاں ۱۰۰۰ روپے، چینی کے ظروف اور کھانے کا دیگر سامان ۳۰۰ روپے، گرامو فون مع اس کی میز کے اور ریکارڈ مع کبرڈ کے ۶۷۰ روپے، سٹور روم کا سامان ۵۰۰ روپے۔ میزان ۲۶۲۰ روپے

باتھ روم :۔

دیواروں کے ٹائل ۱۵۰ روپے، ٹب اور شاور ۳۰۰ روپے، واشنگ بیسن ۲۰۰ روپے، نہانے کا سامان ۳۰ روپے،

میزان ۶۸۰ روپے

جملہ اخراجات :۔

خواب گاہ	۸۵۲۵ روپے
ڈرائنگ روم	۴۱۷۵ "
ڈائننگ روم	۲۶۲۰ "
باتھ روم	۶۸۰ "
میزان	۱۶,۰۰۰ روپے

روزانہ پروگرام :۔

صبح کاذب کے وقت اٹھنا، ضرورت سے فارغ ہو کر ہوا خوری کو چل دینا، سیر سے آ کر جمناسٹک کرنا، زور کر چکنے کے بعد رات کے پانی میں بھیگے ہوئے چودہ بادام کے چھلکے اتار کر انہیں مصری کے ساتھ رگڑ کر چاٹنا، پھر آرام کرسی پر لیٹ کر اخبار پڑھنا۔ آٹھ سے سوا آٹھ تک کی خبریں ریڈیو پر سننے کے بعد نہانے جانا۔ نہانے کے بعد ناشتہ کرنا۔

ناشتہ یہ ہوگا :۔

موسم گرما :۔ ایک پاؤ پیڑوں کی لسّی کا گلاس یا ایک پاؤ دہی کا آدھ رڑکا، مٹھڑیوں کے ساتھ۔

موسم سرما :۔ آدھ سیر گرم گرم دودھ میں آدھی ٹکیہ مکھن، اس کے ساتھ دو ٹوسٹ یا دو چھوٹے چھوٹے نمکین پراٹھے اور کوئی سبزی۔

نو بجے ناشتے سے فارغ ہو کر دفتر چل دینا۔

ساڑھے نو بجے سے ایک بجے تک دفتر۔

ایک بجے دفتر سے گھر آ کر کھانا کھانا۔

کھانا یہ ہوگا:۔

پہلے شوربہ، پھر چاول، دال اور کسی سبزی کے ساتھ۔ پھر روٹی، گوشت (کبھی بھُنا ہوا، کبھی ٹوٹے مسالے میں، کبھی لعاب پر اترا ہوا) کبھی قیمہ تو کبھی پسندے۔

کھانے کے ساتھ آدھ پاؤ دہی، سلاد اور کچے شلجم یا چقندر بھی ہوں گے۔

آخر میں کچھ موسمی پھل بھی کھائے۔

اور چلتے چلتے کچھ مٹھائی چکھ لی۔

کھانے کے دوران میں سنگیت ضرور ہونا چاہیئے۔ ریڈیو پر ہو، تو ٹھیک، نہیں تو گراموفون ریکارڈ ہی سہی۔

کھانا کھا کے واپس دفتر۔

دو بجے سے ساڑھے چار بجے تک دفتر میں کام کرنا۔ دفتر سے سیدھے گھر پہنچنا۔

پانچ بجے ایک بڑا گلاس سنگترے یا موسمبی کے رس کا پینا۔ وہ نہ ہو تو گنّے کے رس کا گلاس، نہیں تو ناریل کا پانی ہی سہی۔

اسے پی کر لکھنے پڑھنے بیٹھ جانا۔

اِدھر دن ڈھلا اور سیر کرنے نکل گئے یا کسی سینما میں جا بیٹھے۔

نو بجے رات کو گھر پہنچ گئے۔ ریڈیو پر خبریں سنیں، پھر کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ کھانا یہ ہوگا۔

پہلے شوربہ۔ پھر روٹی ایک سبزی کے ساتھ۔

اس کے بعد چاول، ایک شوربے دار سبزی اور دال کے ساتھ۔

رات کے کھانے میں گوشت نہیں ہوگا اور دہی بھی نہیں، صرف سلاد ہوگا۔

اس کے بعد کچھ انگور اور انار اور چند دوسرے تازہ پھل۔

اور آخر میں ایک میٹھی ڈش۔

کھانا کھانے کے بعد ریڈیو بند کر دیا اور پڑھنے بیٹھ گئے۔

اِدھر دس بجے کتاب بند اور ریڈیو آن۔

ساڑھے دس بجے آدھ سیر گرم گرم میٹھا دودھ خوب سی ملائی کے ساتھ پیا اور بچھونے میں۔ ریڈیو دھیما کر دیا اور اس پر مدھم مدھم سروں میں موسیقی سنتے رہے، سنتے رہے، اور پھر سنتے ہی سنتے سو گئے۔ لیکن ریڈیو بند کر کے، نہیں تو آدھی رات کے وقت ماتاجی کو اٹھ کر بند کرنا ہوگا اور پھر صبح وہ پھٹکاریں گی۔ لیکن ماتاجی وہاں کہاں ہوں گی۔ ورنہ اُن کے پھٹکارنے میں بھی تو مزا آتا ہے۔

یہ تو ہوا روز کا پروگرام۔ اب رہا اتوار، اس کا پروگرام یہ ہوگا:۔

حسبِ عادت صبح سویرے اٹھے۔ سیر کو گئے۔ جمناسٹک کی۔ پھر بادام چاٹے۔ گھنٹہ بھر اخبار دیکھا۔

اور بجائے ناشتہ کرنے کے آدھ سیر دودھ میں دو کچے انڈے پھینٹ کے پی گئے اور پھر جو لکھنے بیٹھے ہیں تو ایک بجے تک لکھتے ہی رہے۔

لکھنے سے فارغ ہو کر نہائے، ریڈیو آن کر دیا اور سنگیت کی بوچھاڑ میں کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ اتوار کو کھانا خصوصی ہوگا یعنی:۔

دہی کی بریانی۔ اور مرغی کا سالن، یا مرغ پلاؤ اور قورمہ۔ (مرغی کے بجائے کسی ہفتے تیتر، کسی ہفتے بٹیر اور کسی ہفتے کبوتر)

اور آخر میں زردہ، فیرنی کے ساتھ، جس پر پستے کی ہوائی پڑی ہوئی ہو یا بڑی شیرمال کے ساتھ۔
کھانا کھا کر سو رہے۔
دن ڈھلے ہفتے بھر کا کسل دور کر کے سو کے اُٹھے۔
بنے سنورے اور سیر گشت کو نکل کھڑے ہوئے۔
حسبِ معمول نو بجے گھر لوٹے، خبریں سنیں اور کچھ پڑھنے بیٹھ گئے۔
اتوار کی رات کو کھانا نہیں کھانا۔ اس طرح ہفتے میں ایک وقت کا فاقہ جسم میں فاسد مادّے کو پیدا نہیں ہونے دیتا۔
لہٰذا ساڑھے دس بجے حسبِ معمول دودھ پیا اور بستر میں دبک گئے۔ اور ریڈیو سنتے سنتے گیارہ بجے سو گئے، تاکہ آنے والے ہفتے میں زندگی کی گہما گہمی کا پیر کی صبح تازہ دم، ہشاش بشاش اُٹھ کے خیر مقدم کریں۔

مرنے والے کا نام کیا تھا۔ یہ اُس رات معلوم نہ کر سکا۔ دوسرے دن میں پھر اس کے کمرے میں گیا۔ ٹرنک کھولا۔ کچھ خط ملے جن پر اس کا نام اور ایڈریس درج تھا۔ مرنے والے کا نام ہربنس لال تھا۔ راولپنڈی میں پیدا ہوا۔ نوکری کی تلاش میں بمبئی آیا۔ بمبئی میں دس برس رہا۔ شادی نہیں کی تھی (شاید توفیق نہ ہوئی) عمر پینتیس برس!

میں یہ سب باتیں اس لئے لکھ رہا ہوں کہ یہ شخص عین جوانی میں مرگیا۔ یہ صرف ایک شخص کی موت کی داستان نہیں ہے اس موت میں میری موت بھی شامل ہے۔ ہزاروں کروڑوں انسانوں کی موت شامل ہے۔ کیا کوئی ایسا نظام نہیں، جس میں ہربنس لال کی خواب خواہ بن سکے جہاں وہ اپنا پلنگ، بڈ روم کے لئے خرید سکے۔ سنگار میز، لکھنے کا سامان، ڈرائنگ روم، باتھ روم اور تمام چیزوں کو کھا پی سکے۔ جس کا ذکر اس Blue Print میں کیا گیا ہے۔
کیا میں امید کر سکتا ہوں کہ آپ میرے خط کا جواب دیں گے؟
نوٹ:۔ اگر آپ اس کہانی کا نام Blue print ہی رکھیں تو اچھی بات ہوگی۔

آپ کا خیر اندیش
رونق لال
قصبہ بوری ولی۔ کھولی نمبر ۱۳

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
علامہ اقبال

رہنے کو گھر نہیں ہے سارا جہاں ہمارا
ساحر لدھیانوی

مہندر ناتھ

ممی

"ممی۔ یو۔ آر۔ گریٹ ممی۔ میرے پاس آؤ۔ وسکی کا ایک اور پیگ لونا۔

"ڈونٹ بی سیلی۔ مائی سن۔" ممی چلائی۔

"بی۔ اے۔ گڈ مدر۔ صرف ایک پیگ اور۔" ممی وسکی کی بوتل سے ایک پیگ ڈالتی ہے اور پینے والے ہاتھ میں گلاس دیتی ہے۔ "یو آر۔ گریٹ ڈارلنگ۔ تھوڑی برف۔ یہ برف کہاں سے لائی ہو۔ صبح میں نے نوکر کو بھیجا لیکن اسے برف نہ ملی۔ ممی یو آر سویٹ۔ میرے پاس آؤ۔ میرے قریب"

"ڈونٹ بی سیلی مائی سن۔ ممی پھر چلائی۔

"اگر میرے پاس نہ آؤ گی تو میں چلا آؤں گا۔ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ میں تمہیں کتنا پسند کرتا ہوں ممی۔ تمہاری قسم مجھے کچھ معلوم نہیں کہ میں تم کو کیوں پسند کرتا ہوں، لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ، میں تمہیں پسند کرتا ہوں ممی۔ میرے پاس آؤ۔ میرے قریب، تمہارا ہاتھ کدھر ہے۔۔۔۔؟

"تم نے بہت پی ہے مائی سن۔

"نہیں ممی ابھی میں اور پیوں گا۔ جی بھر کے پیوں گا۔ تم شراب پلاتی جاؤ میں پیتا جاؤں۔ شراب کتنی اچھی چیز ہے۔ شراب پی کر میں بہت باتیں کرتا ہوں۔ اِدھر اُدھر کی باتیں۔ عشق اور محبت کی باتیں۔ تمہاری باتیں۔ غلامی کی باتیں۔ ممی تمہارے ہاتھ بہت ہی خوبصورت اور ملائم ہیں، نرم و نازک۔"

ممی زور سے قہقہہ لگاتی ہے۔

زور سے مت ہنسو ممی۔ اس قہقہے سے بڑھاپے کی بو آتی ہے۔ تم ذرا لطیف انداز سے ہنسو۔ دبی دبی سی ہنسی۔ خوشگوار ہنسی پیاری اور میٹھی ہنسی۔ یو۔ آر۔ واقعی گریٹ۔ ایک اور پیگ۔

"بالکل نہیں۔"

"میں تمہارے قریب آؤں گا۔ تمہارے ساتھ بیٹھوں گا۔"

"آجاؤ ـــــ"

"کیا تمہیں کسی بات کا ڈر نہیں۔"

"ممی میں تمہارا کن الفاظ سے شکریہ ادا کروں تم نے جس لڑکی کا پتہ دیا تھا میں اس سے ملنے گیا تھا۔

"کہاں"

"بمبئی میں ڈارلنگ"

"پھر کیا ہوا۔ ؟

"ممی وہ لڑکی مجھے بالکل پسند نہیں آئی دیکھتے ہی مجھے اس سے نفرت ہو گئی۔ مجھے وہ بالکل پسند نہیں آئی ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ مجھے اجنبی سمجھ رہی ہے۔ ممی میں تو تمہاری سفارش لے کر گیا تھا۔ پھر بھی اس نے سیدھی طرح بات نہ کی مجھے کیا غرض تھی کہ اسے مناتا بہت مغرور تھی وہ۔ اپنے آپ کو معلوم نہیں کیا سمجھتی تھی۔ اُس کے سلوک۔ اس کے برتاؤ۔ اس کی باتوں سے صاف عیاں تھا کہ وہ ہندوستانیوں کو پسند نہیں کرتی اور میری جیب میں سفارش کے علاوہ روپے بھی تھے۔ مفت کا مال تو نہیں تھا ممی۔

"مجھے اُمید نہ تھی کہ وہ اس طرح Behave کرے گی" ممی نے شراب کے گلاس کو ختم کرتے ہوئے کہا۔

"ممی میرے قریب آؤ ——— مرے نزدیک - میرے پاس آؤ - ذرا۔ ذرا ادھر سرک آؤ۔ ممی۔ ہاں اتنی جلدی بوڑھی کیوں ہو گئی ہو۔" ؟

"ایک دن تم بھی بوڑھے ہو جاؤ گے۔ بالکل میری طرح صرف dad بن کر رہ جاؤ گے۔ لیکن۔ ہاں عورتیں بہت جلد بوڑھی ہو جاتی ہیں۔

"ممی تم مجھے پسند کیوں کرتی ہو۔

"کیونکہ تم اچھے ہو۔ کیونکہ تم خوبصورت ہو جوان ہو۔ تم استنے زور سے قہقہے لگاتے ہو کہ میرے بوڑھے جسم میں توانائی سی آجاتی ہے۔ میں جوان لڑکوں کی صحبت میں بیٹھ کر خوش رہتی ہوں۔ مجھے ہنسی اور قہقہوں سے انتہائی محبت ہے اور تم —"

رک جاتی ہے)

"جو کچھ کہنا چاہتی ہو کہہ ڈالو"

"یہی کہ تم کمینے نہیں ہو" یہ کہہ کر ممی مسکرائی۔

"ممی ایک پیگ اور۔ تمہارے ہاتھوں کی قسم جو اتنے نرم اور ٹھنڈے ہیں۔ مجھے تمہارے ہر سانس سے محبت ہے"

"تم نے بہت پی لی ہے۔ اور اگر تم نے ایک اور پیگ پی لیا۔ تو قے کرنے لگو گے"

"نہیں ممی نہیں" تمہاری قسم نہیں۔ قے نہیں کروں گا۔ میں کبھی قے نہیں کروں گا۔ صرف ایک پیگ اور۔ لو تم بھی ایک پیگ پیو۔ جب تم شراب پی لیتی ہو تو تم کافی حسین ہو جاتی ہو۔ تمہاری دھنسی ہوئی آنکھیں۔ چمک اٹھتی ہیں۔ اور تمہارے مرجھائے ہوئے چہرہ پر رعنائی سی آجاتی ہے۔ ممی تمہاری —"

"اینگلو انڈین۔

"کیا تمہیں ہندوستانیوں سے نفرت ہے"؟

"بالکل نہیں میرے بیٹے مجھے صرف اُس شخص سے نفرت ہے جو کمینہ ہو۔ اور وہ تمہارا دوست جو اپنے آپ کو شاعر کہتا ہے وہ تو بہت ہی کمینہ ہے"

"کون سا شاعر ممی"؟

"وہ کالا سیاہ سا۔ جس کی آنکھیں اندر دھنسی ہوئی ہیں۔ جو نہایت ہی بدصورت اور بے حیا ہے۔ اس کا دل بھی اس کے رنگ

کی طرح سیاہ ہے۔ مجھے اِس سے انتہائی نفرت ہے۔"

"کس بات پر جھگڑا ہوا تھا؟"

"ایک دن کہنے لگا ـ مجھے لڑکی لا دو ـ کم بخت اپنی صورت نہیں دیکھتا اور جس انداز سے اس نے مجھے یہ الفاظ کہے وہ انداز میں کبھی نہیں بھول سکتی اس کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ میں اسے لڑکیاں لا کر کیوں نہیں دیتی۔ میں اسے شراب کیوں نہیں پلاتی۔ بھلا میں اس کالے سیاہ آدمی کو کس طرح اپنے گھر میں بلاؤں۔ میں بدصورتی سے نفرت کرتی ہوں، میں بدصورت آدمی کے ساتھ شراب نہیں پی سکتی کیا ہوا۔ کہ میں لڑکیاں سپلائی کرتی ہوں۔ یہ میرا پیشہ ہے کیا تم مجھ سے۔ نفرت کرنے لگو گے۔ اسی وجہ سے......!"

"نہیں ممی۔ بلکہ میں اس بے باک پن کی وجہ سے تم سے محبت کرتا ہوں مجھے معلوم ہے کہ تم لڑکیاں سپلائی کرتی ہو۔ مجھے اِس سے کیا غرض۔ لوگ اس سے بُرے کام کرتے ہیں۔ اور پھر میں تم سے کیوں نفرت کروں۔ میں کون سے اچھے کام کرتا ہوں۔"

"لیکن میرے بچے تم کمینے نہیں۔ تم دیانت دار ہو۔ تم میرا مذاق نہیں اُڑاتے۔"

"ممی نو مور ٹاک۔ میرے قریب آؤ۔ آؤ۔ آؤ نا۔"

"ڈونٹ بی سیلی مائی سن ـ مجھے اس شاعر سے نفرت ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ اسے ماروں پیٹوں، اس کی مسکراہٹ کو نوچ ڈالوں۔ وہ مجھے دلالہ سمجھتا ہے۔ کافر کہیں کا ـ وہ مجھے نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ کیوں کہ میں طوائف ہوں۔ یا طوائف رہ چکی ہوں۔ جیسے یہ جسم اس کے باپ کا ہے۔"

"چیخو مت ممی" ـ

"مجھے کہنے دو ـ"

"ممی میرے قریب آؤ۔ اور قریب ـ ناراض نہ ہو۔ یو۔ آر سویٹ۔"

"وہ مجھے سمجھتا کیا ہے۔ اس نے میرا مذاق کیوں اُڑایا۔ وہ مجھے نفرت کی نگاہ سے کیوں دیکھتا ہے سالا کہیں کا۔ کیا تم یہ جانتے ہو کہ پیشہ مجھے کیوں اختیار کرنا پڑا ـ"؟

"کیونکہ تم یہ پیشہ اختیار کرنا چاہتی تھیں۔"

"بکو مت، شاید تم نے ضرورت سے زیادہ پی لی ہے۔ میں طوائف کبھی نہیں بننا چاہتی تھی۔"

"تمہیں طوائف کون کہتا ہے ـ؟"

"تمہارا شاعر"

"وہ شاعر نہیں گدھا ہے۔ اسے کچھ پتہ نہیں ـ وہ بے وقوف ہے۔"

"اب آؤ میرے قریب، اب تو خوش ہونا۔ وہ لڑکی بہت اچھی تھی۔"

"چند دن ہوئے تم نے میرے پاس بھیجی تھی۔ وہ بہت اچھی تھی۔ کم بخت روپے بہت مانگتی تھی۔ ڈیڑھ سو روپے؟"

"کسی شریف گھرانے کی لڑکی تھی۔"

"تو پھر کیا ہوا ـ مجھے اس کی شرافت سے کوئی سروکار نہیں کہنے لگی تم میرے رسیلے ہونٹوں سے رس چرا سکتے ہو۔ بس بس زیادہ کچھ نہیں۔ تمہیں عصمت اور کنوارے پن کی عزت کرنی چاہیئے۔ رات بھیگتی رہی۔ اور میں اس کے شاداب لبوں سے تازگی حاصل کرتا رہا۔ شب بھر ہم نے ایک جان ہو کر ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو جوانی کے خواب دیکھے۔ میں حسن و جوانی اور عصمت کی

عزت کرنا جانتا ہوں۔ خوب جانتا ہوں۔"

"ہوں ـــــ اور تمہارا شاعر ـــــ کالا اور سیاہ۔ چمنی کے دھوئیں کی طرح سیاہ۔ آنکھوں میں آوارگی ---- اور سینے میں بچھو کا ڈنک۔ مجھ پر ہنستا تھا۔ کمینہ۔ مجھے طوائف سمجھ کر نفرت کرتا تھا جانتے ہو میرے بیٹے۔ میری عمر چودہ سال کی تھی۔ جب میری ماں ہیضہ سے مر گئی۔ اس وقت میں جوان تھی۔ بہت گورے سپاہی ہمارے گھر آتے تھے۔ ماں کے مرنے کے بعد میں اکیلی رہ گئی بالکل اکیلی تنہا اور ایک رات ایک گورے نے مجھے بہت پلا دی۔ اور اس رات حسن فروشی کی طرف میرا پہلا قدم اُٹھا۔ کہنے لگا میں تمہارے ساتھ شادی کروں گا۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ لوسی۔ اُن دنوں لوگ مجھے لوسی پکارتے تھے۔ لوسی نادان تھی۔ جوان تھی۔ گورے کی باتوں میں آگئی۔ اور جب صبح ہوئی تو گورا کہیں بھاگ گیا تھا۔ اور لوسی پھر اکیلی تھی۔ میرے بچے تم اس وقت کہاں تھے۔ تمہاری قسم میں اس وقت جوان تھی۔ جسم میں پتھر کی سی سختی تھی۔ اتنی سختی کہ چٹکی لو تو لہو رس چھلک جائیں۔ جسم میں سورج کی سی گرمی تھی۔ معلوم نہیں اس وقت تم کہاں تھے۔؟ اور اب۔ اب تو بوڑھی ہو چکی ہوں۔"

"ممی یو۔ آر۔ گریٹ یو آر گریٹ سوویٹ عورت۔"

"میں ان حالات میں کیا کرتی۔ کیا میں راہبہ بن سکتی تھی۔ کیا میں کسی ہسپتال میں نرس بھرتی ہو سکتی تھی؟ بالکل نہیں مجھے دونوں پیشوں سے نفرت ہے۔ جب جسم میں آگ ہو گوشت میں پتھر کی سی سختی ہو اس وقت عورت راہبہ نہیں بن سکتی نرس نہیں بن سکتی اور پھر میں نے یہ پیشہ اختیار کر لیا۔ لوگ جوق در جوق آنے لگے۔ میں نے ہمیشہ اُن لوگوں سے محبت کی۔ جو مجھے پسند آئے۔ میں نے یوں ہی اپنے آپ کو غیروں کے حوالے نہیں کیا بلکہ آہستہ آہستہ سوچ سمجھ کر میں نے اس جسم کا استعمال کیا ہے دیکھو اس عمر میں بھی لوگ میرے پاس آتے ہیں۔ میرے جسم کو خریدنا چاہتے ہیں لیکن میں ان کو گھر سے باہر نکال دیتی ہوں۔ صرف جوان لڑکوں کے ساتھ بیٹھتی ہوں۔ کیوں۔ میرے بچے"؟

"تم اسے پیشہ کہتی ہو؟"

"ہاں میرے بچے تم اپنا دماغ بیچتے ہو۔ میں اپنا جسم بیچتی ہوں۔ تجارت کرنے والے ۲۰ کروڑ کر کے عالیشان محل تیار کراتے ہیں۔ اور میں جسم کی نمائش کر کے اپنا پیٹ بھرتی ہوں۔ یہ دیکھو یہ چھوٹا سا گھر اسی جسم کی بدولت تیار ہوا ہے۔ اور اگر تمہیں ان تجارت کرنے والوں سے نفرت نہیں تو مجھ سے بھی نہیں ہونی چاہیئے۔"

"ممی شٹ اپ۔ یو۔ آر۔ اسپوائیلنگ مائی موڈ۔ کیا میں نے تمہیں نہیں بتایا کہ میں بمبئی گیا تھا۔ اور پھر اس لڑکی کے گھر بھی گیا تھا۔ لڑکی نہایت ہی بد تمیز تھی۔ تمہاری قسم اس سے بالکل نفرت ہو گئی۔ اس نے مجھ سے اس طرح باتیں کیں جیسے وہ ایک اعلیٰ نسل سے تعلق رکھتی ہے۔ اور میں محض ایک حقیر انسان تھا۔"

"مجھے اس کالے ہندوستانی سے نفرت ہے۔"

"اور میں اس لڑکی کے گھر سے نکل کر بازار میں چلا گیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ بازار میں ایک ہنگامہ برپا ہے۔ دوکانیں بند ہو رہی تھیں۔ لوگ جوق در جوق اکٹھے ہو رہے تھے۔ اور میں بھی کھڑا ہو گیا۔ شہر میں ہڑتال ہو چکی تھی ہندو اور مسلمان جھنڈے اکٹھے لہرا رہے تھے۔ لوگ کہہ رہے تھے کہ انڈین نیوی نے بغاوت کر دی ہے۔ بیس جہازوں پر قبضہ کر لیا۔ ہندوستانی نیوی زندہ باد۔ ہندوستانی فوج زندہ باد۔ کہو ممی جے ہند۔"

"نہیں کہتی۔"

"تمہیں کہنا ہی پڑے گا۔" نہیں تو میں تمہارا سر پھوڑ دوں گا۔"

"مجھے جے ہند کا نعرہ پسند نہیں ۔"

"لیکن ممی اس نعرے نے ہندوستان کو پھر سے بیدار کیا ۔ ممی ایک گلاس اور ممی میرے قریب آؤ ۔ میرے پاس آؤ ۔ میں تم سے باتیں کرنا چاہتا ہوں ، راز کی باتیں ۔ پیار کی باتیں ۔ ارے تم بمبئی نہیں گئیں ۔ اگر تم نے یہ آزادی کی جنگ دیکھی ہوتی ۔ تو ہندوستانیوں کی بہادری کی قائل ہو جاتیں ۔ کھو انڈین نیری زندہ باد ۔"

"ہندوستانی بزدل ہیں ۔ اور روپے کے لالچ میں آکر دوسروں کے لئے لڑتے ہیں ۔"

"نہیں ممی اب میں یقین نہیں کرتا ۔ جو کچھ میں دیکھ کر آیا ہوں ۔ اس کے بعد میں نہایت فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہم آزادی کے لئے لڑ سکتے ہیں ۔ مر سکتے ہیں ۔ ممی چھوٹے چھوٹے بچے جے ہند کا نعرہ لگا رہے تھے ۔ بچوں کے ہاتھوں میں پتھر تھے لاٹھیاں تھیں ۔ لیکن گوروں کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں ۔ مشین گنیں تھیں ۔ مقابلہ بہت سخت تھا ۔ بچوں نے بوڑھوں نے عورتوں نے گولیاں سینے پر کھائیں ۔ اور جے ہند کا نعرہ بلند کرتے رہے ۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے جھنڈے اکھٹے لہرا رہے تھے ۔ اور اگر ان لوگوں کے پاس بھی بندوقیں ہوتیں ۔ تو ۔۔۔"

"مائی گاڈ ڈونٹ ٹاک راٹ ۔ مائی سن ۔"

"کون ۔۔۔"؟

"وہی تمہارا شاعر ۔۔۔ میں اسے جان سے مار دوں گی ۔"

"ممی شٹ اپ کہو جے ہند ۔"

"نہیں کہتی ۔۔۔"

"صرف (Navy) ہی نہیں ۔ ایئر فورس ۔ مسلح فوج ۔ یعنی ہندوستان کی آزادی کی جنگ ۔ میں پہلی بار سب ہندوستانیوں نے مل کر آزادی کا نعرہ بلند کیا ۔ اب اس طوفان کو کوئی نہیں روک سکتا ۔ بندوقیں گولیاں ۔ ہم ہندوستانیوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے یہ ظلم اور یہ تشدد ہمارے آہنی عزم کو متزلزل نہیں کر سکتا ۔ اب ہندوستان آزاد ہو کر رہے گا ۔

I dont under stand your rubbish urdu.

اور جے ہند کا نعرہ صرف بمبئی سے بلند نہیں ہوا کراچی سے کولمبو تک دلی سے لے کر پشاور تک ہر شہر ۔ ہر گاؤں سے نعرہ بلند ہو رہا ہے ۔ اب ہمارا وطن آزاد ہو کر رہے گا ۔

"تم نے بہت پی لی ہے ۔"

"جب میں زیادہ پی لیتا ہوں ۔ تو نہایت صاف اور واضح باتیں کرتا ہوں ۔ نہایت کھری کھری باتیں ۔ ممی میں تمہیں پسند کرتا ہوں لیکن مجھے تمہاری قوم سے نفرت ہے ۔"

"وہ کیوں" ؟

"وہ اس ملک کو اپنا وطن نہیں سمجھتے وہ اس طرح باتیں کرتے ہیں جیسے وہ لندن سے آ رہے ہیں ۔ ان کی حرکات عادات سب انگریزوں کی طرح ہیں ۔ مجھے ان کے رہنے سہنے پر کوئی اعتراض نہیں ۔ لیکن ان کے چہرے مہرے سے تمکنت برستی ہے ۔ غرور کا بے باک سایہ حکومت کا رعب ۔ مجھے یہ بالکل پسند نہیں ۔ ہندوستانی ہو کر ہندوستانیوں سے نفرت کرنا کہاں کی عقلمندی ہے ۔ لیکن ایک بات کے لئے انھیں پسند بھی کرتا ہوں ۔ وہ نہایت صاف اور ستھرے رہتے ہیں ۔ اگر وہ اس ملک کو اپنا وطن سمجھنے لگیں ۔

"مجھے اس پالٹکس سے نفرت ہے ۔ پرماتما کے لئے چپ ہو جاؤ ۔۔۔"

"کیا تمہیں خدا پر یقین نہیں"

"بالکل نہیں۔"

"پھر بھی تم زندہ ہو۔"

"کیا مذہب سے دلچسپی رکھتی ہو۔؟"

"مجھے مذہب سے نفرت ہے۔"

"شاید اسی لئے تم خوش وخرم رہتی ہو۔ ممی! انہیں باتوں کی وجہ سے میں تم کو پسند کرتا ہوں۔ ممی تم اس دفعہ بمبئی نہیں گئیں۔ ہندوستانیوں میں اب نئی تڑپ آچکی ہے وہ ایک نئے عزم کو لے کر آگے بڑھ رہے ہیں۔ اب اس ملک کو کوئی غلام نہیں رکھ سکتا۔ ممی جے ہند کہو۔ نہیں تو سر پھوڑ دونگا۔

"میں نہیں کہتی۔"

"ممی تمہیں کہنا ہی پڑے گا۔ کہو۔" وہ ایک شراب کی خالی بوتل اُٹھاتا ہے۔ اور بوتل مارنے کے لئے ہاتھ بڑھاتا ہے۔

"کہو جے ہند"

"جے ہند مائی سن۔"

"اچھا یہ بوتل رکھ دو۔ ممی سُورج کی طرف دیکھو۔ اس آگ کی طرف دیکھو جو سُورج اُگل رہا ہے۔ یہ سارا کرۂ ارض اس سُرخ روشنی سے جگمگا اُٹھا ہے۔ یہ لانبے لانبے درخت۔ یہ آسمان۔ یہ شفق۔ یہ پہاڑ یہ دریا۔ سب کے سب اس سُرخ روشنی سے جگمگا اُٹھے ہیں۔ کتنا حسین منظر ہے۔ یہ ایک نئی صبح ہے۔ نئی لے۔ نیا گیت۔ یہ آگ اب رک نہیں سکتی اور پھیلے گی۔ اس سرے سے لے کر اُس سرے تک۔

"Dont talk rot"

"دیکھتے نہیں سُورج غروب ہو رہا ہے:

اور دوسرا اُبھر رہا ہے۔ ایک تہذیب مٹ رہی ہے اور دوسری بن رہی ہے۔ ایک قوم مٹ رہی ہے۔ دوسری بن رہی ہے کیا تمہیں یہ دکھائی نہیں دیتا۔

"تم نے بہت پی لی ہے مائی سن:"

"ممی۔ یو۔ آر۔ گریٹ۔ میں جانتا ہوں۔ تم میرے ساتھ ہو۔ میرے قریب ہو۔ آؤ۔ آؤ میرے قریب آؤ۔ اس ٹھنڈے لمس سے مجھے سیراب کر دو۔ جب کبھی تمہارے جسم سے ہمکنار ہوتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی گرم چشمے میں نہا رہا ہوں۔ ممی یو۔ آر۔ واقعی گریٹ۔ آؤ۔ آؤ میرے پاس آؤ

"میں تمہارے پاس ہوں۔

"لیکن اس وقت کے دھارے کو کوئی نہیں مٹا سکتا۔ یہ وقت جو میرے اور تمہارے درمیان ہے۔ یہ وقت کی خلیج یہ بڑھاپے کی لہر۔ جو مجھے تم سے جُدا کرتی ہے۔

"اسی لئے میں تمہاری ممی ہوں۔ یو آر مائی سن۔ لیکن جب شراب پی لیتی ہوں تو تم میرے بیٹے نہیں بلکہ صرف ایک مرد۔ اور میں صرف ایک عورت اور میری ہولناک نگاہیں۔ اندھیرے میں تمہارا مضبوط اور توانا جسم ڈھونڈتی ہیں۔ اِدھر اُدھر جگنوؤں کی طرح بھٹکتی ہیں۔ اور راستہ ڈھونڈتی ہیں۔ اور پھر رشتہ ختم ہو جاتا ہے۔ اور تم میری آغوش میں ہوتے ہو مائی سن۔ یو آر ممی اِز گریٹ دِس ریسپکٹ۔"

"ممی شراب کا ایک اور پیگ لاؤ۔ نہیں تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔ میں مرنا چاہتا ہوں ان لوگوں کے ساتھ۔ ان بچوں کے ساتھ۔ ان عورتوں کے ساتھ جو اس جنگ آزادی میں مارے گئے ہیں، میں واقعی مرنا چاہتا ہوں۔ لیکن میں بزدل ہوں۔ میں نے صرف جے ہند کا نعرہ سنا اور واپس آ گیا۔ لوگ مر رہے تھے۔ آزادی کے لئے، ملک کے لئے۔ اور میں دن بھر شراب پیتا رہا ۔۔ "اور تمہارے جسم کی گرمی سے لذت حاصل کرتا رہا۔ ممی تم میرے لئے افیون ہو۔ ایک نشہ ہو۔ میں مرنا چاہتا ہوں۔ میں واقعی مرنا چاہتا ہوں۔ اپنی قوم کے لئے، اپنے ہندوستان کے لئے۔"

"یہ لو شراب کا پیگ"

"شکریہ ۔ (شراب پی کر) ممی یو آر گریٹ۔ گریٹ۔

"شٹ اپ مائی سن۔ مت بولو خاموش ہو جاؤ۔ اندھیرا بڑھ رہا ہے۔ شراب جسم کی نس نس میں سما رہی ہے۔ مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ ہر طرف اندھیرا اور کچھ نہیں۔ آؤ۔ آؤ۔ میرے پاس آؤ۔ تمہارے بالوں کو چوم لوں۔ تمہارے جوان سڈول بازوؤں کو دیکھ لوں۔ اب میں بوڑھی ہو چکی ہوں بالکل بوڑھی۔ لیکن امنگیں ابھی تک جوان ہے ۔۔ بوڑھے جسم میں خون آہستہ آہستہ دوڑ رہا ہے۔ لیکن یہ شراب۔ یہ شراب۔ یہ تیز و تند شراب "کچھ نہیں آزادی، اور غلامی سب کچھ اس میں غرق ہو جاتا ہے۔ مجھے نزدیک آنے دو۔ یو آر سویٹ۔ یو آر ونڈر فل مائی سن مائی ڈارلنگ"

"ممی کہو جے ہند ۔"

"جے ہند مائی سن"

(دونوں لڑکھڑاتے ہوئے ایک دوسرے سے لپٹ جاتے ہیں۔ اور اندھیرا دونوں کو اپنی آغوش میں لے لیتا ہے)

عزیز قیسی

مہندر ناتھ

وہ جا چکا ہے
اِک اِک چیز اُٹھ گئی اُس کی
وہ ایک کونے میں رہتا تھا پر گیا جب سے
ہر ایک کونے میں رہتا دکھائی دیتا ہے
چمک رہی ہیں در و بام اس کی تحریریں
کہیں پہ نقش ہے اُس کی نگاہ کا پرتو
کھڑی ہوئی ہے کہیں اُس کے پاؤں کی آہٹ
ٹہل رہی ہیں صدائیں یہاں وہاں اُس کی

اُتر گیا ہے وہ دیوار و در کے سینے میں
بکھر گیا ہے مکاں کے ہر ایک ذرّے میں



ریوتی سرن شرما

مہندر ناتھ ۔ ادب اور ایمان

"تم دیوتا ہو"

"نہیں بھائی ۔ میں تو صرف آدمی بننے کی کوشش کر رہا ہوں ۔"

(ایک مکالمہ جو مہندر ناتھ نے خواجہ احمد عباس کی فلم "دھرتی کے لال" میں ادا کیا)

انگریزی ناول نگار ٹامس ہارڈی نے اپنے ناول جیوڈ دی آبسکیور (Jude the obscure) میں ایک کردار لٹل ٹائم جیوڈ کی تخلیق کی، جو اپنے چھوٹے کاندھوں پر بڑا سر لے کر پیدا ہوا ۔ مہندر ناتھ اردو ادب کا لٹل ٹائم جیوڈ تھا ۔

ٹامس ہارڈی کے لٹل ٹائم جیوڈ (Little Time Jude) کی طرح وہ اپنے کاندھوں پر ایک بڑا اور سوچنے والا سر لے کر پیدا ہوا ۔ اس کے ادب کا مطالعہ یہ آخری اثر چھوڑتا ہے کہ مہندر ناتھ نے ادب میں جنم لیتے ہی سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیا اور وہ اس دنیا سے یہی سوچتے سوچتے گیا کہ انسان کو اس کی عزت اور عظمت سمیت، کس طرح زندہ رکھا جائے ۔

یہ بات اپنے میں بہت اہم ہے ۔ بہت سے ادیب، ادب میں آنے کے بہت عرصہ بعد تک "ذہنی بلوغت" حاصل نہیں کر پاتے ۔ لیکن مہندر ناتھ نے ادب میں آتے ہی لوگوں کو چونکا دیا کہ اک نیا ادیب آیا ہے جو تخئیل اور فکر دونوں اعتبار سے اڑان بھرنے کی سکت رکھتا ہے اور اپنے ہم عصروں کرشن چندر، منٹو ۔ بیدی، عصمت اور اشک کے ساتھ پنکھ مار کر ان کے ساتھ ساتھ اونچائیوں پر اڑ سکتا ہے ۔ ان کی طرح وہ سمت، زاویوں اور وسعتوں سے آشنا ہے ۔

اُسی زمانے میں یعنی ۱۹۴۰ء کے بعد کے زمانے میں، کسی نئے ادیب کے لئے لوگوں کو چونکانا ۔ اپنا لوہا منوانا اس لئے آسان نہ تھا کیونکہ ادب ایک نئی ڈگر پر گامزن تھا ۔ محض کہانی لکھنا کافی نہ تھا ۔ کرشن چندر، منٹو، بیدی اور عصمت نے ترقی پسند تحریک کے خدوخال کی لکیریں کھینچ دی تھیں ۔ ترقی پسند ادیب اپنے دور کے ہندوستان کی معاشی، معاشرتی اور سیاسی زندگی کا احاطہ کر رہے تھے اور اس کے ڈانڈے بین الاقوامی زندگی سے بھی ملا رہے تھے ۔ وہ زندگی کے تضاد کو آئینہ دکھا رہے تھے اور اُس کے کُبھ اور بگڑے زاویوں کو خیال کی گنیا سے عیاں کر رہے تھے کہ مہندر ناتھ اپنے تخئیل کا پیراشوٹ لے کر ناپ تول، اور سروے کے علاقے کے بیچوں بیچ اترا ہے ۔ یہ اس کے پہلے افسانے کو پڑھ کر لوگوں نے تسلیم کر لیا کہ ان کے درمیان، ان کے کام کو وسعت بخشنے والا ایک اور ادیب آدھمکا ہے ۔ اور اس نے عمل کے لئے جو جھنڈیاں گاڑھی ہیں وہ صحیح جگہ اور بڑے علاقے میں ہیں ۔ افسانہ "خالی انگلیاں" آزاد تلازمہ یعنی Free Association کی تکنیک میں لکھا گیا تھا ۔ اور اس میں جنسی بے راہ روی سے لے کر بین الاقوامی دھوکہ بازی تک کا ذکر تھا ۔ ایک قنوطی کی طرح مہندر ناتھ نے اس میں ہر چیز کو دیا سلائی دکھائی تھی اور لندن میں ہونے والے ہٹلر کے بموں کے دھماکوں کو ہندوستان میں سنوایا تھا ۔ یہ کرشن چندر کی سماجی انقلابیت اور منٹو کی بےباکی دونوں لئے ہوئے تھا ۔

پھٹ پھٹ۔ دھم دھم۔ کون آیا۔ بم گرا؟ کہاں؟ لندن میں؟ لیکن آواز یہاں آرہی ہے۔ کانوں میں انگلیاں ڈال لو (حنائی انگلیاں سونے کی قاشیں) آزادی۔ لارڈ ایمری کا بیان۔ انڈیا فسٹ۔ کیا کہا؟ خوب کہا۔ تقریر کر رہا ہے۔ چرچل۔ ہم آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں۔ ہم غلامی کو اس دنیا سے مٹا دینا چاہتے ہیں۔ ہم فرانس کو دوبارہ زندہ کرنا چاہتے ہیں۔ ہم لڑیں گے۔ ہر جگہ۔ زمین پر۔ خشکی پر۔ سمندر میں۔ آسمان پر۔ ہم سب کو آزاد کرنا چاہتے ہیں۔ نہیں نہیں میں بھول گیا۔ ہم یورپ کو ہٹلر کے پنجے سے آزاد کرنا چاہتے ہیں۔ کیا یورپ میں ہندوستان بھی شامل ہے؟ خوب زور سے تالیاں پیٹو۔ اختر میاں آزادی مانگتے ہو؟ آزادی مانگنے سے نہیں ملتی۔ کچھ اور مانگو۔ کیا کہا موت؟ ابھی لو۔ اسی وقت لو۔ چلاؤ۔ خوب زور سے چلاؤ۔ ہاں کہو مسجد مندر بن گئی۔ مندر مسجد بن گیا۔ وہ دیکھو سامنے بازار بند ہونے لگے۔ بنئے گھروں میں گھس گئے۔ لاٹھیاں چلنے لگیں۔ پتھر برسنے لگے۔ وہ دیکھو مسجد مندر بن گیا۔ مندر مسجد۔ انڈیا فسٹ مت چلاؤ۔ آزادی ہٹلر کے بعد۔ اور موت؟ ابھی لے لو۔ اسی وقت۔ جب جی چاہے۔　　(حنائی انگلیاں)

اس کہانی میں مہندر ناتھ قنوطی ہے۔ ایک مسخ، ٹیڑھی میڑھی، غلط اصولوں پر چل رہی دنیا کو سدھارنے یا نئے سرے سے بنانے کا نہیں بلکہ اسے ڈائنامیٹ سے اڑا دینے کا جذباتی ردعمل ہے۔ لیکن یہ مہندر ناتھ کی پہلی کہانی ہے۔ تجربہ نے، ترقی پسند تحریک سے وابستگی نے، مارکسی فلسفہ کے مطالعے نے مہندر ناتھ پر واضح کر دیا کہ ایسا کرنا ممکن نہیں۔ یہ سماج ایک پیچیدہ عمل ہے خود آدمی کی اپنی ذات اور اس کے عمل سے نکلا ہے۔ چیز کو توڑا جا سکتا ہے مگر آدمی کی دنیا "چیز" نہیں ہے۔ وہ مکڑی کے منہ سے نکلا لیس اور کوئے کے دہانے سے نکلا ریشم ہے اور یہ مکڑی اور یہ کویا خود آدمی ہے۔ جب تک آدمی کو نہیں سدھارا جائے گا، یہ نظام نہیں سدھرے گا۔ اور آدمی کو سدھارنا سب سے زیادہ مشکل ہے۔ اس کے لئے قدروں کا احساس چاہیئے۔ اپنی خوبصورت کہانی "روشنی اور تاریکی" میں مہندر ناتھ نے اس عمل کا پہلا احساس اور تجربہ کیا۔ کہانی کا ہیرو۔ محبت، جسم کی مانگ اور رضامندی کے باوجود ہیروئن کو نہیں چومتا۔ بانہوں میں آنے کے لئے بے تاب۔ کپلا کو بانہوں میں لے کر اپنے جذبہ کی تسکین کرنے کے بجائے اسے جانے دیتا ہے۔

"امانت۔ امانت ہی ہوتی ہے۔ اگر کپلا چچی کی امانت ہے تو میری بھی امانت ہے۔ اس میں خیانت کرنے کا مجھے کوئی حق نہیں۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے تو کون ذمہ دار ہوگا؟ شادی کرنے سے تو میں رہا۔ یہ کپلا بھی جانتی ہے کہ وہ مجھ سے شادی نہیں کر سکتی۔ درمیان میں چچی حائل ہے۔ چین کی دیوار کی طرح۔۔۔ انگنت صدیوں کا تعصب اور جہالت راستہ روکے کھڑی ہے۔ چچی کے پیٹ میں درد ہے۔ اسے امرت دھارا چاہیئے۔ لیکن مجھے امرت دھارا مل رہی ہے۔ میری روح کو بھی ایذا پہنچ رہی ہے۔ لیکن میرے لئے امرت دھارا امانت ہے۔ پھر بجلی زور سے چمکی۔ اور میرے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ چچی درد سے کراہ رہی ہے۔ اس خیال کے آتے ہی میں باہر نکل گیا۔ اور سیدھا چھت پر چلا گیا اور دیوار کے ساتھ لگ گیا اور اندھیرے کی لہروں کو اپنے اندر جذب کرنے لگا۔ نیچے والے مکان میں کسی نے بتی جلائی۔ روشنی اور اندھیرا۔ کیا کبھی بالکل گھپ اندھیرا۔ چاروں طرف اندھیرا نہ ہوگا یا بالکل روشنی ہو جائے۔ چاروں طرف روشنی اور اندھیرا کبھی نہ ہو۔ کہیں نہ ہو؟"

مہندر کی یہ سوچ، اندھیرے اجالے کا یہ احساس، مہندر ناتھ کا طرۂ امتیاز ہے۔ زندگی اپنی نعمتیں اس کے پاس لے کر آئی۔ لیکن عین وقت پر، سوچ اور اقدار کا احساس اس کے سامنے آکھڑے ہوئے۔ یہ سوچ اور یہ احساس "اخلاقی" نہیں ہیں۔ یہ خالص انسانی ہیں۔ اور اس باریک بین اور دور بین نگاہ سے پیدا ہوتے ہیں جو سطح پر نہیں رکتی۔ ایکسرے کی برقی لہر کی طرح انسان اور معاشرے کے ڈھانچے کی اصل صورت اس کے سامنے لا کھڑی کر دیتی ہے۔ افسانے "برف" میں یہی ہوتا ہے۔ وہ جسم کا بھوکا ہے۔ عورت روٹی کی بھوکی ہے۔ سودا دو روپے میں طے ہوتا ہے۔ عورت بے حیل و حجت اس کے بستر پر آجاتی ہے۔ رکاوٹ کوئی نہیں ہے۔ مگر وہ عورت کو قبول نہیں کرتا کیونکہ قدر کا قائل ہے۔

"اس نے گلاب کے لبوں کو چوما۔ گلاب کے لب ٹھنڈے تھے۔ اور اندر کی طرف بھنچے ہوئے تھے۔ یکایک وہ ٹھٹک کر پرے ہو گیا۔

"گلاب" اس نے کپکپاتی ہوئی مایوس آواز میں کہا۔

"بابو۔" اور گلاب کی آنکھیں جھک گئیں اور گلاب کے لب پھر ایک دوسرے سے پیوست ہو گئے۔

گلاب کے ٹھنڈے لمس نے اس کے ذہن کو بیدار کر دیا۔ گلاب کے شرمیلے احساس نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ گلاب بستر پر ننگی

لیٹی ہوئی تھی ـــــ جیسے وہ کہہ رہی ہو ۔ مجھے اس کام سے کوئی واسطہ نہیں ۔ کوئی سروکار نہیں ۔ لیکن میں انکار بھی نہیں کرتی ۔ یہ عجیب بات ہے کہ کسی کام سے تعلق بھی نہیں واسطہ بھی نہیں اور پھر کسی بات سے انکار بھی نہیں ۔ لیکن جس بات نے اس کے ذہن کو بیدار کیا وہ عورت کا سرد لمس تھا ۔ کیا عورت کا جسم سرد ہوتا ہے ۔ اس نے زندگی میں پہلی بار عورت کو چھوا تھا لیکن کتنا تلخ تجربہ تھا ۔ اس کا جسم کیوں انگارے کی طرح جل رہا تھا ۔ اسے اپنے آپ پر غصہ آیا ۔ اس ننگی عورت پر غصہ آیا ۔ جس نے اس کے تخئیل کو پارہ پارہ کر دیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کمرے میں اندھیرا کیوں ہے ۔ یہ میلے اور بوسیدہ کپڑے کس کے ہیں ۔ ان میں سے بدبو کیوں آرہی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ عورت لیٹی کیوں ہے ؟ یہ بولتی کیوں نہیں ؟ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ بستر پر ساکت اور غیر متحرک ہو کر رہ گئی ہے کیا وہ اس عورت کو گھر میں رکھ لے ـــــ ٹرنکوں کی طرح ۔ بوتلوں کی طرح ۔ چھتری کی طرح ۔ کیا یہ عورت ایک چادر ہے ۔ ایک غلاف ہے ۔ ایک ٹرنک ہے ؟"

عورت چادر یا ٹرنک نہیں ہے ۔ یہ جذباتی یا جنسی رد عمل نہیں ہے ۔ یہ فکری عمل ہے جو مہندر ناتھ کے ادب میں شروع سے غالب ہے مہندر ناتھ کی زندگی بھی اسی عمل کی تابع تھی ۔ وہ ایک اچھے خاندان میں پیدا ہوا ۔ قدرت نے اُسے مردانہ حسن سے مالامال کیا ۔ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی عشق کی نعمت نصیب ہوئی ۔ ایک دولتمند اور شریف خاندان کی خوبصورت لڑکی کملا نے اس سے عشق کیا ۔ گھر والے شادی کو تیار تھے پانچ سال یہ رشتہ رہا ۔ لیکن مہندر ناتھ نے نہ عشق کی ذمہ داری قبول کی نہ شادی کی ۔

روشنی کا مینار

یہ جذباتی فیصلہ نہ تھا ۔ یہ مہندر ناتھ اور اس کے ادب ، دونوں کے لئے تاریخی فیصلہ تھا ۔ مہندر ناتھ عام انسان کی کلرکی کرتا ۔ دو وقت روٹی کھانے اور بچے پیدا کرنے کی زندگی چھوڑ کر چلا آیا ۔ اور ادب میں روشنی کے منارہ کی تلاش کرنے لگا ۔ دراصل روشنی کے منار کی تلاش مہندر ناتھ کی زندگی اور اس کے ادب کا ابتدائی ، مرکزی اور آخری نقطہ ہے ۔ اسی تلاش کی وجہ اور ضرورت "چاندی کے تار" میں درج ہے ۔ یہ افسانہ مہندر ناتھ کا سب سے اہم افسانہ ہے ۔ کیونکہ اس میں اس کے ادب کو سمجھنے کی کنجی ہے ۔ یہ اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ مہندر ناتھ ادب میں سوچتے ہوئے داخل ہوا اور یہ سوچ ایک نیا رنگ لئے تھی ۔

" اکثر میں سوچتا ہوں ۔ میں کیا چاہتا ہوں ۔ میں کیوں پریشان ہوں اور دھیرے دھیرے مجھ پر یہ بات عیاں ہونے لگی کہ مجھے کلرکی سے نفرت ہے ۔ اُن ساٹھ روپوں سے نفرت ہے ، مجھے انسانوں کی کمینگی سے نفرت ہے ۔ کیونکہ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے ۔ چھتوں پر اندھیرا ۔ برتنوں پر اندھیرا ۔ چولہوں پر اندھیرا ۔ روٹیوں پر اندھیرا ۔ دھیرے دھیرے یہ اندھیرا پھیلتا جاتا ہے ۔ کائنات کے ذرے ذرے پر چھاتا جاتا ہے ۔ انسان کی رگ رگ میں سماتا جاتا ہے ۔ دھیرے دھیرے مجھے اس نظام سے نفرت ہونے لگی ۔ جہاں اندھیرا پھیلا رہتا ہے ۔ کیوں نہ میں اس اندھیرے کو چیر دوں ؟ کیوں نہ اس اندھیرے کے لبادے کو پھاڑ دوں ۔ تاکہ روشنی کی صبح پھوٹ پڑے ۔ اور ان چھوٹے چھوٹے کمروں میں بھی روشنی کی ایک آوارہ کرن پہنچ جائے جہاں ایک شوہر ، ایک بیوی اور بہت سے بچے ہوتے ہیں ۔ اور کلرکی کے ساٹھ روپے ہوتے ہیں ۔ جہاں عورتیں شادی ہوتے ہی بوڑھی ہو جاتی ہیں ۔"

(چاندی کے تار)

" کبھی کبھی تمہاری سنہری آرزوؤں کا جال میرے قریب آجاتا تو میرے صبر کے بند ٹوٹ جاتے اور میں سوچتا کہ مجھے کیا غرض ہے کہ میں اپنے آپ کو یوں برباد کروں ۔ ازل سے لے کر ابد تک یہ اندھیرا چھایا ہوا ہے اور آج تک کوئی شخص اس اندھیرے کو دور نہ کر سکا ۔ بلکہ یہ اندھیرا دن بدن زیادہ ہوتا جا رہا ہے ۔ اور میں روشنی کے اس مینار کو پانے کی بے سود کوشش کر رہا ہوں ۔ کیوں نہ میں اپنے آپ کو اندھیرے کے اس بے پایاں سمندر میں پھینک دوں ۔ اور ہمیشہ کے لئے غرق ہو جاؤں ۔ اور پھر اس اندھیرے میں تمہارے ہونٹ چمکنے لگتے ۔ تمہارے لانبے لانبے بال ، سر سے لے کر پاؤں تک چھا جاتے ۔ تمہاری آنکھوں میں سنہری آرزوئیں جھانکنے لگتیں اور میں انہیں پکڑنے کی کوشش کرتا ۔ تاکہ تمہارے سیاہ بالوں میں اپنے کو چھپا لوں ۔ اور تمہاری آتشیں خواہشیں مجھے چاروں طرف سے گھیر لیں اور ہم دونوں اس اندھیرے سمندر میں باقی لوگوں کی طرح لڑھکتے رہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن میں نے سگریٹوں کی ایجنسی لے کر شادی کرنا گوارا نہ کیا ۔

شاید مجھے عام آدمیوں کی طرح زندگی بسر کرنے کی آرزو نہ ہوئی ۔ بلکہ مجھے ان لوگوں سے نفرت ہو گئی ہے اور اس طرز بود و باش سے

اس معاشرے سے۔ اس تہذیب و تمدن سے۔ میں روشنی کے مینار کو پانا چاہتا ہوں اور اس کی نورانی کرنوں کو دنیا میں بکھیرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ اس پھیلے ہوئے بے پایاں اندھیرے میں کچھ کمی آجائے۔
(چاندی کے تار)

مہندر ناتھ مادی تہذیب کے ارتقائی عمل سے واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سامنتی سماج کو صنعتی سماج کھا لے گا۔ سامنتی سماج خود پچھڑا ہوا سماج تھا اور انسان کی پیٹھ پر سوار ہو کر چلنے والا سماج تھا۔ اس کے ہاتھ غریب اور بھولے بھالے انسانوں کی لوٹ کھسوٹ اور ان کے خون سے رنگے تھے۔ اس لئے مہندر ناتھ نے اس سے ناطہ توڑ لیا۔ اور نہ کلرکی لی اور نہ محبوبہ اور نہ سگریٹوں کی ایجنسی۔ وہ روشنی کے مینار کی تلاش میں لاہور، دلی، لکھنؤ اور پونا ہوتا ہوا بمبئی پہنچا۔ یہاں اسے صنعتی نظام کی برکتیں میسر ہوئیں۔ وہ ہیرو بن گیا۔ "سرائے کے باہر"۔ اور "راکھ" نام کی فلموں میں کام کیا۔ روپے کمائے۔ سرمایہ دارانہ نظام کے عیش و آرام کی جھلک دیکھی۔ لیکن جلد ہی اس نظام نے اپنا اصلی روپ دکھایا۔ مہندر ناتھ اور اس کے ساتھیوں کو پٹخنی دی۔ فلمیں ناکامیاب ہوئیں۔ جو کمایا تھا وہ بچا کر نہ رکھا۔ بھوک اور بیکاری سامنے آکھڑے ہوئے۔ مہندر ناتھ کے گھر کے کسی فرد نے وہ ذہنی اذیت پہنچائی کہ پاگل ہوتے ہوتے بچا۔ اندھیری سے بھاگ کر ایک مراٹھی لڑکی درگا دیوی کے پاس دادر آیا۔ اس لڑکی میں انسانیت کے گن تھے۔ مہندر ناتھ اس کے پاس ٹھہر گیا۔

دوسرا دور

لیکن یہ لڑکی غریب تھی، ایک بے پڑھے لکھے خاندان کی تھی۔ ماں باپ، بہنیں، رشتہ دار سب غربت کی لعنتوں میں لتھڑے تھے۔ جس بلڈنگ میں آکر رہا (چھپرا بلڈنگ) اس میں بھی غریب لوگ رہتے تھے۔ ان کی معرفت مہندر ناتھ نے صنعتی شہر اور سرمایہ دارانہ نظام کا اصل روپ دیکھا۔ اس کی افسانہ نگاری اور ناول نگاری کا دوسرا دور شروع ہوا۔

یہ دور پہلے دور سے الگ نہیں ہے۔ یہ صرف اس کی تصدیق اور توسیع ہے۔ پونچھ سے بمبئی تک کے سفر نے مہندر ناتھ کو جو سکھایا وہ عین مین وہی تھا جس کا ادراک اس نے "چاندی کے تار"۔ "دو بیل"۔ "برف"۔ "اکیلا"۔ "حنائی انگلیاں" میں کیا تھا۔ صرف یہاں وہ عمل شدید اور تیز ہو گیا تھا۔ "مجھے خرید لو" میں اس نے ایک باوفا گھریلو بیوی کی آنکھوں میں زندگی کی یک رنگی یا بے رنگی سے بچنے کے لئے "بکنے" کی موہوم سی چمک دیکھی تھی۔ لیکن بمبئی کی صنعتی دنیا میں اس نے خود کو یا پورے خاندان کو بھوک یا بیماری سے بچانے کے لئے عورت کے خود یا اپنوں کے ہاتھوں بکنے کے عمل میں ایک باقاعدہ "فن" کے روپ میں پنپتے دیکھا۔ "ایک دو تین چار"۔ "زندگی چاندسی عورت کے سوا کچھ بھی نہیں"۔ "ایک بار۔ اور صرف آخری بار"۔ "۵۵۵"۔ "گاڈ بلیس یو"۔ "راز"۔ "جونکیں"۔ "بدلہ"۔ یہ افسانے جسم فروشی کے جنسی افسانے نہیں ہیں۔ کچھ لوگوں نے انہیں "فلمی سماج" کے افسانے کہا ہے۔ یہ بھی غلط ہے۔ دراصل یہ افسانے اس عمل کو دکھاتے ہیں جس سے سامنتی سماج کا آدمی بکھر کر یا ٹوٹ کر صنعتی سماج میں آتا ہے اور اس کی مشینی بے حسی، معاشی چکی میں پس کر اپنی ساری روایتیں اور قدریں گنوا بیٹھتا ہے۔

نیا انسان

اس کی شکل سب سے عمدہ اور جامع و مانع اظہار مہندر ناتھ کا ناول "رات اندھیری ہے" ہے۔ اس ناول میں مہندر ناتھ نے پونچھ کے سامنتی سماج کے انسان کو (جو وہ خود ہے) بمبئی کے صنعتی ماحول کے بیچ رکھ کر اس کی اقدار کی توانائیوں کو پرکھا ہے۔ نوجوان جگدیش پونچھ کے قصبے سے چل کر بمبئی آتا ہے اور یہاں کی زندگی میں اپنی جگہ بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اپنی محبوبہ چھوڑ کر آیا ہے اور وعدہ کر آیا ہے کہ اسے جلد از جلد بلا لے گا۔ لیکن بمبئی آکر اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی قابلیت اور نیکی کی کوئی قدر نہیں۔ وہ ایک 'جنسِ محض' ہے۔ جسے اس کے جسم کی وجہ سے ایک ایکٹریس رانی پسند کر لیتی ہے۔ ٹکڑوں کے لئے وہ بھی اسے پسند کر لیتا ہے۔ لیکن پونچھ سے اس کی محبوبہ کملا آجاتی ہے۔ تجارتی رشتہ بیل گڑبڑ پڑنے لگتی ہے۔ رانی اسے الٹی میٹم دیتی ہے کہ اگر وہ اس سے روپے چاہتا ہے تو اسے کملا کو واپس بھیجنا ہوگا۔ سامنتی آدمی صنعتی دور میں جینے کے لئے اپنی سامنتی محبوبہ کو کھڑکی سے گرا کر مار دیتا ہے اور اس محبت کا خاتمہ کر دیتا ہے جو اسے جذباتی غذا تو دے سکتی تھی لیکن جسم کو زندہ رکھنے والے نقرئی سکے نہیں دے سکتی تھی۔

"محبت کرنا آسان بات ہے۔ بچے پیدا کرنا آسان بات ہے۔ خدمت کرنا آسان بات ہے۔ کسی کا انتظار کرنا آسان بات ہے۔ کھانا پکانا، کپڑے دھونا آسان بات ہے۔ آہیں بھرنا۔ گریہ و زاری کرنا آسان بات ہے۔ لیکن روپے کمانا بہت ہی مشکل ہے۔"

(رات اندھیری ہے)

اسی کی ایک جھلک مہندر ناتھ اپنے پہلے ناول "آدمی اور سکے" میں دکھا چکا ہے۔ اس ناول میں ایک طرح سے مہندر ناتھ نے اپنے اگلے بڑے ناول کیلئے کھونٹیاں گاڑ دی تھیں۔ ماحول بمبئی کا ہے اور انسانی رشتے خالص تجارتی ماحول کی پیداوار۔ ایک عورت حمیدہ کو ایسے لڑکے سے محبت ہے (محبوب علی) جو اس سے محبت نہیں کرتا۔ لیکن محبوب علی کو اس سے محبت کرنا پڑتی ہے کیونکہ وہ اس کے ٹکڑوں پر پلتا ہے۔ حمیدہ کو ایسے آدمی سے محبت کرنا پڑتی ہے جو بدصورت ہے لیکن جس کے ٹکڑوں پر وہ پلتی ہے۔ ناول کے ہیرو کو ایسی لڑکی ملتی ہے جو اپنے خاندان کا پیٹ پالنے کے لئے پیسہ کماتی ہے۔ وہ اس کے ساتھ سونے کو تیار ہے لیکن شادی کرنے کو نہیں کیونکہ وہ اس کے ماں باپ کا پیٹ نہیں پال سکتا۔ اس طرح ہر کردار بکا ہوا اور ٹوٹا ہوا ہے۔

کوئی جذباتی ادیب ہوتا تو صنعتی دور کے خلاف جذباتی بغاوت کر اٹھتا۔ اور پرانے دور کو واپس لانے کی دہائی دیتا۔ لیکن مہندر ناتھ جانتا تھا کہ صنعتی دور آ گیا رہے گا۔ اور انسانوں کو مہاجنی دور کے مظالم اور افلاس سے چھڑانے کے لئے اُسے آنا ہی چاہیے۔ اس لئے اس نے اس ناول میں ایک نیا کردار شامل کیا۔ رومیش کیمونسٹ کا۔ رومیش صنعتی دور کا مخالف نہیں لیکن اس کی "بدعنوانیوں" کا علاج اشتراکیت میں دیکھتا ہے۔ وہ کمیونزم کے فلسفہ میں ایمان رکھتا ہے۔ اور اس کے سامنے موجودہ صورت حال سے بچ نکلنے کا راستہ ہے:۔

"روس کی طرف دیکھئے۔ حال میں چین کے انقلاب کو دیکھئے کہ کس طرح انھوں نے عوام کی کایا پلٹ کر دی۔ بھوکوں اور ننگوں کو کپڑا دیا۔ نوکری دی ملک میں بدمعاشی کو دور کیا۔ اگر روس اور چین اپنے ملک سے بیکاری۔ بدمعاشی۔ عصمت فروشی اور بلیک مارکٹ دور کر سکتے ہیں تو ہم کیوں نہیں کر سکتے؟"

رومیش ایک عورت کی محبت حاصل کرنے کے لئے نہیں، اُس نظام کو بدلنے کے لئے جد و جہد کرتا ہے جس میں عورت، مرد بدمعاشی کرنے جسم بیچنے اور محبت سے محروم رہنے کے لئے مجبور ہوتے ہیں۔ ناول کے آخر میں ناول کا ہیرو محبت میں ناامید ہو کر خودکشی کرنے کے بجائے ایک بہتر نصب العین یعنی مارکسی نظام کے لئے جد و جہد کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔

لیکن "آدمی اور سکے" میں اس بہتر نظام کا ذکر سرسری ہے۔ ایک سطحی سا جذباتی لگاؤ اس سے دکھایا گیا ہے۔ مگر "رات اندھیری ہے" میں مہندر ناتھ نے زندگی کا پورا امرت منتھن کیا ہے اور اس زہر کو پوری طرح اُجاگر کیا ہے جو زندگی کے ساگر میں رس بس گیا ہے۔ اس نے ناول کے شروع میں چنی لال اور کنول لال کے والد کی سوانح کی معرفت دیہاتوں کی لوٹ کھسوٹ اور وہاں مہاجنی نظام قائم ہونے کا عمل دکھایا ہے۔ جگدیش اور اس کے دوستوں کی معرفت اُس جنسی ناآسودگی اور جذباتی گھٹن کا بیان کیا ہے جو ایک پچھڑے روایت پسند سماج میں پیدا ہوتی ہے۔ گو اس نے جگدیش کی ماں، کملا کی ماں اور چنی لال کے کرداروں میں ایثار و محبت۔ خلوص اور وضعداری جیسی انسانی قدروں کو بھی درشایا ہے جو سامنتی نظام کی تاریکی میں روشنی کی کرنیں تھیں۔ جگدیش کو نوکری کی تلاش میں بمبئی بھیج کر اس نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ سامنتی معاشی ڈھانچہ خود کفیل نہیں ہے۔ اس کے کنارے کی ریت کٹ کر صنعتی سماج کے دھارے میں گرنے کے لئے مجبور ہے۔ سماج کے اس بہاؤ کو روکا نہیں جا سکتا۔

جگدیش کو بمبئی لاکر مہندر ناتھ نے بمبئی کے صنعتی سماج کو کھنگالا ہے۔ نرائن اور اس کے ساتھیوں کی معرفت اس نے سرمایہ داروں کی بے حسی۔ بیدردی اور معاشی سازش سے پردہ اٹھایا ہے۔ ہیرا کی سالگرہ کا نقشہ اور اسٹوڈیو میں ایکسٹراؤں کا بیان — ایک تجارتی سماج کی بے راہ روی۔ اوباشی، شکست خوردگی۔ بے اطمینانی اور محرومی کا اظہار ہیں۔

"لوگ کہتے ہیں کہ ہندوستان آزاد ہے۔ لوگ کہتے ہیں آج کل ہمارا نیشنل اینتھم ہے۔ ہمارا جھنڈا ہے۔ ہوگا۔ لیکن ان کو دیکھ کر اور سن کر میری بھوک کم نہیں ہوتی۔ میں نے دیانت داری سے کام ڈھونڈا۔ لیکن کام مجھے نہیں ملا۔ ..... میری عمر ۳۶ برس کی ہے لیکن آج تک میں نے کسی عورت کے جسم کو ہاتھ لگا کر نہیں دیکھا۔ ..... لیکن جنسی بھوک سے زیادہ مجھے پیٹ کی بھوک نے ستایا۔ اور پیٹ کی بھوک سے زیادہ ذلت کے احساس نے۔

"اس نے مجھے کہیں کا نہ رہنے دیا۔ جو مجھے کہتا ہے کہ تم کسی کام کے آدمی نہیں ہو۔ میں اب بھی کام کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن مجھے یقین ہو گیا ہے کہ اس قسم کی آزادی کے تلے میں ہمیشہ بیکار رہوں گا — یہ چار گز لمبی کھولی — یہ چار گز کی قبر، جہاں ایک نہیں چار آدمی سوتے ہیں.... اس میں بے کاری ہے.... بھوک ہے.... موت ہے۔ اس سے نکل بھاگو — یہاں سے نکلو..... آگے بڑھو..... یہاں مر جاؤ گے.... کوئی نہیں پوچھے گا۔ اس اندھیرے سے نکلو۔"

(رات اندھیری ہے کا کردار — سونی)

صوفی کی خودکشی کے بعد جگدیش کو ایک فلم ایکٹریس ملتی ہے۔ جو اسے "مرد طوائف" کے طور پر اپنے پاس رکھتی ہے۔ اس عورت سے روپے حاصل کرتے رہنے کے لئے وہ اپنی محبوبہ، اپنی بیوی کا قتل کر دیتا ہے۔ جگدیش کا اپنی محبوبہ کملا کو نیچے گرا کر مار دینا زندگی کے تجارتی تقاضوں کی بہیمیت کی معراج ہے۔ یہ تقاضے انسان کو کیا سے کیا بنا دیتے ہیں۔ اس میں کیا تضاد پیدا کرتے ہیں۔ اس کا ہولناک بیان رات اندھیری ہے کے صفحات پر رقم ہے۔

"لاش ملنے کے بعد جگدیش اور اس کے دوستوں نے کملا کو آگ کے سپرد کر دیا۔ جو کام اسے کرنا تھا اس نے کر ڈالا..... لیکن اس نے یہ کیا کر ڈالا۔ وہ کیا کرنے اور کیا بننے آیا تھا اور کیا بن گیا؟ اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ اس نے یہ قتل کیسے کر دیا۔ وہ تو صوفے پر بیٹھا تھا۔ وہ کون تھا جس نے اسے ترغیب دی تھی کہ موقع ہے۔ دھکا دیدو۔ اس نے کملا کو مار دیا لیکن وہ مری نہیں ہے وہ زندہ ہے... یہ اس کے بال ہیں یہ اس کے ہونٹ۔ یہ اس کا پیٹ۔ یہ اس کی شلوار۔ یہ اس کی ٹانگیں۔ یہ اس کے پاؤں — وہ مری کہاں ہے۔ وہ مارنے کے بعد بھی زندہ رہے گی۔ ہا ہا ہا — ایک شور سنائی دیا۔ جیسے ڈھول پیٹے جا رہے ہوں۔ اور شور بڑھتا چلا آ رہا ہو..... شاید کسی شیر کا شکار کیا جا رہا ہے ڈھول پیٹ کر، شور مچا کر شیر کو مچان کی طرف لایا جا رہا ہے۔ شیر مجبور ہو کر مچان کی طرف آ رہا ہے۔ شیر مچان کے سامنے آ گیا۔ بندوق کی نال نے اس کی کنپٹی کا نشانہ لیا اور "ٹھائیں" چیخ مار کر جگدیش نے دونوں ہاتھوں سے سر کو پکڑ لیا — وہ چیخ کر باہر نکل گیا..... وہ چلتا گیا..... چلتا گیا۔ وہ صبح سے چل رہا تھا، اسے کچھ علم نہ تھا کہ کہاں جا رہا ہے۔ کیا کر رہا تھا۔ بس وہ چلا جا رہا تھا۔ دھوپ میں چلا جا رہا تھا۔ چھاؤں میں چلا جا رہا تھا۔ فٹ پاتھ پر چلا جا رہا تھا۔ ریسٹوران میں بیٹھے بیٹھے چلا جا رہا تھا۔ بس اسٹاپ پر کھڑے کھڑے چلا جا رہا تھا۔ اور لوگ بھی چلے جا رہے تھے۔ اور عمارتیں اور سڑکیں بھی چلی جا رہی تھیں۔ آج سب چیزیں چلی جا رہی تھیں — کیوں — کس لئے؟ — کہاں کو؟......

وہ ہیرا کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس نے ہیرا کو بتا دیا — "میں نے صرف روپے حاصل کرنے کے لئے کملا کو مار دیا۔ ان چند حقیر سکوں کے لئے، جن کا منبعِ اعظم تم ہو۔ ہیرا مجھے تم سے نفرت ہو گئی۔"

"اس دنیا میں انسان جینے کے لئے کیا کچھ نہیں کرتا۔ میں نے اپنا جسم بیچ دیا۔ اپنا ضمیر بیچ دیا۔ اپنی عزت بیچ دی اور اس کے عوض جو ملا، وہ تمہیں دے دیا۔ آؤ میں تمہیں اپنے سینے سے لگا لوں اور اس نفرت کو چوس لوں جو تمہارے چاند سے چہرے کو گھنائے ہوئے ہے۔"

ہیرا نے اپنی بانہیں جگدیش کی طرف پھیلا دیں۔

جگدیش نے ان بانہوں کی طرف دیکھا۔ ان چھاتیوں کی طرف، دیکھا جن کا زیر و بم اسے اپنے اندر مدغم ہونے کی دعوت دے رہا تھا ہیرا اپنے گداز اور خوبصورت جسم کی طاقت آزما رہی تھی۔ لیکن وہ کیا ہے؟ اس نے ایک عورت کا، اپنی محبوبہ کا خون کر دیا اور اب ان بانہوں کو دیکھ رہا ہے۔ ان چھاتیوں کے گداز ابھاروں سے محظوظ ہو رہا ہے؟ وہ واقعی انسان نہیں یا اب انسان نہیں رہا، یا بنیادی طور پر اس کی انسانی شخصیت میں کوئی خامی آ گئی۔ وہ ایک جانور ہے کتّے کی طرح۔ سور کی طرح۔ اور ہیرا؟ یہ عورت نہیں۔ اس میں ممتا نہیں۔ قربانی کا جذبہ نہیں۔ یہ محض ہوس ہے، خالص شہوانیت ہے — مجسّم حیوانیت ہے۔"

لیکن مہندر ناتھ سماجی ارتقا کے شعور کا احساس رکھتا ہے وہ جانتا ہے صنعتی سماج ارتقا کی اگلی سیڑھی ہے۔ اس لئے وہ اس

سماج کے خلاف کچھ نہیں کہتا۔ وہ موجودہ صورت حال کو ارتقاتی دور کی عبوری لعنتیں (Transition ills) مانتا ہے اور گھڑی کی سوئیاں الٹی پھیرنے کے بجائے ان سے نبٹنے کے لئے ایک نئے انسان، ایک نئے طبقے اور ایک نئے نظام کی تشکیل میں معاون ہوتا ہے۔

وہ مزدور نیتا نرائن کی تخلیق کرتا ہے۔ وہ مارکسی نظام حیات پر ایمان لاتا ہے۔ اس نظام کو لانے کی کوشش میں نرائن مارا جاتا ہے لیکن مہندر ناتھ ایک حیات افروز تصور کو پالیتا ہے۔ وہ زندگی۔ زندگی اور موت، موت موت کا فرق پہچان پاتا ہے۔ جو بہت بڑا فرق ہے۔ جو روشنی اور تاریکی کا فرق ہے۔ جو اندھیرے میں جیتے چلے جانے اور روشنی کا منارہ پالینے کے لئے قدم اٹھانے کا فرق ہے۔

"یہاں اس شہر میں اگر سب مرچکے ہیں۔ وہ گاؤں میں رہتے تو بھی مرجاتے۔ صوفی مرگیا۔ اس نے خودکشی کرلی۔ نرائن مرگیا اس نے پولس کی گولی کھائی۔ میں بھی مرجاؤں گا۔ سولی پر چڑھ کر۔ لیکن موت۔ موت میں فرق ہوتا ہے۔ نرائن کی موت، میری موت۔ یہ صوفی کی موت سے جدا ہے۔ اعلیٰ ہے۔ عظیم ہے۔ اس کی موت بھگوڑے کی موت نہیں۔ ڈٹ کر مقابلہ کرنے والے کی موت ہے۔ یہ موت زندگی سے بڑی ہوتی ہے کیونکہ یہ زندگی کی حفاظت کے لئے ہوتی ہے۔ یہ موت زندگی کو ختم نہیں کرتی۔ اس کی آبیاری کرتی ہے"۔　　(رات اندھیری ہے)

موت

مہندر ناتھ کے ادب میں موت کا ذکر آتا ہے۔ دراصل جینے کی کوشش میں مہندر ناتھ مرنے سے پہلے بہت بار مرا۔ اس نے بہت سے تجربے کئے۔ اپنے کو طرح طرح کی موت کی کٹھالی میں ڈالا۔ کبھی خودکشی کی (سورج۔ ریت اور گناہ) کبھی پھانسی کھائی (رات اندھیری ہے) کبھی تیرتھ اور نرائن جیسے کرداروں کو موت کے تیزاب میں ڈبا کر دیکھا۔ تپ دق میں تو اس کے کردار مرتے ہی رہے۔ مہندر ناتھ خود بھی موت کے کمپلیکس میں گرفتار رہا لیکن بنیادی طور پر مہندر ناتھ زندگی کا ادیب ہے۔ اس کی کہانیوں یا ناولوں میں جو کردار مرتے ہیں۔ وہ یا تو معصوم ہیں یا انحطاط پذیر یا پھر اشتراکی۔ وہ انسان یا خدا کے آگے انسان کی بے بسی یا زندگی کی بے ثباتی یا کسی تاریک فلسفہ کے مظہر نہیں ہیں۔ وہ اقتصادی اور سیاسی استحصال اور جدوجہد کے عمل کی طرف اشارہ کرتے ہیں، جو زندگی کو موت اور موت کو زندگی میں بدل دیتا ہے۔ مہندر ناتھ موت کو بھی زندگی کی 'آبیاری' کا عمل بنانا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے انسان کسی نصب العین کے لئے مرے تاکہ مادہ منتشر ہونے پر بھی انسانی سماج کی زندگی پرور تنظیم میں معاون ہو۔ کم ادیب ملیں گے جو زندگی کے ساتھ اتنے بندھے ہیں۔ اس سے اتنی تعمیری محبت کرتے ہیں۔

انسانیت پرستی

مہندر ناتھ بنیادی طور پر انسانیت پرست، ادیب تھا۔ اسے انسان سے بہت محبت تھی۔ جہاں بھی انسان کا درد دیکھا، وہاں رویا۔ جہاں بھی انسان کی عظمت دیکھی، اس کے آگے سر جھکایا۔ اپنے اولین دور کے افسانے "دو بیل" میں اس نے دیکھا بیل گاڑی چلانے والا احمد خود ایک بیل تھا جس کی حالت اس کے بیمار بیل سے بدتر تھی، وہ تڑپ اٹھا ـــ "کیا اس دنیا میں ایسا اسپتال نہیں جہاں ان انسانوں کو داخل کیا جا سکے جن پر ظلم کیا جا رہا ہے؟"۔ "بمبئی میں اس نے ایک بھکاری کو سردی اور بھوک سے مرتے دیکھا اور وہ خدا سے منکر ہو گیا۔" "میں نے سوچا گھر جاکر ماں کو بتاؤں گا کہ اگر غریبوں کے پاس سوئیٹر نہیں تو کیا ہوا۔ ان کا خدا تو ہے، جو انھیں سردی اور طوفان سے بچاتا ہے .... لیکن اچانک مجھے محسوس ہوا میرے سینے میں کسی نے خنجر گھونپ دیا ـــ ابھی میونسپلٹی کی گاڑی آئی تھی اور گداگر کی لاش کو اٹھا کر لے گئی؟ اور میرے منہ سے نکلا۔ "خدا نہیں ہے۔ اگر خدا ہے تو الٰہی یہ تیری برکت ہے؟ یہ کیسی برکت ہے؟"

(ایک ادھ چھلا سنترہ اور ایک ڈبل روٹی کا ٹکڑا)

افسانہ "پھر کوئی نہیں آئے گا" انسانی دردمندی کا کلاسیکل افسانہ ہے۔ "رسم الفت" ایک مثالی انسان کی داستان ہے جسے وہ ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کرتا ہے ـــ "کیلاش تمہارا کلیجہ بھی پتھر کا تھا۔ کیا رسم الفت یوں نبھاتے ہیں کہ فرشتے بھی اس راہ پر نہ چل سکیں؟" "اگر میں مرجاؤں تو" خاموش انسانی محبت کی کہانی ہے۔ "جہاں میں رہتا ہوں" "دکھ اٹھاتی انسانیت کا امر افسانہ ہے۔

"سہارا" ایک بہت اہم افسانہ ہے۔ اس میں ایک مرد اور عورت ایک حرامی اولاد کو قبول کرنے کے لئے نہ صرف مجبور ہیں بلکہ اسے سماج اور خلا۔ دونوں کا دیا، جینے کا واحد "سہارا" ماننے پر مجبور ہیں۔

ڈنڈا مارنے کے لئے وہ بچے کی طرف بڑھا ۔ "حرامی"

تارا نے چیخ ماری ۔ "اسے مت مارئیگے۔ یہ بیٹا نہ تیرا ہے نہ میرا۔ اسے تو اوپر والے نے بھیجا ہے ۔ میرے اور تمہارے بڑھاپے کا سہارا۔" (سہارا)

دی بلیو پرنٹ (The Blue Print) کو میں افسانہ نہیں مانتا۔ اسے میں انسانیت کا مینی فیسٹو۔ اور اس کا نوحہ مانتا ہوں اس میں ایک مرا ہوا انسان اور ایک جی رہا انسان ہے۔ جی رہے انسان کو مرے ہوئے انسان کے ہاتھوں میں سے ایک بلیو پرنٹ یعنی زندگی کا خاکہ ملتا ہے۔ خاکہ میں ایک خوبصورت زندگی کے ماحول اور پروگرام کا تفصیلی رنگ اور رس میں ڈوبا بیان ہے۔ اس خاکے میں جن آرزوؤں اور سپنوں کا ذکر ہے اگر وہ آدمی جیتا رہتا تو بھی پورے نہ ہوتے۔ کیونکہ ہمارے یہاں وہ نظام ابھی نہیں آیا جو انسان کے جمالیاتی شعور اور خوبصورتی کی پیاسی روح کی ان تمناؤں کو پورا کر سکے۔ جس دن ہمارا سماج ایک نیک اور ایماندار آدمی کو ایسی زندگی دے پائے گا، وہ ہمارے اور مہندر ناتھ کے سلام کا مستحق ہوگا۔ لیکن جب تک وہ نہیں دے پاتا مہندر ناتھ کی یہ مانگ اس زندگی میں اور زندگی کے بعد عاقبت میں بھی انسانی سماج کے معماروں کا دامن کھینچتی رہے گی۔

"میں یہ سب باتیں اس لئے لکھ رہا ہوں کہ یہ شخص عین جوانی میں مر گیا۔ یہ صرف ایک شخص کی موت کی داستان نہیں ہے۔ اس موت میں میری موت بھی شامل ہے لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کی موت شامل ہے۔ کیا کوئی ایسا نظام نہیں جس میں ہر بلیس لال کی خواب گاہ بن سکے جس کا ذکر اس بلیو پرنٹ میں کیا گیا ہے؟" (دی بلیو پرنٹ)

اس طرح مہندر ناتھ اردو کا ایک اہم سیاسی افسانہ نگار اور ناول نگار ہے۔ اس نے انسانی کردار اور انسانی معاشرے دونوں کا گہرا مشاہدہ کیا ہے اور اس طرح اس تضاد اور اس انحطاط کا سبب بیان کیا ہے۔ جس میں نہ صرف کل کا بلکہ آج کا ہندوستان گرفتار ہے۔

"ہر شخص سب سے پہلے اپنے بارے میں سوچتا ہے۔ وہ خود بھوکا ہوتا ہے تو دوسروں کو بھوکا سمجھتا ہے۔ جب اس کی بھوک مٹ جاتی ہے تو وہ کہتا ہے ۔ "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" (پتھر کے بت)

"شروع ہی سے مجھے انقلاب لانے کا چسکا لگا رہا۔ انقلاب ہم نہ لا سکے۔ اب بس ہم دوسروں کو اکساتے ہیں کہ تم انقلاب لاؤ...... ہم تماشائی کی حیثیت سے اُسے دیکھیں گے۔ (سورج۔ ریت اور گناہ)

"غربت میں پیار کا نی سستا ہو جاتا ہے۔ جیب میں روپے نہ ہوں تو سوائے پیار بانٹنے کے آدمی کیا کر سکتا ہے"

"تم نرے چغد ہو۔ تم صرف بھائی بننے کے قابل ہو اور کچھ نہیں۔ میاں انقلاب صرف دیواروں پر اشتہار لگانے سے نہیں آتا، اور محبوبہ محض سعادت مندی سے ہاتھ نہیں آتی۔ دونوں میں عمل کی ضرورت ہے اور تم میں عمل کا فقدان ہے۔ (بھائی جان)

"یہاں سے وہاں تک پہنچنے کا فاصلہ تو زیادہ نہیں۔ لیکن اس درمیانی فاصلے کو کیسے اور کیوں کر طے کیا جائے، شاید اسی پر انسانی زندگی کے عروج اور ارتقار کا دارومدار ہے۔ (یہاں سے وہاں تک)

"ان لوگوں کو ہوا کیا ہے؟ یہ خاموش کیوں ہیں؟ ہم تو انقلاب کے نقیب تھے۔ ہم میں سے بہت سے گولی کھا کر مر گئے۔ کچھ فاقوں کی تاب نہ لا کر چلتے بنے۔ کچھ زیادہ شراب پی کر راہی ملکِ عدم ہوئے۔ کچھ ایک فلیٹ اور کار لے کر مر گئے۔" (پتھر کے بت)

بنیادی درد

مہندر ناتھ کا سب سے بڑا درد یہی ہے۔ وہ آدمی کو یوں آدمیت سے گرتے نہیں دیکھ سکتا۔ اپنے اگلے ناول "سورج ریت اور گناہ"

میں اس کا ایک دردناک فقرہ ہے ـــ "میں ساری دنیا کی بربادی دیکھ سکتا ہوں لیکن انسان کی بربادی مجھ سے نہیں دیکھی جاتی۔" مہندرناتھ کی ہر کہانی اور ہر ناول انسان کی بربادی کی کہانی ہے۔ اپنے ناول "سورج، ریت اور گناہ" ایک بار پھر سوانحاتی ہے اور اس درد کا بیان ہے جس میں سے مہندرناتھ خود دانتے کی طرح گھٹنوں گھٹنوں نہیں، گلے گلے تک ڈوب کر گزرا ہے۔ اس کا ہیرو ہری پھر ایک بے کار نوجوان ہے جو شخصیت اور قابلیت کے باوجود بیکار ہے کیونکہ عزت، خودداری اور اقدار کے معاملے میں سمجھوتہ نہیں کر پایا ہے۔ ایک ڈاکومینٹری بنانے کے سلسلے میں ایک چھوٹا سا کام ملتا ہے شوٹنگ کرنے بمبئی کے پاس ایک جگہ جاتا ہے۔ وہاں ایک پارسی لڑکی اس پر عاشق ہو جاتی ہے وہ اپنے ماں باپ سے بغاوت کر کے اس سے شادی کرنے پر تیار ہو جاتی ہے لیکن ہری کے پاس کام نہیں ہے۔ لڑکی اس کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے نرس بن جاتی ہے۔ ہری اس میں ایک جدوجہد کرنے والی شریک حیات کی جھلک دیکھتا ہے

ناول ڈاکومینٹری کی شوٹنگ سے شروع ہوتا ہے۔ ہری کو اس میں ایک انسٹرکٹر بننا ہے۔ وہ اس کام کو پسند نہیں کرتا مگر مجبوری ہے جب اُسے نیکر پہنایا جاتا ہے اور اس کے ایک نقلی مونچھ لگائی جاتی ہے تو اُس کا نوجوان وجود کراہ اٹھتا ہے۔

"لگا دو یار مونچھ۔ اگر تمہارے پاس پونچھ ہو تو وہ بھی لگا دو۔ اپنا خیال ہے دوست کہ اس کے لگانے کے بعد میرے سر پر ایک بندر اور بٹھا دو۔ تب بھی شرم نہیں آئے گی مجھے۔"

ہری اچھے کام کی طرح سچی محبت کا بھی بھوکا ہے۔ "ہائے اس کے دل کے اندر کتنے خوابناک سپنے تھے۔ اس کے اندر ایک اتھاہ ساگر تھا۔ کیا کسی نے اس کے اندر جھانک کر دیکھا؟ کیا کوئی لڑکی ایک غوطہ زن کی طرح اس کے دل کی گہرائیوں میں ڈبکی لگا کر دیکھے گی کہ اُس ویرانے میں کتنی بہاریں پوشیدہ ہیں۔ اس اجاڑ بیابان میں کتنے شگوفے ہیں۔ کتنی سرسبز وادیاں ہیں؟ اس سبستان میں کتنے سورج چمک رہے ہیں۔ کتنے دریا ہیں۔ کتنی لہریں ہیں۔ یہ دل بھی تو ایک سمندر ہے۔ اوپر سے پرسکون۔ چین سے لیٹا ہوا۔ لیکن اندر سے ایک اژدھے کی طرح منہ کھولے ہوئے۔ ایک ایک تمنا ہیبتناک چہرہ بنائے ہوئے۔

ہری کا تیسرا غم اس کا کمرہ تھا۔ یہ کمرہ مہندرناتھ کے ادب اور اس کی زندگی میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ یہ وہی کمرہ تھا جس میں مہندرناتھ جیا اور مرا۔ یہ کمرہ مہندرناتھ کے ادب میں بار بار آتا ہے ـــ اس کے لافانی افسانے "جہاں میں رہتا ہوں"۔ "آدمی اور سکے" میں۔ "رات اندھیری ہے" میں اور "اسکینڈل" میں۔ یہ کمرہ۔ کمرہ نہیں ہے بقول نارائن (رات اندھیری ہے کا مزدور رہنما) "یہ بہت بڑا ناسور ہے جو بمبئی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہی نہیں پورے ہندوستان میں پھیلا ہوا ہے۔ . . . . . اسے ٹھیک کرنا ہوگا۔ قابل نفرت یہ کمرہ نہیں ہے۔ وہ حالات ہیں جو اس کمرہ کو جنم دیتے ہیں۔"

یہ کمرہ سمبل ہے۔ آزادی کے بعد بھی عام انسان کے وہیں کے وہیں کھڑے رہنے کا۔ "سورج نکلتا تب بھی کمرہ میں روشنی نہ آتی ہر طرف اندھیرا۔ کمروں میں اندھیرا۔ برآمدے میں اندھیرا۔ نلوں پر اندھیرا۔ سیڑھیوں پر اندھیرا۔ چہروں پر اندھیرا۔ کپڑوں پر اندھیرا۔ آنکھوں پر اندھیرا۔ دلوں پر اندھیرا۔ اندھیرے نے برسوں سے یہاں یلغار کر رکھی تھی۔ ایک مہیب قسم کی منحوسیت۔ ایک بے رحم بے حسی۔ لاچاری۔ نفرت انگیز غربت۔ بھوک یاسیت چاروں طرف دم توڑ رہی تھی۔"

"جانے سے پہلے میرے گھر کی سیڑھیاں دیکھتے جائیے۔ یہ سیڑھیاں سنگ مرمر کی نہیں ہیں۔ یہ نہایت میلی گندی، بدبودار سیڑھیاں ہیں۔ ان سیڑھیوں پر برسوں کی غربت کے نشان ہیں۔ پہلی سیڑھی چڑھیں گے تو وہاں آپ کو ایک بچہ نظر آئے گا۔ نہایت دبلا پتلا ننگا۔ اس کا پیٹ بڑھا ہوا۔ ناک بہتی ہوئی۔ سیڑھیاں چڑھنے کی کوشش کرتا ہوا۔ قریب ہی ایک بالٹی ہے جس میں تمام گھروں کا گند رکھا ہوا ہے جب میں نیا نیا اس بلڈنگ میں آیا تھا تو بلڈنگ کی بدبو سے میرا دماغ متعفن ہو گیا تھا۔ لیکن اب یہ بدبو۔ یہ سیڑھیاں۔ یہ بچے۔ یہ مفلسی۔ یہ بیماری میری زندگی کا ایک جزو بن گئی ہیں۔ ان میلی سیڑھیوں کے سینے پر ہمیشہ گندے بچوں نے اپنے قدم رکھے۔ میلی سوکھی ہوئی گندی عورتوں نے اترتے چڑھتے

ہوئے ان سیڑھیوں پر تھوکا۔ مردوں نے ان سیڑھیوں پر سے اپنی عورتوں کو دھکا دیا۔ تاکہ وہ مر جائیں۔ کبھی ان سیڑھیوں پر آسودہ دلوں نے جھانک کر نہ دیکھا۔ خوبصورت بچوں نے اپنے نرم ہونٹوں سے انھیں پیار نہ کیا۔ نہ ہی نئی نویلی دلہنوں نے اپنی ساڑھیوں سے انھیں چھوا۔ رات کے اندھیرے میں ان سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر کسی نے ایک دوسرے کا بوسہ نہ لیا۔ وہ بوسہ جس میں نشاط اور محبت کی گرمی ہو۔ سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے کبھی کسی کے ہاتھ ایک دوسرے سے مس نہ ہوئے۔ یہاں صابن یا فنائل کے استعمال سے کچھ نہ ہوگا۔ محض سیڑھیاں دھونے سے کچھ نہ ہوگا۔ یہاں تو کچھ اور ہی ......"

(اسکینڈل)

مہندر ناتھ کو اس کمرہ پر بہت غصہ آتا تھا۔ مہندر ناتھ کو ان لوگوں پر بھی بہت غصہ آتا تھا جو اقدار کے پابند نہیں۔

"جب کوئی دوست اس سے جھوٹ بولتا تھا تو اس کا خون غصہ سے کھولنے لگتا۔ جب کوئی واقف کار کمینی حرکت کرتا تو کافی عرصہ تک وہ دل میں کڑھتا رہتا۔ اسی مسئلہ پر غور کرتا رہتا۔ پتھر اور دھات کے زمانے سے انسان نے اخلاقی اور روحانی طور پر کتنی ترقی کی ہے۔ کیا انسان واقعی بدل گیا تھا۔ باہر کا انسان نہیں جو نائیلان کا سوٹ پہنتا تھا۔ نکٹائی لگاتا تھا۔ جو ریڈیو سنتا تھا یا سنیما دیکھتا تھا۔ جو موٹر اور ہوائی جہاز میں سفر کرتا تھا بلکہ اندر کا انسان۔ کیا وہ واقعی بہتر انسان بن گیا تھا؟ ...... بنیادی طور پر انسان وہیں کا وہیں کھڑا تھا۔ اس کے رہن سہن، بول چال۔ اس کی سائنسی ترقی میں حیرت انگیز اضافہ ہوا تھا۔ لیکن وہ ابھی تک طاقت کا بھوکا تھا۔ کنبہ پروری اور رشتہ داروں کو آگے بڑھانا۔ اپنی انا کے سہارے باقیوں کو کچلنا اس کا روزمرہ کا کام تھا۔ ...... ہر شخص اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنائے بیٹھا تھا۔ ہر رہبر اپنے گرد چند حواریوں کو اکٹھا کر کے تقریر کر رہا تھا۔ اور لوگ بھوکے ننگے۔ جاہل۔ ان پڑھ ان کی طرف پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھ رہے تھے ...... اسی لئے تو اسے کوئی چیز اچھی نہ لگتی تھی۔ نہ مرنے کو جی چاہتا تھا نہ جینے کو۔ زندہ رہنے کو ...... زندہ رہنے کے لئے کوئی آدرش ہونا چاہئے۔ ایک ایسا نصب العین ۔۔ جو انسان کو زندہ رہنے کے لئے مجبور کر دے۔ جو اس کی رگوں میں آگ بھر دے۔ دل کی ویرانیوں کو شاداب کر دے۔"

(ناول۔ سورج، ریت اور گناہ)

سیاسی شعور

ہم انقلاب کے قابل نہیں۔ ہمارے ذہنوں میں تین کمرے کا فلیٹ۔ ایک کار۔ ایک بیوی۔ اس طرح گھسی ہوئی ہے کہ اس کا ذہن سے نکالنا مشکل ہے۔ چاندی کے سکوں نے انقلاب کے حسین چہرہ پر ایک خوفناک لیپ کر دیا ہے اور اسے بدنما اور مکروہ بنا دیا ہے ہم سب اپنے اپنے بلوں میں گھس گئے ہیں۔ اپنی بیویوں اور بچوں کے ساتھ کچھ سال زندہ رہیں گے۔ اور پھر اپنے اپنے بلوں میں مر جائیں گے۔ دراصل ہم سب چوہے ہیں۔"

(سورج۔ ریت اور گناہ)

مہندر ناتھ کوتاہ نظر یا حقیقت سے انکار کرنے والا ادیب نہ تھا۔ وہ زندگی کے برے اور اچھے، دونوں حقائق کو سمجھتا اور تسلیم کرتا تھا اسے ہندوستان کے آزاد ہونے کا احساس تھا۔ وہ فخر کرتا تھا کہ ہندوستان آزاد ہو گیا۔ اسے اُس ترقی کا بھی احساس تھا جو ہندوستان کر رہا تھا۔ مگر اُسے ترقی کی سست رفتاری ...... محض اوپر کے طبقوں کو نہال کرنے کا گلہ تھا۔ اس طرح مہندر ناتھ سو فیصدی وطن پرست، حقیقت آشنا تھا مگر اشتراکی تھا۔

"آزادی کے بعد کا ہندوستان ترقی کی طرف رواں دواں تھا۔ لیکن آزاد ہندوستان کے قدموں کی رفتار اتنی سست تھی کہ ہزاروں لاکھوں انسانوں کا قافلہ فاقوں میں مبتلا تھا۔ ایک نئی زندگی کی بنیادیں رکھی جا رہی تھیں۔ پرانا نظام ختم ہو رہا تھا اور ایک نیا سورج طلوع ہو رہا تھا۔ لیکن نئے سورج کی کرنیں اونچے اونچے مکانوں اور برجوں پر پڑ رہی تھیں۔ جھونپڑوں اور کچی سڑکوں پر ابھی تک نگاہ کرم نہ تھی۔

(سورج۔ ریت اور گناہ)

ادبی ایمان

مہندر ناتھ اشتراکی انقلاب کا قایل تھا۔ اس کے لئے یہ اندھیرے سے نجات اور روشنی تک رسائی کے مترادف تھا۔ یہ انسان کو اس کے بل سے نکال کر ایک بڑے مقصد والی جدوجہد میں فٹ کرتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جب تک انسان کی بنیادی ضروریات کی گارنٹی سماج نہ دے گا وہ اپنی خودغرضانہ جدوجہد میں لگا رہے گا اور کمین سے کمین تر ہوتا جائے گا۔ عجیب بات ہے کہ نقادوں نے مہندر ناتھ کو جنسی افسانہ نگاروں کی صف میں شامل کیا۔ وہ مہندر ناتھ کے ناولوں اور افسانوں میں اس جنسی، اشتراکی رجحان کو نہ دیکھ پائے جس کے سہارے مہندر ناتھ نے 'عورت' میں نہیں بلکہ ایک نئے نظام میں اپنے غم کا علاج دیکھا۔ اس کے افسانوں میں عورت کا بکنا یا پیشہ کمانا جنسی فعل نہیں ہے بلکہ وہ اقتصادی نظام کی کوتاہی ہے۔ جس میں عورت کام کر کے نہیں، جسم بیچ کر ہی جی سکتی ہے۔ جسم بیچنے والی عورت اور بیکار پھرنے والا نوجوان، دونوں نظام کا شکار ہیں اور بیچ کے اونچے طبقہ میں تو مرد بھی عورت کی طرح بکتا ہے، جیسے عیش پسند دولت مند عورتیں خریدتی ہیں۔ جگدیش اور محبوب علی ایسے ہی کردار ہیں۔ اس طرح مہندر ناتھ بنیادی طور پر ایک اشتراکی اور انقلابی ادیب تھا۔ جس نے اپنے افسانے یا ناول میں بے جھجک ایک انقلابی کردار کو پیش کرنے کی جرأت کی۔ وہ اس بات سے نہیں گھبراتا تھا کہ اسے پراپیگنڈسٹ کہا جائے گا۔ اس نے لکھا "اگر سچائی پراپیگنڈہ ہے تو اسے لکھنا ہر شریف آدمی کا کام ہے"۔ اس لئے اس نے ببانگ دہل پراپیگنڈہ کیا۔ اس نے لکھا۔ "جو نظام انسانوں کو کام نہ دے سکا، ضرور ختم ہو جائے گا" (اجنبیوں کا شہر)۔ "یہ دنیا مجھے بالکل پسند نہیں۔ میں اس دنیا میں بالکل رہنا نہیں چاہتا۔ ہاں اس قسم کی دنیا میں، یہ کہنے میں مجھے کچھ عار نہیں کہ مجھے امیر آدمیوں سے نفرت ہے۔ میں انھیں انسان نما حیوان سمجھتا ہوں۔ یہ لوگ ایسی غلاظت سے آلودہ ہیں جسے کوئی صاف نہیں کر سکتا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس طرح کی دنیا بدل دی جائے۔ میں کمیونسٹ نہیں۔ مگر مجھے کمیونزم کی فلاسفی پسند ہے۔" (سورج، ریت اور گناہ)

طرزِ تحریر

مہندر ناتھ کا طرزِ تحریر سادہ ہے، کرشن چندر کی طرح اس میں شاعرانہ عناصر کی بہتات نہیں۔ یقیناً اس نے کسی خاص طرزِ تحریر کو جنم نہیں دیا اور ہم مہندر ناتھ کو "صاحب طرز" نہیں کہہ سکتے۔ اس کی تحریر میں گرامر کی غلطیاں ہیں اور نظم و ضبط کم نظر آتا ہے لیکن جہاں جذبات کی شدت ہوتی ہے وہاں اس میں حیران کن روانی اور شاعرانہ رنگ ابھر آتا ہے

"بھول جاؤ، ان دیواروں کو بھول جاؤ۔ اس فرش کو بھول جاؤ۔ اس کے آگے کچھ نہیں۔ اس کے آگے پھسلنا ہے۔ گہری غار ہے۔ نگاہ کی کوئی مٹھاس نہیں۔ کوئی دلخراش آواز نہیں۔ کوئی نغمہ نہیں۔ کوئی آہ نہیں۔ کوئی ٹیس نہیں۔ کوئی ساحل نہیں۔ کوئی لہر نہیں۔ کوئی جادو نہیں۔ کوئی آگ نہیں۔ کوئی درد نہیں۔ کوئی جنت نہیں۔ کوئی دوزخ نہیں۔ کوئی راحت نہیں۔ کوئی لگن نہیں۔ کوئی پیار نہیں۔ کوئی حسن نہیں۔ کوئی آواز نہیں۔ کوئی سنگم نہیں۔ اس ملن کے بعد جدائی ہے موت ہے۔ تاریکی ہے۔ بھوک ہے۔ بیکاری ہے۔ انسانوں کی کمینگی ہے۔ چھوٹے دلوں کی دنیا ہے۔ چھوٹی دیواروں اور ٹیڑھی دیواروں کی دنیا ہے۔"

ادبی حیثیت

بیشتر نقاد یہ کہتے آئے ہیں کہ مہندر ناتھ، کرشن چندر کے سائے کی وجہ سے ابھر نہ سکا۔ ادب میں بھی چھوٹا بھائی بن کر رہ گیا۔ مہندر ناتھ تقسیم ملک کے وقت تک اردو کے مقبول اور معروف ترین افسانہ نگاروں میں سے ایک تھا۔ اس وقت تک کا کوئی جریدہ اس کی کہانیوں سے خالی نہ ہوتا تھا۔ وہ ساقی، ادب لطیف، ادبی دنیا جیسے چوٹی کے پرچوں کا مطلوبہ

افسانہ نگار تھا۔ اُس کے رنگ میں نہ کرشن چندر کے رنگ کی جھلک تھی اور نہ اس سے مغلوب رہنے کی مردنی۔ وہ اپنی جگہ آزادانہ طور پر کھڑا ایک ستون تھا۔ ملک کی تقسیم کے بعد بھی وہ پاکستانی رسالوں کا محبوب افسانہ نگار تھا۔ آخر دم تک اس کی اپنی "ادبی ڈاک" کم نہ ہوئی تھی۔ اگر مہندر ناتھ شکار ہوا تو کرشن چندر کا نہیں، پورے ترقی پسند ادب کے نیتاؤں کا۔ ان نیتاؤں نے روس سرکار سے بھی دعوت نامے اور انعام لئے اور بھارت سرکار سے بھی۔ خود بھی لئے اور بیسیوں کو دلائے۔ سوویت لینڈ کے نہرو ایوارڈ وہ لے گئے جنہوں نے افسانے کے نام پر ڈھیلی ڈھالی کے ادبی ڈھانچے بھی نہ ٹھونکے تھے۔ لیکن مہندر ناتھ کی باری نہ آئی۔ کرشن چندر کا اثر کوئی اول مہندر ناتھ کی ادبی زندگی میں رہا ہے تو وہ یہ کہ وہ "غیر جانب دار" بنا رہا۔ مہندر کے لئے کہوں گا تو لوگ کہیں گے، بھائی کے لئے کہتا ہے؟۔ اسی ذہنی کمپلیکس میں کرشن چندر نے مہندر ناتھ کو اس کا دنیاوی حق دلانے میں کوئی پارٹ ادا نہ کیا۔ اس ضمن میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ مہندر ناتھ، کرشن چندر کا بھائی ہونے کی وجہ سے "ابھر" نہ سکا۔

لیکن حق یہ ہے کہ مہندر ناتھ کے ساتھ کے سارے ادیب اور شاعر مارے گئے۔ کیونکہ ہندوستان میں اردو ماری گئی۔ بٹوارے نے اردو کا بیڑا غرق کر دیا اور پاکستان کی پالیسی نے ہندوستان اور پاکستان میں ادبی بیوپار ختم کر دیا۔ اگر مارکٹ کھلا رہتا۔ اردو کے پرچوں اور کتابوں پر "سرحدی پابندیاں" عائد نہ ہوتیں تو مہندر ناتھ اردو کا اتنا ہی درخشاں افسانہ نگار ہوتا جتنا وہ جو بٹوارے سے پہلے "بن" گئے۔ علاوہ ازیں اردو کو نقاد نہیں ملے۔ اس ملک میں نقاد ہوئے ہی نہیں اور جو ایک دو ہوئے وہ دو چار ادیبوں کو بڑھ کر باقی کو پڑھنے سے دستبردار ہو گئے۔ اس صورتِ حال نے اُن ادیبوں کے ادب کی ادبی پیمائش نہ ہونے دی جو دوسرے دور میں آئے۔ اگر مہندر ناتھ کا ذکر اردو تنقید میں کم ہے تو قصور مہندر ناتھ کا نہیں ہے۔ قصور اُن نقادوں اور افسانہ نگاروں کا ہے جنہوں نے تقسیم ہند کے بعد پڑھنا اور لکھنا چھوڑ کر ادب سے زیادہ سیاست کے تالابوں میں سے مچھلی پکڑنا شروع کر دیا اور اپنی ادبی دوکانوں کے کواڑ گرا کر بورڈ ٹانگ دیا۔ "یہاں کا پہلا بزنس بند ہو گیا ہے کیونکہ اردو ادب میں جمود آگیا ہے؟"

ادیب + انسان

اشتراکیت میں ایمان اور ادب میں اس کی ترویج نئی بات نہیں ہے۔ بہت سے ترقی پسند ادیبوں نے ایسا کیا۔ لیکن جو بات مہندر ناتھ کے قد کو ان سے اونچا بناتی ہے وہ عملی زندگی میں بھی اس کا اطلاق ہے۔ مہندر ناتھ آخری دم تک ترقی پسند تحریک کے ساتھ رہا۔ تنظیم میں بھی وہ پیش پیش رہا۔ وہ لمبے عرصے تک بمبئی شاخ کا سکریٹری رہا تھا۔ کمیونسٹ پارٹی میں جب ترقی پسندوں نے عملی جدوجہد کا ریزولیوشن پاس کیا تو مہندر ناتھ مُکا دکھانے والوں میں تھا۔ اس کے بعد اس نے فلمی مصنفوں کی انجمن کی تنظیم کی اور ان کے حقوق حفاظت کے لئے اسی خلوص، لگن اور ایمانداری سے کام کیا کہ مرتے دم تک بلا مقابلہ جنرل سکریٹری چنا جاتا رہا۔ جب اس کی موت ہوئی تو خواجہ احمد عباس نے کہا۔ "آج درگا دیوی ہی بیوہ نہیں ہوئی ہے فلم رائیٹرس ایسوسی ایشن بھی بیوہ ہوئی ہے"۔ مہندر ناتھ بیکار رہا۔ وہ اس کمرہ سے بڑا کمرہ نہ لے سکا۔ جس میں وہ ۲۵ سال پہلے آیا تھا۔ اس نے کوئی بینک بیلنس نہ چھوڑا۔ وہ بہت سی چیزیں حاصل کر سکتا تھا لیکن اس نے حاصل نہ کیں۔ کیونکہ ان کے لئے اسے اقدار سے گرنا پڑتا تھا۔ اس کا ادبی ایمان کتابوں تک محدود نہ رہا۔ وہ اس کی زندگی میں بھی سرایت کر گیا۔ اور مہندر ناتھ اس تضاد کا شکار نہ ہوا جس کے شکار آج بہت سے ترقی پسند ہیں۔ "چاندی کے تار" والا مہندر۔ آخر تک تہہ میں باون گز اور کھدر پن میں ۲۶ کیرٹ کا رہا۔ مہندر ناتھ ادیب نفی انسان نہیں، ادیب جمع انسان تھا۔

ایک عاشق

لیکن مہندر ناتھ محض اشتراکی، یا آدرش وادی نہ تھا۔ وہ ایک بڑا عاشق تھا۔ یونانیوں کی طرح وہ تندرست جسم اور صحت مند محبت کا قائل تھا۔ اُسے دھوپ سے اور چاندنی سے محبت تھی۔ جسم کو وہ زندگی کا جمالیاتی مظہر سمجھتا تھا۔ اسے مریل جسم

اور نیم مردہ جذبے سے نفرت تھی بلکہ اس کی لڑائی اس نظام اور اس ذہنیت سے تھی جو اُن کو جنم دیتے ہیں۔ اس کے ناولوں اور کہانیوں میں جابجا کولہوں، چھاتیوں، پنڈلیوں کا ذکر ملتا ہے۔ ان کا ذکر وہ بے جھجک کرتا ہے مگر یہ سیکس نہیں صحت کے نشان ہیں۔ مہندر ناتھ خود ایک چھ فٹ کا تندرست نوجوان تھا۔ اور چاہتا تھا کہ ہر انسان اس کی طرح صحت سے مالا مال ہو۔ اُسے عورت سے بے پناہ عشق تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ چاندی سی عورت سکّوں کے لئے بکے۔ وہ عورت سے محض جنسی رشتے کا قائل نہ تھا وہ اسے اپنی زندگی میں برابر کا باقاعدہ رتبہ دینا چاہتا ہے اور اس کی کہانیوں کا المیہ یہ ہے کہ جو عورت ملی، وہ بکی ہوئی تھی، بک رہی تھی یا آدمی اسے باعزت اور اقتصادی اعتبار سے محفوظ زندگی دینے کے اہل نہ تھا۔ ادب میں عورت کو معشوق نہیں، باعزت بیوی کا روپ دینے کی سماجی خواہش مہندر ناتھ کے ادب کا خاصہ ہے۔ عورت کے لئے اس کا عشق بستر میں چند لمحوں سے کھیل کر زندگی کے اس چھور سے اس چھور تک "پورے ساتھ" کے آدرش میں ڈھل گیا تھا

فطرت

مہندر ناتھ کرشن چندر کا بھائی اور کشمیر کا باسی تھا۔ کرشن چندر کی طرح اسکے ادب میں فطرت ایک کردار یا ایک پس منظر کے طور پر نہیں آتی ہے۔ اس کے ادب میں ناریل کے پیڑ، سمندر، نیلے آسمان، چمکیلی دھوپ، نم ہوا اور اوس کا ذکر ہے۔ لیکن یہ سب اپنی الگ ہستی نہیں رکھتے۔ یہ ایک کھلی۔ بے گھٹن اور صحت مند زندگی کی امنگ کے نشان ہیں۔ مہندر ناتھ فطرت کے پاس واپس جانا نہیں چاہتا۔ لیکن وہ ایک ایسا کھلا مکان چاہتا ہے جس میں سے وہ ان کو دیکھ کر اپنے جسم اور اپنے جذبے کو زندگی اور تابناکی بخشتا رہے۔ اس طرح فطرت کی ضرورت مہندر ناتھ کو شاعر کی طرح نہیں "ٹاؤن پلانر اور فنِ تعمیر کے ماہر" آرچی ٹیکٹ کی طرح ہے۔

مہندر ناتھ کے ادب میں جمود نہیں آیا کیونکہ اس نے "بلیو پرنٹ"۔ "اگر میں مر جاؤں تو"۔ "چائے کی پیالی"۔ "ایک پھول ایک کار"۔ "اوہ چھلا سنگترہ اور ڈبل روٹی کا ٹکڑا"۔ "اجنبیوں کا شہر"۔ "نوفر"۔ "رات اندھیری ہے"۔ اور "سورج ریت اور گناہ" جیسے افسانے اور ناول لکھے۔

مہندر ناتھ انسانوں میں ادیب نہیں تھا۔ ادیبوں میں انسان تھا۔ یہ بات اس کی ذات تک محدود نہیں ہے اس کے ڈانڈے اس کے ادب سے بھی ملتے ہیں۔ اس کی لوح پر یہ عبارت بے جھجک لکھی جا سکتی ہے۔

مہندر ناتھ

زندگی کے دکھوں، آلائشوں اور پریشانیوں کی عکاسی کرتے ہوئے بھی زندگی سے بے حد پیار کرنے اور حق و انصاف کا سدا پرچم بلند کئے رہنے والا یہ ادیب، اردو افسانہ نگاری میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ آپ نے بے شمار افسانے، متعدد ناول لکھے ہیں اور فلمی دنیا میں بھی معروف ہیں۔

(رضیہ سجاد ظہیر)

مرزا ادیب
لاہور (پاکستان)

وعدہ فراموش

چند سال بیتے مہندر ناتھ کا ایک خط ملا تھا جس میں اُس نے کہا تھا کہ "ہم لوگ کرشن جی کے بارے میں "شاعر" کا ایک خاص نمبر شائع کر رہے ہیں۔ آپ بھائی جی کے بڑے پرانے دوست ہیں اُن کے متعلق آپ کے جو بھی تاثرات ہیں، لکھ بھیجیں۔ مگر جلدی کیجیے گا کیونکہ پرچے کو ترتیب دینے کے لئے ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔" اور آج میرے سامنے کرشن چندر کا خط پڑا ہے جس میں میرے عزیز اور بہت پیارے دوست نے لکھا ہے:

"پیارے میرزا ادیب۔ نئے سال کی مبارک باد قبول کرو اور مجھ سے گلے ملو۔ گذشتہ سال مجھ پر بہت بھاری رہا۔ میرے عزیز بھائی مہندر ناتھ اچانک بیس مارچ کو وفات پا گئے۔ اُن کی یاد میں اُن کی پہلی برسی کے موقعے پر بیس مارچ ۷۵ء یعنی دو ماہ بعد ہم لوگ ایک خصوصی نمبر شائع کر رہے ہیں۔ اس نمبر میں تمہاری شرکت بے حد ضروری ہے مہندر ناتھ پر ایک تاثراتی مضمون اپنے مخصوص رنگ میں لکھ بھیجو جس سے پرانی یادیں تازہ ہو جائیں۔ مضمون کا شدت سے انتظار رہے گا۔"

کرشن جی! معاف کیجیے میں تکلف سے کام لے کر کرشن جی لکھ رہا ہوں۔ ہم خطوں میں ایک دوسرے کو اس طرح مخاطب کرنے کے عادی نہیں ہیں۔ مگر معاملہ یہ ہے کہ ہم جس شخص کی برسی منا رہے ہیں۔ اس نے کبھی میری موجودگی میں اپنی زبان سے کرشن چندر نہیں کہا تھا جب بھی آپ کا ذکر آتا وہ بڑے ادب سے کہتا۔ کرشن جی یا بھائی جی! میں نے اپنی زندگی میں مہندر ناتھ جیسے بڑے بھائیوں کی عزت و احترام کرنے والے شخص بہت کم دیکھے ہیں ــــ وہ تو یوں لگتا تھا جیسے اپنے بڑے بھائی کا نام منہ سے نکالتے وقت سراپا عقیدت بن گیا ہے۔ اس کی عقیدت صرف اس بنا پر نہیں تھی کہ اس کا بھائی اُردو کا ایک عظیم افسانہ نگار ہے اور جس کی شہرت برصغیر کی حدود سے نکل کر یورپ کی فضاؤں میں بھی پھیل گئی ہے۔ اسے یقیناً اس بات پر فخر تھا مگر میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس کا بھائی افسانہ نگار کرشن چندر کی بجائے ایک عام آدمی ہوتا ــ کوئی کلرک، کوئی ٹیچر ہوتا جب بھی اپنے بھائی کے لئے اس کے عقیدت مندانہ جذبات میں کوئی کمی واقع نہ ہوتی۔ تو کرشن جی! میں سوچتا ہوں یہ زندگی کتنی عجیب ہے اس کا مذاق کتنا کرب انگیز ہے ــ اس کا المیہ کتنا زہرناک ہے ــ چند سال ــ صرف چند سال پہلے ہی تو اس نے 'شاعر' کے کرشن نمبر کی خبر سنائی تھی۔ اس وقت کسی کے ذہن میں ایک لمحے کے لئے بھی یہ خیال آسکتا تھا کہ ایک روز ــ اور وہ روز جلد ہی آنے والا ہے ــ جب اس کا بڑا بھائی اس کی پہلی برسی پر اس کے اور اپنے دوستوں کو لکھے گا کہ مہندر ناتھ کی یادیں تازہ کرنے کی خاطر اپنے ذاتی تاثرات کا اظہار کرو۔

کرشن جی! یقین کیجیے جب میں نے آل انڈیا ریڈیو سے یہ خبر سنی تھی کہ مہندر ناتھ چل بسے ہیں تو مجھے اس کی صداقت مشکوک سی محسوس ہوئی تھی۔ جیسے میں نے ابھی ابھی جو الفاظ سنے ہیں وہ بس الفاظ ہی الفاظ ہیں ــــ اِن کے وہ معنی ہرگز نہیں جو یہ خبر اپنے دامن میں لے کر آئے ہیں۔ اِن لمحوں ہی میں

نے اپنے دل سے سوال کیا تھا۔ کیا یہ سچ ہے کہ مہندر ناتھ مر گیا ہے! مہندر ناتھ — اردو ادب کا مہندر ناتھ — کرشن چندر کا مہندر ناتھ — میرا مہندر ناتھ — ہم سب کا مہندر ناتھ۔ وہ مہندر ناتھ جسے وقت اور فاصلہ بھی ہم سے الگ نہیں کر سکا۔ جو ہمیشہ ہمارے قریب رہا — بہت قریب رہا۔ — کیا یہ مہندر ناتھ سب کو چھوڑ کر جا چکا ہے! کرشن جی! سچائی کو کیسے چھپایا جا سکتا ہے۔ جو صداقت ہے، پھول کے روپ میں آتی ہے یا کانٹے کے روپ میں، دیر تک نظروں سے اوجھل نہیں رہتی۔ اور وہ خبر جو ایک کانٹا تھی میرے دل میں اتر کر ہی رہی! مجھے اس خبر کو سچ ماننا پڑا کہ مہندر ناتھ واقعی مر گیا ہے۔

جن لوگوں نے مہندر ناتھ کو دیکھا ہے ان کی نگاہوں کے سامنے آج بھی ایک خوبصورت، ایک شاداب، ایک شگفتہ چہرہ پھر رہا ہے۔ کرشن جی! عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جن لوگوں کا رابطہ ادب سے ہوتا ہے وہ خوبصورت نہیں ہوتے۔ شاید اس وجہ سے کہ وہ اپنا سارا حسن اپنی تخلیقات کا چہرہ سنوارنے میں صرف کر دیتے ہیں۔ لیکن مہندر ناتھ خوبصورت تھا۔ قدرت نے اسے حسن دینے میں بڑی فراخ دلی کا ثبوت دیا تھا۔ اور مہندر ناتھ نے بھی کوشش کی تھی کہ اس کے پاس جتنا بھی حسن ہے اپنے افسانوں میں منتقل کر دے — تاہم وہ خود خوبصورت کا خوبصورت ہی رہا۔ کرشن جی! میں نے اُسے ان لمحوں میں نہیں دیکھا جب وہ چپ چاپ وادیٔ خاموشاں کی طرف قدم اٹھا رہا تھا۔ مگر میرے دل کی گہرائیوں سے یہ یقین کوئی بھی نہیں نکال سکتا کہ وہ اس عالم میں بھی شگفتہ پھول ہی ہوگا۔ اور موت کا سایہ اس پھول سے اس کی شگفتگی نہیں چھین سکا ہوگا۔ میں جانتا ہوں آپ اس بات کی تائید کر رہے ہیں۔ کرشن جی!

آپ کو یاد ہے موہن روڈ والا گھر — میں جب آپ سے آپ کا ایک غیر مطبوعہ افسانہ سننے کے لئے اس گھر میں پہونچا تھا۔ تو آپ کے اشارے پر ایک نوجوان نے تانبے کی مٹکی کے اوپر رکھے ہوئے دو تین برتن اتار کر چند لڈو غالباً مٹکی ہی سے نکالے تھے اور پھر انھیں پلیٹ میں رکھ کر لے آیا تھا۔ اس روز میں نے پہلی مرتبہ مہندر ناتھ کو دیکھا تھا۔

مجھے خوب یاد ہے کہ مہندر ناتھ ہمارے پاس بیٹھا نہیں تھا۔ آپ کی کرسی کے پیچھے بڑے ادب سے کھڑا رہا تھا۔ آپ نے کہا تھا

"مہندر ناتھ کو افسانے لکھنے کا بڑا شوق ہے"۔

اپنے بڑے بھائی کے یہ الفاظ سن کر مہندر ناتھ کی آنکھوں اور ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ایک لہر سی آئی تھی اور جلد ہی غائب ہو گئی تھی۔

اس پہلی ملاقات میں مہندر ناتھ سے دو چار باتیں ہوئی تھیں۔ اور ان باتوں سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ کرشن چندر کا بھائی بے حد شرمیلا اور جھجھکنے والا قسم کا لڑکا ہے۔ کھل کر بات نہیں کر سکتا۔ مہندر ناتھ کے چہرے پر میں نے ہمیشہ ایک معصوم سی مسکراہٹ پائی تھی۔ کبھی یہ مسکراہٹ خاص نمایاں ہو جاتی تھی۔ اور کبھی اتنی مبہم کہ صرف قریب سے دیکھنے پر ہی اس کا احساس ہوتا تھا۔ یہ مبہم مسکراہٹ میں نے اس وقت بھی اس کے چہرے پر دیکھی تھی جب ایک رسالے کے ایڈیٹر نے اس کے افسانے پر جو نوٹ دیا تھا اس میں اُس کی اداکاری کا بھی ذکر کر دیا تھا۔

دو چار دنوں بعد 'ادبِ لطیف'، کے دفتر میں مہندر ناتھ کی اس ایڈیٹر سے ملاقات ہو گئی۔

"آپ نے افسانے پر نوٹ پڑھا!" ایڈیٹر صاحب نے اپنی طرف سے احسان جتاتے ہوئے پوچھا۔

"جی پڑھا ہے"۔

"پسند آیا۔؟"

"آپ نے میری اداکاری کا کیوں ذکر کیا ہے — یہ کوئی جرم کی بات ہے؟"

"آپ اداکار نہیں ہیں۔؟"

"ہوں — مگر آپ کا تعلق تو افسانہ نگار مہندر ناتھ سے تھا — ایکٹر مہندر ناتھ سے نہیں — معاف کیجئے آپ نے زیادتی کی ہے — آپ نے شاید مجھے نقصان —"۔

اُس وقت دفتر میں جتنے لوگ بیٹھے ہوئے تھے انھوں نے لازماً محسوس کر لیا ہوگا کہ مہندر ناتھ کو اس نوٹ سے دکھ پہنچا ہے اور اب وہ یا تو مزید گفتگو میں تلخ لہجے سے کام لے گا یا احتجاجاً دفتر سے اُٹھ کر چلا جائے گا۔ لیکن اس کا لہجہ نہ تو تلخ ہوا اور نہ اس نے چلے جانے کی کوشش کی۔ وہیں بیٹھا رہا۔ اس نے ایڈیٹر کے لئے خود چائے بنائی اور اُٹھ کر اس کے سامنے رکھی اور جب ایڈیٹر نے اس سے نیا افسانہ مانگا تو فوراً کہہ دیا۔

"ایک افسانہ لکھ رہا ہوں۔ حاضر کردوں گا۔"

کرشن جی میں نے کبھی مہندر کو غصے میں نہیں دیکھا تھا۔ کیا اُسے غصّے میں سے کوئی معقول قسم کا حصہ نہیں ملا تھا یا وہ غصے کو دبا لیتا تھا۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ آپ کا بہت ادب اور احترام کرتا تھا۔ صرف آپ کا نہیں، سب کا —— ہم سب کا جو آپ کے دوست تھے، وہ بہت اچھا افسانہ نگار تھا۔ اس کے پہلے مجموعے "چاندی کے تار" نے ثابت کر دیا تھا کہ اس کے اندر بلا کی صلاحیت ہے اور اس میں ترقی کے بہت امکانات ہیں۔ مگر ایک بات کہوں۔ کرشن جی! آپ نے بہت زیادہ شہرت حاصل کر کے اسے غیر ارادۃً کچھ نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ میری بات شاید واضح نہیں ہے۔ ایک مثال پیش کروں۔

احسان بی۔ اے اکثر وبیشتر 'ادبِ لطیف' کے دفتر میں آتے رہتے تھے۔ مگر ان کی ملاقات کبھی مہندر ناتھ سے نہیں ہوئی تھی۔ ایک بار وہ اس وقت آگئے جب مہندر ناتھ چودھری نذیر سے اپنے افسانوں کی ایک کاپی لے رہا تھا۔

میں نے کہا۔ "احسان! ان سے ملو۔ جانتے ہو یہ کون ہیں؟"

"جی غرض یہ ہے کہ میں اپنے سامنے کسی بھوت پریت کی بجائے ایک انسان کو دیکھ رہا ہوں" احسان نے حسبِ معمول ظرافت کا اظہار کیا۔

"یہ مہندر ناتھ ہیں —— کرشن چندر کے چھوٹے بھائی۔" میں نے کہا اور چند لمحوں بعد ہی میں نے محسوس کر لیا کہ مہندر ناتھ سے زیادتی کر چکا ہوں۔ مہندر ناتھ خود ایک معروف افسانہ نگار ہے۔ کرشن چندر کی وساطت سے اس کا تعارف کرانا اس سے زیادتی کرنے کے مترادف ہے۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ الفاظ تو منہ سے نکل چکا تھا۔

سوچا کس طرح معذرت کروں —— لیکن معذرت کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ مہندر ناتھ کی مبہم مسکراہٹ واضح مسکراہٹ میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اس کے چہرے پر ذرہ برابر بھی ملال نہیں تھا۔ میں نے کہا ہے نا مہندر ناتھ کو غصہ آتا ہی نہیں تھا اور آتا بھی تھا تو وہ دبا لیتا تھا۔ اور میں نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ بہت اچھا افسانہ نگار تھا —— صرف بہت اچھا افسانہ نگار! نہیں یہ حقیقت کا ایک پہلو ہے —— اس کی تخلیقی ذات کا صرف ایک حصہ۔ وہ بہت اچھا اداکار بھی تھا۔ 'سرائے کے باہر' اور 'راکھ' میں اس نے بڑی اچھی اداکارانہ صلاحیتوں کا ثبوت دیا تھا۔ سرائے کے باہر میں اس نے ایک بڑی نامور اداکارہ ستیا دیوی کے ساتھ کام کیا تھا اور کسی مقام پر بھی اس سے دبا ہوا محسوس نہیں ہوا تھا۔ اور کرشن جی! اب میں ایک اور بات بھی کہتا ہوں۔ اور وہ بات یہ ہے کہ مہندر ناتھ وعدہ فراموش بھی تھا۔

وعدہ فراموش! جی ہاں وعدہ فراموش۔ ہوا یوں کہ ایک بار وہ مجھے بھاٹی دروازے کے پاس مل گیا۔ اس دن موسم بڑا خوش گوار تھا۔ ادبِ لطیف کا نیا شمارہ نکل آیا تھا اور میرے سر سے وہ بوجھ اتر گیا تھا جو پچیس چھبیس روز سے مجھے پریشان کر رہا تھا۔ میں نے مہندر ناتھ سے کہا:

"آپ کبھی بھاٹی کے اندر گئے ہیں؟"

"نہیں۔"

"آج چلیں گے!"

"آپ کی مرضی۔"

" میری مرضی تو ہے ـــــ آپ کی مرضی ہو تو چلیں "

اور ہم بھاٹی دروازے کے اندر چلے گئے ـــــ اور چلتے گئے ، بازار حکیماں میں پہنچے اور اس سے آگے بڑھے تو اس علاقے میں پہنچ گئے جہاں دن سوتے ہیں اور راتیں جاگتی ہیں ۔ یہ علاقہ طوائفوں کا محلہ ہیرا منڈی تھا ۔

میں نے کہا مہندر ناتھ ! آپ جو کہتے ہیں ـــ " زندگی چاندسی عورت کے سوا کچھ بھی نہیں ۔"

" وہ تو ایک افسانہ ہے "

" آپ مانتے ہیں کہ زندگی ـــــ "

" شاید ـ " مہندر ناتھ کی مبہم مسکراہٹ واضح ہو گئی ـــ مگر پھر مبہم ہو گئی ۔ اس نے صرف یہ کہا ۔ " یہ عورتیں بڑی دکھی ہیں "
اُس کے بعد اس نے کوئی لفظ نہ کہا ۔

وہ خاموش رہا ـــــ واپسی پر بھی خاموش رہا ۔

اور آج میں بتاتا ہوں کرشن جی ! مہندر ناتھ نے واپسی پر مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ آج آپ مجھے بھاٹی کے اندر لے گئے تھے اور میں کبھی آپ کو ایک اور جگہ لے جاؤں گا ۔ اور میں نے اس سے کہا تھا " میں اس لاہور میں پیدا ہوا ہوں ۔ لاہور کا کوئی ایسا گوشہ نہیں جو مجھ سے پوشیدہ ہو ۔ خیر آپ مجھے لے جائیں ۔"

اُسنے اپنا وعدہ بھول گیا ـــــ اور میں نے بھی اُسے یاد نہ دلایا ـــ لیکن میں نے سوچ رکھا تھا کہ کبھی بمبئی پہنچوں گا تو اس سے کہوں گا ۔

" مہندر ناتھ ! آپ کو اپنا وعدہ یاد ہے ـــ آپ بمبئی میں رہتے ہیں ۔ مجھے لے جائیں ـــ کہیں لے جائیں ـــ بمبئی کے کسی بھی مقام پر لے جائیں اور یوں اپنا وعدہ پورا کریں ۔"

اور کرشن جی ! آج میں بڑے دکھ سے سوچتا ہوں کہ کبھی بمبئی پہنچا تو کس " وعدہ فراموش " کو اس کا وعدہ یاد دلاؤں گا ـــ کس کو کرشن جی ـــ کس کو ؟ !

رام لال

مہندر ناتھ

کامیاب ادیب ناکام ہیرو

مہندر ناتھ کو میں غالباً ۱۹۴۰ء سے جانتا ہوں۔ اگرچہ ان سے میری پہلی ملاقات ۱۹۵۰ء کے آس پاس ہوئی تھی۔ کسی ادیب کو جاننے کے لئے اس سے ذاتی طور پر بھی ملنا ضروری نہیں ہوتا۔ کیونکہ عام طور پر اس کی تخلیقات بھی اس کی شخصیت، اس کے افکار اور عقائد کا مکمل آئینہ ہوتی ہیں۔ اگرچہ کوئی کوئی ادیب اپنی تحریروں کے پردے کے پیچھے ایک کافی عرصے تک بڑی کامیابی سے چھپا بھی رہ سکتا ہے۔ لیکن مہندر ناتھ ایسا کبھی معلوم نہ ہوا۔ ان کے ترقی پسند نظریات، افسانوں اور ناولوں میں جھانکتی ہوئی جابجا جنسی بھوک، مفلسی، آزادی کی تڑپ اور جرأت مندانہ اظہارِ خیالات کے علاوہ ادبی کانفرنسوں، سیمیناروں کے بارے میں چھپے رپورتاژوں میں ان کا جابجا ذکر میرے ذہن میں ایک دلچسپ شخصیت کا ہی امیج بناتا تھا۔

بمبئی میں چودہ پندرہ سال پہلے جب میں پہلی بار ان سے ملا تو مجھے اگر کسی قسم کا شاک محسوس ہوا بھی تو وہ نہایت خوشگوار قسم کا تھا۔ یعنی وہ میرے ذہن میں پہلے سے بنے ہوئے امیج سے کچھ زیادہ ہی دلچسپ اور محبت کرنے والا انسان نکلا۔ دادر میں شری ساؤنڈ اسٹوڈیو کے پیچھے مادھوداس پاستا روڈ پر ایک پرانی سی بلڈنگ چھپرا ہاؤس کی پہلی ہی منزل پر کرائے کے فلیٹ میں اُن کی رہائش تھی۔ ایک لمبوترا سا کمرہ جس میں باتھ روم بھی تھا۔ کتابوں سے بھری ہوئی الماریاں۔ صوفہ سیٹ اور سونے کے لئے ایک آرام دہ پلنگ بھی۔ کیا وہ شادی شدہ تھے؟ میں آج تک نہیں جان سکا۔ معلوم کرنے کی کبھی کوشش بھی نہیں کی۔ وہاں ایک ادھیڑ عمر خاتون کبھی کبھی ضرور دکھائی دی۔ جس نے مجھے کمرے میں بیٹھنے کے لئے کہہ دیا یا مہندر ناتھ جی کے پروگرام کے بارے میں اطلاع دے دی۔ شاید انھیں کو بعض لوگ درگا بھابی کہتے ہوں گے۔ لیکن اس خاتون کے وجود کے بغیر بھی مہندر جی مجھے ایک مکمل شخصیت کی طرح لگے۔ ان کا جتنا کچھ میرے سامنے رہا میرے لئے وہ کافی اطمینان بخش تھا۔ مزید کچھ جاننے کی خواہش کبھی پیدا ہی نہیں ہوئی۔

پہلی ہی ملاقات میں انھوں نے مجھے اپنا گرویدہ بنا لیا۔ میں انھیں کتابوں کے آئینے کے علاوہ پردہ اسکرین پر بھی دیکھ چکا تھا۔ آزادی کے ایک آدھ سال پہلے کرشن چندر نے مشہور ڈرامہ "سرائے کے باہر" پر ایک فلم بنائی تھی۔ پروڈیوسر، ڈائریکٹر بھی وہی تھے۔ مہندر ناتھ ہیرو تھے۔ کہانی کچھ آدرشوں اور حقیقت پسندانہ واقعات کے گرد گھومتی تھی۔ زیادہ دلچسپ اور تفریحی مناظر سے بھرپور ہرگز نہیں تھی۔ جیسی بیشتر کمرشیل فلمیں ہوتی ہیں۔ اس فلم کو دیکھ کر مجھے مایوسی اسی وجہ سے ہوئی تھی کہ کمرشیل طور پر وہ فلم بالکل فلاپ تھی۔ مہندر ناتھ نے اصل ڈرامے کے مطابق ہی کام کیا تھا۔ اگرچہ وہ بے حد شکیل تھا۔ کسی کمرشیل پروڈیوسر ڈائریکٹر نے اسے سائن کیا ہوتا تو شاید آج اس کا شمار ہماری فلمی دنیا کے روایتی ہیروؤں کی طرح پُرکشش ہی ہوتا۔ میں نے آزادی کے بعد بھی اسے دو ایک اور فلموں میں دیکھا۔ اور احساس ہوا کہ وہ جس طرح اپنے نظریات کے اعتبار سے ایک آئیڈیلسٹ ہے۔ اسی قسم کے فلموں میں بھی اس نے چھوٹے یا بڑے رول منتخب کئے ہیں جن کی آج کے

روپے پیسے کے ریل پیل والے دور میں ناکامی یقیناً ہو سکتی ہے۔ لیکن فلموں میں اس کی ناکامی نے میرے سامنے اس کا وہی پہلا امیج قائم رکھا۔

میری پہلی ملاقات سے شاید انھوں نے میرے بارے میں یہ سمجھ لیا تھا کہ میں بھی فلموں میں بطور اسکرپٹ رائٹر قسمت آزمائی کرنے کے لئے بمبئی آگیا ہوں۔ کیونکہ انھوں نے میرے سامنے فلمی لیکھکوں کی زبوں حالی اور اخلاقی پستی کا ایک ایسا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا جس سے مجھے بے حد افسوس ہوا تھا کہ ہمارے علم و ادب کے شہزادے آخر اس کھیل تماشے کی دنیا میں ایک تیسرے درجے کا شہری بن کر رہنا کیوں قبول کئے ہوئے ہیں، جس دنیا میں سارا کاروبار محض چمچہ گیری کی ہی بدولت چل رہا ہو۔ یہاں کوئی بھی بڑا ادیب اپنی بڑی سے بڑی کہانی کو اسکرین پر پروجیکٹ کرانے میں ناکام رہتا ہو وہ ایسے توہین آمیز اور حوصلہ شکن ماحول کے ساتھ کیوں چپکے ہوئے ہیں؟ اس سوال کا جواب بھی مجھے مہندر ناتھ کی باتوں سے مل گیا ـــ ہر بڑے شہر کی اپنی کچھ قدریں ہوتی ہیں۔ اخلاق کو ایک ایسی پستی تک لے جانے والی قدریں جہاں ادیب کو لکھنے کے لئے بہت سا مواد مل جاتا ہے۔ بڑے بڑے ادیب، شاعر، موسیقار، آرٹسٹ، پینٹر، رقاص وغیرہ پیرس، لندن، ماسکو، نیویارک، کلکتہ اور بمبئی جیسے لاکھوں انسانوں سے بھرے ہوئے ہے جنگلوں میں ابھرے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے کرشن چندر کا بمبئی کے بارے میں پہلا تاثر (میں ایک وحشی ہوں) غلط نہیں تھا۔ بمبئی کی معمولی چالوں میں رہ کر بھی ایک تخلیق کار بہت کچھ حاصل کر سکتا ہے۔ اردو کے ادیبوں نے نام و نمود کی پروا کئے بغیر چھوٹی چھوٹی رقموں کے عوض آرڈر پر بے سر پیر کی کہانیاں گھسیٹیں، ہلکے پھلکے مکالمے یا منظرنامے لکھے۔ لیکن ساتھ ساتھ ایسی کہانیاں اور ناول اور ڈرامے بھی تخلیق کرتے رہے جو ہمارے ادب کا ایک قابلِ قدر حصہ ہیں۔ غالباً اسی روز ایک الگ ملاقات میں راجندر سنگھ بیدی نے مجھے یہ قصہ بڑے دکھ بھرے لہجے میں سنایا کہ ایک مرتبہ شمی کپور نے انھیں محض ایک ڈائیلاگ رائٹر کہہ کر ڈائیلاگ سننے کے لئے اپنے ہاں بلایا۔ لیکن دو گھنٹوں تک وہ اپنے کمرے سے باہر نہ نکلا، تو آخر بیدی صاحب نے اس سے کہا ـــ "شمی صاحب! ہم بھی کسی میدان کے تمہاری طرح اہم ترین ہیرو ہیں۔" یہ سن کر میرے سامنے بمبئی کی فلمی چمک دمک والی دنیا کا امیج کس قدر حقیر بن گیا ـــ مجھے حیرت ہوئی کہ یہاں کے ادیب و شاعر بھی اسی قسم کی ذہنیت کے مالک کیوں نہیں ہیں ـــ؟ میرے سامنے بیٹھا ہوا مہندر ناتھ اتنے خلوص سے قہقہے کیوں لگا رہا ہے؟ بار بار اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر کیوں پلا رہا ہے اور پھر اپنے ہی خرچ پر مجھے ٹیکسی سے کرشن چندر اور اعجاز صدیقی سے ملانے کے لئے کیوں لے گیا ہے؟ اتنے بے رحم اور خود غرض ماحول میں رہتے ہوئے وہ اپنے اندر کے انسان کو کیوں کر زندہ رکھے ہوئے ہے جو کسی بھی چھوٹے شہر، قصبے یا گاؤں میں تو یقیناً زندہ رہ سکتا ہے لیکن بمبئی جیسے شہر میں ہرگز نہیں۔

لیکن مہندر ناتھ واقعی ایک دردمند انسان تھا۔ فلموں کا ایک ناکام ہیرو ـــ اپنے ماحول کے ہاتھوں بے حد ستایا ہوا اپنے فلمی آقاؤں سے سخت بیزار لیکن انہی کے ساتھ رہنے پر مجبور بھی۔ اس کے بعد میں جب بھی سرکاری ٹور پر بمبئی گیا۔ اور مہندر جی سے ملا۔ تو میں نے اکثر اس کے یہاں ناکام ہیروؤں، گیت کاروں، موسیقاروں، ڈائرکٹروں وغیرہ کو دیکھا۔ وہ سب وقت گزارنے کے لئے ہی وہاں چلے آتے تھے۔ ان کی باتوں میں بھی اسی طرح کی مایوسی اور بیزاری کا احساس ملتا۔ جو مہندر جی کے یہاں موجود تھی۔ لیکن وہ سب جی رہے تھے اچھی زندگی گزارنے کے خوابوں میں جی رہے تھے۔ کبھی کبھی آدمی اس امید پر بھی جیتا رہ جاتا ہے کہ کبھی تو اس کے بھی دن پھریں گے ـــ کسی پروڈیوسر کو اچانک اس کی ضرورت پڑ جائے۔ وہاں میں نے ایک روز اردو افسانے کا ایک گمشدہ افسانہ نگار مدھوسدن کو بھی بیٹھے ہوئے دیکھا۔ جو 1942ء کے آس پاس ساقی میں چھپتا رہتا تھا۔ اُن دنوں وہ کسی ڈائرکٹر کا اسسٹنٹ تھا۔ اب تو وہ پورا ڈائرکٹر بن چکا ہے مہندر ناتھ اِن سب کا دوست تھا۔ ان کی دلجوئی کرتا۔ انھیں مشورے دیتا یا اپنے ساتھ رکھتا۔ کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا وہ امید کی روشنی بانٹنے والا ایک ہیرو پیامبر ہے۔ وہ کیوں جانتا ہے فلمی دنیا کی اس اقتصادی کشاکش میں جو ہمیشہ اتفاقی کامیابی کے سہارے ہی چلتی ہے۔ انھیں اب کوئی ہیرو نہیں بنائے گا۔ ان پر ترقی کے دروازے کبھی نہیں کھولے گا۔ پھر بھی وہ انھیں مایوس نہیں ہونے دیتا ہے۔ شاید وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان میں سے کوئی اچانک خودکشی کر بیٹھے۔ اس لئے وہ انھیں حالات پر ہنسنے کا سلیقہ بھی سکھایا کرتا ہے جس طرح وہ خود کھل کر قہقہہ لگاتا

ہے جس طرح وہ خود تجزیہ کرتا ہے اور اپنے اندر زندہ رہنے کی ہمیشہ ایک نئی امنگ پیدا کرتا رہتا ہے۔

ترقی پسند تحریک نے ہمیں ایک ایسا سیکولر مزاج بھی دیا ہے۔ جو انتہائی آزمائشی دور میں بھی اس اعتقاد کو متزلزل نہیں ہونے دیتا کہ انسان بنیادی طور پر ایک سے ہے نیک ہے اور اپنے اندر محبت سے بھرا دل بھی رکھتا ہے۔ سردار پٹیل سے سیاسی اختلاف رکھنے کے باوجود اس کی ایک تقریر کا حوالہ دے رہا ہوں۔ جو اس نے بطور وزیر داخلہ پارلیمنٹ میں آزادی کے فسادات کا ذکر کرتے ہوئے کی تھی اور کمیونسٹوں کے مزاج کو پیش کرتے ہوئے کہا "اس جذباتی طوفان میں صرف اسی جماعت کے لوگ ثابت قدم رہ سکتے ہیں۔" مہیندر ناتھ کی تربیت میں ترقی پسند تحریک کے علاوہ ان کے بڑے بھائی اور ملک کے قابلِ قدر افسانہ نگار کرشن چندر کی شخصیت کا بھی یقیناً یوگ دان رہا ہے۔ اپنی زندگی کے ذاتی رویوں سے اور تخلیق کئے ہوئے افسانوں اور ناولوں سے مہیندر ناتھ ایک سو فیصدی کھری، سچی اور قابلِ تقلید غیر فرقہ پرست شخصیت تھے۔ اس معاملے میں مجھے ان کے دامن پر ایک بھی داغ یا دھبہ نظر نہیں آیا۔ انھوں نے اس نظریئے کو کبھی کسی سطح پر قبول نہیں کیا کہ آدمی کسی خاص مذہب کا مقلد بن کر بھی ایک اچھے متوازن انسان کی سی زندگی بسر کر سکتا ہے، ہر مذہب ایک خاص فرقے کو جنم دیتا ہے۔ ہر خاص فرقہ کچھ بنیادی تعصبات کی تبلیغ کرتا ہے اور انہی کی چھتر چھایا میں پنپتا ہے۔ اس کے مقابلے میں لامذہبیت بنیادی طور پر انسانی رشتوں کے استحکام اور ان کے حل تلاش کرنے پر زور دیتی ہے۔ مہیندر ناتھ کے افسانوں اور ناولوں میں اس کے ان نظریات کو باآسانی تلاش کیا جا سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی بعض تخلیقات کا مطالعہ ایک ذہین قاری کے دل میں اس وجہ سے گھٹن کا احساس پیدا کر دے کہ وہ اس کے لئے تخلیقی تسکین کا سامان بننے میں ناکام رہ جاتی ہیں۔ لیکن یہ گھٹن اس گھٹن سے یقیناً مختلف ہوتی ہے۔ جو کسی نہ کسی مذہبی نظریہ کا مائیہ بنانے کی تخلیقی کوشش سے منتج ہو جاتی ہے۔ تخلیقی ادب میں یہ کمزوری حقیقت پسندی کی طرف مراجعت کی وجہ سے ہی در آئی ہے۔ اگرچہ حقیقت پسندی بجائے خود ایک بہت بڑا تخلیقی تجربہ ہے جو ترقی پسندوں کو بھی بے حد عزیز ہے۔ مہیندر ناتھ بھی بڑی حد تک حقیقت پسند ہی واقع ہوئے تھے، جو کچھ وہ دیکھتے تھے اسے بڑی فن کاری سے پیش بھی کر دیتے تھے جس میں طنز کا پہلو ہمیشہ واضح رہتا تھا۔ ان کے بیشتر افسانے انفرادی آزادی کے ہی ترجمان ہیں۔ جن میں رومان، جنسی بھوک اور سماجی نابرابری کے عکس بے حد نمایاں ہیں۔ سید احتشام حسین (مرحوم) سید سجاد ظہیر (مرحوم) سید وقار عظیم اور دوسرے کئی نقاد اِن کی تخلیقات کا جائزہ لے چکے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اگرچہ مہیندر ناتھ کی اردو افسانہ و ناول نگاری میں، ایک انفرادی حیثیت کی نشاندہی کرنے میں ناکام ہی رہا ہے لیکن انھوں نے اس بات سے کبھی انکار نہیں کیا کہ مہیندر ناتھ ترقی پسند تحریک کے سائے سائے میں چلنے والے ایک چھوٹے سے مگر اہم ترین گروہ کے ایک نمایاں رکن تھے۔ میرا خیال ہے مہیندر ناتھ کی تخلیقات، حقیقت پسندی کے نقطۂ نظر سے بھی اور گہرے مطالعے کی متقاضی ہیں۔ اس وقت مجھے اُن کے ناول "آدمی اور سکے" اور اس کے ساتھ ساتھ ان کا ترجمہ کیا ہوا آئنٹ مین کا ناول "بھوک" بھی یاد آ رہا ہے جو اردو میں موجود ناولوں کے ایک بہت اچھے ذخیرے میں بہت ہی اہم افسانہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

مہیندر ناتھ کی وابستگی کئی رسالوں کے ساتھ بھی رہی ہے۔ وہ شاہکار (الہ آباد) (جو اب بنارس سے شائع ہوتا ہے) کی مجلس مشاورت میں پندرہ سولہ برس تک رہے ہیں۔ اس کے علاوہ رسالہ "شاعر" بمبئی کے ساتھ تو آخری دم تک وابستہ رہے۔ جس کے مدیر محترم اعجاز صدیقی صاحب سے میری پہلی ملاقات بھی اُنہی کے توسط سے ہوئی تھی۔ میں جب بمبئی گیا تھا تو مہیندر جی مجھے ٹیکسی میں بٹھا کر ان کے دولت کدے پر لے گئے تھے۔

مہیندر جی سے یوں تو میری کئی ملاقاتیں دلی، بمبئی اور لکھنؤ میں ہو چکی ہیں جن میں سے کئی ملاقاتیں یادگار رہیں۔ لیکن ان سے آخری ملاقات گذشتہ سال 25 جولائی 1973ء میں بمبئی میں شری شیام کشن نگم کے مکان پر ہوئی تھی۔ جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا۔ وہاں آل انڈیا غیر مسلم اردو مصنفین کی تیاری کمیٹی کی ایک میٹنگ بلائی گئی تھی۔ جس میں ان کے علاوہ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، ساحر لدھیانوی، خواجہ احمد عباس،

سردار جعفری، کنور مہندر سنگھ بیدی، راما نند ساگر، خواجہ عبدالغفور، سید محمد زیدی، سلمیٰ صدیقی، خلش جعفری، ڈاکٹر منظر انصاری، وغیرہ تیس کے قریب ادیب، شاعر اور صحافی شریک ہوئے تھے۔ اس موقع پر بمبئی کی جو کمیٹی بنائی گئی تھی اس کے کنوینرز میں راجندر سنگھ بیدی کے علاوہ مہیندر ناتھ کا بھی نام تھا۔ بحث و مباحثے کے دوران مہیندر جی نے کہا تھا۔ "میں اس کانفرنس کو اپنا پورا تعاون دینے کے باوجود لفظ "غیر مسلم" کو ذہنی طور پر قبول نہیں کر پا رہا ہوں اس میں سے مجھے CHAUVINISM کی بو آتی ہے۔"

اگرچہ میں نے انھیں یہ کہہ کر چپ کرا دیا تھا کہ ہم اسی CHUVINISM کے خلاف لڑنے کے لئے ہی غیر مسلم کا لفظ استعمال کر رہے ہیں۔ لیکن اب جب کہ موت کے ظالم ہاتھ نے مہیندر ناتھ کو ہمیشہ کے لئے خاموش کرا دیا ہے اور ہماری مذکورہ بالا کانفرنس بھی ختم ہو چکی ہے لیکن لسانی عصبیت کا بھیانک دیو ابھی تک زندہ ہے اسے کون خاموش کرائے گا؟ یہ سوال ابھی تک موجود ہے۔

بالکونی

میں بیٹھے ہوئے چمن بارش سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔ لیکن پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ آج چمن نے شیو بھی نہیں کی تھی بلیڈ خریدنے کے لئے جیب میں پیسے نہ تھے اور پھر صابن کی ٹکیہ بھی ختم ہوگئی تھی۔ اس نے اپنی پھٹی ہوئی بنیائن پر نگاہ ڈالی اور پھر بمبئی کی موسلا دھار بارش کو دیکھنے لگا۔ بارش کے لاتعداد قطرے زمین کو سیراب کر رہے تھے۔ سامنے ناریل کے درخت بارش میں نہا رہے تھے۔ نیچے سڑک پر لوگ چھتریاں لئے ہوئے رواں دواں تھے۔ کالے سیاہ بادل طوفان بدتمیزی کی طرح آسمان پر چھائے ہوئے تھے اور بارش تھمنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ آج کوئی دوست بھی ملنے نہیں آئے گا۔ آ جاتا تو چند روپے اس سے مانگ لیتا۔ جب وہ ہیرو بن جائے گا تو سب کا قرضہ چکا دے گا۔

— مہندر ناتھ

واجدہ تبسم

"م"

اردو کے قاعدے میں ایک حرف ہوتا ہے م —— میم —— مجھے اس حرف سے عشق ہے۔

م سے محمدؐ ——
کائنات کی وہ عظیم ہستی، جس نے اس اندھیری دنیا میں روشنی کے کبھی نہ بجھنے والے چراغ جلائے۔ ——

م سے ماں ——
قدرت کی وہ بیش بہا دولت —— وہ ماہر معمار جس کے ہاتھوں، بلکہ پیروں سے جنت کی تعمیر ہوئی ہے۔ ——

م سے محبت ——
اللہ کی پیدا کردہ بظاہر ایک غیر مادی شے، —— لیکن ساری دنیا جس کے سنہرے اور رنگین جال میں الجھی ہوئی ہے، اور الجھ کر بھی شاداں و فرحاں ہے۔ ——

م —— م —— م ——

اور م سے مہندر ناتھ —— !

ممتا ماؤں کے چہروں پر ہوتی ہے —— لیکن مہندر ناتھ کے چہرے پر جو ممتا، نرمی، ملائمیت اور دلکشی تھی وہ ماؤں کے حصے میں بھی کم ہی آئی ہے —— ہمیشہ ایک میٹھی سی معصوم مسکراہٹ۔ ان کے خوبصورت چہرے پر چھائی رہتی ——

میں بہت ہی آؤٹ اسپوکن outspoken ہوں۔ سب سے پہلے جب میں مہندر ناتھ سے ملی تو تعارف کے بعد پہلی بات میں نے ان سے یہی کہی —— "آپ تو ذرا بھی رائٹر نہیں لگتے۔" ——

اُن کے معصوم چہرے پر ایک گڑبڑاہٹ سی نمودار ہوگئی ——

"جی —— ؟" وہ حیرت سے بولے ——

"جی ہاں —— آپ تو اتنے ہینڈسم ہیں کہ آپ کو فلموں میں ہیرو ہونا چاہیے تھا ——

انہوں نے مسکرا کر، بڑے اطمینان سے ایک گہری سانس لی ——

بعد میں مجھے پتہ چلا کہ وہ واقعی فلموں میں ہیرو بھی رہ چکے ہیں —— اور ادب میں بھی ہیرو بنے ہوئے ہیں ——

بلند و بالا قد —— گورا رنگ —— خوبصورت ماتھا —— حسن و جوانی کا دلکش پیکر —— یہ عجیب بات ہے وقت اور زمانے کی گرد نے ان پر کوئی پتہ نہیں چڑھائی —— وہ مجھے سدا ایسے ہی نظر آئے دھلے دھلائے —— بے داغ —— نتھرے ستھرے

جیسا میں نے انہیں آج سے پندرہ سالوں پہلے دیکھا تھا ـــــ اور وہ مسکراہٹ : جو ان کی شخصیت کا سب سے نمایاں حصہ تھی، کبھی اُن کے چہرے سے الگ نہ دیکھی ـــــ غالب نے خاک سے پوچھا تھا ـــ اے کنجوس تو نے ایسے ایسے عظیم لوگوں کو کہاں چھپا دیا۔ کیونکر مٹا دیا ـــــ

مَیں آگ سے پوچھتی ہوں ـــــ ایسی محبت بھری ہستیوں کو جلاتے تیرا اپنا کلیجہ خاک نہیں ہوتا ـــــ ؟

مٹی اور آگ اپنے اپنے کام کرتی رہیں گی ـــــ پیاری پیاری صورتوں کو مٹاتی جلاتی رہیں گی۔ ہم صرف روتے رہیں گے کہ آنکھوں کا کام ہی آنسو بہانا ہے موتی رولنا ہے ـــــ (۴ سے موتی ـــــ)

میں زندگی میں مہندر جی سے اس قدر کم ملی ہوں کہ ساری ملاقاتوں کو جمع کردوں تو ایک گھنٹہ بھی نہ بن پائے ـــــ لیکن جب جب بھی ملی ان کی شخصیت نے مجبور کیا کہ مہینوں انہیں یاد رکھوں ۔ ایسا سیدھا، ایسا سچّا، ایسا کھرا انسان !!

میرے میاں بھی کتابوں کا کام کرتے رہتے ہیں ـــــ مجھ سے زیادہ مہندر جی سے وہ ملے ہیں۔ ـــــ ایک دن مہندر جی کے پاس سے آئے تو بڑے اداس تھے ـــــ میں نے پوچھا ـــ کیا ہوا ـــــ ؟"

کہنے لگے ـــــ مَیں مہندر ناتھ کے پاس گیا تھا ـــ کتابوں کے سلسلے میں ـــ انھوں نے مجھے چائے نہیں پلائی نہیں پلا سکے ـــــ"

"ارے واہ چائے نہیں پلائی تو کیا ہو گیا ـــــ میں بنائے دیتی ہوں ـــ" مَیں کچن کو جانے لگی تو اشفاق بولے ـــ

"نہیں وہ بات نہیں ـــ"

"تو کیا بات ہے پھر ـــ؟"

اشفاق رک رک کر کہنے لگے ـــ" مہندر ناتھ نے صرف ایک پیالی چائے کا آرڈر دیا اور مجھ سے کہنے لگے ـــــ

"بھئی اشفاق صاحب میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں کہ دوسری پیالی کا آرڈر دے سکوں ـــ آئیے اسی میں ایک ایک گھونٹ لے لیں ـــــ یہ سالے بمبئی والے چائے بھی تو آدھی پیالی ہی دیتے ہیں ۔

میں اشفاق کا منہ تکنے لگی ـــــ وہ بڑے درد سے بولے ـــــ "سچ یہ کتنی بڑی بہادری ہے کہ انسان غریب ہو تو اس کا اقرار اور اعلان بھی کرے ـ" جب غریبی ماضی بن جاتی ہے تو لوگ بڑے فخر سے اس کا ذکر کرتے ہیں لیکن کتنے لوگ ہیں جن کے پاس یہ حوصلہ ہے ـــــ"

ایک بار مہندر جی نے اپنے گھر کا پتہ بتایا تو میں نے سخت حیرت کے ساتھ ان کا چہرہ دیکھا ـــــ

"جی ہاں ـــــ چھیرہ بلڈنگ ـــــ" وہ اپنی ازلی معصوم مسکراہٹ کے ساتھ بولے ـــــ

مَیں نے اپنے حسابوں انہیں بڑا اچھا مشورہ دیا ـــــ ویسے آپ چاہیں تو کرشن جی کے ساتھ بھی تو رہ سکتے ہیں۔ ان کا تو بہت بہت بڑا گھر ہے ـــ" میں نے بچوں کی طرح دونوں ہاتھ پھیلا کر کہا۔

وہ اتنی دیر تک چپ رہے کہ میں اپنے آپ کو سخت احمق نظر آنے لگی۔ ـــ پھر وہ بڑی آسانی سے مسکرا کر بولے ـــــ

"مَیں اکیلا ہوتا تو چلا بھی جاتا ـــــ لیکن میرے ساتھ تو لاکھوں لوگ ہیں ـــــ"

انہیں غریبوں کا درد، محض دکھاوے اور زبان کا نہیں تھا ـــــ میں امریکہ اور کنیڈا جا کر آئی تو ایک محفل میں وہاں کی لمبی لمبی کیڈلک، امپالا، فیلکن، گاڑیوں ـــــ ۴۴۶ ـــ دو لی جار جیٹ ساڑیوں اور بڑے بڑے پلازا اور شاپنگ سینٹرز کی باتیں سنا رہی تھی ـــــ مہندر جی نے مسکرا کر پوچھا ـــــ

واجدہ جی وہاں آپ نے غریبوں کے رہنے کی وہ جگہیں دیکھیں جنہیں یہاں 'جھونپڑ پٹی' کہا جاتا ہے "؟

میں نے ذرا شرمندہ ہو کر کہا ــــ "جی نہیں مہندر جی ــــ وہاں جانے کا دراصل موقع ہی نہیں ملا ــــ مگر کیا وہاں غریب ہوتے بھی ہوں گے ؟"

انہوں نے مجھے ایسی بزرگانہ شفقت سے دیکھا کہ میں بالکل بچہ سی لگی ۔

"ایز اے رائٹر آپ کو ایسی جگہوں پر ضرور جانا چاہیئے تھا ــــ اور رہی غریبی کی بات ــــ تو وہ کہاں نہیں ہے ؟"

میں اُن کا منہ دیکھتی رہ گئی ــــــــ

وہ میری کہانیاں بڑی باقاعدگی سے پڑھتے تھے ــــ حیدرآباد دکن کے نوابوں کے کرتوتوں پر میں نے کہانیاں لکھیں، تو ایک ملاقات میں انہوں نے بڑی خوشی کا اظہار کیا ــــــــ

"آپ کے اندازِ تحریر میں آج کل بہت نکھار آگیا ہے ــــ اسے قائم رکھیے ــــ" اور وہی ازلی معصوم مسکراہٹ (م سے مسکراہٹ !)

مہندر جی کے دل میں بہت سارے پروگرام تھے ــــ بہت سے حوصلے اور بہت سی امیدیں ــــ اتنے سارے کام انھوں نے اپنے ذمے لے رکھے تھے کہ حیرت ہوتی تھی ــــ لیکن اللہ میاں نے ان کے لئے صرف ایک ہی کام سوچ لیا تھا اور وہ تھا آرام مستقل آرام ــــــــ

اب وہ تو آرام کر رہے ہیں ــــ لیکن اپنے پیچھے کتنے سارے لوگوں کو بے آرام کر دیا ہے ــــ لوگ کتنا غلط کہتے ہیں کہ وقت ہر زخم پر مرہم لگا دیتا ہے ــــ میں اسے نہیں مانتی ــــ وقت بھلے مرہم ہو، لیکن یادیں ــــ یہ جان لیوا یادیں تو ان زخموں کو کبھی کھرچ کھرچ کر لہولہان کر دیتی ہیں جنہیں ماہ و سال کا شفیق اور مہربان ہاتھ تھپک تھپک کر مندمل کر دیتا ہے ۔

میں اپنے آپ کو بڑی خوش نصیب لگتی ہوں کہ مہندر جی سے اس قدر کم بار ملی میں اپنے آپ کو سخت بد نصیب لگتی ہوں کہ مہندر جی سے ملی ہی کیوں ــــ ؟

اردو کے قاعدے میں ایک حرف ہوتا ہے میم ــــ ! مجھے ایسا لگتا ہے مہندر جی مجھ سے مسکرا کر پوچھ رہے ہوں ــــ "آپ کو "م" سے عشق ہے نا ــــ ؟ لیکن آپ کو شاید یہ پتہ ہی نہیں کہ م سے کتنے الفاظ شروع ہوتے ہیں ۔ م سے موت بھی تو آتا ہے نا ــــــ ؟؟

"م" سے موت ــــ کتنا بھیانک ہے یہ لفظ ــــــــ

میں اس حقیقت کو جھٹلانا چاہتی ہوں ــــ لیکن نہیں جھٹلا پاتی ــــ قلم ۔ کاغذ ۔ آس پاس ــــ ساری چیزیں دھندلی پڑتی جا رہی ہیں ــــ وہ خوبصورت اور مسکراہٹوں کا امین چہرہ بھی ــــ سارا ماحول دھندلا گیا ہے ــــ میری آنکھیں موتی رولنے لگی ہیں ــــــ ▲

زہرہ جمال

چھوٹا بھائی بڑا آدمی

مہندر ناتھ جی کو میں نے چند مرتبہ ہی دیکھا بہت کم اِن سے بات ہوئی لیکن جو عزت اِن کے لئے پیدا ہوئی وہ کبھی ختم نہیں ہوئی۔ جو رائے ان کے لئے قائم کی کبھی بدلنی نہیں پڑی۔ جو خلوص اِن کے لئے محسوس ہوا باقی ہے۔

اس کی وجہ بھی ان کی ہستی ایک منکسر المزاج، انسانیت دوست، سچائی پسند ادیب ہی کو نہیں ایک بڑی خوبصورتی سے سلیقہ سے زندگی جینے والے ایک ہندوستانی کو اپنے اندر سمائے ہوئے بھی۔ ان میں سچائی سادگی اپنی ذات سے بے پروائی مگر سب سے محبت سب کی قدر سب سے رشتہ نظر آتا تھا۔ انھوں نے اُردو ادب کی اپنی کہانیوں اور ناولوں کے ذریعے اور صحافت کی "شاعر" کے ذریعے، بڑی خاموش اور مستقل خدمت کی۔ "ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا"

ترقی پسند مصنفین کو بھی بمبئی کے اس تجارتی ماحول میں دم توڑتے وقت اپنے کاندھوں پر اُٹھائے پھرے۔ بڑی کوشش کرتے رہے کہ ادب کے معمار اس کی نبضوں میں حرارت پیدا کر دیں۔ لیکن اچھا ہوا وہ اِن جیسے مخلص انسان کے ہاتھوں دفن تو ہوئی۔

مہندر ناتھ اس دنیا سے اچانک چلے گئے یہ خبر میں نے احمد عباس صاحب کے "آخری صفحہ" پر پڑھی

مجھے بہت صدمہ ہوا کئی دن تلملاہٹ سی رہی اتنا اچھا انسان اس دنیا سے چلا گیا۔۔ نیک دل اِنسان۔۔ جسے قدرت نے دیوتاؤں کی کسی بستی کے لئے تراشا ہوگا، بھیج دیا اس رزم گاہِ خیر و شر میں۔۔ اس کا دامن کبھی شر سے ملوث نہیں ہوا۔ ادبی محفلوں میں اب کوئی ایسا انسان نہ دکھائی دیگا جو، جو جب ملا ہو اس کا اخلاق اور برتاؤ یکساں نظر آیا ہو۔ غیر متغیر۔ بمبئی جیسے شہر میں جہاں تمدن بھی مصلحتوں میں اسیر ہے۔ کبھی لوگ بڑے خلوص اور تپاک سے ملتے ہیں۔ کبھی وہی لوگ انجان نظر آتے ہیں۔ جہاں کسی کو سلام کرنے سے پہلے سوچنا پڑتا ہے جواب دینا کہ وہ شایانِ شان تصور کرے گا یا نہیں۔ جی ہاں ادبی دنیا میں۔۔۔ اسی دنیا میں جہاں زندگی اور شعور کے ناطے، کبھی انسان اس طرح گلے ملتا ہے جیسے صدیوں کے رشتے ہوں۔ اور کبھی انہیں آنکھوں میں مروت کی ایک رمق بھی دکھائی نہیں دیتی بڑے عجیب تھے مہندر ناتھ جب نظر آئے ایک ہی سطح پر!

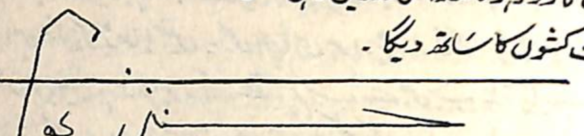
پہلی بار انہیں دیکھا تھا ۲۷ جنوری ۱۹۴۹ء کی ترقی پسند مصنفین کانفرنس کا اجلاس تھا بھوپال میں حمیدیہ کالج (موجودہ اسمبلی) کے وسیع ہال میں ترقی پسند ادبا و شعراء پہلی بار اس ادب خیز ادب پرست ادب نواز سرزمین میں جلوہ گر تھے۔ چلمنوں کے پیچھے کالج کی لڑکیاں اپنے محبوب ادیبوں اور شاعروں کو حسرت و بیکسی سے دیکھ رہی تھیں۔ بھوپال میں پردہ کی قیود سختی سے قائم ہے۔ میں اور میری خالہ زاد بہن عظمیٰ دونوں دسویں جماعت میں تھے۔ ہم دونوں چھوٹے تھے پردے کی قید سے آزاد سب کے آٹو گراف لے رہے تھے۔ شاہد لطیف۔ کرشن چندر۔ عصمت آپا۔ مولانا سلیمان ندوی ایک کونے میں ایک خوبصورت نوجوان تنہا کھڑا سگریٹ کا کش لے رہا تھا فلمی ہیرو معلوم ہو رہا تھا ہم دونوں جھجکتے جھجکتے پاس گئے آٹو گراف مانگا بڑے اخلاق سے

البم لیکر آٹو گراف دینے لگا اچانک شاہد لطیف قریب آئے اور مسکرا کر بولے ”کیوں مہندر تم تو کہتے ہو میں لڑکیوں سے دور بھاگتا ہوں“ مہندر ناتھ مسکرا کر چپ ہو گئے مگر ہم دونوں خفیف ہو گئے۔

لکھا تھا

آنے والا دور مزدور اور کسان کا دور ہوگا اور اس دور میں وہی شخص زندہ رہ سکے گا

جو مزدور اور دنیا بھر کے محنت کشوں کا ساتھ دیگا۔



ساری لڑکیاں جو ہماری بڑی بہنوں کے ساتھ پڑھتی تھیں ہم دونوں کو پھسلا کر آٹو گراف لانے کے لئے تیار کر رہی تھیں۔ ان میں آپس میں چھیڑ چھاڑ ہو رہی تھی۔ سبھی کو مہندر ناتھ بہت جچے تھے اتنا مجھے یاد ہے۔ انہیں باتوں کے دوران ہمیں بھی معلوم ہوا کہ مہندر ناتھ کرشن جی کے چھوٹے بھائی ہیں اور فلم میں ہیرو ہیں کہانیاں بھی لکھتے ہیں۔ کانفرنس کے بعد کرشن جی وغیرہ ہمارے گھر تشریف لائے۔ ابا، امی وغیرہ کے درمیان باتیں کرتے رہے۔ شاید مہندر ناتھ بھی تھے۔ مگر جھینپ کے مارے اتنے بڑے بڑے ادیبوں کے درمیان جانے کی ہمت مجھ میں نہیں ہوئی۔

اس کے بعد ۱۹۵۳ء میں میں اپنے والد مرحوم کے ہمراہ بمبئی آئی E.N.T کے ڈاکٹر کو پر کو دکھانے کے لئے خلافت ہاؤس میں مرحوم زاہد چچا کے پاس ٹھہرے تھے۔ ایک بار بس میں کہیں جا رہے تھے کہ ایک صاحب داخل ہوئے اور بڑی گرمجوشی سے اباجی سے ملے پاس بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے۔ جب وہ اتر گئے تو میں نے پوچھا ”اباجی یہ صاحب کون تھے“ اباجی نے کہا۔ مہندر ناتھ۔ بڑا مخلص لڑکا ہے۔ بڑی محبت سے ملتا ہے۔ جہاں بھی مل جاتا ہے“

مہندر ناتھ سے اباجی کی پہچان غالباً ان دنوں زیادہ بڑھی ہوگی جب کرشن جی کے جہانگیر بنگلہ والے گھر میں میری بہن اختر جمال اور احسن علیخاں کی شادی ہوئی تھی اور امی اور اباجی وہاں گئے تھے۔ لیکن مجھے ذرا مہندر ناتھ کے اس برتاؤ پر اچنبھا ہوا۔ میں نے تو سنا تھا کمیونسٹ، بزرگوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے قدامت پسندوں سے نفرت کرتے ہیں۔

لیکن یہ مہندر ناتھ ۴۸ والے مہندر ناتھ سے زیادہ مشابہ نہیں رہے تھے۔ سر کے بال بھی کچھ انکار کی نذر ہو گئے تھے اور چہرہ پر زندگی کی جد و جہد کے نقوش عیاں تھے حسن و اخلاق وہی تھا۔

دوسری بار پھر مہندر ناتھ بس میں مل گئے۔ اس بار میرا بھائی راشد ساتھ تھا اس نے میرا تعارف کروایا تو مہندر ناتھ نے بہت اصرار کیا کہ ترقی پسند مصنفین کے جلسہ میں ریڈ فلیگ ہال میں شریک ہوں اور اپنی کہانی پڑھوں۔ اس وقت میں انٹرمیڈیٹ کی طالبہ تھی میں نے اس جلسہ میں شرکت کی کہانی پڑھی۔ پہلی بار علی سردار جعفری صاحب اور کیفی اعظمی صاحب اور سلطانہ باجی صاحبہ جیسی شخصیتوں سے ملاقات ہوئی۔ مجھے یاد ہے۔ سلطانہ باجی نے مجھے گلے لگا لیا اور سردار جعفری اور کیفی اعظمی نے بہت حوصلہ افزائی کی کہ میں لکھا کروں۔ شاید اس حوصلہ افزائی نے میرے اندر خود اعتمادی پیدا کی اور میں لکھنے لگی۔

لیکن دلچسپ بات یہ تھی کہ مہندر ناتھ اس جلسہ سے غائب تھے۔ جب ہم لوگ خلافت ہاؤس واپس آئے تو معلوم ہوا کہ مہندر ناتھ کرشن جی کے ساتھ کسی جشن سالگرہ میں مدعو تھے۔ پیارے میاں مرحوم بڑے مسخرے تھے۔ میرا مذاق اڑانے لگے کہ مہندر ناتھ نے تمہیں بلایا تھا۔ وہ تو دعوت میں تھے۔

بمبئی کے متعلق میں نے سنا تھا کہ اتنا بڑا شہر ہے کہ میلوں نکل جاؤ کوئی جانا پہچانا چہرہ دکھائی نہیں دیتا مگر مجھے یقین تھا

کوئی دکھائی دے یا نہ دے مہندرناتھ ضرور کسی بس میں دکھائی دیں گے۔

۱۹۵۸ء میں والد کی وفات کے بعد بمبئی میں آکر بس گئے تو یہی مہندرناتھ اسی نورلمیٹیڈ میں اکثر نظر آنے لگے۔ ہمیشہ پہچان جاتے۔ خیریت معلوم کرتے اور چلے جاتے۔ تعلق چھوٹا سا تھوڑا سا ہی تھا اتنا ہی رہا مگر تعجب ہے کہ رہا۔ جب کہ تعلقات بڑھتے ہیں بہت بڑھتے ہیں اور پھر گھٹتے ہیں۔ گھٹتے چلے جاتے ہیں۔ اور بے تعلقی رہ جاتی ہے۔

اس تعلق کو بڑھایا نہیں یہ بھی اچھا ہی ہوا۔ بڑھانے کو ہمیشہ جی چاہتا رہا۔ وہ یوں کہ کرشن جی کو میری بہن نے راکھی باندھی تھی کرشن جی بہنیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ ہم سب سے بھی جب ملتے پیار سے ملتے۔ اس لئے میرا دل چاہتا تھا کہ میں مہندر جی کو راکھی باندھ دوں، لیکن ایسا موقع آیا نہ اُس کا اظہار ہی کبھی کیا۔ دل ہی دل میں انہیں اپنے حصہ کا بھائی سمجھنے لگے۔ وہ چلے گئے مگر جیسے راکھی جو باندھی نہ تھی آج بھی میرے ہاتھ میں ہے۔ سوچتی ہوں اتنا سا پاس آکر زیادہ اچھائیاں دیکھ کر ان کے یوں چلے جانے کی تڑپ اور بڑھ جاتی۔

پچھلے برسوں میں دو بار ترقی پسند مصنفین کو احمد عباس صاحب کے یہاں جمع ہونے کے مواقع مہندرناتھ نے دیئے نہ جانے کیا کیا جتن کئے ہوں گے اُنھوں نے — لیکن ہمیشہ ہی تنقید کے الفاظ نے خشت باری کی شکل اختیار کرلی، وہاں بھارت شروع ہوگئی مہندر جی کو بس اس کوشش میں مصروف دیکھا کہ ہر سمت کا تیر خود جھیل لیں، درمیان آکر — ٹھیس نہ لگ جائے کہیں آبگینوں کو

خیال خاطر احباب چاہیئے — مگر اتنی ؟

اور پھر آبگینے ٹوٹ گئے — پھر کبھی مہندرناتھ ادیبوں کو ادب کی خاطر جمع نہ کرسکے —

یہی وجہ ہوگی کہ اُنھوں نے اپنی توجہ اور عملی خلوص فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری کی حیثیت کے لئے وقف کردیا۔ وہاں کام کرتے رہے۔

میں نے فلموں کے لئے کچھ نہیں لکھا لیکن لکھنے کا مادہ اور شوق کافی عرصے تک دماغ پر حاوی رہے۔ چند بار فلم رائٹرز ایسوسی ایشن میں بھی جانا ہوا۔ وہاں بھی اسی متین خلوص اور ملنساری سے مہندرناتھ پیش آتے رہے۔

ایک بار میں ذہنی طور پر بےحد پریشان تھی مہندرناتھ اندھیری میں مل گئے۔ میں نے ان سے کہا "جن لوگوں کو زندگی اور انسانیت کے بلند رشتوں سے پہچانا۔ ان کی عزت اور توقیر کی وہی زندگی اور انسانیت کے دشمن کیوں نظر آتے ہیں ؟ کیا زندہ رہنے اور عزت سے زندہ رہنے کا حق بھی کسی کو نہیں دے سکتے۔

میرا اشارہ چند ایسے لوگوں کی سمت تھا جنھیں ترقی پسند تحریک کے بلند آدرشوں کی وجہ سے جانا تھا لیکن سبب کہ سنگین حالات سے زندگی گذر رہی تھی اُنھوں نے سخت رُوحانی اور ذہنی اذیتیں پہونچائی تھیں

مہندر جی نے میرے کھولتے ہوئے احساس کو اپنی سُلجھی ہوئی نصیحت سے مطمئن کردیا۔ "اُنھوں نے کہا" جب تک انسان کا ضمیر زندہ رہتا ہے۔ وہ کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کرتا۔ کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیتا" اور جب ضمیر مردہ ہوچکا ہے تو زیادتی کا شکوہ کس سے کیا جائے کون سُنے گا "۔ اتنی وزنی تھی یہ بات کہ میں نے ہمیشہ کے لئے بےضمیر لوگوں سے بےنیاز ہی رہنے کا فیصلہ کرلیا۔ ہر ردعمل چھوڑ دیا۔

نتیجہ بھی ٹھیک ہی نکلا — رفتہ رفتہ ساری آوازیں خاموش ہوگئیں۔

لیکن میں آج بھی جب اپنی اس ذہنی حالت کو یاد کرتی ہوں جب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ہر طرف سانپ پھن پھیلائے ہیں درمیان میں میں بےبس و لاچار کھڑی ہوں — اور مہندرناتھ کا وہ راستہ چلتے چلتے اندھیری کی سڑک پر سمجھاتے جانا — جیسے

کرشن جی بانسری کی کوئی تان تھی جس نے سارے چاک روح کے سی دیئے۔ یہ بات مجھے جب یاد آئی ہے تو آنسو چھلک پڑتے ہیں۔

میں نے جب کسی کو مہندر ناتھ کا ذکر کرتے سنا — اچھائیوں کا ایثار دوستی اور محبت ہی کا ذکر ہوتا۔ تعریف ہی ہوتی کچھ ہی دن پہلے خدیجہ باجی (بیگم جاں نثار) ان کا ذکر کر رہی تھیں اور درگا بھابی کا — میں نے کہا — میں نے درگا بھابی کا ذکر ہی سنا ہے۔ جی چاہتا ہے کبھی ان سے ملوں — اور وہ کہاں رہتی ہیں یہ سب تفصیل مجھے معلوم ہوئی۔ میں نے سوچا دادر سے تو میں روز ہی گذرتی ہوں۔ اسکول آتے جاتے ایک دن ضرور جاؤں گی مہندر جی۔ گیا کے گھر — خدیجہ کہہ رہی تھیں کسی سے بھی پوچھ لینا کوئی بھی پتا بتا دیگا چھبرا والی بلڈنگ۔ ایکدن میرے بھائی نے کہا "آپا مہندر جی ملے تھے۔ آپکو پوچھ رہے تھے۔ بڑی محبت سے ملتے ہیں کہہ رہے تھے کہ آپ فلم رائٹرز کالونی کے لئے درخواست دے دیجئے۔ وہ بڑی کوشش کر رہے ہیں۔ عنقریب پلان تیار ہو جائے گا۔ میں بہت خوش ہوئی۔

ہاں بھیا ضرور دیدو۔ تمہاری تو "مدہوش" بن چکی ہے۔ اچھا ہے ادیبوں کی کالونی میں مکان مل جائے گا۔

مکان کتنا بڑا مسئلہ ہے جس کے حصول کے لئے زندگی خود ختم ہو جاتی ہے۔ اور پھر بھی نہیں ملتا — لیکن — اس کالونی کی تعمیر سے پہلے کہ میں دادر اتر کر مہندر جی کی کالونی میں جاتی جہاں کوئی بھی ان کا پتہ بتا سکتا تھا۔ اُنھوں نے اپنا پتہ بدل دیا۔

وہ پھول بن کر گنگ وجمن کی گہرائیوں میں بہنے لگے۔ راکھ بن کر دھرتی کے خزانے میں مل گئے۔ صندل کا زعفران بن کر فضاؤں کی بلندیوں پر کہیں جا بسے۔

اور اس جسم میں جو نور تھا وہ کیا ہوا — انسانیت کا نور — چاند کی روشنی اس نور سے قائم ہے جو وہ انسانوں سے چراتا ہے۔ سورج سے نہیں — جبھی چاندنی نرم ٹھنڈی اور مدہم ہوتی ہے۔

مہاتما بدھ نے رشٹ مارگ (اشٹانگ) کا جو تصور دنیا کو دیا تھا۔ زندگی میں اسکی ایک لکیر بنا کر اندھیری سے دادر تک ایک ادیب نے جو درمیانے قد کا آدمی تھا۔ چھوڑی ہے — اندھیروں میں بھٹکتے انسان اپنے ڈگمگاتے قدم اس پر رکھ دیں۔ —

تو — ایک انقلاب آئے گا —"

راجیو مرزا

اُردو ادب کا لکشمن

کہیں کسی ملنگ کو کہتے سنا تھا۔

"رام نے ہر یُگ میں جنم لیا ہے۔ کسی زمانے نے دوسرا لکشمن پیدا نہیں کیا۔"

پتہ نہیں یہ کتھن کس حد تک ٹھیک ہے۔ لیکن میں . . . . اتنا جانتا ہوں ایک لکشمن ہمارے دور میں پیدا ہوا ہے۔ جسے میں اُردو ادب کا لکشمن کہتا ہوں۔ جب ساہتیہ کا رام سماج کے راکششوں سے برسرِ پیکار ہوتا ہے، جب وہ تنہائی کا بن باس بھوگتا ہے۔ تو یہ لکشمن . . . . اُس کا ساتھ دیتا ہے۔ اور جب زندگی کی بے رحمی راون کے روپ میں اس کے سکون کی سیتا کو اٹھا کر لے جاتی ہے اور تنہائی کے جنگل میں بھٹکتا ہوا رام شکستہ دل ہو کر ظلم و استبداد کی لنکا کو بے بسی سے دیکھتا ہے تو اپنے دوش بدوش لکشمن کو پا کر ایک نئے عزم کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اپنے بھائی کی مدد سے لنکا پر یلغار کرتا ہے تاکہ اپنی سیتا کو چھڑا لائے۔

اردو ادب کا یہ رام کرشن چندر ہے اور لکشمن اس کا چھوٹا بھائی مہیندر ناتھ ــــ!

آج میں آپ کو اپنے یُگ کے اسی لکشمن کے بارے میں کچھ بتا رہا ہوں۔

میں اپنی زندگی میں سب سے زیادہ مہیندر ناتھ سے متاثر ہوا ہوں۔ مہیندر ناتھ کو میں نے ایک اچھا مصنّف، بہت اچھا انسان اور سب سے اچھا بھائی پایا ہے۔ پہلے پہل میں نے مہیندر ناتھ کو کرشن چندر کے گھر میں دیکھا تھا۔ اُن دنوں میں کرشن چندر کا اسسٹنٹ تھا۔ پرسنل سیکرٹری جیسا۔ تب وہ کھار میں پندرہویں راستے پر واقع "گرو نواس" نامی عمارت میں رہتے تھے۔ کرشن جی کے یہاں میں صبح ساڑھے نو بجے پہنچتا تھا۔ اُن کا لکھنے کا کمرہ باہر کی طرف کونے میں برآمدے کے پاس تھا۔ میں اپنی آمد کی اطلاع ان کے کمرے کی کھڑکی سے دیا کرتا تھا۔

ایک دن صبح میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ تو کچھ لوگ وہاں بیٹھے تھے۔ میں نے حسبِ معمول کھڑکی کے شیشے کو ہلکے سے تین بار کھٹکھٹایا۔ کرشن جی نے عادتاً ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "اچھا بھئی"

میں گرو نواس کے چھوٹے سے باغیچے اور برآمدے کے درمیان پختہ روش پر ٹہلنے لگا۔ کھڑکی کے سامنے سے گزرتے ہوئے میری نظر ہر بار کمرے میں بیٹھے ایک شخص پر پڑ رہی تھی۔ ایک کہیں دیکھا ہوا سا چہرہ . . . . . میں سوچنے لگا۔ ان صاحب کو کہاں دیکھا ہے؟ دماغ پر بہت زور دینے پر یاد آیا کہ اس چہرے کو میں نے فلم "زلزلہ" میں دیکھا تھا۔ اور تب میں اس یونانی خد و خال اور خوبصورت شخصیت والے آرٹسٹ سے متاثر ہوا تھا۔ اور فلم دیکھنے کے بعد عادت کے مطابق سوچ رہا تھا۔ فلم ڈائرکٹر بن جانے پر اس اداکار کو اپنی فلموں میں سکندرِ اعظم اور جولیس سیزر کا رول دیا جا سکتا ہے۔ اور اس وقت میرے تصور کا وہ ہیرو میری کبھی نہ بننے والی فلموں کا

سکندر اور سیزر میرے بہت قریب اندر کمرے میں بیٹھا تھا اور پھر اچانک میں نے اس چہرے میں کرشن چندر کی جھلک محسوس کی۔ ... تو ---؟ کیا یہ ..... مہیندر ناتھ ہیں؟ کرشن چندر کے بھائی۔ اردو کے مشہور ادیب --- "آدمی اور سکے"، "جہاں میں رہتا ہوں"، "اور ہندوستان سے پاکستان تک" کے مصنف --- اندر بیٹھے ہوئے لوگ ہنوز دلجمعی سے بات کر رہے تھے۔ میں کچھ وقت گزاری کے لئے قریب ہی کھار لنکنگ روڈ پر ایرانی ریستوراں فیئر ڈیل میں قہوہ پینے چلا گیا۔ قریب آدھ گھنٹہ بعد لوٹ کر آیا تو کرشن جی کے پاس آئے ہوئے لوگ جا چکے تھے۔

میں مشہور شخصیتوں یہاں تک کہ اپنے محبوب فنکاروں سے بھی ملنے سے گھبراتا ہوں (غالباً مجھے اپنے تصور کی شکست سے ڈر لگتا ہے) مہیندر ناتھ سے ملنے کا آرزو مند تھا۔ اپنے "ہیرو" سے میری پہلی ملاقات رنجیت اسٹوڈیو دادر میں ہوئی۔ ان دنوں میری صرف ایک ہی حیثیت تھی کرشن چندر کا اسسٹنٹ! مجھے پتہ چلا فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کے جنرل سیکرٹری مہیندر ناتھ ہیں۔ تعارف کرانے والے نے جب بتایا کہ میں کرشن چندر کا اسسٹنٹ ہوں تو مہیندر ناتھ نے چونک کر دیکھا۔ کرسی سے اٹھتے ہوئے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ "آپ بھائی صاحب کے ہاں کام کرتے ہیں" ہاں آپ کو وہاں دیکھا تو تھا۔

یہ رسمی سی ملاقات بہت مختصر تھی۔ لیکن یہ رسمی سی مختصر ملاقات ایک دائمی تعلق کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ مہیندر ناتھ کی حلیمی، خوش اخلاقی اور نیک دلی نے مجھے ان کا گرویدہ بنا دیا۔ اُن سے مل کر مجھے پتہ چلا کہ شیطانوں کی اس نگری (فلم انڈسٹری) میں کچھ فرشتے بھی ہیں۔ گھائل اور افسردہ فرشتے ....

مہیندر ناتھ ایک عرصہ سے فلم انڈسٹری سے منسلک ہیں۔ وہ فلموں میں ہیرو بھی رہ چکے ہیں اور کیریکٹر آرٹسٹ بھی۔ آج کل وہ فلموں کے لئے کہانی اور مکالمے لکھتے ہیں۔ ان کے جیسا حلیم اور ایماندار لیکن صاف گو اور خود دار فلم انڈسٹری میں کامیاب نہیں ہو سکتا تھا --- وہ کامیاب نہیں ہیں --- کیونکہ وہ گھٹیا ان پڑھ اور احمق فلم سازوں، ہدایت کاروں اور دیگر صاحب اقتدار لوگوں کی چمچہ گیری نہیں کر سکتے۔ وہ فلموں میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ وہ کسی فلمی گُٹ یا گروپ کے ممبر نہیں ہیں۔ ان کے قلم میں بہت روانی ہے لیکن ان کی زبان تیز نہیں ہے۔ وہ چرب زبانی سے ناآشنا ہیں۔ کسی بھی قسم کی سیاست سے وہ بہت دور ہیں۔ وہ کسی کے تلوے چاٹنا نہیں جانتے۔ وہ ٹوٹنے میں یقین رکھتے ہیں مُڑنے میں نہیں وہ (احتراماً) جھکتے ہیں تو صرف کرشن چندر کے سامنے۔ اس لئے نہیں کہ وہ بہت بڑے ادیب یا بہت بڑے آدمی ہیں۔ صرف اس لئے کہ وہ اُن کے بھائی ہیں۔ اُن کے بڑے بھائی (رام) کرشن چندر۔ جن کی شکل میں غالباً انھیں اپنے شفیق والد مرحوم کی صورت نظر آتی ہے۔

مہیندر ناتھ کا قصور یہ ہے کہ وہ اس زمانے میں بھی ایماندار اور معصوم ہیں۔ وہ تقریباً چوتھائی صدی تک بمبئی جیسے عیار شہر اور فلم جیسی مکّار انڈسٹری میں رہنے کے باوجود اپنی خاندانی شرافت اور انسانی عظمت سے منحرف نہیں ہو سکے وہ چاہتے تو ساز باز کر کے غیر ملکی دوروں پر جا سکتے تھے۔ بہتیرے ایوارڈ اور اعزاز حاصل کر سکتے تھے۔ وہ اے کلاس فلموں کے پچاس ہزار کے کنٹریکٹ حاصل کر سکتے تھے۔ لیکن وہ اپنے اصول اور خودداری بیچنے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ انھیں ابن الوقتی نہیں آئی۔ معاشیات کا اژدھا اپنی آتشی پھنکاروں سے ان کے کردار کے وقار کو جھلسا نہیں سکا۔ اُن کا جسم شاید بمبئی کی آلائشوں سے آلودہ ہے لیکن ان کی روح اس نئی تہذیب کی ہر غلاظت سے مبرّا ہے۔ انھیں نہ بمبئی پسند ہے نہ فلم انڈسٹری۔ لیکن لکشمن رام کو چھوڑ کر کہاں جائے۔

کرشن چندر کی طرح ان کا بچپن اور لڑکپن بھی کشمیر کے مرغزاروں میں گزرا ہے۔ کرشن چندر نے اس وادی جنت کے حسن کو اپنی تحریروں میں بھر لیا ہے۔ لیکن مہیندر ناتھ نے اس حسن اس کی پاکیزگی اور اس کی معصومیت کو اپنی شخصیت میں جذب کر لیا ہے۔

اس آج کی مکروہ دنیا میں جب کہ لگتا ہے کہ خدا کا دل بھی کالا ہو چکا ہے۔ پتہ نہیں مہیندر ناتھ ایسی اُجّول روح کہاں سے لائے ہیں جو دھندلاہٹوں کے اس دور میں آج بھی میلی نہیں ہوئی۔ میں نے دیکھا ہے کہ اپنی تنگدستی کے زمانے میں بھی وہ لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔ پتہ نہیں لوگ انھیں فارغ البال کیوں سمجھتے ہیں؟ شاید اس لئے کہ ان کے چہرے پر ہمیشہ ایک آسودہ تبسّم رقص کرتا ہے۔ اُن کا یہ تبسم ان کے چہرے اور دل

کی طرح خوبصورت ہے۔ وہ خوبصورتی کے پرستار ہیں۔ وہ سب کو خوبصورتی اور خوشی بانٹتے رہنا چاہتے ہیں اس لئے وہ مسکراتے ہیں۔ لیکن ہم ہمیشہ چراغ کی خوشنمائی کو دیکھتے ہیں۔ کیا کبھی یہ بھی سوچتے ہیں کہ یہ روشنی دراصل ایک آگ ہے۔ جس کی اذیت ناک حدت فقط چراغ کا بدن محسوس کرتا ہے ــــــ میں نے اس مسکراہٹ کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ یہ مسکراہٹ جو اکثر مطمئن اور سنجیدہ ہوتی ہے کبھی کبھی تلخ اور طنزیہ بھی ہو جاتی ہے ــ ایسی ہی مسکراہٹ کی سرگوشیاں میں نے سنی ہیں۔ ..... "مجھے معلوم ہے تم میرے ساتھ فریب کر رہے ہو۔" "ٹھیک ہے۔ میرے دوست ٹھیک ہے۔" "چلو جانے دو" "خیر ــ؟" "جی ہاں۔ جی ہاں ــ" "تم اتنے احمق ہو کہ میں اب کیا کہوں" "یہ بھی سہی۔" "ہم نے تسلیم کی خو ڈالی ہے۔" "اور ہگس قاب اغنیا ہوتا"۔ "بے حیائی نہیں تو اور کیا ہے"

مہیندر ناتھ کو اس بات پر دکھ اور اس سے زیادہ حیرت ہوتی ہے کہ لوگ آخر گھٹیا حرکتیں کیوں کرتے ہیں۔ معمولی سے مفاد کے لئے اپنے دوستوں اور عزیزوں کو فریب کیوں دیتے ہیں؟

مہیندر ناتھ کو اس بات کا قلق اور شکوہ ضرور ہے کہ فلم اور ادب نے ان کی ذہنی کاوشوں کا مناسب صلہ انھیں نہیں دیا۔ لیکن اس بات پر اطمینان بھی ہے کہ شہرت، عزت اور کسی حد تک دولت کرشن چندر (ساحر، بیدی، مجروح) کے قدم چومتی ہے۔ وہ دوسرے ادیبوں اور شاعروں کی خوشحالی دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ وہ آج بیدی کی فنی فلم "دستک" کی کامیابی دیکھ کر بہت مطمئن اور مسرور ہیں ــــ فلم رائٹرس ایسوسی ایشن کا جنرل سیکریٹری بن کر انھوں نے فلم سے وابستہ خستہ حال ادیبوں اور شاعروں کے لئے بہت کچھ کیا ہے۔ یہ انھیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ اب ریڈیو سے فلمی ریکارڈس کے پروگرام کے وقت نغمات کے اصلی تخلیق کار شاعروں کے نام بھی اناؤنس ہونے لگے ہیں۔ .....

بمبئی کے بڑے بڑے ہسپتال میں میں نے مہیندر ناتھ کو ان بیمار مصنفین کی مزاج پرسی کے لئے جاتے دیکھا ہے۔ جن کا کوئی پرسان حال نہیں تھا۔ فلم انڈسٹری کے لوگ جانتے ہیں کہ وہ ایسوسی ایشن اور مجموعے مصنفین کے حقوق کے تحفظ کے لئے انڈسٹری کے خداؤں اور اپنے عزیزوں سے بھی لڑ جاتے ہیں اور الساده اس نگری میں کرتے ہیں جہاں لوگ معمولی مفاد کے لئے اپنی بیوی، بہن بیٹی کو بیچ دیتے ہیں۔

لکشمی ــــــ بلاشبہ کرشن چندر ایک جینئس ہیں۔ وہ اردو افسانے کے خدا کے ہیں وہ وسیع و عریض افسانوی شہر کے معمار اعظم ہیں۔ الفاظ کی دنیا ان کے آگے سرنگوں ہے۔ ان کا قلم کل حیاتِ انسانی کا احاطہ کرتا ہے۔ کرشن چندر زندگی کے عکاس ہیں ان کی تحریر زندگی کی طرح نیرنگ اور لامحدود ہے۔ نثر کا یہ جادو نگار شاعر ایک اعلیٰ درجے کا فن کار ہی نہیں انسانیت کا ایک عظیم محسن بھی ہے۔

کرشن چندر کے قلم سے نکلے ہوئے الفاظ خار زارِ زیست میں پھولوں کی طرح کھلتے اور تاریکیوں میں چراغوں کی طرح جگمگاتے ہیں۔

کرشن چندر ایک بہت بڑے انسان ہیں۔ وہ ایک شاندار مکان میں رہتے ہیں۔ ان کے لاکھوں پرستار ہیں۔ ملک کی حکومت نے انھیں بہت بڑے اعزاز بخشے ہیں۔ غیر ممالک میں بھی انھیں بہت توقیر حاصل ہے۔ اُن کے حلقۂ احباب میں بہت بڑے اور صاحب حیثیت لوگ شامل ہیں۔ ان کے مداحوں میں خوبصورت عورتیں بھی ہیں۔ لیکن کرشن چندر کو ادبی محفلوں اور ان کے افسانوں میں دیکھنے والے نہیں جانتے کہ اُن پر کربناک تنہائی کا وہ لمحہ بھی آتا ہے جب کوئی فلسفہ کوئی آئیڈیل کوئی آدرش انھیں اذیت میں مبتلا ہونے سے نہیں بچا پاتا۔ جب وہ اس بے رحم لمحے سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ان کی شہرت، ان کی عزت، ان کی بیا سہا کتابیں، ان کے احباب، اُن کے اعزازات (خوبصورت عورتیں) انھیں پناہ دینے سے قاصر رہتی ہیں تو ایسے جانسوز تنہائی کے جنگل میں روحانی بن باس بھوگتے ہوئے اس (رام) کرشن چندر کو ــ لکشمن (مہیندر ناتھ) کی رفاقت ہی سکون بخشتی ہے۔ اپنے وفادار بھائی کا ساتھ پاکر وہ ادبی طور پر ہی نہیں جسمانی طور پر بھی زندہ رہنا چاہتے ہیں۔

کرشن چندر دل کے مریض ہیں اور اب مہیندر ناتھ بھی ۔! یہ کیسی پیروی ہے ـ؟ یگانگت اور یکسانیت ہے ــ؟ یہ دکھ بانٹنے کا کون سا آدرش ہے ؟ شاید مہیندر ناتھ اس بے پناہ لیکن مقدس درد کے بوجھ کو اپنے دل پر بھی اٹھانا چاہتے ہیں جو اکثر دل کے دورے

کی صورت میں ان کے بھائی پر حملہ کر دیتا ہے۔ یہ روحانی بن باس میں کیسی شرکت ہے؟

اردو ادب کرشن چندر کا ممنون ہے کہ اس کے وجود میں اسے پریم چند سے عظیم تر افسانہ نگار ملا وہ افسانہ نگار جس پر نہ صرف اردو اور ہندوستان کو ناز ہے۔ بلکہ ساری دنیا کے افسانوی ادب کو فخر ہے۔ ایک دنیا کرشن چندر کی معترف اور مشکور ہے۔ لیکن کون مہیندر ناتھ کا احسان مانتا ہے۔ کون یہ جانتا ہے کہ کرشن چندر کے قلم کی بقا اور توانائی میں مہیندر ناتھ کا بھی ہاتھ ہے۔۔۔ نہیں۔۔۔ کرشن چندر اور مہیندر ناتھ کی یہ باہمی برادرانہ محبت محض ان کا ایک نجی اور خانگی معاملہ نہیں ہے۔ اردو کے ان دو ادیبوں کی یہ رفاقت اردو ادب کی بہت بڑی خوش قسمتی ہے۔

میں نہیں جانتا ادب کی تاریخ مہیندر کو اپنے صفحات پر کیا مقام دے گی۔ لیکن یہ سوچتے وقت میرے تصور میں رامائن کی وہ ان گنت تصویریں گھوم رہی ہیں جن میں ہر جگہ لکشمن کو رام کو ساتھ دکھایا گیا ہے۔ رام کے آگے سر جھکانے والے کیا لکشمن کے آگے نہیں جھکتے؟ رام کی عظمت کو ماننے والے نے لکشمن کی عظمت سے انکار نہیں کیا۔۔۔ اب پتہ نہیں ادب کی رامائن لکھنے والے اردو کے اس لکشمن کو اُس کا حق دیں گے یا نہیں۔۔۔؟

مظہر امام

منفرد فن کار

یہ ان دنوں کی بات ہے جب مجھ میں اردو ادب کے مطالعے کا نیا نیا ذوق پیدا ہوا تھا۔ انہیں دنوں یعنی مارچ ۱۹۴۱ء کے "ساقی" میں مہندر ناتھ کا پہلا افسانہ "ریاضت" شاہد احمد دہلوی کے مندرجہ ذیل ادارتی نوٹ کے ساتھ شائع ہوا:

"ایک اور نئے لکھنے والے نرندر ناتھ (مہندر ناتھ) ہیں، جن کا افسانہ اس اشاعت میں شریک ہے۔ یہ بھی ایک خاص ڈھنگ سے لکھتے ہیں اور خوشی کی بات ہے کہ آپ نے اپنے مضامین کی اشاعت کے لئے 'ساقی' کو پسند کیا ہے۔"

کہیں سے یہ اطلاع بھی ملی کہ مہندر ناتھ، کرشن چندر کے چھوٹے بھائی ہیں۔ کرشن چندر کے نام کے ساتھ ایک رومانی ہالہ تھا اور وہ مجھ جیسے نوخیز ادب دوستوں کے محبوب ترین ہیرو تھے۔ کسی کا ان کا بھائی ہونا ہی مجھ جیسوں کے لئے باعثِ کشش تھا۔ مہندر ناتھ کی کہانی بڑے شوق اور چاؤ سے پڑھی۔ وہ زمانہ اردو افسانے کے عروج کا زمانہ تھا۔ کوئی معمولی کہانی شاہد احمد دہلوی یا صلاح الدین احمد کے تعریفی نوٹ کے ساتھ شائع ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ آج کے دور سے اس دور کا مقابلہ کرنا مناسب نہیں۔ اب تو صورتِ حال یہ ہے کہ اگر کسی مدیر کا تعریفی نوٹ کسی افسانے کے ساتھ شامل ہو جائے تو اس کی ادبی قدر و قیمت مشکوک ہو جاتی ہے۔

مہندر ناتھ نے تیزی سے لکھنا شروع کیا۔ 'ساقی'، 'ادبِ لطیف' اور دوسرے رسائل میں۔ اگست ۱۹۴۱ء کے 'ساقی' میں ان کا افسانہ "حنائی انگلیاں" شائع ہوا، تو شاہد احمد دہلوی نے لکھا:

"مہندر ناتھ کا افسانہ اُن کے گذشتہ سب افسانوں سے اچھا ہے۔"

'ساقی' میں یہ افسانے مہندر ناتھ بی۔ اے کے نام سے چھپے۔ اگست ۴۱ء اور نومبر ۴۱ء میں "زخمی چین" کے سلسلے کی دو کہانیاں "مس فی" اور "شمالی چین کا طالب علم" شائع ہوئیں، جن کے مصنف کا نام مہندر ناتھ تو ہے، لیکن اس نام کے آگے بی۔ اے درج نہیں ہے۔ کہہ نہیں سکتا کہ یہ وہی مہندر ناتھ ہیں یا کوئی اور۔

مہندر ناتھ کی سب سے اچھی کہانی "جہاں میں رہتا ہوں" ہے۔ اسے اردو کے بہترین افسانوں کی فہرست میں بلا تکلف شامل کیا جا سکتا ہے۔ اس کہانی سے متاثر ہو کر اُس دور کے ایک اور ہونہار افسانہ نگار مدھوسودن نے (جو اب اردو ادب کے لئے مرحوم ہو چکے ہیں) اپنا خوب صورت افسانہ "آشیانہ" لکھا جسے نومبر ۴۵ء کے "ادبی دنیا" میں شائع کرتے ہوئے صلاح الدین احمد نے اس طرح داد دی:

"شمارہ زیرِ نظر میں ایک ایسا افسانہ چھپ رہا ہے جس کی نسبت ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں
— دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا"

لیکن نقشِ ثانی اپنی تمامتر خوبصورتی اور رعنائی کے باوجود نقشِ اول کا مقابلہ نہ کر سکا۔

مہندر ناتھ ایک سرکردہ ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ مقبول ادیب بھی تھے۔ ان کے افسانوں کے دس مجموعے اور پندرہ ناول شائع ہوئے۔ آج کے کتنے ادیبوں کی اتنی کتابیں منظرِ عام پر آئی ہیں؟

مہندر ناتھ، کرشن چندر سے دس سال چھوٹے تھے، چھ سال نہیں، جیسا کہ مالک رام نے لکھا ہے۔ دونوں بھائیوں میں رام اور لکشمن جیسا خلوص تھا، لیکن مہندر ناتھ کے طرزِ تحریر پر کرشن چندر کی چھاپ نہیں ہے۔ افسوس ہے کہ ہمارے اکثر ناقدین نے انھیں محض کرشن چندر کا بھائی سمجھا اور ایک منفرد فن کار کی حیثیت سے ان کے فن کو معروضی نقطۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ مہندر ناتھ کا رنگ اپنا ہے۔ انھوں نے اپنی تحریروں کے اعصاب پر اپنے بلند پایہ ادیب بھائی کو سوار نہیں ہونے دیا۔ اُن کے اسلوب کی اپنی خصوصیت، اپنا مزاج، اپنی دلآویزی ہے۔ ہمارے بعض ناقدین ایسی ہی تحریروں کو عظمت کا درجہ دینے پر تلے رہتے ہیں جو اتنی پیچیدہ اور خشک ہوں کہ اسے رد کر کر پڑھا جائے۔ مہندر ناتھ کی تحریریں اس اعتبار سے ہرگز عظیم نہیں ہیں۔ انھیں لطف و مسرت کے ساتھ پڑھا جا سکتا ہے ــــ اپنے موضوعات کی تلخی اور تیزابیت کے باوجود! ▲

وید راہی

سورج، ریت اور گناہ

مہندر ناتھ کے گھر میں پڑی ہوئی کتابوں میں سے اس کے ناول "سورج، ریت اور گناہ" کی ایک کاپی میں اٹھالایا ہوں پہلے ہی صفحے پر انگریزی میں لکھا ہوا ہے۔ "رائٹرز کاپی، ناٹ ٹو بی ٹیکن"۔ یعنی یہ مصنف کی ذاتی کتاب ہے، کوئی لے نہیں جائے، ساتھ ہی مہندر ناتھ نے انگریزی میں دستخط کئے ہیں۔ پھر اُسی صفحے پر مہندر ناتھ نے اپنے ہاتھ سے میر کا یہ شعر لکھا ہے ؎

پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے!
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

مجھے لگتا ہے اس شعر کا کچھ نہ کچھ تعلق مہندر ناتھ کے اس ناول کی روح کے ساتھ ضرور ہے۔ میر کی آواز اپنے وقتوں میں جیسے اکیلی تھی، منفرد تھی، اسی طرح مہندر ناتھ کی آواز بھی اکیلی تھی، منفرد تھی۔ وہ ایک کارواں میں شامل ہوا۔ ساتھیوں کے ساتھ آگے بڑھا مگر پھر بھی اکیلا رہا۔ اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ اس کے ساتھی کب ایک ایک کرکے مصلحتوں کے جنگل میں گم ہوتے گئے اور اسے پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ اسے کسی سے کوئی شکوہ نہیں تھا۔ رنج نہیں تھا بلکہ اس بات کا اطمینان تھا کہ وہ اپنے آدرشوں کے کارواں کا غبار بن گیا ہے۔

مہندر ناتھ کی پیاری شخصیت سے مل کر اس بات کا ذرا بھی احساس نہیں ہوتا تھا کہ اس شخص نے عمر کا بہترین حصہ (چوتھائی صدی سے بھی زیادہ) بمبئی جیسے بے رحم، بے چین شہر کی نذر کئے ہیں۔ اس کا گھر بمبئی کے اس حصے میں تھا جو اپنے وجود میں اس شہر پریشان کا نمائندہ کردار سمیٹے ہوئے تھا۔ دنگا فساد، قتل وہاں کا خاصہ ہے۔ کئی مندروں اور کئی مسجدوں کے علاوہ وہاں فلم اسٹوڈیوز کی بھیڑ ہے۔ سندھی، پنجابی، مراٹھی، گجراتی، ایرانی سب طرح کے ہوٹل ہیں۔ چنڈو خانے بھی ہیں اور جوا خانے بھی۔ وہاں اس طرح کے تعفن زدہ گیسٹ ہاؤس ہیں کہ جنہیں دیکھے بنا اُن کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔ وہاں ایسی تہہ در تہہ، پیچ در پیچ عمارتوں کے سلسلے ہیں کہ آدمی اپنے وجود کو بھول کر اُن کے اندھیروں میں کھو جائے۔ مہندر ناتھ نے اپنے ناولوں، افسانوں میں اسی دنیا کو جاننے کی کوشش کی ہے۔ اسی دنیا کے دوسرے کرداروں کی طرح وہ بھی اس کا ایک حصہ بن چکا تھا، مگر وہ ایک ایسا حصہ تھا جسے دل کہتے ہیں ـــــ دھڑکتا ہوا دل۔

'سورج، ریت اور گناہ' کا ہیرو سہری جب اپنے اردگرد کے بارے میں سوچتا ہے تو لگتا ہے مہندر ناتھ اپنی دنیا کا دل بن کر دھڑک رہے ہیں۔ دیکھئے ـــ "جب کبھی سہری ہندوستان اور دیگر ملکوں کے انسانوں کا تجزیہ کرتا تو اسے محسوس ہوتا۔ بنیادی طور پر انسان وہیں کا وہیں کھڑا تھا۔ اس کے رہن سہن، اس کی بول چال، اس کی سائنسی ترقی میں حیرت انگیز اضافہ ہوا تھا۔ لیکن اندر کا انسان وہیں کھڑا تھا ـــــ وہ خود حیران تھا کہ وہ اتنے گندے اور مردہ سوشل نظام میں کس سے محبت کرے اور کیسے کرے؟ جہاں اندھیرے نے یلغار کر دی ہو جہاں کمینگی اور رغبت کا طوفان منہ کھولے سامنے کھڑا ہو، جہاں ہر آدمی اپنی انا کا جھنڈا بلند کرکے باقیوں کو تحس نحس کرنا چاہتا ہو، وہاں

وہ شرافت کا لبادہ اوڑھ کر کہاں جائے ؟"

مہندر ناتھ اپنے اِرد گرد کے صرف ظاہر سے ہی واقف نہیں تھا۔ بلکہ اس کا احساس کرداروں کے دلوں کے عمیق ترین گوشوں تک جا پہنچتا تھا۔ "سورج، ریت اور گناہ" کی ہیروئن انوری کا اظہارِ عشق نہ صرف آج کی لڑکی کے عشق کی نمائندگی کرتا ہے بلکہ اس کی التجائے محبت جدید معاشرے پر کراری چوٹ کر کے قاری کے ذہن و دل کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ سنئے ـــ "تم مجھ سے وعدہ کرو کہ تم مجھ سے محبت کرو گے میں اس وقت اس دنیا میں بالکل اکیلی ہوں۔ ہری بالکل بے بس ہوں، بالکل اداس ہوں۔ میں تم سے کچھ نہیں مانگتی۔ کوئی وعدہ نہیں۔ کوئی شادی نہیں۔ روپیوں کی کوئی مانگ نہیں۔ کچھ نہیں۔ ہری کچھ نہیں۔ ہاں اگر تم مجھ سے محبت نہیں کرتے تو نہ کرو، صرف Pretend کرو۔ تاکہ مجھے معلوم نہ ہو کہ تم مجھ سے محبت نہیں کرتے۔ صرف چند دنوں کے لئے۔ پھر مجھے چھوڑ دینا۔ میں واقعی تمہیں بھول جاؤں گی، وعدہ کرو ڈارلنگ ـــ کہ تم مجھ سے محبت کرو گے۔"

انوری کی یہ التجائے محبت اِس بات کی غماز ہے کہ وہ بہر حال جینا چاہتی ہے۔ زندگی کا دامن اُس کے ہاتھ سے چھوٹا جا رہا ہے اور وہ اسے چھوڑنا نہیں چاہتی۔ اس نے ہری کو صاف صاف بتا دیا ہے کہ اس کی زندگی میں ہری سے پہلے بھی کئی مرد آ چکے ہیں ان میں سے صرف ایک کو بہت چاہتی تھی۔ اس سے شادی کی خواہش بھی رکھی تھی۔ ایک بار حاملہ بھی ہو گئی تھی ـــ "ہری وہ میرا عاشق تھا اُس نے میرے ساتھ وفا کی ہوتی تو آج میں ایک ماں ہوتی۔ اور میرا جنسی سفر کب کا ختم ہو گیا ہوتا۔ اس کی بے وفائی نے مجھے ایک مرد، دوسرے مرد اور پھر تیسرے مرد، حتیٰ کہ آج میں تمہاری آغوش میں ہوں۔ نہ جانے زندگی میں ماں بننے کے لئے مجھے کتنے سفر طے کرنے پڑیں گے ـــ میری روح کی اس دہلیز پر بچے کی ہنسی کتنی پیاری لگتی ہے۔"

انوری کے کرب کا یہ نشتر اگر مہندر ناتھ نے اپنی روح میں نہ اُتارا ہوتا تو شاید اس کا اظہار وہ اس شدت سے نہ کر پاتا۔ اردو ناولوں کے عظیم کرداروں میں انوری ایک الگ مقام پر کھڑی نظر آتی ہے۔ کردار نگاری کے تمام تر جزئیات کی حامل وہ اتنی حقیقی، بے باک، زندہ اور جنگ جو ہے کہ جینے کی جدوجہد کرتی ہوئی آج کی ہر لڑکی کا عکس اس میں نظر آتا ہے۔ انوری کا کیریکٹر ٹریٹ کرتے ہوئے مہندر ناتھ کو بڑی بے رحمی سے اسٹروک لگانے پڑتے ہیں۔ مردوں کی اقسام پہچاننے والی انوری اپنے ایرانی باپ سے بھی پوری طرح واقف ہے۔ وہ جانتی ہے اس کا شرابی باپ کس طرح ایران سے چل کر ہندوستان آیا۔ کس طرح اس نے ایک چھوٹے سے قصبے میں ایک شاندار کوٹھی تعمیر کی اور ناجائز شراب کشید کرنے کا دھندا کرنے لگا۔ اس نے بیوی کے علاوہ بھی ایک عورت رکھی ہے اور ایک حرامی بچے کا باپ بھی ہے۔ پھر بھی انوری اپنے باپ کو کچھ نہیں کہتی۔ لیکن جب وہ اسے ایک ہندو لڑکے سے شادی کے لئے منع کرتا ہے تو چپ نہیں رہتی۔ صاف کہہ دیتی ہے کہ آپ خود اپنی خاطر ایک ایسی دھرتی سے غذا حاصل کرتے ہیں جو آپ کے آباؤ اجداد کی نہیں۔ اگر اس دھرتی کا کوئی انسان مجھ سے محبت کرتا ہے تو آپ کو کیوں برا لگتا ہے۔

اس ناول میں ایک اور بہت خوب صورت کردار ہے۔ کلبھوشن کا۔ خوبصورتی کردار میں نہیں اس کی کردار نگاری میں ہے۔ مہندر ناتھ نے اس کردار کے ذریعے اپنے اُن مصلحت پسند دوستوں کی ذہنی کیفیت کو عیاں کیا ہے جنہوں نے وقت کے ہاتھوں اپنے خوابوں کو بیچ دیا۔ انہوں نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا۔ انقلاب لانے کی باتوں کو بھول کر بیوی بچوں، کار اور فلیٹ سے بھری ہوئی آرام دہ زندگی گزارتے تھے۔ ناول کا ہیرو ہری تنگی سے مجبور ہو کر اپنے پرانے انقلابی دوست کلبھوشن سے کچھ پیسے ادھار لینے کے لئے پہنچتا ہے۔ وہاں اس کی شان شوکت دیکھ کر بوکھلا جاتا ہے۔ کلبھوشن اسے گلے سے لگا کر اس کا استقبال کرتا ہے۔ اور پھر ہری سے یوں مخاطب ہوا "ہری جتنا کماتا ہوں اتنا خرچ ہو جاتا ہے۔ مانگنے والے اتنے آتے ہیں کہ کیا عرض کروں۔ اور میں کسی کو نفی میں جواب نہیں دے سکتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں تحریک کے لئے کچھ نہیں کر سکتا، مگر روپوں سے اُن کی مدد تو کر سکتا ہوں۔

...... تم بتاؤ کیا کرتے ہو؟ کچھ روپے چاہئیں تو کہو، بندہ حاضر ہے...؟"

کل بھوشن کی باتوں سے ہری کو لگا جیسے اس دنیا میں ہر انسان روپے لینے یا دینے کے سوا کوئی کام نہیں کرتا۔

کل بھوشن نے سلسلۂ کلام جاری رکھا: "...... تم جانتے ہو شروع سے ہی مجھے انقلاب برپا کرنے کا چسکا تھا۔ انقلاب تو ہم لا نہ سکے، اب دوسروں کو اُکساتے ہیں...... دراصل ہم انقلاب لانے کے قابل ہی نہیں...... ہم کافی عرصہ چندر ہے اب آنکھیں کھل گئیں۔ بھوکوں کے ساتھ رہ کر انسان ہمیشہ بھوکا رہتا ہے...... یہ دَور محض پیسے کمانے کا دَور ہے آئیڈیلزم کا زمانہ ختم ہوگیا۔ تم نے انقلاب کی گھن گرج سنی تھی۔ اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چاندی کے سکوں نے انقلاب کے حسین چہرے پر ایک خوفناک لیپ کر دیا ہے۔ اسے بدنما اور مکروہ بنا دیا ہے۔ ہم سب لوگ اپنی اپنی بلوں میں گھس آئے ہیں۔ اپنی بیویوں بچوں کے ساتھ کچھ سال زندہ رہیں گے، پھر اپنی بلوں میں مرجائیں گے۔ دراصل ہم سب چوہے ہیں ____ "I am a Rat"

یہ ایک بہت بڑی ٹریجڈی کا کچا چٹھا ہے جس میں بظاہر کوئی نہیں مرتا، مگر اندر سے سب زندہ درگور ہو جاتے ہیں۔ اس ٹریجڈی کو اتنی شدت سے صرف مہندر ناتھ ہی بیان کرسکتا تھا کیونکہ اس نے اپنے اردگرد اپنے بے شمار مصلحت اندیش دوستوں کی عبرتناک موت ہوتی دیکھی تھی مگر اپنی روح کو زندہ رکھا تھا۔

"سورج، ریت اور گناہ کا ہیرو ہری بھی تقریباً اسی ٹریجڈی کا شکار ہو جاتا ہے۔ ناکامیوں سے بوکھلا کر وہ انوری کو اپنانے سے انکار کر دیتا ہے اور خودکشی کی کوشش کرتا ہے مگر انوری اسے بچا لیتی ہے۔ ناول کے آخر میں وہ اسے سمندر کے کنارے لے جاتی ہے۔ انوری نے ہری کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا اور انوری کے ہاتھ کی گرمی ہری کے ہاتھ میں تحلیل ہو رہی تھی۔

"دھوپ کتنی تیزی سے ہماری طرف آ رہی ہے۔ ہری! جب تک انسان میں زندگی ہے۔ اسے لڑنا چاہئے۔ ڈارلنگ دیکھو تو یہ سمندر کا شفاف سینہ۔ یہ پاکیزہ ہوا۔ یہ ناریل کے درخت۔ یہ لہریں۔ یہ سورج۔ یہ ریت اور ہمارا تمہارا گناہ۔ اور یہ کھلی فضا۔ اور راحت بخش ہوا جو پھیپھڑوں میں جاتی ہے۔ ہم کیوں نہ زندہ رہیں۔ اور ایک بہتر زندگی کے لئے لڑیں۔"

ہری نے انوری کی طرف دیکھا۔

"بہتر زندگی" اس نے زیرلب ان دو لفظوں کو دہرایا، جن میں ساری زندگی کا نچوڑ تھا۔

یہ دو لفظ شاید مہندر ناتھ کی زندگی کا خواب تھے۔

مہندر ناتھ (مرحوم)

"غیر مطبوعہ"

ناول

بلا عنوان اور نامکمل

غالباً جنوری ۱۹۷۴ء کی بات ہے کہ ایک دن میں مہندر کے کمرے میں داخل ہوا

"کیا لکھ رہے ہو یار مہندر؟"

"ایک ناول شروع کیا ہے!"

"عنوان کیا ہے؟"

"ابھی نہیں رکھا!"

"موضوع کیا ہے؟"

"نہیں بتاؤں گا!"

اُس نے کاغذات سمیٹے اور اپنے تکیئے کے نیچے رکھ لئے اور کہنے لگا

"ناول جب مکمل ہو جائے گا۔ تب بتاؤں گا۔

مکمل اِنسان کا وہ ادھورا ناول پورا نہ ہو سکا۔

فنکار کی یہ نامکمل تخلیق آپ کی نذر ہے

(کاوش)

باب ۱

پروفیسر آنند آہستہ آہستہ کار چلا رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ ہینڈل پر تھے۔ بڑی مضبوط اور توانا کلائیاں ذرا نگاہ اوپر جاتی۔ بازوؤں کی مچھلیاں کافی مضبوط اور لچکدار دکھائی دیتیں۔ قمیض کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ کشادہ سینہ جس پر سیاہ بال اُگے ہوئے تھے۔ گردن موٹی اور بھاری سی اور اس کے اوپر ایک خوبصورت چہرہ آویزاں۔ گورنگ گندمی سا تھا۔ اور ہونٹ موٹے موٹے سے، مگر رس بھرے، ٹھوڑی پُروقار، رخسار سیب کی طرح سرخ اور آنکھیں بے حد پُرکشش، روشن کھلی پیشانی اور سر کے بال سیاہ اور گھنے ماتھے پر سیاہ بال لہرا رہے تھے۔ آنند واقعی خوش شکل تھا۔ اور اسے اپنی خوبصورتی کا احساس بھی تھا۔ مگر اس نے اپنی خوبصورتی کا خاص فائدہ نہ اٹھایا تھا۔ بچپن میں ورزش کا شوق تھا۔ اور یہ شوق جنون کی حد تک بڑھ چکا تھا۔ اس کی جسمانی دل کشی اسی ورزش کی دین تھی۔

اب آنند نے کار کی رفتار تیز کر دی۔ راستہ صاف ستھرا تھا۔ پکی سڑک پر کار اس طرح دوڑ رہی تھی۔ جیسے ڈھلوان پر انسان کے پاؤں خود بخود چلتے ہیں۔ بغیر کسی کوشش کے۔ کبھی کبھی کوئی ٹرک سامنے سے آتی۔ تو پروفیسر آنند بڑی چابکدستی سے کار کو بچا کر آگے کر لیتا۔ وہ شہر سے کافی دور آ گیا تھا۔ جھلملاتی ہوئی نگاہ سے وہ گوما کو دیکھ لیتا۔ جو چپ چاپ اس کے قریب بیٹھی ہوئی تھی اور گذرتے ہوئے مناظر سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ گوما کی عمر زیادہ نہ تھی بس اٹھارہ برس کی ہوگی۔ گوما کو بننے سنورنے کا شوق تھا۔ امیر باپ کی بیٹی تھی۔ روپیوں کی کمی نہ تھی اور آج کی تو ہر لڑکی امیر باپ کی بیٹی نظر آتی ہے لباس پنڈلیوں سے اوپر گھٹنوں تک آ پہنچا ہے اور اب لڑکیوں نے چست نیکر پہن کر اپنی رانوں کو بے نقاب کر دیا ہے ساڑھیاں کمر سے ڈھلک کر کولہوں تک آ پہنچی ہیں۔ اور بلاؤزیوں کھلے رہتے ہیں کہ مردوں کی آنکھیں گولائیاں ناپتی رہتی ہیں۔ اس وقت گوما نے ہاف نیکر پہنی ہوئی تھی۔ اور اس کی رانیں اور پنڈلیاں جو بے حد متناسب اور دودھ کی طرح شفاف تھیں۔ اس نیلے آسمان اور کھلی دھوپ کے درمیان بے حد پرکشش اور جاذب تھیں۔

کہاں جا رہے ہیں ہم؟ گوما نے پیشانی سے سیاہ بال ہٹاتے ہوئے کہا۔

جہاں کہو چلتے ہیں، کار اپنی ہے سڑک میونسپلٹی کی ہے۔ اور یہیں روکنے والا کوئی نہیں۔

پروفیسر میں تمہاری شاگرد ہوں۔

جانتا ہوں گوما۔
استاد اور شاگرد کا وہ رشتہ بڑا نازک ہوتا ہے اور مقدّس بھی۔
پرانے زمانے میں ہوتا تھا۔ آج کل نہیں۔
آج کل کیوں نہیں انسان تو وہی ہے۔؟
ہاں گوما انسان تو وہی ہے۔ مگر تہذیب بدلی ہے۔ قدریں بدلی ہے۔ سوچنے اور سمجھنے کے انداز بدلے ہیں۔ اخلاق بھی بدلا ہے۔
اتنا لمبا چوڑا بھاشن۔
تم ایک ذہین لڑکی ہو اور اس پر تم بے حد خوبصورت لڑکی بھی ہو۔
میں پہلی بار آپ کے ساتھ آئی ہوں۔
مجھے معلوم ہے۔ اگر میری ذات پر اعتبار نہیں تو — About turn کرنے میں مجھے کوئی اعتراض نہیں
پروفیسر۔ موسم بے حد خوشگوار ہے۔ آسمان نیلا ہے۔ ہوا میں نشہ ہے۔
ڈرتا ہوں — پروفیسر نے اسپیڈ کو کم کرتے ہوئے کہا۔
کس بات کا ڈر؟
تمہیں یہاں لاکر ایک بڑے خطرے کو مول لیا ہے۔
کس قسم کا خطرہ؟
جس کالج میں میں پروفیسر ہوں۔ اسی کالج میں تم بھی پڑھتی ہو۔ اور جس کلاس میں تم پڑھتی ہو۔ اسی کلاس کو میں پڑھاتا ہوں۔ شاید طلباء کو یہ کبھی معلوم ہو کہ تمہارے میرے درمیان۔۔۔۔۔
چند لڑکیوں کو شک ہے۔ پروفیسر۔
کہیں کسی کو تم نے بتایا تو نہیں؟
بتلایا تو نہیں۔ مگر مجھے لڑکیوں سے کوئی ڈر نہیں ہے۔ اگر ڈرتی ہوں تو اپنے ڈیڈی ممی سے اگر انہیں معلوم ہو گیا تو۔
ہاں گوما۔ یہ مسئلہ ٹیڑھا ہے۔ انہیں سنبھالنا آسان نہیں۔ پھر بھی جس محبت کے سہارے ہم نے اس منزل کی طرف اپنا قدم بڑھایا ہے وہاں پہنچ کر ہی ہم بتا سکیں گے کہ ہمارے ارادوں میں کتنی پختگی ہے اور ہماری محبت میں کتنا جوش اور ولولہ ہے۔
اب کار نیشنل پارک کے اندر جارہی تھی۔ کھلی کھلی سی فضا۔ جہاں تک نگاہ جاتی تھی۔ ہریالی اور ہریالی ہی نظر آتی تھی۔ پروفیسر آنند نے کار کو پارک کیا۔ وہ دونوں کار سے اترے قریب ہی ایک خوشنما قطعہ نظر آیا۔ جس کے چاروں طرف پھول ہی پھول کھلے ہوئے تھے۔ اونچی اونچی جھاڑیاں قطعہ کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھیں۔ کار میں سے پروفیسر نے ایک تھیلا نکالا اور دونوں اس قطعہ کی طرف چل دیئے۔ اور جب دونوں قطعہ کے اندر گئے تو انہوں نے یوں محسوس کیا۔ جیسے اونچی اونچی جھاڑیوں نے انہیں پناہ دی ہے۔ گلابوں نے حیرت بھری نظروں سے تاکا کلیوں نے مسرت بھری نگاہوں سے جھانکا اور ہری ہری گھاس نے ان کا خیر مقدم کیا۔ قطعے سے ذرا دور ناریل کے دو پیڑ ان کی طرف دیکھ رہے تھے اور جیسے ان سے کہہ

رہے تھے۔

"آیئے ہماری چھاؤں تلے آرام کیجئے"

گھاس نرم نرم تھی۔ کسی چیز کو بچھانے کی ضرورت نہ تھی۔ نیلے آسمان سے آفتاب جھانک رہا تھا۔ ابھی تک ہواؤں میں خاص حدت نہ آئی تھی۔ بس گیارہ ہی بجے تھے۔ اور نومبر کا مہینہ تھا۔ ہوا میں تیزی اور تندی نہ تھی۔

میں پہلی بار تیرے ساتھ آیا ہوں۔ پروفیسر آنند نے اس اٹھارہ سالہ لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، میرے دل نے کئی بار مجھ سے کہا کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں۔ درست نہیں کر رہا ہوں۔ مجھے اتنا آگے نہیں بڑھنا چاہیئے۔ نہ جانے وہ کون سی قوت ہے جو مجھے تمہاری طرف کھینچ رہی ہے اور مجھے اس جگہ لے جانا چاہتی ہے جہاں میں جانا نہیں چاہتا۔

ٹھیک کہتے ہو پروفیسر۔ گو میری عمر صرف اٹھارہ برس کی ہے۔ میں نے اپنے دل کو بہت سمجھایا۔ راتیں جاگ جاگ کر کاٹیں۔ دل سے کئی بار کہا کہ تم کیا کر رہے ہو۔ جس راستہ پر میں چل رہی ہوں وہ راستہ سیدھا نہیں۔ بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا ـــــ مگر کیا کروں۔ بات آگے بڑھتی رہی، جتنا پیچھے ہٹنے کی کوشش کی اتنا ہی آگے بڑھنا پڑا۔ میں نے کئی بار پیچھے ہٹنے کی کوشش کی یہ نامراد دل نہ مانا۔ میں نے اس کو کئی بار دھتکارا۔ اسے ذلیل کیا۔ یہ کمبخت نہ مانا۔

غلطی میری ہے پروفیسر۔ میں ہی تو آگے بڑھتی رہی۔ تمہارا تعاقب کیا۔ میں جان بوجھ کر تمہارے قریب آئی۔ کبھی آٹوگراف لینے۔ کبھی یہ پوچھنے کہ اس مضمون پر کون سی کتاب پڑھوں۔ کبھی اپنی کاپی دکھلانے۔ کبھی جان بوجھ کر میرا ہاتھ تمہارے ہاتھ سے مس ہوا۔

جانتا ہوں جب پہلی بار تیرا ہاتھ میرے ہاتھ سے مس ہوا تھا تو سر سے لے کر پاؤں تک میں کانپ سا گیا تھا بجلی کی ایک لہر سی میرے جسم سے گذر گئی تھی۔ یاد ہے وہ دن جس دن College debating Society کے تم صدر تھے اور مجھے اُس دن تقریر کرنی تھی۔ "عورتوں کی آزادی پر" میں کتنی گھبرائی تھی میں نے بڑے زور شور سے تقریر کی تھی۔ لڑکیوں اور لڑکوں نے میری تقریر کے اختتام پر خوب تالیاں بجائیں تھیں اور جب آخر میں تم نے میری تقریر کی تعریف کی تھی۔ تو میں سمجھ گئی تھی کہ اس تعریف میں تمہاری پسند کا دخل تھا۔ اور جب میں تمہیں ہار پہنانے آئی تو میں نے کس قدر اہتمام سے تمہیں ہار پہنایا تھا اور تم بھی جھک گئے تھے ہار پہننے کے لئے میری سانس نے تمہاری پیشانی کو چھوا اور میرے قدموں نے میرے جسم کو ناپا اس رات میں خوشی سے پھولی نہ سماتی تھی یہ سوچ کر کہ میں تمہارے قریب آئی تھی۔ کاش اور قریب آجاتی اور اس رات میں نے قسم کھائی تھی۔ کہ میں تمہارے بہت قریب آؤں گی۔ بہت ہی قریب اور آج ـــــ

کچھ کھاؤ گی ؟

کھلاؤ تو نا۔ بھوک لگ رہی ہے۔

پروفیسر آنند نے تھیلا کھولا، اس میں سے سیب، سنگترے، چکن، پیٹیز، پنیر کے سینڈوچ، کیک اور دیگر چیزیں نکالیں اور ایک چھوٹی سی پلیٹ میں یہ چیزیں رکھ دیں۔

چائے بھی ہے اس تھرماس میں!

تھیلے سے تھرماس نکالا اور گوما کے آگے رکھ دیا۔

سیب کس سے کاٹا جائے۔

پروفیسر نے چاقو جیب سے نکال کر کہا یہ لو۔
گوما سیب کاٹنے لگی۔
اگر سیب بغیر کاٹے کھایا جائے تو بڑا مزا آتا ہے۔ سیب کے چھلکے میں بہت وٹامن ہوتا ہے۔ پروفیسر نے ایک سیب کھاتے ہوئے کہا۔
تو پھر میں بھی کاٹ کر نہیں کھاتی۔
وہ سرخ سرخ سیب دانتوں سے کاٹ کر کھانے لگی۔
آنند کافی دیر تک گوما کی طرف دیکھتا رہا۔ گوما کے دودھیا دانت۔ سیب کے سرخ چھلکے کو کاٹ کر گودے میں گھس جاتے اور وہ پھر مسکراتے ہوئے سیب کے ٹکڑے کو دانتوں سے چبانے لگتی۔ اس کے ہونٹوں میں خون دوڑنے لگتا اور معصوم رخساروں پر سرخی سی پھیل جاتی۔ آنکھیں چمکنے لگتیں۔ بال لہرانے لگتے۔ جوانی کے دن بڑے خوبصورت ہوتے ہیں۔ یہ صحت مند چہرہ، لہرائی ہوئی زلفیں، یہ لچکتا ہوا جسم، دودھیا رانیں، اور سڈول پنڈلیاں۔ اور بے داغ ابھرا سینہ، یہ ہنستا، مسکراتا، لہراتا، بل کھاتا، ہوا جوان جسم، جھوٹ اور مکر سے عاری جسم شبنمی گھاس کی طرح پوتر اور مقدس جسم کب دیکھنے کو ملتا ہے۔
جب گوما، آدھا سیب کھا چکی تو کہنے لگی لو باقی کا سیب تم کھاؤ۔
میں کسی کا جھوٹا سیب نہیں کھاتا۔
تمہیں دینا کون ہے۔ گوما نے چڑاتے ہوئے کہا۔ گوما کی آنکھوں میں شرارت کی جھلک تھی۔
تم مجھے اس وقت پروفیسر نہیں سمجھتی۔
بالکل نہیں۔
اپنے سے بڑا بھی
رتی بھر نہیں
جانتی ہو تم، میری عمر کتنی ہے
کتنی ہے؟
چالیس برس۔
اور میری۔؟
صرف اٹھارہ برس ہے۔ پروفیسر نے سنجیدگی سے کہا۔ میری اور تمہاری عمر میں بہت فرق ہے۔ میری عمر کے مقابلے میں تم بچہ ہی نظر آتی ہو۔
صرف عمر میں ذہانت میں نہیں۔
اس کا اندازہ ہو جائے گا۔ پروفیسر نے رعب جماتے ہوئے کہا یہ لو سنترہ، زبان کا مزہ بدل لو۔
سنترہ کھٹا ہوگا۔
کھا کے تو دیکھو۔
پہلے تم سنترہ چھیلو۔ اور اسے کھا کے دیکھو۔ پھر میری نذر کرنا۔

پروفیسر نے سنترہ کو چھیلا۔ اور اُس کی ایک پھانک کو کھا کر کہا۔ واہ بڑا میٹھا سنترہ ہے۔ لو کھاؤ اسے۔
میں تمہارا چھیلا ہوا سنترہ نہیں کھاؤں گی۔ سنترہ خود چھیلوں گی اور سارا سنترہ خود ہی کھاؤں گی۔ اور تمہیں کچھ نہیں دوں گی۔ اس نے زبان نکالتے ہوئے کہا۔

وہ سنترہ چھیل کر کھانے لگی۔

ہم یہاں کب تک بیٹھے رہیں گے۔

جب تک تم چاہو ——— ڈیڈی سے کیا کہہ کر آئی ہو۔

یہی کہ ایک سہیلی کے ساتھ پکنک پر جا رہی ہوں۔

تمہارے ڈیڈی تمہیں منع نہیں کرتے۔ کہ اکیلی کیوں جا رہی ہو سہیلی کے ساتھ۔

کسی سہیلی کے ساتھ جانے میں کیا حرج ہے۔

کیا میں تیری سہیلی ہوں۔

نہیں۔

سہیلی تو نہیں۔ دوست تو کہہ سکتی ہوں۔

تمہاری پسند مجھے پسند نہیں۔

کون پرواہ کرتا ہے۔ تمہاری پسند کی ——— اس نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہا۔

تم میرے بارے میں صرف یہی جانتی ہو۔ کہ میں ایک پروفیسر ہوں۔

صرف اتنا نہیں۔ میں تمہارے بارے میں بہت کچھ جانتی ہوں۔

مثلاً

کہ تم شادی شدہ ہو۔ تمہاری کوئی اولاد نہیں۔ تمہاری بیوی بیمار سی رہتی ہے اور مجھے اس بات کا اندازہ ہو گیا ہے کہ تم اس سے پہلے بھی عشق کر چکے ہیں۔

کیسے معلوم ہوا تمہیں؟

تمہاری باتوں سے

تو پھر خطرے کو کیوں مول لے رہی ہو۔

جب پیار کیا تو ڈرنا کیا۔

کافی عجیب فقرہ ہے یہ۔

کبھی کبھی انسان کھیل بھی کھیلتا ہے۔

اوہ۔ یعنی تم کھیل کھیلنا جانتی ہو۔

جانتی تو نہیں۔ کتابوں میں پڑھ چکی ہوں۔

اور ان حربوں کا استعمال کر رہی ہو۔ پروفیسر نے چڑاتے ہوئے کہا۔

مجھے جینے کی کوئی تمنا نہیں اور نہ ہی کسی کو شکست دینے کی آرزو ہے۔ کسی کا حق بھی چھیننا نہیں چاہتی۔

بڑی بے غرض محبت ہے تمہاری ، پروفیسر نے سنجیدگی سے کہا۔

اس چھوٹی سی عمر میں بہت کچھ سیکھ لیا ۔ کتابیں پڑھ کر ۔

پھر بھی عقل نہ آئی ۔ پروفیسر نے وار کرتے ہوئے کہا۔

جب دل کی بات ذہن قبول نہ کرے تو کیا کرے انسان ۔ میں نے سوچا کہ میں پاپ کر رہی ہوں ۔ دل نے کہا جو بات دل کہتا ہے ۔ وہ پاپ نہیں ۔ اس لیے تمہارے ساتھ میں چلی آئی ۔

گناہ اور ثواب کا مسئلہ بڑا ٹیڑھا ہے ۔ گوما ۔ میں تیرا استاد ہوں ۔ اور تو میری شاگرد ہے ۔ پرانے زمانے میں گورو باپ کے برابر ہوتا تھا ۔ گورو پرماتما ہوتا تھا ۔ گورو قوم کا راہنما ہوتا تھا ۔ گورو قوم کی روح ہوتا تھا ۔

لیکن آج ؟ گوما بولی ۔

آج وہ بات نہیں ۔ پرانے زمانے میں گورو جو کہتا تھا اس پر خود عمل کرتا تھا ۔ اس زمانے میں گورو مفت تعلیم دیتا تھا ۔ لیتا کچھ نہیں تھا ۔ گورو تپسوی ہوتا تھا اور وہ اپنے چیلوں کو پرکھ کر ایک چیلے کا انتخاب کرتا تھا جس کو اپنا جانشین بناتا تھا ۔ صرف تعلیم اور تربیت نہیں بلکہ انسان کی تمام خوبیوں کا نچوڑ نکال کر اس کے سپرد کرتا تھا کہ تم ان خوبیوں اور سچائیوں کے مالک ہو ۔ پالن ہار ہو ۔ تم ہی ان سچائیوں کو جن میں روحانی اور اخلاقی سچائیاں بھی شامل ہیں ان کی رکشا کرنا ۔ یعنی گورو قوم کا سچا سیوک بھی ہوتا تھا ، راہنما بھی ۔

وہ ڈکٹیٹر نہیں ہوتا تھا ۔ قوم کا سچا خادم ہوتا تھا ۔ انسان کی روحانی تعلیمی اور اخلاقی قدروں کا پرچارک ، جو اعلیٰ مارگ پر خود بھی چلتا تھا اور دوسروں کو بھی چلاتا تھا ۔

تو اب کیا ہوا اس گورو کو ؟

زمانہ بدل گیا گوما ۔ حالات بدل گئے ۔ آبادی میں اضافہ ہوا ۔ انسانی ذہن نے کروٹ لی ۔ انسان نے ترقی کی ۔ سائنس نے ترقی کی ۔ غاروں سے نکلا ہوا انسان تہذیب اور تمدن کی علامت بن گیا ۔ خدا کیا ہے ۔ قدرت کیا ہے انسان اور قدرت کا کیا رشتہ ہے ۔ انسان کا ذہن بالغ ہوا ۔ اس نے انسان کو اتنی روشنی عطا کی ۔ اور انسان نے ایک بہتر زندگی گذارنے کی کوشش اور جدوجہد کی ۔ ۔ اور آج چاند اور دیگر ستاروں تک جا پہنچا ۔ اور اب وہ وقت آ گیا ہے کہ اس کرۂ ارض پر سے بھوک اور بیکاری دور کی جا سکتی ہے اور کئی جگہوں پر کر دی گئی ہے اور جہاں جہالت ہے ۔ غربت ہے ۔ نفرت ہے اسے دور کیا جائے گا ۔ اور اسی دوڑ دھوپ میں گورو اور چیلے کا رشتہ بدل گیا ۔

اب گورو کیا ہے ۔ گوما نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے کہا ۔

محض ایک انسان ۔

پہلے کیا تھا ؟

ایک دیوتا ، فرشتہ ، تیاگی اور مہان آتما ۔

میں تمہیں فرشتہ سمجھ کر رشتہ باندھنے کی کوشش کر رہی ہوں ۔

گوما ۔۔۔ میں فرشتہ نہیں ۔ شاید پہلے بھی گورو فرشتہ نہیں ہوتے تھے ۔ فرشتہ بننے کی کوشش کرتے تھے ۔ پرانی تہذیب اور تمدن کی اعلیٰ قدروں کو دلوں میں سمو کر اور شاید اپنی جائز آرزوؤں کا خون کر کے ، انہیں مار کر ، انہیں دبا کر انہیں قتل کر کے ایک آدرش کی خاطر زندہ رہتے تھے ۔ تاکہ روحانی قدروں کی مشعل جلتی رہے ۔

دیپ سے دیپ جلے اور انسان اس کرۂ ارض پر ترقی کے زینے پر گامزن ہو۔

وہ چپ ہو گیا۔

ایسا کیوں کرتے تھے۔

اس وقت بہت کم لوگ پڑھے لکھے تھے۔ انہیں پڑھے لکھے پنڈتوں کا مقولہ تھا کہ علم کے یہ غازی اپنے عمل اور پرچار سے لوگوں پر یہ ظاہر کر سکیں کہ سچا اور اعلیٰ مارگ بھی ہے۔ جس کا وہ پرچار کرتے ہیں۔ اور اسی پر خود بھی عمل کرتے تھے۔

اب کیوں نہیں کرتے۔

اب اس کی اتنی ضرورت نہیں رہی۔ پڑھے لکھوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے ان پڑھوں کی تعداد کم ہو رہی ہے اور وہ دن دور نہیں جب ہمارے ملک میں بھی سبھی لوگ پڑھے لکھے مانے جائیں گے۔

کیا اس وقت پروفیسروں کی ضرورت رہے گی۔

کیوں نہیں رہے گی۔ ہر نئی نسل کے لئے تعلیم گاہوں اور درسگاہوں کی ضرورت نہیں رہے گی۔

رہے گی۔ اور اس لئے پروفیسروں کی بھی۔

کیا آج کی دنیا میں اخلاق کی کوئی جگہ نہیں ؟

اخلاق کی جگہ ہے مگر اخلاق کی قدر نہیں ....

کیا میرا اور تمہارا رشتہ بداخلاقی کا ہے۔

تم ہی بتاؤ

گورو تم ہو۔ اور بتاؤں میں۔

میں وہ گورو نہیں۔ جس کا ذکر میں نے کیا۔ اگر اس قسم کا گورو ہوتا تو تمہیں اپنے ساتھ کبھی نہیں لاتا۔

لا کر تو کیا کیسے ہے تم نے۔ گوما نے ہنستے ہوئے کہا۔ گوما کے دانت موتیوں کی طرح دمکنے لگے۔

یہی تو سوچ رہا ہوں کہ کیا کروں۔

میں تمہارے پاس ہوں۔

جانتا ہوں۔

اور کھلا ہوا آسمان ہے۔ نیچے ریشمی گھاس اور چاروں طرف پھول کھلے ہوئے ہیں اور ان کی خوشبو سے دماغ معطر ہو رہا ہے۔ اور تم کس قسم کے مرد ہو کہ میرے قریب نہیں آتے۔

آج کل لڑکیاں بڑی جلدی جوان ہو جاتی ہیں۔ آنند نے سوچتے ہوئے کہا۔

عقل مند اور حساس بھی، گوما نے قریب آتے ہوئے کہا۔

گوما۔ ریشمی گھاس پر یوں لیٹ گئی۔ جیسے کوئی قالین بچھا ہوا ہو۔ پروفیسر آنند نے گوما کو سر سے لے کر پاؤں تک دیکھا۔ یہ لیٹی ہوئی لڑکی ایک کمان کی طرح کھینچ گئی تھی۔ سینے کی گولائیاں اس کی تنگ قمیض سے باہر نکلنے کو بے تاب تھیں۔ نہ جانے کیوں گوما نے اپنی قمیض کا ایک بٹن کب کھولا تھا۔ اور وہ دو دھیا ڈھلوان، وہ شفاف ڈھلوان، جس کو دیکھ کر آنند کی آنکھوں کے آگے ایک دھند سی چھا گئی۔ پھر کہکشاں بن کر اس کی آنکھوں کے آگے لہرانے لگی

اس کی نظریں پتلی کمر اور کولہوں سے ہوتی ہوئی اس کی شفاف رانوں اور پنڈلیوں کا جائزہ لیتی ہوئی اس کے پاؤں تک جا پہنچی۔

کیا دیکھ رہے ہو؟

تمہارے پاؤں سنگ مرمر سے تراشے ہوئے۔

نظر آ رہے ہیں۔ گوما نے فقرے کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

ہاں تو

قریب کیوں نہیں آتے۔؟

جلد بازی سے کوئی فائدہ نہیں۔

وہ خود پلٹ کر اس کے قریب آ گئی۔

بیٹھے کیوں ہو۔ لیٹ جاؤ۔ آرام کرو۔ ذہن کو سوچنے دو۔ مگر جسم کو آرام دو۔

گوما۔

ہاں پروفیسر۔

تم یہ کیا کیا۔

دل نے کہا وہ کیا۔

کتنا احسان مند ہوں تیرا۔

کس بات کے لیے

میرے قریب آنے کا۔ تیری سانس میرے ہونٹوں کو چھو رہی ہے۔ تیری سانس میں شہد کی سی مٹھاس ہے آنکھوں میں چاند کی چاندنی۔ اور تیرے ہونٹ یاقوت کی طرح دمک رہے ہے۔ اس سے میں اندازہ لگا سکتا ہوں۔ ایک ایک بہت بڑا طوفان آنے والا ہے۔

اور تم مجھے بچا لوگے۔

شاید میں خود ہی اس طوفان کی نذر ہو جاؤں۔

سانس قریب ہے۔ تمہارے ہونٹ بہت دور ہیں۔ گوما نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

گوما۔

جی۔

گوما نے جذبات سے مغلوب ہو کر اپنے باہیں پھیلا دیں اور اس کا شہد آگیں تنفس زور زور سے چلنے لگا۔

ان باہوں میں آ جاؤ ——— یہ کھلی کی کھلی نہ رہ جائیں۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔

یوں محسوس کر رہی ہوں۔ جیسے میں مر جاؤں گی۔ اگر تم نے اپنی باہوں میں نہ لیا۔

آنند کے جذبات نہ بھڑکے۔ وہ حدت، بے تابی، وہ اضطرابی کیفیت جو گوما کی سانس میں تھی۔ اور جس تندہی سے اس کا جسم تنا ہوا تھا۔ اس کا پتہ آنند کی گفتگو میں نہ تھا۔ گوما تو طوفان بن کر آئی تھی۔ برسات کی ندی کی طرح

وہ اسے بہا کر لے جانا چاہتی تھی لیکن پروفیسر نے ضبط و بند کے دروازے نہ کھولے صرف گوما کے نیم وا ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے اور گوما اپنی دونوں باہیں اس کے گرد حمائل کر دیں اور وہ اپنے محبوب کو اسی بے تابی اور بے چینی سے چومنے لگی۔ جیسے آنند اسے کبھی نہیں ملے گا۔ انسان شرافت کا کتنا ہی پتلا ہو نیکیوں کی ہتیں ایک جوان ہی کے جسم کے گلے لگتے ہی پگھلنے لگتی ہیں۔ انسان اس وقت بھول جاتا ہے کہ کل کیا ہوگا۔ ان آتشیں ہونٹوں پر ہونٹ رکھتے ہوئے پروفیسر آنند نے یوں محسوس کیا کہ گوما واقعی اسے چاہتی ہے۔ یہ اس کا پہلا ہی پیار ہے۔ گو یا وہ پروفیسر کے ساتھ چمٹ گئی تھی۔ جیسے امر بیل کسی پیڑ سے لپٹ جاتی ہے۔ جیسے بچنے کا اب کوئی راستہ نہ تھا۔ جب آگ پر تیل چھڑکا جاتا ہے۔ تو آگ بجھتی نہیں اور بھڑکتی ہے۔ شعلے لپکتے ہیں۔ چھوٹی موٹی نیکیاں، اخلاق اور روحانی قدریں اس ...... Biological سچائی کے آگے تہس نہس ہو جاتی ہیں۔ پروفیسر آنند نے محسوس کیا کہ اس کا جسم جل رہا تھا، تپ رہا تھا۔

کان کی لویں انگارہ ہو رہی تھیں۔ بدن شعلہ ہو رہا تھا۔ اب پروفیسر آنند گوما کے پھول ایسے رخساروں کو چوم رہا تھا۔ پروفیسر آنند کے بوسوں میں وہی تپش، بیقراری اور بے تابی تھی جو گوما کے بوسوں میں تھی۔ دونوں کے جسموں میں ایک ہی آگ تھی۔ دونوں ایک دوسرے میں مدغم ہو جانا چاہتے تھے۔ جل کر راکھ ہو جانا چاہتے تھے۔ اچانک آنند نے محسوس کیا کہ وہ حد سے آگے بڑھ رہا ہے اس نے جلدی سے اپنے آپ کو گوما سے الگ کر لیا۔

گوما لیٹی رہی۔ ایک ہنستے ہوئے گلاب کی طرح۔ جس کے جسم کی مہک ان تمام گلابوں سے ادھک تھی۔

اٹھو گوما —— کسی نے دیکھ لیا تو —— پروفیسر آنند نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

پروفیسر آنند اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ گوما کافی دیر تک لیٹی رہی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں، سانس تیزی سے چل رہی تھی چھاتیوں کے زیر و بم سے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے لہریں کسی گرانڈیل چٹان سے ٹکرا رہی تھیں۔ اس کے جسم میں ایسا بھونچال آیا تھا جس نے اس کے جسم کے حصوں کو چکنا چور کر دیا تھا۔ کافی دیر تک وہ اسی طرح لیٹی رہی۔ جب وہ اُٹھی تو گوما کے رخسار سورج مکھی کی طرح چمک رہے تھے۔ اس کی نگاہوں میں ایک خوشنما چمک تھی۔ اس کا جسم پھولوں کی طرح نرم اور آگ کی طرح گرم تھا——

دونوں کار کی طرف بڑھے —— "

باب ۲

پروفیسر آنند ڈیڑھ بجے کے قریب گھر پہنچا، اس کی بیوی شانتی انتظار کر رہی تھی۔ شانتی کا شمار ان بیویوں میں ہوتا تھا۔ جنہیں لڑنا جھگڑنا نہیں آتا۔ یہ پروفیسر کی خوش قسمتی تھی کہ اسے اس قسم کی بیوی ملی تھی۔ شانتی نے کبھی پروفیسر سے کسی قسم کی شکایت نہ کی۔ شانتی زیادہ تعلیم یافتہ نہ تھی۔ صرف میٹرک پاس۔ بے حد سگھڑ اور سنجیدہ، غصّہ تو اس عورت کو شاید آتا ہی نہ تھا۔ کبھی دو چار سال بعد وہ خفا ہو جاتی۔ عورتوں کی طرح نہ اس کو سونے کی چوڑیاں بنوانے کا شوق تھا اور نہ ہی اس نے کبھی پروفیسر کو اس بات کے لیے تنگ کیا۔ کہ مجھے ساڑھیاں چاہیئے۔ فیشن سے اسے نفرت تھی۔ ہاں اچھا کھانا کھانے کا شوق تھا اور پکانے کا بھی کھلانے کا بھی صورت شکل سے اتنی جاذب نظر نہ تھی۔ اس وقت پینتیس سال کی عمر ہوگی اس کی پہلے چھریرے بدن کی تھی۔ اب ذرا موٹی ہو گئی تھی۔ بس گھر میں پڑے رہنے کی عادت تھی۔ کبھی کوئی فلم لگتی تو پروفیسر اور شانتی دیکھنے چلے جاتے۔ شانتی میں حسد اور جلن کا جذبہ کم تھا، اکثر پروفیسر کے گھر حسین عورتوں کا جمگھٹا رہتا۔ وہ بڑی ہنسی خوشی ان لڑکیوں کا سواگت کرتی۔ بازار سے چیزیں منگوا کر کھلاتی۔ بڑے اخلاق سے پیش آتی۔ تین کمرے کے فلیٹ میں رہ کر اس نے کبھی بڑے فلیٹ میں جانے کی خواہش نہ کی۔ شانتی نے کبھی بھی پروفیسر سے یہ نہ پوچھا کہ تم کیا کماتے ہو۔ کتنا خرچ کرتے ہو۔ اور کتنا بچا کر رکھتے ہو۔ جتنے روپے پروفیسر دیتا اس سے گھر کا خرچ چلاتی۔ چیخنے چلانے کی عادت نہ تھی۔ شادی ہوئے ۱۵ سال ہو چکے تھے۔ ابھی تک ایک بچہ بھی نہ ہوا تھا۔ پروفیسر تو کبھی کبھی ہنس کر کہتا کہ ہم دونوں کو اس کام کے لئے پدم شری کا خطاب ملنا چاہیئے کہ ہم نے بھارت کی بڑھتی ہوئی آبادی میں اضافہ نہ کیا۔ یوں پروفیسر نے اس بات کا احساس کیا کہ جب ساتھ والے فلیٹ کے بچے شانتی کے پاس آتے تھے تو وہ انہیں بڑے پیار سے بلاتی تھی۔ انہیں ٹافیاں اور چاکلیٹ منگوا کر دیتی۔ ان کے بالوں میں کنگھی کرتی اور کئی بار تو ایسا بھی ہوا کہ ساتھ کے فلیٹ میں رہنے والے جب کبھی پکچر دیکھنے جاتے تو بچے شانتی کے حوالے کر جاتے۔ ماں باپ کے چلے جانے کے بعد شانتی ہی ان بچوں کی دیکھ بھال کرتی۔ اور یہ بچے شانتی سے اس قدر مانوس ہو گئے تھے کہ وہ شانتی کو موسی کہتے تھے۔

شانتی پروفیسر آنند کی بے حد عزت کرتی، اس نے محبّت کا اظہار کبھی لفظوں سے نہ کیا مگر برتاؤ اور سلوک و عمل سے اس کی محبت کا اظہار ہوتا تھا۔ شانتی نے کبھی اس بات کا گلہ بھی نہ کیا کہ ہمارے یہاں بچہ کیوں نہیں ہو رہا

ایک دو بار پروفیسر آنند شانتی کو ڈاکٹر کے پاس بھی لے گیا۔ معائنہ بھی کروایا۔ علاج بھی کیا مگر کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ دونوں یہ سمجھ کر چپ ہو گئے کہ بھگوان کی مرضی نہیں تھی۔ اور پھر ہندوستان میں ویسے ہی آبادی زیادہ تھی اگر ہم نے اضافہ نہ کیا تو کون سی قیامت آ گئی۔ اور پھر اس بات کی کیا گیارنٹی ہے کہ ہمارا بیٹا بڑا ہو کر جواہر لال ہی بنے گا۔ اور اگر لڑکی ہوئی تو بڑی ہو کر اندرا گاندھی کی طرح پرائم منسٹر ہی بنے گی۔

اکثر گھروں میں ہنگامے اور جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔ مگر یہ گھر ایسا تھا۔ جہاں جھگڑوں اور ہنگاموں کو سلجھایا جاتا تھا۔ اکثر پروفیسر آنند کے دوست کہا کرتے کہ سکون یہیں یہیں ملتا ہے۔ جب ہم یہاں آتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی مندر میں آ گئے۔ تیری بیوی دیوی ہے دیوی۔ واقعی تم خوش قسمت ہو کہ تمہیں اتنی آدرش وادی بیوی ملی ہے۔ ہماری بیویاں تو ہٹلر اور ہلاکو کی بیٹیاں معلوم ہوتی ہیں۔ چیزوں کی فرمائش یوں کرتی ہیں جیسے ہم لکھ پتی ہیں۔ اور جیسے نوٹ درختوں پر لگتے ہیں۔ جنھیں توڑ کر ہم اپنی بیویوں کی جھولی میں ڈال دیں گے۔ یہ نہیں سوچتیں کہ مہنگائی کا زمانہ ہے زندہ رہنا مشکل ہو گیا ہے۔ فیشن تو یوں کریں گی جیسے پندرہ سولہ برس کی لڑکیاں کرتی ہیں۔ ارے بھئی ٹائٹ پینٹ پہننے کی کیا ضرورت ہے۔ پہلے اپنی ٹانگیں کو ملاحظہ فرمائیے۔ سوکھی دبلی سی آپ کی ٹانگیں مگر خاوند کا ناطقہ بند کیا جا رہا ہے۔ اور پھر پینٹ بھی پہننے لگیں۔ ان کا بس چلے تو ہاف پینٹ بھی پہننے سے گریز نہ کریں۔ اور لنگی اور کرتے کی فرمائش سے باز نہیں آئیں گی۔ بالوں کا فیشن توبہ بھلی۔ مصنوعی بال بازار سے خرید کر سر پر قطب مینار تیار کر لیں گی۔ دراصل مختلف فیشنوں کا تعلق عمر سے ہوتا ہے۔ مگر ہماری عورتیں اس بات کا خیال نہیں رکھتیں۔ فیشن کی خاطر فیشن کرتی ہیں۔ خاوندوں پر یوں رعب جمائیں گی جیسے خاوند ان کے غلام اور بیویاں حاکم۔ خرچ تو یوں کریں گی جیسے ہر مرد پانچ ہزار روپے ماہوار کما رہا ہے۔ اس بات کا خیال نہیں رکھیں گی کہ آمدنی کے مطابق اپنے اخراجات بڑھانے یا گھٹانے چاہئیں۔ اور شکی مزاج تو اتنی کہ اگر کسی خاوند نے کسی دوسری عورت سے بات بھی کر لی تو ایک ہنگامہ کھڑا ہو جاتا۔ اور بھٹو کی طرح ایک ہزار سال کی جنگ کا اعلان کیا جاتا۔ شانتی ان تمام چیزوں سے بہت دور تھی۔

دو سال سے وہ بیمار سی رہنے لگی تھی۔ وزن گھٹ رہا تھا۔ بھوک کم ہو رہی تھی۔ پروفیسر آنند نے ڈاکٹروں کو دکھایا کافی چھان بین کے باوجود کچھ پتہ نہ لگا کہ وزن کیوں گھٹ رہا ہے۔ نیا خون کیوں نہیں بنتا۔ دن بدن شانتی کمزوری محسوس کر رہی تھی۔ مگر اس نے اس کمزوری کو کبھی بیماری نہیں سمجھا۔ گھر میں نوکرانی بھی تھی۔ مگر پھر بھی شانتی خود ہی کام کرتی۔ پروفیسر کا کھانا پکاتی، ہاں برتن مانجنے کا کام نوکرانی کے سپرد تھا۔ یہاں تک سبزیوں کو صاف کرنا۔ انہیں دھونا۔ پکانا۔ یہ سارا کام شانتی ہی کرتی۔ آج ذرا پروفیسر جب لیٹ آیا۔ تو شانتی نے صرف یہی پوچھا۔

دیر ہو گئی۔

ہاں شانتی۔ بھئی ایک دوست کے ساتھ پکنک پر چلا گیا تھا وہیں بہت کچھ کھا لیا۔

کھانا نہیں کھاؤ گے کیا۔

کھاؤں گا مگر تھوڑا سا۔ تم تو کھانا کھا لیتی۔

میں آپ کا انتظار کر رہی تھی۔

تمہیں سو بار سمجھایا ہے۔ اگر مجھے دیر ہو جائے تو تم کھانا کھا لیا کرو۔ مگر تم میرا کہنا نہیں مانتی۔ کتنی دبلی ہو گئی ہو۔

دبلی نہیں بلکہ موٹی۔

یہ موٹاپا صحت کی نشانی نہیں ۔ حضور کے جسم میں خون کی کمی ہے ۔ وٹامن کی گولی کھائی تم نے ۔

پہلے کھانا تو کھالوں ۔

تو لگاؤ ۔ میز پر کھانا ۔

شانتی نے میز پر کھانا لگایا ۔ دونوں نے کھانا کھایا ۔

شانتی کھانا ذرا آہستہ کھاتی تھی ۔ اور پروفیسر آنند ذرا تیزی سے ۔ اس لئے وہ جلدی سے کھانا کھا کر فارغ ہو گیا ۔

دونوں آپس میں بات چیت بہت کم کرتے تھے ۔ اشاروں ہی سے ایک دوسروں کا مطلب سمجھ جاتے تھے ۔

آج سنڈے ہے ۔

ہاں ۔ آپ تو کھانا کھا کر آرام کریں گے ۔

اور تم ؟

میں ساتھ والے فلیٹ کے بچے کا سوئٹر بنوں گی ۔

اس سے بہتر تو تھا کہ تمہارا کوئی اپنا بچہ ہوتا

پیدا کر لیتے روکا کس نے تھا ۔

اب — ؟

اب کیا ہوگا ۔ یوں بھی ساتھ والے فلیٹ کے بچے میرے اپنے بچے لگتے ہیں ۔ ان سے دل بہل جاتا ہے کبھی کبھی یہ بچے مجھے اپنی ماں کہتے ہیں ۔ تو مجھے بڑا آنند ملتا ہے ۔ کبھی میرے پاس آ کر سو جاتے ہیں ۔ کبھی مجھ سے آ کر آئس کریم کے پیسے مانگتے ہیں ۔ میں انہیں دیتی ہوں ۔ یہ بچے خوش ہو جاتے ہیں ۔ میرے اپنے بچے بھی ہوتے تو میں یہی کچھ کرتی ۔ اور کیا کرتی ۔

یہ بچے بڑے ہو کر تمہیں بھول جائیں گے ۔ ان سے زیادہ دل نہ لگاؤ ورنہ پچھتاؤ گی ۔ آج کل کون کس کی دیکھ بھال کرتا ہے ۔ بھروسہ تو اپنی ذات پر کرنا چاہیئے ۔ اور محبت ایسی چیز ہے کہ جو دی جاتی ہے جس سے انسان محبت کرتا ہو اس سے مانگتا کچھ نہیں ۔ جو دینے میں مزا ہے ۔ وہ لینے میں نہیں ۔

تم فلاسفر کب سے بنی ۔

تمہاری صحبت میں بہت کچھ سیکھا ہے میں نے — اچھا جاؤ آرام کرو ۔ کل تمہیں کالج جانا ہے ۔

پروفیسر آنند اپنے کمرے میں آیا ۔ اس نے سوچا کہ وہ کیا کر رہا ہے ۔ اس قسم کی بیویاں کہاں ملتی ہیں ۔ اگر شانتی کو اس بات کا علم ہو گیا ۔ کہ میں گوما کو چاہتا ہوں تو اس کے دل پر کیا اثر ہوگا ۔ انسان بھی عجیب و غریب قسم کا جانور ہے ۔ جسے چاہتا ہے ۔ اسے ہی دکھ دیتا ہے ۔ بھلا اس عورت نے میرا کیا بگاڑا تھا ۔ کہ وہ ایک ایسے گورکھ دھندے میں پھنسنے جا رہا ہے کہ جہاں سے اس کا نکلنا نہایت ہی مشکل ہوگا ۔

اس نے الماری سے ایک کتاب نکالی ۔ کتاب کی ورق گردانی کرنے لگا کہ اس میں سے ایک تصویر گری ۔ یہ تصویر گوما کی تھی ۔

باب ۳

گو ماما مالدار باپ کی بیٹی تھی۔ شام پرشاد لاکھوں کے مالک تھے۔ دولتیں کھیں اور جب انسان مالدار ہو جاتا ہے تو وہ ایک بزنس پر اکتفا نہیں کرتا۔ ملوں کے علاوہ اب شام پرشاد نے صابن اور تیل کے کارخانے کھول لئے تھے۔ امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس بھی شروع کر دیا تھا۔ اور حالت یہ تھی کہ بینک بیلنس دن بدن بڑھتا جا رہا تھا۔ گھاٹا نام کو نہ تھا شہر کے بڑے بڑے صنعت کار گھر میں آتے۔ آئے دن شراب کی پارٹیاں ہوتیں۔ والکیشور روڈ پر شاندار بنگلہ تھا ۱۲ ایکڑوں کا بنگلہ۔ جن کی لمبائی چوڑائی اتنی تھی کہ دو سو آدمی آسانی سے رہ سکتے تھے۔

ابھی تک انہوں نے ایک دھندے سے پرہیز کیا تھا وہ تھا اسمگلنگ کا دھندا۔ اس دھندے کے بارے میں کئی آفرآئے مگر انہوں نے ہمیشہ اس دھندے میں شامل ہونے سے انکار کیا۔ ان کے مشیروں نے شام پرشاد سے کہا۔ حضور آپ کس چکر میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اس دھندے میں لاکھوں اور کروڑوں کا فائدہ ہے۔ بس ایک ہاتھ ماریئے — لاکھوں کے ڈھیر لگ جائیں گے۔ دیکھئے نا۔ سکھوبل ٹھکوبل کو چاروں طرف روپیوں کی ریل پیل ہے۔ وزیروں کے فون پر فون آتے ہیں۔ اور پھر اس دھندے میں کس نے ہاتھ نہیں رنگے۔ اردلی سے لے کر وزیر تک اس دھندے میں شامل ہیں۔ بڑی بڑی پارٹیوں میں بلوائے جاتے ہیں اور پھر لائسنس۔ پرمٹ اور کیا نہیں ملتا جناب۔ اور پھر جب انسان ایک بار کروڑپتی ہو جاتا ہے تو حکومت بھی رعب کھاتی ہے۔ جب الیکشن کے وقت سیاسی پارٹیاں کوٹھی کے گرد چکر لگاتی ہیں۔ اور اس وقت دو چار لاکھ ان پارٹیوں کو دیں۔ اور کروڑوں روپے کمالیجئے۔ یہ سب سے بڑھیا دھندا ہے اور پھر لوٹئے دولت اور شہرت کے مزے۔ سیاست میں بھی آپ کی دخل اندازی کا سواگت کیا جائے گا۔ جو صنعت کار اسمگلر نہیں بنتا وہ بڑا صنعت کار کبھی نہیں بن سکتا۔ اور بڑا صنعت کار بڑا سیاستدان بھی بن سکتا ہے۔ اور جو بڑا سیاست دان بن جاتا ہے۔ وہ قوم کی باگ ڈور سنبھال سکتا ہے۔ اس لئے ذرا بھارت کے منسٹروں پر نظر ڈالئے تو معلوم ہو گا کیسی شاندار زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس لئے انہوں نے سیاست کو اوڑھنا بچھونا بنایا ہوا ہے۔

شام پرشاد ان باتوں کو سنتے تو ہنسی مذاق میں ان باتوں کو اڑا دیتے۔ اپنے مشیروں اور سکریٹریوں سے بے حد خوش تھے۔ کہ یہ لوگ ان کی مالی ترقی کے لئے ہر سبیل اختیار کرنے کے لئے تیار ہیں۔ سیٹھ شام پرشاد کے دل میں

ابھی تک سچائی کی تھوڑی سی رمق باقی تھی جہاں تک انکم ٹیکس کا تعلق تھا۔ اس میں تو گول مال کرتے تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر باقاعدگی سے انکم ٹیکس ادا کیا جائے تو کوئی انسان امیر نہیں بن سکتا۔ پھر نہ جانے انہیں اسمگلنگ سے کیوں نفرت تھی۔ شاید اس لئے کہ اس میں جان جانے کا خطرہ ہے اور جیل جانے کا بھی۔ اگر بر وقت سنٹرل اور دیگر پولیس افسروں نے تعاون نہ کیا تو جیل کی ہوا کھانی پڑے گی۔ اور اس کے علاوہ گھر کا ماحول اس قسم کا تھا کہ یہ پیشہ گھر کے ماحول سے میل نہ کھاتا تھا۔

سیٹھ شیام پرشاد کی بیوی تو بزنس میں دخل نہ دیتی۔ جانکی تو اس بات سے خوش تھی کہ بزنس بڑھتا چلا جائے۔ اور بزنس کے ساتھ انسان پھلتا پھولتا جائے۔ اور جہاں تک پھیلنے اور پھولنے کا تعلق تھا۔ سیٹھ شام پرشاد عمر سے بڑھ رہے تھے۔ اور پیٹ سے پھول رہے تھے اور گال پھول کر کپا ہو گئے تھے اور جہاں تک اس کے اپنے جسم کا تعلق تھا۔ جانکی کا شمار ان عورتوں میں ہوتا ہے جن کے پاس سوائے گوشت کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ ہاں شام پرشاد کو اپنے دو بچوں کی فکر تھی۔ ایک تھی گوما۔ جو اتنی چالاک اور چوبند تھی کہ گھر میں ایک حشر برپا رہتا اور خاص کر شام پرشاد کو گوما کی تقریریں سننی پڑتی تھیں۔ جو اتنی ہی تیز طرار ہوتی تھیں۔ جتنی وہ خود تھی۔ بڑے سے بڑے لیڈر بھی کیا تقریریں کریں گے جو وہ کرتی تھی۔ اور اپنے پاپا سے کہتی۔ پاپا تم یہ کیا کر رہے ہو۔ بھلا اتنی جائداد جمع کرنے سے فائدہ۔ زمانے کی طرف دیکھو لوگ کیا سوچ رہے ہیں۔ کہاں جا رہے ہیں۔ ہماری حکومت کیا سوچتی ہے۔ سوشلزم اب آنے ہی والا ہے اور غربت جلنے ہی والی ہے۔ اتنی جائداد کو کیسے سمیٹا لوگے۔

اس پر سیٹھ شام پرشاد کہتے۔ بیٹی میں تیس برس سے یہی کچھ سن رہا ہوں۔ کہ سوشلزم آئیگا۔ اور لوگوں کی حالت بہتر ہوگی۔ مگر تم ہی بتاؤ۔ کیا لوگوں کی اقتصادی حالت پہلے سے بہتر ہوئی ہے۔ وہ بے چارے تو پہلے سے زیادہ ننگے اور بھوکے ہو گئے ہیں اور ہماری آمدنی میں اضافہ ہوا ہے پہلے ایک مل تھی۔ اب دو ملیں ہو گئی ہیں اس کے علاوہ اور کتنے بزنس کھول لئے ہیں ہم نے۔ میں نے یہی کیا۔ ہماری بزنس سے کمپنی کا ہر شخص مالدار ہوتا جا رہا ہے۔ نہ جانے تم کس سوشلزم کی بات کر رہی ہو۔؟

میں مانتی ہوں پاپا۔ ابھی سوشلزم نہیں آیا۔ لیکن سوشلزم آئے گا تو آپ کی ملیں آپ سے چھن جائیں گی آپ اتنی بڑی کوٹھی میں نہیں رہ سکیں گے۔ آپ کے اتنے نوکر نہیں ہوں گے۔ آپ روزانہ اخبار پڑھتے ہیں آپکو علم ہونا چاہیئے کہ جائداد پر سیلنگ لگ رہا ہے۔ زمین پر سیلنگ لگ رہا ہے۔ لوگوں کو زیادہ منافع کمانے کی اجازت نہیں ہوگی اور پبلک سیکٹر کی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے۔

سب کچھ پڑھ رہا ہوں مگر کاغذ پر۔ سن رہا ہوں۔ مگر اس پر عمل نہیں ہوگا۔

اگر عمل نہیں ہوگا تو ایک دن خونی انقلاب آئے گا۔

سیٹھ شام پرشاد نے قہقہہ لگایا۔ اور کہنے لگے۔ کہ بیٹی۔ ہمارے خون میں غلام تشدد کوٹ کوٹ کر بھرا ہے اور جس قوم کے مزدور ایک وقت کھانا کھا کر پرماتما کے حضور میں اپنے دونوں ہاتھ اٹھا دیں۔ وہاں کیا خاک انقلاب آئے گا۔ جانتی ہو لوگ کیا سمجھتے ہیں غربت کے بارے میں۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں گوما۔ کہ پرماتما نے ہمیں غریب بنایا ہے۔ ہمارے پچھلے کرموں کی سزا ہمیں مل رہی ہے ان بیچاروں کو کیا معلوم کہ جو لوگ عیش کر رہے ہیں ان کو کن کرموں کا پھل مل رہا ہے۔ وہ کیوں عیش کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ اس جنم میں بھی اور اگلے جنم میں بھی۔

"جی نہیں۔ ڈیڈی اس طلسم کا خاتمہ ہو گا۔"

"جب ہو گا۔ دیکھا جائے گا۔ اس وقت تم کیا کر رہی ہو؟"

"کالج جانے کی تیاری کر رہی ہوں۔ ادھر سے گزری۔ تو آپ سے ملاقات ہو گئی۔ میں نے سوچا لگے ہاتھوں پاپا سے دو دو باتیں ہو جائیں۔"

"مجھے تمہاری فکر نہیں گوما۔ تم سمجھ دار لڑکی ہو تم اگر غریبوں کا بھلا چاہتی ہو تو کوئی بُری بات نہیں بلکہ اچھی بات ہے۔ غریبوں کے لئے دل میں ہمدردی ہونی چاہیئے۔ تم نے اقتصادیات پر کتابیں پڑھیں ہیں۔ اُن سے تمہارے ذہن میں ایک نئی وسعت آئے گی۔ اور تم اچھی خاصی تقریر کر سکتی ہو اور مجھے اس بات پر فخر ہے۔ کہ تم ایک ذہین قابل اور سمجھ دار لڑکی ہو۔ آگے چل کے تم وزیر بن سکتی ہو۔

کیا کہا آپ نے پاپا؟

"یہی کہ وزیر بن سکتی ہو اور ہو سکے تو ایک دن وزیر اعظم بھی۔ اندرا گاندھی کی طرح!

"مجھے وزیر یا وزیر اعظم بننے کا شوق نہیں ہاں اس بات کی خواہش رکھتی ہوں۔ کہ میری کوشش سے اگر چند لوگوں کو خوشی مل سکتی ہے تو وہ ضرور دوں گی۔ میری جیب کے سکوں سے اگر چند آدمیوں کا پیٹ بھر سکتا ہے۔ تو اس سے مجھے مسرت ملے گی۔ اور ہاں کبھی وقت آیا اور اس وقت میں نے محسوس کیا۔ کہ میری قربانی سے انقلاب آ سکتا ہے۔ تو اپنی جان کی بازی لگا دوں گی۔

تمہاری آدرش وادی باتیں سُنکر مجھے خوشی ہوئی کیونکہ آج کل لڑکے اور لڑکیاں ہیرو بننے کے خواب دیکھتی ہیں بکم تم نے کم سے کم غریبوں کے بارے میں سوچا تو۔ مگر میں بہت پریشان ہوں۔

"کس کے لئے پاپا؟"

"سوامی کے لئے"

"سوامی کون؟ گوما نے چونک کر کہا۔"

"تیرے بھیا گوپال کے لئے"۔ شام پرشاد نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ گوما کی سمجھ میں بات نہیں آئی۔

"تیرے بھیا نے داڑھی کیوں بڑھالی۔ اور پھر اتنے لمبے لمبے بال کہ ان کو دیکھ کر مجھے سوامی آنند یاد آ جاتے ہیں۔"

"پاپا! گوپال ہپی بن گئے ہیں۔ آج کل فیشن ہے۔"

"داڑھی رکھنے سے کیا فائدہ۔ اور سر کے بال اتنے بڑھا لئے ہیں۔ کہ مرد اور عورت میں فرق ہی محسوس نہیں ہوتا۔"

"پراچین زمانے میں رشی مُنی صرف لمبے لمبے بال رکھتے تھے۔ بھیا نے رکھ لیا تو کیا بُرا کیا۔"

"پراچین زمانے میں رشی منی صرف لمبے بال ہی نہیں رکھتے تھے۔ بڑھیا کام بھی کرتے تھے۔ بڑے تپسوی تھے انہوں نے وید لکھے۔ رامائن لکھی، مہا بھارت لکھی، گیتا لکھی، آج کل مہارشی گوپال کیا کرتے ہیں۔ یعنی تمہارے بھیا گوپال۔"

"تھوڑی سی چرس اور گانجا پیتے ہیں۔ اور ایک گوپال ہی کیا۔ نوجوانوں کے غول کے غول داڑھی اور بال بڑھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔"

"اور کیا کرتے ہیں؟"

"اچھی باتیں کرتے ہیں پاپا۔ امریکہ اور انگلینڈ کے ہپی زندگی سے بیزار نظر آتے ہیں۔ وہاں زندگی ایک ہی طرح کی

ہوگئی ہے ۔ ہر شخص امیر بننا چاہتا ہے ۔ اور مادی سہولتیں چاہتا ہے ۔ ایک شاندار فلیٹ ، ریڈیو ، ٹیلیویژن ، کار ، شراب ، لڑکیاں اور دنیا کی سیر ، یعنی عیش وطرب کی زندگی سے وہ دور رہنا نہیں چاہتے ۔ نوجوانوں کا طبقہ یہ سوچتا ہے ۔ کہ ایسی زندگی کا کیا مقصد ۔ جدھر جاؤ ۔ ریڈیو ۔ جدھر دیکھو ٹیلی ویژن ۔ جدھر جاؤ ایکٹرا اور ایکٹریس ۔ جدھر نظر ڈالو بہتر کرسیاں ، شراب ننگی لڑکیاں ، بلیو فلمز یعنی ایک ہی طرح کی زندگی ۔ اور پھر جب سکھ نہیں ملتا تو ویت نام چلے جائیے اور امریکہ کی خاطر مر جائیے ۔ اپنے وطن کی خاطر ، بہت سے نوجوان اس جنگ سے بیزار ہو گئے ہیں ۔ امریکہ میں لاکھوں نوجوان فوج میں بھرتی کر کے محاذ جنگ پر بھیجے جاتے ہیں اور وہاں موت کی نذر ہو جاتے ہیں ۔ ان کی شہادت سے نہ تو ساؤتھ ویت نام کو فائدہ پہنچتا ہے اور نہ ہی نارتھ ویت نام کو ۔ اور نہ ہی امریکہ کو ۔ صرف نوجوانوں کا خون بہتا ہے ۔ کئی مائیں اپنے بیٹوں سے جدا ہوئی ہیں ۔ بیویاں بیوہ ہوئیں ہیں ۔ باپ بیٹوں سے الگ ہوئے ہیں اور بہنیں بھائیوں سے جدا ہوئی ہیں ۔ ایک عجیب قسم کی افراتفری مچی ہوئی ہے ۔ اس سے بچنے کے لئے امریکہ اور انگلینڈ کے نوجوانوں نے یہ راستہ نکالا ہے ۔ کہ ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں ۔ ہمیں روپیہ نہیں چاہیئے ۔ ریڈیو نہیں چاہیئے ۔ ٹیلی ویژن نہیں چاہیئے ۔ ہم زمین پر سوئیں گے ۔ شادی نہیں کریں گے ۔ بچے پیدا نہیں کریں گے ۔ آزاد رہیں گے ۔ "

" بات تو ٹھیک ۔ مگر داڑھی بڑھانے سے کیا فائدہ ـــ بیٹی ! "

" داڑھی منڈانے سے کیا فائدہ ہے پاپا ؟ "

" آدمی صاف ستھرا تو نظر آتا ہے ۔ "

" ہاں اگر اوپر سے نہا لیا جائے تو اندر کی گندگی کا کیا ہوگا ۔ لیکن ایسا کبھی کبھی ہوتا ہے ۔ انسان ایک ہی طرح کی زندگی گذارتے گذارتے تنگ آجاتا ہے ۔ تو ایک ایسا طریقہ نکالتا ہے زندہ رہنے کے لئے جو دوسروں سے مختلف ہو ۔

" مختلف تو ہو ۔ مگر بہتر بھی ہونا چاہیئے ۔ چرس اور گانجے کا نشہ ۔ "

" روپوں کے نشے کے بارے میں کیا رائے ہے آپ کی پاپا ۔ "

" روپوں کے بغیر زندگی نہیں گذاری جا سکتی ۔ "

" لوگ گذارتے ہیں ۔ "

" کون لوگ ۔ "

" جن کے پاس روپے نہیں ہوتے ۔ "

" وہ تو فاقے کرتے ہیں بیٹی ۔ "

" یہ بھی زندگی گذارنے کا ایک طریقہ ہے ۔ "

" لیکن بڑا ہی کٹھن ، بڑا ہی تکلیف دہ ! "

" اسے بُرا کہیئے یا اچھا ۔ مجبوری ہے پاپا ۔ "

" لیکن تمہارے گوپال کو کونسی مجبوری ہے ۔ اس کے پاس کیا نہیں ۔ وہ چاہے تو میں اسے لندن بھجوا دیتا ہوں امریکہ جا سکتا ہے ۔ روس بھیج سکتا ہوں ۔ دنیا کے کسی خطے میں جانا چاہے بھجوا سکتا ہوں ۔ اتنا روپیہ پڑا ہے ۔ بنکوں میں بزنس شروع کر دے کوئی بزنس ۔ اور اگر کچھ نہیں کر سکتا تو شادی کرلے ۔ زندگی تو ڈھنگ گزرے گی ۔ "

" آج کل ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق زندہ رہنا چاہتا ہے ۔ پاپا ۔ کوئی شخص کسی پر اپنی پسند ٹھونس نہیں سکتا ۔ "

" میں کب کہتا ہوں - کہ میری پسند کا کام کرے - مگر گندگی نہ اپنائے - "

" وہ عمر میں مجھ سے بڑے ہیں پاپا - "

" لیکن عقل میں چھوٹے - بہر حال وہ اپنے کمرے میں لیٹا ہوا چرس کا سگریٹ پی رہا ہوگا - اس سے بات کر کے تو دیکھو - "

" آل رائٹ پاپا - "

باب ۴

گوما ہنستی ہوئی گوپال کے کمرے میں گئی - وہ پلنگ کی بجائے چٹائی پر لیٹا ہوا تھا - ایک میلی گندی سی پتلون پہنے ہوئے اور جسم پر بنیان تھی - وہ جا بجا سے پھٹی ہوئی تھی - داڑھی بڑھی ہوئی اور بال گردن تک پہنچے ہوئے تھے - " بھیا " !

فرمائیے گوما - اس طرف کس طرح آنا ہوا ؟

" تم سے ملنے کے لئے - "

" تشریف رکھئے - "

" گوما بیٹھ گئی "

" کیا پی رہے ہو ؟ "

" چرس ! پیو گی ؟ "

" یوں ہی لیتی - اگر جی چاہتا - "

" سنیاس لینے کو جی چاہتا ہے تمہارا ؟ "

" نہیں - "

" تھوڑی سی افیم کھا لو - "

" اس سے کیا ہوگا ؟ "

" جس طرح تم بیٹھی ہو - اسی طرح بیٹھی رہو گی - اپنے خیالات میں غرق - "

" میں اپنے بھائی کے پاس بیٹھی ہوں اور مجھے خوشی محسوس ہو رہی ہے - "

" لیکن میں خوش نہیں ہوں - "

" کیوں ؟ "

" اس لئے کہ تم خوش ہو - "

" یہ کوئی بات ہوئی بھیا - یہ تم نے داڑھی کیوں بڑھائی ہے ؟ "

" یہ میرا ذاتی معاملہ ہے - اس میں تمہیں دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں - "

"اگر تم یہ داڑھی کٹوا دو۔ تو خوبصورت لگو گے۔"

"خوبصورت بننے سے کیا فائدہ۔"

"بدصورت بنکر کیا کر لیا تم نے"؟

"مجھے داڑھی اچھی لگتی ہے۔" اس نے داڑھی گھماتے ہوئے کہا۔

"اچھا کیا ہوتا ہے۔"؟

"جو برا نہ ہو۔"

"برا کیا ہوتا ہے۔"؟

"جو اچھا نہ ہو"

"اور جو اچھا اور برا نہ ہو۔ وہ کیا ہوتا ہے"؟

"کیا کہا؟"

"یعنی جو اچھا نہ برا ہوتا ہے اسے تم کیا کہو گے۔"

"تمہارے ساتھ مغز پچی کون کرے۔ بال کی کھال نکالتے۔"

"پہلے یہ بتاؤ۔ کہ تم نے داڑھی کیوں نہیں اگائی؟"

"حضور عورتوں کی داڑھی نہیں ہوتی۔"

"کیوں نہیں ہوتی۔"

"سائنس کا مطالعہ کرو۔ پتہ چل جائے گا۔"

"اچھا مان لیا۔ آپ کی داڑھی نہیں سر پر بال تو ہیں۔"

"ہیں۔"

"وہ کٹوا دو"

"بدصورت لگوں گی۔"

"خوبصورت بن کر کیا کر لیا تم نے؟"

"اگر تمہارے مشورے پر عمل کیا تو بدصورت بن جاؤں گی اور پھر کوئی شادی نہیں کرے گا مجھ سے۔"

"شادی کر کے کیا کرو گی۔ سوائے اس کے کہ چند مورکھ بچے پیدا کرو اور کیا کر سکتی ہو تم۔"

"کیا شادی کر کے عورت صرف بچے پیدا کرتی ہے۔ میں بچے پیدا نہیں کروں گی۔ صرف محبت کروں گی۔"

"وہ شادی سے پہلے بھی ہو سکتی ہے۔"

"اور محبت کے بعد شادی کی جائے تو کیا حرج ہے۔"

"اگر شادی اور محبت نہ کی جائے تو کوئی بھونچال آجائے گا۔"

"زندگی نامکمل رہے گی۔"

"کیسے؟"

"جیسے تمہاری ہے۔ نامکمل زندگی۔"

" لفظ مکمل کا کیا مطلب ہے ؟ "

" تم لفظوں کے چکر میں پڑ گئے گوپال - عمل اصلی چیز ہے ۔

" جو میں کر رہا ہوں - یعنی اس وقت چرس پی رہا ہوں - تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو ایک سوٹا ، تم بھی لگاؤ مزا آجائے گا ۔ "

چھی چھی - شرم نہیں آتی - اپنی بہن کو چرس پلا رہے ہو ۔ "

" شرم کیسی - تم کھانا کھا سکتی ہو - کالج جا سکتی ہو - ایک مرد سے عشق کر سکتی ہو ۔ "

" جی ! گوما نے چونک کر کہا ۔

" چونکنے سے کیا فائدہ - میں یہ کہہ رہا ہوں - کہ تم ایک مرد سے عشق کر رہی ہو ذرا ہمیں یہ بتاؤ - کہ تم عشق کر رہی ہو - یا وہ عشق کر رہا ہے ۔ "

" ہم دونوں عشق کر رہے ہیں - تمہیں کوئی اعتراض ہے ۔ "

" چلئے مان لیا - وہ شادی شدہ ہے ۔ "

" ہوگا ۔ "

" وہ تم سے عمر میں بڑا ہے ۔ "

" ہاں ۔ "

" تو ۔ " ـــ ؟ ـــــــــــــــــ میں تم سے عمر میں بڑا ہوں ۔

" کیا ۔ "

" میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جیسے تمہیں یہ حق نہیں پہونچتا کہ تم میری داڑھی کے بارے میں اعتراض کرو ۔ ویسے مجھے بھی کوئی حق نہیں پہنچتا کہ میں تیری شادی کے بارے میں کچھ کہوں ، حالانکہ تم نے میری داڑھی کے بارے میں اتنے اعتراضات کئے ہیں ۔ لیکن میں تیری محبت کے بارے میں ایک اعتراض بھی نہیں کروں گا ۔ چونکہ تم میری چھوٹی بہن ہو - اور میں کبھی تم سے پیار کرتا ہوں ۔ تمہیں کوئی حق نہیں پہونچتا کہ تم کسی دوسرے مرد سے پیار کرو ۔ "

" کس قسم کا پیار ـــ ناسنس ـــ شرم نہیں آتی تمہیں ۔ "

غصے سے لال پیلی کیوں ہو رہی ہو - میری زبان سے پیار کا لفظ سنتے ہی لال بھبھوکا ہو گئیں ۔ کیا اس دنیا میں بہن اور بھائی کا کبھی پیار نہیں ہوا ۔ " ۔ ؟

" ہوا ہے مگر سچا ۔ "

" سچا پیار کیا ہوتا ہے ؟ "

" جس میں سیکس کا دخل نہ ہو ۔ "

" جو پیار تم کر رہی ہو - اس میں سیکس کا دخل ہے یا نہیں " ؟

" ہے ۔ "

" تو پھر اگر میرے اور تمہارے درمیان ....

" یہ گندی بات ہے ۔ "

صرف بات ہے گندی نہیں ۔

تو پھر میرا تم سے یہ جواب ہے کہ میں تم سے ایسا پیار نہیں کر سکتی ۔

نہ کرو ۔ لیکن میں تمہیں یہ اجازت نہ دوں گا کہ تم میری داڑھی کے بارے میں اعتراض کرو ۔ اور سنو تمہارے والد صاحب یعنی تمہارے پتا جی اور پھر میرے پتا جی جو اس لئے میرے پتا جی بن گئے کہ اچانک انہوں نے ایک ایسی لڑکی سے شادی کر لی ۔ جو ان کی بیوی بن گئی اور ان کی بیوی کیا بنی ایک دن وہ میری ماں بن گئی یہ جو کچھ ہوا میری مرضی کے بغیر ہوا ۔ اب اس قسم کی حرکتیں کرتے ہیں جنہیں میں پسند نہیں کرتا ۔ یعنی وہ اتنی دولت کما رہے ہیں جس سے مجھے نفرت ہے ۔ وہ حکومت کو دھوکہ دیتے ہیں ۔ بہت ہی کم انکم ٹیکس دیتے ہیں ۔ وہ چیزوں کی قیمتیں بڑھا رہے ۔ اور لوگوں کو لوٹتے ہیں اور کپڑے کے دام بڑھا رہے ہیں ۔ وہ صابن کے دام بڑھا رہے ہیں ۔ وہ تیل کے دام بڑھا رہے ہیں اور اتنی بڑی کوٹھی میں رہتے ہیں جس میں ایک ہزار آدمی بخوشی رہ سکتے ہیں ۔ وہ شراب پیتے ہیں ۔ اور دوسری لڑکیوں سے عشق کرتے ہیں ۔ جھوٹ بولتے ہیں ۔ بدکار ہیں ۔ اور میں نے سنا ہے کہ اسمگلروں سے بھی ان کی دوستی ہے ۔ یعنی وہ اسمگلر ہیں "۔

"ہوں گے مجھے کیا ۔ اور پھر آج کل کون اسمگلر نہیں ۔"!

"تو پھر گوما صاحبہ ! اگر میں لمبے بال رکھتا ہوں ۔ داڑھی بڑھالی ہے ۔ چٹائی پر سوتا ہوں ۔ کنگھی تنگ نہیں کرتا ۔ چرس پیتا ہوں ۔ گانجا پینے کا عادی ہوں اور جب وقت ملتا ہے ۔ پوجا کرتا ہوں ۔ تو پھر گھر والے مجھ سے ناراض کیوں ہیں ۔ صبح سے شام تک ان کی نظریں میری داڑھی پر کیوں لگی رہتی ہیں ۔ وہ کیوں نہیں اپنے اندر جھانک کر دیکھتے ۔ کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں میں نہیں کرتا ۔ اور جو کچھ میں کر رہا ہوں ۔ وہ یہ نہیں کرتے ۔ —— ! پتا جی نے تمہیں سکھا کر بھیجا ہے ۔ کہ تم مجھے ایک لمبا چوڑا بھاشن دو ۔ اور جوش و خروش میں آ کر تم نے مجھے صلواتیں سنانی شروع کر دیں ۔ یہ میں مانتا ہوں کہ تم ایک اچھی تقریر کر سکتی ہو ۔ مگر گوپال پر تمہاری تقریروں کا کوئی اثر نہیں ہوگا ۔ میں نے سوچ سمجھ کر داڑھی بڑھائی ہے ۔ جیسے سوچ سمجھ کر تم نے عشق کیا ہے ۔"

"لیکن گوپال —!"

"کیا ۔" —؟

"کیا پتا جی کو میرے عشق کے بارے میں کچھ علم ہے ؟"

"مجھے اس سے کیا ۔"

"تم تو نہیں بتاؤ گے ؟

مجھے تمہارے عشق سے کیا مطلب ۔ گوما ۔ اگر تمہیں میری داڑھی اور بالوں سے کوئی بیر نہیں تو مجھے تمہارے عشق سے کوئی مطلب نہیں ۔ کوئی تعلق نہیں ۔ کوئی نقصان نہیں ۔ یہ میرا ذاتی معاملہ تھا ۔ اور وہ تمہارا ۔ اب میرا یوگ آسن کا وقت ہو گیا ہے — اگر آپ کی اجازت ہو تو سر نیچے کر کے ٹانگیں اوپر کر لوں ۔ اور اس پرماتما کی یاد میں چند لمحات صرف کر دوں جو مجھے نظر نہیں آ رہا ہے ۔ اور جسے دیکھنے کے لئے میری نگاہیں ترس رہی ہیں ۔

اب ہاں کرنے کے سوائے کوئی چارہ نہیں تھا ۔ گوما کے پاس

"اب یہ بتاؤ عقل مند میں ہوں یا تم ۔"

"تم بھیا ۔ تم ۔ تم جیتے ۔ میں ہاری ۔ لو میں چلی ۔ آپ گاڈ کی تلاش میں مگن ہو جائیے ۔"

" اچھا گڈ ڈے سسٹر "،
یہ کہہ کر گوپال نے سر نیچے اور ٹانگیں اوپر کر لیں۔ اور گوما منہ لٹکا کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

باب ۵

پروفیسر آنند کلاس میں ذرا دیر سے آئے۔ لڑکے اور لڑکیاں شور مچا رہے تھے۔ اور ڈسک پر ہاتھ مار مار کر ایک ہنگامہ برپا کئے ہوئے تھے۔ پروفیسر کے آتے ہی کلاس روم میں سناٹا چھا گیا۔ دیوار پر جو بلیک بورڈ لٹکا ہوا تھا۔ اس پر جیا بہادری اور ایک ایسے ایکٹر کے خدوخال نظر آتے تھے۔ جس کی شکل منوج سے ملتی جلتی تھی۔ اور دونوں کو اس پوز میں دکھایا گیا تھا۔ جیسے وہ ایک دوسرے کا بوسہ لے رہے ہوں۔ پروفیسر نے ایک نگاہ غلط انداز سے چاک سے کھینچی ہوئی تصویروں کو دیکھا تو اس پوز دیکھ کر مسکرانے لگے ______ طلبا نے۔ پھر تالیوں سے سواگت کیا۔ طلبا کا خیال تھا کہ پروفیسر آنند اچھی خاصی جھاڑ سے طلباء کا سواگت کریں گے۔ مگر پروفیسر آنند خاموش رہے۔

ایک لڑکی نے سرگوشیانہ انداز میں دوسرے لڑکے سے کہا "بھلا خود تو گوما سے عشق کر رہے ہیں۔ ہم سے کیا کہیں گے۔"

شہزادہ ہے ہمارا پروفیسر ہمارا۔!

پروفیسر آنند نے اپنے لیکچر کے آغاز میں کہا شیلی نے ضرور اپنی زندگی میں محبت کی ہوگی۔

" اس میں کیا شک ہے پروفیسر صاحب۔ ایک طالب علم نے کہا۔

ہاں میں بھی یہی کہہ رہا ہوں۔ انہیں گیتوں کے پڑھنے میں مزا آتا ہے جو درد سے بھرے ہوتے ہیں۔ شاعری دراصل داخلی واردات کا اظہار ہے۔ اور داخلی وارداتیں خارجی واقعات سے وابستہ ہوتی ہیں، شاعری فنون لطیفہ کی بڑی نازک شاخ ہے، بڑی کومل، بڑی شوخ، چنچل اور پسندیدہ بھی۔ دراصل شاعری انسانی احساسات کا مرقع ہوتی ہے انسان کے بنیادی خیالات احساسات، جذبات کی عکاسی کرتی ہے۔ کبھی کبھی فلسفیانہ انداز میں لوگوں سے مخاطب ہوتی ہے۔ شاعر انسان کی روح ہوتا ہے ضمیر کا پاسبان ہوتا ہے۔ وہ اس طرح قارئین سے مخاطب ہوتا ہے کہ اس کا کہا ہوا شعر دل میں اتر جاتا ہے اور انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ شاعر نے جو بات کہی ہے پڑھنے والے نے یہ محسوس کی ہے اور واقعی وہ قاری کے دل میں اتر گئی ہے۔

" تو کیا شاعری صرف عشق اور محبت تک محدود ہے؟ اس سے آگے نہیں جا سکتی؟ "

کیوں نہیں جا سکتی یہ تو شاعر پر منحصر ہے کہ وہ کس موضوع کا انتخاب کرتا ہے۔ اگر اسے انقلاب پر ایمان ہے تو ہو سکتا ہے۔ کہ اس کی شاعری عوام کی بہتری کے لئے وقف کر دی جائے۔ میں یہاں اس بات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا۔

شاعری میں جذبات نگاری کی جگہ ہے لیکن کرداروں کا خاکہ کھینچنے کے لئے اس کے پاس وقت نہیں، ہاں پراچین زمانے میں رامائن اور مہابھارت لکھی گئیں تھیں۔ یہ دونوں مجموعے ایک شاعری کے بہترین نمونے ہیں۔ ان میں کہانی بھی ہے کردار بھی ہیں اعلیٰ قدریں بھی ہیں اور حسن بھی۔ نصب العین بھی ہے۔ اصولوں اور آدرشوں کا ٹکراؤ ہے۔ بہترین انسان اور کیسے بن سکتا ہے۔ اس کا تذکرہ ہے رامائن کا اثر ہزاروں سالوں سے ہماری تہذیب پر ہے۔ اور کتابوں کا اثر ابھی تک ہندوستانی تہذیب و تمدن پر ہے اور نہ جانے کب تک رہے گا۔ دوسرے ملکوں میں بھی بڑے بڑے ایپک لکھے گئے ہیں۔!

"آج کل رامائن اور مہابھارت کیوں نہیں لکھی جاتی؟"

یہ ایٹمی دور ہے۔ پہلے زندگی آہستہ آہستہ چلتی تھی۔ صدیوں سے لوگ اندھیرے میں غرق رہے۔ پڑھے لکھوں کی تعداد کم تھی، سائنس نے ترقی نہ کی تھی اگر تبدیلیاں ہوئی تھیں تو بڑی دھیرے دھیرے اب ایٹم کی دریافت نے زندگی میں برقی لہر دوڑا دی ہے۔ انسان کے سوجھ بوجھ میں اس کے رکھ رکھاؤ میں اس کی تہذیب میں اس کے بول چال میں انسانی فلاح اور بہبودی اس کی ترقی پرانے اور نئے خیالات کا ٹکراؤ۔ اخلاق کا بدلا ہوا چہرہ۔ نت نئی سائنسی دریافتوں اور ایجادوں نے دنیا کا رنگ روپ بدل دیا ہے۔ ہوائی جہاز کی وجہ سے لوگ ایک ملک سے دوسرے ملک میں بڑی آسانی سے جا سکتے ہیں۔ مذہب کی چھاپ دھیرے دھیرے ڈھیلی پڑتی جا رہی ہے اور ایک نیا انسان جنم لے رہا ہے۔ انسان جس کی ظاہری شکل و صورت تو وہی ہے مگر اس کے احساسات اور جذبات میں ایک بنیادی تبدیلی آئی ہے۔ یہ بدلتا ہوا انسان جس تیزی سے بدل رہا ہے اُسے ادب اور شاعری کی گرفت میں لانا آسان نہیں۔ اسی لئے ساغر کا زمانہ گیا۔ لمحاتی شاعری کا زمانہ ہے، پھر بھی شاعری کا تعلق، ہمیشہ جذبات اور احساسات سے رہیگا۔ انسانیت، محبت اور عشق، انقلاب، بھوک شاعروں کے محبوب موضوع رہیں گے۔

پروفیسر آنند اپنے لیکچر کے دوران اس بات کا احساس کر رہے تھے۔ کہ گوما ٹکٹکی باندھ کر اس کی طرف دیکھ رہی تھی، کبھی کبھی وہ گوما کی طرف دیکھ لیتے اور پھر نظریں بچا کر باقی طلباء کی طرف نظر دوڑاتے۔ پروفیسر آنند کافی محتاط رہتے کہ ان کے عشق کا افسانہ طلباء پر آشکارا نہ ہو جائے۔ اور یہ بات بڑھتے بڑھتے اتنی نہ بڑھ جائے۔ کہ ان کی نوکری خطرے میں پڑ جائے۔ بورڈ پر جو جیا بہادری اور منوج کی تصویریں کھینچی گئیں تھیں ان سے تو یہ ظاہر ہوتا تھا کہ طلباء کو پروفیسر آنند کے عشق کا علم ہے۔ گوما کی صورت جیا بہادری سے ملتی جلتی تھی۔ بہر حال لیکچر ختم ہونے کے بعد پروفیسر کلاس سے باہر نکل آیا۔ پرنسپل کے روم میں گیا۔ تو فون کی گھنٹی بجی۔ پرنسپل نے فون اٹھایا۔ تو انہوں نے فون پروفیسر آنند کو دیا۔

لیجیے! ایک خاتون آپ سے بات کرنا چاہتی ہے۔

"پروفیسر آنند نے ریسور لیتے ہوئے کہا" کون ہے؟"

"جواب ملا۔ مونا۔"

"کیا بات ہے؟"

اگر شام کو فرصت ہو تو میرے مکان پر تشریف لائیے۔ ایک دو ضروری باتیں کرنی ہیں۔ چائے میرے ساتھ لیجیے۔

"او۔ کے مونا"

پروفیسر آنند نے ریسیور رکھ دیا۔

کالج کے پرنسپل جن کی عمر پچاس کے اوپر تھی۔ کافی باذوق اور خوش باش قسم کے انسان تھے۔

"کہنے لگے۔ آنند تم خوش قسمت آدمی ہو۔"

"کیوں سر" ——— ؟

"ارے بھئی کالج میں بھی لڑکیوں کے لئے شمع بنے ہو اور وہ پروانوں کی طرح تمہارے گرد گھومتی ہیں۔ اور اب جس کا فون آیا تھا وہ بھی کوئی محترمہ معلوم ہوتی ہیں۔"

"میری پرانی شاگردہ ہے۔ چائے کے لئے بلوایا ہے"

"ہمیں بھی لے چلو۔"

"چلئے نا۔"

ابھی ہم کیا کریں گے جا کر۔ مفت میں کباب میں ہڈی بنیں گے۔ خیر یہ بتلایئے کہ آج کل ہمارے کالج کے طالب علم ضرورت سے زیادہ بے باک اور نڈر ہوتے جا رہے ہیں اس کی کوئی روک تھام ہونی چاہیئے۔ میرا کہنے کا مطلب ہے کہ طلبار بھی روش اختیار کر رہے ہیں جو ہمارے لئے ..... آگے جا کر مضر ثابت ہوگی۔ اور ان کے لئے بھی۔

"ذرا وضاحت کیجئے گا۔"

"سب سے پہلے ان کے لباس دیکھئے۔ اتنی بھونڈی اور بدمذاقی کی حد تک پہنچ رہا ہے مثلاً پنٹ کی موری اتنی تنگ ہوتی جا رہی ہے کہ اس میں ٹانگیں صاف نظر آنے لگتی ہیں۔ لڑکیوں نے بیل باٹم اور تنگ جین پہننی شروع کر دی ہے۔ کئی لڑکیاں تو پنٹ اور قمیض پہن کر آتی ہیں۔ بالوں کے فیشن دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ لفظ رکھ رکھاؤ کا کوئی مطلب ہی نہیں رہا۔ بات چیت میں تو ایسی تڑاک پھڑاک۔ بزرگوں کے سامنے شرم و حیا نام کو نہیں اور میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ آج کل کے نوجوان کھلے عام گانجا۔ چرس اور L.S.D اور دیگر منشیات کا استعمال کر رہے ہیں۔ بال اور داڑھی کو بڑھا کر انہوں نے حلیہ بگاڑ لیا ہے۔ آپ ہی بتایئے۔ اگر حالت یہی رہی تو اس نسل کا کیا ہوگا؟

گھبرایئے نہیں پرنسپل صاحب، نئی نسل نے ہمیشہ بزرگوں کے خلاف بغاوت کا پرچم بلند کیا ہے۔ انہیں پرانی قدریں اچھی نہیں لگتی اور طلبار کی چند مانگیں درست بھی ہیں یعنی ہمارا تعلیمی ڈھانچہ پرانا اور فرسودہ ہو چکا ہے اس میں اہم تبدیلیاں کرنی پڑیں گی۔ سوائے اس کے کہ ہم جاہل گریجویٹوں کی ایک فصل تیار کر کے بازار میں بھیج دیتے ہیں تاکہ انہیں تول کر خرید لیں۔ اور ہماری درسگاہوں نے کیا کیا ہے۔ جہاں تک ہمارے معاشرے کا تعلق ہے وہ اتنا پرانا اور فرسودہ ہو چکا ہے کہ نئی قدریں اس میں فٹ نہیں ہوتیں اس لئے طلبار سٹرائیک کرتے ہیں۔ اس تعلیمی ڈھانچے میں تبدیلیاں آنی چاہیئے۔"

"یعنی آپ بھی ان طلبار کے ساتھ ہیں۔"

"ساتھ کی بات نہیں۔ پرنسپل صاحب ہمیں وقت کا ساتھ دینا ہی پڑے گا۔ میں چاہتا ہوں ایک دن تمام پروفیسروں کو بلا کر ایک میٹنگ کی جائے اور ان مسئلوں پہ بحث کی جائے تاکہ ہم ان غلطیوں کا تدارک کر سکیں۔"

"مجھے تو کوئی اعتراض نہیں۔ اچھا اجازت چاہوں گا۔"

باب ۶

شام کو پروفیسر آنند کی گاڑی شواجی پارک کی طرف مڑی۔ سات بج چکے تھے۔ نومبر کا مہینہ تھا۔ ہوا میں تھوڑی سی خنکی تھی۔ سڑکوں اور گلیوں کے قمقمے روشن تھے۔ بمبئی کے ٹریفک میں دن بدن اضافہ ہو رہا تھا۔ آنند۔ مونا سے مل کر کبھی خوش نہ ہوا تھا۔ لیکن مونا کی دعوت کو ٹھکرا نہ سکتا تھا۔ مونا کافی عرصہ ہو گیا اس کے کالج میں پڑھتی تھی۔ آنند اسے پڑھاتا تھا۔ کالج کی پڑھائی سے فارغ ہو کر مونا ایک اسکول میں استانی ہو گئی۔ کالج کے زمانے میں مونا نے اس کے قریب آنے کی کوشش کی تھی۔ وہ دبلی پتلی سی لڑکی جس کا دھڑ نہایت بدصورت تھا۔ لمبوترا چہرہ۔ ناک لمبی سی۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں چھوٹا سا ماتھا اور چہرے پر نہ شگفتگی تھی نہ رونق۔ اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ہمیشہ کھنچی کھنچی سی رہتی ہے۔ دل اور دماغ پر ایک بوجھ سا ہے جس کا وہ اظہار نہیں کر سکتی۔

کالج میں لڑکیاں شوخ اور چنچل ہوتی ہیں۔ ایک دوسرے کو چھیڑتی ہی رہتی ہیں، کھیلتی ہیں۔ مذاق اڑاتی ہیں۔ مگر مونا نے تو سنجیدگی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا۔ اس کے چہرے سے اداسی اور حسرت کے سوا اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ یہ دن تو کھیلنے اور کودنے کے ہوتے ہیں ہنسنے اور ہنسانے کے ہوتے ہیں اور بمبئی تو اتنا خوبصورت شہر ہے کہ انسان کا گھر میں بیٹھنے کو جی نہیں چاہتا ہے قدرت کے نظاروں سے کیوں نہ لطف اندوز ہوا جائے۔ سمندر کا کنارا۔ ناریل کے درخت، غروب آفتاب، پھیلا ہوا سمندر، جوہو کی چہلیں۔ اگر کچھ نظر نہ آئے تو خدا کی مخلوق دیکھتے رہیئے۔ تو جی خوش رہے گا۔ شاید مونا کی زندگی میں مسرت نام کو نہ تھی۔ اداسی نے اسے چاروں طرف گھیر لیا تھا۔ کالج کے دنوں میں مونا نے اس طرح behave کیا جیسے وہ آنند سے عشق کر رہی ہے۔ یا کرنا چاہتی ہے گو مونا نے اس عشق کا اظہار لفظوں میں کبھی نہ کیا تھا۔ مگر اس کی بات چیت چور نگاہیں جو کبھی قریب آ کر اور پھر دور جا کر، کبھی مڑ کر، کبھی جھانک کر آنند کی طرف دیکھتیں تو آنند کو معلوم ہو جاتا۔ کہ اس لڑکی کے دل میں آنند کے لئے محبت کا جذبہ بھڑک رہا ہے۔ انہیں دنوں مونا نے پروفیسر آنند کے گھر آنا جانا شروع کیا کبھی کوئی کتاب مانگ کر لے جاتی۔ کبھی واپس کرنے آتی۔ اس دوران میں مونا نے شانتی کے قریب آنے کی کوشش کی کھانا پکانے میں مدد کرتی۔ شام کو آتی چائے بناتی۔ میز پر رکھتی۔ کیتلی سے چائے ڈالتی اور تینوں چائے پیتے۔ شانتی نے ہمیشہ مونا کی تعریف کی۔ کہ مونا بڑی اچھی لڑکی ہے۔ ایک دو سال تک مونا لگاتار پروفیسر آنند کے گھر آتی رہی تو پھر اچانک مونا کا آنا جانا بند ہو گیا۔ ایک بار پروفیسر آنند نے شانتی سے پوچھا۔

"کہ مونا اب نہیں آتی۔"

"کیا کریں گی آ کر۔" ؟

"کیوں ؟"

"بچاری اتنے چکر کاٹ چکی ہے۔ مگر تم نے اسے گھاس نہیں ڈالی۔"

"تم کیا کہہ رہی ہو ؟"

"وہ تم سے محبت کرتی ہے۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"بیویوں کو بہت جلدی معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ کون سی لڑکی ان کے خاوند میں دلچسپی رکھتی ہے۔"

"کیا کبھی کچھ کہا مونا نے؟"

"ہاں۔"

"کیا؟"

"یہی کہ دیدی تم بے حد خوش قسمت ہو کہ تمہیں اتنا اچھا خاوند ملا۔ میری زندگی کی یہی آرزو ہے۔ کہ مجھے بھی اسی قسم کا خاوند ملے۔ مجھے بے چاری پر بڑا ترس آتا ہے۔ اب تمہیں کیا بتاؤں، اس نے پنجابی کھانا پکانا۔ مجھ سے سیکھا۔ کئی بار تو وہ مجھ سے پوچھتی رہی کہ آنند صاحب کونسی چیزیں زیادہ پسند کرتے ہیں۔ کون سی سبزیاں انہیں زیادہ پسند ہیں۔ کیا وہ آپ کو جھڑکتے ہیں۔ میری اور تمہاری ملاقات کہاں ہوئی تھی۔ سہاگ رات کیسے گذری تھی۔"

"ارے بات یہاں تک پہنچ گئی تھی — تم نے مجھ سے بتایا نہیں؟"

"میں کیا بتاتی۔ مجھے معلوم تھا کہ تمہیں اس لڑکی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ بچاری نے ابھی تک شادی نہیں کی۔"

"ہاں تو۔"

یہ عشق جو یکطرفہ تھا۔ اس نے پروفیسر آنند کے انا کو تقویت پہونچائی تھی۔ اس لئے جب کبھی مونا کا فون آتا تو آنند مونا کے گھر ضرور جاتا۔ اور مونا کے گھر جا کے خوشی کا احساس ہوتا۔

یہ لڑکی جو اب عورت بن چکی تھی۔ جس نے اپنے شباب کا سارا حصہ، آنند کے انتظار کی نذر کر دیا۔ تھا۔ اور اب تک اس آس میں بیٹھی تھی۔ کہ شاید کبھی وہ دن آئے گا۔ جب آنند اظہار عشق کرے گا۔ لیکن ابھی تک وہ دن نہ آیا تھا۔ مونا نے اس عشق کے مخمصے میں پھنس کر اپنا حلیہ بگاڑ لیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جہاں تک اس کے چہرے کے نقوش کا تعلق تھا۔ اس میں کوئی رعنائی نہ تھی پھر بھی لڑکیاں بننے سنورنے کی کوشش کرتی ہیں۔ آج کل بدصورت سے بدصورت لڑکیاں بھی شوخ لباس پہن کر جاذب نظر بن جاتیں ہیں۔ شوخ اور تنگ کپڑے پہن کر اپنے جسموں کی نمائش کرتی ہیں۔ مگر مونا نے تو اپنے جسم کے خوبصورت حصوں کو بے رنگ و بو کر دیا تھا۔ بھلا کولہوں رانوں اور پنڈلیوں کو ہی متناسب رکھتی — تو کیا برائی تھی۔ اور پلاسٹک سرجری کی مدد سے کسی سرجن سے یہی ناک سیدھا کروا لیتی۔ اور اس کے علاوہ ماتھے کو چوڑا کرنے کے کتنے طریقے ہیں۔ یعنی ماتھے پر زیادہ بال کٹوا کر ماتھے کو فراخ کیا جا سکتا ہے۔ اور اس کے علاوہ مصنوعی بھنویں اور سیاہ بالوں کو ڈھنگ سے باندھ کر وہ ایک کافر حسینہ بن سکتی تھی۔ نہ جانے اس نے کیوں بدصورتی کا جامہ اوڑھ لیا ہے۔ اور ایک ہی شخص کی محبت میں گھل کر۔ دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ بھلا پروفیسر آنند نہ ملتے تھے تو اس دنیا میں کئی اور لوگ ہیں جو مونا کو قبول کر لیتے۔ اور مونا ایک اچھی زندگی گذار سکتی تھی۔ مونا کو کون سمجھائے کہ تو نے کیا کیا۔ کیوں ایسی محبت کا آغاز کیا۔ جس کے اختتام کا اسے علم تھا۔ یہ آہستہ آہستہ جلنا۔ اپنے آپ کو جلانا خود کشی کے مترادف تھا۔ بھلا کوئی کیا کر سکتا تھا۔ جب پروفیسر آنند نے گاڑی مونا کے فلیٹ کے نیچے کھڑی کی۔ تو اس نے دیکھا کہ مونا بڑی بے صبری سے پروفیسر آنند کا انتظار کر رہی تھی۔ یہ کیسا انتظار تھا۔ جو اتنے برسوں سے کیا جا رہا تھا۔ یہ کیسی شام تھی جس کی کوئی صبح نہ تھی۔ یہ کیسا غم تھا جس کا کوئی مداوا نہ تھا۔ یہ کیسا پیار تھا جس کا کوئی انت نہ تھا۔

پروفیسر آنند سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اسے تھکن محسوس ہوئی۔ تیسرے فلور پر مونا کا فلیٹ تھا۔ جب آنند دروازے کے قریب پہونچا۔ تو گھنٹی بجانے کی زحمت نہ کرنی پڑی۔ مونا دروازے کے قریب کھڑی تھی۔ داخل ہوتے ہی آنند نے اس فلیٹ میں خوشگوار تبدیلی دیکھی۔ فلیٹ کی دیواروں پر ہلکا آسمانی رنگ کیا ہوا تھا۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر پردے لگے ہوئے تھے۔ جن کا رنگ بھی آسمانی تھا۔ سامنے کی دیوار پر مونالیزا کی تصویر کی کاپی تھی اور دوسری دیوار پر دوسری کاپی تھی یعنی آخر نیر گل کی پینٹنگ لٹک رہی تھی۔ اس فلیٹ کے سامنے کا دروازہ سمندر کی جانب کھلتا تھا۔ اور فلیٹ کے آگے سمندر تھا۔ بالکونی میں کھڑے ہو کر نگاہ سامنے والے جزیرے پر جاتی تھی۔ جہاں چھوٹے چھوٹے قمقموں سے روشنی چھن چھن کر آرہی تھی۔ فرش پر ایک نفیس قالین بچھا ہوا تھا۔ بائیں دیوار کے ساتھ ایک نیا پلنگ، جس کے قریب ایک نیا سٹینڈ استادہ تھا جس کے اوپر آسمانی رنگ کا شیشے کا ایک گولہ لٹک رہا تھا اور اس میں ایک بلب جل رہا تھا۔ ایک ریشمی صوفہ سیٹ اور اس کے سامنے ایک تپائی سنگ مرمر کی تراشی گئی تھی آنکھوں کو بھلی لگ رہی تھی۔

اور ہاں جب پروفیسر آنند نے مونا پر نظر دوڑائی تو مونا میں کافی تبدیلیاں نظر آئیں ان تبدیلیوں سے اس کی صورت شکل بہتر نظر نہ آئی۔ بلکہ مونا پہلے بھی زیادہ کمزور دبلی پتلی نظر آئی۔ سینہ سپاٹ ہو گیا تھا۔ چہرہ اور دبلا پتلا۔ آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں رخسار زرد زرد سے تھے۔ ہاں چلنے پھرنے کے انداز میں ایک پھرتی سی تھی اور اس پھرتی کے علاوہ مونا کا لباس کافی بھڑکیلا تھا۔ آج مونا نے ایک چست پتلون پہن رکھی تھی۔ اور ایک کھلی کھلی سی قمیض جس پر ایلورا اور اجنتا کے نقش و نگار تھے۔ بالوں کو بڑی خوبصورتی سے سنوارا گیا تھا اور کمرے سے بھینی بھینی خوشبو آرہی تھی۔

,, کیا پیوگے ،، مونا نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

,, کافی۔ ،،

,, تمہاری پسند ناپسند سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔ میں نے تمہارے آنے سے پہلے کافی الیکٹرک چولہے پر رکھ دی تھی۔

,, نوکرانی کہاں ہے ؟ ،،

,, چھٹی پر۔ ،،

,, اور ماں جی ؟ ،،

,, وہ اس جہاں میں نہیں رہیں۔ ،،

,, تم نے مجھے بتایا نہیں ،،

,, بتانے سے کیا فائدہ۔ ،،

,, ہوا کیا تھا انہیں ؟ ،،

,, عمر کا تقاضہ اور کیا۔ ،،

,, کیا عمر تھی ؟ ،،

,, ۹۰ سال کی تھیں۔ ،،

,, بے حد افسوس ہے۔ مجھے بتایا ہوتا۔ تو میں ضرور آتا۔ ،،

,, ہاں تم آتے ضرور۔ مگر آکر کیا کرتے۔ ،،

,, ذرا تیرا غم غلط ہو جاتا۔ ،،

" میرے غم کی کسے پرواہ ہے۔ ابھی آتی ہوں۔ کہیں کافی جل نہ جائے۔"

پروفیسر آنند نے محسوس کیا آج مونا کے لہجے میں ایک تیکھاپن تھا۔ بڑی کڑوی باتیں کر رہی تھی۔ شاید مونا کی کڑوی باتیں سننے پر مجبور تھا۔ پردے ہواہیں لہرا رہے تھے۔ آنند بالکونی میں گیا۔ سامنے سمندر تھا، سمندر کے کنارے لوگ ٹہل رہے تھے۔ خوانچوں کے گرد چھوٹے بڑے بوڑھے اور بچے جمع تھے اور چاٹ کھا رہے تھے۔ دو چار بچے گھوڑوں پر سوار تھے۔ اور گھوڑے دوڑا رہے تھے۔ بالکونی سے دور جہاں ذرا بھیڑ کم تھی۔ ایک جوڑا بیٹھا ہوا تھا۔ مرد نے لڑکی کی کمر میں ہاتھ ڈالا ہوا تھا۔ اور دونوں کے ہونٹ ایک دوسرے کو چومنے کے لئے بے قرار تھے۔

اتنے میں آواز آئی۔ " کافی "

آنند آیا۔ صوفے پر بیٹھ گیا۔

" لو۔ یہ کافی " مونا نے کافی کی پیالی۔ آنند کو دی۔ کافی کے علاوہ میز پر تین پلیٹیں اور رکھی ہوئی تھیں۔ ایک میں بسکٹ دوسرے پلیٹ میں کاجو، تیسری میں پیسٹری۔

" بھابی کیسی ہے۔"

" بس ٹھیک ہے۔ ذرا بیمار سی رہتی ہے۔ ویسے ٹھیک ہے۔"

" ان کا موڈ۔ "

" بالکل ٹھیک ہے۔ کمبخت بگڑنا جانتی ہی نہیں۔ نہ کوئی شکوہ نہ شکایت۔ تم بھی ہنیں آئی بہت دنوں سے۔"

" ہاں۔ میں نہ آسکی اور تم بھی چھ مہینوں کے بعد آئے ہو۔ اور وہ بھی میرے فون کرنے کے بعد۔"

" بہت مصروف تھا۔"

" کیسی مصروفیت۔ " ؟

" یہی کالج کا کام "!

" میں نے سوچا شاید کوئی اور کام ؟"

" اور کام کیا ہو سکتا ہے۔"

" کیا دنیا میں یہی کام رہ گیا ہے۔ کہ لڑکوں کو پڑھانا ہے۔"

" اگر یہ کام نہ کروں تو کھاؤں گا کہاں سے۔ تم تو امیر باپ کی بیٹی ہو۔"

" ڈیڈی تو کب کے مر گئے۔ ماں زندہ تھی۔ وہ بھی مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔ ہاں جائداد چھوڑ کر مری ہیں یعنی میری ساری زندگی کے لئے اتنا روپیہ چھوڑ کر مری ہیں۔ کہ میں کسی کام کاج کے بغیر، ۱۰۰ سال تک زندہ رہ سکتی ہوں اور بے حد عیش و عشرت میں!"

" کیا اتنی لمبی زندگی گزارنے کا ارادہ ہے ؟"

" سوچ رہی ہوں گزار دوں یا نہ گزاروں۔ یوں۔ تمہیں کیا۔"

" میں تمہارا استاد ہوں۔ کیا اتنا بھی نہیں پوچھ سکتا۔"

" پوچھ سکتے ہو مگر محض پوچھ کر کیا ہوگا۔" پھر وہ کمرے میں ٹہلنے لگی۔

عجیب سی بات تھی۔ آنند نے سوچا۔ کمرہ کتنی خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ پردوں سے دلکشی اور دلآویزی نمایاں تھی۔ نرم نرم صوفے۔ رنگین قالین ہلکا ہلکا سا اندھیرا۔ فرحت بخش ہوا۔ تین روم کا فلیٹ۔ کافی کی ہلکی ہلکی سی خوشبو آ رہی تھی

اور برآمدے میں مونا کھڑی تھی۔ اس نے مونا کو کئی بار سر سے پیر تک دیکھا۔ عجیب عورت تھی۔ یہ خوشی جو اس وقت کمرے میں بیٹھ کر ہو رہی تھی اور ان نئی چیزوں کو دیکھ کر ہو رہی تھی اس قسم کی خوشی کبھی اس نے مونا کی صحبت میں بیٹھ کر محسوس نہیں کی تھی۔ یہ کس قسم کی عورت تھی۔ اس میں کس بات کی کمی تھی۔ اسے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اسے برف خانے میں بٹھا دیا ہو۔ یا کسی ایسے ایرکنڈیشنڈ کمرے میں جو ضرورت سے زیادہ ٹھنڈا ہو۔ اور آدمی کا جی چاہے کہ اس ایرکنڈیشنڈ کمرے سے فوراً باہر نکل جائے۔ مونا تو کس جگہ میں پھنسی ہوئی ہے تو دنیا چھوڑ دے۔ تو کسی آشرم میں چلی جا۔ تو بھگتی کر۔ تو پرماتما کی یاد میں اپنی زندگی گزار دے۔ تو تو ایک سنیاسن لگتی ہے۔ تو تو ودھوا لگتی ہے۔ تجھ پر رحم آتا ہے۔ ترس کھانے کو جی چاہتا ہے۔ تمہیں اپنی آغوش میں لینے کو جی نہیں چاہتا۔ چومنے کو جی نہیں چاہتا۔ RAPE کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ باقی عورتوں میں کون سی مقناطیسی قوت ہوتی ہے انہیں دیکھتے ہی تن بدن میں آگ سی لگ جاتی ہے۔ سارا جسم کانپنے لگتا ہے اور گلے کے نیچے لعاب سا ڈھلنے لگتا ہے اور کان کی لویں جلنے لگتی ہیں۔

مونا بالکونی سے واپس آئی۔

"تم سے ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں ؟"

"پوچھو۔"

"سچ سچ بتاؤ گے۔ ؟"

"کوشش کروں گا۔ یوں آج کل جھوٹ اور سچ میں زیادہ فرق نہیں رہا۔ بلکہ زندگی میں انسان جتنا جھوٹ بولے گا۔ اتنا ہی کامیاب ہوگا۔"

"میں نے سنا ہے کہ تم عشق کر رہے ہو" مونا نے بڑے افسردہ لہجے میں یہ الفاظ ادا کئے۔

"کس سے ؟"

"ایک لڑکی سے"

"کیسی لڑکی ؟"

"تمہارے کالج میں پڑھتی ہے۔"

"یہ جھوٹ ہے۔"

"اگر سچ ہوئی تو ؟"

"مگر میں تمہیں بتا رہا ہوں۔ کہ یہ جھوٹ ہے۔ اور اگر یہ سچ بھی ہے تو تمہیں کیا۔"

"ہاں یہ بات تم نے ٹھیک کہی۔"

"میں یہ بات اس لئے کہہ رہی ہوں۔ کہ تمہارے لئے یہ اچھا نہیں۔ کہ تم کسی دوسری لڑکی سے عشق کرو۔"

"کیوں ؟"

"اس لئے کہ تم شادی شدہ ہو۔ اور کالج میں ایک پروفیسر۔ کیا استادوں کو یہ بات زیب دیتی ہے۔ کہ انہی لڑکیوں سے عشق کریں۔ جنہیں وہ پڑھاتے ہیں۔" ـــ ؟

"اس میں کیا قباحت ہے ؟"

"تم معاملہ کی تہہ میں نہیں پہنچ سکے۔ سطحی انداز سے میری باتوں کا جواب دے رہے ہو۔ میں تمہاری بھلائی کے لئے کہہ رہی ہوں اگر یہ بات بڑھ گئی۔ تو شاید تمہیں نوکری سے ہاتھ دھونے پڑیں۔"

"تو آپ میری بہتری اور ساتھ ہی میرے مستقبل کے لئے فکر مند ہیں۔"

"جی ہاں۔"

"شکریہ اس ذرہ نوازی کا۔ عمر میں آپ مجھ سے بڑی ہیں یا میں؟"

"عمر میں تم بڑے ہو۔ اور عقل میں بھی۔ پھر بھی جب عقل پر پردے پڑنے لگیں تو اس وقت ان لوگوں کا فرض ہوتا ہے جو تمہارے قریب ہیں جو تمہیں درست مشورہ دیں۔"

"کیا اسی کام کے لئے بلایا تھا تم نے؟"

"ملنے کی آرزو تھی اس لئے بلا لیا۔ اور یہ بات بھی کہنا چاہتی تھی جو میں نے سنی تھی۔"

"جو بات تم نے سنی ہے وہ بالکل جھوٹ ہے۔"

"یہ بات جھوٹ نہیں ہو سکتی۔ سارے کالج میں آپ کی محبت کے چرچے ہیں۔"

"یہ افواہیں ہیں ان پر یقین نہ کرو مونا۔"

مونا اس کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا۔ کہ وہ ایک ذہنی کرب میں مبتلا ہے۔ ایک ایسا کرب جو انسان کو جنونی اور خبطی بنا دیتا ہے۔ اس کے چہرے کے نقوش مسخ سے ہو گئے تھے۔ ایک قسم کا غصہ اور کرختگی و یاسیت کے آثار نمایاں تھے۔ اس کرختگی اور غصے کی تہہ میں جلن اور انتقام کا جذبہ کار فرما تھا شاید اس نے زندگی میں سوچا ہو گا۔ کہ وہ ایک نہ ایک دن پروفیسر آنند کو پالے گی۔ اور جب زندگی آہستہ آہستہ گذرنے لگتی ہے اور عورت کو اس بات کا اندازہ ہونے لگتا ہے کہ بہار تو گزر گئی خزاں کی آمد آمد ہے تو محبت رفاقت اور پیار کی جگہ غصہ، جلن، حسد اور انتقام لے لیتا ہے شاید مونا اسی ذہنی کرب میں مبتلا تھی۔ اور یہ ذہنی کرب بڑا جان لیوا ہوتا ہے۔

"جب تم انکار کر رہے ہو تو میرا اصرار کرنا کہ تم واقعی کسی لڑکی سے محبت کر رہے ہو۔ بیوقوفی ہے۔"

"اس میں کیا شک ہے۔"

"خفا ہو گئے پروفیسر!"

"خفا تو نہیں ہوا۔ مگر مجھے اذیت ضرور پہنچی۔ اور اس کے جواب میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ تم شادی کر لو۔ تاکہ تم ایک نارمل زندگی بسر کر سکو گی۔"

"کیا میں ABNARMAL زندگی گزار رہی ہوں۔ میرے پاس سب کچھ ہے۔"

"تمہارے پاس کچھ بھی نہیں"

"گھر بار۔ نوکر چاکر۔ روپیہ۔"

"خوشی کہاں ہے؟"

"تو کیا میں خوش نہیں ہوں؟"

"شاید تم نے اپنا چہرہ آئینے میں نہیں دیکھا۔ دیکھا ہوتا۔ تو اس قسم کی گفتگو نہ کرتی۔ میں تمہیں پندرہ سال سے دیکھ رہا ہوں اور اس وقت محسوس کر رہا ہوں۔ کہ تم نے معصومیت کھو دی ہے۔ تم نے جوانی کے بہترین دن کسی کی یاد میں گزار دیئے۔ تم نے اپنی زندگی سے جوا کھیلا تھا اور ابھی تک کھیل رہی ہو۔ اور اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ کسی کو نہیں معلوم"

مونا بولی

"مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔ کہ میں نے کس سے محبت کی اور کیوں کی۔ اور کیا کوئی انسان کسی سے پوچھ کر محبت کرتا ہے، کیا محبت چند برسوں کی ہوتی ہے۔ یا عمر بھر کی کیا محبت سندرتا کی وجہ سے کی جاتی ہے۔ کیا محبت کا مطلب بچہ پیدا کرنا ہے۔ کیا محبت کا مطلب یہ ہے کہ اس کی شادی اسی سے ہو۔ جس سے محبت ہوتی ہے۔ تم نے محبت کو ہمیشہ سطحی انداز میں سوچا ہے۔ آنند کبھی اس پرابلم پر گہری نظر نہیں ڈالی۔ محبت کی گہرائیوں میں ڈوبے نہیں۔ کسی کے لئے مرے نہیں۔ شاید تم نے کسی سے محبت نہیں کی۔ اس لئے تم میری محبت کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ کسی کو چاہنا یا نہ چاہنا ایک فروعی سی بات ہے۔ ذہن میں کسی کی تصویر بنتی ہے۔ دل کے صفحے پر کسی کی تصویر کی پرچھائیں پڑتی ہیں اور آہستہ آہستہ وہ پرچھائیں۔ ایک پرکشش پیکر کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ آدمی کوشش کرتا ہے کہ وہ خوب صورت پیکر اس کا پیچھا چھوڑ دے یا وہ اس سے پیچھا چھڑائے۔ وہ کون سا منحوس دن تھا جب میں نے پہلی بار تمہیں دیکھا۔ اور تمہاری پرچھائیاں میرے ذہن اور دل پر پڑیں کہ آج تک میں اسی محبت کے جہنم میں جل رہی ہوں یہ جانتے ہوئے کہ تم میرے نہیں ہو سکتے۔ کبھی نہیں ہو سکتے۔ شاید تم کسی کے نہیں ہو سکتے۔ شاید اپنی بیوی کے بھی نہیں ہو سکے۔ بڑے خود غرض قسم کے انسان ہو۔ اگر تم محبت کرتے ہو تو صرف اپنے آپ سے۔ اپنی صورت سے اپنی آواز سے اپنے قد سے۔ تم کسی کی پرواہ نہیں کرتے۔ تمہاری بیوی بیمار رہتی ہے۔ وہ تمہیں کتنا چاہتی ہے۔ مگر تم اس کے بھی نہ ہوئے۔ میں تو کبھی ہی ابھاگن خوشیوں نے میرا کبھی ساتھ نہ دیا۔ ہمیشہ اداسیوں اور غموں نے میرا ساتھ دیا۔ یاس میری آغوش میں پلتی رہی۔ میں نے کئی بار امیدوں کے چراغ روشن کئے۔ مگر آندھی اور طوفان کے آگے ان چراغوں کی کیا اوقات ہے۔ میں چراغ جلاتی رہی اور آندھیاں اور طوفان انہیں بجھاتے رہے۔ آج دل کی بھڑاس نکالنے کو جی چاہتا ہے۔ جب انسان کے پاس کچھ نہیں رہتا۔ تو وہ اپنوں سے لڑتا ہے اور پھر جب اپنے بیگانے ہو جاتے ہیں تو پھر وہ صرف اپنے آپ سے لڑتا ہے۔ یہ زندگی کی آخری سیما ہوتی ہے۔ آنند اس کے بعد موت کا دہانہ۔ اب میرے پاس رونے دھونے اور جلانے کے سوا کچھ نہیں رہ گیا ہے میں نے تہذیب و تمدن کے سارے مرمریں لباس اتار دیئے ہیں اور تیرے سامنے محبت کا کشکول لئے کھڑی ہوں اور پیار کی بھیک مانگ رہی ہوں۔ خدا کے لئے ان میں محبت اور پیار کے چند لمحات ڈال دو۔ شاید انہیں کے سہارے میری باقی زندگی گذر سکے۔ میں نے دل کی گہرائیوں میں ڈوب کر اس بات کا پتہ لگایا ہے۔ کہ کیا کوئی اور شخص تیری جگہ لے سکتا ہے۔ مگر اس نامراد اور بے حیا دل سے کیا کہوں کہ اس دل سے تیری ہی صدا آتی ہے۔ جب کبھی کسی غیر مرد کو اس نظر سے دیکھتی ہوں کہ وہ تیری جگہ لے لے تو میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا ہے۔ دل میں درد سا ہونے لگتا ہے۔ سانس گھٹنے لگتی ہے یوں محسوس کرنے لگتی ہوں کہ بس اب مر جاؤں گی۔ دل کا دھڑکنا بند ہو جائے گا۔ کیا کروں تمہیں کیسے بتاؤں کہ میں کیسے جی رہی ہوں۔ کیسے سانس لے رہی ہوں۔ دن بدن وزن گھٹتا جا رہا ہے دل سے خوشی کا اظہار جاتا رہا۔ پہلے تم کتنی بار آتے تھے۔ ایک آس تھی۔ اب تو وہ بھی ٹوٹ گئی۔ چھ مہینے بعد آئے ہو اور وہ بھی میرے بلانے پر۔ اب کب آؤ گے۔ کیوں آؤ گے۔ کیسے آؤ گے۔ میری کون پرواہ کرتا ہے۔ میری محبت کی قدر کون کرتا ہے۔ میں محبت کے شمشان گھاٹ پر تنہا جل رہی ہوں۔ چاروں طرف سے کالی سیاہ راتوں نے پنجے گاڑ دیئے ہیں۔ اور اندھیرے کے دیو ہیکل ستونوں نے مجھے گھیر لیا ہے۔ بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں۔ اپنی ناکام تمناؤں کے قلعے میں گھر گئی ہوں۔ ہاں مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ مجھے اکیلی جلنا ہے۔ میرے مرگھٹ پر کوئی نہیں آئے گا۔ اس جلتی ہوئی لاش پر کوئی پانی نہیں ڈالے گا۔ میں اسی طرح عمر بھر جلتی رہوں گی۔ اور جل جل کر راکھ ہو جاؤں گی۔ حسرت تو اس بات کی رہی۔ آنند کہ زندگی میں تم مجھے سہارا نہ دے سکے۔ مجھے اپنے پاس نہ رکھ سکے۔ کیا مرنے کے بعد میری راکھ اپنے پاس رکھو گے۔"

"بے حد جذباتی باتیں کہہ رہی ہو۔"

مونا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور غموں و اداسیوں کے بوجھ سے گر پڑی۔ اور دیر تک روتی رہی۔

آنند بھی کیا کرتا۔ مونا کو کیسے سمجھاتا کہ یکطرفہ محبت کا انجام بڑا ہی حسرت ناک ہوتا ہے۔ بھلا انسان اس قسم کی محبت کیوں کرے کیوں کسی کے لئے اپنا جیون تباہ کرے۔ کیوں کسی کی تصویر کو یوں کلیجے سے لگائے۔ کہ کلیجہ تو پھٹنے لگے مگر تصویر جوں کی توں رہے۔ کیوں اس قسم کا روگ پالے۔ کیوں غم اور اداسیوں کو اپنے سینے میں جنم دے۔ کیوں اتنا دکھ اٹھائے۔ کیوں اپنی زندگی کو برباد کردے۔ مونا یہ کیوں نہیں سوچتی کہ میرے سوا دنیا میں اور لوگ بھی ہیں کسی اور کو انتخاب کرلو۔ اپنی پسند کے دائرے وسیع کرو۔ اس کو اتنا محدود نہ کرلو کہ اس میں صرف ایک فرد ہی سما سکے۔ یہ کیسی خود غرض محبت ہے کہ وہ کسی دوسرے سے محبت نہیں کرنے دیتی بلکہ انسان کو ایسے بھنور میں پھنسا دیتی کہ اس بھنور سے نکلنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے، ذرا سوچو تو سہی، باہر نظر دوڑاؤ، آسمان پر ستارے چمک رہے ہیں سمندر کی لہریں ساحل سے ٹکرا رہی ہیں۔ بجلی کے قمقمے ستاروں کی طرح مسکرا رہے ہیں۔ ہوا تیز اور تند ہے۔ لوگ آجا رہے ہیں۔ لڑکے لڑکیاں ہنس رہے ہیں۔ باہوں میں باہیں ڈالے گزر رہے ہیں۔ یہ زندگی کا ہنگامہ تیرے مرنے سے ختم نہیں ہوگا۔ پھر اپنے آپ کو ختم کرنے سے فائدہ۔ کون سنتا ہے کسی کی آواز۔ کبھی ایک ذرہ پوری کائنات بن جاتا ہے۔ اور کبھی کائنات ذرہ بن جاتی ہے۔ جو من چاہتا ہے اور جو کچھ انسان کو خود معلوم ہے۔ دوسرے کو معلوم نہیں۔ راحت کس کو ملتی ہے۔ غم اور خوشی میں کیا فرق ہے۔ خوشی کسے کہتے ہیں۔ اور غم کیا ہے۔؟ موت کی طرف یہ قدم کیوں اٹھتے ہیں۔ زندگی کی طرف یہ قدم کیوں نہیں بڑھتے۔ اس کا تجزیہ انسان کیسے کر سکتا ہے۔ دل کے نہاں خانے میں کیا ہے۔ اس کے اندر کیسے جھانکے۔ سہارا دینے سے کیا ہوگا۔ بہتر زندگی گذارنے کا نسخہ کس کے پاس ہے۔ وہ کون سے الفاظ ہیں جن کے کہنے سے مونا یہ سمجھ لے کہ جس راستے کو وہ اپنا چکی ہے وہ راستہ موت کی طرف جاتا ہے۔

مونا دیر تک روتی رہی۔ وہ کافی دیر تک مونا کی سسکیاں سنتا رہا۔ اور پھر اس ڈاکٹر کی طرح مریض سے جدا ہوا جیسے اس مرض کا کوئی علاج نہ ہو۔ اس بات کا اسے یقین ہو گیا ہو۔ کہ اسے اسی حال میں رہنے دو۔ شاید جینے کی کوئی راہ خود بخود نکل آئے۔

پروفیسر آنند چپکے سے اٹھا اور کمرے سے باہر نکل کر سیڑھیاں اتر گیا۔ دور تک سسکیاں اس کا تعاقب کرتی رہیں۔

(نامکمل)

ڈاکٹر قمر رئیس

اچھوتا فن کار

سچ پوچھیے تو بعض حیثیتوں سے میں کرشن چندر کے مقابلے میں مہندر ناتھ کے فن کا گرویدہ رہا ہوں۔ کرشن چندر کا آرٹ ایک نہایت عشوہ طراز صاعقہ بدن نازنین کی طرح احساس وحواس پر حملہ کرتا ہے۔ مہندر ناتھ کا آرٹ ایک میلی کچیلی لیکن جفاکش اور توانا مزدور لڑکی کے حسن سادہ کی طرح دھیرے دھیرے دل میں نشتر کی طرح اترتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ اردو کے جن ادیبوں نے پریم چند کی روایت کو وسعت دی، سماجی حقیقت نگاری کے امکانات کو روشن کیا اور افسانوی ادب کو بدلتی ہوئی حقیقتوں اور قدروں کا ترجمان بنایا اُن میں مہندر ناتھ کا نام یادگار رہے گا۔ وہ ساری زندگی بڑی خاموشی لیکن انہماک اور لگن کے ساتھ اپنے تخلیقی کام میں محو رہے۔ طبقاتی جبر، سماجی بے انصافیوں اور محنت کش انسانوں کی کرب زدہ محرومیوں اور دکھوں سے ایک پل کے لیے بھی ان کی نظر نہیں ہٹی۔ ان کی روح ہمیشہ انسان کے غموں سے بوجھل رہی۔ دکھی انسانوں کی زندگی اور ترقی پسند نظریۂ ادب سے ایسی وفاداری اردو کے کم ادیبوں کا نصیب رہی ہے۔ ان کے فن کا ایک مخصوص اور منفرد اسلوب رہا ہے۔ وہ زندگی اور تہذیب کی پیچیدہ حقیقتوں کو بھی، پریم چند کی طرح نہایت سادگی سے بیان کر دینے کی قدرت رکھتے تھے۔ ان کے کردار اس بے خواب زندگی کا زہر پینے کے باوجود انسانیت کے بلند آدرشوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ سطریں لکھتے ہوئے مجھے مرحوم کے کئی ناول اور افسانے یاد آ رہے ہیں — آدمی اور سکے۔ رات اندھیری ہے۔ سورج، ریت اور گناہ۔ درد کا رشتہ۔ ان کی کتابوں کے یہ نام بھی آج کی زندگی کے المناک تضادات کے احساس وشعور کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ "درد کا رشتہ" میں کلمیش اور ہرسکو کے کردار بنی نوع انسان کی ابدی محبت اور ایثار و اخوت کے جن پاکیزہ جذبات کی زندہ علامت ہیں اس کی جھلک ان کے کم و بیش تمام مثبت کرداروں میں ملتی ہے۔ میرا ایک عجیب تاثر ہے۔ آزادی کے بعد اردو کا شاید ہی کوئی اہم افسانہ نگار ایسا ہو جو کرشن چندر کے فن و اسلوب کے سحر و افسوں سے محفوظ رہا ہو۔ اگر کوئی ایک نام ہے تو وہ مہندر ناتھ — حالانکہ شخصی طور پر مہندر ناتھ سے بڑا کرشن چندر کا کوئی پرستار نہیں رہا، لیکن کرشن چندر اور ان کے فن سے بے پناہ عقیدت کے باوجود مہندر ناتھ نے اپنے تخلیقی عمل میں شاید ہمیشہ اپنی آگہی، اپنے تجربے اور اپنی بصیرت پر ہی بھروسہ کیا۔ اُسی کو مشعلِ راہ بنایا۔ ایسا اعتماد استقلال اور حوصلہ اردو کے کم ادیبوں کو ملا ہے۔

مجھے امید ہے کہ مہندر ناتھ کی شخصیت اور تصانیف کے بارے میں اس یادگار نمبر سے اردو افسانوی ادب میں ان کی خدمات کا اگر تعین نہیں تو اندازہ ضرور ہو سکے گا۔

مہندر ناتھ

سنجیدہ و متین شخصیت

کسی ادیب کو جاننے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ آپ اُس کے دوست ہوں یا ہم پیالہ اور ہم نوالہ۔ کئی بار یوں ہوتا ہے کہ آپ سالہا سال سے ایک ادیب سے ملتے رہتے ہیں مگر اس کے اندرونی کرب سے ناآشنا رہتے ہیں۔ اسے جاننے اور پہچاننے کیلئے ادیب کی کتابوں کا پڑھنا بہت اہم ہے۔ پروفیسر احتشام حسین کا شمار اس زمرے میں ہوتا ہے۔ وہ کم گو، سنجیدہ اور متین قسم کے انسان تھے۔ میں نے انھیں قہقہہ لگاتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔ ہمیشہ مسکراتے ہوئے دیکھا، گپیں ہانکتے ہوئے کبھی نہ سنا، معقول اور سنجیدہ بحث کرتے ہوئے دیکھا۔ دراصل میری اُن سے پہلی ملاقات لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن پر ہوئی۔ سنہ ۱۹۴۲ء میں یعنی تقسیم ملک سے بہت پہلے۔ اس وقت تک میرے صرف پندرہ بیس افسانے اردو کے رسالوں میں شائع ہو چکے تھے۔ مکتبہ اردو لاہور کے مالک میرے افسانوں کا مجموعہ چھاپنے کے لئے مصر تھے۔ اور میں یہ چاہتا تھا کہ کسی نامور نقاد سے اپنی کتاب کا دیباچہ لکھواؤں۔ احتشام صاحب کو دیکھتے ہی میں نے فیصلہ کر لیا کہ دیباچہ انھیں سے لکھواؤں گا۔

احتشام صاحب کا قد لمبا تھا، رنگ گندمی اور چہرے پر کافی داغ تھے۔ جسم دبلا نہ تھا۔ آنکھوں میں غور و فکر کی چمک تھی، عمر زیادہ نہ تھی، مگر جوانی کے ایام میں بھی وہ بوڑھے نظر آتے تھے۔ ماتھے اور گالوں پر جو سلوٹیں تھیں، اُن سے ظاہر ہوتا تھا کہ احتشام صاحب نے اس چھوٹی سی عمر میں زیادہ سوچا ہے، صرف اپنے لئے نہیں سوچا۔ دوسروں کے لئے بھی سوچتے ہیں۔ سوچنا ایک مشکل کام ہے۔ بہت ہی مشکل کام، خاص کر دوسروں کے لئے اور وہ بھی ان کی بہتری اور بہبودی کے لئے۔

احتشام صاحب نے کہانیاں لکھیں، نظمیں اور غزلیں بھی اور ایک دو سفرنامے بھی۔ مگر شہرت ملی تو تنقیدی مضامین کی وجہ سے۔ وہ تنقید کے میدان میں شہ سوار تھے۔ اس میدان میں ایسے نقش پا بنا گئے جو دوسروں کے لئے حرف آخر بن گئے۔

پہلی ملاقات فروعی تھی۔

کہنے لگے "میں نے آپ کو پڑھا ہے اور خاص کر آپ کا افسانہ "جہاں میں رہتا ہوں" بے حد پسند آیا۔ اس قسم کے افسانے اردو ادب میں بہت کم لکھے گئے ہیں۔"

"اور ان کا افسانہ "بغاوت" آپ نے نہیں پڑھا" سبط حسن نے چمک کر کہا۔

"پڑھا ہے، خوب ہے وہ افسانہ" احتشام صاحب یہ کہہ کر آگے بڑھ گئے۔

میں اپنی تعریف سن کر خوش ہو گیا اور کون نہیں خوش ہوتا اپنی تعریف سن کر ــ اور تعریف بھی احتشام صاحب کی زبان سے۔ میں نے احتشام صاحب کے تنقیدی مضامین پڑھے تھے۔ مجھے ان کا انداز بیان اور خاص کر ان کا مارکسی نقطۂ نظر اور اعتدال پسندی کا

کا رجحان بے حد پسند تھا۔ وہ کسی ادیب کو نہ آسمان پر بٹھاتے تھے اور نہ ہی زمین پر لا کر پٹخ دیتے تھے۔ میں نے اپنی کتاب کے بارے میں ان سے گفتگو کی۔ انھوں نے دیباچہ لکھنا منظور کر لیا۔ میں نے سوچا بغیر پڑھے لکھ دیں گے۔ جیسا کہ اکثر مشہور و معروف نقاد کرتے ہیں مگر جب انھوں نے مجھ سے میرا مسودہ لے کر اور ایک مہینہ اپنے پاس رکھ کر دیباچے کے ساتھ واپس کیا اور میں نے دیباچہ پڑھا تو مجھے محسوس ہوا کہ احتشام صاحب نے واقعی میرے افسانوں کے مجموعے کو پڑھا ہے اور پڑھنے کے بعد میری خوبیوں اور خامیوں کی نشان دہی کی۔ ہر ادیب بذاتِ خود ایک نقاد نہیں ہوتا ہے۔ میں اپنے افسانوں میں کردار نگاری کو زیادہ اہمیت دیتا ہوں اور احتشام صاحب نے اسی خاصیت کو سراہا تھا۔

دراصل میری احتشام صاحب سے زیادہ ملاقاتیں نہ ہوئیں۔ اگر زیادہ ملاقاتیں ہو جاتیں جب بھی بات آگے نہ بڑھتی، کیونکہ میں بھی کم گو آدمی ہوں اور احتشام صاحب بھی اور جب دو آدمی کم گو آپس میں مل جائیں تو اظہار گفتگو کا راستہ سوائے خاموشی کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ ہاں کبھی کسی کانفرنس میں یا کسی اور میٹنگ میں ملاقات ہو جاتی تو مندرجہ ذیل جملوں کو دہرایا جاتا۔

"آداب عرض! احتشام صاحب!"

"آداب۔ آپ کیسے ہیں؟" احتشام صاحب پوچھتے۔

"بس ٹھیک ہوں جی۔"

"کرشن جی کیسے ہیں؟"

"وہ بھی ٹھیک ہیں۔"

اِن جملوں سے آگے کبھی گفتگو نہ بڑھی۔ میں نے ان مختصر سی ملاقاتوں میں ایک چیز کو شدت سے محسوس کیا کہ احتشام صاحب صرف کم گو انسان ہی نہیں۔ وہ صرف سنجیدہ ہی نہیں رہتے بلکہ اُداس بھی رہتے ہیں۔ یہ اُداسی کوئی ذاتی اُداسی نہ تھی۔ کسی۔ Frustr- (etion) کا نتیجہ نہ تھی بلکہ اس اداسی کی وجہ بڑی گہری تھی۔ جو لوگ ضرورت سے زیادہ ذہین، دیانت دار اور مخلص ہوتے ہیں اور جب وہ اپنے اردگرد ایک ایسے ماحول کو دیکھتے ہیں جو بے حد گھٹیا، گندا اور قابلِ نفرت ہوتا ہے تو ان کے دل میں اِن حالات کو بدلنے کی تمنا ہوتی ہے اور جب یہ نظامِ زندگی ان سے بدلا نہیں جاتا تو یہ ذہنی کرب ایک مستقل اداسی کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

اور شاید یہی کچھ احتشام صاحب کے ساتھ ہوا۔ اگر آپ نے احتشام صاحب کے تنقیدی مضامین کا مطالعہ کیا ہے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ اعلیٰ پایہ کے مارکسی نقاد تھے بلکہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مارکسی تنقید کا آغاز انھوں نے کیا اردو ادب میں۔ وہ مارکسی قدروں کے علمبردار تھے۔ انھوں نے ترقی پسند ادب کو اسی کسوٹی پر پرکھا اور ترقی پسند ادب اور ترقی پسند ادیبوں کو سراہا۔ جی ہاں وہ ایک (committed) نقاد تھے۔ وہ پکے مارکسی تھے۔ انھوں نے ادب کا رشتہ عوام سے جوڑا اور صاف اور سیدھے لفظوں میں بتایا کہ ادب محض انسانوں کی تفریح کے لئے نہیں لکھا جاتا۔ بلکہ عظیم ترقی پسند ادب ملک کے حالات کو بدلتا ہے۔ اس قسم کا ادب بین الاقوامی رشتوں کو استوار کرتا ہے۔ ذات پات تہذیب رنگ اور نسل سے اوپر اٹھ کر سارے کرۂ ارض کے انسانوں کے لئے ایک درسِ حیات دیتا ہے۔ جس سے عوام کی اقتصادی بدحالی، آپس کی منافرت اور دیگر مسائل پر روشنی ڈالتے ہوئے عوام کے اندر ایک جذبہ پیدا کر کے جس سے ان کے اندر لڑنے کی قوت پیدا ہو، تاکہ وہ ایسے نظام کی داغ بیل ڈال سکیں جس سے صرف ایک انسان کا بھلا نہ ہو بلکہ تمام انسانوں کی بہتری ہو۔ احتشام صاحب نے اردو شاعری اور افسانوں پر تنقید کرتے ہوئے انہی قدروں کو اجاگر کیا اور اسی قسم کے ادب کو سراہا۔ احتشام صاحب ادیب ہی تو تھے۔ انقلابی قدروں کا پرچم بلند کرتے تھے۔ انقلاب نہیں آیا تو ادیب کیا کرے۔ جب اندرونی درد پر ضبط لگائے جاتے ہیں تو چہرے پر ایک اُداسی آ ہی جاتی ہے اور اس اداسی سے شکست کا اعتراف نہیں تھا بلکہ علم و فن سے بہرہ ور ہوتے ہوئے یہ

اُداسی اس کیفیت کی غماز ہے۔ جب ادیب اس منزل پر پہنچ جاتا ہے اور اسے اس بات کا احساس ہونے لگتا ہے کہ انسان نے چاند پر کمندیں پھینک دی ہیں۔ ایٹمی طاقتوں کو اپنے بس میں کر لیا ہے۔ جس کی وجہ سے اگر وہ چاہے تو ساری دنیا کے لوگوں کو خوش حال بنا سکتا ہے مگر ابھی تک انسان کی بنیادی فطرت نہیں بدلی۔ وہ خود غرضی، کینہ پروری صرف اپنی قوم کی بہتری، رنگ اور نسل کے جھگڑے، گورے اور کالے کا فرق اور اسی قسم کی بے شمار لعنتوں سے پیچھا نہیں چھڑا سکا۔ اسی لئے سب کچھ ہوتے ہوئے بھی انسان ابھی تک بام عروج تک نہ پہونچ سکا، جہاں اسے پہنچنا چاہئے۔ وہ ایک ایسا نظام زندگی اس کرۂ ارض پر منطبق نہ کر سکا جس سے یہ دنیا رشکِ جنت بن سکے۔ دنیا کو رشک جنت بنانے کی تمنّا۔ ایک حساس ادیب کے دل میں ایک خنجر کی طرح پیوست رہتی ہے اور احتشام صاحب کے دل میں اسی قسم کا ایک خنجر پیوست تھا۔ جس کی وجہ سے اُن کے چہرے پر ہمیشہ ایک خوشگوار اداسی ٹپکتی رہتی۔

بمبئی کی ہنگامہ خیز زندگی میں کبھی کبھی ادبی محفلوں کو آراستہ کیا جاتا ہے۔ ایسی ایک ادبی محفل میں جہاں پروفیسر احتشام حسین کو مدعو کیا گیا، تاکہ وہ مشہور نقاد اور شاعر حالی کے بارے میں لکچر دیں۔ مجھے بھی اسی قسم کی ایک مجلس میں بحیثیت صدر بلوایا گیا۔ یہیں پر احتشام صاحب سے میری ملاقات ہوئی اور وہی جملے دہرائے گئے۔ آداب عرض۔ آپ کیسے ہیں۔ میں ٹھیک ہوں اور کرشن جی بھی۔ احتشام صاحب مسکرا دئے اور کہنے لگے۔ آپ نے میرا جملہ دہرا دیا۔

میں نے اسی مجلس میں احتشام صاحب کے بارے میں ایک چھوٹی سی تقریر کی۔ جس میں اُن کے خلوص، پیار، ادبی لگاؤ، اور مارکسی نقطۂ نظر کے بارے میں روشنی ڈالی۔ اس تقریر کے بعد احتشام صاحب نے حالی کے بارے میں اپنی تقریر کا آغاز کیا۔ اس دن پہلی بار مجھے معلوم ہوا کہ احتشام صاحب گفتار کے غازی ہیں۔ تقریر اتنی صاف ستھری، سنجیدہ تشبیہوں اور استعاروں سے آراستہ، علم و فن کے موتی بکھیرتے ہوئے، حالی کی ادبی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے، اُن کے تنقیدی سرمائے اور شعری حسن پر نظر رکھتے ہوئے اور خاص کر اس وقت کی دقتوں اور مشکلات کو مدنظر رکھ کر حالی نے کس طرح اردو ادب کو ایک نیا نقطہ عطا کیا یہ حالی کی بہت بڑی دین تھی۔ تقریر بھی کہ لفظوں کا ایک جم غفیر، خوب صورت، سلیس، بامعنی، باوقار، پرشکوہ اور دل میں اترنے والے لفظوں کی یلغار تھی۔ تقریر میں ایک سحر تھا۔ آواز میں بے پناہ جادو۔ جس کا تعلق سننے سے تھا اسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اس تقریر کے بعد سارا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ احتشام صاحب ایک ثمر بار ٹہنی کی طرح جھک گئے۔ ان کی نگاہوں میں نہ رعونت تھی نہ نخوت بلکہ اس اعزاز سے وہ جھکے جا رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں غرور نہ تھا بلکہ احسان مندی کی ایک نمی سی تھی۔

بحیثیت مارکسی نقاد کے سبھی ان سے مرعوب تھے۔ اس دوران میں ترقی پسند ادب اور ترقی پسند تحریک پر کئی وار کئے گئے۔ کئی ادبی زلزلے بھی آئے۔ کئی ادبی جمود نے سر نکالا اور جب ادبی جمود ٹوٹا تو جدیدیت نے سر اُبھارا۔ کئی نقادوں نے وقتی شہرت کی خاطر جدید ادب کو سر پر بٹھایا لیکن احتشام صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے۔ یہ کیسا غوغائے عظیم تھا۔ تنہائی۔ ذاتی غم، اپنی ذات کے بارے میں ہمیشہ آنسو بہانا، خودکشی اور گھٹیا قسم کی جنسی کہانیاں لکھنا۔ اس قسم کے موضوعات اب عام سے ہو گئے۔ افسانے اور شعری ادب دن بہ دن مہمل ہوتا جا رہا تھا۔ زیادہ تر ادیب مغربی ادب کے اسیر ہو کر رہ گئے۔ نئی پود نے بے راہ روی اختیار کر لی۔ پرانی روایتوں کے پرخچے اڑا دئے۔ جس دائرے میں اردو شاعری پروان چڑھ رہی تھی اور جس کی وجہ سے میر، غالب، اقبال اور فراق جیسے عظیم الشان شاعروں نے اپنی تخلیقات سے اردو کے شعری ادب کو مالا مال کیا۔ اس ادب کے خلاف نئے ادیب برسرپیکار تھے احتشام صاحب نے اس افراتفری، اس بے راہ روی کے خلاف آواز بلند کی اور کھل کر کہا۔

ادب بے ادبی کا نام نہیں۔ ادب صرف ذاتی غم، تنہائی، ذاتی اداسی کا نام نہیں۔ ادب جنسی بے راہ روی کا نام نہیں۔ ادب صرف روایتوں کو توڑنے کا نام نہیں۔ ادب ابہام کا نام نہیں۔ ادب مہمل نہیں ہوتا۔ ادب تہذیب و تمدن سکھاتا ہے۔ ادب ایک بہتر

زندگی کی نشان دہی کرتا ہے۔ ادب ذہنی کرائسس میں ایک توازن پیدا کرتا ہے۔ ادب روشنی اور علم سے لوگوں کو مالا مال کرتا ہے۔ ادب تفریق کو مٹاتا ہے محبت کرنی سکھاتا ہے۔ نفرت مٹاتا ہے۔ ادب ذریعۂ نشاط ہے انسان کے لئے۔ ادب احساسِ حسن اور ذوقِ جمال کی تربیت کرتا ہے۔ ادب انقلاب لاتا ہے۔ ادب افراتفری کا سرچشمہ نہیں۔ ادب ہیجان نہیں۔ ادب تخریبی عناصر کو بڑھاوا نہیں دیتا بلکہ تعمیر کی جانب بڑھتا ہے۔ احتشام صاحب نے اپنے تنقیدی مضامین میں انہی قدروں کی نشان دہی کی ہے۔

احتشام صاحب کتابوں کے عاشق تھے۔ لکھنا اور مطالعہ کرنا۔ بلکہ لکھنا کم اور مطالعہ زیادہ کرنا ان کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا تھا ان کے تنقیدی مضامین۔ اردو تنقید میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے انہی قدروں کا پرچم بلند کیا۔ جن کی قیادت آج کل شریمتی اندرا گاندھی کر رہی ہیں۔ آج پھر سے ترقی پسند ادب اور ترقی پسند سیاست آپس میں گلے مل رہے ہیں۔ آج سے چالیس برس پہلے جس سماج کی داغ بیل، ترقی پسند ادیبوں نے ڈالی تھی اور ایک نئے سماج کو جنم دینے کے لئے انھوں نے افسانے، غزلیں، نظمیں اور تنقیدی مضامین لکھے تھے اور آج تک لکھتے رہے ہیں۔ ان میں احتشام صاحب کی آواز سب سے زیادہ سنجیدہ، بھرپور، مارکسی نقطۂ نظر سے لیس ہو کر ابھری اور تنقیدی ادب پر اپنی مہر ثبت کر گئی جو ہمیشہ امر رہے گی۔

ہمیں افسوس اس بات کا ہے کہ جس شخص نے فنِ تنقید کو ایک نئی زندگی بخشی، مارکسی فلاسفی سے آگاہ کیا اور مارکسی تنقید کو کہکشاں کی بلندی، اور سُندرتادی اور ایک ایسی مضطرب روح عطا کی جو عوام کی بہتری کے لئے ہمیشہ تڑپتی رہے گی۔ انھیں نہ پدم شری سے نوازا گیا اور نہ انھیں (Indo - soveit) ایوارڈ دیا گیا۔ جس کے وہ یقیناً مستحق تھے۔ کاش وہ دانش ور اور سیاست داں جو اس قسم کی کمیٹیوں کو سنبھالے ہوئے ہیں، وہ ایک لمحہ کے لئے سوچیں کہ انھوں نے کیوں اتنی بڑی غلطی کی۔ اب بھی وقت ہے کہ احتشام صاحب کی یاد میں کوئی ایسا کام کیا جائے جس سے آنے والی نسلیں ان کی ادبی تخلیقات سے مستفید ہوتی رہیں۔ ▲

اختر راہی

پرتو

(مہندر ناتھ جی کی مرگِ ناگہاں سے متاثر ہو کر)

سب کہاں، کچھ بے بہا قطرے سمندر کے
ہوا کے دوش پر اُڑتے ہوئے
آسماں کی رفعتوں کا جزو بنتے ہیں
ابرِ رحمت بن کے دھرتی پر برستے ہیں
لہو بن کر رگوں میں دوڑ جاتے ہیں
ستارے بن کے محنت کی جبینوں پر سنورتے ہیں
صداقت، لفظ و معنی، آگہی بن کر صحیفوں سے اُبھرتے ہیں
مُقدس چند قطرے اس سمندر کے

ایک قطرہ
آگہی کی چشمِ بینا سے لہو بن کر جو ٹپکا
وہ مہندر
نچوڑ و ! اپنے دامن پر
یہ خیر و عافیت کا ایک قطرہ جو سمندر ہے
سجاؤ تیرہ پلکوں پر
شعورِ زندگی کا ایک سورج ہے
زباں پر لاؤ ساری لذتوں کا اک مُرکّب ہے
اُتارو دل میں اپنے یہ خدا کی ذات ہی کا ایک پرتو ہے
جو ابد تک
ایک پورے آدمی کے نام سے باقی رہے گا



R. K. MIDHA'S
GHARIBI HATAO
4V
MUSIC
SHARDA
SCREEN PLAY
KRISHAN CHANDER
DIALOGUES
RAHI MASOOM RAZA
PHOTOGRAPHY
ARVIND LAAD
WRITER-PRODUCER-DIRECTOR
R.K. MIDHA
THERE IS ALWAYS A SILVER LINING
FUJI COLOR by RAMNORD
RAJVANSH
RACHNA
NARINDER NATH
RAJNI BALA
&
ANITA GUHA
PADMA KHANNA
with
starlets
VIBHA
&
VIVEK



مہندر ناتھ کی چند کتابیں



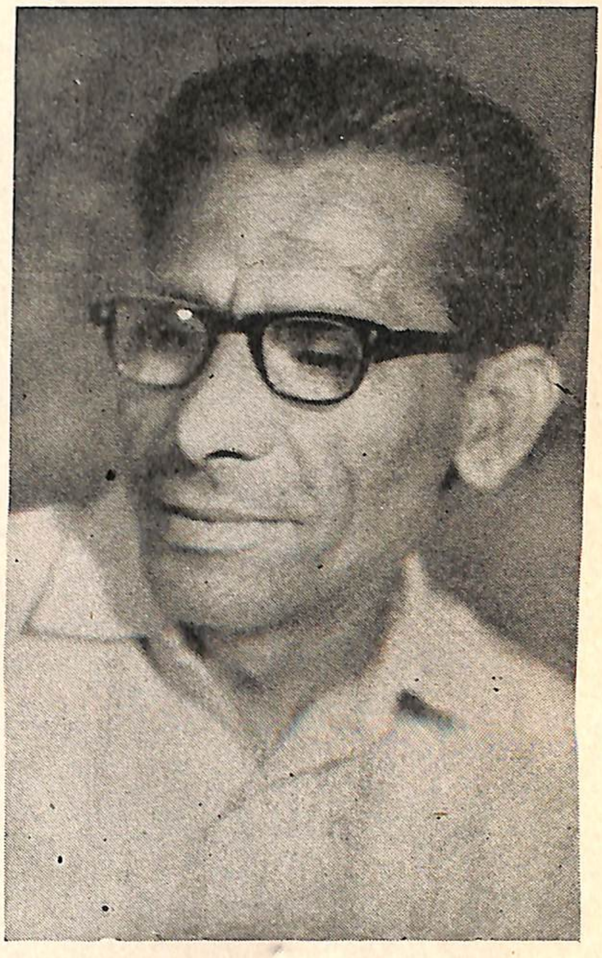
ویدراہی



کشمیری لال ذاکر



حسن کمال ایڈیٹر بلٹز



فکر تونسوی



آر۔ کے۔ ٹڈھا

جب تک فلم کے لکھنے والوں کی حالت نہیں بدلتی تبتک فلم کا مزاج نہیں بدل سکتا۔



ادیب فلم کا ہو یا ادب کا۔ اسکے حقوق کی حفاظت ہمارا فرض ہے۔ (ایم) مہندر ناتھ جنرل سکریٹری فلم رائٹرز ایسوسی ایشن۔ اپنی ایگزیکیٹو کمیٹی کیساتھ

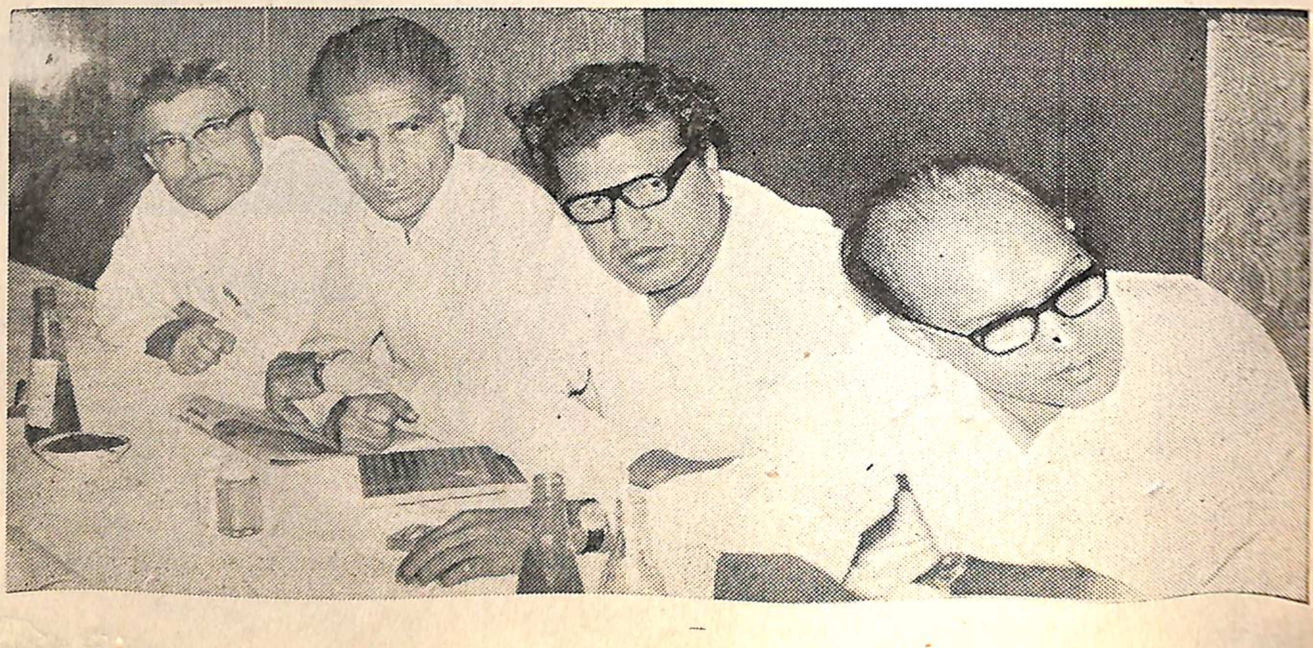
فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کے چار ستون

دائیں سے بائیں ــــ مدھوسودن موجودہ جنرل سکریٹری فلم رائٹرز ایسوسی ایشن

عزیز قیسی۔ چیئرمین ڈسپوٹ سیٹلمنٹ کمیٹی

غافل ہرنالوی۔ جائنٹ سکریٹری

وشنو ملہوترہ۔ جائنٹ سکریٹری





ستیش بھٹناگر



نقش لائلپوری



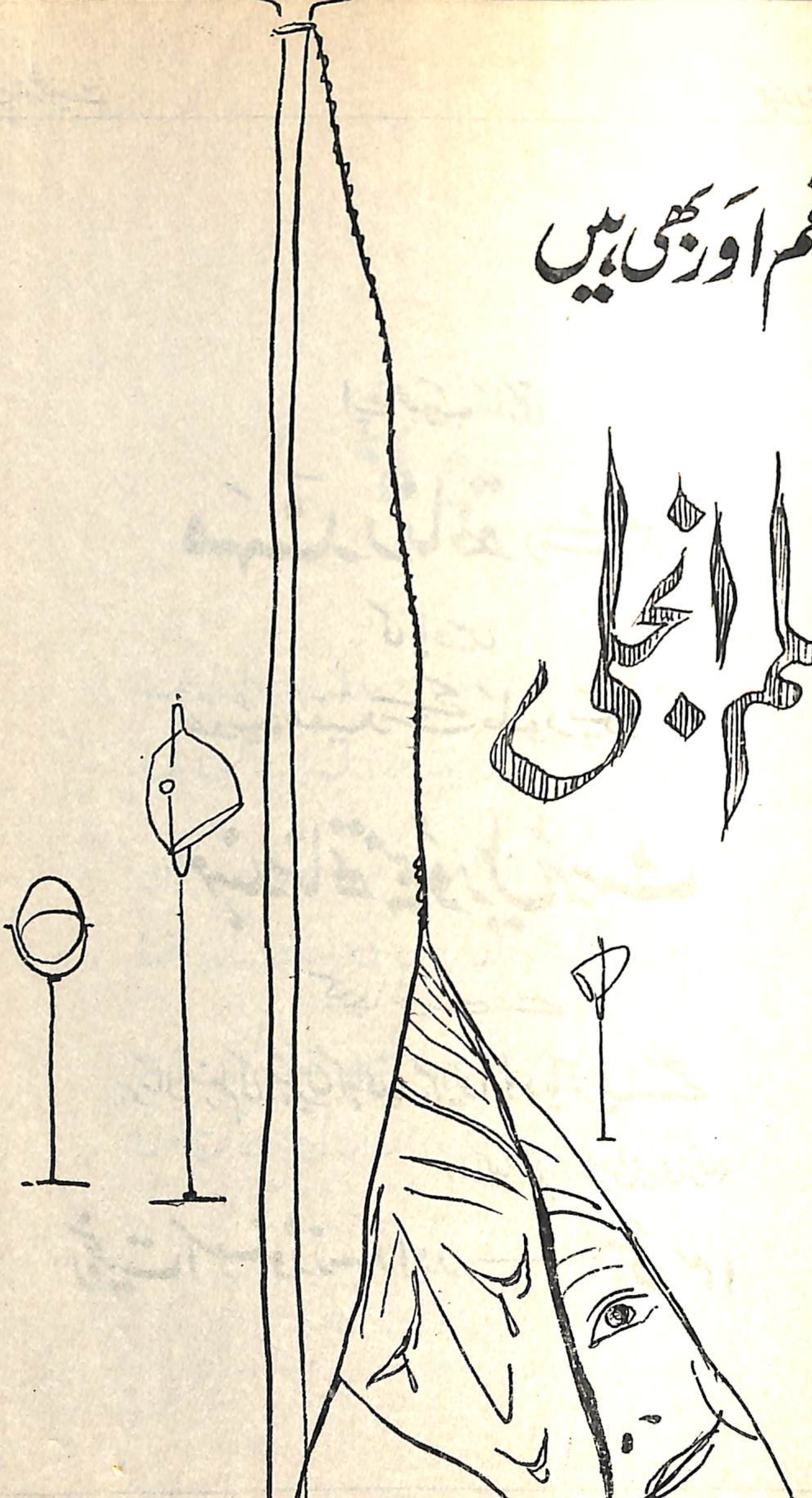
ڈی۔ پی موریا۔ آفس سکریٹری فلم رائٹرز ایسوسی ایشن



اوتار کرشن اگروال

اہلِ غم اور بھی ہیں

نظم انجلی



قمر جلال آبادی

"وہ"

وہ شخص چاند ستاروں کی بات کرتا تھا
خزاں میں بھی وہ بہاروں کی بات کرتا تھا

شہیدِ زر تھا زمانہ مگر وہ صاحبِ فن
ادب کی راہ گذاروں کی بات کرتا تھا

اجل کی لہر اسے کیسے لے گئی یارو
بھنور میں بھی جو کناروں کی بات کرتا تھا

پنڈت مکھ رام شرما

ستّیہ وادی

مہندر ناتھ کو میں فلم رائیٹرز ایسوسی ایشن سے پہلے کبھی نہ ملا تھا جس سبھا میں وہ جنرل سیکرٹری چُنے گئے اُس سبھا میں مجھے بھی ادھکش چنا گیا۔ اس چناؤ میں ہی مہندر ناتھ سے میرا پریچے ہوا تھا۔ وہ اردو بھاشا کا لیکھک تھا میں ہندی بھاشا کا۔ میں اردو نہیں جانتا تھا اور وہ ہندی نہیں جانتا تھا لیکن ہندی۔ اردو لکھنے والے ممبروں کے ادھیکاروں کی رکھشا کرنا وہ اپنا دھرم مانتا تھا۔ اور جو کوئی بھی فلم رائیٹرز کا دوست تھا وہ اس کو اپنا دوست مان لیتا تھا۔ اور جو ایسوسی ایشن کا ورودھی ہوتا تھا اُس کا وِرودھ کرتا تھا۔

ہماری میٹنگوں میں لوگوں کو غصّہ بہت آتا تھا۔ لیکن میں نے مہندر ناتھ کو کبھی غصّے میں نہیں دیکھا جب کبھی بحث آسمان پر پہنچنے لگتی اور سب اُتّے جت ہو جاتے تو بھی وہ غصّہ نہ کرتا صرف اتنا کہتا۔ "یار میری بھی سنو گے یا نہیں۔" وہ یہ کبھی نہیں کہتا تھا "میں جنرل سیکرٹری ہوں میری مانو۔" وہ کہتا تھا۔ "سچ کو دیکھو اور غریب کا ساتھ دو" وہ غریبوں کا دوست تھا۔ اپنی Dispute کمیٹی میں اگر کوئی مصیبت کا مارا پروڈیوسر بھی آجاتا تو اس کی بھی حمایت کرتا تھا۔ کہتا تھا۔ "یہ غریب پروڈیوسر ہے۔" غریب کو دیکھ کر وہ بڑا پریشان ہوتا کہتا "یہ بیچارہ غریب ہے۔" مجبور کے لئے اس کے دل کے دروازے کھلے رہتے تھے۔

فلم رائیٹرز ایسوسی ایشن میں ایک بار بھاشا کا بھوت کھڑا ہوا تھا۔ اگر مہندر ناتھ نہ ہوتا تو یہ بھوت ایسوسی ایشن کو ہڑپ کر جاتا۔ لیکن مہندر ناتھ نے ایسا منتر پڑھا کہ یہ بھوت بھاگ گیا۔ پھر کبھی ایسوسی ایشن کی طرف اس نے رخ نہیں کیا۔ آپ ہی کہئے کہ ہندی اردو کا جھگڑا بھلا فلم رائیٹرز ایسوسی ایشن میں کیوں؟ یہاں نہ کوئی ہندی کا لیکھک ہے نہ اردو کا۔ ہم سب فلم کے لیکھک ہیں۔ فلموں کی بھاشا پاتروں کی بھاشا ہوتی ہے ہندی یا اردو کی نہیں ہوتی۔ مہندر ناتھ بھی اسی عقیدے کا آدمی تھا ——— لوگ کہتے ہیں کہ وہ کمیونسٹ تھا۔ اگر وہ واقعی کمیونسٹ تھا تو بھی سچی بات یہ ہے کہ مہندر کو دیکھ کر، اُس کا برتاؤ دیکھ کر، اُس کی سچائی دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ سبھی کمیونسٹ ہو جائیں۔ تو ہماری پوری فلم انڈسٹری سُکھی ہو جائے۔

وہ سب سے زیادہ آدر اور سمّان کرشن جی کا کرتا تھا کیونکہ وہ اس کے بڑے بھائی تھے۔ ایسا کرنا اس کا دھرم تھا مگر میں نے دیکھا وہ ایسوسی ایشن کے معاملے میں کرشن جی کے سامنے بھی اَڑ جاتا تھا۔

میں تو کہوں گا وہ مارکس وادی نہیں ستیہ وادی تھا، وہ غریب پروڈیوسر، غریب ورکر، غریب رائیٹر کو سکھی کرنے کے لئے خود دکھی ہو جاتا تھا اور سکھی ہوتا تھا ایسوسی ایشن کی ترقی دیکھ کر۔ وہ مت، بھاشا، پرانت اور دھرم کو نہیں دیکھتا تھا۔ لیکھکوں میں ایسا بھید بھاؤ اس نے کبھی رکھا ہی نہیں تھا۔

جب مہندر ناتھ نے ایسوسی ایشن کی باگ ڈور سنبھالی تو ایسوسی ایشن کے پاس کچھ نہیں تھا حتیٰ کہ ممبروں میں اُتساہ بھی نہیں تھا لیکن جب مہندر ناتھ کا دیہانت ہوا تو ایسوسی ایشن کے پاس سب کچھ تھا۔ اچھا دفتر۔ اچھے کام کرنے والے اور بینک میں تیس ہزار روپیہ فکس ڈپازٹ میں بھی تھا۔ ایسوسی ایشن امیر تھی وہ غریب تھا۔ میرا وشواس ہے کہ اگر فلم رائیٹرز ایسوسی ایشن ترقی کرے گی تو وہ جہاں بھی ہو گا اس کی آتما کو سُکھ ملے گا۔

ارجن دیو رشک

ایک بادشاہ نے فقیر لوٹ لئے

موت ایک دروازہ ہے۔ اگر آدمی اندر ہے تو وہ باہر جانے کا راستہ ہے، اگر باہر ہے تو اندر آنے کا راستہ!

مہندر چنگے بھلے اندر تھے۔ مگر جانے کی انھیں کیا سوجھی! کہ وہ اندر سے باہر چلے گئے، کبھی نہ واپس آنے کے لئے۔ مہندر ناتھ سے ہمارا علاقہ اتنی ہی دیر کا تھا جتنی دیر وہ مکان کے اندر رہے۔ اُن کا ہمارا دہی تعلق ہمیں اُن کی یاد کچھ اس طرح دلاتا ہے کہ کلیجہ پھٹنے لگتا ہے۔

مرنے والوں کو کب انسان رویا ہے کہ ہم روئیں ۔۔؟ ہم تو اپنے گھاٹے کو روتے ہیں۔ وہ کئی برس فلم رائیٹرس ایسوسی ایشن بمبئی کے جنرل سکریٹری رہے۔ اس کی مختلف کمیٹیوں میں ہی ان کا بیشتر وقت گزرتا ۔۔۔ اور ہم جو کبھی کبھار اپنا کوئی مسئلہ لے کر ان کے پاس جاتے تو وہ مسئلے کو حل کرنے کا یقین تو ہمیں فوراً دلا دیتے اور پھر ہمارے فوری حالات سے ابھر کر پوچھتے، پہلے یہ بتایئے کہ آپ کس حال میں ہیں۔؟ کون کون سی فلمیں لکھی ہیں اور لکھنے والے ہیں۔ مجھ سے جب کبھی وہ یہ سوال پوچھتے تو میں بمشکل انھیں ایک آدھ فلم کا نام بتاتا۔ اور ساتھ ہی یہ بھی کہ فلم کے پروڈیوسر مجھ سے سخت نالاں ہیں ۔۔ اور فلم سے میرے الگ ہونے کا وقت قریب آپہنچا ہے ۔۔۔ وہ یہ سن کر تڑپ اٹھتے۔ اور پھر ایسی صورت حال کو بہتر بنانے کی جی جان سے کوشش کرتے تھے۔ انھیں اس بات کی قطعاً پروا نہیں تھی۔ پروڈیوسر سے میرا جھگڑا پھر ہوگا اور پروڈیوسر پھر مجھ سے الگ ہو کر مہندر ناتھ سے شکایت کرے گا کہ انھوں نے ہی اپنی شرافت اور وضع داری کے اثر سے میرا پروڈیوسر کا معاہدہ ٹوٹنے سے بچایا تھا۔ اور دیکھئے اب کیا ہوا؟ ۔ یہ بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ اس کے تمام پہلو بھی معرض بحث میں نہیں آتے ۔۔۔ فلموں کے مرگِ انبوہ میں صحیح غلط کی تلاش لایعنی ہے۔ آپ ایک صحیح خبر کو گلے لگایئے۔ وہ آپ کا کوڑھ بن جائے گی، اور غلط خبر سے قطع تعلق کیجئے تو وقت آنے پر سکھائے گا کہ ایک نیکی اور بھلمنساہت سے آپ نے قطع تعلق کیا تھا۔ اس غول بیابانی میں مہندر ناتھ ہمیشہ یکا و تنہا رہے اور ان کی یکتائی و تنہائی کا ہر کسی نے احترام کیا ۔۔۔ یہ یکتائی گریز نہ تھا حقائق کی دنیا سے اور نہ ہی یہ تنہائی ہنگامۂ حیات و مرگ سے بھاگنے کی کوشش تھی۔

مہندر ناتھ ایک سلجھا ہوا مصنف، ایک شریف انسان اور ایک کبھی آنکھیں نہ پھیرنے والا دوست تھا۔ اور وہ بھی چند لکھنے والوں کا نہیں بلکہ ہر لکھنے والے کا۔

آج ہم مہندر کو بہت قریب سے دیکھ رہے ہیں۔ ایک دن (اگر ہمیں وہ دن نصیب ہوا تو) ہم مہندر کو دور سے دیکھیں گے جہاں سے ہر نظارہ صاف دکھائی دیتا ہے اُس دن ہم مہندر کو پہچانیں گے۔ اور اس سے ویسا ہی پیار کریں گے جتنا کہ ہمارے دل میں اپنے جواں مرگ بھائی کے لئے جاگتا ہے اور ہمیں تڑپا جاتا ہے۔

مہندر کی موت کو میں اس نظر سے دیکھتا ہوں کہ درگا بھابی، اسلم اور ودیا بھابی اور دیگر خویش و اقارب، کو جو کہ تہی دامن ہو کر بھی بادشاہوں اور ملکاؤں کا سا گھمنڈ رکھتے تھے مہندر برباد کر گیا ہے۔

اور ان کی بربادی میں شک بھی کیا ہے۔

کیا ان سب فقیروں اور نیک بندوں کو ایک بادشاہ لوٹ کر نہیں لے گیا۔!

پریم وار برٹنی

ایک تاثر۔ ایک یاد

یہ ہماری تہذیب اور معاشرے کی ایک پرانی رسم ہے کہ جب کوئی محبوب ہستی وفات پا جاتی ہے تو ہم اس کے عزیز و اقارب اور پسماندگان سے اظہارِ افسوس کرتے ہیں۔ کبھی افسوس اور ہمدردی کا یہ اظہار زبانی ہوتا ہے اور کبھی بذریعہ خط و کتابت! گویا ہر مذہب و ملت کے اصولوں کے مطابق ہم تعزیتی رسومات کے بعد اپنے فرائض سے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔ چاہے ہمارے دکھ کی نوعیت محض رسمی اور معمولی ہو، چاہے وہ صدمہ انتہائی ناقابلِ برداشت، گہرا اور عظیم ہو۔

مہندر ناتھ میرے دوست بھی تھے اور کرم فرما بھی! اُن کی جُدائی ادب اور زبان کے لئے ناقابل تلافی نقصان سہی لیکن اُن کی یاد میں شائع ہونے والے آرٹیکل، بڑے بڑے خصوصی نمبر، جلسے، جلوس اور میموریل کمیٹیاں کیا اُس کربناک صدمے کی شدت کو کم کر سکیں گی جو لیلائے اُردو کو داغ مفارقت دے گیا ہے؟ اِس ماتمی موقعہ پر اگر میں نے بھی کوئی نظم لکھ ڈالی تو کیا وہ اس خلا کو پُر کر سکے گی۔ جو میری روح کی گہرائیوں میں ہے اور جو دل و دماغ کے سوگوار سناٹے میں صدائے بازگشت کی طرح گونج رہا ہے۔

آج مہندر ناتھ کی پہلی برسی ہے۔ انھیں ہم سے بچھڑے ہوئے ایک سال ہو رہا ہے۔ کہانیوں کا شہزادہ، شہیدِ ادب، مہندر ناتھ! ایک مکمل انسان اور بھرپور ادیب۔ جو اقتصادی اور معاشی بدحالی کے باوجود آخری دم تک آرٹ اور ادب کی خدمت کرتا رہا۔ میں اسے شہیدِ ادب نہ کہوں تو کیا کہوں؟ مگر افسوس کہ ہمارے ملک کی ادبی سیاست نے ابھی اب تک شہیدوں کا احترام کرنا نہیں سیکھا، اور بے چاری اردو کا تو ذکر ہی کیا جو اپنے شہیدوں کے کفن تک نہیں سلوا سکتی۔ اور تو کیا کرے گی؟

میرے دوست صابر دت کا اصرار ہے کہ مہندر ناتھ کی پہلی برسی کے موقعہ پر میں بھی کچھ لکھوں۔ لیکن صداقت یہ ہے کہ دل، دماغ کا اور دماغ قلم کا ساتھ نہیں دے رہا۔ جب کوئی غم حد سے تجاوز کر جائے اور کسی عظیم اور غیر متوقع صدمے کے اثرات نڈھال کر دیں۔ تو ہمارے غموں اور زخموں کو چپ سی لگ جاتی ہے۔ یہ انسانی جذبات کا عجیب نفسیاتی ردعمل ہے اور شاید اسی لئے کہا گیا ہے کہ خاموشی سے بڑھ کر موت کے لئے اور کوئی بہتر خراج نہیں!

اِس میں شک نہیں کہ کسی محبوب شخصیت کے انتقال پر تعزیتی رسومات کو پورا کرنا ایک اہم سماجی اور اخلاقی فریضہ تصور کیا جاتا ہے۔ لیکن مہندر ناتھ کی وفات سے کچھ عرصہ قبل جب میری والدہ محترمہ کا دیہانت ہوا اور اس وقت میرے دوستوں، عزیزوں اور رشتہ داروں نے مجھے ہمدردی کے جو خطوط لکھے۔ اُن سے محسوس ہوا کہ میرے صدمہ کی شدت کم نہیں ہوئی، بلکہ اُن خطوں نے دل کے زخموں کی آگ کو اور بھڑکا دیا۔ یہ تلخ تجربہ مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ ہوا تھا۔

لہٰذا مہندر ناتھ کی اچانک موت پر میں نے دانستہ محترمہ بھابی (شریمتی مہندر ناتھ) کرشن چندر۔ سلمیٰ صدیقی، ریوتی سرن شرما،

سرلا بہن، سی۔ ایل۔ کاوش۔ اعجاز صدیقی، نقش لائلپوری یا کسی دوسرے فنکار ساتھی کو افسوس کا خط نہ لکھا۔ اگر افسوس اور ہمدردی کے خطوط لکھنے سے صبر حاصل ہوتا ہو تو میں بڑی بے بسی سے درخواست کروں گا کہ مہندر ناتھ کے یہ سبھی رشتہ دار اور احباب مجھے بھی صبر کی تلقین کریں کیونکہ مہندر ناتھ سے میرا بھی ایک رشتہ ہے۔ دوستی اور خون کے رشتے سے بڑا رشتہ!

میں نے بہت سے عزیز اور عظیم ساتھیوں کی موت کا سوگ اپنی ماتمی نظموں سے منایا ہے۔ مگر آج میں کوئی نظم لکھنے سے لاچار ہوں! مجبور ہوں! جیسے تخلیقی صلاحیتیں مفلوج ہو کر رہ گئی ہوں۔ احساس لہو لہو ہے اور دل سے دماغ تک سوگوار سناٹے کی تاریک پرچھائیاں لرز رہی ہیں۔ اگر انتہائی کوشش کے بعد سطحِ ذہن پر کوئی شعر ابھرتا ہے تو ایک بھیانک سوال بن کر میرے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے اور جب میں اُسے کوئی جواب نہیں دے پاتا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا ہے۔ میرے اُن کہے اشعار کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے لبریز ہیں جن میں سنہرا کانچ کا ایک خوشنما گنبد کبھی ڈوبتا ہے کبھی ابھرتا ہے اور کبھی پھر ڈوب جاتا ہے۔ کانچ کا ایک سنہرا خوشنما گنبد، جو مہندر ناتھ کے خوبصورت خوابوں کا عکس ہے۔

میرے اُن کہے شعر اور اَن بہے آنسو — میں اپنے دوست مہندر ناتھ کی سوگوار یاد کو اور کیا پیش کروں؟ یہی آنسو میرا خراجِ عقیدت ہیں۔ یہی میری شردھانجلی ہیں۔

میں مہندر ناتھ سے ایک بار نہیں، سینکڑوں بار ملا ہوں۔ لیکن وہ ہماری آخری ملاقات تھی۔ رنجیت اسٹوڈیو اور فلم رائیٹرز ایسوسی ایشن کے دفتر میں! یہ کوئی ڈھائی برس پہلے کی بات ہے۔ اس وقت وہاں ہم دونوں کے علاوہ سی۔ ایل۔ کاوش اور دفتر کے چند دوسرے کارکن موجود تھے۔ میں حسبِ معمول نشے میں شرابور تھا۔ مہندر جی میری اوٹ پٹانگ باتیں سن کر سنجیدگی سے بولے تھے — "ٹھیک ہے تم پنجاب واپس چلے جاؤ۔ ورنہ دوبارہ ہارٹ اٹیک ہو جائے گا۔ آج ہی چلے جاؤ، کسی گاڑی سے لیکن خدارا اور آگے مت جانا۔"

"آگے کہاں؟" میں نے حیرانی سے پوچھا تھا۔

"وہیں! جہاں اس سے پہلے میراجی، مجاز اور نریش کمار شاد جا چکے ہیں۔"

میں نے کہا — "چھوڑیئے اِن باتوں کو۔ میں فوراً روانہ ہونا چاہتا ہوں لیکن ٹکٹ اور سفر خرچ نہیں ہے۔"

"یہ انتظام کر دیا ہے! لیکن نقد روپے تمہارے حوالے نہیں کئے جائیں گے۔ ورنہ پنجاب جانے کی بجائے تم پھر سیدھے کسی 'آنٹی' کے اڈے پر پہنچ جاؤ گے۔ نقش لائلپوری تمہارا سابقہ کارنامہ بتا چکے ہیں۔" مہندر ناتھ نے کہا تھا۔

اور پھر — وہ دیر تک مجھے قاعدے سے شراب پینے کی ہدایت کرتے رہے۔ میرا خیال تھا کہ وہ بھی دوسروں کی طرح یہی فرمائیں گے کہ تم اپنے لئے نہیں تو ادب کے لئے جیو۔ اور ادب کو ابھی تمہاری بہت ضرورت ہے۔ لیکن انھوں نے صرف اتنا کہا تھا — "بے تحاشہ شراب پی کر قبل از وقت مرنے سے نہ تو ادب کو تمہاری وجہ سے کوئی نقصان پہنچے گا اور نہ قوم کو! لیکن اس طرح خود کو قتل کرنے سے کیا حاصل؟ دیکھو پریم! تم دوبارہ فلم میں آئے۔ تو تمہیں آتے ہی دو تین فلمیں آفر ہو گئیں۔ لیکن کام کرنے کی بجائے تم نے پھر خود کو شراب میں غرق کر دیا۔"

مہندر ناتھ نے آخر میں کہا — "اب کے اگر بمبئی آنا۔ تو اس عہد کے بعد کہ تم اوروں کی طرح سلیقے سے شراب پیو گے۔ اور خوب گیت لکھو گے۔"

فرطِ جذبات سے میری پلکیں بھیگ گئیں۔ مہندر ناتھ نے پیار سے مجھے گلے لگایا اور کہا — "میں خود تمہارے ساتھ اسٹیشن چلتا۔ لیکن میری طبیعت ناساز ہے۔" پھر انہوں نے میرے ہمراہ فلم رائیٹرز ایسوسی ایشن کے دو اشخاص اس غرض سے بھیج دیئے کہ میں راستے میں اور شراب نہ پیوں اور مجھے مناسب ٹرین پر سوار کرا دیا جائے۔

یہ مہندر ناتھ سے میری آخری ملاقات تھی۔ کیا خبر تھی کہ مجھے زندگی کا پیغام دینے والا دوست، مجھ سے پہلے ہی زندگی سے روٹھ کر

چلا جائے گا؟ مجھے ہمیشہ اس بات کا غم رہے گا کہ میں نے مہندر ناتھ کی آخری خواہش کا احترام نہ کیا۔ کیونکہ میں نے تو بمبئی چھوڑنے سے قبل ہی راستے میں دو جگہ ٹیکسی رکوا کر شراب پی لی تھی۔ اور سفر کے لئے ایک بوتل ساتھ بھی رکھ لی تھی۔

آج بھی بوتل میرے سامنے پڑی ہے اور میرے گلاس سے پھر سنہرا کانچ کا ایک خوشنما گنبد ابھر آیا ہے اور میں سوچ رہا ہوں۔ سنہرے کانچ کے جھلملاتے ہوئے خوشنما گنبد اس دنیا میں کتنے کم ہوتے ہیں اور بے رحمیوں اور بے انصافیوں کے پتھر کتنے زیادہ ہوتے ہیں کتنے زیادہ؟

اور آج کل یہاں میرے ایک پروڈیوسر دوست جو فلم بنا رہے ہیں اور مجھ سے باقی تینوں گیتوں کی ریکارڈنگ کے لئے بمبئی چلنے کو کہہ رہے ہیں۔ تو میں بار بار سوچتا ہوں۔ کہ کیا اب میں بمبئی جا سکوں گا؟ اگر وہ مجھے اپنے ساتھ لے بھی گئے۔ تو کیا دادر کی اس سڑک سے گزر سکوں گا۔ جہاں مہندر ناتھ کا مکان ہے اور جہاں ہم نے کئی بار رمی کھیلی ہے۔ اکٹھے شراب پی ہے۔ نظمیں سنائی ہیں۔ کہانیاں سنی ہیں۔ شعر و ادب پر بحث مباحثے کئے ہیں۔ کئی مرتبہ دشمنوں کی طرح لڑے اور جھگڑے بھی ہیں اور دوستوں کی طرح محبت بھی کی ہے۔

نقش لائلپوری

مہندر ناتھ کے نقش

اِس نفسا نفسی کے دور میں مہندر ناتھ جیسے انسان خال ہی خال نظر آتے ہیں۔ ان کی شخصیت کا ہر پہلو قابل تحسین تو ہے ہی بلکہ قابل تقلید اور قابل عمل بھی ہے۔ قدرت نے انھیں قلمکار برادری میں یکتائی، بھائی چارگی اور ہمدردی کے لئے کچھ غیر معمولی صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا تھا۔

وہ بھی ہماری طرح کام کرتے تھے، جدوجہد کرتے تھے، لکھتے بھی تھے اور خوب لکھتے تھے، ان کی گھریلو زندگی بھی خوشگوار تھی، وہ برسوں انجمن ترقی پسند مصنفین کو کندھا دیتے رہے۔ اور جب فلم رائٹرس ایسوسی ایشن کی بہبودی کا بیڑہ اٹھایا تو اس کے لئے زندگی صرف کر دی۔ انھوں نے اس ایسوسی ایشن کے بہت سے مسائل نہایت ذمہ داری اور مستقل مزاجی کے ساتھ سلجھائے۔ وہ بھی چاہتے تو خود غرض ہو کر جی سکتے تھے لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔

مہندر ناتھ نے مجھے اپنی پہلی ملاقات سے متاثر کیا تھا۔ بعد ازاں بھی ان کی عظمت کی جھلک ان کے رویّے میں ہمیشہ نظر آئی۔ میں سامنے کم اور پیچھے زیادہ ان کے کردار اور ان کے خلوص کی تعریف کیا کرتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ مہندر خود کو حوصلہ نہیں دے پاتے تھے۔ اپنے دکھوں کو اپنے آپ میں سمیٹنے اور چھپانے کی صلاحیت ان میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔ اس بات کا احساس وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہوں نے انہیں قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کی سعی کی ہو۔ مہندر اپنے ساتھیوں کو مایوس اور پست ہمت دیکھتے تو نفسیاتی طور پر ان کی حوصلہ افزائی کرتے اپنے مطالعے اور مشاہدے کی روشنی میں بڑی اچھی اچھی حیات بخش باتیں کرتے۔

ایک روز مجھے اچانک ان کی موت کی خبر ملی، میں کانپ اٹھا، دوسرے ہی لمحے ایک گمان یہ بھی گزرا کہ شاید یہ خبر غلط ہو۔ کیونکہ اس سے پہلے بھی ایک بار یہ خبر اڑی تھی۔ اُس دن مہندر جی کے گھر پر دن بھر ٹیلیفون آتے رہے، اور مہندر ناتھ اپنی آواز سے سب کو یقین دلاتے رہے کہ وہ زندہ ہیں، جو لوگ اُن کے گھر پہنچے۔ ان کا انہوں نے مسکراتے ہوئے سواگت کیا۔ کئی دنوں تک وہ اس واقعہ کو لطیفے کی طرح دوستوں کو سناتے رہے ـــ اور جب کوئی کہتا کہ جس کے بارے میں اس قسم کی افواہ اڑتی ہے اس کی عمر میں اضافہ ہوتا ہے تو وہ ایک پُر زور قہقہہ لگاتے۔ زندگی سے بھر پور قہقہہ۔ اور پھر سنجیدہ ہو کر بڑی گمبھیر باتیں کرنے لگتے، زندگی کی حیثیت اور موت کی حقیقت کی باتیں۔

لیکن جب اس خبر کی تصدیق ہوئی تو میں تڑپ اٹھا، مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں اپنے خاندان کے ایک شفیق اور ہمدرد فرد سے محروم ہو گیا ہوں۔ جنہیں ہم ہمیشہ واہ کہتے رہے ہوں، انہیں اگر اچانک آہ کہنا پڑے تو دل پر ایک ضرب سی لگتی ہے، لفظ واہ جب آہ میں تبدیل ہوتا ہے تو عجیب سے کرب میں مبتلا کر جاتا ہے اور یہ کرب اتنا ہی شدید ہوتا ہے جتنی کہ ہمیں اس شخص سے محبت یا عقیدت ہوتی ہے جس

سے اس واہ اور آہ کا تعلق ہوتا ہے۔

جس طرح مہندر جی کی ہمدردیاں دوسروں کے ساتھ تھیں، میرے ساتھ بھی رہی ہیں۔ ایک واقعہ مجھے یاد آرہا ہے جو مہندر ناتھ کی شخصیت کو نکھارتا ہے۔ وہ یہ کہ مجھے ہارٹ اٹیک ہوا اور مجھے سائن ہسپتال میں داخل کر لیا گیا۔ خبر ملتے ہی وہ فلم رائٹرس ایسوسی ایشن کے چند ممبران کے ساتھ مجھ سے ملنے آئے، میرے بیوی بچوں کا حوصلہ بڑھایا، اور ہر ممکن امداد کرنے کا وعدہ بھی کیا۔ وہ اکثر مجھ سے ملنے ہسپتال آیا کرتے تھے۔ میں ہسپتال سے گھر بھی آگیا لیکن میری صحت ٹھیک ہونے میں نہیں آرہی تھی۔ ایک روز بیوی نے مجھ سے کہا کہ ڈاکٹر نے کچھ دوائیں اور تجویز کی ہیں اور گھر پر کوئی پیسہ نہیں ہے۔ میں نے بچے سے کہہ کر مہندر جی کو فون کروایا۔ مہندر جی فوراً میرے پاس پہنچے اور دوائیوں کا انتظام کروایا اور جاتے وقت اتنا اور کہہ گئے کہ وہ کچھ رقم کا بھی انتظام کریں گے۔ تیسرے روز فلم رائٹرس ایسوسی ایشن کے آفس سکریٹری مسٹر موریہ میرے پاس پہنچے، انھوں نے ایک ہزار روپے اور ایک واؤچر میرے سامنے رکھ دیا۔ واؤچر سے مجھے پتہ چلا کہ یہ رقم مجھے فلم رائٹرس ایسوسی ایشن کی طرف سے بطور قرض مل رہی ہے۔ مجھے حیرت تھی کہ مہندر جی نے اتنی جلدی منیجنگ کمیٹی کی میٹنگ کیسے کی ہوگی اور کیسے میرے لئے یہ رقم منظور کروائی ہوگی کسی بستر مرگ پر پڑے آدمی کے لئے اس طرح کی عملی ہمدردی اور بے پناہ خلوص اسے نئی زندگی دینے کے برابر ہے۔ جب میں مکمل صحت یاب ہو کر دفتر آیا تو وہ اتنے خوش نظر آرہے تھے جیسے میری صحت ان کی جیت ہے۔

اور بھی بہت سی باتیں قابل ذکر ہیں جن کے اظہار کے لئے کافی وقت چاہیے۔ اس لئے میں صرف ایک اور واقعہ کے اظہار پر اکتفا کرنا چاہتا ہوں۔ جس کا نقش میرے ذہن سے شاید ہی مٹ سکے۔

ایک روز میں مہندر جی کے گھر گیا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اچانک میری نظر ان کے بستر پر گئی جس پر فائلوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ میں اُن کے زیادہ کام کرنے پر تنقید کرتا رہا۔ انہیں آرام کرنے اور صحت کا خیال رکھنے پر زور دیتا رہا۔ اتنے میں درگا بھابی چائے لے کر آئیں صرف ایک کپ دیکھ کر مجھے تعجب ہوا۔ میں نے پوچھا، آپ چائے نہیں پئیں گے۔ وہ عاجزی سے بولے صحت کا مسئلہ درپیش ہے۔ میں نے چائے، سگریٹ اور شراب تینوں چیزیں چھوڑ دی ہیں اور ان کو چھوڑ کر میں بہت مزے میں ہوں۔ اب زینہ چڑھتے وقت میری سانس نہیں پھولتی، رات کو نیند اچھی آتی ہے اور بھوک بھی لگنے لگی ہے۔ مہندر بڑے خوش نظر آرہے تھے۔ انہیں خوش دیکھ کر میں بھی بہت خوش ہوا۔ کسے پتہ تھا کہ ایک ایک چیز چھوڑتے ہوئے وہ اس واقعہ کے صرف چار دن بعد دنیا بھی چھوڑ دیں گے۔

سوچتا ہوں کہ اِن آخری سطور میں میں ان کی ساحرانہ شخصیت کے ایک اور نقش کو اجاگر کرتا چلوں۔ جس کی مثال دنیا میں شاذ ہی نظر آتی ہے۔ اس سنگین حقیقت کو آپ بھی پڑھ لیجیے۔ جسے ہزاروں آدمی جانتے ہیں۔ مہندر ناتھ کے قریبی دوست تھے مسٹر کپور جو فلمی دنیا کے ایک ماہر کیمرہ مین تھے اور جو برسوں سے مہندر جی کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کا کئی اہم مراحل میں ساتھ دیا۔ ایک دن کپور صاحب کو ہارٹ اٹیک ہوا۔ مہندر جی ان کی تیمارداری کر رہے تھے کہ انہیں بھی ہارٹ اٹیک ہو گیا۔ اور جب مہندر جی اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے تو ٹھیک اس کے پندرہ دن بعد اسی روز کپور صاحب بھی اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اسی بیماری سے اور ہسپتال کے اسی بستر پر۔

میں بھی اُن کے بہت قریب تھا۔ ہونا تو میرے ساتھ بھی یہی چاہیے تھا۔ لیکن ایسا لگتا ہے۔ میں کچھ زیادہ سخت جان ہوں۔ دیکھیے شائد مجھے کسی اور ساتھی کا ساتھ دینا ہے۔ ▲

عاقل ہرنالوی
جائنٹ سیکرٹری فلم رائٹرز ایسوسی ایشن بمبئی

میری نظر میں

مہندر ناتھ بطور جنرل سیکرٹری

زندگی کے طویل سفر میں کبھی کبھی کچھ ایسے موڑ بھی آجاتے ہیں۔ جہاں ہماری کسی ایسے اجنبی سے ملاقات ہوتی ہے جسے ہم نہ جانتے ہوئے بھی جانتے ہیں اور جانتے ہوئے بھی نہیں جانتے۔ پہلی ہی ملاقات میں ہم کچھ ایسے گھل مل جاتے ہیں جیسے ہماری اُن سے برسوں کی ملاقات ہو اور وہ ہمارے عزیز ترین دوستوں میں سے یا لواحقین میں سے ایک ہوں۔ آج کے مادہ پرست دور میں اسے محض ایک اتفاق یا خیالات کی یگانگت قرار دیتے ہوئے ہم ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر کوئی خاص توجہ نہیں دیتے۔ لیکن روحانیت کے پرستار جو مسئلہ تناسخ کے قائل ہیں، وہ اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہماری زندگی میں آنے والے نو وارد سے ہمارا پہلے سے ہی کوئی اٹوٹ رشتہ ہے۔ ہم اس سے پیشتر بھی زندگی کی کسی نہ کسی اسٹیج پر اُن سے مل چکے ہیں۔

میری مہندر ناتھ کے ساتھ پہلی ملاقات بھی کچھ ایسے ہی ماحول میں ہوئی تھی۔ غالباً برسات کے دن تھے۔ میں اُن دنوں شریمتی کملا بائی منگلورکر کی ایک زیرِ تکمیل فلم "انتظار کے بعد" لکھ رہا تھا۔ شام کے وقت جب زوروں کی برسات ہو رہی تھی، میں پردیپ پکچرز کے آفس سے نکلا اور ہاتھوں میں فائل لئے لیمنگٹن روڈ کے ایک ہوٹل پر وقت کاٹنے کے لئے بیٹھ گیا۔ اتفاق سے میرے سامنے کی میز پر ہی میرے مرحوم دوست رادھا کشن فلم آرٹسٹ، جو درحقیقت ایک اچھے خاصے ادیب تھے لیکن فلمی دنیا کے اس ناقدر شناس ماحول نے انہیں ایکٹنگ کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ مہندر ناتھ جی کے ساتھ بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ وہ ہم دونوں کا رسمی تعارف کرا کر چائے پینے لگے۔ اور ہم دونوں باتوں میں مشغول ہو گئے۔ میں اس سے پیشتر مہندر ناتھ جی کو صرف شکل و صورت سے ہی جانتا تھا۔ اور یہ بھی جانتا تھا کہ وہ شری کرشن چندر جی کے چھوٹے بھائی ہیں۔ لیکن کبھی متعارف ہونے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ ہم گھڑی بھر میں ہی کچھ ایسے گھل مل گئے۔ جیسے برسوں کی جان پہچان ہو۔ باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اس لئے ہمیں کافی دیر تک بات چیت کرنے کا موقع مل گیا۔ دوران گفتگو مجھے معلوم ہوا کہ وہ ترقی پسند ادیبوں کے ایک ادارہ کے جنرل سیکرٹری ہیں اور فلم رائٹرز ایسوسی ایشن میں بھی وہ نمایاں حصہ لیتے ہیں۔ اچانک لاہور کے زمانے کا تذکرہ چھڑتے ہی میں نے کہا۔ میں لاہور میں نارتھ ویسٹرن ریلوے کے ایک آفیشل آرگن "یونین ونگ" (اردو) کا چیف ایڈیٹر تھا۔ جسے 1942ء کے آندولن میں سر سکندر حیات منسٹری نے بند کر دیا تھا۔ اور اس طرح مجبوراً مجھے بمبئی آکر فلم لائن میں شمولیت اختیار کرنی پڑی۔ لاہور کی رہائش کے دوران میرا ادبی دلچسپی سے زیادہ سیاسی رجحان تھا اور میرا دائرہ سو فیصدی سیاسی تھا۔ ٹریڈ یونین کا ذکر چھڑتے ہی انھوں نے مجھے رائٹرز ایسوسی ایشن میں کام کرنے کی دعوت دی اور میں نے حامی بھر لی ــــ ..... یہ میری مہندر ناتھ جی سے پہلی ملاقات تھی۔

اِس کے بعد ہمارا ایک دوسرے سے ملنا جلنا شروع ہو گیا۔ لیکن فلمی دنیا کے گھناؤنے ماحول ..... زمانہ کے نشیب و فراز اور زندگی کی مجبوریوں نے ہمیں کبھی ایک ساتھ کام کرنے کا موقعہ نہیں دیا۔

اِس طرح ایک اپاہج کی طرح رینگتی ہوئی زندگی کا کارواں برسوں برسوں چلتا رہا۔ اور آخر کار ایک دن 1965ء کے فلم رائٹرز

ایسوسی ایشن کے سالانہ انتخاب میں ہماری ملاقات ہوئی۔ اور ہم نے ایک ساتھ کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن اسے قدرت کی ستم ظریفی سمجھئے یا وقت کی گردش دیکھتے ہی دیکھتے ایسے حالات پیدا ہو گئے جس نے ساری خوشگوار فضا کو ہی مکدّر کر دیا۔ سالانہ انتخاب کے دوران چند ہندی بھاشی ممبران کو شور و واویلا مچاتے دیکھ کر مہندر ناتھ جی نے انتخاب میں حصہ نہ لینے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ ممبران کی اکثریت شری راما نند ساگر کو پریذیڈنٹ لینے کے حق میں تھی لیکن چند ہندی والوں کی بے وقت کی راگنی نے انہیں یہ ارادہ ترک کرنے پر مجبور کر دیا۔ شری راما نند ساگر حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے انتخاب سے پیشتر ہی چل دیئے۔ اور الیکشن کچھ ایسی مکدّر فضا میں ہوا جس میں ٹریڈ یونین کے سارے قوانین و ضوابط بالائے طاق رکھ کر ہنسی مذاق اور تالیوں کی گونج کے درمیان ممبران کا انتخاب شروع ہو گیا۔ شری ورجیندر گوڑ ایسوسی ایشن کے صدر اور شری ہری ملک جنرل سیکریٹری چُن لئے گئے۔ مہندر ناتھ جی نے میرا نام جائنٹ سیکریٹری کے لئے تجویز کیا۔ اور یاروں نے تالیاں پیٹ کر اس پر رضامندی کی مہر ثبت کر دی۔ اس طرح میں ایک ایسے زمرے میں شامل ہو گیا جو میرے لئے محض ایک اجنبی کی حیثیت رکھتے تھے اور جن کی فطرت اور عادات و اطوار سے میں قطعی نا آشنا تھا۔

ابھی الیکشن ہوئے تین مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ ممبران کے سرکل میں جنرل سیکریٹری کے متعلق طرح طرح کی چہ می گوئیاں سی شروع ہو گئیں۔ جنرل سیکریٹری ہری ملک پر ایسوسی ایشن کی کچھ چیزیں ضبن کرنے کا الزام عائد کیا گیا۔ چنانچہ اسی وقت ایسوسی ایشن کی طرف سے ہم نے ایک جنرل باڈی میٹنگ طلب کی۔ جس میں شری ہری ملک کو ایسوسی ایشن سے الگ ہونا پڑا۔ اور ان کی جگہ اگلا انتخاب ہونے تک اتفاق رائے سے شری مہندر ناتھ جنرل سیکریٹری منتخب ہوئے اور اس طرح مجھے اُن کے ساتھ کام کرنے کا اولین موقع ملا۔ اور ہم ایک ساتھ کام کرنے لگے۔ ان دنوں ایسوسی ایشن کی مالی حالت کافی سے زیادہ کمزور تھی، بلکہ یوں کہیئے کہ بند ہونے کا امکان تھا۔ شری مہندر ناتھ جی نے جنرل سیکریٹری منتخب ہوتے ہی فوراً مینجنگ کمیٹی کی ایک غیر معمولی میٹنگ طلب کی جس میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ ایسوسی ایشن کی مالی حالت سدھارنے کے لئے کوئی Function کیا جائے اور سووینیئر نکال کر اور پروڈیوسرز سے اشتہارات لے کر روپیہ اکٹھا کیا جائے۔ چنانچہ مینجنگ کمیٹی کے سامنے پروڈیوسر سے اشتہارات لانے اور روپیہ اکٹھا کرنے کی ذمہ داری میرے کندھوں پر ڈال دی گئی اور دوسرے دن سے ہی میں نے کام کرنا شروع کر دیا۔ Function ختم ہوتے ہی سووینیئر کے جملہ اخراجات نکالنے کے بعد پروڈیوسرز سے لائے ہوئے اشتہارات میں سے ہمیں تقریباً بارہ ہزار روپے کا منافع ہوا۔ اور اس طرح ایسوسی ایشن کے اتہاس میں پہلی بار غالباً بارہ ہزار روپے بینک میں ڈال دیئے گئے۔ اس کے بعد مہندر ناتھ کی سرکردگی میں ہر دو برس کے بعد Function اور Souvenior کے ذریعے روپیہ اکٹھا کیا جانے لگا اور دن بدن ایسوسی ایشن کی مالی حالت مضبوط سے مضبوط ترین ہوتی گئی۔

میں نے شری مہندر ناتھ جنرل سیکریٹری فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کے ساتھ بطور جائنٹ سیکریٹری مسلسل نو برس تک اپنی خدمات سرانجام دیں ایک ہی عہدہ پر دونوں کا نو برس تک لگاتار ایک ساتھ کام کرنا معنی دارد۔ جبکہ ایسوسی ایشن کا الیکشن ہر برس ہوتا ہو اور اس میں ہر برس کئی طرح کے رد و بدل ہوتے ہوں۔ میں نے زندگی میں فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کے علاوہ کانگریس، سوشلسٹ پارٹی، Tenanto Association اور دوسری کئی تحریکوں میں کام کیا ہے لیکن آج تک میں نے اپنی ساری زندگی میں کبھی کسی تنظیم میں ایسا ہر دل عزیز منتظم ..... دور اندیش سیاست داں ..... فراخ دل دوست، انسان شناس اور بلند ترین انسان نہیں دیکھا۔ ہمارے دوستوں کے سرکل میں مرحوم مہندر ناتھ اور صرف مہندر ناتھ ہی ایک ایسی واحد شخصیت تھے۔ جو دوست دشمن دونوں کو ساتھ لے کر آگے بڑھنے کی اہلیت رکھتے تھے۔ جہاں تک انسان شناسی کا تعلق ہے ان میں یہ وصف کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ کام کے آدمی کو جو صحیح معنوں میں محنتی، ایماندار، وفادار اور کرم یوگی ہو۔ انہوں نے اسے ہمیشہ سینے سے لگا کر رکھا۔ اور اس کا زندگی بھر کبھی ساتھ نہیں چھوڑا۔ مثال کے طور پر شری وشنو مہرو ترہ، آنند رومانی، سی۔ ایل۔ کاوش۔ عزیز قیسی، مدھو سودن اور پنڈت مکھ رام شرما اُن کے پرانے ساتھیوں میں سے تھے۔ جنہیں موت کے سوا کوئی طاقت آج تک ان سے الگ نہیں کر سکی اور وہ برسوں قدم سے قدم ملا کر چلتے رہے۔ اکثر ایسی تنظیموں میں جہاں مختلف خیالات کے آدمی ہوں۔ ذرا ذرا سی بات پر پھوٹ پڑ جاتی ہے اور باہمی کشمکش سے تنظیم کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ لیکن مہندر ناتھ جی کے دور میں کبھی یہ بات دیکھنے میں نہیں آئی۔ یہ وہی کر سکتا ہے جس کا ظرف انتہائی بلند ہو اور وہ بحر بیکراں کی طرح اپنے وشال سینے میں زمانے بھر کا کوڑا کرکٹ جذب کرنے کی اہلیت رکھتا ہو۔ مختلف خیالات کے آدمیوں کو ایک لڑی میں پرو کر اپنے کارواں کو ایک باشعور میر کارواں کی طرح بحفاظت

وبخیریت منزلِ مقصود تک لے جانے والا ہی صحیح معنوں میں صحیح منتظم کہلا سکتا ہے۔ یہ اوصاف شری مہندر ناتھ میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔

مہندر ناتھ کا تقدیر پر اعتقاد نہیں تھا، اور نہ ہی وہ خدا کے قائل تھے اور حقیقت تو یہ ہے کہ وہ سو فیصدی مادہ پرست تھے روحانیت کے فلسفے کو وہ محض چند سر پھرے آدمیوں کا ایک خیالی جذبہ اور دل بہلانے کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے۔ دوسری طرف میں سو فیصدی خدا اور تقدیر کا قائل تھا اور مادہ پرستی کو چنداں اہمیت نہیں دیتا تھا۔ مہندر ناتھ پکے کمیونسٹ تھے اور میں جمہوری نظام کا قائل۔ دونوں کے خیالات میں زمین آسمان کا فرق . . . . . لیکن انسانیت کا رشتہ برقرار تھا۔ زندگی کے سفر اور ایسوسی ایشن میں، ایک ساتھ کام کرنے کے دوران ہمارا کبھی ٹکراؤ نہیں ہوا۔ آگے بڑھنے میں کبھی رکاوٹ پیدا نہیں ہوئی۔ میں اِسے مرحوم مہندر ناتھ کی کشادہ دلی، مخلصی، تعاون، انکساری اور دوست نوازی سمجھتا ہوں۔ اس لئے کہ کسی سوسائٹی کی کامیابی اس کے ممبران سے زیادہ اس کے راہ نما پر منحصر ہوتی ہے۔

مثال کے طور پر اِن نو برسوں میں ایک بار ایک کام چور، اور غیر ذمہ دار آفس سیکرٹری جو کام کی طرف سے تو لاپرواہ رہتا تھا لیکن تنخواہ بڑھانے کے لئے اس کا منہ ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔ اسے جب بھی موقع ملتا وہ Divideand Rule کی پالیسی اختیار کرتے ہوئے مہندر ناتھ جی کو ہمیشہ میرے خلاف اکسانے کی کوشش کرتا۔ کہ "غافل صاحب آپ کی پرواہ ہی نہیں کرتے"۔ "وہ تو اپنے آپ کو جنرل سکرٹری سمجھتے ہیں"۔ اور آپ کے کام میں رخنہ انداز ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ لیکن وہ ہمیشہ مسکرا کر ٹال دیتے اور جب کبھی ہماری ملاقات ہوتی۔ تو وہ ہمیشہ مجھ سے اس کا ذکر کرتے۔ لیکن ایک دن جیسا کہ مجھے بعد ازاں مہندر ناتھ جی سے معلوم ہوا۔ کہ ایک دن میری شکایت کرنے پر انھوں نے اسے آڑے ہاتھوں لیتے ہوئے کہا۔ کہ میں انہیں جانتا ہوں۔ آئندہ ان کی شکایت مجھ سے مت کیجئے گا۔ وہ آپ سے زیادہ وفادار ہیں۔ اس طرح انھوں نے اس کا منہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا۔

یہ اوصاف بہت کم لوگوں میں ہوتے ہیں۔ کسی ادارہ کو کامیابی سے چلانے کے لئے زید کی بات بکر سے اور بکر کی زید سے نہ کہہ کر اور دونوں کو اپنا ہم خیال بنا کر آگے بڑھنا ہی ایک دور اندیش راہنما کا اولین وصف اور صحیح قدم ہے۔ کسی بھی ادارے یا تحریک و تنظیم کے روحِ رواں میں جو بنیادی خوبیاں اور وصف ہونے چاہئیں وہ مہندر ناتھ جی مرحوم میں سرتاپا موجود تھے۔

کچھ دوستوں کا خیال ہے کہ مہندر ناتھ ایک منجھے ہوئے سیاسی کھلاڑی تھے اور وہ مختلف مواقع پر مختلف پینترے بدل کر سیاسی چال چلنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ مجھے یہ سب باتیں کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہیں۔ میں نے انھیں جس زاویۂ نگاہ اور جس چشمے سے بھی دیکھا وہ مجھے ایک سیاست داں سے زیادہ انسان نظر آئے۔ زندگی میں اگر کبھی بھی ان سے کوئی غلطی سرزد ہوئی، یا کبھی بھول چوک کر بھی زیادتی ہو گئی تو انھوں نے فوراً معافی مانگ کر اس کا اعادہ کرتے ہوئے اپنی فراخ دلی کا ثبوت دیا۔ اور اس میں کبھی شرم محسوس نہیں کی۔

جہاں تک انسانیت کا تعلق ہے میں نے شری کرشن چندر اور مرحوم مہندر ناتھ دونوں کے ساتھ کام کیا ہے۔ مہندر ناتھ جی کو میں نے بہت قریب سے دیکھا۔ جانچا۔ پرکھا مگر کرشن چندر جی سے اکثر دور ہی رہا۔ انہیں سمجھنے کا کبھی موقع ہی نہیں مل سکا۔ لیکن مہندر ناتھ جی کی موت کے بعد کرشن چندر جی سے کسی حد تک قربت حاصل ہوئی اور میں انہیں سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ میری ذاتی ناقص رائے کے مطابق ایک بین الاقوامی شخصیت کو سمجھنے کے لئے اور سمجھ کر فتویٰ دینے کے لئے ایک بہت بڑی سوجھ بوجھ کی ضرورت ہے جو میرے جیسے نا اہل آدمی کے بس کا روگ نہیں۔ لیکن پھر بھی میں اپنی ادنیٰ سی ذہانت اور معمولی سی سمجھ کے بل بوتے پر اتنا تو کہہ سکتا ہوں کہ مجھے مرحوم مہندر ناتھ بطور انسان کرشن چندر جی سے بہت بلند نظر آئے۔ چونکہ یہ میری ذاتی رائے ہے اس لئے اس پر وثوق کی مہر ثبت نہیں کی جا سکتی۔

قدرت کی یہ بھی ستم ظریفی ہے کہ ایک پرلے درجے کا خوددار۔ ترقی پسند قابل فنکار۔ اور بلند ترین انسان شری کرشن چندر جیسے انٹرنیشنل شخصیت کے مالک کا بھائی ہونے کی وجہ سے نفسیاتی طور پر وہ زندگی بھر کبھی پنپ نہ سکا اور لاکھ جد و جہد کرنے کے باوجود بھی وہ ناکام اور بے آس و مراد ہی دنیا سے چل بسا۔ اور اس طرح اس کے سینکڑوں ولولے اور ہزاروں آرزوئیں دل ہی دل میں دفن ہو کر رہ گئیں۔

وشنو مر ہوترا

سب کا ہمدم سب کا دوست

مہیندر ناتھ سے میری ملاقاتیں کہنے کو تو فلم رائٹرس ایسوسی ایشن سے ہی شروع ہوئیں۔ لیکن تھوڑے ہی دن بعد ایسا ہو گیا جیسے مہندر ناتھ میری زندگی میں ہمیشہ ہمیشہ سے ایک خاص مقام بنائے ہوئے تھے۔ زندگی میں سمائے ہوئے تھے۔

زندگی کی کوئی بھی الجھن، کوئی بھی مشکل، دن کا سکون اور رات کی نیند حرام کر دیتا تب بمبئی کے وسیع اور عریض شہر میں ایک ہی جگہ جا کر نظر ٹھہرتی تھی۔ دادر میں گوکل داس پاستا روڈ پر طرح طرح کے کاغذوں، کچھ فائیلوں، کتابوں اور رسالوں کے بیچ بیٹھے مہندر ناتھ پر۔

تلسی داس جی نے کہا ہے ؎

کہے ہوں تے کچھ دکھ کم ہوئی
کاہی کہوں یہ جانے نہ کوئی

کسی کے من کے دکھ کو اپنا دکھ درد سمجھ کر سننے والا بھی تو سنسار میں بڑی مشکل سے ملتا ہے۔

میری روح نے اس کی اپنائیت کو پہچان لیا۔ یہی وجہ تھی کہ زندگی کے کسی بھی مسئلے، کسی بھی مشکل کو مہندر ناتھ کے روبرو کھُل کر کہنے اور بات کر لینے سے وہ راحت وہ شانتی ملتی تھی جیسے کسی مسیحا نے کسی بیمار پر اپنا دستِ کرم رکھ دیا ہو۔

اور مہندر جی کا یہ پیار، یہ اپنائیت، یہ برادرانہ سلوک صرف میرے لئے ہی نہیں تھا۔ وہ سب کا ہمدم، سب کا دوست سب کا ساتھی تھا۔ سب کے درد کو اپنا درد بنا کر اسے دور کرنے کے اُپائے میں دل و جان سے جٹ جاتا تھا۔

جس طرح شری کرشن کی راس لیلا میں ہر ایک گوپی یہی محسوس کرتی کہ کرشن تو اس کی بانہیں تھامے، اُس کا سچا ساتھی اس کا سنگ سنگاتی بنا ہوا ہے، فلم رائٹرس ایسوسی ایشن کا ہر ممبر تمام فلمی ادیب بڑے چھوٹے قلم کے مزدور یا ادیبِ اعظم اس کے دوست احباب سب اسے اپنا سچا ساتھی، سچا دوست سمجھتے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ فلم رائٹرس ایسوسی ایشن کے ممبر، پوری ایسوسی ایشن کو مہندر ناتھ کے ہاتھوں میں سونپ کر مکمل طور پر بے فکر ہو گئے تھے۔

پھر تو فلم رائٹرس ایسوسی ایشن کا دوسرا نام مہندر ناتھ، اور مہندر ناتھ کا نام لیتے ہی فلم رائٹرس ایسوسی ایشن کے علاوہ دوسری بات خیال میں نہیں آتی تھی۔ پہلی مرتبہ جنرل سکریٹری چنے جانے کے بعد سے مرنے تک وہ فلم رائٹرس ایسوسی ایشن کے سیکریٹری بنے رہے۔

بارہ برس تک لگاتار کوئی دوسرا نام کسی بھی منہ سے پرپوز نہیں ہوا۔ کسی ممبر نے ایسوسی ایشن کی سیکریٹری شپ کے لئے اپنے نام کو تصور بھی نہیں کیا۔ اور مہندر ناتھ ہر برس اتفاق رائے سے منتری چنے جاتے رہے۔

فلم رائٹرس ایسوسی ایشن کے علاوہ بھی مہندر ناتھ کی کوئی شخصیت ہے، یہ فلم رائٹرس خاندان کا کوئی ممبر سوچتا نہ تھا۔ اور مہندر ناتھ سوچنے کا موقع بھی نہیں دیتے تھے۔ کسی بھی وقت کسی بھی لمحے دن ہو یا رات کوئی بھی ممبر ساتھی اپنے مسئلے اپنی پریشانی کو لے کر مہندر ناتھ جی کے پاس پہنچ جاتا تھا۔

اور مہندر ناتھ محض اخلاقاً نہیں بلکہ پوری ہمدردی کے ساتھ آنے والے کی پریشانی کو اپنی پریشانی سمجھ کر اس میں پوری طرح شامل ہو جاتے، اس مسئلے کو حل کرنے میں جی جان سے مصروف ہو جاتے۔ کبھی بھی انھوں نے اپنی ذاتی مصروفیت کو اُس آنے والے کی پریشانی کو سننے، سمجھنے اور خود کو اس کا ایک حصہ بنا لینے کے درمیان حائل نہیں ہونے دیا۔ کھانے پینے سونے اپنی روزی روٹی کے لئے کچھ وقت نکالنے کی بات تو دور یہاں تک کہ جسمانی مجبوری اور اپنی علالت کے دنوں میں بھی نہیں۔

دو تین سال سے جب سے ان کے دل نے اُن کے ساتھ زندگی اور موت کا کھیل شروع کر دیا تھا۔ تب بھی جب نہایت بے بسی کا عالم ہوتا۔ ڈاکٹروں کی طرف سے سخت تاکید کر دی جاتی تب ہی بستر پر پڑتے۔ لیکن تب بھی اپنی شکایتیں اپنی پریشانیاں لے کر آنے والے ممبر، رائٹرس، یا باہری دوستوں کے لئے ان کے کمرے کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوا۔

بیس مارچ کی صبح مہندر ناتھ کی موت کا پیغام لے کر آئی۔ اور انیس مارچ کی شام کوئی گھنٹے تک فلم رائٹرس کے آفس میں بیٹھ کر انھوں نے ایسوسی ایشن کی کئی ضروری فائلیں نپٹائیں۔ 21 اور 22 مارچ کے لئے ڈسپوٹ کمیٹی اور ایگزیکیٹو کمیٹی کی میٹنگ کے لئے خطوط پوسٹ کروائے۔

تاریخ 19 مارچ کی شام کئی گھنٹے میں نے ان کے ساتھ ایسوسی ایشن کے آفس میں گزارے۔ کئی مسئلوں پر ان کے ساتھ بحث ہوئی 23 مارچ کو فلم فیئر ایوارڈ کے اسکرین پلے اور ڈائیلاگس کا چناؤ کرنے والے رائٹرس کے پینل آف ججیز کا گیٹ ٹوگیدر کرنے کا فیصلہ کیا۔

اُس وقت نہ میں جانتا تھا نہ وہ جانتے تھے کہ ہونی کے غیبی پردے کے پیچھے موت کا فرشتہ کھڑا مسکرا رہا ہے کہ اب میٹنگ میں نہیں مہندر کے ماتم میں آنسو بہانے آؤں گا۔ 22 مارچ کی ایگزیکیوٹو میٹنگ مہندر ناتھ کی ماتمی سبھا بن جائے گی۔

اس ماتمی سبھا میں شری عباس کے یہ لفظ بھلائے نہیں بھولتے "کہ موت نے مہندر ناتھ کو ہم سے چھین کر محض درگا بھابی کو بیوہ نہیں بنایا بلکہ پوری فلم رائٹرس ایسوسی ایشن کا سہاگ اجاڑ ڈالا ہے اور اب فلم رائٹرس ایسوسی ایشن کو مہندر ناتھ ایسا ہر دلعزیز جنرل سیکریٹری مل سکے گا اس میں مجھے پورا شک ہے۔!!"

یوسف ناظم

وہ ہمارا تھا

عجیب شخص تھا، غم سے اُسے محبت تھی
چھپا کے دل میں وہ طوفان مسکراتا تھا
کسی کا دکھ ہو اسے اپنا دکھ سمجھتا تھا
شریکِ محفلِ غم ہو کے، بھول جاتا تھا
کہ خود اُسی کے غموں کا کوئی مداوا نہیں

کسی سے کچھ نہیں مانگا، کسی سے کچھ نہ لیا
تمام عمر قناعت پہ اُس نے تکیہ کیا
ملی تھی اُس کو جو دولت، وہ مسکراہٹ تھی
جو اُس کے ہونٹوں سے مرنے پہ بھی، الگ نہ ہوئی
عزیب شخص تھا، اُس کی یہی امارت تھی

پیار اُس کا تھا شیوہ، سبھوں کا پیارا تھا
جدا ہوا تو سبھی بولے وہ ہمارا تھا

شمیم زبیری
ایڈیٹر "کہکشاں" بمبئی

زمانہ سُنے گا بڑے شوق سے

صابردت پیارے ـــ

آج تو واقعی دل چاہ رہا ہے کہ تمہیں مبارک باد دوں!

لیکن اُس روز میں صرف چونکا تھا ـ جس دن میرے آفس میں بیٹھے بیٹھے تم نے اپنے منہ سے پائپ ہٹا کے اچانک فخریہ مسکراہٹ کے ساتھ انکشاف کیا تھا۔ "مہندر ناتھ نمبر نکال رہا ہوں۔ کچھ لکھو!" اور پھر اس انداز میں گھورتے رہے تھے جیسے اپنے اس کارنامے پر داد حاصل کئے بغیر نظریں نہیں ہٹاؤ گے۔

لیکن لاکھ چاہتے ہوئے بھی میں تمہیں "خوش" نہیں کرسکا تھا۔

مہندر ناتھ جیسے سیدھے سادے ادیب کا نمبر ـــ اور وہ بھی اس کی زندگی میں؛ بات ہی کچھ اتنی عجیب لگی تھی کہ مردہ پرست نہ ہوتے ہوئے بھی میں حیرت سے مسکرائے بغیر نہ رہ سکا تھا۔

اور آج جب مہندر ناتھ اس دنیا میں نہیں ہے ـــ تمہارا یہی "نمبر" "بروقت" محسوس ہونے لگا ہے۔ اب تم پائپ پی پی کے شوق سے جھنجھلاتے رہو ـ لیکن مردہ پرستی کی بوڑھی روایت منہ چڑانے سے باز نہیں آئے گی!

مہندر ناتھ کی زندگی میں اس کا نمبر نکالنے کا فیصلہ کرتے ہوئے تم شاید بھول گئے تھے کہ وقت بڑی ظالم چیز ہے ـ وہ کوئی ایسا رنگین مزاج نواب لگتا ہے جسے مہندر ناتھ جیسے سیدھے سادے ادیبوں کے مرثیے سننے میں مجرے کا سا لطف حاصل ہوتا ہے۔ وہ بھلا اس کی زندگی میں قصیدے کیسے برداشت کرلیتا۔ اور پھر وقت کو عیّاشی کے اس حق سے محروم کرنے والے تم کون ہوتے ہو؟ تم سے پہلے جس کسی نے یہ کوشش کی ہے اسے وقت نے صبر کرنے پر مجبور کردیا ـــ اور پھر تم تو ہو ہی صابر ـــ

کئی دنوں کے بعد تمہاری فرمائش پوری کرنے کا خیال آیا تھا ـــ لیکن لکھنے بیٹھا تو یوں لگا جیسے میں بھی وقت کو "مجرا" سنانے لگا ہوں۔ اور اپنے خیال پر اتنی شرمندگی ہوئی کہ لکھنے لکھانے کا ارادہ ہی ترک کردیا۔ ایک بات تو تم بھی مانو گے کہ مہندر ناتھ جس نے زندگی بھر وقت کا ـــ روایتوں کا مقابلہ کیا خود بھی یہ ہرگز گوارا نہ کرتا کہ لوگ اسی کے لئے مردہ پرستی کی روایت کو نئی زندگی بخشیں۔

مہندر ناتھ نے وقت سے سمجھوتہ کرکے اسے اس کے پسندیدہ مجرے نہیں سنائے ـــ روایات کی غلامی قبول نہیں کی ـــ وہ اگر ایسا کرسکتا تو ہارٹ اٹیک سے نہ مرتا۔

مہندر ناتھ اور ہارٹ اٹیک؟ اس میں بھی شاید مہندر ناتھ کا روایت شکنی کا جذبہ پوشیدہ تھا۔ ورنہ یہ بیماری تو عام طور پر صرف ان لوگوں کو ہوتی ہے جن کے پاس ڈھیر سارا کالا روپیہ ہو ـــ بنگلہ ہو ـــ گاڑیاں ہوں ـــ انکم ٹیکس کی الجھنیں

ہوں۔ لیکن غریب مہندر ناتھ کے پاس تو ان میں سے کچھ بھی نہیں تھا۔ بلکہ وہ تو شاید ان کے سپنوں سے بھی بے نیاز تھا۔ تب بھی اس نے ہارٹ اٹیک کو دعوت دی۔ شاید یہ ثابت کرنے کے لئے کہ کسی بیماری پر بڑے آدمیوں کا اجارہ نہیں ہو سکتا۔

مہندر ناتھ کے بارے میں جب بھی کبھی سوچتا ہوں۔ حیرت ہوتی ہے کہ وہ خود "بڑا آدمی" کیوں نہ بن سکا۔

وہ فلم رائٹر بھی تھا۔ ادب میں اونچا مقام بھی رکھتا تھا۔ سب سے اچھے خاصے تعلقات بھی تھے پھر بھی کار کی بجائے اس کے حصے میں بی۔ای۔ایس۔ٹی کی بسیں اور لوکل ٹرینیں کیوں تھیں۔

شاید اس لئے کہ پنجابی ہوتے ہوئے بھی اس نے جاٹ فلمسازوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے انھیں "ٹپّے" اور چٹکلے نہیں سنائے۔

یا شاید اس لئے کہ وہ اپنے احساس اور زندگی کے مشاہدے کو فلم کے فارمولوں میں ڈھال نہیں سکا۔

یا پھر شاید اس لئے بھی کہ وہ فلم والوں کی برادری میں "رشتہ داریوں" یا "پنجابی شناسائی" کا شناختی کارڈ لینا نہیں چاہتا تھا۔

مہندر ناتھ نے پنجاب سے بمبئی تک ۔ اور بمبئی سے فلم نگری تک مڈل کلاس کی نمائندگی برقرار رکھی۔ لیکن وہ شاید آخر وقت تک یہ محسوس نہ کر سکا کہ حقیقت سے آنکھیں چرا کے ماضی سے فرار حاصل کرنے والوں میں "مڈل کلاس" کا سفیر ناپسندیدہ شخصیت قرار دیا جا چکا ہے۔

مہندر ناتھ نے اپنے سیدھے سادے بش شرٹ اور لوکل ٹرین کے سیزن ٹکٹ کے سہارے دو نمبر کے امیروں سے ٹکر لینی چاہی لیکن ان سے صرف ہارٹ اٹیک ہی چھین پایا۔

میں نے مہندر ناتھ کو جب بھی اس کے "کلرک نما" حلئے میں دیکھا۔ ہمیشہ دل چاہا اس سے پوچھوں۔ "اگر تمہیں یہی حلیہ برقرار رکھنا تھا تو پنجاب کیا برا تھا۔ ؟" لیکن نہ جانے کیوں اس کے چہرے پر چھائے ہوئے اعتماد کو دیکھ کے جرأت نہیں ہوئی۔

ویسے بھی وہ آخر وقت تک فلمی مخمل میں "مڈل کلاس" کا پیوند بنے رہنے پر فخر محسوس کرتا تھا۔ فلمسازوں نے اُسے کبھی اچھا ادیب تسلیم نہیں کیا۔

جو اپنی برتھ ڈے تک یاد نہ رکھ پائے۔ جو امپورٹیڈ سگریٹوں کی خصوصیات پر بحث میں حصہ نہ لے سکے۔ جسے یہ تک پتہ نہ ہو کہ بمبئی میں انکم ٹیکس کا دفتر کہاں ہے۔ وہ بھلا فلم کی کہانی کیا خاک لکھ پاتا۔

فلم رائٹرس کی اہم میٹنگوں میں مہندر ناتھ مجھے ایسے ہی دکھائی دیا جیسے لائنس یا روٹری کلب کی پارٹیوں میں (جہاں سوٹ پہننا لازمی ہوتا ہے) آچاریہ ونوبا بھاوے کو بلوا لیا گیا ہو۔ خود غرضی کے محور پر گھومنے والے فلمسازوں کے ان لٹوؤں کے درمیان اس نے "اجتماعیت" کا مذاق کیا اور سب کو ہنستا چھوڑ کے اپنی انفرادیت سنبھالے رخصت ہو گیا۔

ایسے ادیب کے لئے کوئی کیا روئے ؟۔ اور کیا اس کی تعریف کرے ؟ لے دے کے اس کی عظمت کی گواہی دینے کے لئے اس کی تحریر ہی رہ گئی ہے ____ لیکن صابر پیارے۔ تمہیں کچھ اور صبر کرنا ہوگا ______ مردہ پرستی کے بھی اپنے کچھ اصول ہوتے ہیں۔ مہندر ناتھ کی شخصیت ابھی تک لوگوں کے ذہن میں زندہ ہے۔ مشکل تو یہ ہے کہ وہ بیحد پُرخلوص بھی تھا۔ اور کسی کے خلوص کو ذہن سے جھٹکنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ ______ ذرا سا صبر اور کرو۔

لوگوں کے ذہن میں اس کی شخصیت جب کچھ اور دھندلی ہو جائے گی۔ اور دیواروں پر جب صرف اس کی تصویریں رہ جائیں گی۔ تب اس کی تحریر زیادہ شدت سے اُبھرے گی۔ پھر نہ صرف پنجاب اور ہندوستان بلکہ شاید بمبئی کے فلم والوں کو بھی اس بات پر فخر کرنے کا موقع مل جائے گا کہ اتنا عظیم ادیب کبھی ان کا تھا۔

تب تک انتظار کے ساتھ ساتھ صبر کرو۔

تمہارا اپنا
شمیم زبیری

ستیش بھٹناگر

مہندر ناتھ نہیں مرے

کون کہتا ہے کہ مہندر ناتھ مر گئے، مرتے وہ ہیں جو کچھ نہیں ہوتے، مہندر ناتھ تو بہت کچھ تھے۔ پھر وہ کیسے مر سکتے ہیں؟ لیکن لیکن پھر مہندر ناتھ کہاں ہیں۔ مجھے کیوں نظر نہیں آتے۔ ان کی کرسی پر کوئی اور براجمان کیوں ہے۔ ان کے گھر ان کی بیوی اکیلی اداس اور غمزدہ کیوں نظر آتی ہے؟

شاید میرے دوستوں نے مجھے سچی رپورٹ دی تھی کہ مہندر ناتھ کا دیہانت ہو گیا۔ اس وقت میں نے انہیں جھوٹا کہا تھا۔ خبر کو غلط قرار دینے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ لیکن ایک اٹل حقیقت کے آگے کسی کی کیا بساط! ؟ گو کہ مہندر ناتھ کو نذر آتش کر دیا گیا۔ مگر دل نہیں مانتا کہ ایسا ہوا دل تو ببانگِ دہل یہ کہتا ہے کہ مہندر ناتھ نہیں مر سکتے۔ کیونکہ مرتے وہ ہیں جو کچھ نہیں ہوتے۔ یہ تو بہت کچھ تھے۔

مہندر ناتھ سے میری پہلی ملاقات کا دھندلا سا خاکہ ذہن میں ابھر رہا ہے۔ محبت سے بھری دو آنکھوں نے میرا خیر مقدم کیا تھا۔ خلوص سے بھرپور مسکراہٹ نے کچھ دیر کے لئے میرے غم بھلا دئے تھے۔ ذہانت کی چمک لئے چوڑی سی پیشانی نے کہا تھا۔ آؤ ستیش آؤ مجھ سے ملو۔ مجھے سمجھو، مجھے پڑھنے کی کوشش کرو۔ اور جب لب ہلے تو لفظوں کے دام میں دل پھنس گیا۔

اس دن سے جب بھی ان لبوں سے نکلے لفظ میرے کانوں سے ٹکراتے دل تک پہنچ ہی جاتے اور دل کہہ اٹھتا خلوص کا جواب خلوص سے دو۔ پھر میں ایسا ہی کرتا۔ اکثر ملاقاتیں ہوتیں باتیں ہوتیں۔ جب تک میں ان کے سامنے ہوتا لگتا کہ میں میرے اپنے سے بات کر رہا ہوں۔

اس نفسا نفسی کے دور میں اگر کسی سے بات کرتے ہوئے اپنے پن کا احساس ہو تو سامنے والے کی عظمت کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے۔ مہندر ناتھ کے اس خاص وصف کی ستائش ایک میں ہی نہیں، ہر وہ شخص کرے گا جو مہندر ناتھ سے بار بار ملا ہو اُنہیں سمجھنے کی سعی کیا ہو۔ انہیں اوصاف کی بنا پر مہندر اپنے دوستوں، عزیزوں اور رشتہ داروں کے دل و دماغ پر ہمیشہ چھائے رہیں گے۔ جب بھی فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کی کوئی میٹنگ ہو تو ان کی یاد ضرور آئے گی۔

ان کی آخری ملاقات بھی مجھے اچھی طرح یاد ہے مہندر نے مجھے مسکراتے ہوئے رخصت کیا تھا۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ ان سے میری یہ آخری ملاقات ہے۔ آج جب سوچتا ہوں، تو تصور میں مہندر کی میرے لئے وقف وہ مخصوص مسکراہٹ یہ کہتے ہوئے سامنے آجاتی ہے کہ

یاد میری سنبھال کر رکھنا
میرا کیا، میں رہا رہا نہ رہا!

واقعی میں نے اس یاد کو اپنے ذہن کے ایک خاص گوشے میں سنبھال کر رکھا ہے۔ کیونکہ یہ یاد، یاد ہی نہیں ایک مثال ہے خلوص و

محبت کی، اپنائیت اور انسانیت کی ۔

مجھے اس وقت وہ مثالی واقعہ بھی یاد آرہا ہے جو اپنی مثال آپ ہے ۔ایک دن ہوا یوں کہ میں اپنے گھر پر کسی فلم کی اسکرپٹ پر کام کر تے بیٹھا تھا ۔ مجھے اطلاع ملی کہ مہندر ناتھ کو دل کا دورہ پڑا ہے ۔میں نے اپنا کام چھوڑ کر "دادر" کی راہ لی ۔اور جب میں چھبیر اپلا بلڈنگ میں واقع مہندر کی کھولی پر پہنچا تو مہندر لیٹے ہوئے اپنی مسکراہٹ سے اپنے آپ کو اور ہم ملنے والوں کو بہلا رہے تھے ۔ اطراف میں جمع شدہ احباب کی اکثریت فلم رائیٹرز ایسوسی ایشن کے ممبران کی ہی تھی ۔میں بھی ان مزاج پرسی کو آئے احباب میں شامل ہوگیا ۔میں نے دیکھا کہ اس گھر کی فضا میں قطعاً تبدیلی نہیں آئی تھی ۔مہندر حسبِ سابق اپنے ممبران کے مسائل پر بات کر رہے تھے ۔باتوں میں وہی شگفتگی اور ہمدردی تھی ۔ ہاں بھابی جی ضرور پریشان سی لگ رہی تھیں لیکن اپنے مہمانوں کا پورا پورا خیال رکھ رہی تھیں ۔

مہندر نے بسترِ مرگ پر بھی ایسوسی ایشن کے ممبران کی الجھنوں کو سلجھانے کی کوشش کی ہے ۔لیکن اپنے کرب اپنی تکلیف کا کسی بھی قریبی شخص کو یہ احساس تک نہ ہونے دیا کہ اس ایسوسی ایشن کے لئے مہندر نے بہت سی قربانیاں دی ہیں ۔بہت سارا وقت صرف کیا ہے ۔ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مہندر اپنی آخری سانس تک بھی ایک شانِ بے نیازی کے ساتھ فلم رائیٹرز ایسوسی ایشن کے روحِ رواں رہے ۔ اس سے پہلے انجمن ترقی پسند مصنفین کے روحِ رواں تھے ۔شروع کے کچھ دن یہ بنّے بھائی (سجاد ظہیر مرحوم) کے ساتھ مل کر کام کیا کرتے تھے ۔پھر ان کے بمبئی سے دہلی منتقلی کے بعد مہندر ہی اتنی عظیم ترین تحریک کو چلاتے رہے ۔گو کہ ان کے بعض ساتھیوں نے اس انجمن کے لئے بہت سے اچھے کام کئے ۔پورے خلوص کے ساتھ ، ساتھ دیا ۔لیکن ان سب میں مہندر ناتھ اس لئے نمایاں نظر آتے ہیں کہ انھوں نے اس تحریک کے لئے کبھی قربانیاں دیں ۔اور تمام ممبران میں اتحاد کی کڑی بنے رہے ۔مہندر ناتھ اپنی زندگی میں مخدوم کے اس شعر پر عمل کرتے نظر آتے تھے

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

سب کو ساتھ لے چلنے کی عادت نے انھیں زندگی کے کئی میدانوں میں اپنے ہم عصروں سے پیچھے چھوڑ دیا ۔مگر مہندر کو ان تمام باتوں کی قطعاً پرواہ نہیں تھی ۔وہ کام ، کام اور صرف کام کرنے کے قائل تھے اور آخر دم تک کام کرتے رہے ۔

مہندر کی محبتیں اور خلوص اپنے ساتھی رائیٹرز کی حد تک نہیں تھا ۔ان کی ہمدردیاں اور محبتیں غریب طبقے اور متوسط طبقے کے ساتھ زیادہ تھیں ۔مزدور اور کسان ان کی کہانیوں کے ہمیشہ موضوع رہے ہیں اور متوسط اور غریب طبقے کی نمائندگی ان کی تحریریں کرتی ہیں ۔ان تحریروں میں مسائل اور بڑی حد تک ان کا حل بھی ہمیں ملتا ہے اور کہیں کہیں مہندر نے زندگی کو جس ڈھنگ سے دیکھا اسی ڈھنگ سے پیش کر دیا ۔بہر حال یہ جو اپنی حقیقی زندگی میں تھے وہی تحریروں میں نظر آتے تھے ۔ان کے مشاہدے گہرے اور تجربات تلخ تھے ۔کہانی کہنے کا فن انھیں خوب آتا تھا ۔معمولی سے معمولی موضوع پر جب یہ لکھتے تھے تو وہ معمولی موضوع معمولی نہیں رہتا بلکہ غیر معمولی بن جاتا تھا ۔زبان کی روانی ، انداز کی شگفتگی اور جملوں کی خوبصورتی قاری کو ان کی تحریریں پڑھنے پر مجبور کر دیتی تھیں ۔

بہر حال ایک ادیب میں یہ خوبی بہت کم ہوتی ہے کہ وہ اچھے ادیب کے ساتھ ساتھ اچھا آدمی بھی ہو مگر مہندر میں یہ خوبی موجود تھی ۔بحیثیت ادیب وہ اچھے تھے اور بحیثیت انسان بھی اچھے !!

اسی لئے تو میں کہتا ہوں ـــــ مہندر ناتھ مرے نہیں ۔مرتے وہ ہیں جو کچھ نہیں ہوتے ۔مہندر ناتھ تو بہت کچھ تھے ـــــ بہت کچھ ـــــ !! ٭

آر۔ کے۔ مڈھا

پروڈیوسر، ڈائرکٹر

تین ملاقاتیں

مہندر ناتھ جی کے دیہانت کی خبر سن کر ہر وہ شخص افسردہ ہوا جو مہندر ناتھ جی کو تھوڑا بہت بھی جانتا تھا۔ جہاں وہ رہتے تھے وہاں کے لوگ بچوں کی طرح بلبلا رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے اُن کا ہمدرد یا مددگار ان سے چھین لیا گیا ہو۔ ادبی دنیا و فلمی دنیا سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی اداس اور مایوس دکھائی دے رہے تھے۔ جہاں دیکھو ایک ہی ذکر تھا۔ "مہندر ناتھ" اور یہ کہ مہندر ناتھ آج ہم میں نہیں رہے۔ لیکن کیا یہ سچ ہے؟

آج بھی ہم تھامس ہارڈی۔ جارج برنارڈ شا۔ پریم چندر۔ منٹو وغیرہ کی لکھی ہوئی کتابیں پڑھتے ہیں۔ کیا کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ مر چکے ہیں؟ مہندر ناتھ جی کے بارے میں جتنا لوگ آج جانتے ہیں شاید اُن کی زندگی میں اتنا نہ جانتے ہوں۔ وہ صحیح معنی میں ایک کلاکار تھے۔ اور کلاکار کبھی نہیں مرتا۔

میری مہندر ناتھ جی سے صرف تین ملاقاتیں ہوئیں۔ ایک بار کرشن چندر جی کے گھر پر ـــــ مہندر جی کا اور میرا کام ایک ہی افسر کے پاس اٹکا تھا۔ کرشن جی نے ہم دونوں کی مدد کرنے کے لئے اس افسر کو گھر پہ دعوت دی تھی۔ کرشن جی نے کھانے کے دوران سرسری طور پر اس افسر سے ہم دونوں کا تعارف کروایا۔ شاید اتنا ہی کافی تھا۔ کھانے کے بعد میری اور مہندر جی کی قلیل سی گفتگو ہوئی۔ مہندر جی کہنے لگے۔ "یار تمہارا کام ہو جائے۔" وہ بھول گئے کہ ان کا بھی کام اٹکا ہوا تھا اور وہ مجھ سے زیادہ ضرورت مند تھے۔

ان سے دوسری ملاقات ہوئی جب انہیں شمشان گھاٹ لے جایا گیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ مسکرا رہے ہوں۔ اور کہہ رہے ہوں۔ "میں مرا نہیں یار" اور ٹھیک اسی وقت کرشن چندر جی میرے قریب آئے۔ کہنے لگے۔ "دیکھو۔ کیا آرام سے سو رہا ہے۔"

مہندر ناتھ سے میری تیسری ملاقات، صابر دت نے کرائی۔ اُن کی کچھ کتابیں، کچھ کہانیاں مجھے پڑھنے کو دیں۔ مہندر ناتھ کس قسم کا انسان ہے۔ کمیونسٹ ہو نہیں سکتا۔ سمراج وادی قطعی نہیں۔ ہاں تھوڑا بہت سماج وادی ضرور ہے۔ لیکن حقیقتاً کیا ہے؟ جہاں تک میں انہیں سمجھ سکا ہوں وہ محض ایک انسان ہے جس کے دل میں درد ہے۔ جو نہیں چاہتا کہ غریب لوگ نالی کے کیڑوں کی طرح رینگتے رہیں۔ امیروں کے آگے ہاتھ پھیلاتے رہیں شاید اسی لئے انہیں غریبوں سے نفرت ہے، خود سے بھی اور سماج سے بھی۔ انہیں سب سے نفرت ہے۔ پھر بھی یہ انسان کڑوا نہیں میٹھا ہے۔ لوگوں کی مدد کرتا ہے۔ خود غرض نہیں۔ کوئی ذاتی خواہش نہیں۔ وہ خودداری کے ایک ایسے مقام پر آ پہنچا ہے جہاں ہار یا جیت یکساں نظر آتی ہے شاید اسی لئے انہیں سمجھنا اتنا آسان نہیں۔ اُن کی ایک مشہور کہانی 'ڈیڑھ روپیہ' قابل غور ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ خود کو ڈھونڈھنے کی کوشش میں انھوں نے سچائی ڈھونڈلی ہو ـــــــ وا اچانک میرے ذہن میں یہ خیال بجلی کی طرح کوندا کہ ان سکوں کی میل تو شاید پانی کے دھونے سے اتر جائے لیکن ان دلوں کی میل کیسے اترے گی؟ ▲

خلش جعفری
مدیر "انقلاب" بمبئی

میرے، مہندر ناتھ جی!

سدا مسکراتا چہرہ بھرا بھرا جسم، اوسط سے ذرا نکلتا ہوا قد، گورا رنگ جو گردش زمانہ کی "دھوپ" سے کچھ سنولا سا ہوگیا تھا ــــ یہ تھے مہندر ناتھ ــــ میرے لئے مہندر جی!

پہلے "سرائے کے باہر" میں فلم کے ہیرو کی حیثیت سے دیکھا، پھر انجمن ترقی پسند مصنفین کی ہفتہ وار نشستوں میں "ادبی ہیرو" کی حیثیت سے! کیا زمانہ تھا۔ انجمن "معتوب"، انجمن کے اراکین اتنے پُرعزم اور سرگرم کہ ہر ہفتے دیو دھر ہال کھچا کھچ بھر جاتا! اور دیر سے آنے والوں کو جوتوں پر بیٹھنا پڑتا۔ کرشن چندر بھی دو چار بار تو اس پچھلی صف میں بیٹھے ہوں گے کیونکہ چار بنگلہ ورسوا میں رہتے تھے اور دیو دھر ہال تھا (اب بھی ہوگا) تقریباً بیس میل دور اوپیرا ہاؤس کے قریب۔

میٹنگ شروع ہوتی مہندر ناتھ کی پچھلے ہفتے کی روداد سے ــ کچھ ایسے پیارے انداز میں تحریر کی ہوئی کہ سب انتہائی "خاموشی" سے سنتے۔ روداد سن کر پچھلی میٹنگ کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ــــ اگر اس کا فائل صحیح سلامت ہو تو اُسے شائع کردیا جائے ــ مہندر کے نیچرل رائٹر ہونے کا "ایمان" اس سے اور پختہ ہو جائے گا۔

مہندر سے اس وقت "ملاقات" تھی بعد میں ان سے اور کرشن جی سے قربت اور دوستی کا فخر حاصل ہوا۔

دیوالی مہندر کے ہاں تاش کھیل کر منائی جاتی، بڑی رونق ہوتی، کئی بار دوسرے دوستوں کے ہمراہ میں نے بھی حاضری دی۔

ترقی پسند مصنفین کے ہفتہ وارانہ اجلاس کیا بند ہوئے، ادیبوں کا ایک دوسرے سے ملنا جلنا جیسے ختم سا ہوگیا۔ کئی برس بعد میٹنگوں کا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہوا، عباس صاحب کے ہاں۔ ظاہر ہے مہندر یہاں بھی "اگلی صف" میں ہوتے پھر یہ سلسلہ بھی ختم ہوگیا اور مہندر سے اکثر ملاقاتیں ساحر صاحب کے ہاں ہوتیں ــــ وہ ہمیشہ ہشاش بشاش نظر آتے۔ "محفلِ یاراں" میں کھل جاتے، ایسے باغ و بہار ہو جاتے کہ وقت کے گزرنے کا احساس تک نہ ہوتا اور گھنٹے منٹوں کی رفتار سے بیت جاتے۔ آج احساس ہو رہا ہے، بیتے دن کتنے خوب صورت تھے۔

مہندر کو ہر حال میں خوش رہنے کا "گُر" آتا تھا۔ یہ راز مرحوم کسی کو نہیں بتلا گئے۔

فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کی تو وہ "جان" تھے۔ ان کے بغیر اس ایسوسی ایشن کا کوئی شاید تصور بھی نہ کرسکتا ہوگا۔

مہندر سے آخری سے "پہلے" کی ملاقات فیمس سنے لیبارٹریز میں ہوئی ــ بڑی یادگار تھی وہ شام ــ اس شام لیباٹری کے چھوٹے سے سینما میں دوستوں کو ایک ڈاکومینٹری فلم دیکھنے کے لئے مدعو کیا گیا تھا۔ تقریباً پانچ بجے کرشن جی دفتر تشریف لائے اور اردو "رسم الخط" کے مباحثے پر کچھ باتیں کیں اور ڈاکومینٹری دیکھنے کے لئے مدعو کیا۔ کچھ دیر بعد ظ۔ انصاری آئے۔ انھوں نے تصدیق

چاہی کہ ڈاکومینٹری دیکھنے آرہے ہو یا نہیں ـــــــ درمیان میں ایک گلی ہی تو تھی، میں وقت سے کچھ پہلے ہی پہنچ گیا سب جانے پہچانے چہرے لبارٹری کے سامنے کھڑے تھے۔

فلم شروع ہوئی اور ختم ہوگئی ـــــــ کرشن جی پر ڈاکومینٹری۔ مہندر نے بنائی تھی، فلم کرشن جی کی زندگی کا جیتا جاگتا مرقع۔ اور اس کے ہر منظر میں فنکار مہندر ناتھ کی جھلک ـــ میں مہندر کو اس کا ڈائرکٹر نہیں کہوں گا نہ پروڈیوسر ـــ اس لئے کہ ان اصطلاحوں سے بلند اس میں عظیم فنکار کی زندگی کو فنکار مہندر نے سلولائیڈ کا جامہ پہنایا تھا۔

مہندر۔ کرشن چندر کے چھوٹے بھائی تھے ـــ بہت سے لوگوں کو یہ بات بعد میں معلوم ہوئی، شاید بہت سے لوگوں کو جنہوں نے صرف ان دونوں کی تصانیف پڑھی ہیں یہ بات اب تک نہ معلوم ہو ـــ لیکن یہ حقیقت ہے کہ کرشن جی کی عظمت کے باوجود اور ان سے جنون کی حد تک محبت اور عقیدت کے باوجود (جو ہم میں سے بہت سوں کو ہے) مہندر نے اپنی انفرادیت کا سکہ جما لیا تھا اور سب مہندر کو مہندر ناتھ ہی کے نام سے جانتے اور "مانتے" تھے ـــ مہندر کا نام آتے ہی ان کی شخصیت اور انفرادیت ابھر آتی تھی۔

مہندر سے آخری ملاقات المیہ ثابت ہوگی یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

ساحر صاحب کی برتھ ڈے اُس بار شائد دو سال بعد منائی جا رہی تھی ـــ صرف قریبی دوست موجود تھے۔

مَیں "پرچھائیاں" پہونچا تو کرشن جی، مہندر اور سلمٰی باجی موجود تھیں ـــ مہندر نے مجھے دیکھتے ہی کرشن جی کی طرف دیکھ کر کہا ـــ لو وہ آگئے جی ـــ معلوم ہوا۔ ان دنوں جب مَیں رخصت پر تھا (بیماری کے باعث) تو کرشن جی دفتر تشریف لائے تھے۔

محفل جمی، باتیں شروع ہوئیں، پتہ نہیں کس بات پر کرشن جی نے مہندر کی طرف دیکھا اور کہا۔ اس کی صحت اب پہلے سے اچھی ہے (مہندر کو ایک بار ہارٹ اٹیک ہو چکا تھا اور وہ کافی احتیاط برتنے لگے تھے) سلمٰی باجی نے بڑے خلوص سے کہا ـــ خدا سب کو اچھا اور تندرست رکھے ـــ اس کے آٹھ یا دس دن بعد صبح اخبار دیکھا تو دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔ مہندر کے انتقال کی چھوٹی سی خبر تھی ـــ یقین نہیں آیا ـــ یقین کیسے آتا؟ کیا مہندر اتنی جلد ہم سب سے رخصت ہو جائے گا۔ مگر وہ آخری بار خدا حافظ کہہ چکا تھا ـــ کلیجے پر پتھر رکھنا ہی پڑا۔

"مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے" ـــ اور مہندر چلے گئے تو ادبی دنیا اداس تھی ـــ لیکن مہندر تو ہمارے دلوں میں، ہماری یادوں میں زندہ ہے اور اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

مہندر، میں آج تمہیں "سوکھی آنکھوں" سے خراج عقیدت پیش کر رہا ہوں۔ تم قبول کرو تو مَیں سمجھوں گا تم نے ایک معمولی دوست کا سلام اپنی سدا بہار مسکراہٹ کے ساتھ قبول کر لیا ہے۔ ▲

وہ ہمدرد سب کا وہ سب کا رفیق
شریکِ غمِ دوستاں چل بسا

آغا شورش کاشمیری

اوتار کرشن اگروال

ایک مہان آتما

لیکھک مہندر ناتھ سے میرا کوئی خاص تعارف نہیں تھا۔ ان کی رچناؤں میں سے کچھ ایک ناول اور دو تین کہانیاں میں نے پڑھی تھیں۔ کچھ خاص تاثر بھی نہیں لیا تھا۔ سماج کے معمولی کرداروں کے سکھ دکھ سے تعلق رکھنے والی جیسی کہانیاں ہوتی ہیں ویسی ہی معمولی کہانیاں تھیں۔ مہندر جی کے دیہانت کے بعد آج سوچتا ہوں اُن کا ادب اگر معمولی ادب تھا تو منشی پریم چند کے ادب کو کیا کہوں، شرت چندر چیٹرجی کے ادب کو کیا کہوں؟ اور گورکی کے ادب کو کیا کہوں؟

ہم ہندوستانیوں کا ایسا ہی مزاج ہے۔ جیتے کو چند روٹیاں دیتے ہوئے من کسمساتا ہے اور مرنے کے بعد شرادھ پورے سے کرتے ہیں کیونکہ ہماری زندگی کی فلاسفی میں سنسار سے زیادہ سورگ کی اہمیت ہے۔ جینے سے زیادہ نجات کی۔ لیکن مہندر جی کے پاؤں دھرتی پر تھے۔ انھیں جیون سے پیار تھا اس لئے انہوں نے جیون کے آس پاس بکھرے ہوئے کرداروں کو اپنے ادب کی بنیاد بنایا اور جیون بھر جیون کو سنوارنے اور سگھڑ بنانے کی کوشش کرتے رہے۔

وہ فلم رائیٹرس ایسوسی ایشن کے دس برسوں تک جنرل سکریٹری رہے اور ہمیشہ اتفاق رائے سے چنے جاتے رہے۔ یہ اس معمولی انسان کی غیر معمولی مقبولیت تھی۔ نفسا نفسی کے اس یُگ میں جس میں ہر انسان ایک دوسرے کا نکتہ چیں اور مخالف ہے جنرل سکریٹری کے لئے اُن کا مخالف کوئی نہیں تھا۔ کیونکہ فلم رائیٹرس ایسوسی ایشن کا ہر رکن یہ محسوس کرتا تھا۔ مہندر جی کے روپ میں ایسوسی ایشن کو ایک مکمل ایماندار اور جاں نثار سکریٹری ملا ہوا ہے۔ اور دیانت داری سے سوچنے والا ہر آدمی یہ بھی قبول کرے گا کہ فلمی لیکھک کے روپ میں مہندر ناتھ کی ناکامیوں کی سب سے بڑی وجہ ان کی سکریٹری شپ ہی تھی۔ فلمی موضوعات کی گہرائیوں میں نہ ڈوب سکنا اور تکنیک کی باریکیوں سے ناواقفیت نہیں تھی۔ وہ فلم کی تکنیک بھی جانتے تھے اور فلم کی کامیابی کے اسباب سے بھی واقف تھے۔ اس سلسلے میں میں ایک واقعہ کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ گرودت فلمز کی بنائی ہوئی فلم "یہ گلستاں ہمارا" کے خلاف مجھے اپنی کہانی کے چوری ہو جانے کی شکایت تھی۔ فلم کی ریلیز سے چار پانچ دن پہلے کسی نے پروڈیوسر آتمارام کو بھڑکا دیا کہ اگروال عدالت سے فلم کی ریلیز رد کرنے کا (انجنکشن) حکم لے آئے گا۔ آتمارام جی نے مہندر جی کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ "آپ اپنے لیکھک کو عدالت میں جانے سے روک لیں نہیں تو میں برباد ہو جاؤں گا۔" مہندر جی نے مجھے پکارا اور میں نے انھیں یقین دلایا کہ ایگزیکیٹو کے ممبر ہونے کی حیثیت سے میں عدالت میں نہیں جاؤں گا۔ میں اپنی ایسوسی ایشن کا اپمان نہیں ہونے دوں گا۔ لیکن پروڈیوسر آتمارام نے سب کو اندھیرے میں رکھ کر ممبئی ہائیکورٹ سے میرے خلاف انجنکشن آرڈر لے لیا۔ جس قدم کے اٹھانے سے مجھے روکا گیا تھا وہی پروڈیوسر نے اٹھا لیا۔ اپنے حلف نامے میں پروڈیوسر نے عدالت سے درخواست کی تھی کہ اگروال نے فلم رائیٹرس ایسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری مہندر ناتھ اور راج مہرہ کے سامنے مجھے دھمکی دی

ہے کہ میں عدالت سے انجنکشن آرڈر لے کر فلم "یہ گلستاں ہمارا"، کا ریلیز رکوا دوں گا اور اس کا مطلب ہے لاکھوں روپیوں کا نقصان۔ عدالت اس غلط بیانی کا شکار ہو گئی۔ اور میرے خلاف انجکشن آرڈر دے دیا گیا۔ میرا تن بدن جل اٹھا۔ بدحواسی کی اس حالت میں پہلا فون میں نے مہندر جی کو کیا۔ ظاہر ہے کہ میں نے اس وقت پیار کی باتیں نہیں کی تھیں۔ لیکن مہندر جی کی آواز میں کوئی غصہ نہیں تھا۔ بلکہ حیرانی اور افسوس تھا۔ انھوں نے کہا تم گھبراؤ مت میں جوابی حلف نامہ دوں گا کہ تم نے کوئی دھمکی نہیں دی تھی۔ پروڈیوسر جھوٹا ہے۔ انھوں نے جو کہا تھا وہ کیا۔ اس واقعہ کا سب سے روشن پہلو یہ ہے کہ جب مہندر جی حلف نامہ دے کر عدالت سے باہر نکلے تو میں ٹیکسی کی طرف بڑھا۔ کہ مہندر جی آرام سے گھر پہنچ جائیں۔ لیکن انھوں نے ٹیکسی میں بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ اور کہا کہ تم بے انصافی کے خلاف لڑ رہے ہو۔ میں اس لڑائی میں تمہاری مدد کرنے آیا ہوں تم پر بوجھ بننے کے لئے نہیں۔ کافی منت سماجت کرنے کے باوجود وہ اپنی بات پر اڑے رہے۔ اور بس سے ہی واپس آئے۔ آپ ہی بتایئے ایک معمولی لیکھک کے لئے اتنا درد بھرا دل رکھنے والا انسان کیسے ایک کامیاب فلمی لیکھک بن سکتا تھا۔

فلم رائیٹنگ خالص بیوپار ہے — اور بیوپاری صرف اپنا ہوتا ہے کسی دوسرے کا نہیں ہوتا۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ بیوپاری اپنے سے زیادہ کامیاب بیوپاریوں کی دشمنی مول نہیں لیتا۔ جبکہ مہندر جی کو لیکھکوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے قدم قدم پر پروڈیوسروں کے غصے اور مخالفت کا ہدف بننا پڑتا تھا۔

ایک اور واقعہ یہ ہے کہ ایک پروڈیوسر کسی بدیسی فلم کی کہانی چرانے کے جرم میں پھنس گیا۔ اس نے مہندر جی کو بلا کر کہا میں آپ کو پچیس ہزار روپے دوں گا۔ آپ میرے رائیٹر کا نقل کیا ہوا اسکرپٹ سال دو سال پرانی تاریخ میں رجسٹر کر لیجے۔

آٹھ روپے کی قمیض اور بارہ روپے کی پینٹ پہننے والے فلم رائیٹرس ایسوسی ایشن کے اعزازی جنرل سکرٹری کے لئے پچیس ہزار روپے کا لالچ کوئی معمولی لالچ نہیں تھا۔ لیکن مہندر جی اس چھلاوے بھلاوے میں نہیں آئے۔ اور اس پروڈیوسر کو کئی لاکھ روپے بدیشی کمپنی کو دے کر سمجھوتہ کرنا پڑا۔

ایسے کئی واقعات ہیں جو مہندر جی کے کردار کو روشن کرتے ہیں اور ایک فلمی رائیٹر کے روپ میں ان کو ناکامی کے اندھیرے میں ڈھکیل رہے ہیں۔ میں نے ایسے بیسیوں لیکھک اور کلاکار دیکھے ہیں جن کی کلا اور کرداریت کو بنھانے کا کمال کامیابی کی چوٹیوں کو چھوتا ہے۔ لیکن آدمی کے روپ میں ان کا جیون مخالف سمت میں ہی بہتا رہا۔

مہندر جی کی خاصیت یہی ہے کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ویسا ہی جیون جیا۔ اپنی رچناؤں میں وہ جس طبقے کی نمائندگی کرتے تھے۔ اسی طبقے کے ساتھ جیون کی آخری سانس تک رہے۔

ایک لیکھک کی ایمانداری کا اس سے بڑا ثبوت نہیں ہو سکتا۔ کہنے اور کرنے کا یہ سنگم ہی پنچ تتوؤں (عناصر) سے بنے اس شریر کو مہان آتما کے روپ میں ڈھالتا ہے۔ اور جس کی آتما مہان ہے وہی مہان لیکھک ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں!

اُن کی یاد میں، لاکھوں پرنام ——!!

ڈی۔ پی۔ موریہ

آفس سیکرٹری فلم رائٹرز ایسوسی ایشن

ہمارا لیڈر ہمارا دوست

۱۹ مارچ کی رات کھانے سے فارغ ہونے کے بعد میں آرام کرسی پر سکون سے بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔ اسی سوچ کے درمیان مہندر جی کا بھی خیال آگیا۔ رات دن کی ملاقاتیں اور بے پناہ خلوص کی بنا پر اُن کی شخصیت میری سوچ کا حصہ بن چکی تھی۔ دنیا کے کسی بھی مسئلہ پر میں سوچتا تو مہندر جی کی باتیں مجھے یاد آتیں اور یہی میری رہبر بھی بنتیں۔

حسب عادت اس دن بھی ایسا ہی ہوا۔ اچانک ان کا خیال آتے ہی مجھے ان کی ایک دن پہلے کہی ہوئی بات یاد آگئی۔ انھوں نے کہا تھا! "موریہ! اب اپنے مقصد کی طرف بڑھنے کا وقت آگیا ہے۔ بھائی صاحب پر بنی ڈاکومنٹری فلم "کرشن چندر" تو بن چکی اور آگے بھی یہ ڈاکومنٹری فلموں کا سلسلہ تو چلتا ہی رہے گا۔" یہ سن کر میں نے معنی خیز نظروں سے اُن کی جانب دیکھا۔ جیسے ہی آنکھیں چار ہوئیں، انھوں نے فوراً میری بات محسوس کرلی۔ کہنے لگے، "موریہ SORRY میں تم سے وعدہ وفا نہ کرنے پر شرمندہ ہوں۔ چند وجوہات کی بنا پر اس فلم میں میں تمہیں اپنا پارٹنر نہ بنا سکا۔ لیکن اب میں نے طے کرلیا ہے کہ وعدہ پورا کروں گا۔ ہماری فیچر فلم ایم ایم کے بینر تلے ہی بنے گی۔ میرے پاس ایک سبجیکٹ بنا ہوا ہے لیکن تم بھی ایک بجٹ بنا کر مجھے دیدو پھر کام شروع کر دیتے ہیں۔" اس خیال کے آتے ہی میں آرام کرسی سے اٹھا اور ایم ایم فلمز یعنی 'مہندر موریہ فلمز' کا مہینوں پہلے چھپا لیٹر ہیڈ ڈھونڈنے لگا، جسے میں تقریباً بھول چکا تھا۔ جب لیٹر ہیڈ مل گیا تو مسرت کی لہر جسم میں دوڑ گئی۔ اسے ہاتھ میں لے کر میں سوچنے لگا کہ یہ معمولی کاغذ کل اہم دستاویزات میں تبدیل ہونے جا رہے ہیں۔ پھر میں نے اسی پر فیچر فلم کا بجٹ بنانا شروع کر دیا کیونکہ صبح مہندر جی کو بجٹ بنا کر پیش کرنا تھا۔ میں نے سوچا کہ اُن کے پاس جو بجٹ ہے اس سے زیادہ صحیح میرا بجٹ ہونا چاہیے۔ اسی بجٹ کے چکر میں رات دیر گئے تک جاگتا رہا۔ بجٹ کے تیار ہونے کے بعد ہی مجھے نیند آئی۔

علی الصبح میری پتنی کرن نے مجھے جھنجھوڑ کر اُٹھایا۔ میں جھنجلا کر چیخ اٹھا "کیا ہے؟" دوسرے ہی لمحے میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ پریشان، پریشان سی لگ رہی ہے۔ میں نے دھیرے سے پوچھا! "کیا بات ہے؟" وہ روہانسی ہو کر بولی۔ "تمہارا بھانجہ سنت لال آیا ہے دیکھو کیا خبر لایا ہے!؟" یہ سنتے ہی میں جھٹ سے اُٹھ بیٹھا۔ سامنے سنت لال کھڑا تھا۔ "کیا بات ہے؟" بے اختیاری میں میری زبان سے نکلا۔ سنت لال میری بات کا جواب دینا چاہتا تھا لیکن اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ بمشکل تمام وہ صرف اتنا کہہ سکا! "مہندر جی کا دیہانت ....." "کیا ـــ؟" میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا اور میں اس کی طرف آنکھیں پھاڑے حیرت سے دیکھنے لگا۔ پھر اس کے لب ہلے۔ "ہاں رات کو مہندر جی کا ہارٹ فیل ہو گیا ہے۔ آپ جلدی سے دادر پہنچیے لوگ انتظار کر رہے ہیں۔" یہ کہہ کر سنت لال چلا گیا۔

سنت لال کے جانے کے بعد میری آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا۔ جسم بالکل شل ہو گیا۔ میں نے نظر اٹھائی۔ کرن کی بھی وہی

حالت تھی۔ وہ بھی میری طرح خاموش بت بنی کھڑی تھی۔ لگتا تھا سارا ماحول ساکت ہو گیا ہے۔ پھر اس بُت کے لب وا ہوئے "آپ کو فوراً وہاں پہنچنا چاہیئے"۔ — "ہاں" کہہ کر میں نے جلدی سے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ کپڑے بدلے اور جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ کرن نے ریلوے پاس اور پرس میرے حوالے کیا اور میں بدحواسی کے عالم میں گھر سے نکلا۔ راستے میں ٹیلی فون بوتھ پر نظر پڑی۔ میرے قدم رک گئے۔ میں نے سوچا کہ مہندر جی سے پوچھ لوں آج مجھے آفس آنے سے پہلے کہاں کہاں جانا ہے؟ کیا کیا کرنا ہے؟ پھر میں چونکا سوچا 'اب کہاں مہندر جی سے بات کر سکوں گا وہ تو ......'' اسٹیشن پہنچا۔ لوکل ٹرین پکڑی۔ راستے میں پھر وہی خیالوں کی دوڑ۔ مہندر جی کا خیال۔ میں سوچنے لگا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ مہندر جی مجھ سے بنا کہے اتنے لمبے سفر پر چلے گئے۔ انھوں نے ایسا کیوں کیا؟ کوئی بات وہ مجھ سے چھپاتے نہیں تھے۔ پھر یہ بات انھوں نے کیوں چھپائی؟" مجھے اس وقت کامریڈ ین گوپ کی یاد آئی جنھوں نے میری ہی باہوں میں دم توڑا تھا۔

لوکل ٹرین دادر پہنچی۔ میں جلدی سے اترا اور چھبیر اِلڈنگ کی اُور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا بڑھنے لگا۔ وہاں پہنچ کر کیا دیکھتا ہوں کہ ایک کہرام مچا ہے۔ درگا بھابی مجھے دیکھتے ہی چھاتی پیٹتی، چیختی ہوئی میرے پاس پہنچیں۔ کہنے لگیں: "موریہ جی مہندر جی چلے گئے۔ انھوں نے تمہیں فون کرنے کو کہا تھا لیکن میں نہ کر سکی۔ معافی چاہتی ہوں"۔ درگا بھابی کو میں نے ڈھارس بندھائی اور اسپتال پہنچنے کے خیال سے نکلا۔ ٹیکسی پکڑی اور سیدھے اسپتال پہنچ گیا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ مجھے شو بھانند آفس بوائے کی یاد آئی۔ میں سوچنے لگا کم از کم اسے تو یہاں ہونا چاہئے تھا۔ یہ وہی شو بھانند ہے جس کو میں نے بطور سزا دفتر کے باہر بیٹھنے کو کہا تھا۔ اس نے جا کر مہندر جی سے شکایت کی تھی "صاحب! میں باہر نہیں بیٹھوں گا کیونکہ میرے دوست اور رشتہ دار سب جان جائیں گے کہ میں چپراسی ہوں۔ صاحب میں طالب علم ہوں آگے چل کر میں بھی تو بڑا آدمی بن سکتا ہوں"۔ یہ کہتے کہتے وہ رونے لگا تھا۔ اتفاق سے جب میں مہندر جی کے پاس پہنچا تو انھوں نے کہا "موریہ، شو بھانند کو دفتر کے اندر ہی بیٹھنے دو، وہ ایسا کہہ رہا تھا۔ میں نے سوچا مہندر جی کتنے غریب پرور اور دور اندیش آدمی ہیں۔

پانچ چھ دنوں کے بعد ایگزیکیٹو کی میٹنگ ہوئی۔ مسئلہ تھا میری اور شو بھانند کی تنخواہیں بڑھانے کا کیونکہ ہم دونوں نے درخواستیں دی تھیں۔ کمیٹی نے فیصلہ دیا کہ دونوں کی برابر، برابر رقم بڑھا دی جائے۔ یہ سن کر مجھے ایک دھکا سا لگا۔ لیکن میں فوراً سمجھ گیا کہ اس فیصلے میں مہندر جی کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ انھوں نے مجھے یہ بتانا چاہا تھا کہ رائیٹرز ایسوسی ایشن میں کوئی چھوٹا بڑا ہرگز نہیں ہے۔ سب مساوی ہیں۔

کچھ دنوں بعد شو بھانند والی بات کی میں نے صفائی پیش کی اور ساتھ ہی تنخواہ کی شکایت بھی کی۔ وہ سن کر بولے: "موریہ تم ایسا کرو کہ ایک درخواست اور دیدو۔ دیکھتے ہیں۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ کچھ نہ کچھ ضرور ہو جائے گا"۔ ان کی اس بات سے میں بے حد متاثر ہوا۔ سوچنے لگا: مہندر جی واقعی عظیم آدمی ہیں۔ اپنے ساتھیوں کی ضرورتوں کا کتنا خیال رکھتے ہیں۔!!

انھیں خیالات میں میں اُلجھا ہوا تھا کہ کا وش جی، رام مورتی جی، مدھو سودھن جی اور کرشن چندر جی کے بیٹے رنجن جی آتے ہوئے نظر آئے۔ اسپتال میں دفتری خانہ پُری کے بعد ہم لوگ مردہ خانے پہنچے تو کاوش جی نے کہا: "کرشن چندر جی ساڑھے گیارہ بجے تک دہلی سے یہاں پہنچ رہے ہیں۔ اس لئے ہمیں یہاں سے گیارہ بجے روانہ ہونا چاہیئے تب تک اور لوگ بھی جمع ہو جائیں گے۔ مدھو سودن جی ایمبولنس کو فون کرنے چلے گئے اور میں لیکھکوں کو فون کے ذریعے اطلاع کرنے نکل گیا۔ کئی لیکھکوں کے نام ایسے ذہن میں آئے جن کے پاس فون نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں لیکھکوں کے مسائل گھومنے لگے۔ سوچنے لگا کہ ہم سب کا سچا دوست اور حقیقی رہنما نہیں رہا۔ پھر ہمارا کیا ہوگا۔ ایک ٹیس سی دل میں اٹھی اور ایک واقعہ یاد آیا: ایک بار ہمارے سالانہ جلسے میں مرکزی سرکار کے ہاؤسنگ منسٹر شری اندر کمار گجرال اور لوک سبھا کے نائب اسپیکر شری سویل پدھارے تھے۔ جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ بہت سے لیکھک جھونپڑوں میں زندگی گزارتے ہیں۔ کتنے ہی فٹ پاتھوں پر زندگی بتا رہے ہیں۔ یہ جان کر انھوں نے یقین دلایا کہ آپ لوگوں کی کالونی بنوانے کے لئے میں مرکزی سرکار سے ضرور سفارش کروں گا۔ لیکن اس وقت جو بہت سے لیکھک بہت سی جگہوں پر ناقابلِ برداشت زندگی

گزار رہے ہیں۔ آپ لوگ ان کے لئے ہاؤسنگ بورڈ کے ذریعے بنائے گئے مکانوں کو دیکھیں اور مجھے اطلاع کریں۔ میں ان میں سے ہی کچھ مکانوں کو آپ کے لئے الاٹ کرنے کی کوشش کروں گا۔ لہٰذا میں، مہندر جی اور کاوش جی باندرہ، اندھیری اور جوہو پارلے اسکیم میں ہاؤسنگ بورڈ کے ذریعے تیار کئے گئے مکانوں کو دیکھنے گئے۔ ان میں سے کچھ پسند بھی آئے۔ خاص طور پر ڈھاکہ کالونی کے وہ مکانات جن کا کرایہ پندرہ روپے اور ڈپازٹ صرف ۴۵ روپے تھے۔ واپسی میں کاوش جی نٹراج اسٹوڈیو چلے گئے اور ہم دونوں دفتر کی طرف چل پڑے راستہ کافی لمبا تھا لہٰذا کاٹنے کی غرض سے میں نے سوال کیا:

"سنا ہے دو دانشمند ایک ساتھ نہیں رہ سکتے!" مہندر جی نے جھٹ کہا: "نہیں۔ موریہ میں تو ان لوگوں کے لئے کوشش کر رہا ہوں جن کو سر چھپانے کی جگہ نہیں ہے۔ ایسوسی ایشن ضرورت مندوں کے لئے ہے ویسے تمہارا کیا خیال ہے؟ اب سوال الٹا ہو گیا تھا۔ میں نے سوچتے ہوئے کہا: "گلاب کے پھولوں میں اگر لڑائی ہو جائے تو مہک ہی پھیلے گی پھر جہاں یہ پھولوں کا جھنڈ لہرائے گا، جھومے گا، ٹکرائے گا وہاں کی ساری فضا معطر ہو جائے گی۔ لوگ اس کے درشنوں کے لئے آئیں گے۔ وہ زمین تو عبادت گاہ بن جائے گی" یہ بات میں نے ان کی ہی بات سے متاثر ہو کر کہی تھی۔ مہندر جی نے مسکراتے ہوئے کہا: "کون جانے کیا بنے گی۔ لیکن بھیک کے کفن میں اور نگر پالیکا کے کندھوں پر کوئی لیکھک نہیں جائے گا۔"

میں دفتر کے قریب آ چکا تھا میرے پاس جتنے ٹیلی فون نمبر تھے سب کو میں نے خبر کر دی۔ اور کے۔ ای۔ ایم۔ اسپتال پہنچا۔ ایمبولنس آ چکی تھی۔ مہندر جی کو اس میں رکھا گیا۔ ہم گھر پہنچے۔ کرشن جی بھی آ چکے تھے۔ گھر کے سامنے لیکھکوں، نغمہ نگاروں اور اداکاروں کا ہجوم تھا ہم نے مہندر جی کو ایمبولنس سے باہر نکالا۔ لوگوں کو ہٹاتے ہوئے انھیں ان کے کمرے میں لے گئے۔ اُسی کمرے میں جس میں تمام اچھے برے، بڑے چھوٹے سب ہی لیکھک اٹھا بیٹھا کرتے تھے۔ اسی کمرے میں وہی شخص یعنی دوستوں کا دوست اور ہمدرد، درجنوں افسانوں اور پندرہ ناولوں کا خالق ننگا پڑا تھا۔ انھیں ایک چادر سے ڈھک دیا گیا تھا۔ پھر دوستوں نے انھیں پھولوں سے ڈھک دیا۔ اسی وقت درگا بھابی ان کے آخری دیدار کے لئے پہنچی ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں۔ ایسا لگتا تھا گویا یہ پوچھ رہی ہوں "اب میرا کیا ہو گا؟ مجھے کس کے سہارے چھوڑ گئے۔" کرشن جی نے ان کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ تسلی دی کہ "میں ہوں۔"

ہم لوگ ادھر مصروف تھے کہ ایمبولنس والے نے کہا: "صاحب آپ لوگ جلدی کیجئے، مجھے واپس جانا ہے" یہ سن کر ہم لوگ ارتھی کا انتظام کرنے لگے۔ ارتھی باہر نکالی گئی۔ اگلی سڑک پر پہنچنے تک لوگوں نے کندھا دینے کی ہوڑ مچا رکھی تھی۔ ساتھ چلنے والے یہ کوشش میں تھے کہ ارتھی میرے کندھے پر ہو؟ انھیں لوگوں میں ایک شخص جس کا نام ہے۔ پی۔ ادسھی تھا بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ کچھ مہینوں پہلے یہی شخص دفتر میں آیا تھا۔ بیمار تھا۔ تھوڑی دیر کھڑے رہنے کے بعد صوفے پر بیٹھ گیا۔ میں نے پوچھا۔ کوئی کام ہے آپ کو؟ تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بولا "مہندر جی آ رہے ہیں۔ میں ان کے لئے ہی بیٹھا ہوں"۔ تھوڑی دیر بعد مہندر جی آ گئے — مسکراتے ہوئے کہنے لگے "موریہ جی انھیں بیس روپے دے دیجئے! اور چار مہینے تک چالیس روپے کے حساب سے دیتے رہئے۔" پھر اس شخص کی طرف نظر اٹھا کر بولے "اب آپ کے راشن کا انتظام تو ہو گیا لیکن مہربانی کر کے ان چار مہینوں میں کہیں نہ کہیں کوئی کام ضرور ڈھونڈ لیجئے۔ خدا کے واسطے"۔ اس شخص کے چلے جانے کے بعد انھوں نے کہا: موریہ یہ ہمارا ممبر تو نہیں ہے صرف اس ایک گناہ سے میں اس کے پریوار کو بھوکوں مرتے نہیں دیکھ سکتا۔ اس کے پیسوں کا حساب میری طرف —!" اس وقت میں نے سوچا کہ اس مہان آدمی کو لیکھکوں ہی سے نہیں بلکہ عام آدمیوں سے بھی کتنی ہمدردی ہے۔ لیکھکوں کے ساتھ تو اُن کی رعایتیں چلتی ہی رہتی تھیں۔ اگر میں شکایت کرتا کہ فلاں ممبر نے فیس نہیں دی ہے تو وہ کہتے: "پیسے نہیں ہوں گے۔ آئیں گے تو دے دے گا۔" میں سوچا کرتا۔ یہ شخص خود جیسا ہے دوسروں کو بھی ویسے ہی سمجھتا ہے۔

میرے دماغ میں خیالوں کا ایک سیلاب تھا کہ آ رہا تھا۔ خیالوں کا سلسلہ اُس وقت ٹوٹا جب ایمبولنس کو بریک لگے۔ اب ہم لوگ شمشان میں تھے۔ چتا پہلے سے ہی تیار تھی۔ اس کے ارد گرد سرو شری خواجہ احمد عباس، رشی کیش مکرجی، پنڈت مکھ رام شرما، ساحر لدھیانوی، شام کشن نگم، جان نثار اختر، راہی معصوم رضا، دشنو ملہوترا، غافل ہرنالوی، من موہن کرشن اور چیندر اشیکھر کھڑے تھے۔ اور بھی ہندی، اردو، مراٹھی اور گجراتی زبانوں کے لیکھک بھی جمع تھے۔ ان کے درمیان ارتھی لائی گئی اور چتا پر رکھ دی گئی۔ کتنے ہی لوگوں کو آج معلوم ہوا کہ مہندر جی کا پورا نام مہندر ناتھ چوپڑہ تھا۔ کرشن جی کے بیٹے رنجن نے چتا کو آگ لگائی۔ یہ نظارہ دیکھ کر کرشن جی آپے سے باہر ہو گئے۔ تلملا کر رونے لگے۔ آج اُن کا بیٹا، اُن کا بھائی، اُن کا معاون، اُن کا دوست انھیں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ ان سے آگے نکل گیا تھا۔ سب سے آگے نکل گیا تھا۔ ایک ایسے طویل سفر پر جہاں سے واپسی ناممکنات میں سے ہے۔

چتا سے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ ایک دور ختم ہو رہا تھا۔ ایک کہانی جل کر راکھ ہو رہی تھی۔ چتا سے چنگاریاں بلند ہو رہی تھیں۔ بہت ہی بلند — جو ایک دور ایک کہانی کی بلندی کا احساس دلا رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ بلندیاں وہاں کھڑے لوگوں سے پوچھ رہی ہوں کہ کوئی ایسا انسان ہے جو اِن شعلوں کے بیچ جو انسانیت سلگ رہی ہے اس کی حفاظت کے لئے اپنے آپ کو اُن دکھ درد کے شعلوں کے حوالے کر دے جو انسانوں کو زندہ رکھ کر تِل تِل جلاتے رہتے ہیں۔

جلیل باز ید پوری

ناقابلِ فراموش لمحے

اس بات کا فیصلہ تو ادبی مورخ کرے گا کہ مہندر ناتھ مرحوم کا ادب میں کیا مقام تھا؟ لیکن انسان ہونے کے ناطے میں انسانیت کو سب سے بڑا مذہب مانتا ہوں اور مہندر ناتھ جی میں انسانیت نوازی بدرجہ اتم پائی جاتی تھی۔ اُن کی شخصیت نکھری ہوئی چاندنی تھی۔ وہ سایہ دار پیڑ تھے جن میں سکون تھا اور طمانیت بھی! ان کے مزاج اور ان کی عادت میں بارش کی پھواروں جیسی نرمی تھی۔ اور وہ سورج کی کرنوں کی مانند عصبیت سے پاک تھے۔ Film writers.Association کے ممبر ہونے کی وجہ سے میں انھیں بہت قریب سے جانتا تھا۔ ایک بار جھلستی دوپہر میں رنجیت اسٹوڈیو گیا۔ مجھے دو کہانیاں رجسٹرڈ کروانا تھیں اور میرا کارڈ بھی کھو گیا تھا۔ آفس میں صرف آفس بوائے موجود تھا۔ اس نے کہا "آج مہندر جی نہیں آئیں گے"۔ میں نے اُن کا پتہ پوچھا اور ان کی قیام گاہ چمپا بلڈنگ گیا۔ دُرگا آنٹی بیٹھی تھیں۔ میں نے اُن سے پوچھا "مہندر جی کہاں ہیں؟" انھوں نے ان کی طرف اشارہ کر دیا۔ وہ خرّاٹے لے رہے تھے۔ میں نے اُسی وقت انھیں جگایا اور اپنی پریشانیاں بتائیں۔ اُن کی پیشانی پر ذرا بھی شکن نہیں ابھری بلکہ ہونٹوں پر مسکراہٹ کی دھیمی دھیمی آنچ تھی۔ وہ میرے ساتھ اسی وقت رنجیت اسٹوڈیو آئے۔ میرے تمام مسائل بطریق احسن حل کرنے کے بعد پوچھنے لگے۔ "تم کیا کرتے ہو"۔ میں نے کہا کہ "نائٹ اسکول میں پڑھاتا ہوں۔ فلمی کہانی نویس بننے کے لئے حالات سے پنجہ آزمائی کر رہا ہوں"۔ لفظ "پنجہ آزمائی" پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑے اور کہنے لگے "آدمی مزیدار معلوم ہوتے ہو"۔

پھر میں نے کہا "افسانے بھی لکھتا ہوں۔ علاوہ ازیں اب تک کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، احسن رضوی، سردار جعفری، دلیپ کمار، نوشاد، لتا منگیشکر، مکیش اور راج کپور سے انٹرویوز بھی لے چکا ہوں۔ آپ اپنے ہیں آپ سے آخیر میں لوں گا"۔ کیا پتا تھا کم بخت وہ آخیر کبھی نہیں آئے گا۔ اور ایک انسان خالص انسان اتنی جلدی ہم سے روٹھ جائے گا۔ انھوں نے پھر پوچھا "کیا "سب رنگ" رسالہ میں بھی کام کرتے ہو؟" میں نے کہا۔ "نہیں، میں اس میں کام نہیں کرتا ہوں۔ صرف میرے انٹرویوز "سب رنگ" میں چھپتے ہیں۔" اُسی ماہ اُس رسالہ میں بعنوان "کمیشن" مہندر جی کا ایک افسانہ شائع ہوا تھا۔ طباعت بالکل ناقص تھی لیکن انھوں نے صرف بات کے دوران میں اتنا کہا کہ "عدم توجہی سے رسالہ متاثر ہوتا ہے۔"

اُن کی وسیع النظری اور وسیع القلبی کا جب خیال آتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اب دوسرا مہندر ناتھ شاید پیدا نہیں ہوگا۔ آج کسی معمولی ہیرو سے ملنے جائیے تو گھنٹوں دھوپ میں کھڑا رہنے کی نوبت آتی ہے اور واچ مین کتّے کی طرح بھونکتا ہے۔ ہیرو کی تو بات چھوڑئیے میں دو چار ایسے ادیبوں کو بھی اچھی طرح جانتا ہوں جنہیں میں نے بہت قریب سے کتابوں کی مانند پڑھنے کی کوشش کی ہے۔ جو اپنے آپ کو شہرہ آفاق ہستی سمجھتے ہیں حالانکہ وہ انسانیت اور خلوص سے کوسوں دور ہیں جبکہ ایک ادیب کو سراپا انسان

اور سراپا خلوص ہونا چاہیئے کیونکہ ادیب کا مذہب بھی انسانیت ہے ۔ اور یہ بات مہندر جی میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی ۔ لیکن یہ انسانیت کا ہیرو اتنا سادہ تھا جس کی سادگی پر آج آنکھیں بھر آتی ہیں شاید Thor atAr Kempis نے مہندر جی کے بارے میں کہا تھا:

"He is truly great that is little in himself and that make it no account of any night of honouss"

جس روز مہندر جی کا انتقال ہوا ۔ میں نائٹ اسکول میں پڑھا رہا تھا ۔ ایک صاحب نے انقلاب پڑھنے کے لئے دیا "مہندر جی چل بسے" سرخی پڑھ کر آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا اور میں فوراً چھیرا بلڈنگ کے لئے روانہ ہو گیا ۔ راستے میں بار بار مہندر جی کی باتیں اور انسانیت نوازی میرا پیچھا کر رہی تھیں ۔ خلیل جبران کا یہ قول :

" I shall ring into your earo even the vast sea wave carries me back to the vast sea depth "

میرے کانوں میں بج رہا تھا ۔

کیونکہ مہندر جی صدیاں اور قرن گزرنے کے بعد بھی زندہ رہیں گے ۔ وہ ہمیشہ یادوں کے جھلملاتے ستارے بن کر ہماری آنکھوں کے سامنے رقص کرتے رہیں گے ▲

عزیز قیسی

کہانی ختم ہوگئی!؟

غالباً ۱۹۵۰ء کی بات ہے میں پہلی بار بمبئی آیا تھا۔ اس وقت میں طالب علم تھا۔ میں نے بمبئی کا یہ سفر اپنے محبوب ادیبوں اور شاعروں کو دیکھنے کے لئے ان سے ملنے کے لئے کیا تھا وہ بت جن کی میں پرستش کرتا تھا۔ ان کے درشن کی تمنّا لیے ہوئے (پتہ نہیں اس وقت کون کون سے بت میری تمنّا کے مرکز تھے۔ ان میں سے کئی بت درشن کرتے ہی ٹوٹ گئے۔ کئی بتوں کے ٹوٹنے میں کچھ وقت لگا) اپنی کم عمری بے بضاعتی اور کمتری کا احساس لئے میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے اجلاس میں شریک ہوا۔ اور کسی مہربان سینئر ادیب کی سفارش پر میرا نام بھی ایجنڈے میں شامل کرلیا گیا۔۔ میں نے ڈرتے ڈرتے ایک نظم سنائی۔ (وہ نظم نہ مجھے اب یاد ہے نہ میری بیاض میں کہیں درج ہے نہ میری نظموں کے مجموعے میں شامل ہے) نظم پر حسب دستور انجمن، بحث شروع ہوئی۔ بحث کیا تھی۔ یہ بھی مجھے یاد نہیں ہے۔ ہاں ایک بات ضرور یاد ہے، سردار جعفری اور کیفی اعظمی کی نظر میں وہ نظم ۔۔ بے حد سپاٹ۔ اور معمولی تھی (اور وہ یقیناً ویسی ہی ہوگی) لیکن ظ انصاری کی نظر میں وہ بہترین نظم تھی جسے کیفی اعظمی سمجھ نہیں سکے تھے (ظ انصاری نے یہ نہ کہا ہوتا تو شاید میں شاعری ترک کردیتا) اِس جلسے کی کارروائی چلانے والی ایک وجیہہ اور صحت مند مسکراہٹ تھی۔ وہ مسکراہٹ آج بھی میرے تصور میں، اور فلم رائٹرس ایسوسی ایشن کے دفتر میں لگی ہوئی ایک تصویر میں چمک رہی ہے۔

اگر تعارف ـــــ سلام دعا اور مصافحہ کرنے کا نام ہے تو میرا تعارف مہندر ناتھ سے اسی دن ہوا تھا۔ لیکن اگر تعارف کسی اپنے پن کے احساس کا نام ہے تو میرا اور ان کا تعارف برسوں پہلے ہو چکا تھا۔

میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے (ادبی معنوں میں) تب سے میں اُن سے متعارف ہوں۔ مجھے یاد ہے۔ شاید میں ہائی اسکول کا طالب علم تھا ۱۹۴۵ء میں "ادبِ لطیف" لاہور کے کسی شمارے کے سرورق پر، دوسرے ادیبوں کی تصویروں کے ساتھ مہندر ناتھ کی تصویر بھی تھی۔ ایک فلم کے ہیرو جیسے خوبصورت اور پُرکشش آدمی کی تصویر۔ میں وہ تصویر کبھی نہیں بھول سکتا۔ پھر انہیں دنوں حیدرآباد میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس ہوئی۔ میں نے سنا تھا کہ مہندر ناتھ آئے ہوئے ہیں۔ میں ان سے نہیں ملا۔ پر مجھے ایسا لگا کہ جیسے میں ان سے کئی بار مل چکا ہوں۔ میں نے اُن کے تذکرے ایسے سنے جیسے کوئی اپنے عزیز قریب کے بارے میں سنتا ہے۔ "پودے" (کرشن چندر کا رپورتاژ) میں ان کے بارے میں پڑھا۔ ان کی کہانیاں پڑھتا رہا۔ وہ کرشن چندر کے بھائی ہیں، سرلا دیوی کے بھائی ہیں۔ کسی فلم کے ہیرو ہیں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے سکریٹری ہیں۔ یہ جان کر بھی انہیں "بت" نہیں بنا سکا۔ جیسے کرشن چندر، سردار جعفری، سجاد ظہیر، اور سعادت حسن منٹو کو "بت" بنا کے میں نے اپنے دل میں بٹھا لیا تھا۔ مہندر ناتھ کی لکھی ہوئی انجمن ترقی پسند مصنفین کی کارروائیوں کی روداد، اُن کے ناول۔ ان کی کہانیاں۔ اُن کا ادیبوں کو ڈی کلاس ہونے کا مطالبہ۔۔ میں سب کچھ پڑھتا رہا۔ "ہندوستان سے پاکستان تک"

کی بے خانماں اور برباد عورت کے ساتھ روتا رہا۔ لیکن اس روز انجمن ترقی پسند مصنفین کے اجلاس میں پہلی بار انھیں دیکھ کر ایسا لگا کہ انھیں تو میں جانتا ہوں۔ یہ بت نہیں۔ مہندر ناتھ نے مجھے اس دن پہلی بار دیکھا تھا۔ شاید پہلی بار میرا نام سنا تھا۔ پہلی بار میرے شعر سنے تھے۔ لیکن وہ مجھ سے ایسے ملے جیسے وہ مجھے برسوں سے جانتے ہوں۔ میری اُن کی ادبی حیثیت کا فرق، عمر کا فرق، اور پتہ نہیں کون کون سا فرق انھوں نے صرف ایک مسکراہٹ میں مٹا کر رکھ دیا۔ مہندر ناتھ کو اپنی شخصیت کو مسکراہٹ میں سمیٹنے کا فن آتا تھا۔ ایک ایسی مسکراہٹ جو آپ کو اپنے غیر مرئی جال میں لپیٹ لے۔ یہی مسکراہٹ انہیں بت بننے نہیں دیتی تھی۔ اسی مسکراہٹ کے مارے ہوئے سب ہیں۔ نئے ادیب، پرانے ادیب، نامور عہد ساز شخصیتیں۔ بڑے جغادری اور با اقتدار لوگ۔ فلم رائٹرس ایسوسی ایشن کے اسٹار ادیب۔ کچے، ناتجربے کار، بے کار، بے روزگار ادیب۔ اُن کی گلی کے بے چہرہ لوگ، گمنام بے نام اور بدنام لوگ۔ درگا بھابی کی وہ سہیلیاں جن سے ان کو رشتہ داری کا گمان ہے وہ بچے جوان کے بھانجے بھتیجے تھے۔ جو یہ کبھی نہیں جانتے کہ ان کا انکل کس درجے کا ادیب ہے؟ کس مرتبے کا انسان ہے؟ سب کے سب اسی ست رنگی مسکراہٹ کے گرفتار تھے۔

جب 1957ء کے آخر میں بمبئی آیا تو پھر اُن سے "نوجوان مصنفین" کے جلسوں میں ملاقاتیں ہوئیں۔ مشاعروں اور میٹنگوں میں ہم ملتے رہے۔ محفلوں کے بعد محفلوں اور نشستوں میں ہم ملتے رہے اور وہ مسکراہٹ میرے ان کے تعلقات پر پھیلتی رہی۔ 1964ء کے بعد جب میں نے فلم رائٹرس ایسوسی ایشن کے کاروبار میں عملی حصہ لینا شروع کیا تب اُن سے ملنے جلنے کا سلسلہ مستقل ہو تا گیا۔

پچھلے دس برسوں میں پتہ نہیں میں ان سے کتنی بار ملا ہوں۔ ان دس برسوں کے تعلقات میں ایک بات عجیب ہے۔ ان سے میری ملاقات فلم رائٹرس ایسوسی ایشن کے کسی کام کے سلسلے میں ہوئی ہے یا ویسے کسی ذاتی کام کے سلسلے میں ہوئی ہے۔ یا وقت گزاری کے لئے ہوئی ہے ہر بار یہی ہوا کہ مہندر ناتھ نے اپنے کسی دکھ، اپنے کسی مسئلے کے بارے میں مجھ سے کبھی نہیں کہا۔ ہمیشہ یا تو وہ دوسروں کی بات کرتے تھے یا پھر میں انھیں اپنے دکھ سناتا تھا۔ انھیں لوگوں کو ان کے آگے اپنے دکھ درد کا بھنڈار کھولنے پر اُکسانا آتا تھا۔

میں نے ہمیشہ اپنے روز و شب کے چھوٹے بڑے دکھ انھیں سنائے ہیں۔ اپنی بیماری بیکاری کے، اپنی بیوی بچوں کی علالت کے۔ اپنی معاشی پریشانیوں کے دکھڑے، عزیزوں دوستوں کی اذیت رسانی اور اذیت ناکی کے واقعات۔ میں انھیں سناتا رہا۔ انھوں نے شاید ہی کبھی اپنی کوئی بات کی ہو۔ پتہ نہیں مہندر ناتھ کو اپنے کسی مسئلے کو محض اپنا مسئلہ بنانے اور اپنے دکھ کو اپنی حد تک رکھتے ہوئے دوسروں کے دلوں کو اپنے ہاتھ میں لینے کی صلاحیت کہاں سے ملی تھی۔ اگر یہ صلاحیت انھوں نے اپنے آپ میں پیدا کی تھی تو میں سوچتا ہوں وہ اپنے اندر ہی اندر کس زندگی کے جہنم میں جلتے رہے ہوں گے اور کس غضب کی شائستگی ان میں ہوگی کہ اس جہنم کی آگ کو انھوں نے ایک گلبار مسکراہٹ بنا کر اپنے چہرے پر مرتسم کر لیا تھا۔

زندگی اور موت کے بارے میں انسان نہ جانے کب سے سوچ رہا ہے۔ آدمی کہاں سے آتا ہے کہاں جاتا ہے۔ کیا یہ زندگی اتنی ہی ہے کہ آدمی کسی خاص تاریخ کو، کسی خاص وقت پیدا ہوا اور کسی خاص تاریخ کو کسی خاص وقت مر گیا؟ موت کے بعد کیا ہے؟ دوسرا جنم؟ کچھ نہیں؟ قیامت اور روزِ حساب؟ کیا موت زندگی کا آخری نقطہ ہے؟ موت کیا وہ آخری لمحہ ہے جو کسی روشن کمرے کی روشنی اچانک بجھا دیتا ہے؟ لیکن ایسا کیوں ہوتا ہے کہ اس کمرے میں رکھی ہوئی ساری چیزیں، اندھیرے کے باوجود اسی طرح "وجود رہتی ہیں۔ اگرچہ ہم انھیں دیکھ نہیں سکتے۔ لیکن اندھیرا ان کو مٹاتا نہیں۔ وہ معدوم نہیں ہوتیں۔ بلکہ ان کا وجود ہمارے ٹٹولنے والے ہاتھوں اور کھوئی ہوئی نظروں سے اور قریب ہو جاتا ہے۔ ہماری آنکھوں میں زندہ رہتا ہے۔ مذاہب کے فلسفوں نے، پتہ نہیں کیسے کیسے قیاسات، اعتقادات کی صورت میں ہم کو دیئے ہیں۔ میں ان میں سے کسی کو نہیں مانتا۔ نہ دوسرے جنم کو، نہ حیات بعد الموت کو، نہ روزِ قیامت کو۔ اور نہ میں یہ مانتا ہوں کہ موت ــــ زندگی کا نقطۂ آخر ہے۔ میں شاید یہ مانتا ہوں کہ موت کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔

مہندر ناتھ کی موت کے مہینوں بعد آج جب میں ان کے بارے میں لکھنے بیٹھا ہوں تو یقین کیجیے مجھے مہندر ناتھ سامنے کھڑے

ہوئے مسکراتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ وہ یہیں موجود ہیں۔ میرے پاس۔ میرے نزدیک۔ میری میز۔ میری کرسی کے قریب۔ میرے قلم اور کاغذ پر ان کا سایہ پڑ رہا ہے۔

غم بڑا عالمگیر تجربہ ہے۔ غم ہر انسان کے مقدر میں ہے۔ میں نے غم کے ہر پہلو پر شعر سنے ہیں۔ غم کے ہر پہلو کا ذکر سنا ہے ہر پہلو کو دیکھا ہے۔ ہر ایسے تجربے، مشاہدے اور تذکرے پر میری رگوں میں دوڑتا ہوا لہو ایک پل کے لئے رُک جاتا ہے۔ ایک عجیب سی ناقابلِ بیان سنسنی سارے بدن میں پیدا ہوتی ہے۔ سینے میں ایک عجیب سا ارتعاش پیدا ہوتا ہے۔ ایک ابر سا کہیں اندر دل میں اٹھتا ہے۔ امڈتا ہے اور آنکھوں تک پہونچتے پہونچتے پانی بن جاتا ہے۔ کبھی آنکھوں میں تیرنے لگتا ہے۔ کبھی چھلک جاتا ہے اور کبھی برس پڑتا ہے۔ لیکن غم کی ایک اور کیفیت کا تجربہ مجھے آج ہو رہا ہے ــــ جب کبھی میں کوئی ایسا شعر سنتا تھا جس میں شاعر کو غم میں مزہ آرہا ہو تو یقین کیجئے مجھے وہ شعر سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ غم اور مزے کا کیا تعلق ہے میں یہ سوچتا تھا لیکن آج وہ تعلق میری سمجھ میں آگیا ہے۔ اس وقت بدن میں کوئی سنسنی نہیں، نہ کوئی پل، دوڑتے ہوئے لہو کو رگوں میں روک رہا ہے نہ آنکھوں تک کوئی ابر آتے آتے پانی بن رہا ہے۔ ایک ایسی کیفیت مجھ پر طاری ہے جسے میں کوئی نام نہیں دے سکتا ــ ہاں شاعروں کی زبان میں، لذتِ غم کہہ سکتا ہوں یا نشہ۔

مہندر ناتھ کہانیاں لکھتے لکھتے خود کہانی بن گئے۔ موت۔ کسی کہانی کا بڑا اچھا ہوا اختتام ہوتا ہے۔ خاص طور پر کہانی کے کسی محبوب کردار کی موت تو پھانس کی طرح قاری کے دل میں چبھ جاتی ہے اور مدتوں اس کی کھٹک باقی رہتی ہے۔ مہندر ناتھ کی موت بھی بڑی خوب صورت، رنگین و سادہ بامقصد کہانی کا اختتام ہے۔ لیکن کیا یہ اختتام ہے؟ کیا کہانی ختم ہو گئی؟ وہ کہانی جو برسوں تک لکھی جاتی رہی ہے۔ ادب میں۔ فلم میں ــ فلم رائٹرس ایسوسی ایشن اور انجمن ترقی پسند مصنفین کی رسمی، غیر رسمی، روزانہ، ہفتہ وار اور سالانہ کارروائیوں میں، کانفرنسوں میں، سیمینارس اور سیمپوزیمس میں، رسالوں، پرچوں اور اخباروں میں، دادر کی ایک چھوٹی سی گلی کی کالی میلی بلڈنگ کے تنگ و تاریک کمرے میں، دوستوں، عزیزوں کے دلوں میں، درگا بھابی کے شب و روز کے صحیفے میں۔ زندگی کے اندھیروں اُجالوں میں جس کہانی کے ٹکڑے، پھیلتے اور ایک دوسرے کو کاٹتے اور بڑھاتے رہے۔ کیا وہ کہانی ختم ہو گی؟

سلیقے سے کہی ہوئی کہانی، مختصر ہو یا طویل ــ زندگی بھر نہیں بھلائی جا سکتی ــ سننے اور پڑھنے والا۔ دل گدازی کے کسی لمحے میں اس کہانی کو یاد کرتا ہے ــ پوری کہانی یاد بھی نہ آئے تو اس کا کوئی کردار۔ کسی کردار کی کوئی ادا۔ کوئی چبھتا ہوا فقرہ۔ کوئی دلکش مکالمہ کوئی حیرت خیز موڑ۔ اسے یاد آتا ہے۔ اور وہ دوسرے کو سناتا ہے۔ دوسرا تیسرے کو سناتا ہے اور یہ سلسلہ نہ جانے کب سے چل رہا ہے اور کب تک چلتا رہے گا۔ پتہ نہیں آج ہم جس کہانی کو سُن رہے ہیں وہ کتنی صدیوں پہلے کہی گئی ہو اور پتہ نہیں اور کتنی صدیوں تک، سنائی جاتی رہے گی۔ تو کیا مہندر ناتھ کی زندگی کی اتنی خوبصورت کہانی۔ جو اُن کے خونِ جگر سے لکھی ہوئی ہے ـــــ ختم ہو سکتی ہے؟



مہندر ناتھ

جیسے جیا وہ بذاتِ خود ایک فن ہے

ایسے عظیم فن کار کو

خراجِ عقیدت

رامانند ساگر

پرویز یداللہ مہدی

کہتے ہیں جس کو طنز.....!

اُردو ادب کے دسترخوان پر"طنز و مزاح" کی حیثیت ابھی تک املی کی چٹنی، لیموں کے اچار، یا خوبانی کے میٹھے سے آگے نہیں بڑھ سکی ہے۔ اس سے پہلے کہ نئی نسل اس مثال پر یہ الزام عائد کرے کہ یہ صرف "چٹوروں" اور "پیٹو حضرات" کے لئے ہے ایک اور مثال آج کی "فلم زدہ" نئی نسل کے لئے پیش ہے۔ اردو ادب کو اگر ایک "فیچر فلم" تصور کیا جائے تو "افسانہ" اس کا ہیرو، "شاعری" ہیروئن، "تنقید" ویلن" اور "طنز و مزاح" کامیڈین یا مہمان کلاکار کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں ــــ ادب کی اس نازک مگر خطرناک صنف کے "سُروں" کو یار لوگ یعنی ادیب و شاعر حضرات کبھی اپنا اور کبھی دوسروں کے منہ کا مزا بدلنے کے لئے چھیڑتے بھی ہیں تو بڑے احترام اور آہستگی کے ساتھ کہ یہی تو وہ "چھیڑ چھاڑ" ہے جس میں دوسروں کے ساتھ خود اپنی بھی "چھیر پھاڑ" کا خطرہ لگا رہتا ہے ــــ اصل میں بقولِ شاعر؎

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

کے مصداق یہ ظالم صنف خود "قلوپطرہ" سے کم نہیں۔ اس پر "ٹھیکے دارانِ ادب" یعنی "نقادانِ فن" عرف "جراحِ سخن" حضرات نے بھی اس صنف کو "ہوّا" بنا کر پیش کیا ہے ــــ عام خیال ہے کہ طنز و مزاح کا راستہ "معشوق کے سر کے بال سے زیادہ باریک اور رقیب روسیاہ کی دو دھاری تلوار سے زیادہ تیز ہے اس لئے اس "شریر" اور شرپسند" صنفِ ادب سے "چھیڑ چھاڑ" کرتے وقت ایک ادیب کا گھبرا جانا ضروری ہے کہ جانے کب انجانے میں معشوق کے سر کا بال "وبال" بن جائے اور رقیب کی تلوار "وار" کر جائے۔

دیگر اصناف ادب کو اگر "سنگل فیس کرنٹ" سے تشبیہ دی جائے تو صنف "طنز و مزاح" یقیناً "تھری فیس کرنٹ" کہلائی جا سکتی ہے۔ "سنگل فیس لائن" پر ایک معمولی تربیت یافتہ "وائرمین" بھی کام کر سکتا ہے لیکن "تھری فیس" خالہ جی کا گھر نہیں۔ اِن تلوں سے ہر کوئی تیل نہیں نکال سکتا بلکہ یہ صنفِ ادب تو پہلے آپ کا تیل نکال دیتی ہے۔ ــــ چنانچہ ادب کی تاریخ شاہد ہے کہ بڑے بڑے جغادری ادیب و شاعر بھی اس جان لیوا صنف کو چھیڑنے سے پہلے تمام احتیاطی تدابیر آزما لیا کرتے تھے۔ بہتیروں نے تو فرضی ناموں کے سہارے اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے تاکہ ناکامی کی صورت میں کم از کم دوسری اصنافِ ادب میں تو صورت دکھانے کے قابل رہے۔ اس خصوص میں کئی نام گنوائے جا سکتے ہیں، مثلاً علامہ تاجور نجیب آبادی مرحوم، جنہوں نے علامہ ظریف کے فرضی نام سے بے شمار طنزیہ و مزاحیہ انشائیے اور خاکے لکھے ہیں اور خوب لکھے ہیں۔ لیکن آج کتنے اردو داں ہیں جو اس حقیقت سے

واقف ہوں گے۔ یہی حال مشہور شاعر شاہد صدیقی مرحوم کا ہے۔ جو حیدرآباد کے مشہور اخبار "سیاست" کا مقبول عام کالم "شیشہ و تیشہ" لکھا کرتے تھے۔ اس کالم کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ لوگ محض اس کالم کی خاطر اخبار پڑھتے تھے۔ ان کے علاوہ مولانا چراغ حسن حسرت مرحوم نے سندباد جہازی اور اردو شاعری کی "چٹان" جیسی شخصیت شورش کاشمیری نے بھی اسرار بصری کے فرضی نام سے ادب کے اس بحرِ ذخار میں کافی گہرائی تک غوطے لگائے ہیں اور بے شمار سیپے اور بیش بہا موتی لانے میں کامیاب بھی ہوئے ہیں۔

پتہ نہیں اور کتنے ایسے ادیب و شاعر ہوں گے جنہیں ان کی زندگی میں طنز و مزاح نگار کی حیثیت سے وہ شہرت ملی ہو جس کے وہ متقاضی تھے اور ہیں ــــ اس میں ایک تو اس معاشرے کا بڑا دخل تھا جس میں یہ لوگ سانس لیا کرتے تھے۔ کیونکہ ابتدا میں "طنز و مزاح" لکھنے والوں کے ساتھ اردو والوں کا رویہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا کہ آزادی سے پیشتر اونچی ذات والے برہمنوں کا ہریجنوں کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ بلکہ آج بھی سنجیدہ مشاعروں میں طنزیہ اور مزاحیہ شاعروں کی کم و بیش وہی حیثیت اور اہمیت ہوتی ہے جو مداری کے ہاتھ میں "ڈگڈگی" کی ہوتی ہے پچھلے زمانے میں مختلف اصناف ادب کے "قطب میناروں" پر بیٹھی ہوئی جغادری ہستیاں پتہ نہیں کیوں اس صنف کو دوسری اصناف ادب کی سوتیلی بہن سمجھا کرتی تھیں (ویسے آج بھی ادب کے کچھ نام نہاد "گتے دار" آنکھ موند کر اس سوتیلے رویّے کو اپنائے ہوئے ہیں) آج بھی فرضی ناموں کے سہارے اچھے اچھے مستند ادیب، اس صنف میں طبع آزمائی کرتے نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر کچھ عرصہ قبل ملک کے واحد مزاحیہ رسالے "شگوفہ" میں صاحب طرز ادیب و شاعر عزیز قیسی کی کچھ مزاحیہ منظومات، قلندر بد مست کے فرضی نام سے شائع ہوئیں۔ (خود قیسی صاحب نے اس راز سے پردہ اٹھا کر جرأت رندانہ کا ثبوت دیا ہے) کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ قاتل صنف اس قدر ساحرہ ہے کہ بالخصوص وہ ادیب و شاعر جو اپنے اپنے فن کی معراج کو پہنچ چکے ہوتے ہیں۔ ان کے سر اس کا جادو ضرور چڑھتا ہے۔ اور خوب بولیاں بلواتا ہے ــــ مہندر ناتھ بھی چونکہ اپنے فن کی معراج کو پہنچ چکے تھے۔ اس لئے وہ بھی اس "ساحرہ" کی طرف متوجہ ہوئے۔ اگرچہ کہ انھیں اس صنف ادب کے گیسوؤں کو سنوارنے، اس کی نگاہوں کے "کٹیلے تیروں" اور "رسیلے نشتروں" کو زیادہ سے زیادہ چمکانے کے مواقع نہیں ملے۔ تاہم انھوں نے اس میدان میں جو کچھ اور جتنا بھی لکھا وہ اپنی جگہ اہمیت رکھتا ہے۔ عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ طنز کے نوکیلے نشتروں کی چبھن اور مزاح کا "حیات بخش مرہم" اسی وقت کارگر ہوتا ہے جب ایک ادیب، بے بس، بے کس مجبور ولاچار انسانوں میں ایک ہاتھ سے اپنے حصے کی ساری خوشیاں بانٹے اور دوسرے ہاتھ سے ماحول کی ساری تلخیاں اپنی زندگی کے پیمانے میں گھول کر ہنستے ہنستے پی جائے ــــ طنز اسی وقت بھرپور اور مزاح اسی صورت میں کامیاب ہوتا ہے۔ جب ادیب یا شاعر سماج کی کسی نہ کسی دکھتی رگ کو چھیڑنے میں کامیاب ہو جائے اور سماج کی دکھتی رگ تک پہنچنے کے لئے ایک ادیب کو دکھوں کے بے شمار جہنموں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اپنی ذات کے محدود حصار سے نکل کر کائنات کے درد کو اپنانا پڑتا ہے۔ اپنے "میں" کو، اطراف کے "ہم" میں "ضم" کرنا پڑتا ہے ــــ اور مہندر ناتھ کا "میں" برسوں پہلے اپنے اطراف کے "ہم" میں "ضم" ہو چکا تھا ــــ اگر وہ "صرف" "میں" ہوتے تو اعلیٰ معیاری زندگی کی اس پیشکش کو جس میں کار، فلیٹ سبھی کچھ شامل تھا، یہ کہہ کر ٹھکرا نہ دیتے کہ ــــ "مجھے صرف ایک فلیٹ نہیں بلکہ تین سو فلیٹ چاہئیں، تین سو کاریں چاہئیں، تین سو زندگیوں کے لئے سارے آرام و آسائش چاہئیں ــــ یہ تین سو افراد مہندر ناتھ کا "ہم" تھے۔ فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کے تین سو بے خانماں ادیب، زندگی اور موت کی بھیانک کش مکش سے نبرد آزما۔

اردو زبان و ادب کا یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ طنز و مزاح کے میدان میں "اگنی ریکھا" کی حدود میں رہ کر "دھنش" توڑنے والے "رام" یعنی طنز و مزاح نگار کو "ایودھیا کی جنتا" یعنی اردو والے، ڈگڈگی بجا کر عامل و معمول کا ڈھونگ رچانے والا سسٹرک چھاپ شعبدہ باز اور نہ جانے کیا کیا سمجھتے ہیں، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ طنز و مزاح کے یہ "رام" نہ تو شعبدہ باز ہیں نہ مسخرے، نہ نقال اور نہ ہی "جراحِ قوم" بلکہ یہ تو آگ میں کودنے والے ایسے "فائیر ڈائیورس" (fire divers) ہیں جو محض اس لئے اپنے کپڑوں پر تیل چھڑک کر آگ لگا

ہے کہ "اس اجالے" میں لوگوں کو سماج کے وہ گھناونے مکروہ اور سیاہ پہلو نظر آجائیں جو اُن لوگوں کے اپنے اندر ہی کہیں پوشیدہ ہوتے ہیں۔ اِس کوشش میں ادب کے یہ "رام"، کچھ انعام پاتے بھی ہیں تو صرف "بن باس" کم از کم چودہ برس کا (زیادہ سے زیادہ کی البتہ قید نہیں ہوتی) بقول راجیو مرزا، اردو ادب کے لکشمن یعنی مہندر ناتھ نے بھی "رام" کے اسی "پتھ" (راستے) پر چلنے کی کامیاب کوشش کی ہے ـــــ طنز کا "تیکھا پن" ویسے بھی ان کی تحریروں میں آنکھ میں بینائی اور رگوں میں لہو کی مانند دوڑتا نظر آتا ہے مہندر ناتھ کی اسی خصوصیت پر ادب کے نامور اور جید "پیشی اماموں" نے اس قدر لکھا ہے کہ مجھ "کافر" کا اس سلسلے میں کچھ کہنا چھوٹا منہ اور بڑی بات ہوگی۔ البتہ مہندر ناتھ نے جب جب بھی خالص طنز و مزاح میں طبع آزمائی کی ہے اُن کی طنز کا تیکھا پن، مزاح کی ہلکی اور لطیف مٹھاس کی آمیزش سے اور بھی قابلِ قبول بلکہ زود ہضم ہوگیا ہے۔ "شرافت" اور "قومی درد" مہندر ناتھ کے بھرپور انشائیے ہیں، گو کہ ان میں شروع سے آخر تک طنز کی ایک زبردست لہر کارفرما ہے۔ لیکن ہلکے پھلکے طرزِ تحریر اور شگفتہ الفاظ کے انتخاب نے طنز کی کڑواہٹ اور تلخی کو اس حد تک کم کردیا ہے کہ بات آسانی سے گلے سے اتر جاتی ہے ـــــ "لیجئے ہم نے پھر عشق کیا"، "مرحوم یاد" اور "ہم نے کار خریدی" میں طنز پر مزاح پوری طرح غالب ہے، ان انشائیوں کو پڑھتے ہوئے بار بار لبوں پر مسکراہٹ رقص کرنے لگتی ہے ـــــ ناولٹ "ہیرو سے زیرو تک" طنز و مزاح کے انوکھے سنگم کا ایک اور کامیاب نمونہ ہے۔ اس میں طنز و مزاح کی لہریں ایک ساتھ ہلوریں لیتی، قاری کے ذہنی ساحل سے ٹکراتی ہیں، ایک لہر طنز کی چبھن کا احساس دلاتی ہے تو دوسری لہر اس چبھن میں ایک میٹھی کسک پیدا کردیتی ہے ـــــ

مہندر ناتھ چونکہ فلمی نگری سے وابستہ تھے اور کئی فلمیں انھوں نے لکھی ہیں۔ یہاں اُن کی لکھی فلم "گستاخی معاف" کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کرنا چاہوں گا، حالانکہ فلمی تحریروں کو "ادبی" نہیں مانا جاتا، چاہے وہ کتنی ہی معیاری اور اعلیٰ درجے کی کیوں نہ ہوں۔ لیکن اس ناکام فلم کے کامیاب، برجستہ، چست اور پُر لطف مکالمے اس بات کا ثبوت ہیں کہ مہندر ناتھ کے قلم میں وہ روانی اور وہ گہرائی و گیرائی بھی تھی جن کے بغیر 'طنز و مزاح' کی وادیٔ خارزار میں قدم رکھنا اپنی موت کو آپ دعوت دینے کے برابر ہے۔ اگر مہندر ناتھ کی بے وفا عمر، وفا کرتی تو یقیناً اُن کا زورِ قلم، اردو طنز و مزاح کا تہی دامن بے شمار نادر و نایاب موتیوں سے بھر دیتا۔!!!

مہندر ناتھ

قومی درد

قومی درد، ایک ایسا درد ہے جو خاص طور سے ہندستان اور پاکستان میں ہر خاص و عام کو ہوتا ہے۔ چونکہ صدیوں سے یہ درد تسلسلاً چلا آرہا ہے اس لئے اگر اس درد کو اب سردرد کہا جائے تو بے جا بات نہ ہوگی۔

یوں سردست سردرد کا علاج ہے مگر قومی درد کا ابھی تک کوئی علاج نہیں نکلا۔ مجھے تو قومی درد اور کینسر میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا۔ کیونکہ یہ دونوں بیماریاں ابھی تک لاعلاج ہیں۔

اس درد کے تشخیص کرنے والے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ درد ہندو اور مسلمان کو زیادہ ہوتا ہے، کبھی کبھی سکھ کو بھی ہوتا ہے جب اس قسم کا درد سکھ کو ہوتا ہے تو حملے کی تیزی اور تندی کا مقابلہ کوئی نہیں کرسکتا...... پرماتما کا شکر ہے کہ اس درد کا حملہ سکھ پر بار بار نہیں ہوتا۔ ورنہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کا صفایا ہوجاتا۔ اور اس درد کا اس براعظم سے صفایا ہوجاتا۔

کافی تحقیق کے بعد اس مرض کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس درد کے موجد انگریز تھے مگر اس درد کے تحقیق کرنے والے کوئی آخری فیصلہ صادر نہیں کرسکے۔ فرنگیوں نے جہاں اس ملک کو دو حصوں میں بانٹ دیا۔ وہاں اس درد کو بھی دونوں قوموں میں یکساں تقسیم کر کے چلے گئے تاکہ دونوں قومیں حشر تک آپس میں لڑتی رہیں۔ ایک دوسرے کو قتل کرتی رہیں۔ گو فیملی پلاننگ کے ماہرین کو اس طرف متوجہ ہونا چاہئے۔ کہ اگر دونوں قوموں کی تعداد کو گھٹانا ہے تو اس درد کو قومی پیمانے پر بڑھانا چاہیئے۔ ریڈیو، فلم اور اخباروں کا سہارا لے کر ایک وسیع پیمانے پر ایک عالم گیر تحریک چلائی جائے۔ جس سے ان دونوں قوموں کے افراد میں کافی کمی ہوسکتی ہے۔

اعداد و شمار اور سائنسی نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر ہمارے لیڈر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ قومی درد پڑھے لکھوں کو زیادہ ہوتا ہے اور ان پڑھوں کو کم ـــ دراصل اس درد کی ابتدا پڑھے لکھوں سے ہوتی ہے اور ان پڑھوں تک پہنچ کر انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔

اس درد کی سب سے بڑی خاصیت یہ ہے کہ درد خاص کر اس کو ہوتا ہے جسے کبھی درد نہیں ہوتا۔ یہ درد اکثر دور دور سے شروع ہوتا ہے۔ اس درد کو آپ وبائی یا ہوائی بھی کہہ سکتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی ہندو مشرقی پاکستان یا مغربی پاکستان میں مارا گیا ہو تو مرنے والے کا غم اس کے متعلقین کو نہیں ہوگا۔ مگر جس مذہب سے مرنے والے کا تعلق ہوتا ہے وہ غم اور غصے سے بیتاب ہوجاتے ہیں۔ غم سے کم غصے سے زیادہ۔ مثال کے طور پر اس درد کا دورہ مدھیہ پردیش کے ہندوؤں پر ضرور ہوگا۔ جیسے ہی اگر کوئی مسلمان ہندوستان میں مارا جائے تو اس کے مرنے کا غم اس کے رشتہ داروں کو تو ہوگا مگر سب سے زیادہ غم مغربی پاکستان کے مسلمانوں کو ہوگا۔

یہ درد ایک فرد سے شروع ہو کے۔ ایک طوفان بدتمیزی اختیار کرلیتا ہے۔ آخر میں دونوں قومیں صف آرا ہو کے میدان میں نکل آتی ہیں۔ اور ایک دوسرے کا خون بہا کے گھروں کو واپس لوٹ جاتی ہیں۔ اس کے بعد اس درد کا تذکرہ روزنامہ پرچوں، ہفت روزہ

اخباروں اور رسالوں میں خوب زور شور سے کیا جاتا ہے۔ بڑی بڑی سرخیوں میں اس جنوں کو بے نقاب کیا جاتا ہے۔ بڑے شاندار اور جاندار جلوس نکالے جاتے ہیں۔ انہی جلوسوں میں ظالمانہ اور جاہلانہ تقریریں کی جاتی ہیں۔ یہ تقریریں جاہلانہ زیادہ ہوتی ہیں ظالمانہ کم۔ پھر حکومت کمیشن بٹھاتی ہے۔ جج فیصلہ کرتے ہیں کہ کس قوم کی زیادتی تھی۔ پھر اس امر پر غور کیا جاتا ہے۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے کلچر کا تحفظ کیا جائے۔ ہندو اپنے کلچر کے تحفظ کے لئے شور و غل مچاتے ہیں اور مسلمان اپنی بقا کے لئے خون کے آنسو بہاتے ہیں۔

دونوں قومیں اپنے اپنے کلچر کی حفاظت کرنا چاہتی ہیں حالانکہ ان دونوں کا کلچر agriculture سے زیادہ اہم نہیں ہے اس درد کو نیست و نابود کرنے کے کئی طریقے سوچے گئے۔ اور آزمائے بھی گئے۔ کچھ عرصے کے بعد پتہ چلا کہ سوچنے اور آزمانے والے کو نیست و نابود ہو گئے۔ مگر اس درد میں کمی نہ ہوئی۔ کبھی کبھی یوں بھی سوچا گیا کہ بڑے بڑے پلیٹ فارموں پر ہندوؤں اور مسلمانوں کو اکٹھا کیا جائے، بلکہ اکٹھا کیا گیا۔ اور دونوں سے کہا گیا کہ گلے لگ جاؤ۔ بھائیو۔ مگر گلے ملنے کی بجائے دونوں کے ہاتھ ایک دوسرے کے گریبان تک پہنچ گئے۔ یعنی درد بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔

عجیب بات یہ ہے کہ یہ درد پیٹ میں نہیں ہوتا۔ یہ درد پہلے دماغ سے شروع ہوتا ہے۔ وہاں سے اس کا زہر سارے جسم میں سرایت کرتا ہے۔ آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ ہو جاتی ہیں۔ منہ سے کف نکلنے لگتی ہے جسم پر ایک تشنج سا طاری ہو جاتا ہے۔ اور آدمی چھرا یا پستول یا لاٹھی لے کر باہر کی طرف لپکتا ہے۔ اس وقت اس کی حالت پاگلوں کی طرح ہو جاتی ہے۔ اپنے آپ پر قابو نہیں رہتا۔ اس درد کو کم کرنے کے لئے دوسروں کے پیٹ میں چھرا گھونپ دیتا ہے۔ پھر ہر ہر مہادیو یا اللہ اکبر کا نعرہ لگا کے ناچنے لگتا ہے۔ بس اسی طرح باقی لوگ بھی اس درد میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ درد صرف مردوں کو ہوتا ہے۔ عورتوں کو تو ہوتا ہی نہیں۔

کئی بار اس قسم کے بیماروں کو قتل کے بعد اس بات کا پتہ چلا کہ مرنے والا اس کا ہم مذہب تھا۔ غصے سے بپھر کر وہ بھڑکی ایک کو مارنے چلتا ہے۔ اور جب کوئی انسان اسے نہیں ملتا۔ تو دیواروں سے ٹکریں مار کر خود مر جاتا ہے۔ اس قسم کے مریضوں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔ اگر اس قسم کے مریضوں کی تعداد بڑھ جائے تو شاید اس مرض کا علاج نکل جائے۔ دراصل اس مرض کے تحقیق کرنے والوں کو اس قسم کے مریضوں کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔ شاید انہی مریضوں سے کوئی اکسیر نکل آئے۔ کیونکہ جن مریضوں میں احساسِ گناہ ہوتا ہے انہی کے خون سے کوئی کیمیائی مرکب تیار کیا جا سکتا ہے جو آگے جا کر اس درد کی دوا بن جائے۔

اکثر ہندوؤں سے کہا جاتا ہے کہ اس دردِ مسلسل کو کم کرو تو وہ فرماتے ہیں کہ یہ مشورہ مسلمانوں کو دو، ان سے کہو کہ وہ اس سر درد کو کم کریں۔ اگر مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا جائے کہ وہ اس درد سے بچنے کی کوئی راہ نکالیں تو وہ کہتے ہیں کہ اس کا آغاز تو ہندو کرتے ہیں۔ دراصل دونوں قومیں اتنی معقول اور ساتھ ہی نامعقول ہیں کہ کوئی بھی اس درد کو کم کرنے کے لئے تیار نہیں۔

یہ درد اکثریتی کمیونٹی کو اس لئے ہوتا ہے کہ اس کی تعداد اقلیتی کمیونٹی سے زیادہ ہے، اور اقلیتی کمیونٹی کو اس لئے ہوتا ہے کہ اس کی تعداد اکثریتی کمیونٹی سے کم ہے۔ دونوں ہی ایک دوسرے سے خائف نظر آتی ہیں۔ یوں تو مفکروں نے کہا ہے کہ جس قوم کو قومی درد نہیں ہوتا وہ قوم کبھی ترقی کے زینے پر نہیں چڑھ سکتی۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جس قوم کو یہ درد ہوتا ہے۔ وہ قوم بڑی بے درد ہوتی ہے۔ ▲

مہندر ناتھ

بے ڈھنگا آدمی

میں اکثر فرصت کے اوقات اپنے دوست ہری کے پاس جاتا ہوں، تاکہ کچھ گپیں ہانکوں، کچھ باتیں سنوں اور کچھ سناؤں، یوں بھی گھر بیٹھے بیٹھے جی اکتا جاتا ہے۔ جب کبھی میں اپنے دوست ہری رام سے ملتا ہوں تو وہ نہایت اخلاق اور خلوص سے پیش آتا ہے، اپنا کام چھوڑ کر مجھے چائے پلاتا ہے، چائے پیتے پلاتے وہ ادھر ادھر کی باتیں کرے گا۔ صبح کے اخبار کی سرخیوں پر خامہ فرسائی کرے گا۔ کانگریس کے لیڈروں پر طبع آزمائی کرتے ہوئے وہ آر۔ ایس۔ ایس کی طرف آئے گا اور اگر یہاں سے بھی طبیعت سیر نہ ہوئی تو کمیونسٹوں پر خیال آرائی ہوگی۔ مطلب یہ کہ یہاں آکر جی بہل جاتا ہے، کچھ وقت نہایت آرام اور سکون سے کٹ جاتا ہے۔ میرے دوست ہری رام کے پاس ایک چھوٹا سا کمرہ ہے۔ اسی میں اس کا دفتر ہے اور اسی کمرے میں وہ کام کاج کرتا ہے۔ اس کا ایک اسسٹنٹ ہے جو مجھے کبھی پسند نہ آیا۔ میرے خیال میں اگر آپ اُسے دیکھیں گے تو شاید آپ بھی اس کی صورت دیکھ کر منہ موڑ لیں۔ دیکھنے میں نہایت ہی کریہہ المنظر عجیب بے ڈھنگا سا آدمی۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی، جن میں سے اکثر پانی رستا رہتا ہے۔ ہاتھ کی انگلیاں موٹی اور بھدی۔ جیسے کسی مجرم کی ہوتی ہیں۔ بس یوں سمجھئے کہ شکل و صورت پر لعنت برستی ہے۔ بھلا ایسے آدمی سے کون بات کرے۔

جب کبھی ہری رام اسے کوئی کام کہتا تو وہ نہایت خاموشی سے بات سنتا اور پھر ایک مسکین صورت بنائے ہوئے کمرے سے باہر نکل جاتا۔ تھوڑے عرصے کے بعد وہ واپس آتا۔ ہاتھ ملتا ہوا۔ گردن کو ایک طرف جھکائے۔ وہ ہری رام سے مخاطب ہوتا۔ ہری رام اس کی باتیں سنتا۔ لیکن وہ فائیل سے کبھی اپنی نگاہیں نہ ہٹاتا اور پھر سر ہلا کر اُسے کوئی اور کام بتا دیتا۔

وہ اکثر ہماری باتیں سننے کی کوشش کرتا۔ اور ہم دونوں اسے ہمیشہ دور رکھنے کی کوشش کرتے۔ کبھی کبھار وہ میری طرف دیکھ کر مسکراتا۔ جیسے وہ دوستی اور رفاقت کا ہاتھ بڑھا رہا ہو۔ لیکن اس کی صورت دیکھ کر مجھے ایک گھن سی آجاتی۔ اور میں ہری رام سے باتیں کرنے لگتا۔ جب کبھی میں ہری رام سے ملنے جاتا۔ یہ شخص وہاں ضرور ہوتا۔ مجھے اس شخص سے کچھ نفرت سی ہوگئی تھی۔ اور خاص کر اس قسم کے بے ڈھنگے آدمی مجھے اچھے نہیں لگتے۔

ایک دن دوپہر کے وقت میں ہری رام سے ملنے چلا گیا۔ ہری رام باہر گیا ہوا تھا۔ "ہری رام کہاں ہے؟" میں نے اس بے ڈھنگے آدمی سے پوچھا۔ میرا لہجہ کرخت تھا۔ "وہ باہر گئے ہوئے ہیں۔" اُس نے نہایت متانت اور خاموشی سے جواب دیا۔

میں نے اس سے زیادہ بے تکلف نہ ہونا چاہا۔ اس لئے جانے کے لئے کرسی سے اُٹھنے لگا۔

"بیٹھئے صاحب۔" اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"کتنا نامعقول آدمی ہے ؟" میں نے سوچا۔

"چائے پیجئے گا ؟" آواز میں خلوص تھا۔

"جی نہیں" میں نے روکھے لہجے میں کہا۔

"صبح کے اخبار میں لکھا تھا" وہ کہنے لگا۔

میں نے اس کی طرف نہ دیکھا ۔۔۔ اور وہ رک گیا۔ میں نے سوچا ۔۔۔ اچھا جی۔ آپ کو اپنے مالک کی بیماری لاحق ہو گئی ہے۔ اور شاید آپ سوچ رہے ہیں کہ میں بالکل اسی طرح آپ سے باتیں کروں گا۔ جس طرح اس کے مالک سے کرتا ہوں۔ اپنی پوزیشن کو یہ سمجھتا ہی نہیں ۔ بڑا ہی نامعقول آدمی ہے۔

"جواہر لال جی نے رات کو ریڈیو پر کہا تھا" اس نے پھر سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اور دل میں سوچا آپ بھی سیاسی مسئلوں پر بحث کرنے لگے۔ میں نے اپنے وقار اور سنجیدگی کو قائم رکھتے ہوئے کہا "ہری رام کب آئے گا ۔؟"

"وہ آتے ہی ہوں گے ۔ آپ تشریف رکھئے نا" اُس نے سگریٹ پیش کیا۔ اس نے سگریٹ اس انداز سے پیش کیا جیسے اسے میرے رویئے سے کوئی ٹھیس نہ پہنچی ہو۔

"آپ کوئی کتاب پڑھنے کے لئے دیجئے ؟"

"لیجئے صاحب یہ لوگ بھی کتابیں پڑھنے لگے۔ اب تو اردو ادب کا اللہ ہی مالک ہے۔" میں نے سگریٹ کی پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ میں اکثر ہری رام کو کتابیں پڑھنے کے لئے دیتا ہوں۔ لیکن اس شخص کو کیا حق ہے کہ وہ مجھ سے کتابیں پڑھنے کے لئے مانگے۔ یہ کتاب خاک پڑھے گا۔ محض اپنے مالک کی نقل کرنا چاہتا ہے۔ اور کچھ نہیں ۔" میں نے سوچا۔

بے ڈھنگا آدمی کہنے لگا۔ "آپ جو کتابیں ہری رام کو دیتے ہیں۔ پہلے میں انہیں پڑھتا ہوں۔ پھر انہیں دیتا ہوں۔ تھوڑی بہت اردو پڑھ لیتا ہوں۔ ہری رام کو فرصت نہیں ملتی ۔"

اُس نے ہری رام کا نام اس طرح لیا۔ جیسے وہ ہری رام کا نام نہیں لے رہا بلکہ گھسیٹا رام کا نام لے رہا ہو یا لدو رام کا نام لے رہا ہو۔

"وہ اکثر رات بھر باہر رہتے ہیں اور سارا کام مجھے کرنا پڑتا ہے۔ بڑے آدمی ٹھہرے صاحب ۔ ہم تو غریب آدمی ہیں ۔ چالیس روپے ماہوار ہی تنخواہ پاتے ہیں ۔ بڑی مشکل سے دو وقت کھانا کھاتے ہیں ۔ ایک بار ریس میں گھوڑا جیتا تھا تو دس روپے زائد ملے تھے۔ وہ دس روپے میں نے اپنی بوڑھی ماں کو بھیج دیئے تھے ۔ ہری رام تو کئی سو روپے ریس میں ہار جاتے ہیں ۔ لیکن انھیں کس بات کی پروا ہے ۔ وہ اس دکان کے مالک ہیں اور ہم ٹھہرے نوکر ۔۔۔"

دراصل میں اس کی باتیں ضرور سنتا ۔ لیکن جس انداز سے وہ ہری رام کا ذکر کر رہا تھا۔ اس کے لب و لہجہ میں تضحیک کا پہلو نمایاں تھا۔ میری رائے میں ایک نوکر کو اپنے مالک کا نام بڑے ادب سے لینا چاہئے ۔ یہاں تو صاحب وہ صاف کہہ رہا تھا کہ ہری رام یہ کرتا ہے۔ وہ کرتا ہے ۔ اور اس نے پھر شکایتیں شروع کر دیں ۔ میں نے سوچا کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔ تم جاہل اور ان پڑھ ٹھہرے ۔ ہری رام نے تم پر ترس کھایا ، اور نوکر رکھ لیا ۔ کیا اتنا احسان کم ہے ۔ اور آپ برابر کہے جا رہے ہیں کہ ہری رام ریس کھیلتا ہے ۔ جوئے میں روپے ہار جاتا ہے ۔ اس دنیا میں کسی پر احسان کرنا پرلے درجے کی حماقت ہے ۔

میں زیادہ عرصے وہاں نہ بیٹھ سکا ۔ اس نے پھر سگریٹ پیش کیا ۔ میں نے سگریٹ پینے سے انکار کر دیا ۔ درحالانکہ سگریٹ کا Brand برا نہ تھا ۔ اس بے ڈھنگے آدمی کے بجائے کوئی اور شخص سگریٹ پیش کرتا تو میں ضرور پیتا ۔

کافی عرصہ گذر گیا۔ میں ہری رام سے ملنے نہ گیا۔ دراصل مجھے اس بے ڈھنگے آدمی سے کچھ چڑ سی ہو گئی تھی۔ ایک دن میں چلا ہی گیا۔ اور ہری سے شکایت بھی کی۔ ہری نے اسے ڈانٹا۔ اور پھر کہنے لگا۔ "یار چھوڑو اسے۔ کس کا ذکر لے بیٹھے۔ ایسے آدمیوں کو دو وقت کھانا مل جائے تو کمبخت سر پر چڑھ آتے ہیں۔ اُردو کے دو چار لفظ کیا پڑھ لئے کہ کتابیں پڑھنے کا شوق پیدا ہو گیا۔ لیکن دوست، 'کلچر' کتابیں پڑھنے سے نہیں آتی، خون میں ہوتی ہے۔ جو میں بات کرتا ہوں۔ اس کی نقل کرتا ہے۔ میں لوگوں کو چائے پلاتا ہوں تو آپ جناب میری غیر حاضری میں میرے دوستوں کو چائے پلاتے ہیں۔ گو میرے دوستوں میں ایسا کوئی نہیں جو اس کے ساتھ بیٹھ کر چائے پینا گوارا کرے۔ چائے کے علاوہ آپ ہر شخص کو سگریٹ پیش کرتے ہیں خود بیڑی پیتا ہے لیکن میرے دوستوں کو گولڈ فلیک یا کیپسٹن کا سگریٹ پیش کرے گا۔ اُن سے بڑی محبت اور خلوص سے پیش آئے گا۔ ان سے سیاسی مسائل پر بحث کرے گا۔ وہ بے چارے میری خاطر دو چار باتیں کر لیتے ہیں۔ اور یہ صاحب سمجھتے ہیں کہ میرے دوست اس کی عزت کرتے ہیں۔ کسی دن میں سالے کو ایسی کھری کھری سناؤں گا کہ بچہ جی کو اپنی اصلی صورت نظر آ جائے گی۔

جب پہلی بار یہ شخص میرے پاس آیا تھا تو بالکل ایک بھک منگا دکھائی دیتا تھا۔ پھٹے ہوئے کپڑے، داڑھی بڑھی ہوئی۔ آنکھوں سے پانی رستا ہوا۔ پچکے ہوئے گال، لڑکھڑاتی ہوئی چال، آواز میں نقاہت، چہرے پر دحشت۔ یعنی بالکل نا مناسب دکھائی دیتا تھا۔ مجھے دیکھ کر رو پڑا، اور میں نے اس کے حال پر ترس کھا کر نوکر رکھ لیا۔ اور ان دو سالوں میں اس کی کایا پلٹ گئی۔ آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ گال بھر گئے۔ اور اب جناب منہ سے دھواں نکالتے ہیں، یار دوستوں کو چائے پلاتے ہیں اور تو اور سیاسی مسائل پر بحث کرتے ہیں۔ جواہر لال اور راجندر پرشاد کو کچھ سمجھتے ہی نہیں۔ بڑے آئے تیس مار خاں۔ ہری رام کا حقارت سے ایک ہونٹ ایک طرف کو کھنچ گیا۔

"سگریٹ پیو گے۔" ہری نے گولڈ فلیک کا ڈبہ پیش کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے سگریٹ پینا چھوڑ دیا ہے۔"

"یہ بھی اچھا کیا تم نے۔ ہمارا ایک سگریٹ تو بچا۔ زندگی میں پہلی بار تم نے اچھا کام کیا۔ جانتے ہو۔ صاحب اب کیا کہتے ہیں فرماتے ہیں کہ سارا کام سیکھ گیا ہوں۔ یعنی اگر میں دوکان پر نہ ہوں تو آپ میرے کام پر اصلاح فرماتے ہیں۔ اور دوسروں کو کہتے ہیں کہ ہری رام کو تو کچھ نہیں آتا۔ سارا کام میں کرتا ہوں۔ میں مزے سے باہر گھومتا رہتا ہوں اور سارا کام اسے سونپ دیتا ہوں۔

"چلو چائے پئیں۔"

ہم دونوں ساتھ والے ریستوراں میں چلے گئے۔

ہری نے چائے کا آرڈر دیا۔

چائے آئی۔ ہری سیاسی موضوع پر گفتگو شروع کرنے والا تھا کہ وہ بے ڈھنگا آدمی آ گیا۔ اور ہمارے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کا یوں بیٹھنا ہمیں اچھا نہ لگا۔ دراصل ہری کبھی یہ نہ چاہتا تھا کہ اس کا اسسٹنٹ اس کے ساتھ والی کرسی پر اس کے دوست کے سامنے بیٹھ جائے۔ لیکن ہری نے جمہوریت، اخوت اور انسانی برادری پر چند کتابیں پڑھی تھیں اور کچھ نئے فیشن کو اپناتے ہوئے خاموش رہا۔ تاکہ ارد گرد کے لوگ یہ سمجھ لیں کہ اب وہ کمیونسٹ ہو گیا ہے۔ کمیونسٹ بننے کی یہ ترکیب اچھی رہی۔ میں نے سوچا۔

بے ڈھنگے آدمی نے جیب سے سگریٹ نکالا اور مجھے پیش کیا۔

میں نے سگریٹ ہری کے ڈبہ سے لیا۔

وہ دیا سلائی لے کر آگے جھکا۔

"تم نے تو سگریٹ پینا چھوڑ دیا تھا۔" ہری چلّایا۔

میں نے سگریٹ ڈبے میں رکھ دیا۔ بے ڈھنگا آدمی ذرا شرمندہ ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ میرے رویّے سے وہ کافی پریشان ہوا

ہوگا۔ میں بھی یہی چاہتا تھا۔ کہ وہ اپنی حد کے اندر رہے۔

میں زیادہ بات نہ کر سکا۔ بھلا اس کی موجودگی میں کیا بات کرتے۔ ہم اگر باتیں کرتے تو وہ ضرور ٹانگ اڑاتا۔ اپنی بے ہودہ رائے کا اظہار کرتا۔ بالکل اسی انداز میں ہم سے بات کرتا۔ جیسے اس کی پوزیشن اور ہماری پوزیشن میں کوئی فرق نہ تھا۔ کم از کم مجھے یہ بات بالکل ناپسند تھی۔ نہ جانے ہری کس طرح اس رویّے کو برداشت کر رہا تھا۔ میں تو ایسے آدمی کے ساتھ بات تک کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ہم دونوں ریستوران سے باہر نکل گئے۔

اسی طرح کچھ دن اور گذر گئے۔ ایک دن شام کے وقت جب میں بازار میں سے گذر رہا تھا۔ کسی نے مجھے پکارا۔ میں نے مڑ کر دیکھا وہی بے ڈھنگا آدمی کھڑا تھا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر نمستے کی۔ میں نے جلدی سے پیچھا چھڑانا چاہا۔ لیکن اس نے اپنی بات شروع کر دی۔ آپ کافی دنوں سے دفتر نہیں آئے۔ میں نے ہری رام کا کام کاج چھوڑ دیا ہے۔ ایسے صاحب! یہ لوگ۔ ہمیں انسان ہی نہیں سمجھتے۔ مانا کہ ہم ان کے نوکر ہیں لیکن انھیں گالی دینے کا کیا حق ہے۔ بابو صاحب۔ چھوٹی سی بات پر لڑائی ہو گئی۔ رات وہ دفتر میں شراب پی کر آیا۔ کہنے لگا۔ "میرا کھانا لائے ہو؟ بھلا میں کہاں سے لاتا۔ وہ کہنے لگا۔ کیا تمہیں نہیں معلوم۔ آج مجھے یہاں کام کرنا تھا۔ "مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ یہاں آ رہے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔ یہ سن کر وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ اور لگا گالیاں دینے۔ میں نے خاموشی سے اس کی گالیاں سنیں۔ اور میں نے صرف یہ کہا کہ۔ "میں کل سے آپ کے ہاں کام نہیں کروں گا۔"

وہ کہنے لگا۔ "نکل جاؤ یہاں سے اور میں نکل آیا"۔ وہ باتیں کر رہا تھا اور میں اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اور اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے پھٹے ہوئے کپڑوں کو دیکھ رہا تھا۔ اُس کے پچکے ہوئے گالوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے کانپتے ہوئے ہونٹوں کو دیکھ رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے بہتے ہوئے پانی کو دیکھ رہا تھا۔ اُس کی حالت دیکھ کر پہلی بار میرے ذہن اور دل میں ہمدردی کے جذبات اُبھرے۔ میں نے کہا "کوئی بات نہیں۔ میں کل جا کر سارا معاملہ ٹھیک کر دوں گا۔ تم کوئی فکر نہ کرو۔ تمہیں وہ اپنے دفتر میں نوکر رکھ لے گا۔"

"نہیں بابو۔ ایسی بات نہیں۔" بے ڈھنگا آدمی چلّایا۔ "میں ہری رام کی نوکری نہیں کروں گا۔ میں مر تا مر جاؤں گا۔ لیکن ہری رام کی نوکری نہیں کروں گا۔ میں محنت کر سکتا ہوں، مزدوری کر سکتا ہوں۔ اگر کوئی کام نہ ملا تو ریلوے میں قلی بھرتی ہو جاؤں گا۔ سبزی، پھل، مونگ پھلی بیچوں گا۔ لیکن ہری رام کی نوکری نہ کروں گا۔ میں نوکری کے لئے کوشش کر رہا ہوں۔ لیکن ابھی تک ملی نہیں۔ ہری رام نے مجھے نوٹس بھی نہیں دیا۔ صاحب ہم نے کتنی خدمت کی ہے۔ رات رات کام کیا ہے۔ کبھی زائد روپے نہیں مانگے۔ کبھی بونس نہیں مانگا۔ کبھی انھوں نے ترقی نہیں دی۔ پھر بھی کام کرتے تھے اور دو وقت کھانا کھاتے تھے۔ اور یہ صاحب خود عیش کرتے ہیں۔ دن رات باہر گھومتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

"معاف کیجئے گا۔ میں نے یوں ہی آپ کا وقت ضائع کیا۔ آپ سگریٹ پیجیئے گا۔" اس نے بیڑی پیش کی۔ میں نے بیڑی نہیں پی۔ وہ چپکے سے بھیڑ میں گم ہو گیا۔

میں راستے میں سوچتا رہا۔ غریب آدمی ہے۔ یونہی جوش میں آ کر نوکری چھوڑ دی۔ فاقے لگیں گے تو طبیعت صاف ہو جائے گی۔ مجھے اُس بے ڈھنگے آدمی کی خود اعتمادی پر اور اس کی حساس طبیعت پر اور اس کی اَنا کو دیکھ کر ذہن میں ایک شدید دھکا لگا۔ شاید اب تک میں ان چیزوں پر صرف اپنا حق جتا تا رہا ہوں۔ یہ حق میرے ہاتھوں سے چھینا جا رہا تھا۔ لیکن دل کے ایک کونے میں کوئی کہہ رہا تھا کہ بے روزگاری کے زمانے میں یہ اکڑ فوں نہیں چل سکتی وہ معافی مانگنے آئے گا اور ضرور آئے گا۔ اور اسی بات کا پتہ لگانے میں دوسرے دن ہری کے پاس گیا۔ وہ خود بے ڈھنگے آدمی کی اکڑ فوں اور اس کے رویّے سے بھرا بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگا۔ "اب بچّہ جی کو معلوم ہوگا جب وہ پائی پائی کے لئے ترسے گا۔ وہ فاقے کرے گا۔ اس کی ماں فاقے کرے گی۔ کپڑے پھٹ جائیں گے۔ کھولی سے نکال دیا جائے گا۔ فٹ پاتھ پہ ٹھٹھر ٹھٹھر کر مر جائے گا۔ تو وہ میرے پاس

ایک بھکاری کی طرح آئے گا اور نوکری مانگے گا۔ میں نہیں دوں گا نوکری اُسے۔ نہیں دوں گا نوکری۔"

"تم چائے پیو گے؟"

میں نے انکار کر دیا۔

"سگریٹ — ؟"

"وہ کب کا چھوڑ چکا۔"

میں نے بے ڈھنگے آدمی کی وکالت کرنا چاہی لیکن ہری کا موڈ دیکھ کر میں خاموش سا ہو گیا۔
آج مجھے اس کی باتیں پسند نہ آئیں۔ اس کی باتوں میں رفیقانہ جذبہ نہ تھا۔ انسان کو انسان سمجھنے کی کوشش کارفرما نہ تھی۔ صرف مالک اور نوکر کا جذبہ ایک دوسرے کے مدمقابل کھڑا تھا۔ ایک احساس برتری کا جذبہ۔ ایک انتقامی جذبہ۔ اس کے دل و دماغ پر حاوی تھا۔ اس دن ہری رام نے سیاسی مسائل پر بحث نہ کی۔

اس طرح اس واقعے کو تین چار مہینے گزر گئے۔ ذہن میں بے ڈھنگا آدمی ایک کانٹا بن کر چبھ رہا تھا۔ میں اس کانٹے کو نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن کوشش کے باوجود وہ اندر گھستا جا رہا تھا۔ ایک دن سوچا چلو ہری سے مل کر پوچھیں۔ بے ڈھنگے آدمی کا کیا حشر ہوا۔ کیا اس کے ہوش ٹھکانے لگے یا نہیں۔ کیا اس کی عزت، وقار اور خود اعتمادی کا خول ابھی تک قائم تھا۔ یا وہ ایک بھکاری بن کر دوبارہ ہری رام کی بارگاہ میں حاضر ہو گیا تھا۔ ہری رام کی دوکان سے دس قدم اِدھر بے ڈھنگا آدمی مل گیا۔ مجھے اُسے دیکھ کر خوشی ہوئی۔ کمبخت واپس آگیا۔ اس نے مجھے دیکھ کر نمستے کی۔

"آپ ملتے ہی نہیں۔" اس نے میرے متفکر چہرے کی طرف دیکھا۔ چہرے پر سکون تھا۔ خود اعتمادی کی جھلک تھی۔

میں نے سوچا۔ ہری نے ضرور مہینے کی تنخواہ دی ہوگی۔

"کیا حال ہے تمہارا۔" میں نے فتح اور کامرانی کے جذبے سے مغلوب ہو کر کہا۔

"اچھا ہے صاحب! مزے سے کام کرتے ہیں۔ اور کھاتے ہیں۔ اپنا آفس کھول لیا ہے۔"

"اپنا آفس ؟" میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"جی ہاں میں نے اپنا آفس کھول لیا ہے۔ آپ آئیے نا۔ وہی کام کرتا ہوں جو ہری رام کرتا تھا۔ ایک اور ساتھی میرے ساتھ کام کرتا ہے۔ ہم دونوں محنت کرتے ہیں۔ نہ کسی کی گالی نہ کسی کا طعنہ۔ صرف محنت۔ دن رات کی محنت اور کچھ نہیں۔ ہری رام کہتا ہے کہ ہم نے اس کا بزنس تباہ کر دیا ہے۔ صاحب ہم کام کرتے ہیں اور دو وقت کھانا کھاتے ہیں۔ اب وہ کہتا ہے کہ میں نے کب نکالا تھا۔ میں تو خود ہی چلا آیا تھا۔ صاحب مجھے اس بات کا گلا نہیں کہ انھوں نے مجھے کیوں نکالا۔ لیکن انہیں ہمارے ساتھ انسانوں ایسا تو سلوک کرنا چاہیے تھا۔

"چائے پیجیے گا۔"

"شکریہ"۔ میں نے جل کر کہا۔

"سگریٹ۔" اس نے سگریٹ کی ڈبیہ آگے کرتے ہوئے کہا۔

میں نے دونوں چیزیں پینے سے انکار کر دیا۔

"آپ ضرور ہمارے دفتر آئیے گا۔" شام ہو چکی تھی۔ میں زیادہ عرصہ اس سے باتیں نہ کر سکا۔

میں نے اس کے دفتر آنے کا وعدہ کیا۔

لیکن اس کے دفتر نہ جا سکا۔ میں سیدھا ہری کے دفتر پہنچا۔ وہ کچھ بھنّایا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی زبان قینچی کی طرح

چلنے لگی۔ "میرا ہی نمک کھا کر اسی نے میرے پیٹ پر لات ماری۔ اُس سالے کی کرتوت دیکھی میرے مقابلے میں جا بیٹھا۔ اِن کمینے لوگوں پر احسان کرو تو بچھو کی طرح ڈنک مارتے ہیں۔ میں نے سارا کام سکھا دیا تھا۔ وہ میرے دفتر کے ہر بھید سے واقف تھا۔ اب ڈی ڈی روڈ پہ جا کر دفتر کھول لیا۔ اور میرے گاہکوں پر ڈورے ڈالنے شروع کر دئے۔ اور اب ایں جناب مالک بنے بیٹھے ہیں۔ ذات کے چمار اور آج دفتر کے مالک بن گئے۔ میں بچے جی کو ایسی پٹخنی دوں گا کہ ساری عمر یاد کرے گا۔ دو غنڈے بلا کر اس کے سارے دفتر کو تحس نحس کرا دوں گا۔ کہتا ہے۔ کہ میں گالی دیتا ہوں گالی نہ دوں تو کیا پھولوں کا ہار پیش کروں۔ آپ ماہرِ سیاست بنے بیٹھے ہیں۔ جواہر لال، راجندر پرشاد اور کمیونسٹوں پر رائے زنی کرتے ہیں کہتا ہے۔ کمیونسٹوں کا راج اچھا ہوتا ہے۔ مانا کمیونسٹوں کا راج اچھا ہوتا ہے۔ لیکن پہلے کچھ پڑھ لکھ لو۔ انگریزی کا ایک حرف نہیں آتا اور آپ فرماتے ہیں کہ کمیونزم ہندوستان میں آنا چاہئے۔ تم ہی بتاؤ ایسے آدمیوں کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہئے۔"

جو گاہک آتا ہے اُسے کم ریٹ بتاتا ہے۔ کہتا ہے۔ "کم کماؤں گا۔ کم کھاؤں گا۔" بھائی ہمارا تو شاہانہ خرچ ہے۔ ریس کھیلتا ہوں۔ شراب پیتا ہوں۔ موٹر اور ٹیکسی کی سیر کرتا ہوں۔ دوستوں کو چائے اور کافی پلاتا ہوں۔ اور آپ کا کیا خرچ ہے۔ ایک گندی کھولی میں رہتے ہیں۔ ایک بیمار ادھ موئی ماں ہے۔ اُس کی تیمارداری میں کیا خرچ ہوتا ہوگا۔ اور جو باقی بچتا ہے۔ اس کا راشن خرید لیتے ہیں۔ ہمارا کیا مقابلہ کریں گے۔

"چائے پیو گے؟"

"نہیں یار" میں نے اکتا کر کہا۔

"سگریٹ"

"زیادہ دل نہ جلاؤ"

"ٹھنڈا لیمن۔؟"

بالکل نہیں۔ اچھا ہری اب اجازت دو۔

شام ہو چکی تھی۔ راستہ صاف اور کشادہ تھا۔ سورج مغرب میں غروب ہو رہا تھا۔ ایک ہلکا سا غبار چاروں طرف چھایا ہوا تھا سڑکوں پر ابھی تک بجلی کے قمقمے روشن نہ ہوئے تھے۔ اور میں اکیلا سٹرک پر پیدل چلتا ہوا یہ سوچ رہا تھا۔ کہ ہم تینوں میں بے ڈھنگا آدمی کون تھا۔؟ ▲

اِک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ
اِک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے

غالب

مہندر ناتھ

لیجئے ہم نے پھر عشق کیا

عشق جیسی لطیف شئے، جس پر ہمارے مشہور و معروف شاعروں اور افسانہ نگاروں نے افسانے لکھ کر غیر فانی شہرت حاصل کی ہے اور بہت سے عاشقوں اور معشوقاؤں نے اپنی زندگی کی بازی لگا کر ابدی داستانوں میں جگہ بنا لی ہے۔ اسے مزاحیہ انداز میں پیش کرنا پرلے درجہ کی حماقت ہے۔ لیکن بندہ نواز، میں بے بس لاچار اور مجبور ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ لیلیٰ مجنوں، ہیر رانجھا، رومیو جولیٹ کے عشقیہ داستانوں نے نوجوانوں کے دلوں پر گہرا اثر ڈالا ہے۔

اور وہ عشق کرنے سے باز نہیں آئیں گے۔ حال ہی میں مرحوم جان کینیڈی کی بیوہ نے ایک ستر سالہ بڈھے سے عشق فرما کر اور اس کے بعد ازدواجی بندھن میں بندھ کر مردوں کی بڑی ہمت افزائی اور عزت افزائی کی ہے۔ اس سے عشق کی راہیں استوار اور ہموار ہوئی ہیں اور عشقیہ ماحول کافی خوشگوار ہوا ہے۔

حضورِ انور! میری عمر پچاس سال سے اوپر ہے۔ میرے سر کے بال سفید ہو چکے ہیں۔ میں خضاب لگا کر عالم شباب کے مزے لینا چاہتا ہوں۔ اسے میری خوش قسمتی سمجھئے یا بد قسمتی۔ کیونکہ ابھی تک میں یہ فیصلہ نہیں کر پایا کہ عشق کرنے والوں کو خوش قسمت سمجھنا چاہئے یا بد قسمت۔ اس کا فیصلہ آپ ہی کیجئے۔ یوں اس سے پہلے میں کئی عشق کر چکا ہوں۔ گو زندگی میں ایک ہی عشق کافی ہوتا ہے۔ مگر میں تو اس صف میں کھڑا ہوں جہاں عشق ایک مسلسل بیماری کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ یعنی جونہی ایک عشق ختم ہوا دوسرا چالو۔

سچ پوچھئے تو میں کہوں گا کہ اس عشق سے پہلے جو میں نے محبت کی تھی وہ بڑی جان لیوا تھی یعنی میں مرتے مرتے بچا۔ اگر آپ نے دنیا کی مشہور عشقیہ داستانیں پڑھی ہوں گی تو آپ کو پتہ ہوگا کہ عشق کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ اس سے بدتر کوئی کام نہیں۔ میری حالت عشق شروع ہوتے ہی بگڑنے لگتی ہے۔ میں فوراً جذباتی سا ہو جاتا ہوں۔ اپنی پچھلی محبتوں کو بھول جاتا ہوں اور جس سے محبت کرتا ہوں اسے اپنی پہلی محبت سمجھنے لگتا ہوں یعنی دل و جان سے فدا ہو جاتا ہوں۔ اُلٹے سیدھے وعدے کرتا ہوں۔ اگر میں نے اپنے آپ کو شادی شدہ ظاہر کیا ہے تو میں فوراً اپنی محبوبہ سے کہہ دیتا ہوں کہ میں اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے دوں گا اور تمہارے ساتھ شادی کروں گا۔ تیاگ اور قربانی کے اس جذبے سے متاثر ہو کر محبوبہ بڑی آسانی سے میرے جھانسے میں آ جاتی ہے اور میری گرویدہ ہو جاتی ہے۔ جہاں تک میرے دوسرے چھوٹے موٹے وعدوں کا تعلق ہے۔ مثلاً مقررہ وقت پر ملنا۔ سینما جانا، کسی ریستوران میں جانا یا کھانا کھلانا۔ ان تمام وعدوں کو بڑے سلیقے سے نبھاتا ہوں۔ محبوبہ کو خوش کرنے کے کئی طریقے ہیں۔ مشہور رکو کا پنڈت کے نسخے تو آپ نے آزمائے ہوں گے۔ میرے ایک دو نسخے آزمایئے۔ اس سے فائدہ ہی ہوگا۔ نقصان کی آمد کم ہے۔

سب سے بہترین حربہ جس سے محبوبہ کو اپنایا جا سکتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اپنی زبان سے کچھ نہ کہو۔ اسے کہنے دو۔ وہ

تمہارے پاس بیٹھی ہو۔ تو یوں سمجھو کہ وہ تم سے بہت دور بیٹھی ہے۔ یعنی وہ خود قریب آئے۔ تم خود قریب نہ جاؤ۔ صاف ظاہر ہے کہ اس چکر میں قوت برداشت کی سخت ضرورت ہے۔ یوں تو قوت برداشت کے بغیر کوئی بڑا اور اہم کام ہو ہی نہیں سکتا۔ دنیا کے شہرت یافتہ اور بڑے انسانوں کی زندگیوں کا اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا۔ کہ ان سب میں قوت برداشت کا مادہ سب سے زیادہ تھا۔ محبوبہ کو حاصل کرنے کیلئے اگر اس شکتی سے کام لیا جائے تو کیا قباحت ہے۔ ایک بار جب آپ کی ہونے والی محبوبہ نے خود اپنی زبان مبارک سے یہ الفاظ کہہ دے گی۔ "ڈارلنگ میں تم سے محبت کرتی ہوں ہوں" تو فتح آپ کی جناب۔ اگر کسی وجہ سے آپ کی محبوبہ شرم اور لاج کی دیوی ہے اور وہ صرف اشاروں اور کنایوں سے اس جذبے کا اظہار کرتی ہے۔ تو اس وقت آپ سمجھ لیجئے کہ آل کلیئر کا سگنل مل گیا۔ اب آپ اپنی محبت کا اظہار کر سکتے ہیں۔ سنٹ پرسنٹ جیت آپ کی ہوگی۔ اس طرح آپ رسوائی اور بے عزتی سے بچ جائیں گے۔

دراصل میں راہ سے بے راہ ہو گیا۔ یعنی میں اپنے عشق کا قصہ سنا رہا تھا کہ بیچ میں لڑکیوں کو اپنانے کا طریقہ بتانے لگا۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ آخری عشق کر کے میں نے قسم کھالی تھی کہ اب دوبارہ اس نامراد بیماری کا منہ نہ دیکھوں گا۔ کہ ایک دن اچانک ایک ماہ لقا سے ٹکر لگتے ہی میرا چکر شروع ہو گیا۔ یعنی اس کے سرو قد، گوری رنگت اور چہرے کے خدوخال سے اتنا متاثر اور مرعوب ہوا کہ دنیا و مافیہا کو بھول گیا۔ گو عشق کرنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ میں اس کی طرف رجوع نہ ہوا تھا بلکہ وہ میری طرف رجوع ہوئی تھی۔

محبوبہ کا میری طرف رجوع ہونا خطرے سے خالی نہ تھا۔ یوں بھی اس عمر میں عشق کرنا موت کو دعوت دینا ہے۔ میں جانتا تھا کہ عشق کے شروع ہوتے ہی میرے دل کی رفتار یوں تیز ہوگی جیسے میں کسی راکٹ پر سوار ہوں اور جلد ہی کسی چاند پر اترنے والا ہوں۔ عشق میں صرف دل کی دھڑکنیں ہی تیز نہیں ہوتیں بھوک بھی مر جاتی ہے۔ راتوں کی نیند حرام ہو جاتی ہے۔ کسی دوسرے سے بات کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ ہمیشہ اس بات کی خواہش رہتی ہے کہ محبوبہ آپ کے سامنے بیٹھی رہے۔ کسی رقیب روسیاہ سے بات نہ کرے۔ کسی دوسرے کی طرف نہ دیکھے۔ بس اسی قسم کی جاہلانہ حرکتیں کرنے پر انسان مجبور ہو جاتا ہے۔ عشق کی آخری منزل تو بہت ہی بری ہوتی ہے انسان پاگل سا ہو جاتا ہے۔ بیوی کو اگر آپ کے عشق کا پتہ لگ گیا تو سمجھو جیتے جی موت کا نظارہ آنکھوں کے آگے گھومنے لگتا ہے ایک طرف بیوی کی گالیاں سنو تو دوسری طرف محبوبہ کی آہ و زاریاں۔ کبھی بیوی آنکھیں دکھاتی ہے تو کبھی محبوبہ۔ یعنی ان دونوں کے درمیان عاشق نامراد کی وہ حالت ہوتی ہے جو آج کل ویت نام کی ہو رہی ہے۔ حضور والا! عشق بہت بری بلا ہے۔ ایک بار جب اس نامراد بیماری کی لت پڑ گئی تو کمبخت پان، بیڑی، شراب، افیون، گانجا اور چرس پینے کی لت تو شاید چھوٹ جائے مگر عشق کرنے کی لت نہیں چھوٹتی۔

جب میری حالت بد سے بدتر ہونے لگی اور جان کے لالے پڑ گئے۔ تو میں نے اپنی ماہ لقا سے التجا کی۔ "ڈارلنگ، "میری آنکھوں کے آگے موت ناچ رہی ہے۔ لبوں پر جان اٹکی ہوئی ہے۔ اگر آپ مجھے معاف کر دیں گی تو بڑی عنایت ہوگی آپ کی"

"کیوں جی۔ آپ اتنی جلدی فیڈ اپ ہو گئے ہیں ہم سے۔ ابھی تو ابتدائے عشق ہے۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا"

میں اپنی محبوبہ سے صاف صاف کیسے کہتا کہ جانِ من۔ یہ کھیل میں کئی بار کھیل چکا ہوں عشق اور محبت کی مصیبتیں کئی بار جھیل چکا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ میرا کیا حشر ہونے والا ہے۔ میں قبر میں پاؤں لٹکائے ہوئے ہوں۔ گیس ٹربل کا پرانا مریض ہوں۔ دو قدم چلتا ہوں تو سانس پھولنے لگتی ہے۔ یہ ڈاکٹروں اور حکیموں اور مرغن غذاؤں کا معجزہ ہے کہ میں خوبرو اور خوش شکل نظر آتا ہوں ورنہ میں کب کا شمشان گھاٹ پہنچ جاتا۔ میری حالت زار پر رحم کیجئے دیوی جی اور کسی نوجوان لڑکے سے عشق کیجئے۔

مجھے نوجوان اچھے نہیں لگتے۔ حسینہ نے میرے سوال کا جواب فوراً دیا۔

اس منہ توڑ جواب کو سن کر میں سن ہو گیا۔ کیسا زمانہ آیا ہے جناب۔ کیسی وبا چلی ہے کہ جوان لڑکیاں نوجوانوں سے عشق کرنا

نہیں چاہتیں۔ مغرب سے لے کر مشرق تک۔ یعنی دنیا کے ہر دلیش میں اس نئی بیماری کو فروغ حاصل ہوا ہے یعنی جب سے جان کینیڈی کی بیوہ نے اس راہ کو اپنایا ہے نوجوان لڑکیاں بڈھوں کو اپنانے کی بھرپور کوشش میں مصروف نظر آتی ہیں۔ اور یہ کوشش ایک منظم تحریک کی صورت اختیار کر رہی ہے۔ مجھے تو اس تحریک میں ایک گہری سازش کا پتہ چلتا ہے۔ نوجوان لڑکیوں کی ایک بہت ہی سلجھی ہوئی اور ترقی پسندانہ سیاسی چال ہے۔ مردوں کو ہوشیار رہنا چاہیئے۔ ورنہ جس دنیا پر ان کی حکومت ہے وہ ہاتھ سے نکل جائے گی۔

لیجئے میں اصلی موضوع کی طرف آتا ہوں۔ اپنا قصہ سناتا ہوں۔ میں نے اپنی محبوبہ سے کہا تھا کہ تمہارا عاشق کوئی مالدار آسامی نہیں بلکہ ایک غریب ادیب ہے جسے ٹکوں کو نیشنلائز کرنے کے بعد بھی اس فہرست میں شامل نہیں کیا گیا جنہیں حکومت قرضہ دے گی۔ یعنی ایک رکشا والا سے لے کر ایک موچی تک کو حکومت قرضہ دے گی مگر بیچارے ادیب کو اس قابل بھی نہ سمجھا گیا کہ اسے قرضہ دیا جائے۔ بہرحال جب میری محبوبہ کو میری اقتصادی حالت کا پتہ چلا تو وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ بلکہ اس کی آنکھوں میں آنسو بھی آ گئے اور وہ لمبی لمبی آہیں بھی بھرنے لگی اور کہنے لگی کیا آپ میرے متعلق یہ رائے رکھتے ہیں کہ میں آپ کے بینک بیلنس پر نظر رکھتی ہوں یا میں آپ کو مالدار آسامی سمجھ کر عشق فرما رہی ہوں۔ جی نہیں۔ میں دل و جان سے آپ کو چاہتی ہوں۔ میں اس جنم میں ہی کیا۔ اگلے جنم میں بھی آپ کی ہو کے رہوں گی۔

پھوٹ گئی ری قسمت ہماری۔ یہ جواب سن کر میں سن سا ہو گیا۔ اب تو مجھے یکا یقین ہو گیا کہ میرا کوئی قصور نہیں اس لڑکی کے دماغ میں ضرور کوئی فتور ہے۔ اب آپ ہی بتایئے۔ حضور۔ میں کیا کرتا۔ کاش میں پرماتما ہوتا۔ یا میرے سینے میں گوشت اور پوست کے لوتھڑے کی جگہ سیمنٹ کا دل ہوتا تو ان آہوں، سسکیوں اور آنسوؤں کو نظر انداز کر دیتا۔ بس کیا عرض کروں کہ بندہ ناچیز اور کندہ ناتراش انسان کیا کرتا۔ اس عشق کے چکر میں ایسا پھنسا کہ حالات دگرگوں ہونے لگے۔

عشق کے کئی درجے ہوتے ہیں۔ شروع میں محض رسمی ملاقاتیں۔ بات سے بات بنتی اور بڑھتی ہے۔ ہر روز ملنے کا وعدہ، انتظار، محبت کا اظہار اور ساتھ ہی ہلکا سا پیار، پھر وصل کا وعدہ۔ پھر ہجر کا رنگ گہرا ہونے لگتا ہے۔ پھر ایک اسٹیج ایسی بھی آتی ہے خدا ایسی اسٹیج کبھی نہ لائے۔ جب عاشق معشوق ایک دوسرے سے بیزار ہو جاتے ہیں یعنی ایک دوسرے کی صورت دیکھنا پسند نہیں کرتے آخری اسٹیج کو تجربے کار عاشق بڑی آسانی سے برداشت کر لیتے ہیں۔ ناتجربہ کار عاشق تو اس منزل تک پہنچ ہی نہیں سکتے۔ اس سے پہلے ہی راہی ملک عدم ہوتے ہیں۔

ہاں جب ہجر کی اسٹیج شروع ہوتی ہے تو عاشق کا اصلی امتحان شروع ہوتا ہے۔ ہجر اور فراق کی گھڑیاں بڑی جان لیوا ہوتی ہیں۔ بڑے بڑے عاشقوں کی بولتی بند ہو جاتی ہے۔ انہی لمحات میں اکثر عاشق گریبان چاک کر کے مجنوں بن جاتے ہیں۔ صحرا صحرا جنگل جنگل گھومنے لگتے ہیں۔ ماڈرن مجنوں اپنی جان بچانے کے لئے نرسنگ ہوم یا شفاخانے کی طرف منتقل ہوتے ہیں۔ کئی ایک اونچی بلڈنگوں سے چھلانگ مار کر زندگی ختم کر دیتے ہیں، یا سمندر، دریا، کنوؤں میں چھلانگ لگا کر اگلے جہان کا رخ کرتے ہیں۔ یوں آج کل کے عاشق اتنی دوڑ دھوپ نہیں کرتے، بڑے آرام اور چین سے مرنا چاہتے ہیں وہ بیچارے نیند آور گولیوں کو کھا کر سو جاتے ہیں اور دوبارہ اٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ یہ مرنے کا بہترین طریقہ ہے اور اس میں تکلیف کم ہوتی ہے۔ مرنے میں مزا آتا ہے اس لئے اس طریقے نے ایک وبائی صورت اختیار کر لی ہے جس کی روک تھام بھارتی سرکار کو کرنی چاہیئے۔

چونکہ میں درجنوں عشق کر چکا ہوں اس لئے میں خودکشی کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ میری قوت برداشت تو میری محبوبہ آزما چکی تھی اب میں اپنی محبوبہ کی سہن شکتی کو آزما رہا تھا۔ آخر کب تک وہ اس طرح عشق کرتی رہے گی۔

ایک شام جب ہم دونوں سمندر کے کنارے بیٹھے ہوئے لہروں کو گن رہے تھے کہ میری محبوبہ نے کہا "جس کمرے میں آپ رہتے ہیں کیا وہ کمرہ آپ ہی کا ہے؟"

"کمرہ تو مالک مکان کا ہے، لیکن رہتا میں ہوں اور کمرہ میرے نام پر ضرور ہے۔"

"پرماتما نہ کرے۔ اگر آپ مر جائیں، تو یہ کمرہ کس کے نام کریں گے آپ؟"

میں اپنی محبوبہ کی طرف دیکھنے لگا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اب میری محبوبہ کی قوت برداشت جواب دے رہی تھی۔ اور وہ اپنی اصلی اوقات پر آ گئی تھی۔ گو سوال سے کافی ذہانت ٹپکتی تھی۔ شاید آپ کو معلوم نہیں کہ بمبئی میں نوکری اور چھوکری تو بڑی آسانی سے مل جاتی ہے مگر رہنے کے لئے دو گز زمین نہیں ملتی۔

اس شام میں چپ رہا۔ ہم دونوں سمندر کی لہریں گنتے رہے۔

"کل جواب دوں گا، ڈارلنگ۔ کل اسی جگہ ملیں گے۔"

یہ کہہ کر میں اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا۔

رات بھر سوچتا رہا۔ میری پریمیکا کافی ذہین ہے۔ میں آج تک اسے جاہل اور بے وقوف سمجھتا رہا۔ دراصل جہاں وہ رہتی ہے وہ جگہ بے حد گندی، گھٹیا اور چھوٹی ہے۔ میرا کمرہ کافی کشادہ، صاف ستھرا اور ہوادار ہے اور اب میری محبوبہ کو یقین ہو گیا تھا کہ یہ بڈھا زیادہ عرصہ تک جی نہیں سکتا۔ عشق جیسی نامراد بیماری اسے مار کر دم لے گی۔ مرنے سے پہلے اگر یہ بڈھا یہ کمرہ اس کے نام کر دے تو پو بارہ۔ یعنی میری محبوبہ کی نظر میری کمر پر نہ تھی میرے کمرے پر تھی۔

اگلی شام میں سمندر کے کنارے نہ گیا۔ کیونکہ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ مجھے صرف ایک دو ماہ یا ایک دو سال ہی نہیں جینا ہے بلکہ دس پندرہ سال اور زندہ رہنا ہے۔ اس کے بعد میری محبوبہ کے کئی پیام آئے۔ کئی خط آئے۔ لیکن میں نے اپنی محبوبہ سے ملنے سے انکار کر دیا۔ میری محبوبہ کو میری بے رخی سے اندازہ ہو گیا کہ یہ چالاک اور کائیاں بڈھا اتنی آسانی سے نہ تو مرے گا اور نہ ہی اپنا کمرہ اس کے نام کرے گا۔ اس لئے وہ بھی کسی اور طرف رجوع ہو گئی۔

اب میں نے قسم کھالی ہے کہ میں اپنے کمرے میں مرنا چاہتا ہوں، کسی فٹ پاتھ پر نہیں۔ اس لئے اب میں نے توبہ کر لی ہے کہ آئندہ عشق نہیں کروں گا۔ ▲

عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودن
دِل بدستِ دیگرے دادن و حیراں بودن

مہندر ناتھ

ہم نے کار خریدی

وہ مثل تو آپ نے سنی ہوگی کہ خدا کسی کو جب دیتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ ہمیں بھی خدا نے روپیہ اور مرتبہ اسی طرح دیا۔ یوں تو فلمی دنیا میں ہم ہاتھ دیکھنے آئے تھے۔ لیکن چند برس کے بعد ہم دوسروں کو ہاتھ دکھانے لگے۔ ایک اچھے خاصے مشہور اور امیر ایکٹر ہمارے جال میں ایسے پھنسے کہ بس ہمارے مرید ہو کر رہ گئے۔ دراصل وہ تھے کافی ذہین اور قابل اور ہم تھے نہایت بے تکے اور نا اہل۔ اکثر ذہین آدمی نا اہل آدمیوں کی صحبت زیادہ پسند کرتے ہیں کیونکہ ذہانت کی داد زیادہ تر جاہلوں سے ملا کرتی ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ وہ ایکٹر جس کا نام میں ابھی نہیں بتانا چاہتا، ہماری جوتش کی سوجھ بوجھ سے اتنا متاثر ہوئے کہ انھوں نے اپنا کاروبار ہمارے سپرد کر دیا۔ جس وقت انھوں نے اپنے فلمی ادارے کا کاروبار ہمیں سونپا اُس وقت وہ گھاٹے میں جا رہے تھے۔ شاید انھوں نے سوچا ہوگا کہ ہم ستاروں کی مدد سے ان کی ڈگمگاتی کشتی کو ڈوبنے سے بچا لیں گے۔ لیکن انھوں نے یہ کبھی نہ سوچا کہ جس شخص کے وہ یہ کام سپرد کر رہے تھے اس کی اپنی کشتی کب کی ڈوب چکی تھی۔ اب ہمارے لئے صرف ایک ہی راستہ تھا کہ ہم ان کی کشتی کو مکمل طور پر ڈبو کر اپنی کشتی کو پار لگا لیں۔ بس جناب ستاروں نے ہمارا ساتھ دیا۔ ہماری سوئی ہوئی ذہانت ابھر آئی۔ اور ہم نے اُن پر ہاتھ صاف کرنے شروع کر دیئے۔ اُن کی اچھی خاصی فلم کمپنی اپنے نام کرالی۔ اب ہماری نظر اُن کی کار پر تھی۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ کار ایک سندھی فنانسر کے پاس بیس ہزار روپوں میں گروی تھی۔ میرے دوست فرمانے لگے، "آپ کار لے سکتے ہیں بشرطیکہ آپ بیس ہزار روپے ادا کر دیں۔" دراصل ہم اس کار پر بری طرح فدا تھے۔ عورت اور کار میں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ اگر ایک بار ان دونوں میں سے کسی پر دل آ جائے۔ تو اسے اپنا بنانے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا۔ پہلے تو ہم نے سوچا کہ یہ بیس ہزار روپے بھی اس کاٹھ کے اُلّو کی جیب ہی سے نکلوا لے جائیں۔ لیکن کوشش کرنے پر معلوم ہوا کہ ایکٹر صاحب جلد ہی پبلک سیکٹر میں جانے والے ہیں۔ جب کشتی ڈوبنے لگتی ہے تو ہوش و حواس اُڑ جاتے ہیں اور یوں بھی ہماری اقتصادی حالت آج کل بہت بہتر تھی۔ اس لئے ہمارے اندر رحم دلی اور انسان دوستی کی لہر ابھر آئی۔ اور ہم نے اپنے کلیجے پر پتھر رکھ کر بیس ہزار اس سندھی مہاجن کے حوالے کر دیئے اور کار خرید لی۔

دراصل کار ایک ایسی شے ہے جو انسان کو اچھا خاصا بے کار بنا دیتی ہے۔ ہم کار لے کر جب گھر پہنچے تو محلے کے لوگوں نے ہمیں گھورنا شروع کر دیا۔ اور جب ہم کار سے نیچے اترے تو محلے کا ہر شخص ہمیں یوں دیکھ رہا تھا، جیسے ہم کسی کا خون کر کے آئے تھے۔۔۔ حالاں کہ ہم نے صرف اپنے بیس ہزار روپوں کا خون کیا تھا۔

یوں ایک خوبصورت کار اور داشتہ میں فرق نہیں ہوتا۔۔۔ جیسے داشتہ پر بے تحاشہ روپے خرچ کرنا پڑتے ہیں اور اس کے نخرے برداشت کرنا پڑتے ہیں، اسی طرح کار کی دیکھ بھال میں پورا وقت اور کافی روپے خرچ کرنے ضروری ہو جاتے ہیں۔ داشتہ کسی بھی وقت کسی بھی جگہ اپنے پرانے عاشق کو چھوڑ سکتی ہے۔ اسی طرح کار بھی کسی بھی وقت کسی بھی جگہ فیل ہو سکتی ہے۔

دیکھنے میں ہماری کار بڑی خوب صورت تھی ـــ اس کی لمبی چوڑی باڈی اور ظاہری چمک دمک سے ہماری آنکھیں خیرہ ہو جاتی تھیں اور دشمنوں کے سینے پر سانپ لوٹنے لگتے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ کار کی لمبائی چوڑائی ہمارے فلیٹ سے بھی بڑی تھی۔ ہم نے پہلے ہی دن اپنی چارپائی کھڑکی کے قریب بچھوائی تاکہ آنکھ کھلتے ہی ہماری نظر سب سے پہلے اپنی نئی نویلی کار پر پڑے۔ کار رکھنے کے لئے ہمارے پاس گیرج نہ تھا اس لئے ہمیں اپنی کار کو کھلے میدان میں رکھنا پڑا۔ رات بھر ہمیں صرف اس اندیشے سے نیند نہ آئی کہ رات کو محلے کے لونڈے کار کے شیشے نہ توڑ دیں یا مڈگارڈ نکال کر چور بازار میں نہ بیچ دیں۔

رات جیسے تیسے جاگ جاگ کر کاٹ لی۔ صبح سویرے ڈرائیور آدھمکا اور ہمیں کار میں اسٹوڈیو لے گیا۔ جس طرح داشتہ کی اماں جان کا احترام واجب ہوتا ہے اور ان کی بات ماننی پڑتی ہے، اسی طرح آپ کار کے ڈرائیور کو ناراض نہیں کر سکتے۔ کیونکہ کم بخت کسی بھی جگہ کار کو بے کار بنا سکتا ہے۔ دراصل کار خریدنے کے بعد ہم نے سوچا یہ تھا کہ ہماری تکلیفوں میں اضافہ نہ ہوگا بلکہ کمی ہوگی۔ یار دوستوں پر رعب پڑے گا، بیوی آگے پیچھے گھومے گی، اور ہماری بزنس میں ترقی ہوگی۔ لیکن یہاں تو یار دوستوں نے کار دیکھتے ہی منہ پھیر لیا۔ کتنوں نے تو صاف صاف یہ تک کہہ دیا "اخاہ! آخر آپ نے اپنے محسن کی کار بھی ہتھیالی! مان گئے گرو ـــ آخر دوست کو لنگوٹی بندھوا دی نا!"

بیوی کو مجھ پر پہلے ہی شک تھا کہ میں باہر کسی لڑکی سے عشق فرماتا ہوں۔ اب وہ کار کو بھی سوکن سمجھنے لگی۔ کہنے لگی "پہلے ہی کہاں گھر میں ٹکتے تھے جواب پھیرو گے۔ اب تو چار پہیوں والی کھٹیا مل گئی۔ دن رات اسی پر سوار رہو۔ پرماتما کرے پنچر ہو جائیں چاروں ٹائر۔ تب کہیں جا کر میرا کلیجہ ٹھنڈا ہوگا۔"

ہمارے باپ دادا کی یہ حالت تھی کہ ان بے چاروں کو کار دیکھنا تک نصیب نہ ہوئی اور ہماری حماقت ملاحظہ فرمائیے کہ ہم نے کار تو خرید لی لیکن خریدنے سے پہلے یہ بھی نہ پوچھا کہ یہ نیک بخت ایک گیلن میں دوڑے گی کتنے میل؟ جب ڈرائیور نے تقریباً ہر میل پر ایک گیلن پٹرول ڈلوانا شروع کیا تو ہمیں معلوم ہوا کہ ایک گیلن میں بیگم صاحب صرف سات میل چلتی ہیں۔ اب پٹرول کے علاوہ ہمیں کیا معلوم تھا کہ اس نخریلی کار کے اور بھی اخراجات ہوں گے یعنی اس کے کل پرزے بھی خراب ہو سکتے ہیں۔ آئے دن کبھی بریک خراب ہو جاتے، کبھی کلچ ٹوٹ جاتا، کبھی پٹرول کی ٹنکی لیک کرنے لگتی، کبھی آگے کی لائٹ فیل ہو جاتی، کبھی پیچھے کی، کبھی آگے کا ٹائر پنچر ہو جاتا۔ بارش کے دنوں میں اور مصیبت تھی ـــ یعنی ساری کار کو دھلوا لیجیے، اور ڈرائیور نہ آئے تو خود پانی سے دھوئیے اور کپڑے سے پونچھئے۔ بس صاحب کیا عرض کروں، کس ستم پیشہ کے جنگل میں پھنس گیا ـــ یہ نگوڑی کار تو اچھے خاصے کھاتے پیتے انسان کا دیوالہ نکال دیتی ہے۔

یار دوستوں کو کیا سوجھی کہ ہر دوسرے تیسرے دن کار مانگ کے لے جاتے۔ اب آپ ہی بتائیے پٹرول کے بغیر تو آپ کار نہیں کھینچ سکتے۔ ہماری کار میں دس پندرہ گیلن سے کم پٹرول نہیں آتا۔ اور جب تک اتنا پٹرول نہ ڈلوایا جائے ہماری کار سرکتی ہی نہیں ـــ ایک بار تو اپنی عزت بچانے کے لئے ہمیں اپنے گھر کا اسٹوو بھی بیچنا پڑا تاکہ کار میں پٹرول ڈلوا کے اسے ایک عزیز دوست کے گھر بھجوایا جا سکے۔

چند مہینوں کے بعد ہمیں محسوس ہوا کہ اگر یہ کار چند مہینے اور ہمارے پاس رہی تو کھانے کے لالے پڑ جائیں گے، اپنی رہی سہی عزت چلی جائے گی اور فاقے بھی کرنے پڑیں گے۔

اگر ڈرائیور کو تنخواہ وقت پر ملتی تو کار شان سے سڑکوں پر دندناتی پھرتی۔ لیکن جہاں اسے تنخواہ دینے میں تین چار دن کی دیر ہوئی کہ کار کے پرزے خراب ہونے لگتے۔ بس ہمارا ڈرائیور کار میں کوئی نہ کوئی نقص بتا کر ہر روز کے دس پانچ روپے اینٹھ لیتا اور کار کو "ٹھیک" کراتا رہتا۔ ہم ایک نکھٹو آدمی کی طرح منہ دیکھتے رہ جاتے۔ اور خدا سے دعا کرتے دولت عطا کر یا اس کار سے چھٹکارا دے ....

ہوتے ہوتے اس کار کے چلانے میں ہماری حالت ایسی دگرگوں ہوئی کہ بیوی کے گہنے تک بک گئے۔ گھر کا سامان گروی رکھ دیا گیا۔ ڈرائیور نے تنخواہ نہ ملنے پر گالیاں دینی شروع کر دیں۔ بھائی بہنوں نے گھر آنا چھوڑ دیا۔ دوستوں نے اپنی کاروں میں لفٹ دینا بند کر دیا۔ کہتے

"چلنے دو ڈھنگ کو پیدل۔ ذرا اسے اپنی اوقات تو معلوم ہو جائے ...."۔

خدا جنّت نصیب کرے اس نیک دل ٹرک ڈرائیور کو، جس نے ہمارے حال پر ترس کھا کر ہمیں نئی زندگی بخشی۔ اگر وہ ٹکّر مار کر بھاگ نہ جاتا تو ہم اسے گلے سے لگا لیتے اور کہتے۔ "میرے عظیم محسن زندگی بھر تمہارا احسان نہیں بھولوں گا"۔ کم بخت نے کیا ٹکّر ماری تھی کار کے دونوں دروازے یوں آپس میں بغل گیر ہوئے جیسے برسوں کے بچھڑے دوست گلے ملتے ہیں۔ ہم چونکہ پچھلی سیٹ پر براجمان تھے اس لئے بچ گئے۔ خدا ایک بار اور جنت نصیب کرے اس ٹرک ڈرائیور کو جس کی وجہ سے ہمارا ڈرائیور الیاز خمی ہوا کر ابھی تک ہسپتال میں پڑا کراہ رہا ہے، اور تین ماہ تک وہ اٹھنے کے قابل نہیں —— کم از کم تین ماہ تک تو وہ تنخواہ مانگنے نہیں آئے گا۔

سب سے زیادہ خوشی تو ہمیں اس بات سے ہوئی کہ ہماری کار اسٹوڈیو کے شیڈ میں کھڑی ہے۔ ہم ہر روز آتے جاتے اس کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ لیتے ہیں اور پھر خدا کا شکر بجا لاتے ہیں کہ بڑے اچھے وقت پر اس کار سے پیچھا چھوٹا، نہیں تو یہ کار ہمیشہ کے لئے ہمیں بے کار بنا دیتی۔ ہم تو مرنے سے پہلے وصیت کر جائیں گے کہ دس شادی کر لیجیے لیکن کار کبھی نہ خریدیئے۔ ▲

○

چکّر

در اصل دنیا کا چکّر چلانے کا یہی طریقہ ہے کہ جو کچھ تم نے اپنے والدین سے سیکھا اور جو کچھ تمہارے والدین نے اپنے والدین سے سیکھا تھا۔ اُن سب کو ملا کر کھرل میں پیس کر یہ تعلیم اپنے بچّوں کو پلا دو۔ تاکہ وہ ماں باپ بن جائیں۔ تو پوری نسل کی ذہانت، ساری خباثت اور ساری ریاکاری بچّوں کے حوالے کر دیں۔ تاکہ سند رہے کہ تم باپ بن کر اپنے فرض سے عہدہ برآ ہو گئے تھے۔

(ناولٹ: لسیڑی)

—— مہندر ناتھ

مہندر ناتھ

شرافت

در اصل شرافت اور خباثت میں زیادہ فرق نہیں ہے جس طرح خبیث آدمی اپنی خباثت کا ڈھنڈورا پیٹنے سے باز نہیں آتا بالکل اسی طرح شریف آدمی اپنی شرافت کا مظاہرہ کرنے سے کبھی نہیں شرماتا۔

تقریباً ہر مذہب کی مقدس اور الہامی کتابوں میں شریفوں کو احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور خبیثوں کو گالیوں سے نوازا جاتا ہے۔ شریفوں اور خبیثوں میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ شریفوں کو مرنے کے بعد جنت ملتی ہے اور خبیثوں کو زندگی میں۔ اِس فانی دنیا میں شریفوں نے ہمیشہ مار کھائی ہے اور خبیثوں نے ہمیشہ مارا ہے۔ شریفوں کو اُن کی ازلی شرافت کے لئے سنگسار کیا گیا۔ خبیث سیدھا بار میں گیا! اور یار دوستوں کے ساتھ، جام پر جام چڑھاتا ہوا، زندگی کی لطافتوں اور رنگینیوں سے لطف اندوز ہوتا ہوا دوزخ میں وارد ہوا۔

شرفاء، شرافت کے پردے میں، ایک مقدس اور پرہیزگار زندگی بسر کرنے کے لئے جتنے ظلم اپنے اوپر کرتے ہیں۔ ان کو گنوانا ضروری نہیں۔ یہ لوگ کن کن چیزوں سے اپنے آپ کو محروم رکھتے ہیں۔ اگر ان کی ایک لمبی چوڑی فہرست تیار کی جائے اور شرفاء اُس فہرست کو پڑھ لیں تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ فہرست پڑھتے ہی وہ فوراً خبیث بننے پر آمادہ ہو جائیں گے۔

مَیں نے ڈاکٹروں اور حکیموں کی طرح، بڑی پابندی سے شرافت کی چالیس سال تک پریکٹس کی ہے۔ ڈاکٹروں اور حکیموں نے ضرور اپنے لئے بنگلے اور کوٹھیاں بنوالی ہوں گی مگر میں ایک کھولی کا باقاعدگی کے ساتھ کرایہ ادا کرنے کے قابل بھی نہ ہوا۔

جس طرح سے خبیثوں کی طرح طرح کی قسمیں ہوتی ہیں، اسی طرح شریف بھی مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ چند ازلی شریف ہوتے ہیں، کچھ پیدائشی۔ پھر خاندانی شریف بھی ہوتے ہیں، جو شرافت کو بطور پیشہ اختیار کرتے ہیں چند وقتی طور پر شرافت کا لبادہ اوڑھ لیتے ہیں۔ انھیں شریف بدمعاش کے لقب سے پکارا جائے تو بے جا بات نہ ہوگی۔

ازلی شریف بڑا ہی ناکارہ قسم کا انسان ہوتا ہے۔ اُسے سدھارنے کی کوئی ضرورت نہیں آپ کا بیکار وقت ضائع ہوگا۔ جہاں تک خاندانی شریفوں کا تعلق ہے، اُن کے بارے میں صرف یہی عرض کر سکتا ہوں کہ خاندانی شریف صرف اپنا ہی بیڑا غرق نہیں کرتے بلکہ پورے خاندان کا بیڑا غرق کرتے ہیں۔

پیدائشی شریف اگر شادی نہ کرے تو صرف اپنی ذات کو نقصان پہنچائے گا ورنہ اس شریف انسان کے جو اولاد پیدا ہوگی۔۔ وہ گلیوں میں خاک چھانتی پھرے گی۔

وہ لوگ جو شرافت کو بطور پیشہ اختیار کرتے ہیں۔ ان کی زندگی میں شاید چند بہاریں آجائیں۔ ورنہ شرافت ہمیشہ ان کو ذلیل و

خوار کرتی ہے، شرافت ایسا لفظ ہے، جو ایک بار کسی انسان کے ساتھ چپک گیا تو ساری عمر کا ساتھی بن جاتا ہے۔ حتیٰ کہ مرنے کے بعد بھی لوگ اُسے یاد کرتے ہیں — "بچارا بڑا ہی شریف انسان تھا"۔

یوں تو لفظ شرافت کو بڑی سنجیدگی اور احترام سے برتا جاتا ہے اور شریفوں کا ازراہِ شرافت کافی احترام کیا جاتا ہے ذرا شریفوں کے چہرے ملاحظہ فرمائیے تو معلوم ہوگا کہ چہروں پر کتنی نحوست برستی ہے۔ شامتِ اعمال سے اگر آپ نے کسی شریف آدمی کو اپنے یہاں مہمان ٹھہرا لیا تو چند ہی دنوں میں آپ کا جیتا جاگتا گھر ویرانے کی صورت اختیار کرلے گا۔ بس بھول کر ایسی غلطی نہ کیجیے گا—!

شریفوں کے یہاں اکثر اولاد ہوتی ہی نہیں — اگر ہوتی ہے تو بہت زیادہ ہوتی ہے۔ بہرحال ہر حالت میں شریف آدمی کا انجام بڑا حسرت ناک اور المناک ہوتا ہے۔ مرنے کے بعد گھر سے کفن کے لئے ایک کوڑی بھی نہ ملے گی اکثر شریفوں کے جنازوں کے ساتھ اپنوں کے سوا اور کوئی نہیں ہوتا۔

کسی شریف آدمی سے روپے مانگئے، اول تو روپے اس کے پاس ہوتے نہیں۔ بالفرض روپے اس کے پاس ہوئے تو وہ بے چارہ اپنی شرافت سے مجبور ہوکر فوراً اپنی جیب میں ہاتھ ڈالے گا۔ اگر اپنی جیب خالی نکلی تو بیوی کی جیب صاف کرے گا۔ اگر وہاں بھی کچھ نہ ملا تو پڑوسی کی جیب کی طرف ہاتھ بڑھائے گا۔ بدقسمتی سے اگر پڑوسی نے بھی انکار کردیا تو اپنی بیوی کی چوڑی گروی رکھ کر اپنی شرافت کو برقرار رکھے گا۔

دراصل شرافت کسی خطرناک بیماری سے کم نہیں۔ آج کل ہر بیماری کا علاج ہے۔ سوائے کینسر کے۔ یوں تو ڈاکٹروں نے کینسر کی روک تھام کا طریقہ نکالا ہے۔ مگر شرافت ایسا روگ ہے جو ایک بار لگ گیا تو عمر بھر کا سوگ بن کر رہ جاتا ہے۔

بدقسمتی سے میرا شمار بھی شریفوں میں ہوتا ہے۔ شروع میں جب یار دوستوں نے میری شرافت کی تعریف کی تو مجھے بے حد خوشی ہوئی — "اجی صاحب کیا شریفانہ اور قلندرانہ طبیعت پائی ہے۔ اپنے کام پر لات مار کر دوسروں کا کام کرتے ہیں۔ اپنے سود و زیاں کی کوئی فکر نہیں۔ کوئی مہمان آجائے تو بس آگے پیچھے گھومتے ہیں، خاطر تواضع میں کوئی کسر نہیں رکھتے۔ انکساری، خلوص، دیا اور دھرم تو مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔"

دراصل نہ مجھے دھرم پروشواش ہے نہ دیا پر — جہاں تک انکساری اور خلوص کا تعلق ہے وہ میرے مزاج کا ایک حصہ ہے جس طرح سے میں لوگوں سے سلوک کرتا ہوں اس کا انسانیت سے کوئی تعلق نہیں۔ بس یوں سوچئے کہ اس قسم کی حرکتیں کر بیٹھتا ہوں اسی لئے اب شرافت سے اس قدر نالاں ہوں کہ بیان نہیں کرسکتا۔ آج کل کیا عرض کروں جس تیزی اور تندہی سے اس شرافت کو مٹانے کی کوشش کرتا ہوں۔ کمبخت اسی برق رفتاری سے یہ بیماری ادر ابھرتی ہے۔

اگر شرافت اور عشق پر ذرا تحقیقی نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ دونوں میں زیادہ بُعد نہیں۔ دونوں بیماریاں ایسی ہیں جن کا علاج حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں۔

جیسے چند لوگ عاشقانہ مزاج لے کر پیدا ہوتے ہیں اسی طرح شریف لوگ شریفانہ مزاج لے کر اس دنیا میں وارد ہوتے ہیں۔

جیسے عاشقوں کو دنیا و مافیہا کی خبر نہیں ہوتی اور جذبۂ عشق میں سرشار اور غرقاب رہتے ہیں۔ بجنسہٖ شریف آدمی شرافت کو برتنے کے لئے بیتاب رہتے ہیں۔ اگر عاشق اپنا گریبان چاک کرتا ہے تو شریف آدمی بے حد کم ملاک کرتا ہے۔ اگر عاشق، معشوقہ کے نہ ملنے پر دن رات خون کے آنسو بہاتا ہے تو شریف آدمی اگر اپنی شرافت کا اظہار نہ کرنے پائے تو خود بھی روتا ہے اور دوسروں کو بھی رُلاتا ہے۔ اگر عاشق اپنا گھر برباد کرکے محبوبہ کا گھر آباد کرتا ہے تو شریف آدمی اپنا گھر برباد کرکے دوسروں کا گھر آباد کرتا ہے۔

میں نے بڑے بڑے عاشقوں کے بڑے ہی حسرت ناک انجام دیکھے ہیں۔ پھر بھی چند گنے چُنے ایسے عاشق ضرور ملیں گے جنھوں نے اپنی اپنی محبوباؤں کو پاکر اپنی زندگیاں بنالی ہوں۔ مگر خدا کے فضل سے میں نے کسی شریف آدمی کو شرافت سے زندگی گذارتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ان کا انجام اتنا حسرت ناک اور المناک ہوتا ہے کہ دیکھنے والوں کا کلیجہ چاک چاک ہوتا ہے۔

شریفوں کو اپنی شرافت کی سزا اسی دنیا میں مل جاتی ہے۔ خبیثوں کو مرنے کے بعد۔ شریف آدمی اس دنیا میں بھوکے مرتے ہیں اور خبیث مزے سے عیش کرتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب یہ نعرہ بلند کیا جاتا تھا کہ "دنیا کے مزدورو! متحد ہو جاؤ!! تمہاری صرف زنجیریں ٹوٹیں گی اور کچھ نہیں"۔ میں سمجھتا ہوں اب وقت آگیا ہے کہ میں دنیا کے شریفوں سے ببانگِ دُہل کہوں کہ "اے دنیا کے شریفو! شرافت کی زنجیریں توڑدو!! تم سب کی زندگیاں سدھر جائیں گی"۔

بڑے بڑے عقل مندوں کا مقولہ ہے کہ اگر اس دنیا میں خبیث آدمیوں کی کمی ہو جائے تو یہ دنیا رشکِ جنت بن جائے۔ مگر میرا یہ مخلصانہ مشورہ ہے کہ اس دنیا میں اگر شریفوں کی تعداد صفر کے برابر ہو جائے تو یقیناً انسانی زندگی بہتر ہو جائے گی۔ اس لئے دنیا کے تمام انسانوں کی بہتری اور بقا کے لئے یہ نعرہ بلند کرتا ہوں۔

"شرافت مردہ باد! خباثت زندہ باد!!"

لیڈر

عزیز دوست میری طرف یوں نہ دیکھو، میں جانتا ہوں تم مجھے گھور گھور کر کیوں دیکھ رہے ہو۔ تمہاری آنکھوں میں سوالیہ نشان کیوں ہیں۔ تم مجھ سے یہ پوچھنا چاہتے ہو کہ میں لیڈر کیوں بنا۔ یعنی مجھ میں کیا خوبیاں تھیں کہ میں لیڈر بن گیا، کلرک کیوں نہ بنا، ٹرک ڈرائیور کیوں نہ بنا، ڈاکٹر، وکیل، انجینئر اور پروفیسر کیوں نہ بنا۔ بھنگی یا موچی کیوں نہ بنا۔ دنیا میں ہزاروں کام ہیں جو میں کر سکتا تھا۔ اور نہ کرسکا۔ اور سیدھا لیڈر بن گیا۔ آخر کیوں؟ کیا ساری قوم کا دُکھ مجھے کھائے جا رہا تھا۔ کیا قوم بے سہارا رہتی۔ اگر میں لیڈر نہ بنتا۔ مجھ میں اتنی جرأت کیسے ہوتی۔ تمہارا سوال عجیب ہے۔ دراصل میں تمہیں اس قدر ذہین نہ سمجھتا تھا۔ کہ تم اس قسم کا سوال کرو گے۔ اگر تم میرے بچپن کے دوست نہ ہوتے تو میں تم سے پوچھتا۔ حضورِ انور آپ کون ہوتے ہیں مجھ سے یہ پوچھنے والے۔ کہ میں لیڈر کیوں بنا اور گیدڑ کیوں نہ بن گیا۔ دراصل لیڈر اور گیدڑ میں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ جب تک مجھے لیڈر مانتے رہیں گے میں لیڈر رہوں گا جس دن ان کا بھروسہ مجھ پر نہ رہا میں دم دبا کر بھاگ جاؤں گا۔ یعنی گیدڑ بن جاؤں گا۔

مہیندر ناتھ   ناولٹ: لیڈر

مہیندر ناتھ

مرحوم یاد

جب کبھی مرحوم یادؔ جکوی کی یاد آتی ہے تو کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔ نقادوں اور قارئین کی ستم ظریفی ملاحظہ فرمائیے کہ انھوں نے مرحوم یادؔ کی ذات کے متعلق کئی مضامین لکھے اور ملک کے ادبی رسالوں میں چھپوائے۔ اِدھر ایک دو سال میں ان کی ذاتِ گرامی کے بارے میں دو کتابیں مارکیٹ میں آچکی ہیں اور یونیورسٹی کے کئی طلبا ان کی ذات کے متعلق تحقیق بھی کر رہے ہیں۔ اور ہو سکتا ہے کہ انہی طلبا کو پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری بھی مل جائے۔ مگر اُن کی شاعری کے بارے میں ابھی تک ایک مضمون بھی نہیں چھپا۔ معتبر ذریعہ سے معلوم ہوا ہے کہ مرحوم یادؔ جکوی اعلیٰ پائے کے شاعر تھے۔ غزل ان کی اوڑھنا بچھونا تھی۔ مگر مرحوم یادؔ کے کردار کی صفات کو اتنی اہمیت دی گئی ہے کہ اب مرحوم کی شاعرانہ عظمت سے ہر شخص منکر ہو گیا ہے۔

دراصل اس پہلو پر کافی ریسرچ ہو رہی ہے کہ کیا مرحوم یادؔ واقعی ایک بہت بڑے شاعر تھے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے بےشمار شاگرد تھے۔ جو ہندوستان کے ہر شہر میں ابھی تک پائے جاتے ہیں۔ ان کے شاگرد بزمِ یادؔ کی تیاریوں میں ہمیشہ مصروف رہے۔ لیکن مرحوم یادؔ کی بدقسمتی ملاحظہ فرمائیے کہ جب تک مرحوم زندہ رہے ایک بزم کبھی نہ بن سکی۔ صرف تیاریاں ہی تیاریاں ہوتی رہیں۔ جشن کے اعلان ہوتے رہے لیکن اُن کے اعزاز میں ایک جشن بھی منعقد نہ ہوا۔ مرحوم یادؔ شاگردوں کی غزلوں کی اصلاح فرماتے تھے، مگر اصلاح کا معاوضہ نہ لیتے۔ مرحوم نے اپنے فن کی بالکل پرواہ نہ کی۔ بلکہ ساری عمر شاگردوں کے فن کو ہی ابھارتے رہے۔ شاگردوں کو اپنے استاد سے اتنا پیار تھا کہ انھوں نے کئی بار مرحوم کی غزلوں کو اپنے نام سے چھپوا لیا۔ مرحوم کے نزدیکی رشتے داروں اور دوستوں نے اس بدعت کی طرف اشارہ بھی کیا۔ سنتے ہی مرحوم یادؔ کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ دراصل وہ جذباتیت کے علمبردار تھے۔ انھیں ہر بات پر رونا آتا۔ بےچارے آنسو بہا کے چپ ہو جاتے۔ انھوں نے کبھی کسی شاگرد کے خلاف کوئی ایکشن نہ لیا۔ ان کی ذہانت اور ذکاوت کے چرچے ہر جگہ ہوتے رہتے۔ زبان و بیان پر انھیں بڑا عبور تھا۔ خوب صورت لفظوں کا انتخاب، شبدوں کا ذخیرہ، زورِ بیان، بےپناہ روانی، پرشکوہ لفظوں کا استعمال۔ نادر تشبیہوں کی آمد۔ اور نہ جانے کتنی اور شاعرانہ صلاحیتوں کے مالک تھے کہ اُن کے آگے انیسؔ اور دبیرؔ پانی بھرتے نظر آتے۔

اُن کی ساری عمر یہی کوشش رہی کہ کسی طرح ان کا دیوان چھپ جائے۔ مرحوم یادؔ کا جنازہ کبھی اُٹھ گیا۔ لیکن اُن کا دیوان نہ چھپ سکا۔ ایک تحقیقی مضمون میں اس بات پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ مرحوم یادؔ کا جنازہ بڑی شان و شوکت سے نکلا۔ شہر کی بیشتر آبادی اُن کے جنازے میں شامل تھی۔ جب دیوان چھپوانے کے لئے روپیوں کی اپیل کی گئی تو کسی شہری نے ایک روپیہ بھی نہ دیا۔

مرحوم یادؔ کی شخصیت کے بارے میں ریسرچ ہوئی اور جتنے تحقیقی مضامین رسالوں میں چھپے وہ سب میری نظر سے گزرے ہیں انھیں بڑے شوق اور غور سے پڑھتا رہا۔ اُن کے بارے میں پہلی بار یہ انکشاف ہوا کہ مرحوم یادؔ کو اردو، ہندی اور انگریزی پر پورا عبور

تھا۔ اگر وہ چاہتے تو ہندی اور انگریزی زبان میں بھی اپنے ادبی جوہر کو نمایاں کر سکتے تھے۔ مگر انھیں اردو سے بے پناہ محبت تھی۔ پیدائش سے لے کر موت تک اسی زبان میں گفت گو کرتے رہے، اور اسی زبان میں غزلیں کہیں۔ مختلف مضامین پڑھ کر مجھ پر یہ حقیقت عیاں ہوئی کہ مرحوم یاد بڑے پُر خلوص، دیانت دار، شریف، خدا پرست، وطن پرست، دوسروں کی حاجت پورا کرنے والے، خود نہ کھا کر دوسروں کو کھلانے والے، دوست نواز، غریب نواز، ادیب نواز، قربانی اور سچائی کے پیکر، ہندو مسلم ایکتا کے حامی، بردبار، مہربان اور منکسر المزاج قسم کے انسان تھے۔ شروع میں دوستوں اور مداحوں نے اس صفت کی بہت مدح سرائی کی۔ بعد میں یہی دوست ان کے دشمن بن گئے۔ اور اُن کی قوتِ برداشت کو بزدلی سمجھنے لگے۔ لیکن اس مردِ مجاہد نے اپنی روش نہ بدلی۔

یوں دیکھنے میں بڑے خوش وضع اور خوش قطع تھے۔ لانبا قد، گوری رنگت، چہرے کے خطوط بڑے دلکش اور جاذب نظر تھے آنکھیں بڑی بڑی، فراخ پیشانی، لانبے لانبے بال، جو اکثر کندھوں تک آجاتے۔ خوش شکل ہونے کے باوجود بھی انھوں نے صرف ایک شادی کی۔ اگر وہ چاہتے تو بڑی آسانی سے چار شادیاں کر سکتے تھے۔ آخری عمر تک ایک ہی بیوی پر اکتفا کیا۔ اپنی بیوی کے سوا سب کو ماں بہن سمجھتے تھے۔

شادی کے بعد چار چاند سی لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ جب لڑکیاں جوان ہوئیں تو اُن کی بیوی چلانے لگی کہ اب اپنی جوان لڑکیوں کی شادی کر دو۔ گھر میں اُلّو بولتے تھے۔ روپے پیسے کی اس قدر کمی تھی کہ بڑی مشکل سے دو وقت کا کھانا نصیب ہوتا۔ بیٹیاں دولہا کا انتظار کرتے کرتے تھک گئیں۔ جب انھیں اس بات کا مکمل یقین ہو گیا کہ ان کے والدین ان کے لئے دولہا نہ لاسکیں گے تو چاروں لڑکیوں نے خود اپنے لئے شوہر تلاش کر لئے۔ اور یکے بعد دیگر مختلف لڑکوں کے ساتھ بھاگ گئیں۔ اور اپنا اپنا گھر بسا لیا۔ مرحوم یاد اپنی بیٹیوں کے اس ترقی پسندانہ اقدام پر بہت خوش ہوئے اور اس خوشی میں کئی دن گھر سے باہر نہ نکلے — اس ہولناک واقعہ کے بعد ایک قریبی رشتہ دار نے بتایا کہ مرحوم یاد کافی دنوں تک روتے رہے اور ہنستے بھی رہے۔ جہاں تک رونے کا تعلق ہے اس کے بارے میں کسی کو شک کی گنجائش نہیں — ہاں ہنستے کیوں تھے اس کے بارے میں ہمارے نقاد یا ذہین طلبا تحقیق کیوں نہیں کرتے؟

اُن کے کردار کے بارے میں بڑے ہی دلچسپ قصّے مشہور ہیں۔ مثلاً مانگنے سے وہ اس قدر گھبراتے تھے کہ ہات پھیلاتے ہوئے اُن کے ماتھے پر پسینہ آجاتا، زبان گُنگ ہو جاتی۔ گلا خشک ہونے لگتا۔ اور آخر میں جس شخص سے مانگنے جاتے اُسے کچھ دے کر ہی آتے۔ کافی تحقیق کے بعد پتہ چلا ہے کہ آخری عمر میں اُن کی بیوی نے اُن سے طلاق لے لی اور ان کے نزدیکی دوست سے شادی کر لی۔ مرحوم یاد کو اپنی بیوی پر غصہ نہ آیا بلکہ محلّے میں انھوں نے پیڑے بانٹے، یہ سوچ کر کہ آخری عمر میں انکی بیوی کو دو وقت کا کھانا تو نصیب ہوا۔ اس واقعے کے بعد گلی محلے والوں نے ان سے بول چال بند کر دی۔ بھلا جو شخص مرد ہو کر اپنی مردانگی کا اظہار نہ کرے اس سے دعا سلام رکھنے سے کیا فائدہ ایسے انسان کو سنگسار کرنا چاہیئے۔ شہر کے باشندوں نے باقاعدہ ایک پلان بنایا کہ ایسے انسان کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے مگر عین وقت پر فلو کی ایسی وبا پھیلی کہ شکار کرنے والے خود ہی اس وبا کا شکار ہو گئے۔

یوں مرحوم یاد نے بڑی لمبی عمر پائی۔ چوراسی (84) سال کی عمر تک جئے۔ آج سے بیس برس پہلے کہا جاتا تھا کہ زیادہ کھاؤ گے تو لمبی عمر پاؤ گے۔ مگر آج کل ڈاکٹر اس بات کا مشورہ دیتے ہیں کہ کم کھاؤ گے تو لمبی عمر پاؤ گے۔ مرحوم یاد کو اول تو کھانا ملتا ہی نہ تھا۔ اگر مل جاتا تو وہ اگلے دن کے لئے ضرور بچا کر رکھتے۔ آخری عمر تو فاقوں کی نذر ہو گئی۔ لیکن جناب فاقہ کرتے ہوئے انھوں نے کسی کے آگے ہات نہ پھیلائے کسی سے کچھ نہ مانگا۔ اپنی انا کے بل بوتے پر جیئے۔ بھوک سے آنکھیں باہر نکل آئی تھیں۔ گال پچک گئے تھے مگر آفریں اس شخص پر کہ اس مردِ مجاہد نے اپنے کردار کو ایسا سنبھالا کہ سچائی، خودداری، خلوص، پیار، بردباری پر آنچ نہ آنے دی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فاقوں سے روحانی طاقت بڑھتی ہے۔ قوت برداشت اور عمر میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس لئے ہمارے دیش کے سیاسی لیڈر اکثر برت رکھتے ہیں۔ تاکہ لمبی عمر

پائی اور جنتا کی حالت بگاڑ کر پدم شری کا خطاب حاصل کریں۔

مرحوم یادؔ شہرت کے دلدادہ نہ تھے۔ کوئی ان کی تعریف کرتا تو فوراً اُسے جھڑک دیتے۔ مگر دوسروں کی تعریف کرتے ہوئے کبھی نہ تھکتے۔ معتبر ذریعے سے معلوم ہوا ہے کہ حکومت ہند ان کے بے داغ کردار سے اتنی متاثر اور مرعوب ہوئی ہے کہ وہ جلدی ایک تحقیقی کمیشن بٹھانے والی ہے۔ جس میں مرحوم یادؔ کی اچھائیوں کے بارے میں ثبوت طلب کرے گی اور اس بات کی تہہ تک پہنچے گی کہ کیا مرحوم یادؔ واقعی پُر خلوص اور دیانت دار آدمی تھے۔ کیا ان میں اتنی قوت برداشت تھی کہ وہ کئی دن تک بغیر کھانا کھائے کام کر سکتے تھے؟ کیا مرحوم خوددار تھے کیا انھوں نے کسی سے قرض لیا یا نہیں؟ کیا انھوں نے کسی کے آگے ہاتھ پھیلائے یا نہیں؟ کیا مرحوم یادؔ واقعی وطن پرست تھے یا وطن فروش یا محض غزل فروش؟ کیا مرحوم واقعی ہندو مسلم ایکتا کے حامی تھے۔ کیا مرحوم کا دیوان چھپا یا نہیں۔ کیا مرحوم اتنے بڑے شاعر تھے کہ اُن کا دیوان چھپایا جائے۔ کیا مرحوم یادؔ جدیدیت کے حامی تھے یا ترقی پسند تحریک کے ۔۔۔ کیا مرحوم یادؔ کی غزلیں دستیاب ہو سکتی ہیں۔ کیا مرحوم یادؔ کی اچھائیوں اور خوبیوں کو اپنا کر ہماری قوم ترقی کر سکتی ہے! اگر واقعی مرحوم یادؔ اتنی اچھائیوں اور خوبیوں کے مالک تھے تو انھیں قومی ہیرو کیوں نہ تسلیم کیا جائے۔ لوگوں کو زندگی میں شہرت ملتی ہے مرحوم یادؔ کو مرنے کے بعد کیوں نہ شہرت ملے۔ اگر مرحوم واقعی اتنی خوبیوں کے مالک تھے تو بھارتی عوام کو ان کے نقشِ قدم پر چلنا چاہیے اور مرحوم کی اچھائیوں کو ہر طرح سے اجاگر کرنا چاہیے۔ مثلاً پریس میں ان کے کردار کے بارے میں مضامین چھاپے جائیں۔ شہروں میں بڑے بڑے سائن بورڈ لگوائے جائیں۔ ان کے اوصاف حمیدہ کے بارے میں ریڈیو، ٹیلی ویژن پر باقاعدہ پراپیگنڈہ کیا جائے۔ اسکولوں، کالجوں میں ان کے کردار کے بارے میں لیکچر رکھوائے جائیں تاکہ آنے والی نسلیں ان کی اچھائیوں اور خوبیوں سے اچھی طرح آگاہ ہو جائیں۔ اگر ہو سکے تو کسی فلم پروڈیوسر کو اس بات پر راضی کیا جائے کہ وہ ان کی زندگی کے متعلق ایک بامقصد فلم بنائے اور ہماری حکومت اس پروڈیوسر کو قرضہ دے تاکہ ساری قوم اس خلوص، پیار ایثار، خودداری، قربانی کی اسپرٹ۔ قوتِ برداشت اور دیگر اوصافِ حمیدہ کی گرویدہ ہو جائے اور کشمیر سے لے کر راس کماری تک ایک نئے جیون کا آغاز ہو۔

دراصل مجھے ذاتی طور پر بہت بڑا اعتراض ہے اس کمیشن کے تعینات کئے جانے پر۔ اگر میں سچ بات کہہ دوں تو قارئین کو میرے مشورے کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔

میری نظر میں مرحوم یادؔ بہت ہی بڑے بے وقوف قسم کے آدمی تھے۔ جن خوبیوں کو ہم آج تک سراہتے رہے ہیں دراصل وہ میری نظر میں برائیاں ہیں۔ مثلاً اپنا کام نہ کرنا اور دوسرے کے کام کرتے رہنا کہاں کی عقل مندی ہے۔ خود نہ کھانا اور دوسروں کو کھلاتے رہنا بہت بڑی بے وقوفی ہے۔ خود ننگے رہنا اور دوسروں کو کپڑے پہنانا کہاں کی شرافت ہے۔ اپنے گھر کو اجاڑ کر دوسرے کے گھر کو آباد کرنا پرلے درجے کی حماقت ہے۔

جیسا کہ ان کے ہر ناقد نے ان کے لانبے قد گوری رنگت اور خوبصورت خدوخال کی تعریف کی ہے تو یہ بات میری سمجھ سے باہر ہے کہ انھوں نے صرف ایک شادی کیوں کی؟ وہ بڑی آسانی سے تین چار شادیاں کر سکتے تھے۔ اگر وہ اپنی ذہانت سے مستفید نہیں ہوئے تو کم سے کم اپنی جسمانی خوبصورتی سے تو فائدہ اٹھاتے اور کسی ایسی عورت سے شادی کرتے جو کمانے کے قابل ہوتی تاکہ اُن کا بڑھاپا تو تمیز سے گزرتا اور مرحوم ایڑیاں رگڑ رگڑ کر نہ مرتے۔

جہاں تک اُن کی اس صفت کو سراہا جاتا ہے کہ انھوں نے مرتے دم تک کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلائے اور وہ کسی کے قرضدار نہ تھے۔ تو اس سلسلے میں یہی عرض کروں گا اگر ہماری سرکار اس خوبی کو اچھا جان کر عمل نہ کرتی تو ساری قوم بھوکی مرجاتی۔ بھارت سرکار کی اس سلسلے میں جتنی تعریف کی جائے کم ہے کہ انھوں نے قرض مانگنے کی مہم میں کسی دیش کو نہیں چھوڑا۔

بلکہ ہر دلیش کے سامنے اپنی جھولی پھیلائی۔ اور اپنے عوام کو مالا مال کیا۔ اس طرح اگر مرحوم یاد اپنے پرستاروں، اپنے دوستوں اپنے شاگردوں اور اپنے رشتے داروں سے قرض مانگتے تو یقیناً ان کے پاس ایک کار ایک بنگلہ اور اچھا خاصا بینک بیلنس ہوتا۔ اور وہ ایک بھکاری کی طرح نہ مرتے۔ جہاں تک ان کی خودداری، خلوص، ایثار اور جذبۂ قربانی کا تعلق ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اُن میں کامن سینس کی کمی تھی۔ جن لوگوں نے اُن نام نہاد خوبیوں کو اپنایا وہ قلاش ہو کے مرے۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ حکومت ہند اس قسم کے کمیشن کو نہ بٹھائے بلکہ اس قسم کی فرسودہ قدروں اور کھوکھلے اصولوں کے خلاف ایک باقاعدہ مہم چلائے تاکہ آئندہ آنے والی نسلیں مرحوم یاد سے عبرت حاصل کریں اور وہ ایک باوقار اور باسلیقہ زندگی گزار سکیں۔ ▲

مہندر ناتھ یادگار نمبر

کے لئے

نذرِ عقیدت

عزیز قیسی

JAVED

THEIR

Condolences

Family and Friends

and remember his services

The Film Writer's Association

JAVED

RAVINDER JAIN

Affectionately remembers

his

dear departed Friend

Mohindar Nath

A great Sonl - A great Solace

We Pay Our Homage

To

Late Mohindranath a man of great understanding

ANIL GANGULI

D. C. POPLI

VIRANGANA

ظفر ادیب

ایک آواز

ایک آواز گونجتی تھی کبھی
محفلوں، ناولوں، فسانوں میں
اب وہ آواز ہے نہ ہے وہ گونج
محفلیں سونی، ناولیں بے رنگ
روحِ افسانہ کو لگا ہے زنگ
یہ نہیں، فن کا حُسن جاتا رہا
ہاں، مگر ایک منفرد سی نوا
ایک دل میں اترنے والی ادا
اِک تبسّم کی کھلکھلاتی ضیا
ایک انسانیت کی سچی جِلا
جس کا سینہ تھا دوستی کے لئے
جس کے دل میں تھا زندگی کا درد
غم پہ جو دوستوں کے تڑپا تھا
جس نے سیکھا تھا صرف درسِ وفا
محفلوں، ناولوں، فسانوں میں
وہ نہیں ہے تو ہے خلا ہی خلا

○

(بقیہ: "جہاں وہ رہتا تھا" صفحہ ۸۶ سے آگے۔)

ان کے مقابل کے فلیٹ میں ایک مدراسن رہتی ہے۔ مہندر اور اس کے دوستوں میں سے جو آخیر میں باہر جاتا ہے وہ فلیٹ کی چابی مدراسن کو دے جاتا ہے۔ مدراسن ایک بیوہ ہے اور اپنی تین جوان لڑکیوں، بیٹے اور داماد کے ساتھ رہتی ہے۔ اکثر زینے پر چڑھتے یا اترتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ مدراسن کے گھر میں لڑائی ہو رہی ہے لیکن جیسے کسی کے آنے کی آواز سن کر خاموش ہو جاتے ہیں پچھلے مہینے سے مدراسن کا بیٹا پاگل ہو گیا ہے وہ اب اکثر کھڑکی کی سلاخیں پکڑے کھڑا رہتا ہے۔ بے حس، بے حرکت اور خلا میں اس طرح تکتا رہتا ہے جیسے اس کی نظریں جامد ہو گئی ہوں۔ اُسے دیکھ کر اکثر دل پر سے ایک موہوم سے ڈر کا سایہ گزر جاتا ہے۔ مدراسن کی کنواری جوان لڑکی کو دیکھ کر بھی ایک عجیب سا احساس ہوتا ہے۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں ہمیشہ ایک ایسا جذبہ ہوتا ہے گویا وہ اپنے آپ کو کسی وجہ سے کمتر خیال کرتی ہے۔ اس سے زیادہ خاموش لڑکی آشیانے کے دوستوں نے کبھی نہیں دیکھی۔ اس سے عشق کرنے کا خیال ہی نہیں آتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اس سے عشق کرنا اس سے ناجائز فائدہ اٹھانا ہوگا۔ آشیانے کا کوئی دوست اسے نظر بھر کر نہیں دیکھتا۔ مہندر، ہری، رندھیر، گورمکھ وغیرہ سب اوشا کو پھنسانے پر تلے ہوئے ہیں۔ اوشا مدراسن کی دوسری لڑکی ہے اور مدراس میں اپنے خاوند کو چھوڑ کر چلی آئی ہے۔ اوشا کا شوہر شرابی ہے۔ وہ خود شراب پیتا ہے اور اسے مارتا ہے اور اوشا اس کے پاس رہنا نہیں چاہتی۔ سب کو اوشا سے سخت ہمدردی ہے، آخر یہ کہاں کی انسانیت ہے ایک دن مہندر سب کے سامنے کہہ رہا تھا کہ ایک عورت اپنی جوانی کو یوں اُجاڑ دینے پر مجبور کر دی جائے۔ اُس دن وہ مدراسن کی نگہداشت سے خصوصاً بیزار تھا۔ مدراسن اوشا کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھتی ہے۔ اسے ایک لمحہ گھر سے باہر اکیلا نہیں رہنے دیتی، چابی تک لینے کے لئے دروازے پر خود آتی ہے اُسے اپنی بیٹی کی آبرو کا ڈر ہے۔ مہندر کہتا ہے عورت اس وقت تک دکھ اٹھاتی رہے گی جب تک اقتصادی طور سے آزاد نہ ہو جائے گی۔ لیکن اوشا اقتصادی طور سے آزاد نہیں ہے وہ اپنے شوہر کے پاس اس سے پٹتی تھی اور اس سے بچنے کے لئے یہاں چلی آئی ہے۔ مہندر اور دوست کہتے ہیں اس کی زندگی تباہ ہو رہی ہے۔ اوشا کی آنکھوں میں صرف ایک مایوسی کی لکیر ہے۔

یہ مایوسی کی لکیر کٹی کی آنکھوں میں نہ تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک چمک تھی، ایک خود اعتمادی، جیسے وہ خود کو کسی کا دستِ نگر نہ سمجھتی ہو۔ جیسے یہ احساس اس کی روح کو کچلنے کو موجود نہ ہو۔ مہندر نے سوچا کٹی کی آنکھوں میں یہ مایوسی کی لکیر دیر میں آئے گی۔ جب تک یہ نظام یوں ہی رہے گا۔ جب تک اُن چیزوں کی خریداری جاری رہے گی جو خریدے جانے کے لئے نہیں بنیں، عورت کی آنکھوں سے مایوسی کی لکیر دور نہ ہو گی۔

ابھی کٹی کی آنکھوں میں چمک ہے۔ اگر آج وہ آشیانے میں آجاتی تو دوبارہ بات کرنا گوارا نہ کرتی۔ مگر آج وہ آشیانے میں نہیں آئی۔ کل وہ اسے دادر سرکل پر ملے گی۔ جب تک کٹی کو یہ معلوم نہ ہوگا کہ وہ قلاش ہے، یہ دوستی قائم رہے گی۔ مہندر اس دوستی کو قائم رکھنا چاہتا تھا۔ لیکن اچانک اسے خیال آیا کہ اس کی جیب میں کل کٹی پر خرچ کرنے کے لئے روپیہ نہیں ہے۔ وہ اس بات کو بھول گیا تھا، حالانکہ یہ کانٹا کل شام اس کی روح میں کھٹکتا رہا تھا۔ سیر کے دوران میں ہر مرتبہ کھنہ نے بل ادا کیا تھا اور ہر بار مہندر نے ایک شرمساری سی محسوس کی تھی۔ لیکن آج شام کھنہ بہت خوش تھا اور بلا دریغ خرچ کر رہا تھا۔ کٹی سمجھ تو گئی ہوگی کہ "سیٹھ" وہی ہے لیکن اس کے باوجود بھی اس نے مہندر سے کہا تھا۔ آئی لو یو۔

یہ الفاظ متواتر اس کے شعور کی سطح کے نیچے گھوم رہے تھے لیکن اس نے یہ سوچا نہ تھا۔ اب اسے خیال آیا کہ کٹی روپیہ ہی نہیں چاہتی، ایک کار ہی نہیں چاہتی، وہ کار اور روپیہ کے ساتھ خوبصورتی بھی چاہتی ہے۔ مہندر کو اپنی جسمانی خوبصورتی پر کافی فخر تھا۔ اُس کے فخر نے آشیانے کے دوسرے دوستوں کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ تو کٹی روپیہ ہی نہیں، خوبصورتی بھی چاہتی ہے۔ اس نے مہندر کے کان میں جھک کر یہ کہا تھا۔ "مجھے تم سے عشق ہے۔"

خود مہندر کے ادراکی وجود کے نیچے اس عشق کے جذبے نے جنم لے لیا تھا۔ وہ کٹی سے جذباتی طور سے متاثر تھا لیکن یہ احساس اب تک اس کے شعور پر واضح نہ ہوا تھا۔ شعوری طور پر وہ صرف کٹی کے جسم سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔ اجرت دے کر اس کے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔ مہندر کہا کرتا تھا کہ اب اسے عورت سے محبت نہیں ہو سکتی۔ یہ دل اب پتھر ہو گیا ہے۔ اس میں عنفوانِ شباب کی وہ ملائمیت نہیں رہی جو محبت کو جنم دیتی ہے۔ یہ محض اس کی محرومی کا ایک حقیر سا ردِ عمل تھا۔ برسوں سے کسی عورت نے اس سے محبت نہیں کی تھی۔ ایک عرصے سے وہ خود کسی کے عشق میں مبتلا نہیں ہوا تھا اور یہ سمجھنے لگا تھا کہ دل میں محبت کی چنگاری بجھ گئی ہے اور اب کوئی آندھی اسے روشن نہیں کر سکتی۔ یہ محض ایک بہلاوا تھا، اسے کسی بھی ایسی قبول صورت لڑکی سے محبت ہو سکتی تھی جو ایک بار اس کے سامنے پیار سے مسکرا دے۔

آج وہ کٹی کے جسم کو اپنانا چاہتا تھا۔ اس کے سرخ ہونٹوں کو چومنا چاہتا تھا جنہیں کٹی نے اس کے ہونٹوں سے آشنا ہونے دیا تھا۔ اور اس کے پاس روپیہ نہ تھا۔ اُسے غصہ آیا، یہ غریبی، یہ مفلسی، یہ بے کاری.... پھر حسب معمول یہ غصہ آہستہ آہستہ اتر گیا۔ اس نے سوچا وہ ہری سے روپیہ واپس لے لے گا۔ صرف روپیہ ہی ایک ایسا رشتہ تھا جس نے آشیانے کے دوستوں کو باہم ملا رکھا تھا۔ مہندر کو ہری سے کچھ لینا تھا، ہری کو رندھیر سے کچھ لینا تھا، رندھیر گورمکھ کا قرضدار تھا — اور یونہی قرض ایک تار تھا جس نے آشیانے کے دوستوں کو باہم باندھ رکھا تھا۔ مہندر نے سوچا، وہ ہری سے کچھ روپیہ لے لے گا۔

صبح جب ہری کی آنکھ کھلی تو دن کافی چڑھ آیا تھا اور ناریل کے درختوں میں سے چھن کر آتی ہوئی سورج کی کرن حسب معمول دیوار پر موجود تھی۔ کمرے میں سوئے ہوئے دوست بکھرے پڑے تھے۔ ہری کو یاد آیا کہ رات بوندیں پڑی تھیں اور سب کو اپنا اپنا بستر لے کر نیچے آنا پڑا تھا۔ اور اب وہ بے ترتیبی سے کمرے میں بکھرے پڑے تھے۔ ایک لمحے کے لئے اُسے محسوس ہوا کہ یہ سب لوگ مردہ ہیں اور وہ مردوں کے درمیان بیٹھا ہے۔ انہیں کمرے میں پڑا دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ ان لوگوں کی روحیں سلب کر لی گئی ہیں اور بے جان جسموں کو بے پروائی سے پھینک دیا گیا ہے۔ لیکن رات جب وہ بوندوں سے پریشان ہو کر نیچے آئے تھے تو کس قدر زندہ اور اسی قدر زندگی سے بیزار معلوم ہوتے تھے۔ سب کو ایک دوسرے پر غصہ آرہا تھا اور سب سے زیادہ خدا پر۔ کیا خالق کائنات کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ وہ خدا کو گالیاں دے رہے تھے۔ بارش تک کرنے کی تمیز نہیں۔ خدا کو وہ ہمیشہ گالیاں دیتے تھے، حالانکہ کسی کو خدا پر اعتقاد نہ تھا، سب دہریے تھے لیکن روایتی خدا کے متعلق ہر وقت دل کی بھڑاس نکالتے رہتے تھے۔ رات اوپر سے آنے کے بعد کچھ دیر کے لئے کمرے میں ایک عجیب شور مچ گیا تھا، جیسے یہ سب لوگ اپنی اپنی زندگی کے لئے محوِ جنگ ہوں۔ پھر کچھ دیر بعد خاموشی چھا گئی تھی، اور لڑتے ہوئے سپاہی ہو کر مر گئے تھے۔

ہری بستر پر بیٹھا رہا۔ اب وہ کل کی بات بھول کر آج کی بات سوچ رہا تھا۔ اس کی جیب میں روپیہ نہیں ہے۔ کل رندھیر نے کہا تھا کہ اسے کہیں سے روپیہ ملنے کی امید ہے، اور اس امید میں کہ رندھیر اس سے لئے ہوئے روپے ادا کر دے گا اس نے چند دوستوں کے ساتھ اپنی جیب شراب خانے میں خالی کر دی تھی۔ اب وہ مفلس تھا اور رندھیر رات کو گھر نہیں آیا تھا۔ اُسے رندھیر پر غصہ آیا اور اپنے اوپر کہ اسے اس وقت کیا ہو گیا تھا جب اس نے اپنا سرمایہ بانٹ دیا تھا۔ اسے اس وقت کیا ہو جاتا ہے یہ اُس کی سمجھ میں نہیں آتا۔ روپیہ اس کے پاس ہو تو کسی کے مانگنے پر اس سے انکار نہیں کیا جاتا۔ یہ نہیں ہوتا کہ وہ کہہ دے کہ وہ دے نہیں سکتا یا اس کے پاس نہیں ہے، جیسے اپنے دل کی گہرائی میں وہ سمجھتا ہو کہ یہ روپے صرف اس کی ملکیت نہیں ہے، جیسے اپنی روح کے نہاں خانے میں اسے اس بات کا شبہ ہو کہ یہ روپیہ مشترکہ ملکیت ہے لیکن اس وقت وہ مفلس تھا۔ اور اسے غصہ آرہا تھا کہ رندھیر رات کو گھر کیوں نہیں آیا اور اب وہ کیا کرے۔ اسے پھر مہندر سے پیسے مانگنے پڑیں گے۔ اس نے سوچا، اب اسے مانگنے میں جھجک نہ ہوتی تھی، وہ شرمندگی کا احساس کئے بغیر مانگ سکتا تھا لیکن چند مہینے پہلے ایسا کرتے ہوئے کوئی چیز اس کا ہاتھ پکڑ لیتی تھی، عزت، خودداری، شرم اس کی اجازت نہ دیتی تھی۔ اب نہ وہ شرم رہی تھی نہ وہ خودداری، نہ وہ اپنی

عزت۔ اب وہ جھجکتا نہ تھا۔ اب کوئی چیز ہاتھ نہ پکڑتی تھی۔ اکثر بستر پر جانے کے بعد رات گئے تک، وہ آنکھیں بند کئے یہ سوچتا رہتا تھا، لیکن وہ کانٹا نکل گیا تھا۔ اس شرم، عزت اور خودداری کا احساس زائل ہو گیا تھا۔ اس سے بھی لوگ مانگتے تھے، وہ بھی لوگوں سے مانگ سکتا ہے۔ وہ بھی خود کو اس کے سیلاب میں بہہ جانے سے روک نہ سکا۔

ہری بستر پر بیٹھا سوچ رہا تھا۔ چند مہینے پہلے وہ گھر گیا تھا۔ گھر جا کر اس نے اپنا گھر بیچ دیا تھا۔ اس سے پہلے وہ بمبئی میں زندگی کا لطف اٹھانے آیا تھا، لیکن روپیہ جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا، بہت جلد ختم ہو گیا۔ ان دنوں وہ ایک وقت کھانا کھاتا تھا۔ لیکن اس نے کسی سے کچھ نہ مانگا۔ اُن دنوں دل میں وہ کانٹا تھا، وہ کانٹا جس نے اسے مانگنے کی بجائے اپنا گھر بیچ دینے پر مجبور کر دیا۔ وہ کانٹا اب کہاں گیا، وہ غیرت اب کیا ہوئی، یہ اُسے معلوم نہیں۔

مکان بیچ کر وہ واپس آیا تو اس کے پاس تین ہزار روپیہ تھا۔ وہ اُسے خرچ کرنا چاہتا تھا اپنے اوپر، لیکن دوستوں نے اُس سے اُدھار مانگا اور وہ انکار نہ کر سکا۔ اور پھر شراب اور طوائفوں کے بستر اور عیاشی — وہ روپیہ اب خرچ ہو چکا ہے یا دوستوں کے پاس ہے جو واپس کرنے کے قابل نہیں ہیں۔

اچانک ہری کو خیال آیا کہ مہندر قرض نہیں دے گا۔ وہ پہلے بھی کہہ چکا ہے کہ اس کی فضول خرچی کے لئے مہندر کے پاس پیسہ نہیں ہے۔ وہ ہری سے کوئی کام کرنے کو کہتا ہے اور ہری کام نہیں کرتا۔ روپے کے ساتھ واپس آنے پر مہندر نے اُس سے کہا تھا کہ اس روپے سے وہ مستقبل میں اپنا کیریکٹر بنا سکتا ہے۔ لیکن یہ ہری نے نہیں کیا۔ جیسے وہ مستقبل کے آنے تک زندہ نہیں رہے گا۔ موت کا ایک موہوم سا ڈر اس کے تحت الشعور پر تسلط کئے ہوئے تھا۔ وہ نیند میں دیکھتا کہ کوئی اسے قتل کر رہا ہے، اس کے پیچھے بھاگ رہا ہے، وہ بچاؤ کے لئے گڑگڑا رہا ہے، وہ پسینوں میں تر بتر بستر پر اٹھ بیٹھتا اور وہ ڈراؤنے خواب ہفتوں سائے کی طرح اس کے ساتھ لگے رہتے۔

اپنے دل کی گہرائی میں اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ مر رہا ہے۔ مرنے سے پہلے وہ زندگی کی تمام خوشی سمیٹ لینا چاہتا تھا۔ عورتیں، شراب، ہنگامے اور تضیع۔ یہ ضائع کرنے کی خواہش جو بظاہر خواہش نہیں تھی اس کی ہر حرکت پر حاوی ہے، وہ استعمال کرنے سے زیادہ ضائع کرتا ہے جیسے تھوڑے سے عرصے میں چیزوں کی زیادہ سے زیادہ مقدار استعمال کر لینا چاہتا ہو۔ مہندر اس کی اس عادت سے نالاں ہے۔ ہری یہ جانتا ہے۔ بستر پر بیٹھے ہوئے اسے یقین ہو گیا کہ مہندر روپیہ نہیں دے گا۔ کہہ دے گا کہ اپنی کوتاہ اندیشی کا خمیازہ بھگتو۔ ہری کو لوگوں کا یہ دور اندیشی کا فلسفہ کھوکھلا معلوم ہوتا ہے، وہ حال میں زندہ رہنا چاہتا ہے۔ اسے مستقبل پر یقین ہی نہیں ہے، وہ کہتا ہے چند روز عیش میں جی لینا چند سال ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے سے بہتر ہے۔ اسے زندگی میں صرف ایک خواہش رہ گئی ہے۔ وہ زندگی میں زندہ لوگوں کی طرح جینا چاہتا ہے۔

لیکن اپنی زندگی میں وہ کبھی بھی تو زندہ نہیں رہا۔ زندہ رہنے کے لئے کبھی اس کے پاس کافی روپیہ نہ تھا اور روپے کے بغیر زندہ رہنا ناممکن ہے۔ ایک نیم مفلسی کی حالت میں وہ جوان ہوا تھا، پھر ایک خاندان کا بوجھ اس کے کندھوں پر آ پڑا۔ وہ زندگی میں بڑے بڑے ارادے لے کر آیا تھا لیکن سب دیکھتے دیکھتے ایک خواب کی طرح پریشان ہو گئے۔ اس کی صحت ایک کھنڈر ہو گئی تھی۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ زندگی کے کنارے آ گیا ہے اور آگے موت کی سیاہ تاریکی ہے۔ وہ مر جائے گا اور زندگی ختم ہو جائے گی، دل کی دھڑکن رک جائے گی۔ وہ خود کو موت کے اندھیرے میں کھو دے گا۔ اور یہ سب کچھ اس کی زندگی کو دیکھنے سے پہلے ہو جائے گا۔ اسے نہیں معلوم کہ مسرت اور خوشی اور آرام کیا ہوتا ہے۔ عورت کے ہونٹوں کا شہد، اس کے سانس کی خوشبو، اس کے جسم کی حرارت کیا ہوتی ہے۔ وہ مر جائے گا ان چیزوں کو جانے بغیر۔ اس گھر میں جہاں کوئی کبھی زندگی سے ہم آغوش نہیں ہو سکتا، جہاں موت ایک بھیانک بیل کی طرح اس کی رگ و پے میں سرایت کرتی جا رہی ہے۔ اس نے یہ گھر چھوڑ دیا۔ اُس گھر سے دور وہ بمبئی میں آ گیا تھا۔ یہاں وہ زندگی سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔ اور آشیانے کے

دوست کہتے تھے وہ کوئی کام کیوں نہیں کرتا۔ اکثر تنہائی میں وہ خود سوچتا ہے کہ وہ کام کیوں نہیں کرتا اکثر تنہائی میں بیٹھ کر وہ آئندہ زندگی کے لیے پلان بناتا ہے، سوچتا ہے کہ زندگی کو سنوار کر ٹھیک راہ پر لے آئے، مگر یہ ہوتا نہیں۔ وہ کام کرنے سے بھاگتا ہے۔ جیسے یہ خیال ہو کہ جب زندگی باقی ہی تھوڑی ہے تو کام سے کیا فائدہ، جیسے اسے کام کی بے مصرفی کا یقین ہو گیا ہے۔ روپیہ اس کے پاس ختم ہو گیا ہے یا مفروض دوستوں کے پاس ہے۔ اسے مانگنے میں شرم نہیں آتی مگر پھر بھی یہ خیال ٹھہر ٹھہر کر چبھتا ہے کہ یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔ اکثر اسے اس قسم کا احساس ہوتا ہے، جیسے اپنی پھانسی کے لئے اسے خود ہی رسی بٹنی پڑے گی۔ اکثر بالکنی میں کھڑا ہوا وہ ڈر کر پیچھے ہٹ جاتا ہے کہ کہیں وہ خود کو نیچے نہ گرا دے۔ پچھلے کچھ دنوں سے یہ خیال بار بار اسے خوفزدہ کرنے لگا ہے کہ وہ خود کشی کرے گا۔ دل ہی دل میں وہ دوبارہ اس کی روح کو قبض کرنے والی کش مکش میں جانے سے کانپتا ہے جس سے بھاگ کر آیا ہے۔

وہ رندھیر کے کھولتا ہوا بستر پر بیٹھا رہا جو رات کو گھر نہیں آیا تھا۔ اُسے پھر مہندر سے پیسے مانگنے پڑیں گے۔

مُہندر کی آنکھ کھل گئی تھی۔ آنکھ کھلتے ہی اس کا پہلا خیال کٹی تھی۔ پھر اس نے ہری کو دیکھا جو بستر پر بیٹھا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ روپے کے لئے ہری سے استفسار کرے، برابر کے فلیٹ میں رہنے والا پنجابی نوجوان اندر آگیا، پھر اور سب بھی جاگ گئے اور صبح کی مجلس شروع ہو گئی۔ صبح کی مجلس، رات کی مجلس یا جس وقت بھی یہ لوگ ایک جگہ جمع ہو جاتے تھے، مطلب ایک دوسرے کو نیچا دکھانا ہوتا تھا۔ ایک دوسرے پر فقرے کسے جاتے تھے، ایک دوسرے کے نشتر چبھوئے جاتے تھے اور اس میں انھیں ایک مخصوص سا اذیت پرستانہ لطف محسوس ہوتا تھا۔ یا پھر گفتگو کا ایک دوسرا پہلو ہوتا تھا جس میں پارسی لڑکیوں کی پنڈلیاں، مراٹھی عورتوں کی چھاتیاں اور ایک دوسرے کی شکل وصورت پر حملے ہوتے تھے، جسے مذاق کہا جاتا تھا۔ مذاق کی یہ قسم مہندر سے شروع ہوتی تھی۔ وہ خود خوش شکل تھا اور دوسروں کے کم خوبصورت چہروں کو مسخ کرنے میں اسے ایک طفلانہ خوشی محسوس ہوتی ہے۔ اکثر اپنی اس خوشی پر وہ رازدارانہ طور پر شرمندہ ہو جاتا ہے۔ لیکن مذاق کی یہ قسم جو چل نکلی تھی ختم ہونے میں نہ آتی تھی۔

سامنے کے فلیٹ میں رہنے والے پنجابی نوجوان کو ان کی چشمک دیکھنے میں مزہ آتا تھا۔ دفتر جانے سے پہلے اپنا وقت وہ آشیانے میں گزارتا ہے۔ صرف چیٹر جی ایک ایسا شخص ہے جو اس ہنگامے میں ایک خاموش تماشائی کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ کسی سے کچھ نہ کہتا تھا کوئی باریک سا نشتر چبھ جاتا تو مسکرا کر خاموش ہو جاتا ہے۔ اس مسکراہٹ میں غم کی ایک گہری لکیر ہوتی ہے جو اکثر دیر تک دل پر کھنچی رہتی ہے۔ نشتروں کا سب سے بڑا نشانہ گورمکھ ہوتا ہے۔ گورمکھ سردار ہے اور اپنے بال کٹوا چکا ہے۔ وہ اب خود کو سردار کہلانا نہیں چاہتا، مگر سب زبردستی اسے سردار کہتے ہیں۔ آشیانے کے دوستوں کو سردار کی جو بات سب سے زیادہ ناگوار ہے وہ اس کی خود غرضی ہے اور اس کا حقارت آمیز رویّہ۔

مہندر نے دیکھا کہ ہری آج معمول سے زیادہ خاموش ہے۔ اُسے شبہ ہوا اور یہ ڈر کہ شاید آج اس کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ اُس نے ہری کو اکثر اسی وقت اداس دیکھا تھا جب اس کی جیب خالی ہوتی تھی۔ آج وہ خاموش تھا۔ مہندر کو ڈر سا ہو گیا اُسے ہری سے پیسے لینے تھے۔

سردار نے کہا۔ "میں تنگ آگیا ہوں۔ تم لوگ اس آشیانے میں جانوروں کی طرح رہتے ہو۔"
"تو نکل جاؤ یہاں سے، بھیڑ کم ہو جائے گی۔" ہری نے جل کر کہا۔
"کہاں جائے، بے چارہ سڑک پر سوئے کیا؟" مہندر نے لقمہ دیا۔ سردار کو جلانے میں اُسے خاص مزہ آتا تھا۔
"جہاں جی چاہے سوئے۔" ہری نے کہا۔ "پہلے بھی تو گوردوارے میں سوتا تھا۔"

نشتر سردار کے دل میں اتر گیا۔ لیکن مہندر نے دیکھا کہ ہری آج خلافِ معمول اپنی فتح پر مسکرایا نہیں۔ ضرور وہ اس وقت مفلس ہے۔ مہندر نے سوچا۔ ہری کہہ رہا تھا: "نالی میں رہ کر امیرزادوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ جیسے ہمیشہ محلوں میں ہی رہے ہو۔" اس تلخی میں آج مذاق کا شائبہ بھی نہ تھا۔ سردار سن کر چپ نہیں ہوا، وہ کبھی چپ نہیں ہوتا تھا۔ بولے گیا۔ لیکن بات ختم ہو چکی تھی۔ زہر اثر کر چکا تھا۔ باقی دوستوں کو ایک پُرلطف تسکین کا مزہ آیا تھا۔ دنیا سے پائی ہوئی ساری ناکامی، ساری شکست، ساری مایوسی کا وہ اس طرح ایک دوسرے کو مطعون کر کے انتقام لیتے تھے۔ جیسے دوسرے کی دکھتی آگ پر ہاتھ رکھ کر وہ یہ باور کرانا چاہتے ہوں کہ صرف ہمیں دکھی نہیں ہیں، ہم ہی زخمی نہیں ہیں، تم بھی اسی کشتی میں سوار ہو۔

دیر تک یہ چشمک یوں ہی جاری رہی۔ مہندر نے کل کی داستان سنائی اور کسی کو یقین نہیں آیا۔ جیسے ایک لڑکی کا مہندر سے ملنا ناممکن ہو، ایک معجزہ ہو اور یہ معجزوں پر یقین کرنے کا زمانہ نہیں ہے۔ اتنے عرصے، بلکہ ہمیشہ عورت سے محروم رہنے کے بعد انہیں غیر شعوری طور پر یقین ہو گیا تھا کہ ایک عورت کا ملنا ناممکن ہے۔ انہیں مہندر کی داستان ناقابلِ یقین معلوم ہوئی۔ جب انہیں یقین آیا تو سب نے ایک زبان ہو کر کہا کہ وہ طوائف ہوگی۔ مہندر کے چہرے پر ایک مسکراہٹ آئی جسے کوئی نہیں دیکھ سکا۔ جسے وہ خود بھی نہیں دیکھ سکا۔ پنجابی نوجوان کے دفتر جانے کا وقت ہو گیا تھا۔ وہ اٹھ کر چلا گیا۔ پھر محفل برخاست ہو گئی اور بستروں پر بیٹھی ہوئی لاشیں اپنی ضروریات سے فارغ ہونے میں مصروف ہو گئیں۔

مہندر کو اتنی دیر میں یقین ہو گیا تھا کہ ہری کے پاس روپیہ نہیں ہے۔ لیکن کسی دوسرے سے مانگنے سے پہلے وہ ہری سے پوچھنا چاہتا تھا۔ ہری اس کا مقروض تھا۔ "کتنے روپے ہیں تمہارے پاس؟" اس نے پوچھا۔

"ایک بھی نہیں۔" ہری نے جواب دیا۔ "رندھیر نے کہا تھا وہ دے گا مگر وہ آیا ہی نہیں رات کو۔ تم دو روپے دیدو مجھے۔"

"میں تم سے مانگ رہا ہوں، مجھے شام کو کٹی سے ملنا ہے۔"

"رندھیر نے آج لا دیے تو تم مجھ سے لے لینا۔" ہری نے کہا۔ مہندر جانتا تھا کہ اگر اسے مل گئے تو ہری ضرور دے دے گا۔ اس نے خود کو امید دلائی کہ رندھیر روپے لے آئے گا۔ لیکن پھر بھی روپے رات سے پہلے نہیں ملیں گے۔ رندھیر رات سے پہلے نہیں آئے گا اور اس نے کٹی سے شام کو ملنے کا وعدہ کیا ہے۔ وہ شام کو کٹی سے مل سکے گا، مگر اس کی جیب میں روپے نہ ہوں گے اور روپے کے بغیر کٹی سے ملنا بے معنی ہے۔

اور اگر وہ کٹی سے شام کو نہ ملے، کہ اس کے علاوہ وہ اور کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کٹی آکر لوٹ جائے اور اس کے بعد پھر اس سے کبھی ملاقات نہ ہو یا اس وقت ہو جب وہ اسے بھول چکی ہو۔ اس شام کی یاد اس کے ذہن سے چھٹ چکی ہو۔

مہندر نے سوچا وہ شام کو کٹی سے ملے گا۔ اتنا کہنے کے لئے کہ آج وہ بہت مصروف ہے اور شام اس کے ساتھ نہیں گزار سکتا۔ وہ کٹی سے کل ملنے کو کہے گا۔ رندھیر رات کو روپیہ لے آئے گا۔ کل وہ کٹی پر خرچ کر سکے گا۔

مہندر نے یہ فیصلہ کر لیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک عجیب سی یاس و افسردگی اس کے دماغ میں پھیل گئی۔ روپیہ جو نہیں ہے، روپیہ جو چاہیے، روپیہ جس کے بغیر ہر کام بند ہے، روپیہ جو دوستوں کے درمیان تنہا رشتہ رہ گیا ہے۔ دراصل کٹی کے نہ ملنے سے زیادہ اس وقت اس کے دل میں اس یاس و افسردگی کی وجہ یہی تھی، ابھی چند لمحے پہلے ہری سے روپیہ نہ ملنے پر دفعتاً اسے محسوس ہوا تھا کہ اس کے دل میں دوستی اور برادری کا جذبہ تفریق ہو گیا ہے اور ناپسندیدگی اور نفرت رہ گئی ہے۔ اپنے دل میں وہ خود کو قصوروار سمجھ رہا تھا، — اور وہ شام کو کٹی سے نہیں مل سکے گا۔

وہ شام کو کٹی سے نہیں مل سکا۔

مہندر انتظار کر کے لوٹ آیا۔ کٹی نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا۔ وہ ملنے نہ آئی تھی۔ آشیانے کے دوستوں کو رازدارانہ طور پر ایک خوشی سی ہوئی۔ لیکن اُن کی یہ خوشی مہندر کے لئے راز نہ رہ سکی۔ وہ اس خوشی کو جو انسان کے ادنیٰ ترین جذبات سے پھوٹتی ہے چھپا نہ سکے۔ انہوں نے مہندر کے ہتھیار اسی پر استعمال کئے۔ مہندر کا مذاق اڑایا گیا اور مہندر چپ رہا۔ وہ اُن لوگوں کو دیکھ رہا تھا جو اس کی شکست پر مسرور تھے۔ اگر یہ اس کی اپنی شکست نہ ہوتی تو اسے ان لوگوں پر رحم آتا۔ لیکن یہ اُس کی اپنی شکست تھی اور اسے اُن لوگوں پر غصہ آیا۔ وہ غصے کو مذاق میں ٹال گیا اور اسے ایک بار پھر خیال آیا کہ یہ سب لوگ کمینے ہیں۔ یہ خیال اسے پہلے بھی کئی مرتبہ آیا تھا۔ لیکن ہر بار وہ اس بات پر محمول کر کے درگزر کر جاتا تھا کہ یہ لوگ حالات کے شکار ہیں، کہ محرومیت انسان کو ذلیل، حاسد اور کمینہ بنا دیتی ہے۔ یہ حسد کا جذبہ اس میں بھی ہے، یہ کمینہ پن وہ خود بھی کرتا ہے۔ اسے بھی جاہل لوگوں کو کاروں میں عیش کرتے دیکھ کر آگ لگ جاتی ہے۔ وہ بھی ایک بدصورت امیر کے پہلو میں ایک حسین لڑکی کو دیکھ کر جل جاتا ہے۔ اگر یہ حسد ہے تو قدرتی ہے، اگر یہ کمینہ پن ہے تو ٹھیک ہے لیکن آج ان لوگوں کو اپنی ناکامی پر خوش دیکھ کر وہ جذباتی علیحدگی سے فیصلہ نہ کر سکا۔ یہ لوگ کمینے ہیں۔

کمینے آج چھت پر نہیں گئے تھے۔ یہیں کمرے میں بستر بچھا لئے گئے تھے۔ آج پھر شام سے ابر ہو گیا تھا۔ باہر ناریل کے درختوں اور اُن سے پرے نظر آتے ہوئے گرجا گھر پر بادل چھلائے ہوئے تھے۔ ممکن ہے کٹی بارش کے ڈر سے نہ آئی ہو۔ مہندر نے سوچا۔ مگر شام کو ابر اتنا زیادہ تو نہ تھا۔ یا ممکن ہے اُسے کوئی اور مل گیا ہو، کسی اور کار کا مالک۔ آج اس کی کمر کے گرد کسی اور کا بازو ہوگا۔ آج کسی اور کے کان میں جھک کر وہ کہہ رہی ہوگی کہ مجھے تم سے عشق ہے۔ یہ عشق اس کے دل میں کہاں ہوگا۔ اس جذبے کو تو پیدا ہوتے ہی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ یہ جذبہ تو اسی دن اپنی تاریک قبر میں دفن ہو گیا جب اس نے پہلی بار روپیہ قبول کیا ہوگا۔ وہ —— یہ محض تصور ہے، اُس نے سوچا، طوائف کے بھی دل ہوتا ہے، طوائف بھی محبت کر سکتی ہے —— یہ محض دل خوش کن سوچ ہے۔ اس نے تردید کی لیکن وہ اس خیال کو ملتوی نہ کر سکا۔ اور طوائف کی محبت ایک بیوی کی محبت سے بہتر ہے۔ اس نے سوچا، طوائف روپے کے لئے محبت نہیں کرتی، وہ جب محبت کرتی ہے تو بدلے میں روپیہ نہیں چاہتی۔ ایک بیوی کی محبت کی ہمیشہ قیمت ہوتی ہے! مہندر کو طوائفوں سے ہمدردی تھی، اتنی ہی جتنی اسے طوائفیت سے نفرت تھی۔ اور کٹی سے جس نے آج اپنا وعدہ پورا نہیں کیا تھا، اسے عشق ہو گیا تھا۔ کل وہ اُس سے واقف نہ تھا، لیکن آج کٹی کے نہ ملنے کے بعد اُسے محسوس ہوا کہ چنگاری جو بجھ گئی تھی روشن ہو اُٹھی ہے۔ وہ اب بھی کٹی کے لبوں پر لب رکھنا چاہتا تھا۔ اس کے جسم کو اپنے جسم میں جذب کرنا چاہتا تھا، اپنے جسم کو اس کے جسم میں کھونا چاہتا تھا۔ لیکن آج اس خواہش کا رنگ نیا تھا۔ آج کٹی کے جسم کی غیر حاضری اس کے لئے ایک روحانی عذاب بن گئی تھی۔ کٹی کے جسم کا قرب اس کے لئے ایک روحانی راحت بن جائے گا، وہ پھر جی اٹھے گا۔

اس نے یہ بات آشیانے کے دوستوں میں نہیں کہی ورنہ انہیں مذاق اور نشتر اندازی کا ایک اور موقع مل جاتا۔ یہ لوگ ایک دوسرے کے جذبات کو دکھانے میں پوری بیدردی کا ثبوت دیتے تھے۔ منہ سے ایک بار کوئی بات نکل جائے تو منہ چھپانا مشکل ہو جاتا تھا۔ زہر کے ڈنک ہمیشہ تیار رہتے اور پھر مہندر اُن کے سامنے جذباتی اعتبار سے ننگا ہونا نہ چاہتا تھا۔ وہ چپ رہا۔

"اب یونہی ٹھنڈی سانس بھر کر سو جاؤ۔" ہری نے بستر پر جاتے ہوئے کہا۔ "یونہی مر جاؤ گے تم، اور کوئی لڑکی نہیں ملے گی۔"

"کیوں خواہ مخواہ امید لگائے بیٹھے ہو۔" گورمکھ بولا۔

چٹرجی ہمیشہ کی طرح خاموش تھا۔ وہ کچھ اور سوچ رہا تھا۔ لیکن مہندر خاموش نہیں رہ سکا۔ اندر سے جل کر اور باہر سے مسکراتے ہوئے بولا۔ "جب تم جیسے گھٹے بڑھئی کی شکل کے آدمی امید کر سکتے ہیں۔ تو میں کیوں نہ کروں۔"

سردار کچھ جواب دینا چاہتا تھا، لیکن زینے پر سے عیسائی کے کتے کے بھونکنے کی آواز آ رہی تھی۔

اور — " زندگی چاندسی عورت کے سوا کچھ بھی نہیں " رندھیر گاتا ہوا اوپر چڑھ رہا تھا۔

زندگی چاند —— اسے زینے پر ٹھوکر لگی اور، یہ عیسائی کا کتا مجھے آتے جاتے دیکھ کر کیوں بھونکتا ہے، اس نے کہا، کتا اب بھی بھونک رہا تھا۔ رندھیر سیڑھیاں چڑھتا رہا، وہ نشے میں تھا۔ رم کے پانچ پیگ اس کے خون میں گھل چکے تھے، اور زندگی چاندسی عورت کے سوا کچھ نہیں تھی۔ دادر بار سے وہ ناکام ایکٹروں کے ساتھ شراب پی کر آیا تھا۔ آج اس نے بل خود ادا کیا تھا۔ " چپ رہو عیسائی کتے " اس نے سرگوشی میں کہا۔ " سونے والے جاگ جائیں گے " اس نے دروازہ کھول دیا —— سونے والے جاگے ہوئے تھے۔

" روپے لائے سالے؟ " ہری نے داخل ہوتے ہی سوال کیا۔

" زندگی چاندسی عورت کے سوا کچھ بھی نہیں " رندھیر نے جواب دیا۔ وہ اتنا نشے میں نہیں تھا جتنا بن رہا تھا۔

" تمہارے چچا نے کبھی دیکھی ہے چاندسی عورت " گورمکھ بستر پر اٹھ بیٹھا تھا۔ جیتر جی جو بیٹھا تھا تھک کر لیٹنے لگا تھا۔ مہندر گالیاں دے رہا تھا۔ سب رندھیر کی اس عادت سے نالاں تھے۔ وہ اکثر رات کو کہیں نہ کہیں سے شراب پی کر آتا تھا، پھر آکر سب کو جگاتا، پیتا تھا، اتنے زور زور سے سرگوشیوں میں بات کرتا تھا کہ برابر کے فلیٹ میں پنجابی نوجوان کی بیوی اپنے شوہر سے شکایت کرتی تھی۔ صبح رندھیر معافی مانگ لیتا تھا، اگلی رات کو پھر یہی ہوتا تھا۔ اس نے گورمکھ کی بات نہیں سنی نہ مہندر کی گالیاں۔ وہ گنگناتا ہوا کپڑے اتار رہا تھا۔ زندگی چاندسی عورت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ کپڑے اتار اتار کر اس نے کمرے کے چاروں طرف پھینک دیئے، جیسے وہ انہیں پھر نہیں پہنے گا، اور بالکل ننگا ہو کر بید کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ یوں بھی گھر میں انڈر ویئر کے علاوہ اور کچھ پہننا پسند نہیں کرتا تھا، اور شراب پینے کے بعد تو اسے کپڑے اتار دینے کا خبط تھا۔ کپڑے اتار کر وہ سارے گھر میں پھرتا تھا اور گاتا تھا، زندگی چاندی عورت کے سوا کچھ بھی نہیں۔

روپے جو اسے کل ملے تھے، اب اس کے پاس نہ تھے، شام شراب خانے میں ختم ہو گئے تھے۔

صبح اس نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے ہری کو بتایا کہ وہ روپے خرچ ہو گئے۔ کل شام اسے اپنے بچپن کا ایک دوست مل گیا تھا۔ وہ شملہ کی خوبصورت پہاڑیوں پر ساتھ کھیلے تھے، مدتوں کے بعد آج وہ اسے بمبئی میں ملا تھا، اس کی خاطر کرنی تھی اور وہ روپے ہوٹل کے بل اور شراب میں ختم ہو گئے تھے۔ ہری نے رندھیر کو گالیاں دیں کہ میں بھوکا مر رہا ہوں اور تم لوگوں کو شراب پلاتے پھرتے ہو، تمہیں شرم نہیں آتی؟ اس نے اپنے اوپر قرض کے بوجھ کو سنجیدگی سے محسوس کرنا چھوڑ دیا ہے۔ قرض اس کے لئے ایک معمول سا ہو گیا ہے۔ اچھی طرح سوچ کر وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ وہ شرم کو پال نہیں سکتا۔ وہ اپنے ہر واقف کار کا قرض دار تھا، کس کس کے سامنے شرم کرے۔ شروع شروع میں وہ شرمندہ ہوتا تھا، شرم آتی تھی کہ وہ ان کا قرض دار ہے، لیکن پھر بھی وہ اس احساس سے باغی ہو گیا تھا۔ یہ اس کی زندگی اور موت کا سوال تھا، وہ قرض کے بغیر فاقوں سے مر جائے گا، یہ شرم بھی اسے زندہ نہ رہنے دے گی۔ اور اس نے قرض لے کر کھول جانا شروع کر دیا تھا۔ وہ قرض ادا کرنا چاہتا تو تھا لیکن لاچار تھا، روپیہ اس کے ہاتھ میں آتے ہی خرچ ہو جاتا تھا، جیسے وہ ڈرتا ہو کہ روپیہ اگر اس کے پاس رہا تو کوئی مانگ لے گا اور اسے دینا پڑے گا۔ خود خرچ کرنے کی عمیق ترین خواہش کے سامنے وہ بے بس تھا، وہ اب صرف خوب صورتی سے اپنی زندگی گزارنا چاہتا تھا، مگر وقت کے اصول جہنم میں جائیں۔ وہ زندگی میں بہت شرافت برت چکا، اس شرافت نے کبھی اسے فائدہ نہیں پہنچایا، اسے ٹھوکریں کھلائی ہیں، ذلت کا احساس کرایا ہے۔ وہ کیا کرے، پاس شرافت کو لے کر، اسے اس شرافت سے نفرت ہو گئی تھی، اب وہ نفرت بھی نہیں رہی، اب وہ صرف

بے پرواہ ہے۔

رندھیر بمبئی کے فلمی شہر میں ہیرو بننے کے لئے آیا تھا۔ وہ اپنا سارا وقت بمبئی کے نگار خانوں میں گزارتا تھا۔ اس نے اپنے ضمیر کا گلا گھونٹ کر پروڈیوسروں کی خوشامد کی تھی۔ اپنی روح کو ذبح کر کے ڈائرکٹروں کے آگے دست سوال پھیلایا تھا کہ زندگی کو ایک شاہراہ مل جائے۔ وہ بہت اچھا ایکٹر تھا لیکن کسی نے اُسے موقعہ نہیں دیا۔ لوگوں نے اس سے وعدے کئے اور اپنے وعدے وفا نہ کئے۔ کسی نے کہا اس کا قد چھوٹا ہے، کسی نے کہا اس کی ناک لمبی ہے، یہ سب جھوٹ تھا، یہ سب بہانے تھے۔ وہ گوہر لال کے گنجے سر سے اچھا تھا، وہ الیاس کے ساہوکاری جسم سے بہتر تھا۔ وہ مدھوک کپور کے چوبی چہرے سے خوب صورت تھا۔ لیکن یہ بزدل لوگ جن میں سے ہر ایک احساس کمتری کا شکار تھا ایک نئے آدمی کو موقعہ دینا نہ چاہتے تھے۔ رندھیر ایکٹر نہ بن سکا۔ کسی نے اس سے کہا تم گیت لکھ سکتے ہو۔ رندھیر نے کہا میں شاعر ہوں۔ کسی نے کہا تم مکالمے لکھ سکتے ہو، رندھیر نے کہا میں ڈرامے لکھتا رہا ہوں۔ اب کوئی اُسے ایک گیت لکھنے کو دے دیتا ہے۔ کبھی وہ کسی فلم کے مکالمے لکھنے میں مدد کرتا ہے۔ لیکن کوئی اس سے یہ نہیں پوچھتا کہ تم کیا کرنا چاہتے ہو۔ رندھیر نے اٹھارہ برس کی عمر میں گھر چھوڑ دیا تھا، اس نے اسٹیج کی خاک چھانی تھی، ریڈیو پر ٹھوکریں کھائی تھیں۔ لیکن کسی نے اس کے خواب کو نہیں پہچانا تھا۔ انسان کی صحیح قدر کب پہچانی جائے گی، وہ سوچتا ہے یہ کب ہوگا، کیسے ہوگا کہ اسے اپنی تکمیل کا موقعہ ملے گا۔ یہ رات کب ختم ہوگی، کب افق پر صبح کی سرخی نمودار ہوگی۔

لیکن رندھیر اب بھی نا امید نہیں ہے، ابھی تک اس کی نظر کے افق پر وہ ستارہ روشن ہے جس کے سہارے وہ اب تک جیتا رہا ہے۔ لیکن ان ٹھوکروں نے، ان پے در پے مایوسیوں نے اسے پست خیال کر دیا ہے۔ اب وہ لوگوں کو خوش کرنا چاہتا ہے، خوش کر کے ان سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ ایک ایکٹر سے وہ ایک مسخرا بن گیا ہے۔ شروع شروع میں لوگوں کو اس میں لطف آتا تھا۔ رندھیر ایسی حرکات کرتا تھا جن سے خواہ مخواہ ہنسی آجائے۔ رندھیر شرابی کا پارٹ ادا کر رہا ہے، رندھیر چارلی چپلن کی نقل کر رہا ہے۔ رندھیر بس میں بیٹھی ہوئی کسی لڑکی سے اپنے ناکام معاشقے کا مزاحیہ انداز میں ذکر کر رہا ہے اور ہا ہا ہا۔ ہی ہی ہی، لوگ خوش ہوتے تھے اور کسی کو اس تماشے کے عقب میں اس ٹریجڈی کی جھلک نظر نہ آتی تھی۔ لیکن اب لوگوں نے اس کے اس تماشے سے بھی محظوظ ہونا چھوڑ دیا ہے۔ رندھیر کا جوکروں والا رویہ ان کے اعصاب پر سوار ہونے لگتا ہے۔

رندھیر نے یہ محسوس کر لیا ہے، اب وہ لوگوں سے کم ملتا ہے۔ آج کل اپنے وقت کا بیشتر حصہ وہ شوبھا بوس کے ساتھ گزارتا ہے۔ شاردا گھوش ایک مشہور فلم اسٹار ہے اور ہندوستان کی نامی رقاصہ۔ رندھیر نے پہلی بار اس کے بیلے کے ساتھ کام کیا تھا۔ اس کے بعد سے اس نے خود کو مسز بوس کے لئے وقف کر دیا ہے۔ اب وہ بمبئی کے نگار خانوں میں کم چکر لگاتا ہے۔ اور ایک پروانے کی طرح شاردا گھوش کے گرد رہتا ہے جو اب اسے اپنی انجمن کی آخری شمع معلوم ہوتی ہے۔ شاردا گھوش سے رندھیر کا کیا رشتہ ہے، یہ سب قیاس کرتے ہیں، کوئی کہتا ہے مسز بوس سے رندھیر کا وہی رشتہ ہے جو "آرسی" فلم میں ہوٹل والے لڑکے کا طوائف ہیروئن سے تھا۔ رندھیر خود کچھ نہیں کہتا۔ کوئی اس سے پوچھے تو وہ مسخرا بن جاتا ہے اور ہا ہا ہا، ہی ہی ہی، خی خی خی، کمینے، جاہل، ذلیل۔

شاردا گھوش رندھیر کے لئے ایک محبوبہ ہے، ایک ماں ہے، ایک سرپرست ہے۔ رندھیر اس کے لئے ایک پروانہ ہے، ایک سکریٹری ہے، ایک خادم لڑکا ہے۔ وہ شاردا گھوش کی بوتل سے شراب پیتا ہے، جب گھر نہیں آتا تو ڈرائنگ روم میں اس کے صوفے پر سو جاتا ہے، ٹیلی فون پر پیغام وصول کرتا ہے اور شاردا گھوش کی میز پر کھانا کھاتا ہے۔ کبھی اس میں اسے ایک فخر محسوس ہوتا ہے، کبھی ذلت تحقیر، شرمساری۔ لیکن وہ شاردا گھوش کے آنچل کو نہیں چھوڑ سکتا، اُسے شاردا گھوش سے عشق ہے، اُسے شاردا سے امید ہے۔ شاردا نے اُسے مایوسی کے عمیق، تاریک غار میں گرنے سے بچا لیا ہے۔

شاردا کی سفارش سے اس نے کسی فلم میں ایک گیت لکھا تھا۔ اس گیت کا کل اُسے معاوضہ ملا تھا۔ وہ روپیہ کل ہی شراب خانے میں ختم ہو گیا۔ گھر آتے ہوئے اُس کی جیب میں ایک روپیہ چار آنے تھے، روپیہ اس نے صبح ہری کو دے دیا، اُسے معلوم تھا کہ چار آنے میں وہ دن بھر گزارا نہیں کر سکے گا۔ لیکن اپنے دل کے اندر اُسے خود قصوروار ہونے کا احساس تھا۔ روپیہ اس نے ہری کو دے دیا، وہ خود کسی اور سے مانگ لے گا۔ مہندر سے مانگنا بیکار ہے، اُس نے سوچا، اُسے غصہ آرہا ہے، اس کے پاس ہوئے بھی تو نہیں دے گا۔

مہندر کے پاس پیسے نہیں تھے۔ ہوتے بھی تو وہ اس وقت رندھیر کو نہیں دیتا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ رندھیر کو جی بھر کے گالیاں دے۔ اِس سے پہلے بھی وہ رندھیر کو اکثر گالیاں دے چکا تھا۔ لیکن رندھیر نے ہمیشہ ہنس کر ٹال دیا تھا۔ یہ ہنسی، ہنسی نہ تھی، مہندر کو احساس ہوتا تھا جب احساسِ عزت مرجاتا ہے، خودداری مٹ جاتی ہے، ضمیر مردہ ہو جاتا ہے۔ تو اُس کے مدفن سے یہ ہنسی پھوٹتی ہے، یہ ہنسی جو ہنسی نہیں ہوتی، موت ہوتی ہے، اس ہنسی کو دیکھ کر مہندر ہمیشہ خاموش ہو جاتا تھا، آج بھی وہ خاموش ہو کر رہ گیا۔ لیکن خلاف معمول آج کے بعد میں بھی ایک غصہ اس کے دل میں کھولتا رہا۔ اگر رندھیر روپے ضائع نہ کرتا تو آج وہ کٹی سے مل سکتا تھا۔ وہ کل نہیں آئی تھی، ممکن ہے آج آئے۔ شاید وہ آج گئی ہو اور آج اس کے پاس پھر روپیہ نہیں ہے۔ روپیہ اور کہیں سے مل نہیں سکتا۔ چیٹرجی خود ایک وقت کھانا کھاتا ہے، اس سے مانگنا بے جا ہے۔ سردار شاید دے سکتا ہے مگر وہ سردار سے مانگنا نہیں چاہتا۔ اُسے سردار سے نفرت ہے۔ گورمکھ کے متعلق اس کے دل میں ایک ناپسندیدگی کا جذبہ جڑ پکڑ گیا ہے۔ کئی بار اس جذبے کے زیر تحت اس نے گورمکھ کے ساتھ زیادتی بھی کی تھی۔ اپنی ان زیادتیوں پر وہ بعد میں شرمندہ بھی ہوا تھا۔ لیکن گورمکھ سے نفرت اسی طرح موجود تھی۔ وہ گورمکھ کا ممنون ہونا نہ چاہتا تھا۔ لیکن اور کوئی ذریعہ نہیں ہے، اس نے سوچا، اُس سے مانگ کر دیکھوں، شاید دے دے، مگر جن جذبات کے ساتھ میں اُس سے مانگ رہا ہوں، یہ کمینہ پن ہوگا۔ اُسے خیال آیا، لیکن خود کو کمینہ پن کے سپرد کر دیا۔ گورمکھ کو چند ہی روز ہوئے تنخواہ ملی ہے۔

گورمکھ کو چند ہی روز پہلے تنخواہ ملی تھی۔ لیکن اس نے مہندر کو قرض دینے سے صاف لفظوں میں انکار کر دیا۔ اُس کے پاس دوسروں کو عیاشی کرانے کے لئے فالتو روپیہ نہیں ہے۔ اس نے سوچا تھا اور کہہ دیا تھا۔ روپے کی ضرورت ہوتی ہے تو مجھ سے مانگتے ہیں، اُس نے دفتر جاتے ہوئے زینے پر سے اترتے ہوئے سوچا، جیسے ہمیشہ میرے اوپر احسان ہی کرتے رہے ہیں۔ گورمکھ لوگوں کی مہربانیوں کو بھول کر ان کی زیادتی کو یاد رکھتا ہے۔ اسے لوگوں کی مہربانی اور ہمدردی سے نفرت ہے اور ان کی نامہربانیاں اس کے دل پر نقش ہو جاتی ہیں۔ اسے اچھی طرح یاد ہے پچھلے دنوں جب وہ خسرہ میں مبتلا تھا تو کوئی اس کے پاس نہ آتا تھا۔ کسی نے اُس سے یہ تک نہ پوچھا تھا کہ تم اٹھ کر پانی پی سکتے ہو یا نہیں۔ خود مہندر نے جو انسانیت انسانیت چلّاتا تھا اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر یہ نہ پوچھا تھا کہ بخار کتنا ہے۔ اسے مہندر سے نفرت ہے، اسے یہ بھی معلوم ہے کہ مہندر کو اس سے نفرت ہے اور اسے قرض دینے سے صاف انکار کر کے گورمکھ دفتر چلا آیا تھا۔ مہندر نے اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا، یہ محض اس کے دل میں ایک بہانہ تھا۔ دراصل وہ کسی کی مدد کرنا نہیں چاہتا۔ حسد نے اس کے تمام جذبات کو مغلوب کر لیا ہے۔ وہ خوش نہیں ہے اور دوسروں کو خوش دیکھ کر جل اٹھتا ہے۔ وہ کسی کی خوشی حاصل کرنے میں مدد نہیں کر سکتا۔ وہ اب تک اپنی کوشش میں ناکام رہا ہے اور نہیں چاہتا کہ کوئی دوسرا کامیاب ہو۔

گورمکھ لاہور سے ناکام ہو کر بمبئی آیا تھا۔ لاہور سے بی اے پاس کرنے کے بعد اس نے کوشش کی تھی کہ کوئی اچھی سی نوکری مل جائے اُس کی زندگی میں عظیم الشان تمنائیں نہ تھیں، بس ایک خوبصورت سا گھر ہو، ایک خوبصورت بیوی ہو اور اطمینان ہو۔ لیکن لاہور میں اسے یہ نہ مل سکے۔ دو سال کوشش کرنے کے بعد اسے محسوس ہوا تھا کہ لاہور میں اچھی نوکریاں زمیندار فرقے کو ملتی ہیں۔ گورمکھ کے پاس زمین نہ تھی۔ زمین کب اس کے بزرگوں سے چھن گئی تھی یہ اسے معلوم نہیں۔ پشتوں سے وہ کرائے کی زمین پر رہ رہے تھے اور پنجاب میں اچھی نوکریاں زمینداروں کو ملتی ہیں گورمکھ

نے کئی سال کوشش کی تھی۔ لیکن ہمیشہ ناکامی نے اس کے چہرے پر طمانچے مارے تھے۔ لاہور سے مایوس ہو کر وہ بمبئی آیا تھا کہ یہاں اُسے کوئی اچھا موقعہ مل جائے، لیکن یہاں بھی وہ ناکام رہا۔ بمبئی میں سرکاری نوکریاں بمبئی والوں کو ملتی ہیں۔ گورمکھ بمبئی والا نہ تھا۔ وہ پنجاب میں زمیندار نہ تھا بمبئی میں بمبئی کا باشندہ نہ تھا۔ اسے غصہ آتا تھا کہ یہ بمبئی اور پنجاب کی بے ہودہ تمیز کیوں ہے، زمیندار اور بے گھر کی غیر منصفانہ تفریق کیوں ہے، وہ کہاں جائے، وہ کیا کرے؟

شکست کھا کر وہ یہاں ایک آرڈیننس ڈپو میں نوکر ہو گیا تھا۔ یہاں وہ صبح آٹھ بجے گھر سے جاتا ہے، شام کو چھ بجے واپس آتا ہے، اور تین روپے روز اُسے معاوضہ ملتا ہے۔ وہ خوب صورت مکان جو اس نے اپنے سینے میں بنایا تھا گر گیا، وہ حسین لڑکی جو اس کے خوابوں میں آتی تھی مر گئی ہے اور گورمکھ سب کا دشمن ہو گیا ہے۔

شام کو دفتر سے آنے پر وہ صرف کھانا کھانے کے لئے ہوٹل تک جاتا ہے اور پھر واپس آجاتا ہے۔ اس کی زندگی صرف ڈپو اور آشیانے میں بٹ گئی ہے۔ آشیانے کے دوستوں کو تعجب ہوتا ہے کہ گورمکھ زندہ کس طرح رہتا ہے، اُسے نہ سینما کا شوق ہے، نہ سیر کا، اسے کسی چیز سے دلچسپی نہیں رہی ہے۔ وہ یا گھر میں اکیلا اپنے بستر پر لیٹا رہتا ہے یا ڈپو میں کام کرتا ہے۔ گورمکھ نے خود کو تفریح سے انتقاماً علیحدہ کر لیا ہے۔ جو شے اسے مکمل طور پر نہیں ملی اس کے ایک حصے سے فائدہ نہ اٹھا کر اپنے اوپر تکلیف انڈیل کر وہ دنیا سے انتقام لیتا ہے۔ آشیانے کے دوست، اُس کی اس خود غرضی سے تنگ ہیں کہ وہ کسی کے کام نہیں آتا۔ جب وہ آسانی سے مدد کر سکتا ہے تب بھی نہیں کرتا۔ اسی لئے مہندر اس سے نفرت کرتا ہے، اسی لئے وہ اور سب کو ناپسند ہے۔ گورمکھ کے پاس بھی اب صرف نفرت رہ گئی ہے اور تلخی۔ وہ بھی سب سے جلتا ہے اور مہندر کو قرض دینے سے انکار کر کے چلا آیا ہے۔

"اس سے امید ہی یہ تھی، وہ کیوں دے"! مہندر نے سوچا، پھر اُسے جھنجلاہٹ ہوئی کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ نہیں دے گا، اس نے گورمکھ سے کیوں مانگا تھا۔ وہ کیوں اتنا گر گیا تھا کہ اپنے دل میں دوستی کے کسی جذبے کو محسوس کئے بغیر اس نے گورمکھ سے فائدہ اٹھانا چاہا تھا۔ یہ خیال گورمکھ کے انکار کرنے کے بعد اب چبھ رہا تھا پہلے اس نے اسے ایک طرف ہٹا دیا تھا۔ لیکن اب وہ اس کے لئے ندامت محسوس کر رہا تھا۔ اچانک اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس کے جذبات پر ایک ادراکی ملمع ہے اور اس کے نیچے وہ بھی کمینہ ہے اور اسے خود پر غصہ آ رہا تھا۔ یہ بات اس کے ضمیر میں کھٹک رہی تھی۔ اس نے خود کو تسلی دی کہ ابھی ضمیر مردہ نہیں ہوا ہے۔ اتنے عرصے سے وہ اسے بچاتا رہا ہے۔ لیکن آخر یہ ضمیر مردہ ہو جائے گا۔ اور یہ قدرتی بات ہو گی۔ وہ حسب معمول سوچنے لگا۔ خیالات کی یہ رَو اس کی ذاتی صفائی میں آئی تھی۔ انسان خود کو حالات کے مطابق ڈھال لیتا ہے، کمینہ پن ذلت اور دنائیت بنیادی طور پر انسان کی فطرت میں نہیں ہیں۔ اور اگر حالات سنور جائیں تو انسان کی فطرت ان سے مبرّا ہو جائے گی۔ وہ یہ سوچتا رہا۔ اور اپنے قصور کا احساس اس کے ذہن سے دور ہوتا گیا۔ یہ نظام بدل جائے تو ابھی انسان کے لئے امید ہے۔ انسان پھر ایماندار، نیک اور امن پسند ہو سکتا ہے۔ دنیا پر ہر آن لرزتا ہوا یہ جنگ کا خطرہ دور ہو سکتا ہے۔ طوائفیں پھر عورتیں بن سکتی ہیں، محبت کر سکتی ہیں اور کٹّی ——!

لیکن ابھی یہ نظام یونہی ہے۔ ابھی کٹّی کی محبت سکّوں سے خریدی جائے گی۔ اسے کٹّی سے محبت ہے، چاہے وہ سکوں کے ہی ذریعے کیوں نہ ہو، وہ اسے اپنانا چاہتا ہے۔ اور وہ کٹّی کو اپنا نہیں سکتا۔ شاید وہ شام کو آئے۔ مگر وہ شام کو نہیں جا سکتا۔

وہ شام کو نہیں جا سکا۔ اب شام گزر چکی تھی۔ کمرے میں روشنی کم ہو رہی تھی، اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ آشیانے کے دوست باہر گئے ہوئے تھے۔ مہندر کو ایک رہائی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس شکست کی حالت میں اس میں ہمت نہ تھی کہ اُن

کے نشتروں کو برداشت کر سکے۔ آج اس کا جی چاہ رہا تھا کہ آشیانے کو چھوڑ کر چلا جائے، بمبئی کو چھوڑ دے۔ یہ خیال نیا نہ تھا پہلے بھی بارہا آیا تھا، ناکام ہو کر کئی مرتبہ دل میں فرار کا جذبہ پیدا ہوا تھا۔ ہمیشہ وہ اسے ایک بزدلانہ قسم کی جذباتیت پر محمول کر کے مسکرا دیا تھا۔ لیکن آج وہ مسکراہٹ ناپید تھی۔ آج وہ اس جگہ کو چھوڑنا چاہتا تھا اور دراصل یہاں سے جانا نہ چاہتا تھا بلکہ ایک زیرنفسی ضد نے اسے بیزار کر دیا تھا۔ وہ نیم تاریک کمرے میں بستر پر نیم دراز پڑا رہا۔ "مجھے تم سے عشق ہے"۔ ممکن ہے۔ سچ ہو۔ مگر وہ خالی جیب اُس کے پاس نہیں جا سکتا۔ شاید اس حالت میں وہ کٹی کی نظر میں ایک بھکاری بن جائے، ایک عاشق نہ رہے۔

وہ بیٹھا رہا اور وقت گزرتا گیا۔ پھر کسی نے دروازہ کھولا۔ چیٹرجی اندر آ گیا۔

"ابھی سے کیسے آ گئے؟" مہندر نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

چیٹرجی نے اُس کے ہاتھ میں دس دس روپے کے دو نوٹ تھما دیئے۔

"یہ کیا ہے؟" مہندر سمجھ نہ سکا، چیٹرجی ایک وقت کھانا کھاتا تھا۔

"تمہیں روپے کی ضرورت ہے نا؟"

"مگر یہ —— تمہارے پاس روپے تھے!"

"نہیں —— میں نے اپنی انگوٹھی گروی کر دی ہے۔" چیٹرجی نے مسکرا کر کہا۔ اس کی مسکراہٹ میں غم کی وہ گہری لکیر تھی جو دیر تک مہندر کے دل پر کھنچی رہی۔

"وہ انگوٹھی تمہاری ماں کی یادگار تھی، میرے لئے تم نے اُسے گروی رکھ دیا؟"

"—— نہیں" ایک لمحے کے بعد چیٹرجی نے جواب دیا۔ "وہ انگوٹھی میں اپنے پاس نہیں رکھ سکتا تھا، مجھے ہوٹل والے کا بل دینا تھا۔"

وہ دونوں نوٹ اب تک مہندر کے ہاتھ میں لرز رہے تھے۔ اچانک مہندر کو محسوس ہوا کہ یہ نوٹ دو موتی ہیں، دو آنسو ہیں، خون کے دو قطرے ہیں۔ اس نے نوٹ واپس چیٹرجی کے ہاتھ میں دے دیئے۔ اس نے چاہا کہ چیٹرجی کو سینے سے لگا لے، مگر ایک عجیب سے حجاب کا احساس کر کے وہ یہ نہ کر سکا۔ اس نے صرف چیٹرجی کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"مجھے اب ان کی ضرورت نہیں ہے۔" اُس نے مسکرانے کی کوشش میں کہا۔ "نہیں تم اپنے پاس رکھو، تمہیں ضرورت ہو گی۔"

اور چیٹرجی کو چھوڑ کر وہ بالکنی میں جا کھڑا ہوا۔ اب تک وہ چیٹرجی پر صرف رحم کرتا رہا تھا۔ آج اس کے لئے مہندر کے دل میں آنسوؤں سے دُھلی ہوئی محبت پیدا ہو گئی۔ وہ جانتا ہے کہ چیٹرجی ہمیشہ زندگی کے درد میں شریک رہا ہے۔ اس نے خوشی کبھی نہیں دیکھی، کبھی نہیں دیکھی، کبھی راحت نہ اٹھائی۔ چیٹرجی کو اس کے بھائی نے فوٹوگرافی کا کام سکھایا تھا۔ بنگال کے ایک چھوٹے سے قصبے میں اس کی دوکان تھی۔ چیٹرجی اس قصبے کی دوکان پر کام نہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ زندگی میں عزت، آرام اور خوشی چاہتا تھا۔ وہ عزت، وہ آرام، وہ خوشی اب تک نہ ملی۔ پانچ سال پہلے وہ اپنے بھائی کو چھوڑ کر بمبئی آیا تھا۔ یہاں وہ فلمی کیمرہ مین ہونا چاہتا تھا۔ بمبئی کے ایک نگار خانے میں وہ کئی سال کام سیکھتا رہا اور کسی نے اسے کام نہیں سکھایا، وہ بنگالی تھا۔ یہاں گجراتی بنگالیوں سے نفرت کرتے تھے، مراٹھی گجراتیوں سے نفرت کرتے تھے، پنجابیوں سے نفرت کرتے تھے۔ یہ نفرت کی دنیا تھی، یہاں انسانی محبت نابود تھی۔ چیٹرجی سے لیبورٹری کی بالٹیاں منجھوائی جاتی تھیں، اس سے قلیوں کی طرح کام لیا جاتا تھا اور کوئی اسے کچھ بتاتا نہ تھا لیکن چیٹرجی نے ایک کتے کی طرح صبر سے کام لیا، ایک جونک کی طرح غلاظت سے چمٹا رہا۔

لیکن اب کام سیکھنے کے بعد بھی کوئی اسے کام نہیں دیتا۔ کوئی اس کے کپڑے دیکھ کر تیوری چڑھا لیتا ہے، کوئی

اسے بنگالی ہونے کی وجہ سے پاس نہیں آنے دیتا۔ چیٹرجی نے ٹھوکریں سہنا سیکھ لیا ہے، وہ ہر ذلت، ہر توہین، ہر ظلم برداشت کرلیتا ہے، وہ ایک وقت کھانا کھاتا ہے اور ہر ہفتے اس کا وزن کم ہوتا جاتا ہے۔

لیکن اس سب کے باوجود اُس کے دل میں یہ حُسن کیسے رہ گیا۔ مہندر سوچ رہا تھا، کیسے اس نے اپنے دل میں انسانیت کو بچا لیا۔ اس کا یہ فعل ہر اس شے کا حامل تھا جو انسان میں خوب صورت ہے۔ لیکن وہ چیٹرجی کے روپے نہ لے سکتا تھا۔ وہ کِٹی پر روپے صرف کرنا چاہتا تھا لیکن اِن روپوں کو کِٹی پر صرف کر کے وہ ہمیشہ خود کو مجرم سمجھتا رہے گا۔ یہ نہیں ہوگا اور اس کے پاس اپنا روپیہ نہیں ہے، وہ کِٹی سے نہیں ملے گا اور اس کے دل میں یہ محبت آہستہ آہستہ مردہ ہو جائے گی۔ یہ شمع جو اس کے سینے میں جل اٹھی تھی بجھ جائے گی اور دل میں پھر وہی غیر محدود گہرا اندھیرا چھا جائے گا۔

بالکنی میں کھڑا ہوا وہ سوچتا رہا۔ باہر اندھیرا ہو گیا تھا اور بوندیں پڑ رہی تھیں۔ لیمپ پوسٹ کی دھیمی روشنی میں گلی بے رونق پڑی تھی اور بارش کی بوندیں متواتر گیلی زمین پر پڑ رہی تھیں۔ کیچڑ کی چھینٹیں اڑاتی ہوئی مالک مکان کی کار گلی میں داخل ہوئی اور آشیانے کے آگے رک گئی۔ آج ہفتے کی رات تھی۔ مالک مکان کار سے اترا، پھر اس نے عورت کو ہاتھ پکڑ کر نیچے اتارا۔

یہ کِٹی تھی!

ایک لمحے کے لئے مہندر کو یقین نہ آیا۔ یہ عورت جو مالک مکان کا ہاتھ پکڑ کر کار سے اُتری تھی؟ پھر اُسے یقین آگیا۔

کِٹی مالک مکان کے ساتھ اندر چلی گئی۔ مہندر بالکنی میں کھڑا رہا۔ کار سڑک پر کھڑی رہی۔ ایک پیہم تسلسل سے بارش کی بوندیں نیلی کار پر پڑ رہی تھیں جیسے آنسو برس رہے ہوں۔

آدمی اور سکّے

لیڈر

رات اندھیری ہے

جیسے عظیم ناولوں کے خالق

مہندر ناتھ

کو

خراجِ عقیدت

گلشن باورا

(گیت کار)

ترقی پسندوں نے پڑھا اور مہندر ناتھ نے لکھا

آج ترقی پسند ہونا ایک اعزاز ہے۔ لیکن اُس زمانے میں ترقی پسند ہونا ایک عذاب تھا۔ مذہب پرست لوگ ترقی پسندی کو لادینوں کی داشتہ مانتے تھے اور برسرِاقتدار لوگ ترقی پسندوں کو روس کا گماشتہ گردانتے تھے۔

بمبئی میں اُن کی کانفرنسوں پر پابندی لگ جاتی تھی۔ لیڈر اور منسٹر انہیں ترچھی نظروں سے دیکھتے۔ بمبئی میں اُن کی نشستیں ہوتیں۔ ہر زبان کے ادیب اپنی نگارشات پیش کرتے۔ ان پر تنقید ہوتی۔ ادب و شعر کے رموز کھلتے۔ ترقی پسند پڑھتے اور بولتے۔ رپورٹ لکھتے مہندر ناتھ۔ وہ ترقی پسند مصنفین کے سکریٹری جو تھے۔ عام طور پر سکریٹری مجلس کی کارروائی پڑھیں یا سالانہ رپورٹ لکھیں۔ اُس میں اُن کی اپنی رائے اور اپنا نقطۂ نظر اصل مدعا کو دُھندلا دیتا ہے۔ مطلب یہ کہ حقدار کو دھکیل کر الگ کر دیتے ہیں۔ اور کیمرے کے سامنے خود کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مگر مہندر ناتھ ایسا نہیں کرتے تھے۔ ان کی لکھی ہوئی کارروائیوں میں نکتہ چین بال نوچتے نظر آتے ہیں اور قاری سر دھنتے ہوئے۔ مہندر ناتھ کہیں دکھائی نہیں پڑتے۔ اُس زمانے کی نشستیں ادب کا بیش بہا سرمایہ بن گئی تھیں۔

ادارہ اُن رپورٹوں کی تلاش میں نکلا۔ تو ترقی پسندوں کے ذہن میں اُن کی روئیداد کے کچھ نقوش ملے مگر اُن کے کاغذ سفید تھے۔ قلم گنگ ــ لیکن ہمارے دوست سعید انیس جو لاہور سے لے کر بمبئی تک ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے۔ اُنکے ہاں کبھی ہندوستان اور پاکستان کا سارا مطبوعہ ادب محفوظ تھا۔ ہم ان سے ملے تو وہ اقتصادی ترقی سے نکل کر بدحالی کے آخری نقطے پر تھے۔ اونچی بلڈنگوں سے اتر کر چالوں اور جھونپڑوں میں آ بسے تھے۔ جن مکانوں میں دھوپ نہیں آتی وہاں دیمک آتی ہے۔ کچھ ترقی پسند ادب کو دیمک چاٹ گئی اور کچھ سعید انیس کے بمبئی سے باہر جانے پر اُن کی اَن پڑھ بیوی نے ادب کو ردّی سمجھ کر بچوں کے لئے چولہا سلگا

لیا۔ جو کچھ بچا تھا وہ ہمارے ہاتھ آیا اور اس وقت ہاتھ آیا۔ جب پورا یادگار نمبر مرتب ہو چکا تھا۔ اِدھر اس دور میں پاکیزگی کی طرح کاغذ بھی کمیاب بلکہ نایاب ہے اس لئے بہت ہی مختصر رپورٹوں پر ہم نے قناعت کرلی ہے۔
آپ بھی صبر کر لیجئے۔

(ادارہ)

---

۳ جنوری ۱۹۵۴ء

انجمن ترقی پسند مصنفین شاخ بمبئی کا ہفتہ وار جلسہ ۳ جنوری ۱۹۵۴ء کو کیفی اعظمی کی صدارت میں منعقد ہوا۔
سب سے پہلے سیکریٹری نے پچھلے ہفتے کی رپورٹ سنائی جو بغیر کسی اعتراض کے پاس کی گئی۔
پروگرام کے مطابق ظفر گورکھپوری نے اپنی تازہ نظم سنائی جس میں ہندوستان کی بدحالی اور بیکاری کا ذکر تھا۔
اندیور نے اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ مجھے پیاسے کا استعمال صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اور ساتھ میں سائیں سائیں قافیہ غلط ہے
کیفی اعظمی: سائیں کا قافیہ صحیح ہے۔ آرزو نے اپنی ایک غزل میں استعمال کیا ہے جہاں انھوں نے سائیں کے ساتھ ہوائیں کا استعمال کیا ہے۔ پیاسے غلط نہیں ہے۔
اس کے بعد اندیور نے اپنی تازہ نظم "ملن کی موت" سنائی۔
مجروح سلطانپوری: مجھے نظم کی central theme پر اعتراض ہے۔ شاعر نے عاشق اور معشوق کے ملاپ کو موت سے تشبیہ دی ہے۔ اگر زندگی کا مقصد صرف محبوب کو پانا ہے یا صرف اس سے ملنا ہے تو پھر یہ بات صحیح ہو سکتی ہے لیکن اس بات کو حقیقت نگاری کے ترازو پر تولتے ہیں تو یہ بات غلط ثابت ہوتی ہے جب A اور B کا ملاپ ہوتا ہے تو ایک بہترین چیز وجود میں آتی ہے۔ بہترین چیز کے وجود سے انکار کرنا غلطی ہوگی۔ زندگی ایک مسلسل حرکت ہے ایک کڑی سے دوسری کڑی بنتی ہے۔ اس زندگی میں انسان کچھ چیزیں دیتا ہے اور کچھ چیزیں آگے سے پاتا ہے۔ اب ملاپ کو مکمل موت کہنا ایک بھاری غلطی ہوگی۔ کیونکہ انسان ترقی کرتا ہے اور آگے بڑھتا ہے۔
کیفی اعظمی: میں پوری نظم سمجھ نہیں پایا۔ انسان ہمیشہ ترقی کرتا آیا ہے۔ ایک زینے سے دوسرے زینے تک۔ ایک چیز حاصل کرنے کے بعد دوسری چیز کی طرف بڑھتا ہے۔ لیکن جس چیز کا ذکر اس نظم میں کیا گیا ہے وہ کافی خطرناک رجحان ہے شاعر کو اس رجحان سے بچنا چاہیے۔
اندیور: مجھے پہلے بھی یہ بات کھٹکتی تھی۔ اب اس مقصد کے زیر اثر اس نظم کو دوبارہ لکھوں گا۔
اس تنقید کے بعد اکبر الہ آبادی نے اپنی تازہ غزل سنائی جو حاضرین نے کافی پسند کی۔
علی سردار جعفری: مطلع میں موجوں کا دھارا کچھ کھٹکتا ہے۔
مجروح: مجھے بھی کچھ اجنبی سا لگتا ہے۔
ظفر: گر یہ کچھ کھٹک رہا ہے۔
کیفی اعظمی: کیوں؟
ظفر: کچھ غیر فصیح معلوم پڑتا ہے۔
اس کے بعد پریم دھون نے اپنی سریلی آواز میں دو تین گیت سنائے جو حاضرین نے بہت پسند کیے۔

اس کے بعد صاحبِ صدر نے جلسہ برخاست کیا۔

سکریٹری : مہندر ناتھ

۱۰ر جنوری ۱۹۵۴ء

۱۰ر جنوری ۱۹۵۴ء

انجمن ترقی پسند مصنفین شاخ بمبئی کا ہفتہ واری جلسہ ۱۰ر جنوری ۱۹۵۴ء کو عرب بلڈنگ میں منعقد ہوا۔ اس جلسے کی صدارت بشو درما نے کی۔ پروگرام کے مطابق سیکریٹری نے پچھلے ہفتے کی رپورٹ سنائی۔ اور ہندی کے مشہور افسانہ نگار یشپال نے ہندی ادب پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ہندی میں آج کل بہت سے واد वाद چل رہے ہیں۔ مثلاً پرگرتی واد، چھایا واد اور اسی طرح مختلف ادیب مختلف وادوں کے زیر اثر ادب کی تخلیق کر رہے ہیں۔ بمبئی میں گجراتی اور مرہٹی کے ادیبوں نے اکثر مجھ سے پوچھا کہ ہندی میں ادیبوں کے اتنے الگ الگ مورچے کیوں ہیں؟ اور ہندی کے لیکھک ادیب ہونے کے بجائے سیاست داں بن گئے ہیں۔ میرے خیال میں ہندی کے ادیب زیادہ باشعور ہیں۔ اگر ہندی ادب میں واد زیادہ ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہندی کے ادیب آپس میں لڑتے ہیں یا جھگڑتے ہیں۔ بلکہ وہ ہر چیز کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ اب ہندی کے ادیب اعتقادوں اور روشنوں پر زیادہ دھیان نہیں دیتے اور وہ روایت پرستی پر حملہ کرتے ہیں اور نئی قدروں کو پرکھنے اور اپنانے میں سب سے زیادہ آگے ہیں۔

ہمارے نقاد اس ترقی سے خوش نہیں ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہندی کے ادیب اور آگے نہ بڑھیں۔ بعض نقادوں نے زیادہ سخت تنقید کر کے بہت سے ادیبوں کو اپنا دشمن بنا لیا اور ہمارے بہت سے ادیب ترقی پسندوں کو گالیاں دیتے ہیں۔ مثلاً ہندی کے مشہور شاعر سمترا نندن، پنت، وہ پرگتی شیل ادیب اور ادیبوں پر کافی کڑی تنقید کرتے ہیں۔ لیکن ان کا حال ہم لوگوں سے مختلف نہیں۔ ہندی کے ادیبوں میں بیداری دن بدن بڑھ رہی ہے۔ ہمارے کچھ ادیب وقت کا ساتھ نہیں دے رہے ہیں۔ لیکن ہمارے پیچھے جو لہر آ رہی ہے وہ ہم سے بھی تیز ہے۔ اگر پرانے ادیبوں نے اس لہر کا ساتھ نہ دیا تو یہ لہر آگے بڑھ جائے گی اور پرانے ادیبوں کو پیچھے چھوڑ جائے گی۔

حال ہی میں میں نے ایک مارواڑی مشاعرہ میں شرکت کی۔ وہاں تقریباً سارے کا سارا مالدار طبقہ تھا۔ لیکن اس طبقے کے شاعر بھی ترقی پسند نظمیں کہتے تھے۔ نظموں میں ان کی یہی وچار دھارا تھی کہ سرمایہ کو لوگوں میں برابر بانٹ دیا جائے۔ اس پرانے سماج کو ڈھایا جائے اور نئے سماج کو قائم کیا جائے۔ اب گاندھی واد سے ہمارے مسائل حل نہیں ہو سکتے۔ کچھ ادیب ایسے ہیں جو رجعت پسند ہیں۔ بھارتی سنسکرتی کی رکھشا کے لئے لڑتے جھگڑتے ہیں۔ لیکن ان کی للکار میں بھی ترقی پسندی کی گونج ہے۔

اس تقریر کے بعد پرواز اعظمی نے ایک غزل سنائی۔

کیفی اعظمی نے تنقید کرتے ہوئے کہا کہ اس غزل میں بت پرستی کا رجحان زیادہ ہے۔ ردیف قافیہ کو نبھانے کے لئے زیادہ سے زیادہ شعر کہے گئے ہیں۔ اور شاعر کو اس رجحان سے بچنا چاہئے

اس کے بعد مشفق حیدرآبادی نے ایک نظم سنائی۔

ظفر گورکھپوری :۔ آزاد نظم ہے۔ آزاد نظم لکھنے کے لئے کافی مشق کی ضرورت ہے۔ اس نظم میں صرف ایک شعر اچھا ہے۔ باقی نظم اچھی نہیں ہے۔

کیفی اعظمی :۔ فنی خامیوں کے علاوہ میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ کہ آج کل نعرہ بازی کا ایک فیشن سا بن گیا ہے۔ میں نعرہ بازی کے خلاف نہیں ہوں، بلکہ نعرہ بازی کو شاعری کا ایک حصہ سمجھتا ہوں۔ لیکن میں کھوکھلی نعرہ بازی کے خلاف ہوں۔ شاعر اس نظم میں

کس طرح اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ اب اچھے دن آجائیں گے۔ وہ کون سے حالات ہیں۔ جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اب جلد ہی ایک نیا مستقبل آنے والا ہے۔ یہ نظم سامعین پر کوئی اثر نہیں ڈالتی کیونکہ یہاں جدوجہد نہیں ہے۔ کھوکھلی نعرہ بازی ہے۔

اس کے بعد کرشن چندر تشریف لائے اور انہوں نے اپنا تازہ افسانہ بہ عنوان "سب سے بڑا گناہ" پڑھا۔ کہانی روزن برگ کی پھانسی ہے۔ اس پھانسی سے متوسط طبقے کے افراد پر کیا اثر پڑا۔ ان تمام تاثرات کو اس کہانی میں پیش کیا گیا۔

تنقید یوں ہوئی:

کیفی اعظمی: اس کہانی میں روزن برگ کی سازش کو اچھی طرح بے نقاب نہیں کیا گیا کہ یہ قتل کیوں ہوا؟ اس کے پیچھے کونسی طاقتیں کام کر رہی تھیں۔ اور روزن برگ اور ایتھیل کے بیانات سے کافی مواد مل سکتا تھا۔ لیکن کہانی کا پہلا حصہ دوسرے حصے سے زیادہ لمبا ہو گیا۔ اصل واقعہ کو کم جگہ دی گئی اور جہاں بیوی بچوں کا ذکر ہے وہاں زیادہ تفصیلات سے کام لیا گیا۔ اگر روزن برگ کی سیاسی اہمیت کو اجاگر کیا جاتا۔ ساتھ ہی امن کا پس منظر زیادہ ابھر کر آنا چاہئے تھا۔ کرشن جی اس بارے میں کچھ کہیں تو بہتر بات ہوگی۔

رشل جی: کہانی رپورتاژ کی تکنیک میں لکھی گئی ہے۔ گو میں خود افسانہ نگار نہیں ہوں۔ کہانی کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتا لیکن پھر بھی میں یہ ضرور پوچھوں گا کیا اس کو کہانی کہا جا سکتا ہے؟

ایک صاحب: جب میں نے روزن برگ کی پھانسی کی خبر سنی تھی تو میری آنکھوں میں آنسو آگئے تھے لیکن یہ کہانی سن کر میری آنکھوں میں آنسو نہیں آئے۔

رفعت سروش: دراصل کرشن چندر کی یہ کہانی ایک تاثراتی کہانی ہے۔ مختلف تاثرات کو جوڑ کر ایک کہانی بنائی گئی ہے۔ کبھی کبھار کہانی کا تاثر ایک شعر کی مانند ہوتا ہے۔ اور اس کہانی کا اثر بھی ایک شعر کی طرح ہے۔ یہ پلاٹ والی کہانی نہیں ہے۔ کرشن چندر نے بڑی خوبصورتی سے ان تاثرات کو قلمبند کیا ہے۔

ظ۔ انصاری: اس کہانی میں تاثر اور اثر پایا جاتا ہے۔ اثر دھیرے دھیرے شروع ہوتا ہے اور آخر میں بڑھ جاتا ہے۔ کرشن چندر جی نے اسی تکنیک کے تحت ایک کہانی بہ عنوان "جانور" لکھی تھی۔ لیکن وہ کہانی زیادہ جاندار تھی۔ یہ کہانی ایک Montages صورت میں لکھی گئی ہے۔ اور میرے خیال میں اس کہانی کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ ایک سوشل تھیم کو انفرادی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ انفرادیت اس کہانی کی کمزوری بن گئی ہے۔ اس کہانی سے ہماری سوجھ بوجھ میں زیادہ اضافہ نہیں ہوتا۔ اور ایک بات اور کہوں گا کہ روزن برگ کو اس لئے پھانسی نہیں دی گئی تھی کہ وہ امن تحریک کے ساتھ تھے بلکہ انہیں پھانسی اس لئے دی گئی تھی کہ انہیں SPY سمجھا گیا تھا۔ میرے خیال میں ان واقعات پر افسانہ نگار کو دوبارہ غور کرنا پڑے گا۔

لیشپال: میں اس کہانی کو Personal essay سمجھوں گا۔ کہانی کا پہلا حصہ زیادہ Enjoyable اور Gay ہے لیکن دوسرے حصے کے لئے ایک مناسب ماحول پیدا نہیں ہوا۔ پہلے حصے میں روزن برگ کی موت سن کر بھی وہ خوش ہے یہ بات کچھ کھٹکتی ہے اور اس کا رویہ بیوی بچوں کے ساتھ زیادہ اچھا اور بہتر ہو جاتا ہے۔ دریا سنگھ روزن برگ کی پھانسی کی خبر سن کر اسے زیادہ غمگین اور اداس ہونا چاہئے لیکن وہ اپنی بیوی بچوں سے کہتا ہے کہ تم جی بھر کر خوش ہو جاؤ۔

اسی نظر میں روزن برگ کی پھانسی کا تعلق امن کے ساتھ ہی ہے۔ بنیادی طور پر ایک ہی سوال ہے۔ ایک صاحب نے کہا کہ اِس کہانی کو سن کر میری آنکھوں میں آنسو نہیں آئے۔ تو یہ کوئی ضروری نہیں کہ ہر کہانی سننے کے بعد آنکھوں میں آنسو آجائیں۔ یا آنسوؤں کے آنے ہی سے کہانی بہتر کہلائی جاسکتی ہے۔

مہندر ناتھ:۔ شیل جی نے یہ اعتراض کیا کہ یہ کہانی نہیں ہے کیونکہ اس میں پلاٹ نہیں ہے۔ دراصل یہ تاثراتی کہانی ہے۔ جس میں روزن برگ کی پھانسی کا اثر ایک خاندان پر دکھایا گیا ہے۔ اس قسم کی کہانیاں صرف کرشن جی ہی نے نہیں لکھیں بلکہ اس قسم کی تاثراتی کہانیاں گورکی، چیخوف اور دیگر بڑے افسانہ نگاروں نے بھی لکھی ہیں۔ میں نے چیخوف کی ایک کہانی پڑھی تھی۔ جس میں وہ صرف ایک عورت کے حسن کی تعریف کرتا ہے بس اور کچھ نہیں۔ اب اسے Personal essay کہہ لیں یا کچھ اور۔

جہاں تک امریکی سیاسی سازش کا تعلق ہے تو میرے خیال میں اس سازش کا لکھنا اس افسانے میں درست معلوم نہیں ہوتا۔

یشپال جی نے کہا کہ شروع کا حصہ زیادہ Gay اور مسرت آمیز ہے تو دراصل افسانہ نگار تضاد پیدا کرنے کے لئے سب سے پہلے Gay Mood لاتا ہے تاکہ اس کے بعد ایک اور اُداس فضا پیدا کر سکے۔ Central theme کو ابھارنے کے لئے دو مختلف موڈ سامنے لائے گئے۔ ایک ساتھی نے کہا کہ خاوند پھانسی کی خبر سن کر بچوں اور بیوی کے ساتھ اور بہتر سلوک کیوں کرتا ہے۔ وہ غمگین کیوں نہیں ہوتا۔ اداس کیوں نہیں ہوتا۔

میرے خیال میں اگر حالات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا۔ موت انسان کو ایک بہتر انسان بنانے کی کوشش کرتی ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ آج کے حالات میں کیا ہو جائے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے بیوی بچوں سے الگ کر دیا جائے۔ موت اس کے اندر انسانیت کے جذبے کو اُبھارتی ہے اور وہ اپنے بیوی بچوں سے زیادہ پیار کرنے لگتا ہے۔ تو میری نظر میں افسانہ کا دوسرا حصہ نہایت پیارا اور سلجھا ہوا ہے۔ اس میں ایک ایسا اثر ہے جو نہایت ہی اچھا اور میٹھا ہے مجھے یہ کہانی اچھی لگی۔ اور بے حد پسند آئی۔

کرشن چندر نے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ ظ۔ انصاری صاحب نے کہا ہے کہ میں نے اس افسانے میں Montage کی تکنیک کو استعمال کیا ہے۔ دراصل اس افسانے کو Montage کی تکنیک سے کوئی تعلق نہیں۔ Montage کی تکنیک وہی ہے جو عباس نے Montage نام کے ایک افسانے میں استعمال کی ہے۔

ظ۔ انصاری نے کہا کہ اس کہانی میں انفرادیت پسندی ہے۔ میرے خیال میں یہ تجزیہ غلط ہے۔ میں نے ایک خالص سیاسی نقطۂ نظر سے یہ کہانی لکھی ہے۔ اس کہانی کا پس منظر امن ہے۔ اور امن تحریک سے انفرادیت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ ایک مجموعی مانگ ہے جس کا صرف ایک فرد سے تعلق نہیں بلکہ کروڑوں انسانوں سے تعلق ہے۔

جہاں تک کہانی کی سوجھ بوجھ کا تعلق ہے تو کہانی میں Human appeal ہوتی ہے اور ہونی چاہئے۔ یہ کہانی روزن برگ کی پھانسی کے متعلق ہے جس کا اثر ایک چھوٹے سے خاندان پر دکھایا گیا ہے۔ روزن برگ کو کیوں پھانسی پر لٹکایا گیا۔ اس کی سیاسی وجوہات کیا تھیں۔ یہ ایک لمبا قصّہ ہے جو صرف ایک ناول میں آسکتا ہے، کہانی میں نہیں۔ اور بہت سی باتوں کو زیادہ تفصیل سے بیان نہیں کیا گیا۔ مثلاً امریکی سازش کا پس منظر Brus کا تصور، کیوں یہ سمجھ لیا گیا۔ پڑھنے والوں کو روزن برگ کے متعلق کچھ نہ کچھ ضرور معلوم ہوگا۔ اور میں نے اس افسانے میں روزن برگ a tom spy کیوں؟ نہیں لکھا۔ اس میں ایک سیاسی نقطہ ہے۔ اگر روزن برگ اور ایتھل کے خطوط اور باقی باتوں کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کا امن تحریک کے ساتھ گہرا تعلق تھا۔ ایتھل کی شاعری، بچوں سے پیار، کتابوں سے محبت یہ سب چیزیں امن تحریک سے محبت سکھاتی ہیں۔

جہاں تک یہ کہا گیا ہے کہ خاوند کیوں خوش ہے تو میں عرض کروں گا کہ سارے افسانے میں یہ کہیں نہیں دکھایا گیا کہ خاوند خوش ہے وہ شروع ہی سے سوچتا ہے۔ اس کی بیوی خوش ہے۔ اس کے بچے خوش ہیں لیکن وہ غمگین اور اداس ہے۔ وہ سوچتا ہے۔ وہ بہتر سلوک کیوں کرتا ہے تو اس کا جواب مہندر نے بہت اچھا دیا ہے کہ اس روز واقعی چاہتا ہے کہ وہ جی بھر کر اپنے بچوں کو پیار کرے۔ اس موت نے اسے زیادہ Humane بنا دیا ہے۔

جہاں تک یہ کہا گیا کہ یہ کہانی ہے یا نہیں۔ تو میں کہوں گا۔ اس کہانی میں پلاٹ ہے۔ کردار ہے۔ ایک تاریخی تسلسل ہے۔ ایک منظم سوجھ بوجھ ہے۔ ایک باشعور انسان کی پوری سوجھ بوجھ اس افسانے اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہے۔ ایک دوست نے کہا کہ میں اس افسانے میں رلا نہیں سکا۔ دراصل میرا مقصد آپ کو رلانا نہیں تھا۔ اگر میں رلانا چاہتا تو میں ضرور رلا دیتا میں اس افسانے میں گہرے تفکر اور ایک ٹھہراؤ کا اثر چھوڑنا چاہتا ہوں۔ اس لئے آخر میں پال رابن کا راگ گونجتا ہے۔ گو آج کی رات روزن برگ کو پھانسی دی گئی۔ لیکن آج کی رات مقدس ہے۔ پال رابن کا راگ گونج رہا ہے۔ اس آواز کو کوئی بند نہیں کر سکتا۔ یہ آواز گونجتی رہے گی۔

اس بحث کے بعد اگلے ہفتے کا پروگرام مرتب کیا گیا۔ اور صاحبِ صدر نے جلسہ برخاست کیا۔

مہندر ناتھ ۔ سیکرٹری

۲۴ جنوری ۱۹۵۴ء

فیض احمد فیض کی نئی نظم پر بحث

کیفی اعظمی:۔ آج پڑھنے والا اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ نظم اس کی سمجھ میں آسکے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں شاعری سے حسن، اندازِ بیان یا تشبیہیں اور استعارے چھین لینا چاہتا ہوں۔ یہ بات نہیں۔ تشبیہیں اور استعارے لائیے۔ لیکن اپنی جدوجہد اور روزمرہ کی جدوجہد لائیے۔ آپ کا موضوع اجتماعی زندگی ہے۔ لیکن آپ کے استعارے اور اس قسم کی تشبیہیں آتی ہیں جو عوامی جدوجہد سے کٹی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ میں اس قسم کی شاعری کو نوابی شاعری کہوں گا۔ تشبیہیں سردار بھی استعمال کرتے ہیں۔ لیکن ان کی تشبیہوں سے لوگ پورا اثر لیتے ہیں۔ جس دروازے کو آج کھولا جا رہا ہے وہ نہایت ہی خطرناک راستہ ہے۔ ہمارے شاعر یاسیت پرستی کا شکار ہو جائیں گے۔ ہم اس بات کا مطالبہ کرتے ہیں کہ نظمیں ہماری سمجھ میں آسکیں۔ یہ مطالبہ جائز ہے۔ میں اس نظم کی زبان کے بارے میں کہوں گا کہ اس کی زبان مشکل نہیں ہے، بلکہ اندازِ بیان مشکل ہے۔

وشوامتر عادل:۔ کیفی صاحب کا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ اس نظم میں جدوجہد تو ہے لیکن زبان عوامی نہیں ہے۔ تشبیہیں اور استعارے عوامی نہیں ہیں یا اندازِ بیان مشکل ہے۔ تو کیا ہمیں وہ زبان استعمال کرنا چاہیے جو عوام استعمال کرتے ہیں۔ جیسے نیاز حیدر نے شاعری کی ہے "خالی ہیلی رباب کرتا ہے"۔ جس زبان میں عوام بات چیت کرتے ہیں وہ شاعری کی نہیں ہو سکتی۔ فیض نے بھی آسان نظمیں کہی ہیں۔ مثلاً "چند روز اور میری جان چند روز" جہاں تک زبان کا تعلق ہے تو دنیا کے بہترین شاعروں کی زبان عوام کی سمجھ میں نہ آسکے گی۔ اگر ہم استعاروں اور تشبیہوں کو شاعری سے نکال دیں گے تو شاعری نعرہ بازی بن کر رہ جائے گی۔ فیض کی یہ نظم شاعری کرنا سکھاتی ہے۔ اس میں بڑے

حسین استعارے ہیں۔ خیال کو فنی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس نظم سے ہمارے پرانے اور نئے شاعر بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

سردار جعفری: گرما گرم بحث میں صحیح بات کہتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ کہیں عوام دشمنی کا الزام ہم پر نہ لگ جائے۔ اس نظم میں تشبیہیں اور استعارے خوبصورت ہیں لیکن اندازِ بیان مشکل ہے اس لئے اس میں کچھ اجنبیت سی لگتی ہے۔ میں عوام کے ردِّ عمل سے اچھی طرح واقف ہوں، اپنی نظم پڑھتے ہوئے ہر مصرع پر غور کرتا ہوں کہ کس مصرع پر داد ملتی ہے، کہاں لوگ خاموش رہتے ہیں۔ عوام کی سمجھ بوجھ میں مختلف باتیں کام کرتی ہیں۔ ایک نظم ایک خاص علاقے میں مقبول ہوتی ہے۔ دوسرے علاقے والے اُسے پسند نہیں کرتے۔ 'پتھر کی دیوار' میں جہاں چاولوں کا ذکر آتا ہے وہاں پنجاب والے داد نہیں دیتے جہاں سبزیوں کا ذکر آتا ہے پنجاب والے داد دیتے ہیں۔ کیونکہ پنجاب میں سبزی زیادہ کھائی جاتی ہے چاول کم کھایا جاتا ہے۔ جہاں تک فیض کی تشبیہوں اور استعاروں کا تعلق ہے وہ سب عوامی ہیں۔ رات، پیڑ، شاخیں، تارے ان میں کوئی شئے ایسی نہیں ہے جس سے عوام متاثر نہ ہوں۔ صرف اندازِ بیان اجنبی ہے۔

آج ہمیں تنگ نظری سے ادب کو پرکھنا نہیں چاہیے۔ نئے تجربوں کو جگہ ملنی چاہیے۔ نئی تشبیہیں اور نئے استعارے لکھیں اور عوام کا فرض ہے کہ وہ سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس نظم میں تشبیہیں اور استعارے مشرقی ہیں۔ لیکن اندازِ بیان مغربی ہے اس لئے پوری نظم میں ایک اجنبیت کا احساس ہوتا ہے۔ سمجھنے میں ذرا دقت ہوتی ہے۔ اس کے اندر ایک ہلکا سا ابہام ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ فیض پاکستان کی جیل میں ہیں اور وہاں کے حالات اجازت نہیں دیتے کہ بات کھل کر کی جائے۔

ماؤ نے ایک جگہ کہا ہے کہ ہمیں دو طرح کا ادب پیدا کرنا ہے۔ ایک ادب عوام کی تعلیم کے لئے اور دوسرا عوام کے معیار کو اونچا کرنے کے لئے۔ جہاں تک 'دروازے سے' کا تعلق ہے تو میں یہ کہوں گا کہ جبار صاحب اس دروازے سے داخل ہو کر واپس بھی آ سکتے ہیں۔ جس رویئے کو وہ اختیار کرنا چاہتے ہیں وہ غلط ہے۔ یہ نظم تکنیک، وحدت، تاثر اور شدت، تشبیہیں اور استعاروں کے لحاظ سے بڑی کامیاب نظم ہے۔

مہندر ناتھ

۲ر دسمبر ۱۹۵۴ء

انجمن ترقی پسند مصنفین شاخ بمبئی کا ہفتہ وار جلسہ ۲ر دسمبر ۱۹۵۴ء کو عرب بلڈنگ کھیت واڑی میں منعقد ہوا۔ اس جلسے کی صدارت علی سردار جعفری نے کی۔

سیکرٹری نے پچھلے ہفتے کی رپورٹ سنائی۔ ہندی کے مشہور افسانہ نویس محفل میں شریک تھے۔ کرشن چندر نے یشپال جی کا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ ہندی میں یشپال جی کا بحیثیت افسانہ نویس بہت اونچا درجہ ہے۔ وہ زیادہ تر بول چال کی زبان استعمال کرتے ہیں۔ سوویت روس میں ان کی چھ کہانیوں کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ حال ہی میں وہ روس گئے ہوئے تھے۔ میں ان سے درخواست کروں گا کہ روس کی یاترا کے متعلق کچھ کہیں:

یشپال جی نے تقریر کرتے ہوئے بتایا کہ وقت بہت کم ہے اس لئے میں سب باتوں کا ذکر نہ کر سکوں گا۔ میں لیکھکوں کے بارے میں کہنے کی کوشش کروں گا کہ روس میں ادیبوں کی کیا حالت ہے اور یہ جاننے کے لئے کہ روس میں ادیبوں کی حالت کیسی ہے بس یہ معلوم کر لینا چاہیے کہ باقی ملکوں میں ادیبوں کی حالت کیا ہے۔ میں سب سے پہلے انگلینڈ کے ادیبوں کی حالت بیان کروں گا۔ انگلینڈ جمہوریت کا

رہبر رہا ہے۔ وہاں ہر ادیب کو حق حاصل ہے کہ وہ آزادی سے لکھے اور آزادی سے اپنی زندگی گزار سکے۔ لیکن جب وہاں کے ادیبوں کی اقتصادی حالت کا پتہ چلا تو بہت حیرت ہوئی۔ کیونکہ انگلینڈ میں اس وقت چھ ادیب ایسے ہیں جو صرف کتابوں کی آمدنی پر زندہ ہیں، باقی سب ادیب لکھنے کے علاوہ کوئی دوسرا کام کرتے ہیں۔ کوئی ریڈیو میں نوکر ہے، کوئی ٹیلی ویژن میں، کوئی فلم میں۔ انگلینڈ میں شارٹ اسٹوری کی مانگ گر گئی ہے، کہانیاں چھاپنے والے رسالے بند ہو گئے ہیں اور وہ رسالے چل رہے ہیں جن میں سمجے Cross ward Puzzle چھپتے ہیں۔ اور وہاں کے اخباروں کی یہ حالت ہے کہ اخباروں میں سب سے پہلے صفحوں پر عجیب و غریب خبریں چھاپی جاتی ہیں۔ مثلاً آج کل انگلینڈ میں Brann shas کا رواج پہلے سے زیادہ ہو گیا ہے اور فٹ بال میچ کی خبریں جلی حروف میں چھاپی جاتی ہیں بین الاقوامی واقعات کا ذکر پہلے صفحہ پر نہ ہوگا۔ لڑکے اور لڑکیوں کے رومان کا ذکر جلی PIERTNIES خبریں اخبار کے پہلے صفحوں پر ہوں گی۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ لوگوں میں کتنی بیداری ہے۔ گو ہمارا ملک اقتصادی طور پر انگلینڈ سے بہت پیچھے ہے لیکن جہاں تک ہماری بیداری کا تعلق ہے ہم لوگ ان سے بہت آگے ہیں۔ انگلینڈ میں آج کل کچھ ایسی فضا ہے کہ وہاں ANLHERAHIP پر گزارا کرنا مشکل ہے۔ انگلینڈ کے پبلیشر کافی منظم ہیں۔ وہاں کوئی مصنف پبلیشر نہیں بن سکتا کیونکہ کتابوں کی تجارت اتنی منظم ہے کہ کوئی تنہا آدمی پبلیشر نہیں بن سکتا۔ حال ہی میں ایک لیکھک نے خود اپنی کتاب چھاپی لیکن کتاب چھاپنے کے باوجود وہ کتاب کو نہ بیچ سکا۔ کیونکہ کوئی پبلیشر کتاب لینے کے لئے تیار نہ تھا۔ اگر روس کے ادیبوں کی حالت کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہاں ادیبوں کی حالت سب سے بہتر اور سب سے اچھی ہے۔ لیکھکوں کے اپنے (Centry Heose) اور بڑے بڑے مصنفوں کی آمدنی اتنی ہے کہ ذہن ماننے کو تیار نہیں ہوتا۔ کیونکہ روس میں ہر شخص پڑھا لکھا ہے اور (Cultural standerd) اونچا ہے۔ اس لئے تقریباً ہر شخص کتاب خریدتا ہے اور پڑھتا ہے۔ کتابوں کی مانگ زیادہ ہے۔ مصنف کی عزت زیادہ ہے۔ اور وہ سب سے زیادہ کماتا ہے۔ روس میں پبلیشنگ ہاؤس گورنمنٹ کنٹرول میں نہیں ہیں۔ جو Text Books ہیں وہ تعلیمی ادارے کے ہاتھ میں ہیں۔ یہ تعلیمی ادارے ان چیزوں کو کنٹرول کرتے ہیں۔

کتابوں کے چھاپنے کے سلسلے میں مصنف خود فیصلہ کرتے ہیں۔ ان کے اپنے پبلیشنگ ہاؤس میں Managing staff رکھا ہوا ہوتا ہے۔ یہ لوگ کتاب کو چھپوانے، حساب کتاب رکھنے اور باقی sale organis کرنے تک کا سارا کام کرتے ہیں۔ ان کی تنخواہ نکالنے کے بعد جو کچھ بچتا ہے وہ مصنف کو دیا جاتا ہے۔ بڑے بڑے ادیبوں کی بات جانے دیجئے میں ایک چھوٹے ادیب کے متعلق کچھ کہہ سکوں گا۔ کہ ایک معمولی ادیب ایک ناول لکھ کر چار سال تک اس کی آمدنی پر زندہ رہ سکتا ہے۔ روس میں ایک بار ایک ادیب سے بحث ہو رہی تھی جبکہ وہ Coffee پی رہے تھے پینے کے بعد انھوں نے ہاتھ صاف کرنے کے لئے لوڈی کلون Eudico llon۔ کا استعمال کیا۔ جس سے اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ روسی ادیبوں کی مالی حالت کیا ہے۔ اکثر روسی ادیبوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ لکھنے کے سلسلے میں انھیں پوری آزادی نہیں ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم اس قسم کا الزام روسی ادیبوں پر لگائیں ہمیں سوچ لینا چاہئے کہ ہم آزادی کا کیا مطلب لیتے ہیں۔ اس میں عوام کو کس قسم کی آزادی حاصل ہے اور کیا روس میں عوام کو آزادی حاصل ہے یا نہیں۔ اگر آزادی کو Concrete صورت میں دیکھا جائے تو اس کے دو مطلب ہوں گے کہ آزادی کن چیزوں کے لئے ہے۔ روس میں روٹی، کپڑا، نوکری، بیماری، گھر بار یہ سب چیزیں ہر شخص کو میسر ہیں۔ اس لئے یہ ضروری نہیں کہ ہر ادیب ان مزدوروں کا ذکر اپنی نظموں یا افسانوں میں کرے۔ جب ادیب بھوکا نہ رہے گا، عوام بھوکے نہ ہوں گے تو پھر بھوک کے بارے میں لکھنا بے معنی بات ہوگی۔
Freed in Frian Danger جہاں تک ان دونوں چیزوں کا تعلق ہے کہ روسی عوام اور ادیب ان دونوں چیزوں سے بے نیاز ہیں۔ روسی ادیبوں کو ان کی محنت کا پورا معاوضہ ملتا ہے۔ چھینے جانے کا کوئی خطرہ نہیں اس سلسلے میں میری TIEKNOV سے

کافی بات چیت ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ سوشلسٹ نظام میں جو خامیاں ہیں اُن کے متعلق ادیب کہہ سکتے ہیں۔ اشارے کر سکتے ہیں سوشلسٹ نظام کو آگے بڑھانے کے لئے ہر قسم کی تنقید برداشت کی جاسکتی ہے۔ لیکن اگر کوئی ادیب سوشلسٹ نظام درہم برہم کر کے دوبارہ سرمایہ دارانہ نظام لانے کی ترغیب دیتا ہے تو حکومت اس قسم کے پروپیگنڈے کی اجازت نہ دے گی۔ روسی عوام اس قسم کی تنقید برداشت کیوں نہیں کرتے۔ اس کی وجہ میں بتاتا ہوں۔ میں ایک کسان کے گھر گیا۔ روس میں ۵۴ فی صدی عوام کسان ہیں اور کھیتی باڑی پر گزارا کرتے ہیں۔ گویہ کسان بہت بڑا کسان نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی اس نے سیب، سنتروں، شراب اور بسکٹ سے ہمارا سواگت کیا۔ اس کسان کی عمر ۶۷ برس کی تھی۔ انقلاب سے پہلے اور انقلاب کے بعد ان دونوں دوروں کو دیکھ چکا تھا۔ میں اس کی بیوی سے ملا۔ اسے میرے ساتھ ہاتھ ملانے میں جھجک محسوس ہوئی۔ اس کے چہرے پر وقت کے نشان تھے۔ اس کسان نے بتایا کہ انقلاب سے پہلے اس کی کیا حالت تھی صرف ایک گائے تھی ایک تنور تھا۔ اس کا ایک بیٹا تھا جو اُن دنوں مرگیا۔ یہ ان کا سارا سرمایہ تھا۔ لیکن اب ان کے گھر پیانو تک موجود تھا۔ کھانے کے لئے سب کچھ تھا پینے کے لئے شراب تھی۔

صاف ظاہر ہے کہ ان حالات میں عوام نہیں چاہتے کہ اس نظام کو بدل دیا جائے۔ مزدور، کسان اور باقی شہری لوگوں کی حالت اچھی ہے۔ ہر آدمی محسوس کرتا ہے کہ وہ حکومت کے سب اہم کاموں میں حصہ لے رہا ہے اور وہ کسی بھی طرح برداشت نہیں کر سکتے کہ یہ نئی زندگی جو انھیں ملی ہے یہ زندگی کے لوازمات انہیں ایک کڑی لڑائی کے بعد میسر آئے ہیں ان سے چھین لی جائیں۔ یا کوئی شخص اس نظام کے لئے ایسی باتیں کہے جو اس نظام کو درہم برہم کر دے۔ اس لئے روسی ادیب بھی اپنے عوام کے ساتھ ہیں۔

ہمارے یہاں کیا ہوتا ہے کہ سستا اور گندا ادب زیادہ بکتا ہے۔ ہر چیز کو تجارتی نکتہ نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ لیکن روس میں ادب کی قدر و قیمت ان افراد پر نہیں ہوتی۔ تجارتی نکتہ نظر سے ادب کو نہیں تولا جاتا۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ روس کے ادیب خوش قسمت ہیں کیونکہ ادیب کی قدر و قیمت فن کے پہچاننے پر ہوتی ہے اور جو زندگی کی ضروریات ہیں۔ وہ ہر شخص کو میسر ہیں۔ اس لئے ادیب، ان چیزوں سے بے نیاز ہو کر اچھے ادب کی تخلیق کرتا ہے اور اس قسم کی تجارتی پابندیاں روسی ادیبوں پر ہی نہیں ہیں۔

سکریٹری: مہندر ناتھ

۳ر جنوری ۱۹۵۴ء

(ھفت روزہ اُجالا۔ بمبئی)

کیفی اعظمی

کچھ یادیں کچھ باتیں

عام آدمی اکیلا جیتا اور اکیلا مرتا ہے۔ مہندر ناتھ نہ اکیلے جیئے نہ اکیلے مرے۔ مہندر نے زندگی کیسے گزاری، وہ جتنے بھی دن جی سکے کس شان اور کس ادا سے جیئے۔ اس کا اندازہ آپ اس بات سے لگایئے کہ جس دن مہندر کا انتقال ہوا اسی دن اور اُن کے ساتھ ہی دوستی اور رفاقت بھی مرگئی۔ آپ اس کو میرا ذاتی احساس بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ میرا ایسا ذاتی احساس ہے جس نے طویل تجربے کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔

مہندر ناتھ سے مجھے بے انتہا پیار تھا۔ اتنا پیار کیوں تھا یہ پوچھنے کا کسی کو حق نہیں، پھر بھی کوئی پوچھ لے تو مجھے خوشی ہوگی اس لئے کہ اس کو بتانے میں مہندر کی قربانیاں گنوا سکوں گا۔ ان سے پیار کی پہلی وجہ تو یہ تھی کہ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی کے بعد اردو میں افسانہ نگاروں کی جو نسل ابھری اس میں مہندر ناتھ مجھے سب سے زیادہ پسند تھے۔ وہ لکھتے بھی بہت اچھا تھے۔ لکھنے کے علاوہ ان میں ایک خوبی ایسی تھی جو اُن کے کسی ہم عصر میں نہیں تھی۔ وہ یہ کہ مہندر اپنے بارے میں بہت کم سوچتے تھے۔ اپنے بارے میں سوچ سوچ کے دکھی اور سب سے خفا ہونا مہندر کی فطرت کے خلاف تھا۔ وہ جو کچھ سوچتے تھے سب کے لئے سوچتے تھے وہ جو کچھ چاہتے تھے سب کے لئے چاہتے تھے۔ اگر آپ مجھے ہندو فلسفے کی ایک اصطلاح استعمال کرنے کی اجازت دیں تو میں کہوں گا کہ مہندر سچے کرم یوگی تھے وہ ہمیشہ پھل کی اِچھا کئے بغیر اپنا فرض پورا کرتے تھے۔

سنہ ۳۶-۱۹۳۵ء میں جب ہماری مہذب دنیا کے سر پر فسطائیت کا خطرہ منڈلانے لگا تو دنیا کے کئی نامور ادیبوں نے دنیا بھر کے ادیبوں کو اس خطرے کے خلاف منظم اور متحد ہونے کی دعوت دی۔ اِن آوازوں میں گورکی کی آواز سب سے اونچی تھی۔ ادیبوں کی تنظیم کے ابتدائی مرحلوں میں ہی گورکی نے یہ بھی محسوس کر لیا تھا کہ ادیبوں کو منظم کرنا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ گورکی کو فلمی ادیبوں کی تنظیم کا تجربہ نہیں ہوا ورنہ وہ کہہ دیتا کہ ادیبوں کی تنظیم کا خیال ہی غلط ہے۔ آفریں ہے مہندر کو کہ وہ یہ دنیا کا مشکل ترین کام ہمیشہ بڑی آسانی اور خوبی سے انجام دیتے رہے — مہندر ناتھ سال چھ مہینے نہیں بلکہ برسوں انجمن ترقی پسند مصنفین بمبئی کے سکریٹری رہے۔ اس وقت سکریٹری کو کیسی کیسی گتھیاں سلجھانا پڑتی تھیں اس سلسلے میں ایک واقعہ سُنئے۔ یہ سنہ ۱۹۵۲ء کی بات ہے۔ بمبئی میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس ہونے والی تھی۔ بمبئی کی انجمن میزبان تھی۔ بمبئی میں مرارجی ڈیسائی کی حکومت تھی۔ اس نے کانفرنس کو ناکام بنانے کے لئے طرح طرح کے غیر جمہوری اقدامات کئے۔ سردار جعفری صاحب گرفتار اور نظر بند ہو گئے۔ اس کے بعد کانفرنس کے انعقاد کی ساری ذمہ داریاں مجھ پر آگئیں۔ میں یہ ذمہ داریاں لیتے ہوئے گھبرا رہا تھا۔ انجمن کی ایک میٹنگ میں مہندر ناتھ نے مجھے یقین دلایا کہ میں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہوں گا تم گھبراتے کیوں ہو۔ مہندر کے تعاون کی امید پر میں نے وہ ذمہ داری قبول کر لی۔ کانفرنس کی تاریخیں متعین ہو چکی تھیں۔ اس کے لئے بمبئی کا ایک شاندار ہال بک ہو چکا تھا۔ بنگال، آسام اور آندھرا سے خبریں آچکی تھیں کہ وہاں کے ساتھی بہت بڑی تعداد میں شریک ہوں گے۔ بعض ڈیلی گیٹوں کے بمبئی پہنچنے کی تاریخیں بھی معلوم ہو چکی تھیں کہ اچانک مرارجی ڈیسائی کی سرکار

نے بمبئی میں کانفرنس کے انعقاد پر پابندی لگادی ۔ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے ۔ کچھ ساتھی کہتے تھے کانفرنس ملتوی کردی جائے ۔ لیکن التوا آسان نہ تھا ۔ میری رائے تھی کہ کانفرنس ضرور کی جائے ۔ لیکن بمبئی شہر سے دور ، ایک شاعر دوست کا اصرار تھا کہ ہمیں قانون توڑنا چاہیے اور کانفرنس بمبئی میں کرنا چاہیے ۔ اگر مرارجی کی پولیس نے ادیبوں پر فائرنگ کی تو انقلاب ذرا قریب آجائے گا ۔ میں نے اس رائے کی شدید مخالفت کی ۔ میٹنگ میں مہندر ناتھ نے میری تائید کی ۔ اور فیصلہ یہ ہوا کہ اگر مہندر اور کیفی دو دن میں شہر سے کہیں دور کانفرنس کے انعقاد کا انتظام کر سکتے ہیں تو کانفرنس منعقد ہو ورنہ ملتوی کردی جائے ۔ یہ فیصلہ سن کے میں فوراً بمبئی سے بھیونڈی گیا اور وہاں کے چند نوجوان ساتھیوں کی مدد سے بھیونڈی میں کانفرنس کے انعقاد کا انتظام کیا ۔ اس ساری دوڑ دھوپ میں بمبئی کے ساتھیوں میں سے مجھے سب سے زیادہ مدد مہندر ناتھ سے ملی ۔ بھیونڈی کی کانفرنس بہت بدنام ہے ۔ یقیناً وہاں جو فیصلے کئے گئے وہ نظریاتی اعتبار سے ناقص تھے ۔ لیکن انتظام کے اعتبار سے کانفرنس پر کوئی اعتراض کسی نے نہیں کیا ۔ مہندر ناتھ کانفرنس میں بہت سرگرمی سے حصہ لیتے رہے لیکن وہ کانفرنس کے اکثر فیصلوں کے خلاف تھے ۔

مہندر ناتھ

کے

ادبی نقش غیر فانی ہیں —

نقش لائلپوری
(گیت کار)

مہندر ناتھ

جنوب کا ساتھی

جب ترقی پسندوں کو بمبئی میں کانفرنس کرنے کی اجازت نہ ملی، تو لوگوں نے بھیمڑی کی طرف رخ کیا۔ یہ جگہ بمبئی سے چالیس میل دور ہے۔

بھیمڑی ایک چھوٹا سا قصبہ ہے، جہاں زیادہ تر جلاہوں کی آبادی ہے ہم سب لوگ یہاں پہلی بار آئے تھے سب لوگ ایک چھوٹے سے اسکول میں ٹھہرے، اور چار دن وہاں قیام کیا۔ کانفرنسیں تو اکثر ہوتی رہتی ہیں، لیکن یہ کانفرنس عجیب و غریب تھی۔ ہندوستان کے مختلف شہروں اور صوبوں سے لوگ تشریف لائے تھے۔ یعنی ترقی پسند مصنفین کی انجمنوں کے نمائندے کم از کم مجھے بالکل امید نہ تھی کہ اتنے نمائندے اس کانفرنس میں شریک ہوں گے۔ حکومت کا رویہ اس سے بہت پہلے سخت ہو چکا تھا۔ علی سردار جعفری، ظ۔ انصاری۔ بلراج ساہنی اور دیگر ساتھیوں کو گرفتار کر لیا گیا تھا اور اس سے قبل جلوس پر گولی چلائی گئی تھی، ظاہر ہے اِن حالات میں لوگوں کا آنا کوئی آسان بات نہ تھی۔ لیکن ۲۶ مئی کی صبح سے ہی نمائندوں کی آمد شروع ہو گئی تھی۔ اور جب ہم لوگ بھیمڑی پہونچے تو کافی ڈیلیگیٹ آچکے تھے۔ دہلی، کانپور، شولاپور، حیدرآباد، لکھنؤ اور بھوپال وغیرہ سے نمائندے تشریف لا چکے تھے۔ بنگال کے ساتھیوں کا انتظار تھا۔ آندھرا کے ساتھیوں کا انتظار تھا۔ اور اس طرح دیگر شہروں سے نمائندوں نے آنے کی اطلاع دیدی تھی۔ اگر کانفرنس کی ظاہری ٹیپ ٹاپ دیکھی جاتی تو شاید آپ لوگ بے حد مایوس ہو جاتے۔ یعنی نہ یہاں عالیشان ہال تھا اور نہ گدے دار کرسیاں، نہ قالین تھے۔ اور نہ خوبصورت کپڑوں میں ملبوس عورتیں۔ یہاں جو لوگ بھی آئے تھے وہ یہ سوچ کر آئے تھے، کہ یہ جگہ تفریح کے لئے نہیں، بلکہ ہمیں چند بنیادی مسائل پر بحث کرنا ہے، اِن مسائل پر سوچنا ہے اور ان کا حل پیش کرنا ہے۔ چہروں پر مسکراہٹ تھی۔ لیکن دلوں اور ذہنوں میں ایک عجیب سا ارتعاش۔ اس سے پہلے اتنے ڈیلیگیٹوں نے کبھی مل بیٹھ کر باتیں نہ کی تھیں۔ ایک دوسرے کو کبھی جاننے کی کوشش نہ کی تھی۔ گویا ایک نے دوسرے کی نظمیں اور کہانیاں یا تنقیدیں پڑھی تھیں، لیکن اُن کی صورتوں سے نا آشنا تھے۔ کبھی اکٹھے مل کر بات نہ کی تھی۔ کھانا نہ کھایا تھا۔ چائے نہ پی تھی۔ اس کانفرنس میں ترقی پسند انجمنوں کے نمائندے موجود تھے۔ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔ اکٹھے کمروں میں رہ رہے تھے اور زندگی اور ادب کے بڑے بڑے مسئلوں پر بحث کر رہے تھے۔ زیادہ تر ڈیلیگیٹ جو تشریف لائے تھے، وہ ہیٹے کٹے نہ تھے۔ انہوں نے مجھر کیلے لباس نہ پہنے ہوئے تھے۔ وہ پھول کر کپّا نہ ہوئے تھے۔ اُن میں سے زیادہ تر وہ لوگ تھے، جن کی آمدنی سو روپے سے کم تھی۔ کچھ ادیب ایسے تھے، جو دوسروں سے مالی اعتبار سے زیادہ اچھے تھے۔ لیکن آج تو روپے ہی کل کیا ہو گیا۔ اِس

کا کسی کو علم نہ تھا۔ سرمایہ داری نظام میں ادیبوں کی جو حالت ہو سکتی تھی، وہ عیاں تھی، ہماری حکومت دو سال سے برسر اقتدار ہے اور ان دو سالوں میں اس نے ادیبوں کے لئے کیا کیا ——— یہ ادیب، جو دن رات ایک نئی دنیا کے تصور میں بیٹھے رہتے ہیں، لکھتے رہتے ہیں اور ایک بہتر زندگی کی تخلیق کی کوشش کرتے ہیں۔ ہر ملک میں ادیبوں کی عزت ہوتی ہے لیکن ہماری حکومت تو ادیبوں کو جیل میں ٹھونسنے کا حق رکھتی ہے۔ اس ملک کے ادیب کیا کھاتے ہیں، روزی کیسے کماتے ہیں کہاں رہتے ہیں۔ اس بات کی حکومت کو کیا پروا۔ اب تو گلہ کرنا بھی فضول ہے۔ کیونکہ جب ہم ہندوستان کے مزدور کسانوں اور نچلے متوسط طبقے کی حالت دیکھتے ہیں تو صاف دکھائی دیتا ہے کہ حکومت ان سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانک رہی ہے۔ لیکن اب رونے دھونے سے کیا ہوگا حکومت پر آنسوؤں کا اثر نہیں ہوتا۔ بہر حال چھوٹے چھوٹے ادیبوں کے ساتھ بڑے بڑے ادیب بھی شامل تھے۔ یہ ہیں کرشن چندر۔ ہندوستان کے مشہور افسانہ نگار، جو اس چھوٹی سی عمر میں بیس کتابیں لکھ چکے ہیں۔ لیکن اقتصادی حالت یہ ہے کہ انہیں یہ معلوم نہیں کہ اگلے مہینہ کا خرچ کس طرح چلے گا۔ یہ راجندر سنگھ بیدی، جو ایک فلم کمپنی میں نوکر ہیں۔ لیکن معلوم نہیں کب وہاں سے جواب مل جائے۔ یہ ہیں رام دلاس شرما، جو آگرہ یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ لیکن یہ نوکری کب تک۔ آپ چونکہ کمیونسٹ خیالات رکھتے ہیں۔ اس لئے حکومت آپ کو کھلم کھلا چلنے نہ دے گی۔ یہ ہیں عصمت چغتائی جو کافی بوڑھی دکھائی دیتی ہیں۔ یہ ہیں کیفی اعظمی دبلے پتلے، آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے۔ یہ ہیں نیاز حیدر جو نو دن کی بھوک ہڑتال کر کے باہر تشریف لائے ہیں اور بڑی مشکل سے سانس لے رہے ہیں۔ یہ ادھر ساحر لدھیانوی کھڑے ہیں۔ نہایت دبلے پتلے۔ ادھر مجاز بیٹھے ہیں کسی گہرے خیال میں غرق۔ اس بنچ پر عادل رشید بیٹھے ہیں جو یہ سوچ رہے ہیں کہ ان کے بیمار بچوں کی دوا کے لئے روپے کہاں سے آئیں گے۔ اور اس بنچ پر کھڑکی کے قریب اختر الایمان اور مدھوسدن نہایت انہماک سے کانفرنس کی کارروائی سن رہے ہیں، لیکن ذہن میں مستقبل کا خوف ہے، معلوم نہیں کل کیا ہو جائے، کام ملے یا نہ ملے۔ آپ جان نثار اختر ہیں، بھوپال سے آئے ہیں، اور آپ ڈاکٹر علیم ہیں۔ آپ ملک راج آنند ہیں۔ ادھر راما نند ساگر سگریٹ پی رہے ہیں اور سوچ رہے ہیں کہ نیا فلم کا کنٹراکٹ کب ملے گا۔ اور اس کونے میں وشوامتر عادل تشریف فرما ہیں۔ وشوامتر عادل کا سر گنجا ہو گیا ہے۔ وہ قبل از وقت بوڑھا ہو گیا ہے۔ آج سے پانچ سال پہلے میں نے اُسے دہلی میں دیکھا تھا، نہایت خوش شکل خوب رو انسان تھا۔ نہ جانے اس عرصے میں اُسے کیا ہوا کہ بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گیا ہے۔ چہرے پر مردنی چھا گئی ہے اور کھانسی کی اکثر شکایت رہتی ہے اور بھوپال کے نمائندے، حیدرآباد کے نمائندے، شولاپور کا دبلا پتلا ادیب، کانپور سے آنے والا ساتھی۔ چھوٹا قد دبلا پتلا۔ احمد آباد کے نحیف و لاغر نمائندے یہ سب لوگ دبلے پتلے کیوں ہیں۔ کیا یہ لوگ کام نہیں کرتے۔ کام کرتے ہیں لیکن مناسب اجرت نہیں ملتی۔ کوئی اسکول میں نوکر ہے تو کوئی پرائیویٹ فرم میں۔ کوئی اخبار میں کام کرتا ہے، تو کوئی مل میں، کوئی کالج میں، کوئی اپنی تنخواہ سے رسالہ نکالتا ہے، اور کوئی روپے جمع کر کے اپنی کتاب چھپواتا ہے لیکن کتاب بکتی نہیں۔ ہر طرف ایک انتشار ہے لیکن پھر یہ لوگ اکٹھے ہوتے ہیں، مل بیٹھتے ہیں، سوچتے ہیں۔ یہ سب کچھ کیوں ہے آخر اس میں اتنی تلخی کیوں ہے، اتنی بے کاری کیوں ہے، اتنی بربریت کیوں ہے۔ یہ لوگ پڑھے لکھے ہیں۔ کوئی ایم۔ اے پاس ہے۔ کوئی بی اے پاس ہے کوئی میٹرک پاس ہے۔ یہ لوگ گورکی اور مو پساں پڑھتے ہیں۔ ٹیگور اور اقبال کے وارث ہیں۔ ان لوگوں نے آٹھ آٹھ دس دس کتابیں لکھی ہیں۔ اچھا ادب پیدا کیا ہے لیکن پھر بھی ان کی زندگیوں میں چین نہیں، سکون نہیں، راحت نہیں۔ یہ میں سوچ رہا تھا کہ کسی نے کہا، آپ بھا سکر راؤ ہیں۔ "ما بھومی" کے مصنف۔ اور میں نے بھا سکر راؤ اور اس کے ساتھیوں کی طرف

دیکھا بھاسکر راؤ اور اس کے ساتھی سامنے کھڑے تھے۔ پاؤں سے ننگے، سر سے ننگے، ایک دھوتی اور ایک قمیص میں۔

• "میں آندھرا سے آیا ہوں، میں نے "ما بھومی" لکھا ہے، کانگریسی لیڈروں نے اسے دیکھا تھا اور تعریفیں کی تھیں۔ لیکن چند دن ہوئے پولس والوں نے مجھے بلایا" بھاسکر راؤ ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی میں اپنی کہانی سنا رہے تھے۔ ان کی اپنی کہانی۔ آپ بیتی۔ خیالی نہیں، اپنی۔ انسپکٹر نے پوچھا "تم بھاسکر راؤ ہو؟" میں نے کہا۔ "ہاں میں بھاسکر راؤ ہوں۔" "تم بھاسکر راؤ کیوں ہو؟ تم ما بھومی کے مصنف کیوں ہو؟" اور میں خاموش رہا۔ "جواب کیوں نہیں دیتے؟" اور میں خاموش رہا۔ انسپکٹر نے چانٹا مارا "بولتے نہیں، جواب نہیں دیتے۔" اور اس نے پھر چانٹا مارا، ایک دو تین چانٹے اور میں خاموش رہا۔ "جاؤ اس کے گھر کی تلاشی لو" تلاشی لی گئی۔ میرا مسودہ مجھ سے چھینا گیا۔ اور اسے میری آنکھوں کے سامنے جلایا گیا۔ اس مسودے پر میں دو سال سے محنت کر رہا تھا۔ اور تلگو کی تاریخ مرتب کر رہا تھا۔ دو سال کی محنت کو آگ کی نذر کر دیا گیا میرے باپ کو پیٹا گیا۔ وہ بوڑھا تھا، اندھا تھا، لیکن وہ میرا باپ تھا۔ جانتے ہو یہ چانٹا کس کو مارا گیا تھا۔ بھاسکر راؤ کو نہیں، بلکہ کالی داس کو۔ وہ کبھی تو ہندوستان میں پیدا ہوا تھا۔ کبیر کو، غالب کو، ٹیگور کو، اقبال کو، پریم چند کو، کرشن چندر کو اور نہرو کو بھی، وہ بھی تو ادیب ہے۔ یہ ایک انسان کی بے عزتی نہ تھی، ایک ادیب کی بے عزتی نہ تھی۔ سارے ادیبوں کی بے عزتی تھی۔ دنیا کے ادیبوں کی بے عزتی کی گئی تھی، گورکی کی بے عزتی تھی۔ پیبلو نرودا کی بے عزتی تھی۔ ہاورڈ فاسٹر کی بے عزتی تھی عصمت چغتائی کی بے عزتی تھی۔ سردار جعفری کی بے عزتی تھی۔ یشپال کی بے عزتی تھی۔ ان سب چھوٹے بڑے ادیبوں کی بے عزتی جو اپنے آپ کو ادیب کہتے ہیں۔ افسانہ اور نظم لکھتے ہیں۔ ہال میں ایک سناٹا چھا گیا۔ ادیبوں کی آنکھوں میں خون اتر آیا——

یہ کیسا نظام ہے، جس میں ہم لوگ رہتے ہیں، یہ کیسی حکومت ہے جو ادیبوں کو پیٹتی ہے، ان کے مسودوں کو جلاتی ہے اور بغیر مقدمہ چلائے ان کو جیلوں میں ٹھونستی ہے۔ جی ہاں یہ سب لوگ کمیونسٹ ہیں۔ کمیونسٹ ہونا کوئی جرم نہیں، کوئی گناہ نہیں۔ آج دنیا کے تہائی حصے پر کمیونسٹوں کا راج ہے۔ کیوں نہیں آپ ان کو گولی سے اڑا دیتے؟ کیوں نہیں آپ انھیں تحس نحس کر دیتے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ تم ایک نہتے اور امن پسند ادیب کو پیٹو، اس کے باپ کی بے عزتی کرو۔ اور پھر ہندوستان کی تہذیب اور تمدن کے گن گاؤ۔ اور ہندوستان کو DISCOVER کرو۔ شاید تم ہندوستان کو پہچانتے نہیں۔ شاید تم بھاسکر راؤ کو جانتے نہیں۔ وہ وہیں کھڑا ہے وہ ویسے ہی لکھے گا۔ اس کی پُر وقار سادگی اس چانٹے سے کم نہ ہوگی، اس کی شہرت، ان ہتھکنڈوں سے کم نہ ہوگی، اس کے ارادے متزلزل نہ ہوں گے، وہ ما بھومی لکھے گا، وہ اور لکھے گا۔ وہ جنتا کے دکھوں کو اپنے ڈراموں میں جگہ دے گا۔ اور انسانیت کے راگ گائے گا۔ حتیٰ کہ تمہیں بھاسکر راؤ کی بات ماننا ہوگی۔ اور پھر بھاسکر راؤ چلا گیا۔ اس کے ساتھی چلے گئے۔ لیکن ان کے ننگے پاؤں کے نشان اسی جگہ پر قائم ہیں۔ یہ نشان یوں نہیں مٹیں گے، یہ نشان اور گہرے ہوتے جائیں گے۔ حتیٰ کہ یہ نشان ایک تہائی دنیا کے ساتھ مل کر چھین لیں گے۔

اور پھر رام ولاس شرما اٹھے۔ چہرے پر مسکراہٹ۔ چمکتی ہوئی آنکھیں۔ چوڑا چکلا سینہ، ہاتھوں میں آہنی سختی، باتوں میں رس۔ ہنستے ہوئے، مسکراتے ہوئے انہوں نے کہا، ہندی اور اردو کا جھگڑا دراصل ہمارا جھگڑا نہیں ہے۔ یہ تو حکومت کا پیدا کردہ جھگڑا ہے۔ جب حکومت بڑے بڑے مسائل کو حل کرنا نہیں چاہتی، تو وہ عوام کی توجہ کو ان مسئلوں کی طرف پھیر دیتی ہے تاکہ عوام بنیادی مسئلوں کے متعلق سوچ نہ سکیں۔ ہندی اور اردو دونوں زبانیں ایک ہیں۔ یہ جو شکلیں ہم اس وقت دیکھ رہے ہیں۔ یہ شکلیں اس لئے ظہور میں آئیں کہ ہم تو لوگ بچھڑ گئے ہیں۔ زبانیں عوام سے الگ ہو گئی ہیں۔ آؤ ہم سب دونوں زبانیں پڑھیں اور لکھیں۔ اور اپنے ادب کو عوام کے اور قریب لائیں۔ زبان کو اور سہل بنائیں تاکہ ہر شخص سمجھ سکے۔ عوام کے لفظوں کو عوام

کے محاوروں کو اپنے ادب میں جگہ دیں۔ اور دونوں SCRIPTS کو سیکھ لیں۔ جو لپی زیادہ اچھی اور سائنٹفک ہوگی وہ زندہ رہے گی۔ اور آخر میں ہندی اور اردو ایک زبان بن کر رہ جائے گی۔

رام ولاس شرما بول رہے تھے اور سمجھا رہے تھے نہایت ہی پرخلوص لہجہ میں۔ انھوں نے زبان کا مسئلہ سمجھایا۔ اس مسئلہ کو مارکسی انداز میں پیش کیا۔ اس سے پہلے کسی نے زبان کے مسئلے کو اس خوبصورتی سے پیش نہ کیا تھا۔

رام ولاس شرما کی تقریر میں خطابت نہ تھی، جوش نہ تھا بلکہ INTELLECTUAL INTEGRITY تھی۔ جیسے انھوں نے اس حصے پر بہت محنت کی ہے، سوچا ہے، پڑھا ہے۔ اور وہ اصلیت کو جانتے ہیں۔ سیزر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ آیا۔ اس نے سوچا اور فتح کیا۔ یہی بات رام ولاس شرما کی۔ وہ آئے۔ انھوں نے دیکھا، اور فتح کیا۔ لیکن دونوں کے طریقہ کار میں بہت فرق ہے، ایک کے پیچھے توپیں تھیں، فوجیں تھیں، شاہی وقار تھا۔ بربریت تھی۔ لیکن رام ولاس شرما کے ساتھ کوئی ایسا حیوانی جذبہ نہ تھا۔ بلکہ صرف ذہنی قوت کا احساس تھا۔ عوام کے لئے پیار تھا اور پس منظر میں مارکسی فلاسفی تھی۔ وہ عوام کے مسائل کو مارکسی انداز میں پیش کرنے کا طریقہ جانتے ہیں اور اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ ان مسئلوں کا کوئی اور حل نہیں .....

اور پھر کرشن چندر بولے کہ میں اس مینی فیسٹو کی تائید کرتا ہوں۔ کرشن چندر پہلے سے زیادہ سنجیدہ ہو گئے تھے۔ اُن کے ماتھے پر گہری لکیریں ابھر آئی تھیں۔ اُن کے سر کے بال جھڑ گئے تھے۔ لیکن کرشن چندر کی معصومیت ابھی تک زندہ ہے وہ معصومیت جو اکثر آپ ان کے افسانوں میں دیکھتے ہیں۔ پاک اور صاف، شبنم کی طرح خوبصورت۔ انھوں نے کہا کہ آزادی کا صرف رنگ بدلا ہے پہلے گورا تھا اب کالا ہے۔ لیکن دونوں کے دلوں کی رنگت کالی ہے۔ اُن میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اور پھر کہا، غیر جانبداری کس بلا کا نام ہے۔ آج دنیا میں کوئی انسان غیر جانب دار نہیں ہے۔ پھر ادیب کس طرح غیر جانبدار رہ سکتے ہیں۔ کرشن چندر، آج بول رہے تھے۔ رک رک کر نہیں، بلکہ صاف اور ستھرے انداز میں۔ شاید بھاسکر راؤ نے بولنا سکھا دیا تھا۔ وہ بولتے جا رہے تھے۔ اور سننے والے آج حیرت میں تھے۔ آج کرشن چندر اتنی اچھی تقریر کر رہے ہیں، یہ کیا بات ہے۔ یہ تقریر میں روانی کس طرح آگئی۔ لفظوں کا سیلاب کس طرح امڈا چلا آرہا ہے اور پھر انھوں نے کہا، میں اس مینی فیسٹو کی تائید کرتا ہوں۔ کیونکہ مجھے انسانیت سے محبت ہے۔ حسن سے پیار ہے اور عوامی جدوجہد سے لگاؤ ہے۔

پھر ڈاکٹر آنند بولے۔

ڈاکٹر علیم بولے۔

عصمت چغتائی بولیں۔

بھوپال کے احسن بولے۔

راجندر سنگھ بولے۔

دو خواتین تشریف لائیں اور بولیں۔

اور پھر کیفی اعظمی نے کہا۔

میں نے کیفی اعظمی کو نظم پڑھتے سنا ہے لیکن تقریر کرتے آج سنا۔ تقریر میں ایک بے پناہ جوش تھا۔ اس اندھے نظام کے خلاف انھوں نے ایک خوب صورت تقریر کی۔ انھوں نے حکومت کے رویے کے خلاف احتجاج بلند کیا کہ حکومت نے ان کی کانفرنس بمبئی میں نہ ہونے دی۔ ان کے ساتھیوں کو گرفتار کر لیا۔ اپنی مشکلات بیان کیں۔ بھیمڑی کے ساتھیوں کے خلوص کی تعریف

کی۔ اور پھر انہوں نے بتایا کہ ترقی پسند ادیبوں کا رشتہ سوائے عوام کے کسی اور کے ساتھ نہیں ہو سکتا ۔ تقریر میں روانی تھی۔ جوش تھا، آواز میں گرج تھی۔ بجلی کی کڑک تھی ـــــــ شائد بہت کم ساتھیوں کو معلوم ہو گا کہ اس کانفرنس کا سہرا کیفی اعظمی کے سر ہے۔ جب سردار جعفری گرفتار ہوئے تو سارا کام ان کو سونپا گیا، اور وہ دن رات کام کرتے رہے۔

کانفرنس کے دن نزدیک آ رہے تھے کہ یکا یک انھیں اپنی بیوی کا تار ملا۔

"جلدی آؤ"

"روپے بھیجو"

"تمہارا بچہ سخت بیمار ہے"

"جلدی آؤ"

"روپے بھیجو"

"تمہارا بچہ قریب المرگ ہے"

کیفی روپے نہ بھیج سکا۔

کانفرنس اور نزدیک آ گئی۔

کیفی کا بچہ مر گیا۔ اس کا باقاعدہ علاج نہ ہو سکا۔ روپوں کی کمی کی وجہ سے ـــــ وہ حیدرآباد گئے اور واپس چلے آئے۔ کیفی اپنے خوبصورت بچے کے لئے ضرور رویا ہو گا۔ لیکن اس کا ذکر اس نے کسی سے نہیں کیا۔

وہ اس موت کو پی گیا۔

کانفرنس شروع ہو گئی۔

اور کیفی کام کرتا رہا۔

اور اس کا خوبصورت بچہ مر گیا تھا ـــــــ

کیونکہ اس کے پاس روپے نہ تھے۔

اس کا بچہ اس نظام کی بہیمت کا شکار ہو گیا تھا۔ ہزاروں بچے اس نظام کی بہیمت کا روزانہ شکار ہو جاتے ہیں۔

اور کانفرنس شروع ہوئی اور ختم ہوئی۔

اور کانفرنس نے ایک بچہ دیا۔

ایک خوب صورت بچہ۔

یہ ہے آپ کا مینی فسٹو۔

اس بچے کو زندہ رکھنا ترقی پسندوں کا فرض ہے۔ یہ آپ کا بچہ ہے۔ اس بچے کی وجہ سے آپ کا اور عوام کا رشتہ زیادہ مضبوط اور توانا ہو گا۔ خدارا اس بچے کو مرنے نہ دیجئے۔

اعجاز صدیقی
مدیر "شاعر"، بمبئی

مَیں اور مہندر ناتھ

یادوں کے جلتے ہوئے دریچے سے،
کثیف دھوئیں اور سُرخ شعلوں میں لپٹا،
اُس شہزادۂ ادب کا چہرہ اور جسم اب بھی نظر آرہا ہے۔
جیسے منوں لکڑیوں کے انبار میں ۲۱ رمارچ ۱۹۷۴ء کو شام کے ۴ بجے لِٹا دیا گیا تھا۔
کہتے ہیں کہ ۲۰ رمارچ کو شام کے آٹھ بجے، کبھی نہ کھولنے کے لئے اس نے اپنی آنکھیں موند لیں تھیں۔
گیارہ مہینے گذر جانے کے بعد بھی، نہ جانے کیوں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اُس کا فون آئے گا، وہ میرے گھر کی "کال بیل" بجائے گا۔
مہندر ناتھ بے وفا نہیں ہو سکتا۔ اُس نے آخر وقت تک ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا —!

آزادی کے بعد اتر پردیش میں اکبرآباد (آگرہ) کے حالات اتنے زیادہ بگڑ گئے تھے کہ لاکھوں مسلمانوں کو ہجرت کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ میں بھی آشوبِ روزگار سے گھبرا کر ترکِ وطن پر مجبور ہوا۔ اور ۲۱ فروری ۱۹۵۰ء کو مع اہل وعیال بمبئی آگیا۔ سو سال کی بنی بنائی گرہستی اور ایک بڑے ادارۂ شعر و ادب کو اجاڑ کر ——— بمبئی بارہا کا دیکھا بھالا تھا۔ یہاں کے اربابِ علم و ادب سے دیرینہ مراسم تھے۔ اُس دور کے کئی نوجوان ادیب و شاعر باہر سے آکر فلمی دنیا سے منسلک ہو چکے تھے۔ اُن میں ترقی پسند اور غیر ترقی پسند دونوں گروہ کے لوگ تھے۔ میرا اپنا جھکاؤ شروع ہی سے ترقی پسند رجحان کی طرف تھا۔ بمبئی آکر بس جانے والوں میں سید مجیب اشرف ندوی، ساغر نظامی، شکیل بدایونی، بہزاد لکھنوی، مخشب جارچوی، عادل رشید اور اُن کے چھوٹے بھائی سے قریبی مراسم تھے۔ خواجہ احمد عباس، سردار جعفری، عصمت چغتائی، شاہد لطیف، مجروح سلطانپوری، کرشن چندر، اختر الایمان اور حامد الانصاری غازی وغیرہ سے بھی ایک غائبانہ رابطہ و تعلق تھا۔ ان میں سے بعض سے ملاقات تھی اور بعض سے نہیں۔

چند ماہ بعد "شاعر" کی اشاعت بمبئی سے شروع ہو گئی۔ اُن دنوں عادل رشید کیڈل روڈ ماہم میں رہتے تھے۔ ایک دن میں عادل کے یہاں گیا تو وہاں چھریرے بدن، لانبے قد اور تیکھے خد و خال کے ایک نوجوان سے عادل رشید نے اس طرح تعارف کرایا —

"اعجاز بھائی! ان سے ملئے۔ یہ کرشن چندر کے چھوٹے بھائی مہندر ناتھ ہیں۔ بہت اچھے افسانہ نگار ہیں۔ اب ان

کی کہانیاں بھی "شاعر" میں چھاپے گا ؟"

"ضرور"

اور وہیں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کی ملاقات نے مجھے مہندر ناتھ سے قریب کر دیا۔ انسان شناسی کا اُس وقت جو تھوڑا بہت شعور تھا، اُس سے یہ فیصلہ کرنے میں دیر نہ لگی کہ یہ نوجوان اپنے کردار اور معتقدات میں کھرا ہے۔ اُس کی سرشت میں خلوص، خیر اور اخلاق و محبت ہے۔ ایثار پسند اور بے لاگ رائے دینے والا ہے۔ اُس کے سینے میں بہت سی آرزوئیں اور تمنائیں مچل رہی ہیں اور وہ آگے بڑھنے کا بے پناہ جذبہ رکھتا ہے۔

چند ماہ بعد میں مہندر ناتھ سے ملنے اُن کے گھر گیا۔ جمیل مہدی (رکن ادارہ "شاعر") میرے ساتھ تھے۔ شری ساؤنڈ اسٹوڈیو، دادر کی پشت والی گلی کی چھپرا بلڈنگ کے ایک کمرے میں چٹائی پر بیٹھے مہندر ناتھ کھانا کھا رہے تھے۔ ہمیں انہوں نے ایک دوسرے کمرے میں بٹھا دیا۔ چند ہی منٹ میں وہ کھانے سے فارغ ہو کر ہمارے پاس آ گئے۔ چہرے سے دبی دبی مسرت کا اظہار ہو رہا تھا۔ ایک دبلی پتلی سانولی سی لڑکی چائے لائی۔ یہ اُن کی بیوی درگا دیوی تھیں۔

مہندر ناتھ کافی دیر تک میرے حالات پوچھتے رہے۔ میں منتظر تھا کہ وہ "شاعر" کے تعلق سے کوئی بات چھیڑیں اور جب انہوں نے پوچھا کہ موجودہ سخت حالات میں جبکہ آپ کی رہائش کا بھی کوئی مستقل انتظام نہیں ہوا ہے (میں اُن دنوں ایک مسافر خانے میں مع اہل و عیال مقیم تھا)۔ "شاعر" کیسے نکل سکے گا اور اسے کیوں کر جمایا جا سکے گا؟ میں نے کہا۔ مجھے اس کی فکر نہیں ہے کہ میں خانہ بدوشوں کی سی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ "شاعر" کو بہر حال نکلنا ہے یہی نہیں بلکہ اسے اور زیادہ بہتر بنانا ہے۔ اسی لئے آپ کے پاس آیا ہوں۔ آپ ادارہ "شاعر" میں شامل ہو جائیے۔ اُس میں خود لکھئے اور اپنے ترقی پسند حلقے کا قلمی تعاون بھی حاصل کیجئے۔ میں آپ کو اپنا حقیقی چھوٹا بھائی سمجھوں گا۔ میرے سب بھائی پاکستان جا چکے ہیں۔

مہندر ناتھ کچھ دیر خاموش رہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ کہیں گے ــــ میں اپنے بڑے بھائی کرشن چندر سے مشورہ کر کے جواب دوں گا۔ لیکن چند لمحوں کے بعد ہی انھوں نے پہلو بدلا، چہرہ پر کچھ فکر اور سنجیدگی طاری ہوئی۔ پھر کہنے لگے۔

"مجھے کوئی عذر نہیں ہے۔ آپ میرا نام "شاعر" کے ادارہ میں دے دیجئے۔ مجھ سے اس کے لئے جو کچھ ہو سکے گا۔ ضرور کروں گا۔ بھائی صاحب (کرشن چندر) سے بھی ذکر کروں گا۔

ماہ و سال کی وہ تمام لکیریں میری آنکھوں کے سامنے لرز رہی ہیں۔ کوئی ایک نقش بھی دھندلا نہیں ہے۔ سارے نقوش اتنے واضح ہیں کہ ایک مبسوط کتاب کے اوراق پر پھیل سکتے ہیں۔ میری اپنی اور مہندر ناتھ کی مشترک کتاب زندگی لکھ سکوں گا یا نہیں، فی الوقت اس کے لئے کچھ سوچنا یا کہنا میرے لئے مشکل ہے۔

میں نے اپنی اکلوتی جوان بہن، بڑے بھائی منتظر صدیقی، جواں سال چھوٹے بھائی، ماں، باپ اور اُن بے شمار عزیزوں اور دوستوں کی موت کا صدمہ برداشت کیا ہے، جن سے قلبی لگاؤ تھا۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میں نے کسی مرنے والے پر کچھ لکھنا چاہا ہو اور نہ لکھ سکا ہوں ــــ مگر یہ مہندر ناتھ کی موت کیسی ہے کہ ایک سال کی مدت میں ان پر دو صفحے بھی مجھ سے نہ لکھے گئے۔ برادر مشفق کرشن چندر کا مہینوں سے اصرار ہے کہ مہندر ناتھ پر مضمون لکھ کر دوں۔ اُن کے اصرار و ارشاد اور میرے انفعال کی نوبت تو نہیں آنا چاہیئے تھی، مگر آئی ــــ نہ جانے کتنی بار میں نے قلم اٹھانے کی کوشش کی، مگر ہر بار خیالات گڈمڈ ہو گئے۔ قلم چلتے چلتے رک

گیا۔ حروف والفاظ خود بخود دھندلے ہوتے نظر آنے لگے۔ اور ان کے بجائے کاغذ پر مہندر ناتھ کے تیکھے خدوخال، اُن کا طنز کرتا ہوا چہرہ، اپنے کرب کو چھپاتا ہوا نظر آنے لگا۔ مہندر کے چہرے پر اپنے ہی قلم سے خراشیں کس طرح ڈالوں، یا وہ خراشیں کس طرح دکھاؤں جو مہندر کے نام نہاد "اپنوں" نے اُن کے دل میں ڈالیں ___ "گویم مشکل، وگرنہ گویم مشکل"!! مہندر محاسبہ کرنے نہیں آئیں گے، لیکن اُن کی رُوح (جو اکثر مجھے اپنے پاس ہی میرے اُسی پلنگ پر محسوس ہوتی ہے، جس پر میں بیٹھتا ہوں اور میرے لکھنے پڑھنے کا سامان بکھرا رہتا ہے (جس پر خود مہندر ناتھ بھی بارہا بیٹھے تھے) مجھے مصلحت پسند ضرور کہے گی۔ میری اُس بیباکی کا مذاق اڑائے گی جیسے مسلسل ۲۳ سال تک دیکھا تھا اور اکثر باتوں باتوں میں زِچ ہو کر۔ "آپ نہیں بدلیں گے" اُن کی زبان سے نکل جاتا تھا۔ اور جواباً مجھے کہنا پڑتا تھا کہ پہلے خود بدلئے، پھر مجھے مشورہ دیجئے گا۔

مہندر ناتھ کی گذشتہ ۲۳ سال کی زندگی مجھ پر آئینہ ہے۔ مجھے اُن کا "ہم راز" ہونے کا فخر حاصل ہے۔ وہ میرے گھر کے بھیدی تھے اور میں اُن کے گھر کا۔ لیکن ہم دونوں نے کبھی "لنکا نہیں ڈھائی"۔ "اب کیسے ڈھا دوں؟" مگر سچی کردار نگاری (Real Charac terlization) کے لئے تو کچھ راز اِفشا کرنے ہی پڑیں گے، اور جب یہ ارادہ کرتا ہوں تو قلم لرزنے لگتا ہے۔ جو باتیں یا اپنی جو کیفیات وہ کرشن چندر، اپنی بیوی درگا دیوی، آنجہانی کپور صاحب اور بعض دوسرے قریبی دوستوں تک پر ظاہر نہ کرتے تھے، مجھ سے اُن کا اظہار کسی لیس و پیش کے بغیر کر دیا کرتے تھے۔ وہ جب تک زندہ رہے ناآسودگیوں، محرومیوں اور آرزوؤں کی صلیب پر لٹکے رہے۔ ان کا مسکراتا ہوا چہرہ، اُن کی نقاب بنا رہا۔ کبھی کسی سے یہ نہیں کہا کہ صلیب کی کیلیں میرے اندر تک اتر چکی ہیں۔ زبردست اعتماد کے باوجود کبھی کبھی مجھے بھی یہ ہدایت ہوتی کہ کسی سے بھول کر بھی فلاں بات کا ذکر نہ کروں۔ ایک مشہور و ممتاز ادیب کی حیثیت ہی سے مہندر ناتھ یاد کئے جاتے رہیں گے، اُن کی شخصی زندگی سے کسی کو کیا سروکار۔!! اُن کی موت سے اب تک، طویل عہدِ رفاقت کی سیکڑوں باتیں میرے دل و دماغ میں ہلچل مچائے ہوئے ہیں اور سب اظہار کے لئے بیتاب۔ مگر میں نے جب بھی اُن کے اظہار کا ارادہ کیا ہے، خود بکھر کر رہ گیا ہوں۔

گذشتہ تین چار مہینے میں کئی بار رات کے وقت اُن پر لکھنے کے لئے بیٹھا، لکھ نہیں سکا ہوں۔ اور اُس ارادہ و احساس کو لے کر سو گیا ہوں ۔۔ ایسے ہی عالم میں وقفوں وقفوں سے تین بار انہیں خواب میں دیکھا۔ دو بار کی اُن کی الجھی ہوئی کیفیت اور گفتگو دوسرے دن بالکل یاد نہ رہی۔ لیکن ایک بار کا خواب کسی فلم کے منظر کی طرح بے کم و کاست اب بھی ذہن کے پردوں پر مرتسم ہے۔

"بمبئی کے چند ادیب اور شاعر کسی ادبی اجتماع میں باہر گئے ہیں۔ کرشن چندر اور سلمیٰ صدیقی بھی ساتھ ہیں۔ ایک بڑی سی خوبصورت سہ منزلہ عمارت ہے۔ کرشن چندر اِس عذر کے ساتھ کہ وہ زینہ نہیں چڑھ سکتے۔ گراؤنڈ فلور کے کمرے میں ٹھہر گئے ہیں۔ میں تیسری منزل پر ٹھہرا ہوں۔ رات کے آٹھ بجے ہیں، میں نیچے کھانے کے لئے آ رہا ہوں۔ اپنے کمرے سے نکل کر بالکنی تک آتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ مہندر ناتھ کھڑے ہیں۔ سفید قمیص اور بھورے رنگ کی پینٹ میں ملبوس۔ میں ایک دم چیخ پڑا ہوں۔

"ارے مہندر جی آپ ـــ"

"جائیے گا نہیں ـ کرشن جی بھی یہیں ہیں، میں ابھی انہیں بلا کر لاتا ہوں۔"

اور یہ کہتا ہوا جلدی جلدی نیچے دَوڑا ـــ پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ کرشن چندر کو بتایا کہ وہ بھاگ کر اوپر آئیں مہندر جی آئے ہیں۔ کہیں پھر نہ چلے جائیں اور تیزی سے اوپر کی بالکنی میں پھر اسی جگہ پہنچا ہوں، جہاں مہندر ناتھ کو چھوڑ کر گیا تھا اب کیا دیکھتا ہوں کہ وہ مکمل سوٹ پہنے ہوئے ہیں۔ سر پر سفید سمور کی کشمیری ٹوپی ہے۔

"بہت پریشان کیا مہندر جی آپ نے۔ بہت رلایا"

"کہاں چلے گئے تھے اتنے دن سے"

"کرشن جی آ رہے ہیں۔ بولتے کیوں نہیں ہیں آپ"

"ارے حضور" تھوڑی دیر کے لئے آیا ہوں آپ سے اور بھائی صاحب سے ملنے کے لئے۔ بڑی مشکل سے اجازت ملی ہے"

"جی بھی نہیں چاہتا ہے آنے کو"

"میں اب بہت اچھا ہوں۔ کیدر صاحب اور ہم اکٹھے ہی رہتے ہیں"

"بھائی صاحب اور آپ پریشان نہ ہوا کریں"

"شاعر" برابر دیکھتا رہتا ہوں"

اور یہ کہتے کہتے مہندر ناتھ کے نقوش دھندلے پڑنے لگے اور اُن کی جگہ ایک کالی سی موٹی سی لڑکی کھڑی کہہ رہی تھی۔

"امّی۔ یہ آپ کیا کیا مجھ سے کہہ رہے تھے۔ کس سے باتیں کر رہے تھے۔ کیا ہو گیا تھا آپ کو؟"

میں عالمِ رویا میں بہت سے مرحومین سے مل چکا ہوں، روحوں کے تصرفات کا قائل ہوں، ہو سکتا ہے کہ مہندر ناتھ اِس دنیا سے اُس دنیا میں اچھے ہوں۔ یہاں تو اپنے آخری دنوں میں وہ بہت بیزار بیزار سے نظر آتے تھے۔ جب بھی ملاقات ہوتی، یہی کہتے۔ اب بیار ہے، دل میں تکلیف رہتی ہے۔ نبض BRAKE ہونے لگی ہے۔ معدہ خراب رہتا ہے۔ گلا خراب رہتا ہے۔ بڑھاپا آ چلا ہے میں کہتا۔ مہندر جی بڑھاپے کی حدود میں تو میں داخل ہو چکا ہوں۔ آپ سے ۱۲ سال بڑا ہوں۔ ۲۴ سال سے مسلسل کئی جسمانی تکالیف میں مبتلا ہوں۔ میرے مسائل و مراحل بھی آپ سے کہیں زیادہ سخت ہیں۔ آپ ماشاء اللہ ابھی جوان ہیں اور صرف دو میاں بیوی۔

وہ ایک زہر خندہ کے ساتھ کہتے۔ ارے حضور ایک دن اس طرح چلے جائیں گے کہ کسی کو خبر بھی نہ ہوگی۔

دیکھتے ہی دیکھتے دنیا سے میں اٹھ جاؤں گا　　دیکھتی کی دیکھتی رہ جائے گی دنیا مجھے

میں ذرا خفا ہو کر کہتا۔ کیا رکھا ہے اِن باتوں میں مہندر جی۔ جانا سب کو ہے۔ کون آگے جاتا ہے اور کون پیچھے، یہ کسے خبر پھر ہماری باتیں دوسرا رخ اختیار کر لیتیں، مگر یہ ضرور محسوس ہوتا کہ یہ شخص اندر سے ٹوٹتا جا رہا ہے۔ میں نے اُن میں زندگی کی لہر دوڑانے کی ہمیشہ کوشش کی۔

"آپ اجازت دیں تو میں کرشن جی اور درگا بھابی سے . . . . "

"سمجھ گیا۔ اور رسوا کریں گے اِس بڑھاپے میں دوسری شادی کی بات کر کے"

"اب کوئی ایسی خواہش نہیں ہے" (اور یہ خواہش چند بار انتہائی شدت کے ساتھ ابھری بھی تھی)

"ساحر لدھیانوی بھی تو بوڑھا ہو گیا ہے"

باتوں کا رخ پھر بدل جاتا۔

مہندر ناتھ سے آخری ملاقات فروری ۴ ۷۶ میں ہوئی تھی۔ جناب آئی۔ کے گجرال بمبئی آئے ہوئے تھے۔ ہمیں ان سے ملنے راج بھون جانا تھا۔ طے یہ پایا کہ میں مہندر ناتھ کے یہاں دادر پہنچ جاؤں، وہیں کرشن چندر آ جائیں گے اور سب ساتھ چلیں گے۔ کرشن جی

کے آنے تک کافی دیر ہم دونوں "شاعر" کے "قومی یک جہتی نمبر" اور اس وقت کے سیاسی حالات پر باتیں کرتے رہے۔ پھر کرشن جی مع ساحر لدھیانوی آگئے۔ ہم چاروں ساحر صاحب کی کار میں راج بھون کے لئے روانہ ہوئے۔ مہندر کافی ہشاش بشاش تھے۔ ہر بات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ اُن دنوں کرشن چندر اُردو زبان کے سلسلے میں راہی معصوم رضا کے مضامین کا جواب روزنامہ "انقلاب" بمبئی میں دے رہے تھے اور راہی کا اندازِ تحریر کافی تکلیف دہ تھا۔ مجھے یہ بات پسند نہ تھی۔ میں نے کرشن جی کو اس طرف متوجہ کرنا چاہا۔ اور اپنی بات ٹھیک سے کہہ بھی نہ پایا تھا کہ مہندر ناتھ نے کرشن چندر کے اس اقدام کی نہایت بیباکی اور سختی سے مخالفت کی۔ یہ چھوٹا سا واقعہ اس لئے لکھ رہا ہوں کہ مہندر کو جس بات سے اختلاف ہوتا، وہ جسے ناپسند کرتے، اُس کے تعلق سے اپنے بڑے بھائی سے بھی صاف صاف بات کرنے میں ہچکچاتے نہ تھے۔ دوسروں کا تو ذکر ہی کیا۔ (ایسے واقعات بیشمار ہوں گے)

اُس دن گجرال صاحب سے ملاقات کے دوران سیاسی صورتِ حال پر سب سے زیادہ مہندر ناتھ ہی بولتے رہے تھے۔

چھوٹے بھائی کے ساتھ کرشن چندر کی شفقت و محبّت کا ہمیشہ یہ عالم رہا کہ وہ بڑی سے بڑی اختلافی بات کا جواب مہندر ناتھ کو نہایت نرمی اور آہستگی سے دیتے، جیسے وہ خود چھوٹے ہوں! او مہندر ناتھ بڑے، جیسے وہ چھوٹے بھائی کا احترام کرتے ہوں۔ اور واقعی کرشن چندر نے بھائی سے بے پناہ محبت ہی نہیں کی، اس کا احترام بھی کیا۔ اُس کے جذبات و خیالات کا احترام، اس کے فن کا احترام، اس کے معتقدات کا احترام اور اس کی سرگرمیوں کی تعریف۔ جب کبھی دونوں بھائی ساتھ ساتھ شراب پیتے (تنہا یا احباب کے ساتھ) تو کیا مجال کہ اُس عالم میں بھی دونوں بھائیوں کے سدابہار رویّے میں ذرا سا بھی فرق پیدا ہو جائے۔ میں نے ہمیشہ دونوں بھائیوں کو ایک دوسرے کے لئے بیچین دیکھا۔ کرشن چندر نے مہندر ناتھ سے کبھی "تم" کہہ کر بات نہیں کی۔ ہمیشہ "مہندر جی آپ" کہہ کر ہی مخاطب کیا۔ بھائیوں میں ایسی فدائیت بہت کم دیکھنے میں آئی ہے۔

دونوں بھائی ادیب، دونوں فلمی دنیا سے وابستہ، دونوں کا مزاج الگ الگ، دونوں کے لکھنے اور سوچنے کا ڈھنگ جداگانہ بڑے بھائی کی آمدنی معقول اور چھوٹے کی کم۔ ان تضادات کے باوجود دونوں یک جان و دو قالب۔ ایک دوسرے پر شیفتہ و فریفتہ مہندر ناتھ، کرشن چندر کے تنہا معتمدِ علیہ۔ کبھی گائڈ اور کبھی قائد۔ مہندر ناتھ کا یہ احساس کہ میرا بھائی "عظیم" ہے اُن کے لئے سب سے زیادہ قابلِ فخر و مسرت تھا۔ اپنے بڑے بھائی کی عظمت کی مزید توثیق و تشریح کے لئے انھوں نے کرشن چندر پر ۲۵ منٹ کی ایک دستاویزی فلم بنادی۔ خود پس منظر میں رہے۔ اُس میں بھی اپنی ایک آدھ "خاموش جھلک" ہی دکھائی۔ بڑے خوش تھے اپنی اس کامیابی پر ــــ تاردیو کی لیبورٹری میں اس دستاویزی فلم کی ابتدائی نمائش (PREMIER SHOW) کا انتظام کیا۔ بہت سے ادیب اور شاعر مدعو تھے۔ کچھ فلمی حلقوں کے لوگ بھی تھے۔ بڑی بدھائیاں دی گئیں انھیں، شخصیت پر اتنی کامیاب فلم بنانے پر۔ وفورِ مسرت سے ان کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ پھولے نہیں سما رہے تھے۔ فلم کے ایک ایک زاویے پر دوستوں نے اظہار خیال کیا۔ طنزیہ اور مزاحیہ جملے بھی پھینکے جاتے رہے۔ وہ ایک یادگار شام تھی۔ شاید اس لئے بھی کہ وہ اِس دنیا سے اٹھنے والے تھے ــــ فلم شو کے بعد ہمیں کرکٹ کلب آف انڈیا (C.C.I.) جانا تھا۔ جہاں "شاعر" کے "قومی یک جہتی نمبر" کی ایڈوائزری کمیٹی کی میٹنگ تھی۔ کرشن چندر، سلمیٰ صدیقی، مہندر اور میں ٹیکسی میں ایک ساتھ روانہ ہوئے۔ C.C.I. پہنچے تو وہ حسبِ عادت ٹیکسی کا کرایہ دینے لگے، مگر میں نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور جلدی سے دس روپے کا نوٹ نکال کر ڈرائیور کے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں نے کہا۔ یہ "شاعر" کے سلسلے کی میٹنگ ہے۔ آپ کیوں دیں۔ کہنے لگے۔ کیا "شاعر" میرا نہیں ہے۔ اُن کا یہ معمول تھا کہ میرے ساتھ ٹیکسی میں جائیں یا بس میں، میرے ہزار اصرار کے باوجود مجھے کرایہ نہ دینے دیتے تھے۔ ۲۳ سالہ دورِ تعلق میں جب بھی میں اُن سے ملنے دادر گیا، وہ مجھے رخصت کرنے کے لئے ٹیکسی یا بس اسٹاپ تک ضرور آئے۔ آدھا آدھا گھنٹہ بس کے انتظار میں میرے ساتھ کھڑے باتیں کرتے رہتے تھے۔ مجھے رخصت

کئے بغیر جاتے نہیں تھے۔ یہ تھا میرے ساتھ ان کا غیر معمولی لگاؤ۔ عام طور پر اُن کی رواداری اور وضع داری کے قصے لوگوں کی زبان پر رہتے تھے۔

کئی سال سے دو کمرے اُن کے استعمال میں تھے۔ ایک کپور صاحب والا اور دوسرا خود اُن کا۔ کپور صاحب غیر شادی شدہ تھے اور اُن کی عمر بھی ڈھل گئی تھی۔ ایک چھوٹے حقیقی بھائی کی طرح کپور ساتھ رہتے تھے۔ کھانا تیار ہو جاتا تو تشت میں رکھ کر پہلے مہندر جی کے لئے لاتے۔ یہ آنجہانی کپور کا روزانہ کا معمول تھا۔ کپور فلم کے تجربہ کار فوٹو گرافر تھے۔ کبھی مہندر ناتھ کے پاس کام نہ ہوتا تو کپور صاحب کی آمدنی سے اخراجات چلتے۔ کپور کے پاس کام نہ ہوتا تو مہندر ناتھ کی آمدنی کام دیتی۔ غرض سب کچھ مشترک تھا۔ اتنا کہ روپیہ پیسہ کبا ڈ میں ایک ساتھ ہی رکھا رہتا تھا۔ جس کو ضرورت ہوئی نکال لیا۔ یہ تھا مہندر کا آئینِ محبت و اخلاص ـــ اور موت بھی آئی تو کپور صاحب ہی کی تکلیف سے متاثر ہو کر ـــ اور اُن کی موت کے بعد کپور نے بھی زندہ رہنا عہد و پیمانِ محبت کے خلاف جانا۔ خود وہ بھی ایک ہفتہ میں چل بسے۔!!

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ ایک کمرہ کھانا پکانے اور سونے وغیرہ کے لئے تھا اور دوسرا ڈرائنگ روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ معمولی ساز و سامان، نہ آرائش، نہ کوئی قیمتی چیز۔ ایک دیوان (پلنگ نما تخت) اس پر گدّا، چادر تکئے۔ لمبے صوفے سیٹ کے بجائے دو چھوٹے صوفے۔ اُن کے درمیان میز۔ اِدھر اُدھر بیت کی کرسیاں۔ اسٹیل کبڈ۔ ریڈیو۔ چند تصاویر۔ لکڑی کی الماری میں کتابیں، رسالے۔ کوئی آٹھ سال پہلے تک اُن کے کمرے میں اتنا بھی سامان نہ تھا۔ اپنی آئی ہوئی ڈاک اور اپنے ضروری کاغذات سرہانے کی طرف گدّے کے نیچے رکھ دیا کرتے تھے۔ لباس بھی بہت سادہ ہوتا تھا۔ پینٹ اور شرٹ۔ کبھی کبھی سوٹ بھی پہن لیا کرتے تھے۔ جو کچھ پہنتے اُن کے قد و قامت پر سجتا تھا۔ بڑے بھائی کرشن چندر کپڑا خریدنے جاتے تو اُنہیں بھی ساتھ لے لیتے اور چھوٹے بھائی کو اس کی پسند کا کپڑا دلاتے۔ بڑے بھائی کی بینک اور پوسٹ آفس کی "پاس بک" بھی چھوٹے بھائی ہی کے پاس رہتی۔ کھانا نہایت سادہ کھاتے۔ شراب کبھی کبھی اور توازن کے ساتھ پیتے۔ احباب کو پلاتے بھی تھے۔

تمام دن لوگ آتے جاتے رہتے تھے۔ ادیب، شاعر، فلم کے مختلف شعبوں سے متعلق لوگ۔ کوئی کچھ مشورہ کر رہا ہے کوئی کچھ لکھوا رہا ہے۔ کوئی شکایتیں لے کر آیا ہے۔ گھر سے تھوڑی ہی دور "فلم رائیٹرز ایسوسی ایشن" کا دفتر۔ دفتر روزانہ جاتے تھے۔ گھر پر بھی لکھنے پڑھنے کا کام کرتے تھے۔ انگریزی کے ناول پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ انگریزی اخبار کے علاوہ اردو کے رسائل و اخبارات بھی پابندی سے پڑھتے تھے۔ "شاعر" ڈاک سے ملتا تو سب سے پہلے اُسی کو پڑھتے اور خاص خاص باتوں کو ذہن میں رکھتے۔ فون پر یا ذاتی ملاقات کے وقت بعض مندرجات پر اظہارِ خیال کرتے۔ کسی حاجت مند کو مایوس کرنا نہ جانتے تھے۔ چاہے خود پر کتنا ہی جبر کیوں نہ کرنا پڑے۔ مگر کسی کا دل نہ توڑتے تھے۔ جیب میں صرف پانچ روپے ہیں۔ کوئی ضرورت مند آیا تو دو روپے نکال کر دے دئے۔ زیادہ ہوئے تو دس اور بیس تک نوبت پہنچ جاتی اور کبھی کبھی اس سے بھی زیادہ تک ـــ کوئی شراب کے لئے روپے لئے جا رہا ہے۔ کسی کو کرایہ کی ضرورت ہے۔ کسی کے لئے ریل کا ٹکٹ خرید کر، اُسے اُس کے گھر بھجوا رہے ہیں۔ کسی کو ٹیکسی کا کرایہ دے رہے ہیں۔ شراب کے نشہ میں چُور، کسی دوست کو ٹیکسی میں ڈال کر اس کے مکان پہنچانے جا رہے ہیں۔ کسی کو علاج معالجہ کے لئے روپیہ دے رہے ہیں۔ پڑوس کے بچے کمرے میں شور مچا رہے ہیں۔ گلے میں ہاتھ ڈال کر جھول رہے ہیں۔ بچوں سے بےحد پیار کرتے تھے (خود لاولد تھے) انہیں ہر روز ٹافیوں، چاکلیٹ، مٹھائی اور کھلونوں کے لئے پیسے دیتے۔

مہندر ناتھ کے پاس نئے لکھنے والے بھی آتے تھے اور پرانے بھی۔ وہ بھی جن سے برسوں کے مراسم تھے اور وہ بھی جن سے نئی رسم و راہ ہوتی۔ مگر کیا مجال کہ کسی کے ساتھ اُن کے رویّے میں ذرا سا بھی فرق آ جائے۔ وہ ایسی باتوں کو بھی پی جاتے

تھے۔ جو انہیں سخت ناگوار گذرتی تھیں۔ ناگواریوں کو حتی الامکان ٹالنے کی کوشش کرتے تھے اور لہجے پر قابو رکھتے تھے۔ ناشائستہ الفاظ اور جملے زبان پر نہیں لاتے تھے۔ کبھی کبھی جب بات عزتِ نفس تک آجاتی اور برداشت سے باہر ہو جاتی تو رنج و غم سے اُن کا بُرا حال ہو جاتا تھا۔ چہرہ متغیر ہو جاتا اور لہجہ کسی قدر دُرشت۔ بعد میں افسوس کرتے۔ ایک بار ساحر لدھیانوی اُن سے لڑ لئے۔ بات مہندر ناتھ کے صبر و ضبط سے آگے نکل گئی۔ کئی مہینے تک ساحر صاحب سے نہیں ملے۔ تاآنکہ وہ خود اُن کے گھر آئے اور وہ تلخی ختم ہو کر پھر اُسی طرح دوستی ہو گئی جیسے پہلے تھی۔ بڑا معصوم دل تھا مہندر ناتھ کا۔ خودداری، اصول پسندی اور حق گوئی میں تو وہ اپنی مثال آپ تھے۔

"شاعر" کے بہت بڑے بڑے خاص نمبر نکلے۔ ایک ایک نمبر پر بیس بیس پچیس پچیس ہزار روپے خرچ ہوئے۔ جن مقامی دوستوں سے قلمی تعاون یا اشتہارات کے تعاون کی امیدیں ہوتیں۔ قرض دینے یا دلانے کی بات ہوتی۔ ہم دونوں اُن کے یہاں کے چکر لگاتے، فون کرتے اور جب وہ تعاون کے وعدے کر کے، پورے نہ کرتے تو سخت پریشانی لاحق ہو جاتی۔ ایسی نازک صورتِ حال میں مہندر کہتے۔ ماریئے گولی۔ آپ کے کام تو کسی نہ کسی طرح ہو ہی جائیں گے۔ ہندوستان بھر میں آپ سے عقیدت و محبت رکھنے والے لوگ ہیں۔ آپ کی خود اعتمادی سلامت رہے۔ آپ کے ارادوں کو یہ موانعات نہیں بدل سکتے۔ بڑی شکتی ہے مولانا اعجاز صاحب آپ میں۔ میں کہتا "مہندر جی۔ جان پر بن رہی ہے۔" تو ہنس کر کہتے، آپ میں جان بہت ہے۔ مردہ تو ہم ہیں کہ بس بیٹھے ہوئے ہیں (حالانکہ ایسا نہ تھا) مہندر ناتھ بہت فعّال تھے، مگر بلا کے خوددار۔ کسی سے کام مانگنے نہیں جاتے تھے۔ جس نے خود بلایا یا اُن کے پاس آیا اُس کا کام کرنے لگے۔ Payments رک جاتے تھے۔ فلمیں بنتے بنتے رک جاتی تھیں اور وہ پریشانی میں مبتلا ہو جاتے تھے مگر اپنی پریشانی کسی پر ظاہر نہ کرتے تھے۔ انہیں ٹوٹ جانا گوارا تھا لیکن جھکنا اور ہاتھ پھیلانا پسند نہ تھا۔

بارہ سال تک وہ فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری رہے۔ بہت سے رائٹرز کے رُکے ہوئے مطالبات پروڈیوسروں سے دلائے۔ بے شمار جھگڑے طے کئے۔ اِس ایسوسی ایشن کے لئے انہوں نے جتنے وقیع کام انجام دیئے وہ سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔ انہوں نے فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کے فنڈ کے لئے ایک سالانہ اجتماع کی بنیاد ڈالی۔ وہ رائٹرز کی رہائش کے لئے کالونی بھی بنانا چاہتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد فلم رائٹرز کا جو تعزیتی جلسہ ہوا تھا، اُس میں میں نے دیکھا کہ بیشتر لوگوں کے دل رو رہے تھے۔ آوازیں بھرائی ہوئی تھیں اور آنکھیں چھلک رہی تھیں۔ ایسی محبوبیت نہ دیکھی نہ سُنی۔

"قومی یک جہتی نمبر" کے بڑے منصوبے میں وہ میرے برابر کے شریک تھے۔ اس کیلئے مجھے طویل سفر بھی کرنے پڑے۔ میری غیر موجودگی میں، انگریزی، اردو کے جتنے بھی اہم خطوط جاتے، ان سب پر وہی دستخط کرتے تھے۔ آہ۔ وہ اس نمبر کے تکملے کو نہ دیکھ سکے۔ لیکن مہندر ناتھ کے اٹھ جانے کے بعد کرشن چندر نے اپنے بے پایاں پُر خلوص رویّے سے ان کی کمی کے احساس کو میرے دل سے دور کرنے کی ہر قدم پر جو کوشش کی ہے وہ بھی بھولنے والی نہیں ہے۔ مہندر ناتھ کی یاد تو زندگی کی آخری سانس تک آتی رہے گی۔

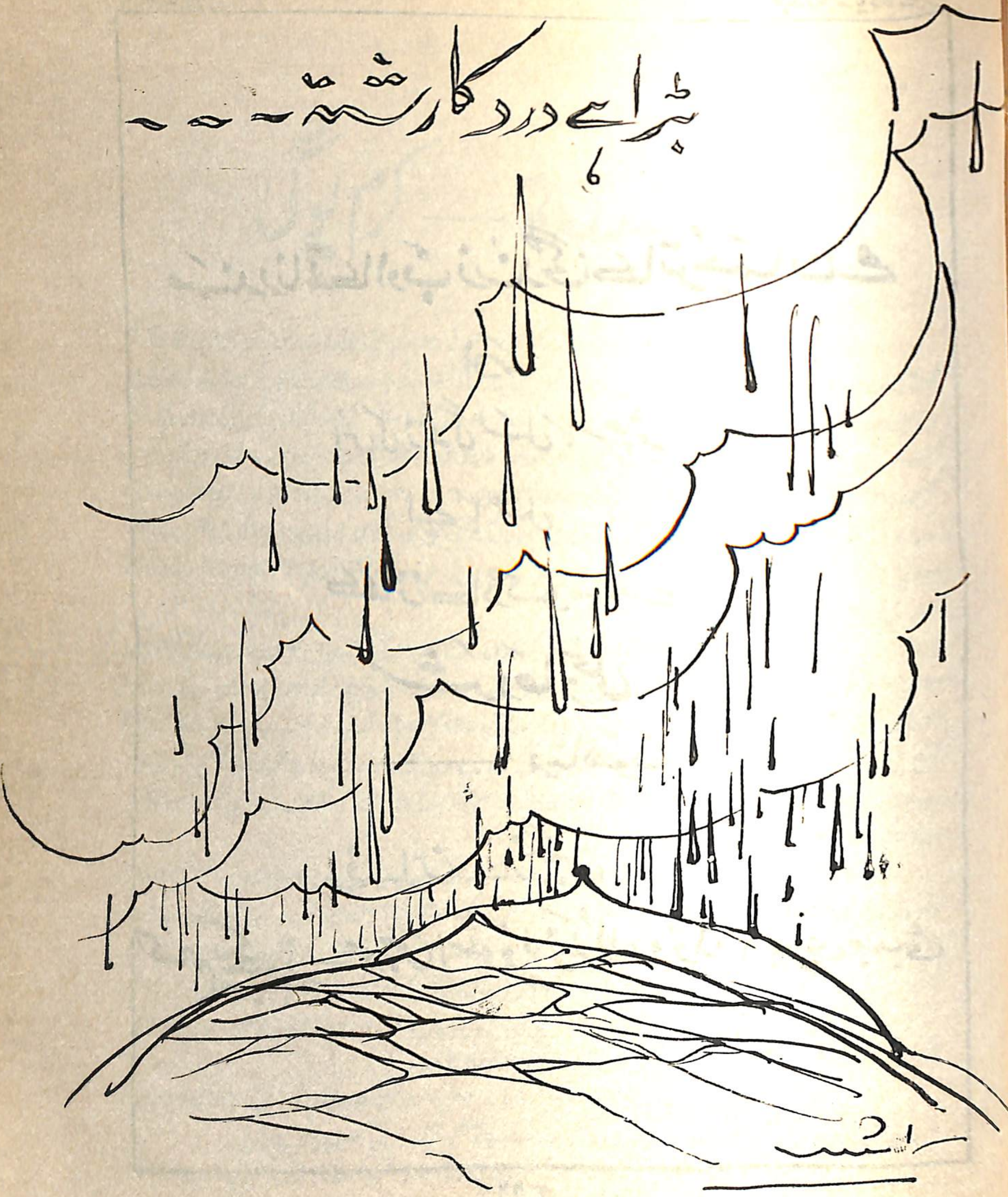
میری اور کرشن چندر، مہندر ناتھ کی بیوہ دُرگا دیوی، بہن سرلا دیوی اور بھتیجے بھائی آدم کی بات تو الگ ہے۔ ایک اعلیٰ صفات کے انسان اور ممتاز ادیب کی حیثیت سے مہندر ناتھ کو کوئی بھی نہ بھلا سکے گا۔ گذشتہ ۲۵ سال میں انھوں نے بہت کافی لکھا اور اپنا ایک الگ رنگ پیدا کیا۔ اپنے انداز و فکر و اسلوب پر اپنے بڑے بھائی کرشن چندر کی چھاپ نہ پڑنے دی۔ میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے اپنی نگارشات کے سلسلے میں کرشن چندر سے کبھی کوئی مشورہ تک نہیں لیا۔ بڑی خود اعتمادی کے

ساتھ وہ لکھتے رہے۔ ہند و پاک کے اہم رسائل کے مدیر اُن کے افسانے حاصل کرنے کے لئے خطوط اور تار بھیجا کرتے تھے۔ بعض رسالے انہیں گراں قدر معاوضے بھی دیتے تھے۔ جنسی مسائل اور عوام کی غربت، اُن کے دو محبوب موضوعات تھے۔ لیکن اِن سے ہٹ کر بھی انہوں نے اپنے عصر کے دیگر اہم مسائل کو اپنی کہانیوں میں سمویا ہے۔ وہ سچائی اور خوبصورتی کے پرستار تھے اور معاشرے میں انہیں دیکھنے کے متمنی۔ جنسی موضوع کو ہاتھ لگانے میں نہ انھوں نے منٹو کی تقلید کی اور نہ عصمت چغتائی کی۔ وہ اِس گرم سیال سے مومی شمع کی سی ٹھنڈی روشنی کا کام لیتے تھے۔ وہ جنسی سودے بازی کو ایک بڑی لعنت سمجھتے تھے۔ جنسی لذت اندوزی اُن کی کہانیوں میں مفقود ہے۔ سماج کی دکھتی ہوئی رگوں پر انگلی رکھتے تھے۔ کبھی طنز کر کے، کبھی مسکرا کے۔ سوشلزم کے حامی تھے اور ملک میں اُس کی غلط تصویریں اور تعبیریں دیکھ کر کڑھتے تھے۔ وہ ایک دوررس نظر رکھتے تھے اور بیدار ذہن پایا تھا۔

مہندر ناتھ کے ۹ ناول اور تقریباً ۱۶ مجموعے، کہانیوں کے شائع ہوئے۔ کیسے لکھ لیتے تھے وہ، کب لکھتے تھے، مجھے بڑا تعجب ہوتا تھا۔ اُن کا بیشتر وقت تو خدمتِ احباب یا فلمی مصروفیات میں نکل جاتا تھا۔ اُن کی کتابیں شمع بکڈپو، ہند پاکٹ بکس، مشورہ بکڈپو اور زیادہ تر ایشیا پبلیشرز کی طرف سے شائع ہوئیں۔ چند کتابیں ہندی رسم الخط میں بھی چھپ چکی تھیں۔ ان کے فکر و فن میں اور زیادہ گہرائی آتی جا رہی تھی۔ تحریر کا حُسن بڑھتا جا رہا تھا، پختگی پیدا ہو گئی تھی۔ مرنے سے چند ماہ پہلے انھوں نے احتشام حسین اور سجاد ظہیر پر جو مضامین لکھے وہ ادبی انشا کا بہترین نمونہ ہیں۔

ترقی پسند تحریک اور اس کے پھیلاؤ میں سجاد ظہیر اور چند دوسرے لوگوں کا نام لیا جاتا ہے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ اِس میں مہندر ناتھ کا بھی زبردست حصہ تھا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی جتنی بھی کانفرنسیں ہوئیں انہیں کامیاب بنانے میں وہ پیش پیش رہے۔ بمبئی میں انجمن اسی وقت تک زندہ رہی جب تک مہندر ناتھ دلچسپی لیتے رہے۔ کئی سال تک وہ اس کے سیکرٹری رہے۔ انجمن کی ماہانہ نشستوں کا اہتمام، باہر سے آنے والے ادیبوں کے اعزاز میں انجمن کے جلسوں کا انتظام تنہا وہی کرتے تھے۔ میں نے انہیں فرش بچھاتے اور اٹھاتے تک دیکھا ہے۔ ادیب اور شاعر بس آکر بیٹھ جاتے تھے۔ اور کوئی غرض نہ تھی۔ فیس ممبری تک وصول نہ ہوتی تھی۔ اکثر وہ اپنی جیب سے خرچ کرتے تھے۔ اِن جلسوں میں اور جلسوں کے بعد تلخیاں بھی پیدا ہوتی تھیں ــــ مگر واہ رے بلند ظرف انسان، سارے زہر خود اپنے اندر انڈیل لینا بڑے حوصلے کا کام ہے!

جو عمر بھر کلفتوں، محرومیوں، خود غرضیوں، مصلحت پسندیوں، مفاد پرستیوں اور کمینگیوں کا زہر پیتا رہا ہو۔ اُس سقراط کے حساس دل کی رگوں اور نسوں کو تو ایک دن پھٹ ہی جانا چاہیے تھا۔ شمع خاموشی سے جلتی اور اپنی ٹھنڈی روشنی بکھیرتی رہتی ہے ــــ لیکن یکایک بجھ بھی جاتی ہے!!


بڑا بے درد کا رشتہ ہے ۔۔۔

رامانند ساگر

مہندر ناتھ — کرم یوگی

مہندر سے میری پہلی ملاقات کب ہوئی۔ یاد نہیں۔ ماضی کی دھند میں لپٹا ہوا وہ دن اس وقت اہم نہیں لگا ہوگا مگر آج وہ دن بہت اہم لگتا ہے کیونکہ ان تیس پینتیس برس کے عرصے میں اس کی شخصیت بتدریج ابھرتے ابھرتے اس قدر اونچی ہوگئی ہے کہ جیسے ایک دن اپنے سے جونیئر اور پیچھے کی صف میں کھڑے افسانہ نگاروں کے گروہ کا "یکے از دیگراں" ممبر سمجھ کر ملا ہوں گا۔ آج اس انسان کے پورے طول و عرض کو دیکھنے کے لئے نظریں اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ وہ شخصیت کہیں ہوا میں معلق ہے جہاں وہ ہم خاکی انسانوں سے دور کہیں کسی موہوم سے، دھندلے سے، آدرشوں کی بلندیوں میں ایک روشن ستارے کی طرح چمک رہی ہے، نہیں۔ اس کی بلندی آسمان تک پہنچ گئی تھی۔ مگر اس کے پاؤں زمین کی خاک میں لتھڑے ہوئے تھے۔ وہ ایک ایسی آسمانی روح تھی جس نے اس دھول اور کیچڑ سے بھری ہوئی زمین سے قطع تعلق نہیں کیا تھا۔ اسی وجہ سے اس کی ذاتی زندگی یا اس کے فن میں تصنع کا نام تک نہیں تھا۔

اس کی ذاتی زندگی پر کچھ کھل کر کہہ سکنا ابھی ممکن نہیں۔ کیونکہ اس زندگی کے کئی ورق ابھی زندہ انسانوں کی شکل میں ہمارے درمیان موجود ہیں۔ مگر اس کی ذاتی زندگی کا ذکر یا تجزیہ کئے بغیر مہندر ناتھ کے کسی بھی پہلو پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ اس نے ایسا کوئی آدرش یا خیال اپنے فن میں پیش نہیں کیا جس کے مطابق وہ خود نہیں جیا۔ بلکہ میں نے ہمیشہ یہ سمجھا ہے کہ مہندر کا عظیم ترین فن شاید اس کی کتابوں میں نہیں بلکہ خود اس کی زندگی میں ہے وہ جیسے جیا، وہ بذاتِ خود ایک عظیم فن ہے۔ وہ ہم میں سے بہتوں کی طرح محض ایک قلم یوگی نہیں تھا بلکہ وہ اصلی کرم یوگی تھا۔ جسے نہ دکھاوے سے دلچسپی تھی۔ نہ دنیاوی، دینی یا آسمانی رسوم سے!

درگا جی سے اس کا ملن دو آوارہ متلاشی روحوں کا ملن تھا۔ جس کی بنیادیں دنیاوی یا سماجی رسوم پر رکھنے کی ضرورت دونوں نے کبھی نہیں سمجھی۔ مگر ایک چوتھائی صدی سے زیادہ عرصے تک وہ ملن ایسا حسین، ایسا خوبصورت ملن رہا کہ وعدۂ جنت کا حسن اس کے سامنے پھیکا لگتا تھا ـــــ انہوں نے اپنے خاکی کرداروں کو منتروں یا آیتوں کے 'پاکیزہ' پانی سے دھونے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ مگر پھر بھی ان کا رشتہ اُن رسماتی منتروں یا آیتوں کی پاکیزگی سے کسی طرح کم پاکیزہ نہیں تھا۔

مہندر نے نعرے لکھ کر ان کے سائن بورڈ اپنے دروازے پر کبھی نہیں لٹکائے۔ کیوں کہ جتنی اسے تصنع سے چڑ تھی اتنی ہی اُسے نمائش سے نفرت تھی۔ اسی لئے وہ ایک آزاد [illegible] عمل رہا۔

سب سے بڑی بات جو اس میں تھی وہ یہ کہ کسی بات کا لالچ اسے نہیں تھا۔ یہاں تک کہ لیڈری کا بھی نہیں۔ حالانکہ اس کی شخصیت جس دھات سے بنی تھی، اسی دھات سے عظیم لیڈروں کی شخصیتیں تعمیر ہوئی ہیں۔

ایک بہت معمولی سی جگہ پر ایک بہت معمولی انسان کی طرح وہ رہا۔ شری ساؤنڈ سٹوڈیو کے پیچھے اس بوسیدہ عمارت

چھپر ابلڈنگ (بمبئی کی زبان میں جسے چال کہتے ہیں) میں جہاں مزدور اور نچلے متوسط طبقے کے لوگ رہتے ہیں، شاید اُن میں سے اکثر کو کبھی احساس ہی نہیں ہوا ہوگا کہ پہلی منزل کی کھولی نمبر ۱۳ میں رہنے والا وہ سیدھا سادہ سا بابو کتنی عظیم شخصیت ہے اور یہ مہندر کی سادگی کا کمال تھا کہ تقریباً تیس برس میں اس نے غیر ارادی طور پر بھی کبھی ان کو اپنی اہمیت کا احساس دلانے کی کوشش نہیں کی۔

وہ اصلی معنوں میں سوشلسٹ تھا یا یوں کہو کہ یوگی تھا۔ گیتا میں جو کہا گیا ہے کہ ایک یوگی کو ملکیت کے جذبہ سے دور رہنا چاہیئے اس کی صحیح تفسیر مہندر ناتھ تھا۔ اس کا جو کچھ تھا وہ سب کا تھا۔

اس وقت کئی واقعات فلم کی طرح میری نظروں کے سامنے گھوم رہے ہیں۔

ماہم کی ایک چال کے ایک کمرے میں چند بیکار دوست اکھٹے رہتے تھے (جن میں میں بھی تھا) ہم سب بمبئی کی فلمی دنیا میں اپنی اپنی قسمت آزمانے آئے تھے۔ کوئی ایکٹر بننے، کوئی کہانی بیچنے، کوئی شاعری کرنے۔ ایک چارپائی تھی، ایک کرسی اور مہندر کی دو چار پتلون قمیضیں، کچھ کپڑے رندھیر کے تھے۔ باقی سب کے پاس اتنا ہی تھا جو پہنا ہوا تھا۔ اب ہر روز جسے بھی کسی پروڈیوسر سے ملنے جانا ہوتا وہ کسی کے بھی بہترین کپڑے پہن کر چلا جاتا۔ کئی بار یہ ہوا کہ بیک وقت چار پانچ کو کہیں کسی سے ملنے جانا ہے تو دیکھا کہ مہندر صرف چڈھی پہنے گھر پر رہ گیا ہے۔ اور جب تک ہم سب واپس نہ آجائیں اس کے پاس پہننے کو کچھ نہیں! اور اس کے رویّے سے ایسا لگتا تھا کہ جیسے اس نے آج تک ہمارے ہی کپڑے چرا کر رکھے ہوئے تھے اور وہ اس بات پر خوش تھا کہ ہم نے اپنے کپڑے واپس لے لئے ہیں اور اسے چوری کی سزا نہیں دی۔ رندھیر کا بھی یہی حال تھا۔

مہندر سچ کہنے سے کبھی احتراز نہیں کرتا تھا۔ بھلے ہی کچھ ہو جائے۔ اسی لئے وہ Leftist ہونے کے باوجود کسی پارٹی کی قید میں نہیں رہ سکا۔ جو اس کے دل میں ہے اُسے صاف منہ پر کہہ دینے کی اخلاقی قوت اس میں بدرجۂ اتم موجود تھی چاہے اس کی قیمت کچھ ہی ہو!

مجھے یاد ہے ایک بار ۱۹۴۶ء میں میں نے ایک افسانہ لکھا جس میں اُسے احساس ہوا کہ میں نے کرشن چندر پر کوئی نازیبا چوٹ کی ہے۔ کرشن کی اور میری دوستی مہندر سے پہلے کی تھی اور کرشن نے اپنی روایتی دریا دلی اور دوست نوازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس افسانے کو محض ایک ادبی Perspective سے دیکھا مگر مہندر نے مجھے صاف صاف کہہ دیا کہ اسے یہ اچھا نہیں لگا۔ اور اس کے بعد کئی برس تک اس نے میرے ساتھ بات چیت بند کر دی مگر یہ احتجاج اور اظہار ناراضگی اس نے اس خلوص کے ساتھ کیا کہ میں یہ محسوس کرنے پر مجبور ہو گیا کہ میں نے جوشِ ادب میں ایک غلطی کی ہے اور جب تجدیدِ دوستی ہوئی تو پھر اسی خلوص اور گہرائی کے ساتھ —

مہندر ناتھ کی صرف ایک ہی کمزوری تھی۔ کرشن چندر۔ اپنے بھائی سے وہ عقیدت بلکہ عبادت کی حد تک پیار کرتا تھا، اس کے بارے میں ہمیشہ اس طرح بات کرتا تھا کہ یوں لگتا تھا کہ کرشن رام ہے اور مہندر اس کا لکشمن۔ کرشن کو چھوڑ کر باقی ہر رائٹر، ہر شاعر، ہر فنکار کے بارے میں وہ ایک بے لاگ رائے رکھتا تھا۔ اگر اس کی باتوں کو کبھی یکجا کیا جائے تو ہمارے پچھلے تیس برس کے ادب پر ایک نہایت ہی خوب صورت اور نادر تجزیاتی مضمون بن سکتا ہے۔

اس کے ساتھ بیتے ہوئے کئی لمحات کئی واقعات آنکھوں میں دوڑتے ہوئے آنسوؤں کی طرح یکے بعد دیگرے ذہن میں دوڑتے چلے آرہے ہیں مگر اس وقت ان کے بیان کی گنجائش نہیں۔ آخر میں مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ اس کی موت پر ایک گہرے ذاتی نقصان کا احساس ہونے کے علاوہ مجھے یہ لگا کہ دنیائے ادب نے تو ایک بہت اچھا ادیب کھو ہی دیا ہے مگر انسانوں کی دنیا نے ایک نہایت ہی خوب صورت انسان کو کھو دیا جس کے جیسا شاید کبھی کبھی ہی آتا ہے —!

ساحر لدھیانوی

مہندر ناتھ

مہندر ناتھ سے میرا پہلا تعارف اُن کی کہانی ,,حنائی انگلیاں،، سے ہوا۔ یہ کہانی ماہنامہ "ساقی" میں شائع ہوئی تھی جو اس وقت دہلی سے چھپتا تھا۔ اِس کہانی میں بلا کی تلخی اور تُرشی تھی جو مُصنف کے حساس دِل کی جھنجھلاہٹ کا آئینہ تھی، مجھے بے حد متاثر کیا۔

اِس کے بعد میں مہندر ناتھ کی کہانیوں کا انتظار کرنے لگا۔

برسوں اسی طرح گذر گئے۔

۱۹۴۶ء میں جب میں بمبئی آیا۔ تو مہندر ناتھ سے میری پہلی ملاقات ہوئی، مگر یہ مُلاقات کسی ادبی محفل یا کسی کلچرل کانفرنس میں نہیں ہوئی۔ ایک فلم کے سیٹ پر ہوئی۔ مہندر ناتھ اس فلم میں ہیرو کا کام کر رہے تھے۔ فلم کا نام تھا۔ ,,سرائے کے باہر،،

فلم چونکہ تجارتی فارمولے پر نہیں بنائی گئی تھی۔ اس لئے جب ریلیز ہوئی تو باکس آفس پر ناکام رہی۔

اِس کے بعد مہندر ناتھ نے دو تین اور فلموں میں بھی کام کیا، مگر چونکہ وہ سبھی فلمیں عام روش سے ہٹ کر تھیں۔ اس لیے تجارتی اعتبار سے کامیاب نہ ہو سکیں۔ اور یوں مہندر ناتھ اداکاری کے شعبے میں آگے نہ بڑھ سکے۔ بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ فلمی ناخداؤں نے فلموں کی ناکامی کے ساتھ ان کی اداکاری پر بھی ناکامی کی مہر لگا دی۔ پھر بھی یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ فلم انڈسٹری سے انہیں اس دورِ حیات میں کچھ نہیں ملا۔ اس دورِ حیات نے انہیں شریکِ حیات دی۔ ایک سیدھی سادی مہاراشٹرین لڑکی، جو اس وقت فلموں میں چھوٹے موٹے رول کرتی تھی۔ اسی دورِ حیات میں مہندر ناتھ سے ملی اور ان کی زندگی میں شامل ہو گئی ہم سب انہیں دُرگا بھابی کہتے ہیں۔ ہندوستان کے تمام ادیب اور شاعر چاہے وہ اردو کے ہوں، چاہے ہندی کے، چاہے مراٹھی میں لکھتے ہوں، چاہے پنجابی میں انہیں اسی نام سے پکارتے ہیں۔

فلمی اداکاری کے اس مختصر سے وقفے کے بعد مہندر ناتھ کی پوری زندگی، ادب اور ٹریڈ یونین تحریک کی خدمت میں گذری، ویسے وہ ایک مکالمہ نگار کی حیثیت سے فلمی صنعت کے ساتھ بھی وابستہ رہے۔ مگر یہ وابستگی بہت گہری نہیں تھی۔ میں نے ہمیشہ محسوس کیا کہ فلم کے لئے لکھتے وقت وہ کوئی ذہنی یا روحانی آسودگی محسوس نہیں کرتے تھے چنانچہ ان کا بیشتر وقت کہانیاں اور ناول لکھنے پر صرف ہونے لگا۔ انہوں نے درجنوں کتابیں لکھیں۔ اور اس کے باوجود لکھیں۔ کہ ان کو ہر وقت دوست گھیرے رہتے تھے۔

ان کے دوستوں میں کئی قسم کے لوگ تھے۔ ایک قسم ادبی دوستوں کی تھی۔ دوسری قسم فلمی دوستوں کی، تیسری قسم ٹریڈ یونین ورکروں کی اور چوتھی قسم ان کی جن کا مقصد صرف اپنی بیکاری کا وقت کاٹنا اور چائے پینا ہوتا تھا میں پہلی تین قسموں کے علاوہ، ایک عرصے تک اُن کا چوتھی قسم کا دوست بھی رہا ہوں، یعنی بیکاری کا وقت کاٹنے اور

چائے پینے والا دوست۔ وہ میرے ادبی رفیق بھی تھے۔ اور فلمی ہم عصر بھی، میرا ان کا ٹریڈ یونین تحریک میں بھی ساتھ رہا ہے۔

مہندر ناتھ صرف قلم کے مجاہد نہیں تھے، عمل کے بھی مجاہد تھے۔ انہوں نے صرف اپنی تحریروں میں ہی سماجی ناانصافیوں کے خلاف احتجاج نہیں کیا۔ بلکہ جن شعبوں سے وہ وابستہ رہے۔ ان میں پھیلی ہوئی ناانصافیوں کے خلاف عملی جدوجہد بھی کی۔ وہ فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کے معماروں میں سے تھے اور ایک طرح سے اس تنظیم کے مستقل جنرل سکریٹری تھے۔ ہر سال وہ اس عہدے سے سبکدوش ہونے کی خواہش کا اظہار کرتے تھے۔ مگر ہر سال یہ بوجھ انہی کے کندھوں پر آپڑتا تھا۔ کیونکہ جب الیکشن کے لئے جنرل باڈی کی میٹنگ بلائی جاتی تھی تو سب کے سب ممبر تالیاں بجا کر اور کھڑے ہو کر متفقہ طور پر ان کا نام تجویز کر دیتے تھے۔ میں نے پانچ برس اس ایسوسی ایشن کے صدر اور نائب صدر کی حیثیت سے ان کے ساتھ کام کیا۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی جھجک نہیں کہ ادیبوں کا وقار بڑھانے، ان کے نام اور کام کو مناسب اہمیت دلوانے اور ان کے معاوضوں کی ڈوبی ہوئی رقمیں وصول کروانے میں مہندر ناتھ نے جتنی تکلیفیں سہیں، اتنی شاید ہم سب نے مل کر بھی نہیں سہیں، کئی بار تنظیم کے دشمن عناصر نے انہیں دھمکیاں دیں۔ کئی بار انہیں عدالتوں میں کھینچا گیا۔ مگر وہ اپنی روش پر قائم رہے، اور مسکرا مسکرا کر کہتے رہے۔ "بھائی! اس میں تو یہی کچھ ہوتا ہے۔" اور کیوں نہ کہتے، وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے جنرل سکریٹری کے طور پر بھی یہی کچھ، دیکھ چکے تھے۔ اور ویسٹرن انڈیا سنے ایمپلائز فیڈریشن کی مجلس عاملہ کے رکن کے طور پر بھی یہی کچھ، سہہ رہے تھے۔

جب کبھی بھی ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کا قافلہ کسی سماجی مقصد کے لئے ہندوستان کے مختلف شہروں کا دورہ کرنے اور فنڈ جمع کرنے نکلا، مہندر ناتھ ہمیشہ اس کے ساتھ رہے، چاہے یہ فنڈ قحط زدگان یا سیلاب زدگان کے لئے ہو، چاہے فرقہ وارانہ فسادات کے شکار۔ بے گھر لوگوں کے لئے ہو، چاہے کسی بائیں بازو کی پارٹی کے اخبار کے لئے ہو۔

مہندر ناتھ شاید ابھی اس قافلے کا اور بھی ساتھ دیتے
مگر حساس دل کی دھڑکنوں نے ساتھ نہیں دیا۔
اب وہ صرف یادوں میں رہ گئے ہیں
میں اُن کی یاد کے سامنے سر جھکاتا ہوں

ہاجرہ مسرور
کراچی (پاکستان)

اپنا رنگ اپنی خوشبو

مہندر ناتھ اُردو کے افسانوی ادب میں اس پودے کی طرح تھے جو ایک اونچے درخت کی چھاؤں میں اُگا ہو۔ سایہ نمو کو انجانے میں دبا ضرور دیتا ہے۔ مگر پھر بھی اس پودے میں پھول کھلتے ہیں جن کا اپنا رنگ اور اپنی خوشبو ہوتی ہے۔

ہمارے اکثر سہل پسند نقادوں کی نظر کرشن چندر کے حسن میں الجھی کہ ان کے بھائی مہندر ناتھ کو اچھی طرح دیکھ ہی نہ سکی۔ مگر ہم جیسے پڑھنے والوں نے مہندر ناتھ کو بھی اسی چاؤ سے پڑھا جس طرح کرشن چندر کو۔ اس لئے نہیں کہ مہندر ناتھ کرشن کے بھائی تھے بلکہ اس لئے کہ مہندر ناتھ کے پاس بھی اپنے انداز میں کہنے کی بہت سی باتیں تھیں۔ پاکستان اور ہندستان کے درمیان برسوں سے رسالوں کتابوں کا تبادلہ نہیں ہوا۔ خدا جانے اپنی عمر اور فن کی پختگی کے گذشتہ دس برسوں میں مہندر ناتھ جی نے افسانے اور ناول کی دنیا کو کیا کچھ دیا ہوگا؟ مگر مجھے یقین ہے کہ وہ سب چیزیں بھی مہندر ناتھ کی یاد کی طرح ہمارے دلوں میں زندہ رہنے والی ہوں گی۔

خدیجہ مستور
لاہور (پاکستان)

کرشن چندر کے نام

برادر محترم ــــ تسلیم

آپ کا خط اور تار دونوں موصول ہوئے ۔ مگر ذرا دیر سے ۔

آپ کا خط پڑھ کر میں اس طرح بے چین ہو گئی جیسے آج اور ابھی، جب میں خط پڑھ رہی تھی تو بھائی مہندر ناتھ بزم ادب سے اُٹھ کر بزم عدم کو سدھار گئے۔ میں نے انہیں اپنی آنکھوں سے جاتا ہوا دیکھا۔ اور اپنے آپ سے پوچھا کیا یہ وہی مہندر ناتھ ہیں جن سے میں شاید کبھی نہیں ملی تھی مگر ان کے ادب کے ذریعے، ان کی صورت، ان کا ذہن اور ان کی سوچ بچار کا ایک انمٹ خاکہ میرے پاس محفوظ تھا۔

بیس مارچ ۱۹۷۴ء کو میری ادیب برادری کا ایک ممتاز افسانہ نگار اتنی جلدی دنیا سے چل بسا اور مجھے خبر بھی نہ ہوئی۔ یقیناً ریڈیو نے یہ خبر سُنائی ہوگی۔ اخباروں میں بھی یہ خبر چھپی ہوگی مگر یہ کتنی عجیب بات ہے کہ ان دنوں نہ میں اخبار پڑھتی تھی نہ ریڈیو سنتی تھی۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ کوئی اہم یا دردناک خبر میرے کمرے کے اندر نہ داخل ہو سکتی تھی۔ مجھے دنیا سے الگ کر کے چھ ہفتے کے لئے بستر پر ڈال دیا گیا تھا۔ دنیا کے غم و آلام سہنے والے دل نے مزید کچھ سہنے سے انکار کر دیا تھا۔ شاید ڈاکٹر اسی کو ہارٹ اٹیک کہتے ہیں۔ میں اس بیماری سے لڑ جھگڑ کر پھر زندگی کے میدان میں کود پڑی۔ مگر یہ میرے بھائی مہندر ناتھ کو کیا ہوا؟ کیا وہ اتنے حساس تھے؟ مجھے آج ان کی ایک کہانی یاد آ رہی ہے جو مجھے بے حد پسند آئی تھی۔ ایک میاں بیوی کی سادہ سی کہانی۔ دونوں ساتھ ساتھ بظاہر خوش گوار زندگی گذارتے ہیں۔ بچوں کو پروان چڑھاتے ہیں اور پھر ایک دن وہ اعتراف کرتے ہیں کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے کبھی محبت نہیں کر سکے۔

اس کہانی میں کیا کچھ تھا۔ میں نقاد نہیں جو تنقید کے مخصوص جملوں میں کہانی کے تاثر کو واضح کر سکوں۔ میں تو صرف یہی کہوں گی کہ میں نے اس کہانی کو کئی بار پڑھا۔ ہر بار تاثر گہرا ہوتا چلا گیا۔ فن کی اس سے بڑی خوبی اور کیا ہو سکتی ہے۔ مہندر بھائی کا فن اسی خوبی سے آراستہ تھا اور یہی خوبی فن اور فنکار کی دائمی زندگی کی ضامن ہوتی ہے۔

تو بھائی کرشن چندر کیا آپ نے یہ سچ لکھا ہے کہ بھائی مہندر ناتھ مر گئے۔ ان کا فن تو اس ظاہری موت کو جھٹلا رہا ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں زندہ ہیں ان کا دل احساس کی شدت سے دھڑک رہا ہے۔ وہ اپنی کہانیوں میں زندہ ہیں۔ ان کی کہانیوں کی ایک ایک سطر پر انگلیاں رکھتے اور ان کے دل کی دھڑکنوں کا شمار کیجیے۔ کون کہتا ہے کہ سچے فنکار کی نبضیں کبھی ڈوب بھی سکتی ہیں۔

مہندر بھائی کے جسم کی جدائی میں آپ جس طرح تڑپے ہوں گے اسی کے احساس نے مجھے رُلا دیا کرشن بھائی،

نیا سال آپ کو بھی مبارک ہو۔ میری دعا ہے کہ نیا سال خوفناک ہتھیاروں کی دائمی موت ثابت ہو۔

آپ کی مخلص بہن

خدیجہ مستور

شری کملیشور
ایڈیٹر سارِیکا (ہندی) بمبئی

وہ پھر نہیں مِلا

میں جب دلی رہتا تھا۔ مہندر ناتھ جی کے بارے میں لگاتار سنتا رہتا تھا کہ انھوں نے یہ لکھا، یہ کہانی لکھی، یہ ناول لکھا اور یہ بھی کہ وہ کرشن چندر کے چھوٹے بھائی ہیں۔ اس لئے وہ لیکھک روپ میں بھی چھوٹے ہو کر رہتے تھے جو کہ اُن کا بڑا پن تھا۔

دلی میں کئی برس گزار کر جب میں بمبئی آیا تو جو بھی آدمی ملتا اردو کہانی کی بات چھڑتی تو کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس کے نام کے ساتھ مہندر ناتھ کا نام ضرور لیتا۔ مجھے لگا کہ مہندر ناتھ جی سے ملاقات ہو جاتی تو اچھا ہوتا کیونکہ باقی سب لیکھک مِتروں سے ملاقات ہو چکی تھی۔ بمبئی کتنی بے رحم بستی ہے اس کا اُن سب کو اندازہ ہے جو یہاں سے دور رہتے ہیں پر یہ بستی کتنے بڑھیا لوگوں کی ہے اس کا اندازہ انہیں ہی ہے جو یہاں رہتے ہیں ـــــ اُن اچھے لوگوں سے ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں ایسے لوگ جو ادب کی بات نہ کر کے مصیبت زدہ آدمی کی بات کیا کرتے تھے۔

صحیح بات تو یہ لگتی تھی کہ اُن لوگوں کا ساہتیہ سے کوئی سمبندھ ہی نہیں تھا پر اِن اچھے لوگوں والے جھنڈ میں سے کبھی کبھار دو دوست میرے دفتر میں بھی آیا کرتے تھے ہم کچھ منٹ باتیں بھی کیا کرتے تھے ـــ وہی تکلیف میں مبتلا اور لڑتے ہوئے آدمی کی، ملوں میں کام کرنے والے مزدوروں اور فلموں میں کام کرنے والے ایکسٹرا لوگوں کی ـــــ

ایک ایسی ہی دوپہر تھی ہم تینوں اپنی باتیں کر رہے تھے کہ "سارِیکا" کے آفس میں ایک صاحب آئے اور انھوں نے مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی، میں نے ٹالنا چاہا تو وہ نہیں مانے۔ میں نے انہیں بلایا تو آتے ہی انھوں نے ایک کہانی مجھے تھمادی اور بولے۔ "یہ اردو کے مشہور کتھا کار مہندر ناتھ کی کہانی کا انواد (ترجمہ) ہے۔ اسے آپ پڑھئے اور "سارِیکا" میں چھاپئے۔"

میں نے ان سے پوچھا کہ کیا انھوں نے مہندر ناتھ جی سے ترجمے کی اجازت لے لی ہے۔ وہ انوادک (مترجم) بولے۔ وہ مل جائے گی، میں اُن سے لے لوں گا۔ میں نے اُن سے التجا کی کہ اگر موقع لگے تو مہندر ناتھ جی سے ملاقات کی جائے۔

مترجم بولے "ضرور ضرور۔ کیوں نہیں، میں کل ہی اُن سے طے کرتا ہوں۔

مترجم کے جانے کے بعد میرے وہ دونوں دوست جو پہلے سے بیٹھے تھے کچھ اور باتیں کر کے چلے گئے۔

میرا ملنا مہندر ناتھ جی سے نہیں ہو پایا وہ مترجم لوٹ کر نہیں آئے۔ میرے دماغ سے یہ ہی بات آئی گئی ہو گئی۔

پھر ایک سال بعد ایک دن میرے دوست صابر دت ایک اور دوست کے ساتھ آئے۔ وہ اُن کے ہی دوست نہیں تھے۔

میرے بھی تھے۔ کیونکہ وہ اُن اچھے لوگوں والے جھنڈ کے اُن دو لوگوں میں سے ایک تھے جو کبھی کبھار میرے پاس آیا کرتے تھے۔ میں نے انہیں پہچانا۔ ہم دونوں مسکرائے اور وہ بھی بیٹھ گئے۔ صابر دت بھی اپنے اس دوست کا (جو اکثر مجھ سے ملنے آیا کرتے تھے) نام مجھے یاد نہیں تھا۔ ادیبوں شاعروں کی دوستی اور پہچان اتنی بڑھ چکی تھی کہ نام معلوم کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ تبھی صابر دت نے اُن کو کہا پہچانتے ہیں نا انھیں ـــ صابر دت کہہ ہی رہے تھے کہ اُن دوست نے کہا "ہاں ہاں ہم دونوں ایک دوسرے کو خوب اچھی طرح پہچانتے ہیں۔ ہم بہت بار ملے ہیں۔"

اُن کا نام پھر معلوم ہونے سے رہ گیا۔ ہم باتیں کرتے رہے۔ صابر دت اور وہ دوست جب چلنے لگے تو صابر دت نے کہا۔ کملیشور بھائی آپ کو مہندر ناتھ کی کہانیاں چھاپنی چاہئیں۔"

میں نے کہا "دوست ہیں کب سے اُن سے خود ملنے کی سوچ رہا ہوں پر موقع ہی نہیں لگ رہا ہے۔ کبھی ملاقات کرا دیجئے نا۔" صابر دت نے ساتھ کھڑے دوست کی طرف اشارہ کیا۔ "ارے انہیں نہیں پہچانتے، یہی تو مہندر جی ہیں۔" میں سکتے میں آ گیا۔ تو یہی وہ شخص ہے جو اُس دن بھی ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ جب مترجم اس کی کہانی لایا تھا۔ اور یہی وہ آدمی ہے جو پچاسوں بار دنیا کے دکھ درد کی باتیں مجھ سے کرتا رہا ہے اور اس آدمی نے کبھی یہ جتانے کی کوشش نہیں کی کہ میرا یہ دوست اور لیکھک مہندر ناتھ ایک ہی ہے۔

اس سے زیادہ خوبصورت، اونچا اور بیباک گھٹیا پن کیا ہو سکتا تھا ایک دوست کے ساتھ۔

افسوس یہی ہے کہ جس دن مجھے دونوں کا ایک ہونا پتہ لگا اس دن سے اس دوست نے آنا بند کر دیا۔ اور ہماری آخری ملاقات اُن کی موت کے وقت ہی ہوئی۔

جب میں یہ سوچتا ہوا جا رہا تھا کہ آج میں لیکھک مہندر ناتھ کے لئے جا رہا ہوں یا اُس گمنام دوست کے لئے جو پہچانے جانے کے بعد موت کے دن تک مجھ سے پھر روبرو نہیں ملا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے آگے کیا کہوں۔ کس طرح انھیں یاد کروں!!

اپنے ساتھی ادیب اور

بے تکلف دوست

مہندر ناتھ

کو

میں اِس لئے شردھانجلی دیتا ہوں کہ اُس نے اپنے لئے کچھ نہیں کیا ـــــــ جو بھی کیا دوسروں کے لئے۔

ـ گیان سچدیو

خدیجہ اختر

مہندر جی

مہندر جی کو میں نے پہلی بار ۱۹۴۸ء میں دیکھا۔ وہ ترقی پسند مصنّفین کی کانفرنس میں بھوپال آئے تھے۔ لیکن اتنی دور سے دیکھا کہ صحیح ناک نقشہ بھی سمجھ میں نہ آیا۔ میں انہیں افسانہ نگار کی حیثیت سے جانتی تھی لیکن یہ نہ جانتی تھی کہ یہ کرشن چندر کے سگے بھائی ہیں۔ ان کے بہت سے افسانے پڑھ چکی تھی۔ اور میرے ذہن پر ایک افسانے طوفان کے بعد۔ کا گہرا اثر تھا۔ مجھے ان کے افسانے کا یہ جملہ آج تک یاد ہے جو اس کے مرکزی کردار کی زبانی لکھا گیا ہے۔

"لیکن دنیا میں صرف ماں باپ ہی نہیں ہوتے۔ دنیا میں صرف دنیا والے ہی نہیں ہوتے اپنا آپ بھی کچھ ہوتا ہے اپنی انفرادی حیثیت بھی کچھ ہوتی ہے"

آج نئی تنقید میں "ذات" کا بڑا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے۔ مہندر جی نے کتنے پہلے یہ جملہ لکھا تھا۔

میں جب بمبئی آئی تو اختر صاحب کے ادیب دوستوں میں جس سے سب سے پہلے ملی وہ مہندر جی تھے۔ یہ مجھے چھرا بلڈنگ لے گئے جہاں ایک چھوٹے سے کمرے میں ہندوستان کا اتنا بڑا ادیب رہتا تھا۔ مہندر جی کی بیوی درگا کہیں گئیں تھیں۔ مہندر جی نے ہمارے لئے چائے منگائی۔ بڑی دیر تک میں ان سے ان کی کہانیوں کے بارے میں باتیں کرتی رہی۔ اُن کا شائستہ انداز اور ہنستا چہرہ آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ یہ تھی اُن سے میری پہلی اور مختصر ملاقات۔

پھر ہزاروں مرتبہ اُن سے ملنا ہوا۔ اُن کے گھر پہ اپنے گھر پہ کبھی کرشن جی کے یہاں، کبھی کہیں کبھی کہیں۔ نئے ادیب کسی نہ کسی کے گھر پر ادبی جلسہ رکھ دیتے۔ ایک مرتبہ ہمارے گھر پر جلسہ تھا۔ مہندر جی نے اُس میں شرکت کی باقر مہدی نے مضمون پڑھا تھا۔ اس پر خوب بحث ہوئی۔ اور مہندر جی نے اس میں زور شور سے حصّہ لیا تھا۔ مہندر جی ایک سلجھے ذہن کے انسان تھے۔ اور اس لئے اُن کی تنقیدی باتیں بھی بہت سلجھی ہوتی تھیں۔ وہ خواہ مخواہ کی منطقی بحثیں نہیں کرتے تھے بلکہ اُن سے گریز کرتے تھے۔

ایک زمانے میں اختر صاحب اُن فلمی کمپنیوں میں زیادہ کام کر رہے تھے جن کا آفس دادر میں تھا۔ رنجیت اسٹوڈیو اور مشری ساؤنڈ اسٹوڈیو کے متواتر پھیرے ہوتے تھے اور تقریباً مہندر جی سے ہر روز ان کی ملاقات ہوتی تھی۔ یوں بھی اختر صاحب مہندر جی کو اور مہندر جی اختر صاحب کو بے حد پسند کرتے تھے۔ اُن کا لہجہ اختر صاحب کے لئے ہمیشہ ہمدردانہ ہوتا تھا۔ جب اختر صاحب پر پہلی مرتبہ دل کا دورہ پڑا تو کرشن جی کے ساتھ مہندر جی بھی فوراً پہنچ گئے تھے۔ اُنکے چہرے پر ایک ایسا سکون تھا جو کسی حال میں نہیں ٹوٹتا تھا۔ غالباً یہ ان کی اُمید پروری کا نتیجہ ہو۔ یہی سکون میں نے اُن دنوں بھی اُن کے چہرے پر دیکھا ہے جب کرشن جی کو دل کا دورہ پڑا۔ دل اور دماغ کتنے ہی پراگندہ کیوں نہ ہو۔

وہ مایوس مجھے کبھی نظر نہیں آئے۔ اُس زمانے میں کرشن جی کا مکان ہم سے بہت قریب تھا۔ اور میں تقریباً روزانہ ہی وہاں جاتی تھی۔ اختر صاحب دل کے مریض تھے جاتے جاتے ہوئے انہیں اکثر گھبراہٹ ہوتی تھی۔ اس لئے اُن کا جانا بہت کم ہوتا تھا۔ مہندر جی مجھے وہاں روزانہ ہی ملتے تھے۔ کرشن جی سے جتنا لگاؤ انہیں تھا شاید ہی کسی بھائی کو کسی بھائی سے ہو۔ وہ صحیح معنوں میں اُن پر جان چھڑکتے تھے۔ کرشن جی کا ہر حرف اُن کے لئے حرفِ آخر تھا۔ اس بیماری میں جتنی خدمت مہندر جی نے کی شاید سلمیٰ کو چھوڑ کر اور کوئی نہ کر سکتا تھا اور نہ کر سکا۔

مہندر جی کی اپنی زندگی خود ایک کہانی رہی ہے۔ وہ کرشن جی ہی لکھ سکتے ہیں۔ اپنی سحر انگیز جادو بیانی کیساتھ لیکن اُن کے ایک بڑا کہانی کار ہونے میں شک نہیں۔ اُن کی کہانیوں کے کردار جیتے جاگتے ایسے انسان ہیں جن سے ہمیں کوئی اجنبیت محسوس نہیں ہوتی، ان کے دکھ درد، اُلجھن، پریشانیاں، گھٹن، اور نفسیاتی پیچیدگیاں۔ وہی ہیں جو ہماری آپ کی ہیں بعض افسانوں میں مہندر جی نے ایسی باتیں کہی ہیں جسے ایک بڑا نفسیات داں ہی کہہ سکتا ہے، انہوں نے جنسیات پر بھی بہت کچھ لکھا ہے مگر صحت مند ذہنیت اور تندرست رجحانات کے ساتھ۔ ترقی پسند ادب کے بڑے افسانہ نگاروں میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی کے ساتھ اگر کوئی نام بڑھایا جا سکتا ہے تو وہ مہندر ناتھ کا ہوگا۔ لوگوں کا عام خیال ہے کہ کرشن جی کے بھائی ہونے کی وجہ سے مہندر جی کی شخصیت دب گئی۔ میں اسے نہیں مانتی۔ مہندر جی نے اپنا ڈھنگ اپنا طرز سب سے الگ رکھا وہ ایک کامیاب ادیب کہلائے۔ اگر وہ کرشن جی کی نقالی کرتے تو بے شک یہ بات کہی جا سکتی تھی۔ مہندر جی کو کرشن کی عزت اور شہرت سے کبھی کوئی complex نہیں رہا۔

مہندر جی نے جو کتاب "تنہا تنہا" مرنے سے کچھ دن پہلے اختر صاحب کو دی تھی۔ میں نے اُن کے سارے افسانے پڑھے اُن افسانوں میں "ڈیڑھ روپیہ" اور "رسم الفت" بہت خوبصورت ہیں۔ ان کی ایک کہانی "جا بیاں" کبھی نہیں بھول سکتی ہوں۔

مہندر جی کو دل کا دورہ پڑنے کی اطلاع ہمیں رات کو فون پر ملی۔ اختر صاحب اُسی وقت جانا چاہتے تھے لیکن میں نے کہا صبح چلو میں بھی ساتھ چلوں گی۔ رات کے نو بج رہے ہیں۔ ہاسپٹل میں جانے کی اجازت بھی ملے یا نہیں۔ کیا معلوم تھا کہ صبح سے پہلے وہ اس دنیا میں نہ رہیں گے۔ صبح ہی سے اختر صاحب وہاں جانے کے لئے بے تاب تھے۔ دس بجے تک ہم لوگ وہاں پہونچ گئے۔ مہندر جی کو ہاسپٹل سے لائے نہیں تھے۔ کرشن جی کا انتظار ہو رہا تھا۔ بارہ بجے کے پلین سے کرشن جی آئے۔ ساری چھ بلڈنگ مہندر جی کے دوست احباب سے اٹی پڑی تھی۔ جب کرشن جی آئے تو سب رو رہے تھے۔ لوگ ان کے گلے سے لپٹ گئے۔ اختر صاحب بھی کرشن جی کے گلے سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ مجھے ایسا لگا جیسے مہندر جی میں سما گئے ہوں۔ سوچتی ہوں جانے کیسے اتنے بڑے غم کو کرشن جی نے سہن کر لیا خدا نے کون سی طاقت ان کے دل میں بھر دی تھی۔ جیسے بھگوان کرشن نے اپنی پوری شکتی انہیں دیدی ہو اوپر مہندر جی کے کمرے میں درگا چیخ چیخ کر رو رہی تھیں اور ہم سب ہی رو رہے تھے۔ ایک کونے میں اس ڈاکومنٹری کے ڈبے چُنے ہوئے تھے۔ جو مہندر جی نے کرشن جی پر تیار کی تھی میں اسے دیکھ کر اور غم میں ڈوب گئی۔ مہندر جی کی تصویر سامنے دیوار پر لگی اسی طرح مسکرا رہی تھی۔

انسان آتا ہے اور چلا جاتا ہے اسے نہ پھر اپنے کارناموں سے مطلب رہتا ہے نہ اپنی اُلجھنوں سے نہ دوسروں کی خوشیوں سے۔ کچھ یادیں دوسرے کے لئے چھوڑ جاتا ہے جنہیں سوچتے ہوئے دل دکھتا ہے اور نہ سوچنا بس کی بات نہیں ہوتی ●●

خواجہ عبدالغفور

دیدہ ور

برسوں سے میں مہندرناتھ سے ملتا رہا ہوں اور جب کبھی میں اُن سے ملا اسی سوچ میں مبتلا رہا کہ کیا یہی وہ ادیب ہے کہ جس کے پندرہ ناولیں اور افسانوں کے دس مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ بیس فلموں کے مکالمے لکھنے والا کیا یہی وہ قلمکار ہے کہ جس کے شاہکار ہندی مرہٹی، گجراتی، تامل، تلنگی، پنجابی، سندھی، اور دوسری زبانوں میں ترجمے کئے جا چکے ہیں۔ کیا یہ ہمیشہ مسکراتا ہوا چہرہ اس قابل ہے کہ لوگوں کے دُکھ درد کو محسوس کر کے اس کو اس طرح قلم بند کرے۔ کہ غیر حساس دل بھی بلبلا اُٹھے۔ کیا یہ شگفتہ چہرہ اپنے اندر وہ سارے غم والم چھپائے ہوئے ہے کہ جو ہمارے معاشرے کے ۹۹ فیصدی لوگوں کو گھلا رہا ہے۔ اور جن کا حل نکالنے کی کوئی بھی نہیں سوچتا۔ اس کا بھی یقین نہیں آتا کہ سوشلزم کا معتقد اس بات پر ایمان رکھنے والا کہ سوشلزم کے ذریعہ ہی غریبی ہٹائی جا سکتی ہے اور اسی کے ذریعہ قومی یکجہتی برقرار رہ سکتی ہے اس قدر ہنس مکھ اور خوش رو ہو سکتا ہے۔ مہندرناتھ نے قلم اور زبان سے مسلسل جدوجہد کی اور تا دم آخر کرتے رہے کہ دنیا کا نقشہ بدل جائے۔ اس میں کچھ رنگ و بو چڑھے مگر انہوں نے کبھی قیادت تو کیا رہبری کا بھی دعویٰ نہیں کیا۔ وہ یہی سمجھتے رہے کہ دنیا میں دانشور بستے ہیں۔ ان کے سامنے اچھی اچھی باتیں کہانیوں اور افسانوں کے روپ میں رکھ دو اور سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ انہوں نے کبھی پند و نصائح کا بھی سہارا نہیں لیا۔ بس یہی سمجھتے رہے کہ انہوں نے جو بات اپنے لئے پسند کی ہے اور جو راہ اختیار کی ہے وہی اوروں کے لئے شمع ہدایت بنے گی اور سارا کارواں منزل کی طرف بڑھتا ہی جائے گا۔ انہیں ایسی قوی امید تھی کہ وہ اپنی زندگی ہی میں اپنے خوابوں کی تعبیر دیکھ لیں گے اس لئے وہ ہمیشہ شاداں و فرحاں نظر آتے تھے کبھی ان کے ماتھے پر شکن نہ تھی نہ ابرو میں گرہ۔ ان کی خوش پوشاکی سے یہ کبھی گمان بھی نہ ہوتا کہ وہ حد درجہ پست حال لوگوں کی طرح معمولی چال میں رہتے بستے ہیں۔ ایسے لوگوں کے بیچ کہ جن سے ان کو پیار تھا۔ جن کی فلاح و بہبود کی انہیں دن رات فکر لگی رہتی۔ جن میں وہ ایسے گھلے بسے تھے کہ انہی میں کے ایک لگتے۔ یہ ان کی مرضی اور پسند کا سوال تھا کہ جن کی خدمت وہ کرنا چاہتے تھے اور انہیں کے ساتھ رہنا بھی چاہتے تھے مگر اپنی شخصیت اپنی دانشوری اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی وجہ سے ان میں ممتاز و ممیّز بھی لگتے۔ ساتھ ہی ساتھ جب وہ اور شاعروں ادیبوں دانشوروں سیاست والوں کے بیچ ہوتے تو بھی یہ لگتا کہ وہ ان سب میں سے ایک ہیں اور پھر بھی اونچے ہیں بلند و بالا ہیں۔ یہی ان کی ہمت تھی کہ آخر دم تک وہ مصروف و مشغول رہے۔ اور لوگوں کے کام آتے رہے اور بالآخر سچ مچ وہ خود بھی کام آ گئے۔ نہ صرف یہ خود ترقی پسند ادیب تھے بلکہ ان کی انجمن کے معتمد کی حیثیت سے اس تحریک اور اس نہج کو کافی ترقی پذیر بنایا اور مقبول بنایا۔ اپنی عمر کے پچاسویں سال میں بھی وہ نوجوان ادیبوں کی انجمن کے صدر رہے اور فلمی ادیبوں کی انجمن کے جنرل سکریٹری۔ یہ محض ان کی ہمت اور جرأت تھی کہ جو وہ اس قدر بوجھ اپنے شانوں پر لئے چاق و چوبند گھومتے پھرتے۔ "ماہنامہ شاعر" کے معاون مدیر بھی تھے اور اپنی قابلیت کے سہارے اعجاز صدیقی کے ممد و معاون۔

ان سب کے علاوہ انہوں نے اپنی عمر کے آخری دور میں اپنے بھائی کرشن چندر کی زندگی کی ڈاکیومینٹری بنانے کی ذمہ داری بھی قبول کی۔ اور اس کو بہ حسن خوبی انجام دیا۔ میری آخری ملاقات اس وقت ہوئی کہ جب انہوں نے اس ڈاکیومنٹری کو اپنے شاہ کار کی طرح ایک مخصوص محفل میں پیش کیا۔ ہم سب ہی نے اس کو خوب خوب سراہا اور اس کی خوبیوں کو گن گن کر انہیں بتایا اس فلم کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے کرشن چندر کے احباب کو چن چن کر فلم میں اکٹھا کیا اور خود پردہ سیمیں کے باہر رہے۔

اس دن کی یاد آتی ہے تو دل بھاری ہو جاتا ہے۔ آنکھیں بوجھل۔ اس ڈاکیومنٹری فلم کی طرح ایک ایک بات ایک ایک منظر آنکھوں کے سامنے سما جاتا ہے اور دل پکار اٹھتا ہے کہ۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا"

مہندر ناتھ

کو

خراجِ عقیدت

جو

دوسروں کی تعمیر میں ہمیشہ سرگرم عمل رہا

نریندر بیدی

ماہر تعمیرات　ARCHITECT

شیام کرشن نگم

اُردو کے ساتھ مہندر ناتھ زندہ رہے گا

مہندر ناتھ جی سے میری ملاقات تقریباً اکتوبر ۱۹۴۸ء میں ہوئی۔ میں نے ایک ادبی ماہنامہ "خیال" نکالا۔ خیال' کے ایڈیٹروں میں میراجی، اخترالایمان صاحب، ظ انصاری صاحب اور مدھوسودن صاحب تھے۔ اس سلسلے میں اکثر شام کو اچھی خاصی ادبی محفل جمتی تھی اور وشوامتر عادل صاحب، جاں نثار اختر صاحب، ساغر نظامی صاحب اور مہندر ناتھ جی وغیرہ شرکت کرتے تھے۔ اور ادبی مسائل پر گفتگو ہوتی تھی اور بعد میں سورج کے غروب ہونے پر میں بمبئی سنٹرل سے دادر کی بس پکڑتا تھا اور باقی لوگ بمبئی سنٹرل اسٹیشن کی پہلی منزل کے ریسٹورنٹ میں چلے جاتے تھے۔ بمبئی سنٹرل سے یہ لوگ اپنے گھروں کو کب لوٹتے تھے یہ خدا ہی بہتر جانتا تھا۔ ہاں میراجی کے متعلق دوسرے دن خبر ملتی کہ رات کو میراجی کو چند لوگوں کی مدد سے وکٹوریہ گاڑی میں گھر پہنچایا گیا۔

مہندر جی ایک نہایت ہی وضع دار انسان تھے، چاہے کوئی کتنا ہی مذاق کرے کیا مجال کہ مہندر جی نے تہذیب کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے دیا ہو۔ ذرا مسکرا کر جواب دے دیتے یا صرف چپ ہو جاتے۔ لیکن گھٹیا بات اُن کے منہ سے کبھی نہیں سنی۔ کیونکہ نہ تو وہ خود گھٹیا بات برداشت کرتے اور نہ ہی ایسی بات کرتے جس سے کہ کسی دوسرے کو گھٹیا بات کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی۔ میری جب بھی مہندر جی سے ملاقات ہوتی وہ مجھ سے ہمیشہ بڑے ادب سے بات کرتے تھے۔ شاید کرشن جی اور میری دوستی کی یہ سزا رہی ہو۔

ابھی ۱۹۷۳ء میں لکھنؤ میں آل انڈیا نان مسلم اردو رائٹرس کانفرنس ہونے والی تھی جس کے روح رواں جناب رام لال تھے وہ بمبئی آئے اور اس کانفرنس کے سلسلے میں بمبئی کے تمام اردو ادیبوں کو صلاح و مشورہ کرنے کے لئے اکٹھا کیا گیا۔ اس میں مہندر جی نے بھی کافی دلچسپی لی اور وہ اس کانفرنس کے بمبئی زون کے سکریٹری بھی رہے۔ لہٰذا اس سلسلے میں مہندر جی سے کافی ملاقاتیں رہیں۔

اس کے علاوہ میں نے مہندر جی کی کافی کہانیاں پڑھی ہیں اُن کی کہانیوں میں ایک خاص طرح کا تسلسل ملتا ہے کہ پڑھنے والا اکثر ایسا محسوس کرنے لگتا ہے کہ شاید یہ میری کہانی ہے اور نظر کے سامنے ایک مکمل منظر دکھائی دیتا ہے یعنی ان کی کہانیاں حقیقت سے بالکل قریب نظر آتی ہیں۔

مجھے وہ منحوس دن ہمیشہ یاد رہے گا کہ جس دن صبح ہی صبح بھابی سلمیٰ صدیقی کا دل خراش فون آیا کہ مہندر جی کا سورگباش ہو گیا۔ مجھے یقین نہیں آیا اور میں نے کہا ارے بھئی یہ کیسے ہو سکتا ہے ابھی چند دن ہوئے جب تو ملاقات ہوئی تھی اور وہ اچھی طرح تھے۔ یکایک یہ کیا ہوا؟ میں اسی وقت مہندر جی کے مکان پر پہنچا جب سب لوگ اکٹھے ہو رہے تھے۔ ہر شخص اداس تھا۔ اور ہر ایک کی زبان پر یہی الفاظ تھے کہ مہندر جی جیسے شریف انسان اس دنیا میں مشکل

سے ملتے ہیں۔

اُردو کا ایک سچا عاشق اب دنیا سے چلا گیا۔ اُردو کا وہ لعل چلا گیا جس کا نعم البدل ملنا مشکل نظر آتا ہے اب بھی جب مہندر جی کی یاد آجاتی ہے تو سینے سے آہ نکل جاتی ہے۔

مہندر اردو کے لئے پیدا ہوئے تھے اور اردو کے لئے انھوں نے اپنی ساری زندگی نذر کر دی۔ مہندر جی نے کبھی بھی خود نمائی کی کوشش نہیں کی۔ اور نہ ہی کبھی ادبی خدمات کا صلہ چاہا۔

اب تو مہندر جی کی صرف یاد رہ گئی ہے۔ ایشور ان کو سورگ میں جگہ دے اور ہم سب کو ان کے باقی کام جو رہ گئے ہیں پورا کرنے کی توفیق دے۔ آہ! مہندر تم مرے نہیں اور نہ ہی کبھی مر سکتے ہو بلکہ جب تک دنیا میں اردو ادب زندہ رہے گا، تم زندہ رہو گے ——!

عظیم فن کار

مہندر ناتھ

کو

خراجِ عقیدت

جو

ہمیشہ ہم جیسے چھوٹے کلاکاروں کو مشہور کلاکاروں سے کم نہیں سمجھتا تھا۔

کاجل
(اداکارہ - رقّاصہ)

صہبا لکھنوی مدیر "افکار"

کراچی — (پاکستان)

پیارے کرشن — محبتیں

تمہارا خط اور پھر تار — عرصۂ دراز کے بعد ملا تو یوں محسوس ہوا کہ جیسے ویرانے میں بہار آگئی۔ سچ ہے۔ انسان، انسان سے تو لڑ سکتا ہے۔ تاریخ سے نہیں لڑ سکتا۔

اس طویل عرصہ میں تم پر کیا بیتی، ہم کن حالات کا شکار رہے۔ اردو ادب پر کیا کچھ بیت گئی۔ اس کی داستان سنانے کا نہ مجھے نہ شاید تمہیں سننے کا حوصلہ ہو!

سال گذشتہ جب ایک اخبار میں بھائی مہندر ناتھ کے انتقال کی خبر نظر سے گزری تو یقین نہ آیا کہ مہندر اتنی جلد تمہیں اور ہمیں سوگوار چھوڑ جائیں گے۔ موت کتنی ظالم ہے اور انسان کتنا بے بس ہے۔ اس کا یقین کئے بنا چارہ نہیں۔ شاید دنیا میں اچھے لوگوں کی کم ضرورت ہے۔ مہندر بچھڑ گئے اور اپنے ساتھ اعلیٰ صلاحیتیں، خوبصورت یادیں اور محبتیں سمیٹ کر لے گئے۔ اور میں تمہیں تعزیت کا خط تک نہ لکھ سکا کہ تمہارے اور ہمارے ملک کی سرحدیں بند تھیں۔ رشتے ناطے ٹوٹ چکے تھے اور ہم مسلسل حالت جنگ میں زندگیاں بسر کر رہے تھے اور ایک دوسرے سے بے تعلق ہو چکے تھے۔

یہ سب کچھ کیوں ہوا۔ کیسے ہوا۔ اس کے لئے ہمیں ماضی کی راکھ کو کریدنا ہوگا۔ اور اب کہ ہم نے ظلمتوں کا سینہ چیر کر اجالوں کو پا لیا ہے۔ بہتر ہوگا کہ ماضی کی تلخ یادوں کو بھلا دیں۔

سو آؤ — میں تمہیں گلے لگا لوں — تم میرے آنسو پونچھ دو۔ میں تمہارے آنسو پونچھ دوں۔ بے شک مہندر تمہارا بھائی تھا۔ بہت ہی پیارا۔ لیکن وہ ہمیں بھی تو اپنے بھائیوں کی طرح عزیز تھا۔ پاک بھارت تعلقات کی استواری کے سلسلے میں وہ تم سے کسی طور پیچھے نہیں تھا۔ غیر تمہیں یاد ہو۔ سنہ ۵۰-۱۹۴۹ء کے دوران۔ "افکار" ہی میں اس کا ایک معرکہ آرا افسانہ چھپا تھا۔ "ہندوستان سے پاکستان تک" یہ افسانہ آج بھی اس کی انسان دوستی، ترقی پسندی، دونوں ملکوں کے درمیان مفاہمت و آشتی اور برادرانہ روابط کا وہ آئینہ ہے جو ہمیشہ اس کی یاد کو تازہ رکھے گا۔

جنوری سنہ ۱۹۴۹ء میں وہ بھوپال آئے تھے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی سالانہ کانفرنس میں شرکت کے لئے تین چار دن وہ ہمارے مہمان رہے اور اس طرح مہمان رہے کہ میزبان اور مہمان کا امتیاز ختم ہوگیا — بس یہی ہماری پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ پھر خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوا جو عرصہ تک جاری رہا۔

اگست سنہ ۱۹۶۵ء میں برادرم اعجاز صدیقی — بمبئی سے کراچی آئے تھے۔ دیرینہ روابط کی بنا پر ہم نے ایک دوسرے کی قربت میں بہت اچھا وقت گذارا۔ میں نے نقوش نمبر میں "کرشن چندر نمبر" کا اعلان کر دیا تھا۔ چنانچہ اعجاز سے یہ طے کیا کہ تم بھی اس نمبر میں ہاتھ بٹاؤ۔ شاعر کا "کرشن چندر نمبر" بمبئی سے نکلے اور افکار کا کراچی سے ہم دونوں اپنے مسودات کا تبادلہ کر لیں۔

اس طرح کرشن چندر کی خدمات کا جو اردو کے لئے ہیں اور دونوں ملکوں میں مقبول ہیں — بجا طور پر اعتراف ہوگا اور ایک اچھی صحت مند اور نئی مثال قائم ہوگی۔ وہ میری تجویز سن کر خوش ہوئے اور پروگرام طے ہوگیا۔ بعد میں شاید وہ کسی وجہ سے تعاون نہیں کر سکے۔ پھر بھی انہوں نے کرشن چندر نمبر کی تجویز کو اپنے طور پر بحسن و خوبی عملی جامہ پہنایا۔ اسی سلسلے میں مہندر نے مجھے کئی خطوط لکھے اور مجھ سے باصرار تمہارے نمبر کے لئے مضمون لکھوایا۔ برا بھلا جب بھی ممکن ہوا۔ میں نے اس نمبر کے لئے صرف مہندر کی خواہش پر مضمون لکھ کر بھیجا۔ اور خوش ہوا کہ زندہ دوستی کی روایت کچھ اور آگے بڑھی۔

بھوپال کی ترقی پسند مصنفین کانفرنس پر صفیہ بھابھی (مرحومہ) (جاں نثار اختر) کا لکھا ہوا رپورتاژ "ایک ہنگامہ" تو تمہیں ضرور یاد ہوگا۔ یہ افکار کے بھوپال کانفرنس نمبر میں چھپا تھا۔ اس رپورتاژ میں یوں تو سبھی کا ذکر ہے لیکن صفیہ بھابھی نے مہندر کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ شاید اب تمہیں یاد نہ ہو— تین روزہ کانفرنس کے ایک اجلاس کی صدارت مہندر ناتھ نے کی تھی۔ وہ لکھتی ہیں :—

"۲۸ر جنوری (سنہ ۴۹ء) کی شام کو ادبی تخلیقات کا دوسرا جلسہ مہندر ناتھ کی صدارت میں ہوا۔ بمبئی گروپ میں یہ بھی آئے تھے اور عادل رشید بھی۔ اس محفل کو ماحول ستھرا اور صاف میسّر آگیا۔ MUSE OF POETRY کی پوجا شروع ہونے سے پہلے مہندر ناتھ نے — ادب و جنس کے موضوع پر خطبۂ صدارت پڑھا۔ ابتداء میں انہوں نے ترقی پسند ادب میں جنس کے موضوع کا تاریخی جائزہ پیش کیا اور بتایا کہ— "ابتدائی دور میں ترقی پسند ادیب جنسی مریضانہ ذہنیت کا علاج کرنے کے بجائے خود مریض ہو کر رہ گئے۔ لیکن اب ہمارے ادیبوں نے اب اپنا رُخ موڑا ہے اور جنس کے موضوع کو ایک تعمیری انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مہندر ناتھ نے جنسی افسانوں میں جسمانی محبت کے ساتھ روحانی رفاقت اور خیال کی ہم آہنگی پر زور دیا ہے۔ ایسی رفاقت جو ایک نئے سماج کی داغ بیل ڈالنے میں مددگار ہو—"

افسوس کہ سعی و کوشش کے باوجود مجھے افکار کا بھوپال ادبی کانفرنس نمبر نہ مل سکا ورنہ میں مہندر کا یہ فکر انگیز خطبۂ صدارت تمہیں نقل کرا کے بھیج دیتا۔ جب بھی یہ نمبر دستیاب ہوگا ضرور بھجوا دوں گا۔ مہندر ایک اچھا ناقد اچھا افسانہ نگار اور سب سے بڑھ کر ایک اچھا انسان تھا۔ وہ وقت سے بہت پہلے ہم سے جدا ہوگیا۔ افسوس! لیکن مجھے یقین ہے کہ مہندر کی اعلیٰ ادبی تخلیقات اردو ادب میں ہمیشہ زندہ و پائندہ رہیں گی اور پاک بھارت دوستی کے سلسلے میں نئی نسل خصوصیت کے ساتھ ان تخلیقات سے درس سے تپش حاصل کرے گی۔

تم نے بہت اچھا کیا جو مہندر پر خصوصی اشاعت ترتیب دینے کا پروگرام بنایا۔ اسی طرح تم اور ہم اس کا ادبی قرض چکا سکتے ہیں۔

گذشتہ چار سال سے میری صحت جواب دے چکی ہے۔ عرق النساء کا شکار ہو چکا ہوں لیکن سید ڈاکٹروں کے مشورے کے مطابق بیلٹ بندھی ہے۔ کم سے کم بارہ گھنٹے یہ بیلٹ مجھے چلنے پھرنے اور کام کرنے کی سہولت دیتی ہے افکار نے اور ہجوم افکار نے گذشتہ تیس۳۰ سال میں میرا ایک ایک قطرۂ خون جذب کر لیا ہے۔ پھر بھی حوصلہ نہیں ہارا ہے۔ بس افکار اور اپنے چھوٹے چھوٹے بچے بچیوں کے لئے زندہ ہوں۔ زندہ رہنے کی جدوجہد کر رہا ہوں۔ دعا کرو کہ آخری سانس تک افکار زندہ رہ جائے اس سے زیادہ کی تمنا نہیں۔ خدا کرے تم، بھابھی اور بچے بعافیت ہو۔ امید کہ قلبی تعلق قائم رکھو گے۔ والسلام تمہارا بھائی۔

صہبا لکھنوی

ندا فاضلی

مرثیہ

(مہندر ناتھ کی یاد میں)

کیا خوب آدمی تھا بلا کا ذہین تھا
کہتا تھا ـــــ!
ماں کی گود سے تاریک قبر تک
اِک راستہ ہے جس پہ چلے جا رہے ہیں ہم
پہیئے پہ چڑھ چکے ہیں گھسے جا رہے ہیں ہم
الجھا رہا وہ اپنے ہی اندر تمام عمر!
ہر پل نیا سوال تھا!
جینا وبال تھا!
محدود ہو کے سوچنا اس کو محال تھا
لیڈر نہ بنا!
نہ چور!
نہ روحانی پیشوا!
افسوس!! جیسے آیا تھا ویسے ہی چل دیا
ہر بات جانتا تھا یہ ہی اس کا عیب تھا
کمبخت کو! یہ عیب چھپانا نہ آسکا
لوگوں کو بے وقوف بنانا نہ آسکا
کیا خوب آدمی تھا

ایک سچے اور کھرے انسان

کی

خدمت میں

ایک دوست

کا

نذرانۂ عقیدت

کہانی کار

ستیش بھٹناگر

بھارت کے آئین کی چھبیسویں سالگرہ کے

موقعہ پر

ہم چوکس رہنے کا عہد کریں

اپنے آئین کے ذریعے ہم نے زندگی کا ایک خاص راستہ چنا ہے۔ یہ ہے پارلیمانی جمہوریت کا راستہ جس پر چل کر ہم اپنے دیش میں سب کے لئے سیاسی، معاشی اور سماجی انصاف کو یقینی بنانا چاہتے ہیں۔

لیکن ہمارے ہی کچھ لوگ جنہیں یہ طرزِ زندگی پسند نہیں، اس پر وار کر رہے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ ہم اس راستے پر چل کر اپنے مقاصد میں کامیاب ہوں۔ بلکہ وہ تو اس طرزِ زندگی کو سرے ہی سے ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ ان کا راستہ کچھ اور ہی ہے۔ انتشار، بربادی اور دوسروں پر کیچڑ اچھالنے کا راستہ۔

آیئے ہم ایسے لوگوں سے خبردار رہیں۔

آزادی اور جمہوریت کو برقرار رکھنے کے لئے ہر دم چوکس رہنا لازمی ہے۔

دیکھیے! آئین پر آنچ نہ آئے

davp 76/491

نذرانۂ خلوص و محبت

عظیم افسانہ نگار مہندر ناتھ کی یاد میں

من جانب

عباس حسینی شکیل جمالی اور سید محمد ہاشم

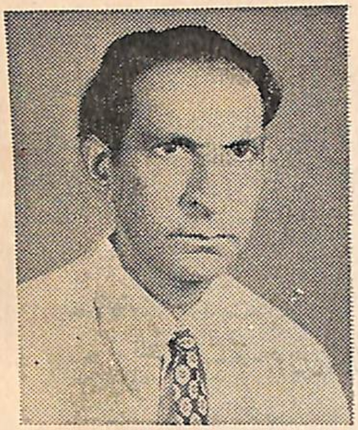
نکہت پبلیکیشنز — الہ آباد 211003

اردو اور ہندی کے مشہور ادیبوں کی تخلیقات
پاکٹ بکس میں چھاپنے والا ادارہ

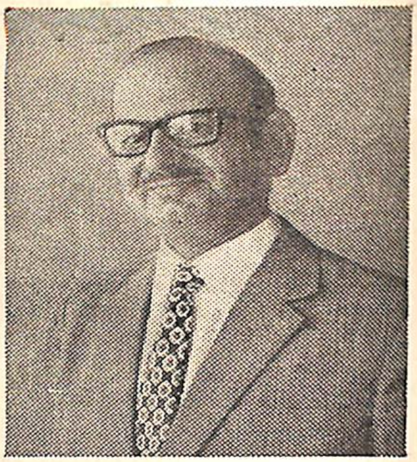
نکہت پبلی کیشنز۔ الہ آباد 211003



مہندرناتھ کی چھوٹی بھابی - کملا



مہندر کا چھوٹا بھائی اوپندرناتھ چوپڑہ

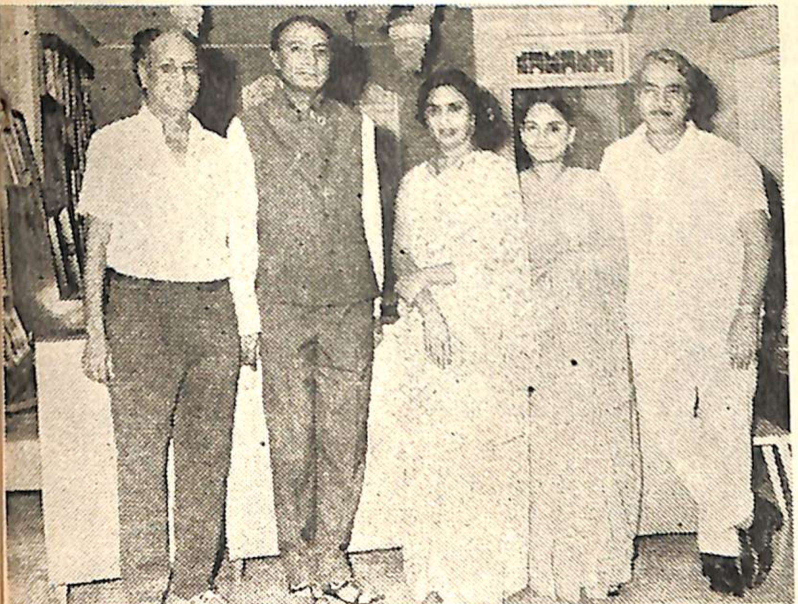


ریوتی شرن شرما



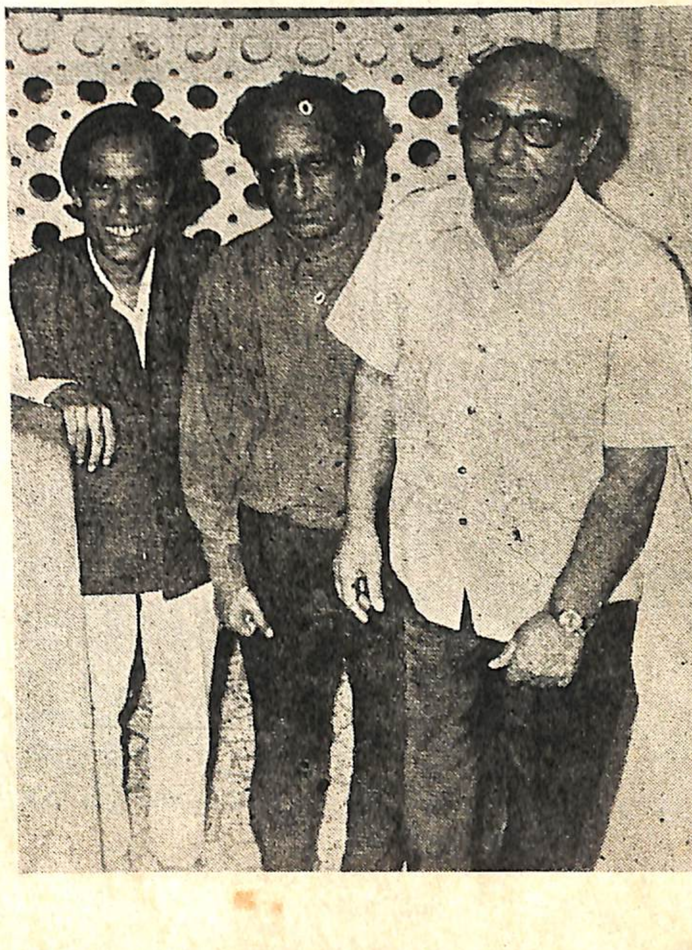
چھوٹی بہن سرلا دیوی

دس مارچ کو لی گئی تصویر

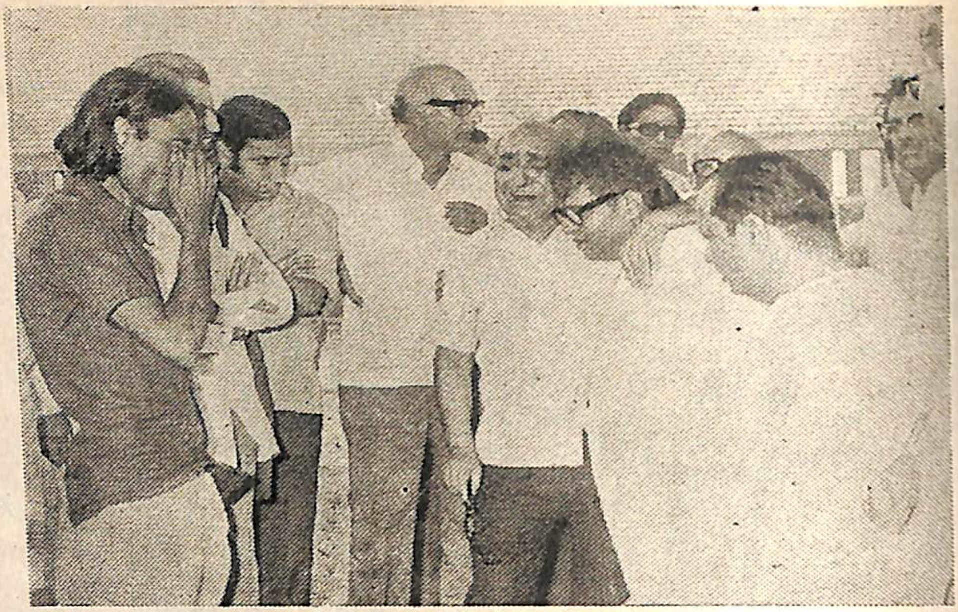


اور مہندر ناتھ۔ جو بیس مارچ کو انتقال کر گئے

ساحر لدھیانوی، سلمیٰ صدیقی، پروفیسر پھول منی ورما، امرت بھوشن گجرال



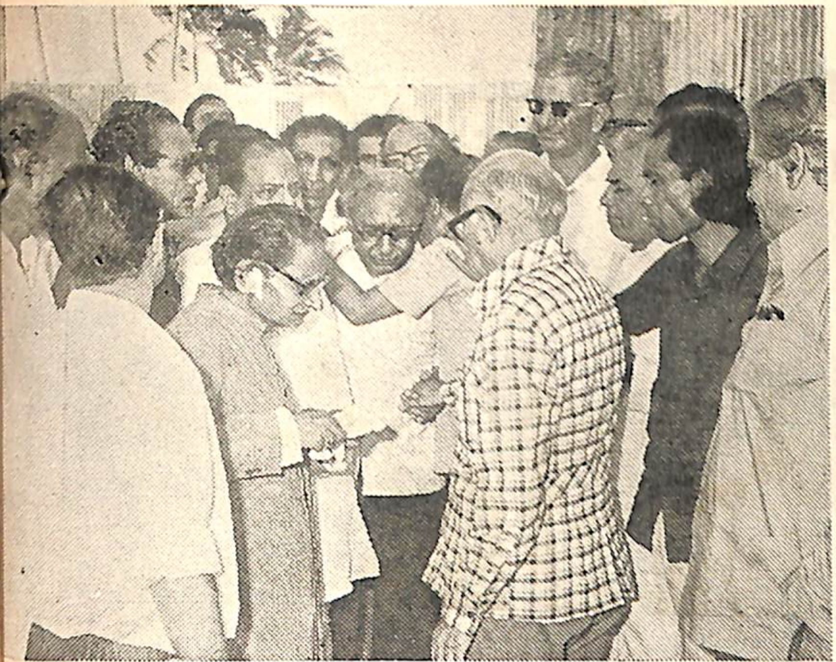
کرشن چندر، مہندر ناتھ اور صابر دت نیشنل کلچرل فرنٹ کی میٹنگ میں
ساحر لدھیانوی کی قیام گاہ پر جاتے ہوئے



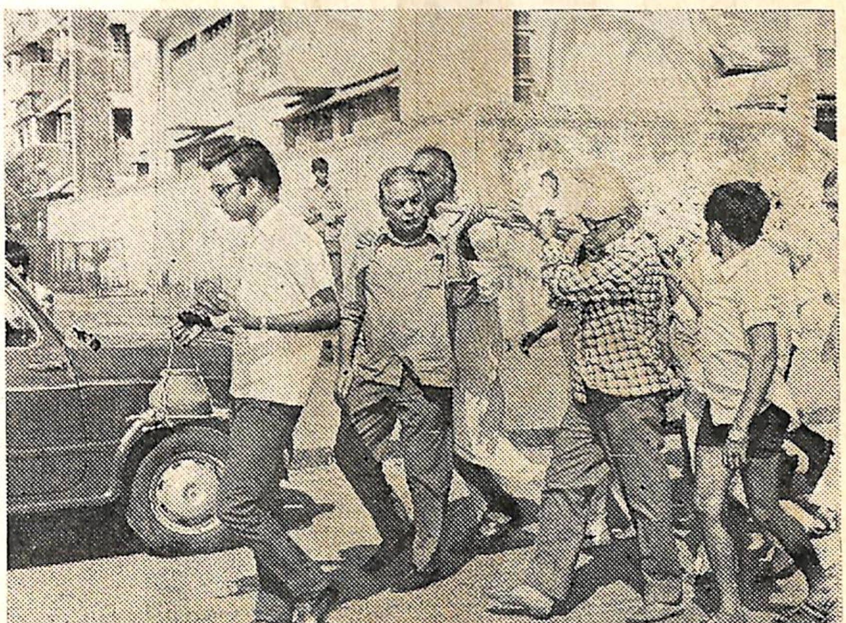
شیواجی پارک کے شمشان گھاٹ پر



ابھی ابھی تک ہنستے ہنستے سو گیا ہے۔



کرشن چندر جب ۲۱ مارچ کو دہلی کے چھیرا بلڈنگ کے
پاس پہنچے اور مہندر ناتھ کی موت کی خبر سُنی۔



آخری منزل کی طرف ساتھیوں کے کندھوں پر۔

سینہ خواہم شرح شرح از فراق
تا بگویم شرح دردِ اشتیاق"
(مولانا رومؒ)

شریکِ غم



نیاز حیدر

میرے حبیب کا دل

(اپنے عزیز ترین مشفق اور محسن دوست مہندر ناتھ کی نذر — نیاز حیدر)

دلِ خموش ہے اِک داستاں اگر سمجھو
زبانِ چشم ہے اشکِ رواں اگر سمجھو
وہی تو جرأت و طاقت ہے آدمی کیلئے
صدائے دردِ دلِ ناتواں، اگر سمجھو

حیاتِ لامتناہی سے ربط کی خاطر
فنا پذیر بدن سب کو چھوڑنا ہوگا
جسے بھی زیست کے لمحے عزیز ہیں اے دوست
اُسے حیات کے رشتوں کو توڑنا ہوگا

مگر یہ قاعدۂ فطرت و اصولِ حیات
مُصر نہ ہو کہ یہ انسان سنگدل ہو جائے
بتاؤ کونسی خواہش ہے زندگانی میں
جو عارضی بھی رہے اور مستقل ہو جائے

وہ آدمی کہ جو ہے صیدِ حرص و زرداری
جو اپنی عزّت و حرمت خرید سکتا ہے
ضمیر بیچ رہا ہے قمار بازوں کو
کنواریوں کی جو عصمت خرید سکتا ہے

مرے حبیب نے کی ہے مخالفت اُس کی
مرے حبیب کا ایمان ہے محبت پر
وہ جنکو عشق سے ہے عشق وہ یہ کہتے ہیں
حیاتِ نو سے ہی پیدا ہے آخرت اُس کی

مرے حبیب نے پروا نہ کی کسی غم کی
کسی کے درد سے انجان وہ کبھی نہ رہا
وہ زرپرست کا محکوم تھا کہ باغی تھا
سوال پوچھ رہا ہے یہ آدمی سے خدا

چلا گیا ہے وہی آج اس خدا کے گھر
اب اُسکی موت کو ہم لوگ زندگی سمجھیں
یہ زیست موت سے پہلے کبھی نہیں ملتی
جو ہو سکے تو ہم اس رمز کو ابھی سمجھیں

وہ جس نے اپنی محبت نہ کی کبھی نیلام
نہ کوٹھیوں کے عوض اور نہ موٹروں کے عوض
ڈکیتِ علم و ادب کے نہ اُس کو لوٹ سکے
وہ جس کو کر نہ سکے ساحرانِ زر بدنام

وہ دل تھا دل جو غمِ روزگار کو سہہ کر
تبسّم اور مسرت کا روپ دھار لیا
وہ دل کہ جس نے رنگوں پر کیا نچھاور خوں
وہ دل کہ جس نے چمن سے عذابِ خار لیا

مرے حبیب کا دل سورجوں سے بہتر
سیاہ کار دلوں کو جو روشنی بخشے
فغاں کہ اُس کو اسی دل نے مجھ سے چھین لیا
خدا کے قہر کو کس طرح آدمی بخشے ؟

(۲۳ مارچ ۱۹۷۷ء)

مجاہد منزل
سری نگر۔ کشمیر
۱۱ر اپریل ۱۹۷۴ء

بھائی کرشن چندر جی!

آداب و تسلیم !

آپ کے خط مرقومہ یکم اپریل ۱۹۷۴ء سے یہ خبر پڑھ کر مجھے انتہائی دکھ ہوا۔ کہ آپ کے چھوٹے بھائی اور اُردو کے مشہور افسانہ نگار مہندر جی کا ۲۰ر مارچ کی رات میں انتقال ہوگیا۔ اور آپ نہ صرف ایک عزیز بھائی بلکہ ۵۰ برس کے ایک رفیقِ زندگی کی صحبت سے محروم ہوگئے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس ناقابلِ تلافی نقصان کو سہارنے کی توفیق عطا کرے۔ اور مرحوم کی آتما کو شانتی بخشے۔

نہ صرف میں بلکہ کشمیر کا سارا ادبی حلقہ آپ کا شریکِ غم ہے۔

براہِ کرم تمام سوگوار خاندان کی خدمت میں میری جانب سے پیغامِ ہمدردی پہنچا کر مشکور فرمادیں۔

آپ کا شریکِ غم

شیخ محمد عبداللہ

(شیخ محمد عبداللہ)

مالک رام ۔ نئی دہلی ۲۴

برادر عزیز کرشن چندر جی!

میں تین چار دن یہی سوچ رہا ہوں کہ کیا لکھوں! یہ اتنا بڑا حادثہ ہے کہ اپنے جذبات کے اظہار کے لئے الفاظ تک نہیں ملتے۔ ایسا لائق اور غمخوار اور قوت بازو بھائی یوں ہاتھ سے نکل جائے، تو ظاہر ہے کہ اس سے بڑا المیہ کیا ہوگا۔ میں آپ کے دل کی کیفیت کا کچھ اندازہ کر سکتا ہوں کیونکہ خود زخم خوردہ ہوں۔ اور ان حالات سے گزر چکا ہوں۔

صبر و سکون تو رفتہ رفتہ ہی آئے گا۔ وقت سب سے بڑا معالج ہے، اور شکر ہے کہ وقت کے ساتھ بڑے سے بڑا زخم بھی مندمل ہو جاتا ہے، ورنہ زندگی دوبھر نہ ہو جائے!

مجھے اپنے غمخواروں میں شمار کیجئے۔

خاکسار مالک رام

پرکاش پنڈت ۔ دہلی

برادرم کرشن چندر صاحب،

مجھے افسوس ہے کہ کوشش کے باوجود میں اپنے عزیز ترین دوست پر کوئی مضمون نہیں لکھ سکا۔

جب بھی میں مہندر ناتھ کے بارے میں کچھ لکھنے کا ارادہ کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ مجھے اُسے مرحوم لکھنا پڑے گا، تو میری آنکھیں ڈبڈبا جاتی ہیں، قلم سرکنے سے انکار کر دیتا ہے اور میں نڈھال ہو جاتا ہوں۔۔ آپ کے تقاضے اپنی جگہ پر، میری لاچاری میری جگہ پر۔

آخر میں اس مہندر ناتھ کے بارے میں کیا لکھوں جس نے بمبئی میں میرے گلے کے کینسر کے علاج کے دوران مجھے ہزار ہزار تسلیاں دیں۔ خود دل کا مریض ہونے کے باوجود دو دو منزلہ سیڑھیاں چڑھ کر میری مزاج پرسی کرنے آتا رہا اور میری قبل از وقت موت کا تصور کر کے مجھے گلے سے لگا کر زار و قطار روتا رہا۔ اس مہندر ناتھ کے بارے میں میں کیا لکھوں جو مجھے زندہ دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن جو مجھے زندہ دیکھنے کے لئے خود زندہ نہیں رہا۔

اپنی زندگی میں میرا ہزاروں لوگوں سے واسطہ پڑا ہے۔ سینکڑوں میری دوستی کا دم بھرتے ہیں اور میں بھی ان کی دوستی کا دم بھرتا ہوں۔ بعضوں کے مجھ پر احسانات ہیں، بعضوں پر میرے احسانات ہیں۔ لیکن جن دو عظیم اخلاق اور خلوص کے پتلوں نے نہ مجھ پر کوئی احسان کیا اور نہ میں نے اُن پر کوئی احسان کیا ـــ مہندر ناتھ ان میں سے ایک تھا ـــ اور دوسرا تھا بلراج ساہنی!

افسوس آج نہ مہندر ناتھ ہے نہ بلراج ساہنی۔ اپنے مہلک مرض کی وجہ سے مجھے اُن دونوں کے تئیں اپنے

خلوص کا اظہار کرتے ہوئے اُن دونوں سے پہلے اُٹھ جانا چاہیے تھا لیکن اس اعتبار سے بھی وہ مجھ پر سبقت لے گئے۔ ـــــ کوئی بات نہیں، جہاں وہ گئے ہیں عنقریب میں بھی وہاں جاکر اُن سے باز پرس کروں گا کہ یہ بداخلاقی انھوں نے کیوں کی۔ کہ، مجھے صرف دوستی کا دم بھرنے والوں کے درمیان چھوڑ گئے۔

کرشن چندر

کلام حیدری ۔ مدیر "آہنگ" گیا (بہار)

موت بڑی کٹھور ہوتی ہے، اِس کٹھور موت نے صرف پچاس سال کی عمر میں مہندر ناتھ کو اُس کے پیاروں سے چھین لیا۔ ۵۰ سال میں تو آدمی جوان ہوتا ہے، مہندر ناتھ ہمیشہ جوان بن کر جیا اور مرا تو بھی جوان ہی رہا۔

ہندوستان کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک سوگواروں نے سنا تو دم بخود رہ گئے۔ لگا کوئی اپنا اُٹھ گیا۔ چتا کی لپکتی لہکتی لمبی زبانوں نے مہندر ناتھ کو ۳ بجے دن (۲۱ مارچ) میں کرشن چندر، سرلا دیوی اور اُدم کے کھڑے مہندر ناتھ کو ہضم کر لیا، درگا بھابی کا سہاگ سفیدیوں میں گم ہو کر ساری دنیا کو تاریک کر گیا۔

اُردو نے مہندر ناتھ سے محروم ہو کر کیا کھویا؟ اُردو کی تاریخ کئی اعتبار سے مہندر ناتھ کے بغیر نامکمل رہے گی مہندر ناتھ کا مزاج فقیرانہ تھا۔ وہ اگر دولت حاصل کرنے کو اپنا مقصد بنا لیتا تو بمبئی میں اُس کی بھی سمندر کے کنارے کوئی بلڈنگ کھڑی ہوتی۔

مہندر ناتھ کے افسانوں کے ۹ مجموعے اور چودہ پندرہ ناول شائع ہو چکے ہیں۔ انھوں نے فلموں کے لئے مکالمے لکھے، منظرنامے لکھے، کہانیاں لکھیں، انجمن ترقی پسند مصنفین کے روحِ رواں رہے۔ بارہ سال تک فلمی دنیا کے مظلوم طبقے یعنی ادیبوں کی ایسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری رہ کر ادیبوں کے حقوق کی حفاظت کی۔

ہم کرشن چندر، سرلا دیوی اور سب سے بڑھ کر درگا بھابی کو کن الفاظ میں تسکین کی تلقین کریں اور ان کے غم کو ہلکا کریں۔ خدایا! کرشن چندر کے لاکھوں چاہنے والوں کے لئے، غریب اُردو کے لئے زندہ رکھ، سرلا بہن کو زندہ رکھ، درگا بھابی کو مہندر ناتھ کی نمائندہ بنا کر ہمارے لئے زندہ رکھ۔

مہندر ناتھ میرا کون تھا؟ میں مہندر ناتھ کے لئے کس رشتے سے رویا؟ اِس رشتے کے تقدس، اس کی حرارت اور اس کی صداقت کے طفیل میرے کرشن چندر کو حیاتِ خضری دینا۔

کلام حیدری

مجتبیٰ حسین ـــ نئی دہلی ۱۳

کرشن بھائی تسلیمات!

کل مہندر جی کے سانحہ ارتحال کی خبر ملی اور شدید صدمہ پہونچا۔

میں جانتا ہوں کہ اس المناک حادثہ سے آپ کے دل پر کیا نہ گزری ہوگی۔ یہ سوچ کر ہی حیران ہوں۔ مہندر جی سے آپ کو جو لگاؤ تھا اس کا اندازہ ساری ادبی دنیا کو ہے۔

غفور صاحب بھی آج ہی بمبئی سے پہونچے۔ وہ بھی بتا رہے تھے کہ اس سانحہ سے آپ کتنے متاثر ہوگئے ہیں۔
اس غمناک موقع پر میں صرف یہی دعا کروں گا کہ خدا آپ کو صبرِ جمیل عطا کرے اور مرحوم کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

ناچیز　یحییٰ احسن

فکر تونسوی ۔ روزنامہ "ملاپ" نئی دہلی

کرشن جی!

موت سے جتنی حماقتیں ہوئی ہیں، مہندرناتھ کا ہارٹ اٹیک اُن حماقتوں میں ہی ایک اضافہ ہے۔ لہٰذا صبر و شکر کی ضرورت نہیں، کیونکہ وہ تو ہم انسانوں کے نصیب میں ہے۔

حسین خواب دیکھنے والا ایک اور آرٹسٹ چلا گیا۔

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اُٹھتے جاتے ہیں　　کہیں سے آبِ بقائے دوام لا ساقی

فکر تونسوی

احمد جمال پاشا ۔ لکھنؤ (یوپی)

محترمی کرشن جی آداب و نیاز

مہندر جی کے انتقال کی اچانک غیر متوقع خبر سے سخت صدمہ ہوا۔ یہاں ادیبوں کا ایک تعزیتی جلسہ بھی اُن کے سوگ میں گھر پر کیا تھا۔

اگر آپ اسے رسمی بات نہ سمجھیں تو جانیں کہ آپ کے ساتھ میں بھی اپنے بھائی سے محروم ہوگیا۔ خدا سے دعا ہے کہ آپ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

سلمیٰ آپا کی خدمت میں آداب۔ سرمد سلام عرض کرتی ہیں۔ نیازمند

شریکِ غم　احمد جمال پاشا

جگت نارائن　مدیر "ہند سماچار" جالندھر

پیارے کرشن

مہندرناتھ جی کی اچانک وفات کا جو تار مجھے آپ کی طرف سے ملا اُس سے مجھے شدید دھچکا سا لگا۔ ابھی پندرہ دن پہلے عزیز دجے بمبئی میں تھا اور مہندر جی سے ملا تھا اور انہیں بالکل تندرست پایا تھا۔ یہ معلوم نہ تھا کہ اُن کا آخری وقت اس قدر قریب ہے۔

میں بہت دنوں سے مہندر سے نہیں مل سکا۔ مگر اس کا ہنستا مسکراتا چہرہ اور دلکش خد و خال میری آنکھوں میں گھومتے ہیں۔

بھگوان کے طریقے نیارے ہیں ۔ اور اُن میں کوئی دخل نہیں دے سکتا ۔ مہندر نے ساری زندگی عجب سادگی سے گزار دی اور اُسے مکمل طور پر اردو ادب کے لئے وقف کر دیا ۔ اُسے کھو کر تم نے نہ صرف اپنا چھوٹا بھائی کھویا ہے بلکہ اپنا سب سے پیارا ساتھی بھی ۔ اُوبیش نے مجھے بتایا ہے کہ تم مہندر کو کتنا چاہتے ہو اور اب اس کے بغیر تمہاری زندگی کتنی سونی ہو جائے گی ۔

رنج و الم کے ان لمحوں میں میری دلی تعزیت قبول کرو ۔ دُرگا کو سنبھالو ۔ اومیش ۔ وجے اور ہمارے خاندان کے سب افراد تمہارے غم میں شریک ہیں اور اس ناقابل تلافی نقصان کو محسوس کرتے ہیں ، جو مہندر کی وفات سے ہمارے خاندان کو پہنچا ہے ۔ بھگوان مرحوم کی آتما کو شانتی دیں ۔ یہی دعا ہے ۔

تمہارا جگت نارائن

سیّد میر قاسم ـــــ سابق چیف منسٹر جموں و کشمیر

مہندر ناتھ کی وفات حسرت آیات پر میری دلی تعزیت قبول کیجئے ۔ آپ کے خط مورخہ ۲۷ مارچ سے مجھے اُن کے سانحہ ارتحال کی خبر پڑھ کر شدید دھچکا سا لگا ۔ مہندر ناتھ صرف ایک بڑے ادیب ہی نہیں تھے ایک بڑے انسان بھی تھے ۔ رہتی دنیا تک اُن کے رشحات قلم اردو ادب کو تازگی اور تب و تاب بخشتے رہیں گے ۔ میں آپ کے خاندان کے ساتھ شریک غم ہوں ۔

Mir Qasim

ڈاکٹر کیول کرشن ـــــ اسپیکر ودھان سبھا (چنڈی گڑھ)

آپ کے بھائی شری مہندر ناتھ کی اچانک اور بے وقت موت سے مجھے جو صدمہ پہنچا ہے وہ محسوس نہیں کیا جا سکتا ہے ۔ بیان نہیں کیا جا سکتا ۔ میں پرماتما سے پرارتھنا کرتا ہوں کہ وہ مرحوم کی آتما کو شانتی پردان کریں ۔ اور آپ کے خاندان کو اس ناقابل تلافی نقصان کو برداشت کرنے کی شکتی دیں ۔

Kewal Krishan

ڈاکٹر محمد حسن ، دہلی ۹

برادرم

بھائی مہندر کے انتقال کی خبر ابھی ابھی اخبار سے معلوم ہو کر سخت افسوس ہوا ۔ گو ایک مدت سے اُن سے ملاقات نہیں ہوئی تھی مگر ہمیشہ اُن سے قربت اور لگاؤ کا احساس رہا ۔ اُن کے افسانوں کی مہک مدتوں تک باقی رہے گی ۔ اور اُن کی رفاقت ، دوستی اور خلوص کی یاد مدتوں محفوظ رہے گی ۔ ہائے کیسا مخلص ، بے لوث اور باغ و بہار دوست چلا گیا ۔

سوگوار محمد حسن

سرلا دیوی

پھر تیرے کوچے کو جاتا ہے خیال

"میرے بچپن۔ جوانی اور چالیس کو پار کرتی عمر کی یادوں کی چادر، جو میرے بھائی مہندر ناتھ کی باتوں اور زندگی کے سنہری تاروں سے بنی ہے۔ میرے گرد اس طرح چمٹی ہوئی ہے۔ جیسے میرے جسم کی جلد۔
سچ پوچھئے تو مہندر جی کی موت کے بعد، یادوں کی اس چادر کو، جسے میں نے ہمیشہ کے لئے اوڑھ لیا ہے۔ میں ادھیڑنا نہیں چاہتی۔ لیکن یہ بھی ایک کڑوی حقیقت ہے کہ مجھے اسکو ادھیڑنا ہوگا۔ اور اس تکلیف کو سہنا ہوگا۔ ہاں اس تکلیف کو، جو جسم کی چمڑی ادھیڑنے والے کو سہنی ہوتی ہے۔ کیونکہ مہندر جی پر ایک، نمبر نکل رہا ہے۔ اور مجھے ان پر لکھنا ہے۔ ضرور لکھنا ہے۔ ان کی موت کے بعد۔
یہ نمبر نکل رہا ہے اور نکلے گا۔ افسوس صرف اتنا ہے کہ نمبر ان کی زندگی میں نہیں نکلا۔ کاش وہ بھی مسرت کے وہ چند لمحے جی لیتے جو ایک ادیب کی زندگی میں آنے چاہئیں کیونکہ وہ ادب کے لئے اپنی زندگی کی بازی لگاتا ہے۔
مہندر جی کو ایک دو سال سے یہ چاہ کچھ کچھ ہونے لگی تھی کہ ان پر نمبر نکلے۔ انھوں نے ۳۰ کے قریب کتابیں لکھیں۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ ادب کی خاطر انھوں نے نوکری نہیں کی تھی۔ بہت غم سہے خونِ جگر پیا مگر نتیجہ۔ وہی ڈھاک کے تین پات۔ سچ مانئے اس نمبر کے لئے ان کے دل میں ایک تڑپ تھی۔ ارمان تھا۔ چاہ تھی پر ان کی زندگی میں کچھ نہ ہوا۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے۔ جب موت کے بعد کسی ادیب کا نمبر نکلتا ہے۔ یا پدم شری ملتا ہے۔ یا مرنے والے کے کارناموں کا چرچا ہوتا ہے " سرلا عجیب و غریب دنیا ہے۔ اب نمبر نکل رہے ہیں، سنگ مرمر کی سمادھی بن رہی ہے۔ قبر پہ سجدے ہو رہے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں۔ جو دینا ہے بھئی زندگی میں دے دو،، بھئی اگر سنگ مرمر کا فرش نہیں دے سکتے تو سیمنٹ کا دے دو۔ مگر زندگی میں دے دو۔
لیکن مہندر جی کی باتیں کس نے سنی۔ کس نے سمجھی۔ شاید اسی لئے وہ بچپن میں پتھروں سے کھیلا کرتے تھے۔ ان سے گھنٹوں باتیں کیا کرتے تھے۔ دیواروں کو کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ ہماری ماں جی کہتی۔ ناتھ نے (مہندر جی کو وہ ناتھ پکارا کرتی تھیں) کبھی کھلونوں کے لئے ضد نہیں کی کبھی چابی والی موٹر نہیں مانگی۔ بس کچھ پتھر لئے ایک ہاتھ میں کسی پیڑ کی ٹہنی لی اور گھر کے کسی کونے میں پتھروں کو لے کر بیٹھ گئے کسی پتھر کو راجا۔ کسی پتھر کو رانی اور کسی کو غلام بنا لیا۔ اور ان سے کبھی دھیرے دھیرے بات کرتے۔ کبھی زور سے اور کبھی پتھروں کو ٹہنی سے پیٹتے"
جب ماں جی دوڑی دوڑی جاتیں اور پوچھتیں کہ کیا ہو رہا ہے۔ تو مہندر جی کہتے یہ راجا اور رانی غلام کو مار رہے ہیں میں انہیں مارنے نہیں دونگا۔

"ماں جی کہتی — بیٹا یہ تو پتھر ہیں"۔

"نہیں — مہندر جی کہتے — یہ راجہ رانی ہیں۔ آج انھیں ٹھیک کر کے رہوں گا"۔

"ہُشش۔ ایسے نہیں کہتے بیٹا۔ ہم تو راجہ کے راج میں رہ رہے ہیں۔ ایسے نہیں کہتے"۔

"نہیں — آج انھیں ٹھیک کر کے رہونگا۔

"اچھا جو جی میں آئے کر۔ تیرے کھیل ہی نرالے ہیں۔ ماں جی ہنستی چلی جاتیں۔

"آخری دم تک مہندر جی کے کھیل نرالے ہی رہے۔

جب سے ہوش سنبھالا مہندر جی اور کرشن جی کو ساتھ ساتھ دیکھا۔ کبھی اکیلا نہیں دیکھا۔ کھانا کھا رہے ہیں تو ایک تھالی میں سو رہے ہیں تو ایک بستر میں۔ دونوں کو ایک دوسرے سے بے حد پیار تھا۔ ہم نے اُن کا کبھی الگ الگ، تصور نہیں کیا۔ ماں جی ہمیشہ نوکروں سے کہا کرتیں۔ کاکوں کا کھانا لگا دے۔ کاکوں کا بستر لگا دے۔ کاکے پڑھ رہے ہیں۔ کاکوں کے دوست آئے ہیں۔

لیکن پھر بھی دونوں بھائیوں کی فطرت میں بڑا فرق تھا۔ کرشن جی گھر کے معاملوں میں دخل نہ دیتے تھے۔ زیادہ بات نہیں کرتے، لیکن مہندر جی — گھر کی ساری باتیں ان سے ہوتی تھیں۔ اور گھر کا سارا کام ان کی رائے سے ہوتا تھا (پتا جی)، کرشن جی دونوں ان کی رائے پر چلتے۔ ان کی رضا کے بنا، گھر میں پتہ تک نہ ہلتا۔

میں بہت چھوٹی تھی۔ ماں جی کو نہ جانے مکان بنانے کی کیا سوجھی۔ وہ بھی وزیر آباد میں جہاں ہمارے دادا رہتے تھے۔ ہم لوگ وہاں کبھی نہ رہے۔ ہمارے بابو جی کو مکان دوکان بنانے کا قطعی شوق نہ تھا۔ گھر میں اکثر اسی بات کو لیکر بحث ہوتی۔ بابو جی کہتے "بھلے لوکے! — میں کہتا ہوں۔ فرضی مکان بنانے کے چکر میں نہ پڑ۔ ایسے مکان بنا رہا ہوں جو زندگی بھر تیرا ساتھ دیں گے۔ ایسا نام پیدا کریں گے کہ دنیا دیکھے گی"۔

(ان کا اشارہ کرشن جی اور مہندر جی کی طرف ہوتا)

لیکن ماں جی اپنی ہٹ کی پکی تھیں۔ اس لئے انھوں نے مہندر جی کو تھام لیا۔

"بیٹا دیکھ اپنے سب رشتہ داروں کے مکان ہیں۔ اپنے پُرکھوں کے شہر میں مجھے ایک مکان ضرور بنوانا ہے۔ جس سے رشتہ دار یہ نہ کہیں کہ پیسہ رکھنا نہ آیا۔ کھایا اور اڑایا۔ تو اپنے بابو جی کو سمجھا۔ کہ مجھے مکان بنوانے سے نہ روکیں"۔

مہندر جی بابو جی کے پاس گئے۔ "آپ ڈاکٹر ہیں۔ ہر مرض کی دوا کرتے ہیں۔ سوچیے ماں جی کو بھی ایک مرض ہے جسے آپ کو ٹھیک کرنا ہے"۔

سب زور سے ہنسے، اور دوسرے دن ماں جی مکان بنوانے وزیر آباد چلی گئیں۔

لیکن — ہم بھائی بہنوں میں سے کسی نے وہ مکان نہ دیکھا۔ ہمارے بابو جی کبھی نہ گئے۔ ماں جی مہندر جی سے اصرار کرتیں کہ تو ہی مکان دیکھ آ۔ کتنا خوبصورت بنوایا ہے"۔

لیکن مہندر جی اتنا کہہ کر بات ختم کر دیتے۔ "میں تو اپنے بھائی کو دیکھتا ہوں۔ وہی میرا سب سے بڑا محل ہے۔"

دسویں تک مہندر جی پونچھ میں پڑھے۔ پھر کرشن جی کے ساتھ لاہور چلے آئے۔ گھر جیسے ویران ہو گیا۔ بابو جی کے پاس میں اور میرا چھوٹا بھائی ادم رہ گئے۔ ماں جی اکثر پنجاب رہا کرتی تھیں جہاں ان کے بھائی بہن تھے۔ آج کسی کی شادی میں، کل کسی کی غمی میں،

اوم اسکول پڑھنے چلا جاتا ۔ پونچھ میں لڑکیوں کا اسکول پانچویں تک تھا ۔ میں پانچویں کے بعد کیا کروں ۔ میں نے مہندر جی کو لکھا ۔ میرا بھی کچھ سوچئے ۔ مجھے بھی لاہور بُلا لو ۔ میں بھی پڑھنا چاہتی ہوں ۔

بھائی صاحب نے جواب دیا ۔ میرا تم بہت چھوٹی ہو ۔ تمہیں یہاں کہاں بلاؤں ۔ لیکن گارنٹی کی بات ہے کہ تمہارے بڑے ہونے تک بہت بھاری انقلاب آئے گا ۔ لڑکی کو پڑھنے کے لئے ۔ اپنے بھائی یا ماں کی منت کرنی نہیں پڑے گی ۔ تب اندھیرا پاش پاش ہو جائے گا ۔ اور روشنی خود تم لوگوں کے قدم چومے گی ۔ لیکن انقلاب کے لئے لگاتار جد و جہد کی ضرورت ہے ۔

"میں نے پہلی بار انقلاب کا لفظ مہندر جی سے سُنا ۔ مہندر جی نے اس خط میں لکھا تم اوم سے خالی وقت میں اُردو ۔ پڑھنا سیکھو خالی بیٹھنے سے انقلاب نہیں آتا ۔" اور انھوں نے مجھے خالی بیٹھنے نہیں دیا ۔ وہ لاہور سے میرے لئے اُردو میں پریوں کی کتابیں بھیجتے اور لکھتے کہ انہیں پڑھ کر رکھنا جب ہم چھٹیوں میں گھر آئیں گے تو تم سے لفظ بہ لفظ سُنیں گے ۔

تو اردو میں نے اسطرح مہندر جی کے اُکسانے سے سیکھی ۔

بھائی لوگ گھر آئے تو میں مہندر جی سے رات کو کہانیاں سُنانے کو کہتی ۔ مہندر جی کہتے میں بھوت پریت کی کہانیاں سناؤں گا ۔ تم پریوں کی سنانا ۔

نہیں بھا پا جی ۔ بھوت پریتوں کی نہیں ۔ ہمیں ڈر لگے گا ۔

"جو ڈرا سو مرا" وہ کہتے "ویسے بھوت پریت نام کی کوئی چیز نہیں ۔ لیکن زندگی بڑی سنگین ہے ۔ سب کچھ سننے کے لئے دل کو تیار رکھنا چاہئیے ۔"

شاید انہیں دنوں کی بات ہے ۔ ایک دن مہندر جی کا لاہور سے پونچھ میں تار آیا "کرشن جی کہیں لاہور سے باہر چلے گئے ہیں ۔ میں ان کے یوں چُپ چاپ چلے جانے سے اکیلا رہ گیا ہوں ۔ نہ معلوم میرا بھائی مجھ سے روٹھ کر کہاں چلا گیا ۔"

یہ تار پڑھ کر ہم سب پتھر سے ہو گئے ۔ زندگی بہت سنگین ہے ۔ اس کا مطلب سمجھ میں آنے لگا ۔ ماں جی پاگل سی ہو گئیں ۔ مہندر جی دلاسا دیتے ۔ "میرا بھائی جینیس ہے ۔ ماحول راس نہیں آیا ۔ لیکن میری ہمت اور آپ کی ممتا اُسے ضرور ہمارے پاس واپس لائے گی ۔"

جب تک کرشن جی واپس نہیں آئے ، مہندر جی کالج نہیں گئے ۔

لیکن میرا یہ ڈھارس دینے والا بھائی آج کہیں دکھائی نہیں دیتا ۔ آنکھ آنسو سے بھری ہے ۔ کرشن جی ٹوٹے ہوئے پھرتے ہیں ۔ دھیرج دینے والا وہ بھائی کہاں گیا ۔ وہ ہماری طرف مڑ کر نہیں دیکھتا ۔ میں مُڑ کر پیچھے دیکھتی ہوں ،

بھائی صاحب کے واپس آجانے پر ماں جی بھی اُن کے ساتھ لاہور چلی گئیں ۔ اور میں بھی ، زندگی میں کبھی کبھی آ گئی ۔ قہقہے گونجتے رہتے ۔ ایف اے تک مہندر جی کا قد چھوٹا تھا ۔ کسی نے گینٹھا ۔ کہدیا ۔ بس بات دل کو لگ گئی ۔ دوسرے ہی دن ورزش کے لئے مگدر وغیرہ خرید لائے ۔ ڈنڈ پیلے اور طرح طرح کی ورزشیں کیں ایک سال میں قد کو سرو کے پیڑ کی طرح لمبا کر لیا ۔ ہمارے گھر میں وہی سب سے خوبصورت تھے ۔

مہندر جی کو انھیں دنوں پتنگ اُڑانے کا شوق چرایا لیکن کرشن جی اس کے بالکل خلاف تھے ۔ وہ مہندر جی کو سمجھاتے تم کیا آٹھوں پہر پتنگ بازی کے چکر میں پڑے رہتے ہو ۔ لیکن مہندر جی نہ مانتے ایک دن دونوں بھائیوں میں مار پیٹ ہو گئی ۔ ایک دوسرے پر میز کرسیاں پھینکیں ۔ آخر مہندر جی نے ان سے پوچھا ۔ آپ پتنگ اُڑانے سے روکتے کیوں ہیں ۔ ؟

"بھئی اگر ڈور سے تمہارا انگوٹھا کٹ گیا۔ دراصل میں تمہاری انگلی میں خون بہتا نہیں دیکھ سکتا۔

یہ بات ہے؟ تب آج سے پتنگ بازی بند" مہندر جی کرشن جی کے گلے سے لپٹ گئے۔ یہ تھی ان کی محبت۔

ایک دفعہ کرشن جی کو یرقان ہوگیا۔ ہم لوگ پونچھ کی تحصیل مہنڈر میں تھے کرشن جی کالج سے چھٹی لے کر گھر آگئے۔ دو دن بعد مہندر جی بھی اپنا سامان لے کر گھر آگئے۔ ماں جی اور بابو جی نے کہا ناتھ تمہارے امتحان کے دن نزدیک آرہے ہیں اور تم یہاں چلے آئے۔؟

"ماں جی میرا بھائی بستر پہ بیمار پڑا ہے اور میں اس سے دور رہوں۔ یہ نہیں ہو سکتا!

کرشن جی کی بیماری لمبی ہوگئی۔ یرقان ٹھیک ہونے میں نہ آیا۔ ماہ گذر گئے ماں جی اور بابو جی فکرمند رہتے۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ مہندر جی مکان کے باہر کی دیوار کے ساتھ لگے رو رہے تھے۔ اور رو رو کر کہہ رہے تھے۔ بھگوان میرے بھائی کو ٹھیک کر دے۔۔ میں سچ کہتا ہوں میں اس کے بنا نہیں رہ سکتا۔

معلوم نہیں دعا کا اثر یا دوا کا۔ کرشن جی ٹھیک ہوتے گئے۔

پھر دونوں بھائی لاہور چلے گئے۔ اس سال کرشن جی پاس ہو گئے اور مہندر جی فیل، ماں جی نے فیصلہ کیا کہ ناتھ فیل ہوگیا اس لئے کرشن جی کے پاس ہونے کے لڈو شہر میں نہ بانٹوں گی۔

لیکن مہندر جی نے جھٹ سے نئے کپڑے پہنے اور ماں جی سے کہا۔ "ماں جی لڈو بانٹئے کیا ہوا میں فیل ہوگیا۔ میرا بڑا بھائی تو پاس ہوگیا۔ جو گھر میں بڑا ہے وہ تو پھل پھول رہا ہے۔ ہم سب تو اس کی چھایا ہیں!

گھر میں ایک دم خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ماں جی نے شہر میں لڈو بانٹ دیئے۔

کرشن جی نے ایم اے کیا، پھر ایل ایل بی پاس کر لیا۔ اور مہندر جی ایم اے تک پڑھے۔ کرشن جی پونچھ میں نوکری کرنا نہیں چاہتے تھے۔ بابو جی چاہتے تھے مہندر جی تو پونچھ میں رہیں۔ انھیں کے نام پہ انھوں نے "مہندرا میڈیکل ہال کھولا۔ لیکن مہندر جی نے صاف کہدیا۔ میں ڈاکٹر نہیں ہوں۔ کلینک میں نہیں بیٹھوں گا۔ "نیم حکیم خطرۂ جان کی کہاوت نہیں دہراؤں گا۔" انھوں نے کہاوت نہیں دہرائی۔

دونوں بھائی جوان ہو گئے تھے۔ ماں جی کو ان کی شادی کی فکر ستانے لگی۔ مہندر جی کے لئے پونچھ کے امیر خاندان کی خوبصورت لڑکی کا رشتہ آیا۔ لیکن مہندر جی نے صاف منع کر دیا۔ پہلے بڑے بھائی کی شادی ہو جائے۔ پھر میرا سوال اٹھے گا۔

ماں جی بہت دن تک سمجھاتی رہیں "ناتھ لڑکی بہت خوبصورت ہے گھر بہت اچھا ہے۔ ابھی شادی کی نہیں۔ سگائی کی بات ہے۔ تم سگائی کر لو۔ آخر ایک دن مہندر جی نے اپنے دل کی بات کہدی۔ "ماں جی اصل بات یہ ہے کہ میں شادی وادی کے بکھیڑے میں پڑنا نہیں چاہتا۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔

اس لڑکی کو میں اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ میری پیاری سہیلی تھی۔ ماں جی نے لڑکی والوں کو نہ جانے کیوں دو ٹوک جواب نہ دیا وہ دو سال تک آس لگائے رہے۔ لڑکی بھی مہندر جی کو بہت چاہنے لگی۔ اور جب بھی میرے ساتھ ہوتی۔ مہندر جی کی بات کرتی رہتی۔ مہندر جی کی کہانی "چاندی کے تار" اور ناول "رات اندھیری" کا ایک حصہ اسی کے بارے میں ہے۔

کرشن جی کی شادی کے بعد ہم سب دہلی میں آگئے۔ مہندر جی نے کہانی، ناول اور ڈرامے لکھنے شروع کئے۔ وہ مشہور ہونے لگے۔ یہ بات شاید ۱۹۴۷ء کے قریب کی ہے۔ ماں جی کہتی۔ ناتھ تم لکھنا دکھنا چھوڑ کر نوکری کر لو۔ مہندر جی نے انکار کیا۔ ماں جی

بہت پیچھے پڑیں تو امتحان دے دیا۔ پاس بھی ہو گئے لیکن نوکری نہیں کی۔

" کرشن جی کا تبادلہ لکھنؤ ہوا۔ مہندر جی بستر باندھ کر تیار ہو گئے۔ ماں جی نے کہا " تم لکھنؤ مت جاؤ۔ کیا تم بھائی کے پچھ لگو ہو۔ انھوں نے جواب دیا۔ ہاں مجھے اپنے بھائی کا پچھ لگو ہونے پر ناز ہے "

پھر بڑے بھائی صاحب پونہ چلے گئے۔ مہندر جی بھی پونہ چلے گئے۔ پھر کرشن جی بمبئی آ گئے۔ مہندر جی بھی انکے ساتھ ہی بمبئی آ گئے۔ دونوں بھائیوں نے فلم کا دھندا شروع کیا۔ بھائی صاحب نے فلم بنائی "سرائے کے باہر" اور "راکھ"۔ مہندر جی ہیرو بنے "

ایک دن ماں جی نے شوٹنگ دیکھنے پر اصرار کیا۔ دیکھوں تم وہاں کیا کرتے ہو۔ ماں جی شوٹنگ سے واپس آئیں تو رونے لگیں " ناتھ تم منھ پہ رنگ پوت کر سوانگ کرو گے۔ تم تو افسر بنتے۔ یہ تو بہروپیا کا کام ہے۔

مہندر جی نے جھٹ جواب دیا۔ ماں جی۔ کیا آپ روز گیتا میں یہ نہیں پڑھتیں کہ یہ دنیا ایک سوانگ ہے۔ ایک تماشہ ہے اور ہم سب بہروپیا ہیں ؟۔ پھر اس کام میں کیا دوش ہوا ؟ دوش نہیں ہوا !

ماں جی خاموش ہو گئیں مگر پھر فوراً بول اٹھیں۔ اچھا تو شادی کر لے۔ سات پھیرے لے لے کسی لڑکی سے۔ وہ تمہیں باندھ لے گی۔

" ماں پھیرے لینے سے کیا ہوتا ہے۔ کیا انسان کسی لڑکی سے بندھ جاتا ہے " مہندر جی بولے۔ سات پھیرے لے کر اگر میں لڑکی کو چھوڑ دوں تو اس کی کوئی گارنٹی ہے۔ یہ بندھن تو من کا ہوتا ہے۔ جس دن میں کسی لڑکی کے ساتھ بندھ جاؤں گا۔ سات پھیروں کی بھی ضرورت نہ رہے گی۔

اور یہی ہوا۔ انھیں دنوں میں نے درگا بھابھی کو دیکھا۔ کرشن جی کے لڑکے رنجن کا جنم دن تھا درگا بھابی نے لال ساری پہن رکھی تھی۔ دونوں کلائیوں میں دھانی رنگ کی چوڑیاں جھنجھنا رہی تھی۔ بات بات پہ قہقہے لگا رہی تھیں۔ میوزک ڈائرکٹر دتا صاحب کی بیوی نے بتایا۔ یہی مہندر جی کو باندھ کر رکھے گی سرلا۔

قسمت کی ضد یا اس کا پھیر۔ دونوں بھائیوں نے جو فلم بنائی فیل ہوئی "سرائے کے باہر" دلی میں ریلیز ہوئی تو اگلے دن سے فساد شروع ہو گئے۔ دوسری فلم ڈبے سے باہر ہی نہ نکلی۔ اس ناکامیابی کا اثر مہندر جی کی زندگی پر زیادہ پڑا۔ تنگی کے دن شروع ہو گئے۔ لیکن انھوں نے گلہ یا شکوہ نہ کیا۔ آشاوادی ہو کر خط لکھتے رہے۔ سرلا فلمی دنیا ہے ہی ایسی۔ کبھی نرم کبھی گرم۔

" ماں جی بمبئی لکھتیں۔ " ناتھ ایک لڑکی کا باپ ہے کہتا ہے۔ بہت اچھی نوکری دلواؤں گا۔ بس میری لڑکی کا رشتہ لے لو۔ مہندر جی فوراً جواب دیتے " ماں جی آپ کا بیٹا چند سکوں کے لئے نہیں بکے گا۔ فی الحال میری شادی کی بات چھوڑ کر سرلا کی شادی کی فکر کیجئے "!

میں گھر میں کھل کر بس مہندر جی سے بات کرتی تھی۔ وہ بھی اپنی باتیں مجھ سے کرتے تھے۔ اپنے عشق کی داستانیں تک سناتے تھے۔ اپنے عشق کا اقبال میں نے سب سے پہلے مہندر جی ہی سے کیا۔

بمبئی میں میرے لئے وہ شام بڑی اداس اور خاموش تھی۔ میرے سامنے ناریل اور چیکو کے پیڑ مستی میں سمندر کی ہوا میں جھوم رہے تھے۔ میں گوندر لاج کے وسیع برآمدے میں اکیلی کھڑی تھی۔ بے حد فکر مند تھی کیونکہ دوسرے دن میرا بیاہ

سنائی ہونے والی تھی۔ اچانک میں نے دیکھا مہندر جی آ کھڑے ہوئے ہیں۔

"سرلا یہاں اکیلی کیوں کھڑی ہو؟"

"یونہی"

"نہیں، ضرور کوئی بات ہے۔ بتاؤ۔"

میں نے دل کڑا کر کے مہندر جی سے کہدیا "بھائی صاحب جی میں یہاں قطعی شادی نہیں کروں گی۔"

"کیوں نہیں کرو گی۔ کوئی وجہ تو ہوگی۔"

میں خاموش ہوگئی۔

"یہاں تک ہمت کی ہے تو آگے بھی بڑھو۔ صاف صاف بتا دو۔ لیکن جھوٹ نہیں بولنا۔"

میں نے ڈر کر کہا "میرا ارادہ ریوتی جی سے شادی کرنے کا ہے۔"

"ٹھیک ہے" مہندر جی نے کہا۔

لیکن ماں جی نہیں مانیں گی۔ کیونکہ وہ برہمن ہیں۔

"ریوتی جی کے ماں باپ بھی کہاں مانیں گے۔ لیکن ٹھیک ہو جائے گا۔ تم جا کر آرام کرو۔ میں سب سنبھال لوں گا۔"

میری ماں جی۔ باپو جی اور کرشن جی کو انھوں نے منا لیا۔ مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہ پڑی۔ یہ بات نہ تھی کہ انھیں صرف مجھ سے محبت تھی۔ وہ ہر آدمی کے جذبے کی عزت کرتے تھے۔

مہندر جی کے کچھ آدرش تھے جن کے اوپر وہ ساری عمر قائم رہے۔ وہ ایسے آدمی نہ تھے جو کہتے کچھ ہیں کرتے کچھ ہیں۔ ان کا دل بہت بڑا تھا۔ دوسرے کا درد اپنا درد سمجھتے تھے۔ دوسروں کی غریبی کا کبھی مذاق نہ اڑاتے تھے۔ جو بن پڑتا تھا کرتے تھے لیکن اس کا ڈھنڈورا نہ پیٹتے تھے۔ ایک بار میں لگا تار دو ماہ ان کے پاس رہی۔ میں نے دیکھا چار کے وقت بھی دو چار آدمی ہوتے ہیں۔ کھانے کے وقت بھی اور سب کو اسی محبت سے کھانا کھلایا جاتا ہے۔ اگر چپاتی ختم ہوگئی تو ڈبل روٹی منگا لی جاتی ہے۔ کئی بار ہم لوگ کہتے "عجیب لوگ ہیں عین کھانے کے وقت آدھمکتے ہیں۔ ادھار کھایا ہے کیا آپ نے اسکا؟" جواب دیتے "بھائی یہ فلمی دنیا ہے بس ایک دلدل ہے۔ دلدل۔ جو پھنستا ہے۔ پھنستا ہی چلا جاتا ہے۔ ویسے یہ لوگ کوئی ایسے ویسے نہیں ہیں۔ پڑھے لکھے اور سمجھدار لوگ ہیں۔ ان کا کوئی قصور نہیں۔ جو کام نہیں بنتا۔ دن بھر کام کی تلاش میں گھومنا پڑتا ہے۔ کھالو تو کیا فرق پڑتا ہے مجھے کیا بلڈنگ کھڑی کرنی ہے۔!

انھیں دنوں کی بات ہے۔ میں صبح اٹھی تو دیکھا کمرے کے باہر ایک آدمی تولیا باندھے کھڑا ہے۔ اور مہندر جی اسے روپے دے رہے ہیں۔ میں نے کہا کون تھا بھائی صاحب" "تھا کوئی مصیبت کا مارا۔ اور مہندر جی خاموش سے اخبار دیکھنے لگے تھوڑی دیر بعد وہ آدمی، پینٹ قمیض پہن کر کمرے میں داخل ہوا۔ درگا بھابی چائے لے آئیں۔ سب نے ساتھ چائے پی۔ جب وہ آدمی چلا گیا تو میں نے کہا "یہ کیا۔ ابھی تو یہ آدمی تولیہ باندھے کھڑا تھا۔ مہندر جی نے بتایا۔ ایک افسانہ نگار ہے۔ اس فلمی دنیا نے کیا گت بنا دی ہے۔ بے چارے کے پاس ایک پینٹ اور قمیص رہ گئی ہے۔ لانڈری پر دھونے کو دی کیونکہ ایک پروڈیوسر نے کہانی سننے کے لئے بلایا ہے۔ چونکہ لانڈری والے کو دینے کے لئے پیسے نہیں تھے۔ اس نے تولیہ باندھے پھر رہا تھا۔"

"آپنے اُسے پیسے دیئے۔"

"کون سا قارون کا خزانہ دیا۔ مجھے تو بس یہ فکر ہے کہ بیچارے کا کام بننا چاہیئے۔

انھوں نے اپنے لئے کبھی نہیں سوچا۔

ماں جی اگر کہتیں "ناتھ تمہارے اگر ایک بچہ ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔" تو وہ فوراً بول پڑتے "بھائی صاحب کے بچے۔ سرلا کے بچے۔ آدم کے بچے کیا میرے بچے نہیں ہیں؟۔ پھر ماں جی جس دور سے ہم گذر رہے ہیں۔ اس دور میں بچے پیدا کرنا گناہ ہے۔ اپنے ساتھ بھی بچوں کے ساتھ بھی"

جب کبھی اُن پر کڑکی کے دِن آتے۔ میں کہتی بھائی صاحب آپ اپنے فلاں دوست سے کہئیے آج کل لاکھوں کما رہا ہے آپ کو بھی کام دلوا دے"

وہ جواب دیتے۔ "سرلا۔ اپنے بھائی کے سوا کسی سے نہیں کہوں گا کہ میرے پے کیا گذر رہی ہے۔ پھر میرے عزیز دوستوں کو کیا دکھائی نہیں دیتا۔ کہ میرے پاس کوئی کام نہیں ہے؟

اس معاملہ میں مہندر جی بہت خوددار تھے۔ تکلیف سہہ لیتے تھے لیکن اُف نہیں کرتے تھے۔ لیکن دوسرے کی تکلیف ان سے سہی نہیں جاتی تھی۔ ایک بار مشہور شاعر میراجی سخت بیمار ہو گئے۔ ڈاکٹر نے کہا میراجی کی جان بچانے کے لئے خون کی سخت ضرورت ہے۔

"مہندر جی افسانہ نگاروں میں پہلے آدمی تھے جنھوں نے اپنا خون دے کر اس وقت میراجی کی جان بچائی تھی۔

مہمان نوازی اُن کا دھرم تھا۔ ایمان تھا۔ کچھ ایسی باتیں انسان کی زندگی میں ہو جاتی ہیں جو بھولے سے بھی نہیں بھولتیں؛ کوئی آٹھ نو سال پُرانی بات ہے۔ میں دو ماہ سے بیمار تھی مہندر جی نے کئی خط لکھے۔ سرلا تم میرے پاس آجاؤ یہاں آکر تم ضرور ٹھیک ہو جاؤ گی۔ متواتر اصرار کرکے انھوں نے مجھے اپنے پاس بلالیا۔ میرے دونوں بچے بھی میرے ساتھ تھے۔ مجھے وہاں جاکر پتہ چلا کہ مہندر جی کا کام مندہ ہے۔ کوئی نیا فلم لکھنے کا کنٹریکٹ اُن کے پاس نہیں کہانیاں اور ناول لکھ لکھ کر وہ گذارہ کر رہے تھے۔ خالی لکھنے سے یہاں کس کا پیٹ بھرا ہے۔ اس لئے مجھے بے حد شرمندگی کا احساس ہوا۔ میں دِل ہی دل میں اپنے کو کوس رہی تھی کہ میں کیوں آگئی۔ یہ مہندر جی۔ کبھی سہہ نہیں سکتے تھے کہ میں اُن کے پاس رہ کر اپنا کچھ خرچہ کروں۔

انہیں دنوں ہمارے نزدیک کے ایک رشتہ دار بھی بمبئی گھومنے چلے آئے۔ ٹھہرے تو وہ کہیں اور۔ لیکن ایک دِن کوئی بیس آدمیوں کا قافلہ مہندر جی کے گھر آدھمکا۔ اُن کی فرمائش ہوئی کہ انہیں کسی فلم کی شوٹنگ دکھائی جائے۔ کیونکہ انھوں نے شوٹنگ نہیں دیکھی ہے۔

مہندر جی نے بڑے پیار اور محبت سے اُن کی فرمائش قبول کرلی۔ پہلے چائے کے ساتھ انہیں مٹھائی سموسے پھل کھلائے پھر انہیں شوٹنگ دیکھنے کے بعد کھانے کی دعوت دے ڈالی۔

مجھے بے حد رلائی آئی۔ بھائی صاحب کو کیا لٹنے کا شوق چرایا ہے۔ ان رشتہ داروں نے تو انھیں کبھی ایک کپ چائے کا نہیں پوچھا اور یہ اُن کی آؤ بھگت کئے جا رہے ہیں۔

لیکن مہندر جی کا کہنا تھا۔" سرلا یہ کتنی آس لے کر میرے پاس آئے ہیں۔ مجھے اپنا سمجھ کر ہی تو یہ اتنا بے تکلف ہوئے ہیں۔ ورنہ کھاتے پیتے لوگ ہیں۔ کہیں اور بھی جا سکتے تھے۔" بھائی صاحب نے گرینڈ دعوت دی اور دعوت کے درمیان مہندر جی کے مذاق اور درگا بھابھی کے قہقہوں نے دعوت کو بڑا پُرلطف بنا دیا۔ میں نے سوچا مہندر جی نے کیسے اتنی کڑکی کے دِنوں میں روپوں کا انتظام کرلیا۔ صرف چند گھنٹوں میں۔ کیونکہ اُن دِنوں کرشن جی انڈیا سے باہر گئے ہوئے تھے۔

لیکن صبح ہوئی تو میں نے دیکھا درگا بھابھی کے ہاتھ کا ایک کنگن کلائی سے غائب تھا۔ میری سمجھ میں سب کچھ آگیا اور ایک دم

میرا چہرہ اُتر گیا - پر مہندر جی اور درگا بھابھی کے چہروں پر کوئی شکن نہ تھی - بلکہ پہلے سے زیادہ روشن تھے -

" ایسی بھی کیا مہمان نوازی - کہ بیوی کا زیور تک بک جائے ." میں نے مہندر جی سے کہا -

" مہندر جی اور درگا بھابھی دونوں ایک سُر سے بول اُٹھے . گنگن تو کبھی بھی بن سکتے ہیں لیکن یہ لوگ جس پیار اور بھروسے کا سہارا لیکر میرے گھر آئے تھے - جس گھڑی یہ سہارا ختم ہو جاتا سرلا میں اُسی دن پوری طرح لُٹ جاتا - مر جاتا - میں ایسے مرنا نہیں چاہتا - ایسا تھا میرا بھائی مہندر -

ابھی پچھلے سال ۱۹۷۳ء میں اُنھوں نے بڑے بھائی صاحب پر ایک ڈاکیو منٹری بنائی - اُنھیں کشمیر اور پونچھ میں جاکر شوٹنگ کرنی تھی - وہ مجھے ریوتی جی کو میرے چھوٹے بھائی اوم کو خط پر خط لکھتے رہے کہ سب کشمیر چلنے کے لئے تیار رہو - وہ ساتھ میں یہ بھی لکھتے کہ تم لوگوں کے انکار کا سوال ہی نہیں اٹھتا - دیکھو اکٹھے جائیں گے تو مجھے بہت ہی اچھا لگے گا - جس جگہ اپنا بچپن اور جوانی گذاری ہے - اُسے ۳۰ سال کے بعد پھر دیکھنا نصیب ہو رہا ہے - نہ جانے آگے کبھی ایسے اکٹھے جانے کا موقع ملے یا نہ ملے -

ریوتی جی نے لکھا کہ سرلا تمہارے ساتھ چلی جائے گی میں نہ جا سکوں گا ." کیوں کہ اُنہی دنوں ریوتی جی کو بھارتیہ ناٹیہ سنگھ کی طرف سے روس جانا پڑ رہا تھا - مہندر جی نے لکھا " یار لگتا ہے تمہیں میرے ساتھ سے روس جانا زیادہ پسند ہے - دیکھو روس تو تم پھر بھی جا سکو گے - لیکن یہ ہم سب کا اکٹھے پونچھ جانا کبھی نہیں ہو سکے گا - یہ کیا انکی پیشین گوئی تھی - ؟

کوئی ۲۲ آدمیوں کا قافلہ لے کے وہ جمو کشمیر گئے تھے - انھیں جو ڈاکیو منٹری سے بچانا تھا وہ بھی سب پر خرچ کر آئے اُلٹا قرضدار ہو گئے ، خرچ کی بات ہوتی تو کہتے " خرچ تو ہوتا ہی رہتا ہے - اور ہوتا ہی رہے گا - لیکن ہم سب بھائی بہن پریوار سمیت کبھی کشمیر کی وادی اور پونچھ کے دریا کے شفاف پانی اور اپنے اسکول کے ماسٹر کو نہ دیکھپاتے - یہ پہاڑ یہ جنگل یہ چیڑ کے سنساتے پیڑ یہ جھرنے بہت سندر کہانیاں کہتے ہیں - سرلا کوئی ان کی آواز کو پہچانے تو پتھر سے ہیرا بن جائے -

کشمیر میں سب نے کچھ نہ کچھ لیا - مہندر جی اپنے لئے کچھ نہیں لیا - میں نے کہا بھائی صاحب آپ کم سے کم ایک مفلر ہی لیجئے اور کچھ نہیں لینا تو " وہ بولے " نہیں سرلا - میں کچھ نہیں اپنے لئے خریدوں گا ——————— کیونکہ بمبئی میں گرم کپڑے کی ضرورت ہی نہیں - بیکار ہیں اپنے لئے خریدنا - مجھے پسند نہیں -

کرشن جی کے اوپر ڈاکیو منٹری جن دنوں تیار ہو رہی تھی ' وہ بے حد خوش تھے - میں اور ریوتی جی ان کے مرنے سے ایک ماہ پہلے اُن کے ساتھ بمبئی میں بیس روز رہے -

اکثر کہتے - سرلا لگتا ہے دن پھرنے والے ہیں - تین چار پکچر ہاتھ میں ہیں - من چلی (پکچر کا نام) بھی خوب چل رہی ہے - اور دیکھو دو تین ڈاکیو منٹری بنانے کا آفر آنے والا ہے - اب میری صحت بھی ٹھیک ہے - نہ زکام ہوتا ہے - نہ پیٹ خراب ، ایک عجیب سی جو لے جینی تھی اب ختم ہو گئی ہے - یہ سب شراب اور سگریٹ چھوڑنے سے ہوا ہے سرلا - ڈاکٹر نے کہا ہے کہ تم کو سگریٹ اور شراب نہیں پینا چاہیئے - اب میں نے چھ ماہ سے شراب اور سگریٹ بھی چھوڑ دیا - ایک دل ہی تو ہے میرے پاس - اس کی چنتا مت کرو -

میں کہتی بھائی صاحب آپ کی کِڈنی میں پتھری ہے - اس کا علاج ہونا چاہیئے سرلا ویسے یہ دنیا فانی ہے - مرنا سبھی کو ہے اب مجھے مرنے سے ڈر نہیں لگتا -"

" میں کہتی بھائی صاحب آپ ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں - آپ ۱۰۰ سال تک جیئیں -

۔ نہیں سرلا میں اتنا بڈھا ہو کر مرنا نہیں چاہتا۔ سچ پوچھو تو میں کام کرتے کرتے مرنا چاہتا ہوں۔ کسی کا محتاج ہو کر نہیں۔"

جب ہم واپس دہلی آنے لگے تو کہنے لگے تم اور ریوتی میرے پاس آتے ہو تو مجھے کتنا سکھ ملتا ہے۔ میں کتنا خوش قسمت ہوں کہ تم مجھے اس قدر چاہتے ہو۔ سچ مجھے ایسا احساس ہوتا ہے کہ میں چھپرا بلڈنگ میں نہیں رہ رہا ہوں۔ بلکہ ایک عالیشان مکان میں رہ رہا ہوں۔ ارے اُس محل کو بھی کیا کرنا، جہاں کوئی قدم رکھنے سے بھی ڈرے۔

اسٹیشن پر چھوڑنے آئے تو بولے۔ "سرلا ایسے ہی آیا کرو۔ بڑی ہنسی خوشی سے یہ دن بیت گئے"۔ اور بھائی صاحب نے مجھے اپنے گلے سے لگا لیا۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ درگا بھابھی کی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں یہ میری مہندر جی سے آخری ملاقات تھی۔

پھر ایک ماہ میں اُن کے ریوتی جی کے نام۔ میرے نام پانچ خط آئے۔ ریوتی جی کو اپنے اس نمبر کے بارے میں لکھتے۔ مجھے بھائی صاحب کی راضی خوشی اپنی صحت کے بارے میں اور میرے بچوں کی خیر پوچھتے۔

۱۹ مارچ کو مجھے اُن کا آخری خط ملا۔ جس میں لکھا تھا۔ کرشن جی ۲۰ مارچ کو دہلی پہنچ رہے ہیں۔ اور ۲۰ مارچ کو وہ بیمار پڑے اور ۲۵ مارچ کو ہی وہ چل بسے۔

مجھے بیماری کی خبر ملی مرنے کی نہیں۔ لیکن جب بمبئی کے اسٹیشن پر پہنچے تو عجیب سی ویرانی مجھے اسٹیشن پر دیکھنے کو ملی گو آدمیوں کی بھیڑ کا شور ویسے ہی تھا۔ سب کچھ تو ویسا ہی تھا۔ لیکن پھر بھی دن کے اُجالے میں اداس اداس شام گھر آئی تھی۔ میرے قدم اُٹھتے ہی نہیں تھے۔

"کوئی اسٹیشن پر نہیں آیا" میں ریوتی جی سے بولی۔

"سب ہسپتال میں ہونگے۔ مہندر جی کے پاس"

"انھوں نے جھوٹ بولا۔ وہ سچ جانتے تھے کہ مہندر جی ہسپتال کیا۔ دنیا میں نہیں ہے۔ جس کوچہ کو جا رہی ہوں اُجڑ گیا۔

سلمیٰ صدیقی

ایک خوبصورت آدمی

مہندر جی کو میں نے پہلی بار دہلی میں اُن کے سب سے چھوٹے بھائی اہندر ناتھ (ادم) کی شادی کے موقع پر دیکھا تھا وہ دسمبر ۱۹۵۷ء کی آخری تاریخوں میں سے ایک تھی۔ سردی عروج پر تھی۔ تیس ہزاری دہلی کے ایک چھوٹے سے محلے میں کرشن جی کی والدہ کے گھر پہ بارات کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ گھر کے باہر ایک وسیع میدان میں شامیانہ لگا تھا، ڈھولک کی تھاپ، بچوں کے شور وغل اور عورتوں کی ہنسی کی آوازیں دور سے سنائی دے رہی تھیں...... کرشن جی مہمانوں کی مدارات میں مصروف کچھ گھبرائے بوکھلائے، کھانستے کھنکارتے اِدھر سے اُدھر گھوم رہے تھے۔ اسی وقت مجھ سے کسی نے سرگوشی میں کہا۔

"وہ مہندر ناتھ ہیں، میں نے بھی اسی قدر آہستہ سے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ مہندر جی سیاہ گرم سوٹ پہنے ہوئے، کالر میں ایک چھوٹا سا پھول لگائے عورتوں کے جھرمٹ میں کھڑے تھے ___ "اچھا تو یہی مہندر ناتھ ہیں...... کرشن جی کے بھائی، میں نے کہا ___ اسی وقت کسی طرف سے کرشن جی اُدھر آنکلے.........

مجھ سے پوچھا "آپ مہندر جی سے ملیں؟

میں نے کہا "ملی تو نہیں لیکن دیکھ لیا ہے.........

کرشن جی خوش ہو کے بولے "آپ نے دیکھا مہندر کس قدر خوبصورت ہے.........؟

"ارے واہ ...... یہ بھی کوئی بات ہوئی ......"، میں نے سوچا۔

"جیسے ہم نے آخر تک کوئی خوبصورت آدمی دیکھا ہی نہیں تھا.........

۱۹ر مارچ ۱۹۶۹ء کی ایک رات ___ کرشن جی کو قلب کا دوسرا دورہ پڑ گیا تھا۔ پورا دن ڈاکٹروں عزیزوں اور دوستوں نے انتہائی پریشانی میں گزارا تھا۔

کرشن جی کو پیتھے ڈین کا انجکشن دے کے سُلا دیا گیا تھا ___ لیکن ڈاکٹر مطمئن نہیں تھے۔ تسلی اور تشفی کے رسمی الفاظ اپنا مطلب کھو چکے تھے۔ آدھی رات اِدھر آدھی رات اُدھر کمرے میں سناٹا تھا۔ تیماردار دم بخود تھے۔ میں نے خاموشی سے کرشن جی کی طرف دیکھا وہ غفلت کی حالت میں ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ کہہ رہے تھے۔ نرس نے انجکشن کی سوئی سنبھالی ۔ میں نے جھک کر سُننا چاہا کہ کرشن جی کیا کہہ رہے ہیں...... کچھ نہ سن سکی۔

لیکن کرشن جی کی انگلیاں اپنے شفاف بستر کی سفید اور چکنی سطح پر کچھ لکھ رہی تھیں۔...... بالکل اسی طرح جیسے وہ تندرستی کی حالت میں اپنے خوبصورت شفاف بیڈ کی چکنی سطح پر لکھتے تھے .... پتہ نہیں مجھے کیا ہوا، دن بھر کے تمام صبر و قرار کے بندھن ٹوٹ گئے .... میں کمرے سے بھاگتی ہوئی باہر نکل آئی .... گھر کے باہر کمرے کی کھڑکی کے پیچھے نیم اندھیرے میں ایک سایہ پہلے سے وہاں موجود تھا .... وہ مہندر جی تھے .... میں نے گھبرا کے مہندر جی کا ہات تھام لیا .... اور پتہ نہیں اُن سے کیا کہا .... مہندر جی خاموشی سے مجھے سہارا دے کر برآمدے میں لے آئے۔ میں بیٹھ گئی تو خود بھی ایک کرسی پہ بیٹھ گئے۔ پھر ایک سگریٹ سلگائی .... آنکھیں بند کر کے دو تین منٹ تک چپ چاپ نیم دراز رہے۔ پھر جیسے کسی فیصلہ کن نتیجے پر پہونچ گئے ہوں ـــــ کرسی سے اُٹھے ...... برآمدے کے ستون کے سہارے اکڑ گئے اور بڑے مضبوط، اور جری لہجے میں بولے "یہاں آکے سب مجبور ہو جاتے ہیں .... پھر جانے انہیں کیا ہوا۔ ساری جرأت اور ہمت جانے کہاں گئی ...." انہوں نے ستون کے سہارے سر لٹکا دیا اور پھوٹ پھوٹ کے رونے لگے، پھر میری طرف بڑھے اور بولے۔

"روئیے مت ـــــ سلمیٰ جی ـــــ یقین کیجئے، میں آپ کو اور بھائی صاحب کو کبھی روتے نہیں دیکھ سکتا ...."

پھر میرے شانے پہ ہات رکھ کر بولے "ابھی میں نے پیدا کرنے والے سے ایک دعا مانگی ہے، اور وہ جانتا ہے کہ میں نے آج تک اُس سے کچھ نہیں مانگا ہے ـــــ میں نے اُس سے التجا کی ہے کہ میری زندگی میرے بھائی کو عطا کر دے اور بس ـــــ انہوں نے سگریٹ سلگانے کو ماچس جلائی .... اور لمبے لمبے کش لینے لگے ـــــ، نرس بھاگی بھاگی باہر آئی ـــ خوش ہو کے اُس نے کہا "پیشنٹ کا کنڈیشن بہت BETTER ہے .... آپ کو بلاتا ہے۔

---

۸ ا مارچ ۱۹۷۶ء کو کرشن جی دہلی کے لئے روانہ ہو رہے تھے۔ پہلا موقع تھا کہ اُن کے ساتھ نہیں جا رہی تھی چار دن کے بعد اُن سے دہلی میں ملنے والی تھی۔ ڈاکٹر ظ۔ انصاری کرشن جی کے ساتھ تھے اس لئے اطمینان بھی تھا کہ اللہ نے چاہا تو سب خیریت رہے گی۔ صبح دس بج چکے تھے۔ مہندر جی کا فون آیا........ کرشن جی نے اُن کو منع کیا کہ وہ اسٹیشن نہ پہنچیں دیر ہو گئی ہے ـــ مہندر جی اصرار کر رہے تھے کہ انہوں نے کرشن جی کے لئے جو سلک کے کرتے تیار کرائے تھے وہ ساتھ لے کر اسٹیشن پہ پہنچیں گے۔ کرشن جی بولے۔

"مہندر جی! اُلٹی بھی کیا بات ہے ـــ اس وقت رہنے دیجئے کُرتے........ دیر ہو گئی ہے"

"لیکن بھائی صاحب آپ کو خدا حافظ بھی تو کہنا ہے۔

"ارے مہندر جی دو چار دن کی تو بات ہی ہے آپ اور صابر دت بھی تو ۲۲ر ۲۳ر تک دہلی آجائیں گے ـ"

"لیکن آپ سے آج ملاقات........"

"نہیں نہیں مہندر جی آپ بے کار تکلیف مت کیجئے۔

میں ان دونوں بھائیوں کی اس طرح کی گفتگو سننے کی عادی ہو چکی تھی۔ روزانہ اس طرح کی بے معنی گفتگو ٹیلیفون پہ ہوتی تھی۔ مثال کے طور پر، صبح اُٹھتے ہی کرشن جی کہتے ذرا مہندر جی سے بہت ضروری بات کرنی ہے وہ فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کی میٹنگ کے بارے میں ...... یا ڈکو منڈی کے بارے میں یا انکم ٹیکس کے کاغذات کے بارے میں یا فلاں پبلشر کے بارے میں یا فلاں پروڈیوسر کے بارے میں .... لیکن دونوں بھائی جب بات کرتے تو صرف ایکدوسرے

کے بارے میں .... اور سب "بارے دھرے رہ جاتے ۔ اور ان سب یاروں، کے بارے میں بات کرتے کرشن جی ٹیکسی پکڑ کے مہندر جی کے گھر جاتے .... بارہ سال تک یہی پروگرام مجھے دیکھنے کو ملتا رہا تھا ...... اُس دن بھی یہی کچھ ہوتا رہا ....

جاتے جاتے کرشن جی نے مجھے بتایا کہ کپور صاحب کی طبیعت خراب ہے اُن کا خیال رکھوں ـــــ لکشمن کپور ایک نیم بے روزگار کیمرہ مین تھے جو برسہا برس سے مہندر جی کے ساتھ رہتے تھے اور گزشتہ بیس پچیس سال سے مہندر جی اور دُرگا کی زندگی میں اس طرح شامل ہو گئے تھے کہ مہندر جی کے گھر کا کپور صاحب کے بغیر تصوّر بھی محال تھا ۔ لکشمن کپور بڑے غیرت مند اور روایتی شریف آدمی تھے ، جانے کیسے اس فلمی بھنور میں پھنس گئے تھے ۔ لیکن وہ فلم کے عشق میں نہیں مہندر جی کے عشق میں مبتلا تھے .... جس طرح مہندر جی کی زندگی کا محور ، کرشن چندر تھے ۔ بالکل اسی طرح لکشمن کپور کی زندگی کا سرچشمہ مہندر ناتھ تھے ۔

مجھے اس وقت کرشن جی سے پہلی بار پتہ چلا تھا کہ کپور صاحب بیمار ہیں ۔ لیکن یہ پتہ نہیں تھا کہ وہ زیادہ بیمار ہیں ۔

کرشن جی دہلی کے لئے روانہ ہو گئے ۔

شام ساڑھے سات بجے مہندر جی کا فون آیا ......

"بھائی صاحب اکیلے گئے ہیں ـــــ پتہ نہیں کیا بد پرہیزی کریں گے "

میں نے کہا

" ڈاکٹر ظ ۔ انصاری جو ساتھ ہیں ـــــ "

" ظ ۔ انصاری تو لٹریچر کے ڈاکٹر ہیں ـــ میڈیسن کے تھوڑے ہی ۔ "

پھر بھی آپ کو ساتھ جانا ہی تھا .... " مہندر جی نے کہا ۔

پھر بولے " کپور صاحب کی طبیعت مجھے ٹھیک نہیں لگ رہی ہے ...... "

" کیا تکلیف بڑھ گئی ہے ...... ؟ "

" جی ہاں .... مجھے تو اُن کی حالت ٹھیک نہیں لگ رہی ہے ـــ ابھی ڈاکٹر کا ہاتھ دیکھ کے گئے ہیں .... "

" آپ کیسے ہیں ؟ " میں نے پوچھا

" میں تو ٹھیک ہوں ...... لیکن کپور صاحب .... کیا بتاؤں ...... مجھ سے کپور صاحب کی تکلیف نہیں دیکھی جاتی .... "

بس یہی بات بار بار دہراتے رہے کہ کپور صاحب کی تکلیف اُن سے نہیں دیکھی جاتی ہے "

بیس مارچ [illegible] صبح ساڑھے پانچ بجے اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی ...... دل دھک سے ہو گیا ....

اللہ خیر ...... کرشن جی سفر میں ہیں ، بچہ پونا میں ہے .... کپور صاحب زیادہ بیمار ہیں ......

میں نے ریسیور اٹھایا ۔

" سلمیٰ جی ـــ جلدی آ جائیے .... فوراً .... "

" آپ ؟ " " میں کپور بول رہا ہوں .... "

" کپور صاحب ..... آپ ـــ کیسے ...... کیا ـــ ..... کون ..... " میں جانے کیا کیا پوچھ گئی "

کپور صاحب روتے روتے کہہ رہے تھے ......

"مہندر جی تین گھنٹے سے بے چین ہیں ...... سینے میں سخت درد ہے بے پناہ"

"تین گھنٹے سے طبیعت خراب ہے ان کی اور آپ لوگ اب اطلاع دے رہے ہیں"

"کیا کریں ...... مہندر جی منع کر دیتے تھے کہ رات کو آپ کی نیند خراب ہو گی۔ صبح سے پہلے اطلاع مت کرنا ...!

"توبہ توبہ ...... کس قدر غلط آدمی ہیں مہندر جی آپ بھی، میں اسی طرح کی باتیں دل ہی دل میں دہراتی ہوئی دادر پہنچی ...... مہندر جی ایک دیوان پر نیم دراز تھے ــــ دونوں ہاتھوں سے سینے کو دبائے ہوئے۔ چہرہ کرب سے پیلا ــــ تیمار داروں کا اژدہام،

مجھے دیکھتے ہی اٹھنے کی کوشش کرنے لگے ...... پھر بولے

"آپ آگئیں ...... " پھر اپنے دونوں ہاتھ میرے ہاتھوں میں سونپتے ہوئے بولے "میں مر رہا ہوں ..."

"ارے رے رے ...... مہندر جی ...... آپ ......"

"دیکھئے وقت نہیں ہے ...... بس بھائی صاحب کو دیکھ لیتا ...... اور سرلا تو ......"

پھر رک کر بولے۔

"بھائی صاحب تو ابھی دہلی پہونچے بھی نہیں ہوں گے ...... اور ریوتی اور سرلا وہ بھی لکھنؤ کے راستے میں ہوں گے ......

ڈاکٹر کامتھ کی طرف میں نے دیکھا ......

ڈاکٹر نے نظریں جھکا لیں ...... ہاسپٹل میں بیڈ مل گیا ہے۔

ایمبولنس آرہی ہے ...!"

"ہاسپٹل؟" میں لرز گئی ــــ مہندر جی ہاسپٹل سے بہت گھبراتے تھے۔ اکثر مجھ سے کہتے تھے کہ ان کے خاندان میں جو فرد ہاسپٹل جاتا ہے پھر وہ خود سے واپس نہیں آتا۔ لایا جاتا ہے ......!

میں نے ان کو دلاسہ دینے کے لئے کہا۔

"نہیں مہندر جی آپ کو ہاسپٹل نہیں لے جائیں گے ـــ یہیں سب انتظام ہو جائے گا آپ تو ذرا خاموشی سے لیٹے رہئے بس ......"

"نہیں نہیں ...... گھر پہ نہیں ...... مجھے فوراً ہاسپٹل لے چلئے ...... پھر بڑی تلخی سے جلنے کس سے مخاطب ہو کر بولے۔

"ہاسپٹل جانے کا وقت آگیا ہے ......"

ایمبولنس چلنے لگی تو تھوڑا سا سر اُٹھا کے چھبرا بلڈنگ کی طرف ایک عجیب سی نگاہ ڈالی، پاس بیٹھی ہوئی درگا کو دیکھا ــــ پھر دونوں ہاتھ بلڈنگ کی اور جوڑ لئے اور آنکھیں بند کر لیں ...... راستے میں ہر دو منٹ کے بعد کہتے "کتنی دور ہے ...... بہت دور ہے ......؟"

دس پندرہ منٹ میں ایمبولنس K.E.M ہاسپٹل پہونچ گئی۔ مہندر جی کو اسٹریچر پر لٹا کے وارڈ میں لے جایا گیا۔ راستے میں وارڈ بوائز بڑی بے دردی سے اسٹریچر کو لے کے چل رہے تھے۔ جھٹکے لگ رہے تھے مجھے

بہت غصّہ آیا میں نے جھنجھلا کے کہا " ارے بھائی ذرا تو سنبھال کے لے چلو۔ ایک وارڈ بوائے جو زیادہ عجلت میں تھا۔ بڑے اکھڑے لہجے میں بولا۔

" رات دن ہمارا یہی کام ہے۔ کس کس کو سنبھال کے لے چلیں گا۔ اونھ.......

سنبھال کے لے چلو....... " اس نے چڑانے والے لہجے میں کہا ــــ"

میں حسب عادت کچھ کہنے ہی والی تھی کہ مہندر جی نے آنکھیں کھولدیں بڑی ہی انکساری سے اس کمبخت سے بولے۔

" بھائی ــــ میں دل کا مریض ہوں...... ناراض مت ہو....... بس ذرا سی تکلیف اور کر دو........"

وارڈ میں پہنچتے ہی ڈاکٹروں اور نرسوں نے مریض کو ہاتھوں ہاتھ لیا ــ درگا اور مجھے وہاں سے ہٹنے کو کہا گیا۔ درگا بیچاری سہمی ہوئی...... باہر نکل آئی...... نرس نے انجکشن کی سوئی تیار کی بانہہ میں انجکشن لگانے کے لئے مہندر جی کی آستین چڑھائی گئی تو انہوں نے غصے میں ہاتھ کھینچ لیا....... میری طرف اشارہ کر کے بولے " اگر ان کو باہر بھیجا گیا تو میں انجکشن نہیں لگواؤں گا ــ"

پہلا انجکشن انہوں نے اس طرح لگوایا کہ ایک ہات میں ڈاکٹر انجکشن لگا رہا تھا دوسرے ہات سے وہ میرا ہات تھامے ہوئے تھے۔

جب ڈاکٹر جانے لگا تو مہندر جی نے اس سے پوچھا " ڈاکٹر صاحب، کیسی حالت ہے میری ؟"

ڈاکٹر نے انگلی، منھ پہ رکھ کے کہا " چپ چاپ، لیٹے رہئے سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

مہندر جی نے آنکھیں بند کر لیں ــــ میں ڈاکٹر کے ساتھ کمرے سے باہر نکلی۔

ڈاکٹر کی طرف میں نے دیکھا....... اس نے کہا۔

" کچھ نہیں کہہ سکتے ــ"

" درگا "....... مہندر جی نے زور سے پکارا ــــ

درگا " بھاگ کے اندر گئیں ــــ مہندر جی نے کچھ کہا۔ درگا پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ نرس نے زبردستی انہیں کمرے سے باہر بھیجدیا ــــ میں کھڑکی میں سے اندر جھانک رہی تھی مجھے اشارے سے بلایا اور بولے " درگا کا خیال رکھئے گا...... یہ بات بھائی صاحب سے نہیں آپ سے کہہ رہا ہوں......"

میں نے تسلی کے کچھ الفاظ کہنا چاہے۔ مہندر جی سرگوشی میں بولے۔

" بس بھائی صاحب کو دیکھ لیتا....... جب آنکھیں بند کر لیتا......!

اسی وقت کرشن جی کا بیٹا رجن کمرے میں داخل ہوا۔ مہندر جی کی آنکھوں میں عجیب سی چمک آئی جیسے انہوں نے کرشن جی کی جھلک دیکھ لی ہو ــــ میں تھوڑی دیر کو باہر نکل آئی ــ

دوبارہ اندر گئی تو مجھ سے بولے " اس دن آپ کے گھر پہ ہم سب لوگ آپ سے بحث کر رہے تھے آپ کہتی تھیں قسمت ہی سب کچھ ہے اور ہم کہتے تھے نہیں کوشش اور عمل کے بغیر کچھ ممکن نہیں ہے ــــ" لمحے بھر کو ٹھیرے۔

ایک بہت طویل آہ بھر کے بولے " آپ ہی ٹھیک کہتی تھیں اس کے آگے " ماتھے پہ انگشت شہادت رکھ کے " کسی کی نہیں چلتی ــــ"!

مہندر جی کو میں نے آخری بار بمبئی میں اُن کی موت کے بعد دیکھا تھا وہ مارچ ۱۹۷۴ء کی آخری تاریخوں میں سے ایک تاریخ تھی۔ دادر کی ایک چھوٹی سی چال میں جنازے کی تیاریاں ہو رہی تھی بلڈنگ کے اندر اور باہر عورتوں مردوں، اور بچوں کے آہ و بکا کی آوازیں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں ——— کرشن جی گھبرائے، بوکھلائے، روتے بلکتے ادھر سے اُدھر مارے مارے پھر رہے تھے۔ اُسی وقت کسی نے کہا "جنازہ تیار ہے"! میں نے دوسرے کمرے میں جا کے دیکھا، مہندر جی نیچے فرش پہ لیٹے ہوئے تھے۔ سفید کفن میں لپٹے ہوئے تھے گلے میں پھولوں کے ہار۔ ماتھے پہ چندن کا ٹیکا ــ دوستوں۔ عزیزوں اور پرستاروں کے جھرمٹ میں گھرے ہوئے تھے ——— کرشن جی اُن پہ جھکے ہوئے تھے۔

کاوش جی نے سہارا دیکے کرشن جی کو اُٹھایا۔ کرشن جی اُٹھ گئے۔ میرے قریب آئے میرے شانے پہ ہاتھ رکھ کر بولے۔

"تم نے دیکھا ——— مہندر کس قدر خوبصورت تھا"

ہاں کرشن جی ——— یہ سچ ہے ——— مہندر جی واقعی ایک خوبصورت آدمی تھے

ورق ورق کھو گئی زندگی میری

(سفر نامہ)

کرشن چندر

چند دن پہلے میں نے خواب دیکھا کہ مہندر جی شب خوابی کا لباس پہنے اپنے بستر پر اکڑوں بیٹھے کچھ لکھ رہے ہیں۔ ایک فل سکیپ کاغذ ان کے گھٹنوں پر پھیلا ہوا تھا۔ میں نے قریب جاکر ان سے پوچھا۔ مہندر جی کیا لکھ رہے ہیں؟ —— اکدم بھڑک کر بولے دیکھئے نا بھائی صاحب لوگ سمجھتے ہیں چونکہ میں مر چکا ہوں۔ اس لئے اب میں لکھنے سے بھی قاصر ہوں۔ حالانکہ دیکھئے اب بھی میں برابر لکھ رہا ہوں۔

میں نے جھک کر ان کے گھٹنوں پر پھیلے ہوئے کاغذ کو دیکھا۔ دائیں بائیں دونوں طرف وہ کاغذ ان کی تحریر سے پُر تھا اور کاغذ کے عین مرکز میں ان کی تحریر کا عنوان تھا۔ میں نے اور جھک کر اس عنوان کو پڑھا۔

"ورق ورق کھو گئی زندگی میری"

یکایک میری آنکھ کھل گئی۔ دل کی کیا حالت ہوئی بتا نہیں سکتا۔ جب طبیعت اعتدال پر آئی۔ تو اٹھا۔ باتھ روم میں جاکر آنکھیں دھوئیں۔ پھر ایک نوٹ بک پر اس عنوان کو لکھ لیا۔ سوچا۔ اس سفرنامے کا یہی عنوان ہوگا۔ اس سفرنامے کے چند باب یہاں پیش کئے جا رہے ہیں۔

ورق ورق کھو گئی زندگی میری

کرشن چندر

جب فلمز ڈویژن نے یہ طے کیا کہ کرشن چندر کے ادب اور زندگی پر بیس منٹ کی ایک دستاویزی فلم تیار کی جائے۔ تو انہوں نے مہندر جی کو بلوا کے یہ کام ان کے سپرد کر دیا۔ کچھ دن بمبئی میں شوٹنگ ہوتی رہی۔ پھر پونا اس مقصد کے لئے گئے۔ پھر پونا سے لوٹنے پر کشمیر جانے کا پروگرام بنا۔ جہاں ہم دونوں بھائیوں کے بچپن اور جوانی کی گمشدہ تصویریں تھیں۔

فلمز ڈویژن کا دیا ہوا تیرہ ہزار روپیہ خرچ ہو چکا تھا۔ کشمیر جانے کے لئے ایک معقول رقم کی ضرورت تھی اتفاق سے اس دستاویزی فلم پر ایک بینک نے مہندر جی کو پچاس ہزار روپے قرض دیئے۔ کشمیر کا پروگرام بننے لگا۔ کون کون لوگ جائیں گے۔ مہندر جی بولے۔ آپ ہونگے اور سلمیٰ بھابھی۔ میں اور درگا۔ کیمرہ صاحب اور پونم۔ جس کمپنی سے فلم کیمرہ کرائے پر لیا جائے گا اس کا کیمرہ مین اور ایک اسسٹنٹ۔ اور وہاں رام چندر ڈائریکٹر آف فوٹو گرافی بھی ہو گا۔ اور جس بلڈنگ کے مالک کے فلیٹ میں وہ رہتا ہے۔ اُس کی بیٹی اینی بھی چلنے کو کہہ رہی تھی۔ اور درگا کاول ستیش اور نوتن کے بغیر نہ لگے گا۔ اس لئے ان دونوں کو بھی لے جانا پڑے گا۔ اور وہاں اپنے دوست مدھوسودن کا تو نام ہی بھول گیا۔ جو یہ فلم ڈائریکٹ کر رہا ہے۔ پریتم بیلی بھی چلنے کو کہہ رہا ہے۔ اس کی بیوی بھی جائے گی اور ....

میں نے انہیں ہاتھ سے روک کر کہا۔ بس بس۔ پندرہ آدمی تو یہی ہو گئے۔ کس کی بارات لے جا رہے ہو؟

مہندر جی مسکرا کر بولے۔ ابھی فہرست مکمل کہاں ہوئی ہے؟ بہن سرلا کو لکھ دیا ہے۔ اور اس کے دونوں لڑکے دینو اور منا بھی۔ بلونت جی بھی چلیں گے۔ بھائی اوم کو لکھ دیا ہے۔ اس کی بیوی کملا بھی چلے گی اور اس کا بیٹا ملکی اور بچی انیلا اور ....

میں نے تعجب سے ان پر اک نگاہ ڈالی۔ کہا۔ اتنے لوگوں کو پہاڑ پر لے جانا؟ کوئی لکھ پتی ہی کر سکتا ہے!

مہندر جی نے بینک کا چیک میرے سامنے پھرا کر کہا۔ "آدھا لکھ پتی تو ہو چکا ہوں" ـــــــ وہ مسکرا رہے تھے۔

سب چیٹنی ہو جائے گا۔ کچھ پتہ نہیں چلے گا۔ روپیہ کہاں گیا۔ میری سنو تو صرف چھ آدمی لے جاؤ۔ تم چلو۔ میں چلتا ہوں۔ ڈائریکٹر چلے گا اور کیمرہ مین۔ دو آدمی اور ساتھ لے لو۔ کل ملا کے چھ آدمیوں کا یونٹ ہو گا بیس پچیس ہزار میں سب معاملہ نپٹ جائے گا۔ باقی رقم آپ اپنے لئے بچا سکتے ہیں۔ تیس ہزار کی رقم کم نہیں ہوتی۔

مجھے سنجیدہ دیکھ کر مہندر جی کے چہرے پر اداسی کی لہر دوڑ گئی بولے۔ بھائی صاحب۔ مجھے روپیہ بچا کر کیا کرنا ہے۔ بال بچے میرے نہیں۔ رہی درگا۔ اس کا کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ کیا کروں گا روپے جمع کر کے۔ جی چاہتا ہے اس موقع پر سارا خاندان چلے۔ سارے دوست چلیں۔ اور آپ کاٹ چھانٹ کر رہے ہیں۔ رہنے دیجئے۔ مجھے میری خوشی پوری کرنے دیجئے۔

پھر میں کچھ نہ بولا۔ کشمیر جانے کی تیاریاں زوروں سے ہونے لگیں۔ پھر بھی کچھ دوست رہ گئے۔ پریتم بیلی اور اسکی بیوی، رام چندر کو عین وقت پر کسی دوسری شوٹنگ پر جانا پڑ گیا۔ ریوتی جی روس چلے گئے۔ منّا اور وینو بھی تیار نہیں ہوئے۔ پھر بھی جموں ریلوے اسٹیشن پر جب ہمارا قافلہ اترا تو بائیس آدمی تھے۔ مجھے معلوم تھا۔ بائیس آدمیوں میں پچاس ہزار کی رقم کم پڑے گی۔ اس لئے کچھ رقم میں اپنی جیب میں ڈال کر لے آیا تھا۔ مہندر جی کو میں نے نہیں بتایا۔ روپے پیسے کے معاملے میں وہ بچوں کی طرح معصوم تھے۔

اسٹیشن پر برادر محترم غلام رسول رینز وڈ ائریکٹر آف انڈسٹریز مع اپنے رفقائے کار لینے کے لئے آئے تھے۔ حکومت کی جانب سے انہوں ہی نے سب انتظام کر رکھا تھا۔ جموں ہوٹل میں آٹھ کمرے بک تھے۔ باقی لوگوں کے رہنے کے لئے سرکٹ ہاؤس میں انتظام کیا گیا تھا۔ مہندر جی کے بچپن کے دوست گوری دت رینہ اور ان کے بڑے بھائی بھی آئے تھے۔ اس رات جموں ہوٹل کے بار اور اسکے ڈائننگ ہال میں بڑی گہما گہمی تھی۔ مہندر جی سب کی خاطر و تواضع میں مشغول چہکتے پھر رہے تھے۔ ان کی وہ موہنی مسکراہٹ سب لئے تھی۔ اور سب کو خوش دیکھ کر وہ خود بھی خوش تھے۔

جموں میں ایک دن شوٹنگ کی۔ (بعد میں جموں کے سارے مناظر کاٹنے پڑے کیونکہ فلم بہت لمبی ہو گئی تھی) دوسرے دن جموں سے پونچھ کے لئے روانہ ہو گئے۔

انفارمیشن کے مہتمم پوری صاحب نے ایک اسٹیشن ویگن کا انتظام کیا۔ اپنے محکمے کی طرف سے۔ ایک موٹر اور ایک جیپ ویگن، رینز و صاحب نے اپنے محکمے سے عنایت کی۔ اور حکومت کشمیر نے اس قافلہ کے دورۂ کشمیر کے لئے ایک انفارمیشن آفیسر سردار نرینڈر سنگھ کو ہماری دیکھ بھال کے لئے مامور کیا۔ یوں تو ساتھ چلنے کا وعدہ رینز و بھائی نے بھی کیا تھا اور وزیر مالیات گردھاری لال ڈوگرا نے بھی، مگر عین وقت پر سرکاری کاموں میں الجھ کر رہ گئے۔

ہمارا قافلہ جب جموں سے پونچھ کی جانب چلا تو کچھ دیر دریائے چناب کی نہر نے ہمارا ساتھ دیا۔ راستے میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں خیمے دکھائی دیئے۔ ان میں چھمب علاقے کے وہ ریفوجی رہتے تھے۔ جن کے گھر بار ہندوستان اور پاکستان کی پچھلی لڑائیوں نے تباہ کر دیئے تھے۔ یہاں سے سرحد بہت قریب تھی۔ مگر ریفوجیوں کے بچے آس پاس کی نفرت سے بے خبر دھلو میں مچاتے ہوئے ریت میں کھیل رہے تھے۔ عورتیں قمیص شلوار پہنے نہر سے پانی کے گھڑے بھر رہی تھیں۔ شہتوت کے پیڑ کے نیچے ایک بڈھا حقہ پی رہا تھا۔ اس کے قریب اس سے منہ موڑ کر ایک نو بیاہتا جوڑا ایک دوسرے کو میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھنے میں مصروف تھا۔

میں نے مہندر کی طرف دیکھا۔ کچھ کہا نہیں۔ چلتے چلتے اتنا بتا دوں کہ میرے اور اس کے درمیان بہت کم بات ہوتی تھی۔ گفت گو تو دراصل کانچ کی دیوار ہے۔ جس کے آر پار دونوں فریق ایک دوسرے کو دیکھتے جاتے ہیں مگر میرے اور مہندر کے درمیان کوئی دیوار نہ تھی۔ اس لئے کوئی گفت گو نہ تھی۔ بس ہوں، ہاں، چند جملے۔ پھر ایسی خاموشی۔ جس کی قوت اظہار گویائی سے بڑھ کر ہوتی تھی۔ اس سے جو بھی گفت گو تھی۔ ایک طرح کی خود کلامی تھی، اور اب کہ جب وہ اس جہاں میں نہیں ہے۔ میں گھنٹوں اس سے بات کیا کرتا ہوں۔ اپنے آپ سے بات کرنا کیا مشکل ہے۔ میں نے مہندر سے پوچھا۔ "کچھ یاد آرہا ہے؟"

"سیالکوٹ"

سیالکوٹ یعنی سیالوں کی بستی۔ سیال ہندو بھی ہوتے ہیں اور مسلمان بھی ہوتے ہیں۔ ایک زمانے میں سیال قبیلہ اس علاقے کا مشہور قبیلہ تھا۔ سیال عورتیں اپنی خوب صورتی اور ناز کی کے لئے مشہور تھیں۔ اور مرد اپنی وجاہت کے لئے۔ پھر وہ سب تاریخ میں گھل گیا۔ لاہور میں ہمارا ایک سیال دوست رہتا تھا۔ برج موہن سیال وہ ہمارے کالج کی ایک

لڑکی دلیپ کور پر عاشق تھا۔ اور فلائنگ کلب میں شامل ہو کے روز اس کے گھر کے اوپر اپنا ہوائی جہاز دوڑایا کرتا تھا۔ ایک روز اپنے ہوائی جہاز میں اڑان کے کرتب دکھاتے دکھاتے اپنی محبوبہ کے گھر کے سامنے ڈائیو کرتے کرتے گر گیا اور ہوائی جہاز سمیت جل گیا۔

"جل رہا ہے !" ۔ مہندر نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

میں نے کہا ہاں عشق کی آگ کبھی بجھتی نہیں۔ اس سیال کی چتا آج بھی جل رہی ہے مگر کیا بات ہے۔ مہندر جی ۔ آج کل کسی کو کسی سے عشق نہیں ہوتا ۔ بس افیر (AFFIAR) ہوتے ہیں ۔"

"سب ٹیلیفون کا قصور ہے" سلمٰی نے اچانک کہا۔

میں نے اور مہندر نے چونک کر سلمٰی کی طرف دیکھا۔

"ہاں" سلمٰی نے دہرایا "سب ٹیلیفون کا قصور ہے ۔ آج کل محبت ٹیلی فون سے شروع ہوتی ہے۔ ٹیلی فون پر کاٹ دی جاتی ہے۔ لطیف جذبہ کہاں سے آئے !"

مہندر جی نے زور سے قہقہہ لگایا ۔ پھر چپ ہو گئے ۔ مگر نگاہیں اس طرف تھیں جدھر سیال کوٹ تھا۔ ڈاکٹر اقبال کا وطن۔ ایک دفعہ ہم دونوں بھائی اپنے باؤجی کے ساتھ سیال کوٹ گئے تھے ۔ (ہم اپنے پتاجی کو باؤ جی کہا کرتے تھے) ہم دونوں بہت چھوٹے تھے ۔ اور ڈاکٹر اقبال کا نام بھی نہیں جانتے تھے۔ سیال کوٹ کے قریب قصبہ گھڑتل میں اپنے قرابت داروں میں ایک شادی تھی ۔ شادی میں کوئی خاص بات نہیں تھی ۔ مگر جس دن ہم وہاں پہنچے ۔ رات گذرنے کے بعد صبح ہوئی تو میں نے باؤجی کو چپکے چپکے اپنے بستر کے کنارے روتے دیکھ لیا۔ سمجھ میں نہ آیا ۔ کیا بات ہوئی ۔ پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ مہندر سے بات کی اس کی سمجھ میں بھی کچھ نہیں آیا ۔ بہت سال گذر گئے ۔ وہ آنسو معمہ ہی رہے ۔ پھر ایک دن جب مہندر کی محبوبہ کی شادی اچانک قرار پائی ۔ تو مہندر بڑے دل گداز لہجے میں مجھ سے کہا ۔ "آج سمجھ میں آیا باؤجی کیوں رو رہے تھے ۔" پھر آہ بھر کر بولے ۔ انسان کو سمجھنا آسان ہے ۔ بھائی صاحب آنسوؤں کو سمجھنا بہت مشکل ہے ۔"

ہمارا قافلہ اب جموں کے مضافات سے دور نیلی سڑک پر بھاگ رہا تھا ۔ دو رویہ ریتیلے میدان تھے ۔ بالو کے کھیت یا جلی پہاڑیاں ۔ جن میں کانٹے دار جھاڑیوں کے سوا کچھ اگتا نہ تھا ۔ ہمارے قافلے کے سب لوگ تین گاڑیوں میں سما نہ سکتے تھے ۔ اس لئے نو آدمیوں کو صبح کی بس میں پونچھ کے لئے روانہ کر دیا تھا ۔ گرمی دمبدم بڑھتی جا رہی تھی ۔ جموں سے راجوری تک گرمی کی یہی شدت رہی ۔ ہاں جب راجوری لب دریا پہونچے ۔ تو وطن کے پہاڑوں سے ٹھنڈی ہوائیں آنے لگیں اور جھاگ اڑاتی ہوئی نیلی لہریں خوش آمدید کے پیام دینے لگیں ۔

ڈاک بنگلے میں کھانے کا انتظام تھا ۔ اتفاق سے وہ بس جس میں باقی کے نو ساتھی سوار تھے ۔ یہیں راجوری کے بازار میں مسافروں کے کھانے کے لئے رک گئی تھی ۔ ہمیں معلوم ہوا تو ہم نے ایک اسٹیشن ویگن بازار بھیج کر باقی ساتھیوں کو بھی یہاں کھانے کے لئے بلوا لیا ۔ کھانا کھا کر کچھ دیر آرام کیا ۔ ڈاک بنگلے والوں نے ہمارے لئے چار کمرے کھول دیئے تھے ۔ تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد جو باہر نکلا تو مہندر جی کو چپ چاپ نچلی منزل کے برآمدے کے فرش پر بیٹھا ہوا پایا ۔ میں بھی ان کے قریب جا کے بیٹھ گیا ۔ انہوں نے قریب میں بچھی ہوئی بجری کی چند کنکریاں اٹھا رکھی تھیں ۔ اور انہیں ایک ایک کر کے چھوٹے بڑے وقفوں کے بعد لان کی گھاس پر پھینک رہے تھے ۔ چھوٹا وقفہ ۔ چھوٹی یاد ۔ بڑا وقفہ ۔ بڑی یاد ۔ لمحہ جو بجلی کی طرح کوند جائے یا وہ لمحہ جو ماہ و سال کی کوئی خوبصورت تصویر بن کر دل کے دریچے میں اتر جائے ۔

میں نے مسکرا کر کہا۔ "مہندر جی! یہ کس شیطان کو کنکریاں مار رہے ہو۔" وہ بولے "دل کے شیطان کو بھائی صاحب۔ مچلا جاتا ہے۔ اور مجھے لاہور لئے بھاگا جا رہا ہے۔ یاد ہے ہم لوگ رات کی گاڑی سے لاہور نکلتے تھے اور صبح راولپنڈی پہنچ جاتے تھے۔ پھر صبح کا ناشتہ راجہ بازار میں روپ سنگھ کے ڈھابے پر کرتے تھے۔ اور پھر ——————؟"

"اور پھر" میں نے کہا "کوہ نور بس سروس کی کسی لاری پر سوار ہو کر راولپنڈی سے مری۔ مری سے کوہالے۔ کوہالے سے اُڑی اور اُڑی سے براستہ علیہ آباد پونچھ پہنچ جاتے تھے۔ وہ راستہ کتنا خوبصورت تھا۔"

پھر میں نے کہا۔ "ابتک تو یہ راستہ بہت پھیکا اور بد رنگ رہا گرمی سے جھلس گئے ہیں۔ جموں پونچھ روڈ پر سفر کرنے کا ہمارا یہ پہلا موقع ہے۔"

مہندر جی مسکرا کر بولے۔ "یہی سوچ کر میں نے اس سڑک کو صاف کر دیا۔ کہ اس راستے پر ہماری کوئی یاد نہیں۔ اور یہ یادیں ہی تو ہیں جو ہر سفر میں رنگ بھرتی ہیں۔ ہیں اس کے لئے اجنبی۔ یہ میرے لئے اجنبی۔ لیکن اس اجنبی کے لئے اجنبی نہیں۔ جس نے چند میل پہلے ایک چھوٹے سے نخلستان میں تپتے ہوئے سفر سے گذر کر گاڑی روک کر چودہ سال کی نوخیز کلی سے پانی کے لئے پوچھا تھا اور ہم وہ سب لوگوں کو ایک ڈھلوان سے ایک پرانی باؤلی پر لے گئی تھی۔" مہندر نے ایک کنکری پھینک کر کہا۔ "اس کی آنکھیں گہری سبز تھیں ——"

"اور اب وہ کبھی بڑی نہ ہو سکے گی۔ ہمیشہ چودہ سال کی رہے گی۔ اور دوسری بار جب ہم اس سڑک سے گزریں گے اور اس نخلستان کی باؤلی کا پانی پئیں گے۔ تو شاید وہ وہاں نہ ہوگی۔ لیکن اس دوسرے سفر پر اس کی سبز آنکھوں کا افسوں دیر تک اور دور تک جادو جگاتا رہے گا۔" میں یہ کہہ کر چپ ہو گیا۔

مہندر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ "مگر یہ تو سچ ہے کہ سڑکیں بھی پالتو جانوروں کی طرح ہوتی ہیں۔ دھیرے دھیرے مانوس ہوتی ہیں۔ پالتو جانوروں کی طرح۔ کبھی کبھی کھو بھی جاتی ہیں۔ جیسے وہ سڑک ہم سے کھو گئی —— ہماری بچپن سے جوانی تک کی سڑک۔" اس کے بدلے میں یہ نئی سڑک ہمیں مل گئی۔ ٹھیک ہے ہمارے لئے یہ اجنبی ہے لیکن اس سڑک کی اپنائیت ان لوگوں سے پوچھو۔ جو بار بار اس سے گزر رہے ہیں۔ اس پر چلے ہیں۔ راستے کے ندی نالے جنھوں نے پیدل پار کئے ہیں ان کے لئے کسی ندی کے ہاتھوں میں جل پری تھی۔ کسی بچے کو کوٹھے کے آنگن میں کوئی شمع فروزاں تھی ———"

مہندر ہنس کر بولے۔ "ارے بھائی صاحب آپ کی شاعری .... بس اب اٹھئے۔ چلنے کی تیاری کریں۔ شام ڈھلتے پونچھ پہنچ جانا چاہیئے۔

———— ⁘ ————

سندربنی کا ذکر ہی بھولتا جا رہا ہوں۔ اونچے اونچے پہاڑ سے لدے ہوئے پہاڑوں کے خطرناک موڑ کاٹتے ہوئے جب سندربنی راستے میں آئی تو پہاڑ یک لخت پیچھے ہٹ گئے۔ اور ایک خوبصورت دور دور تک پھیلی ہوئی وادی نظر آئی۔ میلوں تک کھیت تھے۔ اور جنگل پیچھے ہٹ گئے تھے۔ کسی زمانے میں یہ سب کھیت جنگل ہوں گے اسی مناسبت سے لوگوں نے اس کا نام سندربن رکھ دیا ہوگا۔ جو اب بگڑ کر سندربنی ہو گیا ہے۔ کچھ لوگ اسے سنڈربنی بھی کہتے ہیں۔ مگر ہے یہ سندربن۔ ایک سندربن بنگال میں بھی ہے۔ وہاں تو ابھی گھنے جنگل موجود ہیں۔ مگر یہاں کاٹ ڈالے گئے ہیں۔ اور اب وہ کھیتوں سے دور دور سہمے سہمے سے کھڑے انسان کی اس بربریت کے گواہ ہیں جو اس نے جنگلوں اور اس کے باسیوں پر روا رکھی ہے۔

مہندر نے کہا۔ "دیکھئے سلمیٰ جی یہاں کے درخت کیسے شکست خوردہ نظر آتے ہیں۔ ڈرے ڈرے سے، مظلوم اور مجبور نظر آتے ہیں۔ جیسے گیر کے جنگلوں کے شیر۔ مگر ابھی پیچھے جو گھنا جنگل ہم چھوڑ کے آئے وہاں ان درختوں کا مزاج ہی کچھ اور تھا۔ کتنے خوددار اور آزاد نظر آرہے تھے۔ اپنے آپ میں مگن، مغرور، سر بفلک بلند اور مضبوط، وہاں انہیں اپنی اہمیت کا احساس تھا اور یہاں اپنی ہزیمت کا............

سرلا بولیں۔ "ہائے انسان نے جنگلوں کو تباہ کر کے بڑا پاپ کیا ہے۔ جہاں جہاں سے جنگل کٹتے جا رہے ہیں بارش کم ہوتی جا رہی ہے،،

میں نے کہا۔ ،،گھنے بھرے پُرے جنگل میں چرواہے کی بنسی کی تان کا جو مزا ہے۔ وہ میدانوں میں نہیں۔،،

آپ کو تو ہمیشہ بنسی کی تان کی پڑی رہتی ہے۔ کہیں کوئی چرواہی نظر نہیں آ گیا؟،، سلمیٰ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ پھر مہندر سے مخاطب ہو کے بولی: "مہندر جی راستے میں کہیں کوئی چرواہی نظر آجائے تو گاڑی رکوا لیجئے" گا۔ کرشن جی کے ساتھ اسکی ایک تصویر لے لیں گے۔ سب ہنسنے لگے۔

اب پہاڑ بلند ہوتے جا رہے تھے اور چانول کے ٹیرس نما کھیت نمودار ہو رہے تھے۔ کس طرح تین چار ہزار فیٹ نیچے کے پانیوں کو چھوٹی چھوٹی کولیں کھود کر اوپر لایا گیا تھا۔ بجلی یا ڈیزل کی طاقت کے بغیر۔ اس سے یہاں کے ان پڑھ کسانوں کی محنت اور مہارت کا پتہ چلتا ہے۔ کھیتوں کے کنارے کنارے پھلدار پیڑ بھی نظر آنے لگے تھے۔ خوبانی، ہاڑی۔ سیب اور چیری کے بوٹے کہیں کہیں کیلوں کے جھنڈ۔ یہاں کے کیلے دیکھنے میں زعفرانی رنگ کے ہوتے ہیں اور بڑے بڑے۔ مگر مزے میں لیس دار ہوتے ہیں۔ وہ ذائقہ نہیں جو بمبئی چھال کے کیلے میں ہوتا ہے۔ زیادہ تر پیڑ خوبانیوں اور ہاڑیوں کے ہیں۔ بہت اونچائی پر ہمیں ایک لڑکا خوبانیاں بیچتا ہوا ملا۔ سر پر گول ٹوپی۔ گلابی رخسار اور لوکری اشرفیوں کی طرح چمکنے والی سنہری خوبانیوں سے بھری ہوئی سلمیٰ نے جب قیمت پوچھی تو حیرت سے چیخ کر رہ گئی۔

،، ایک روپیہ؟ — ارے اس خوبانیوں سے بھری لوکری کے لئے صرف ایک روپیہ۔

مہندر جی نے اس بچے کو جب دو روپے دیئے، تو پہلے تو وہ حیرت سے دو روپیوں کو دیکھتا رہا۔ پھر مارے خوشی کے لوکری سمیت خوبانیوں کو چھوڑ کر اوپر بھاگ گیا۔ جہاں قریب دو سو فیٹ کی اونچائی پر ہم اس کا خوبانیوں کے پیڑوں میں گھرا ہوا گھر دیکھ سکتے تھے۔

سرلا مہندر جی سے بولی — دیکھو بھاپا جی — ہم لوگ اڑتیس برس کے بعد یہاں آئے ہیں۔ مگر خوبانیوں کی قیمت نہیں بدلی — یہ لڑکا دو روپے پا کر کتنا خوش ہوا۔ شاید اُسے یقین نہ آیا ہو گا۔ سوچتا ہو گا۔ کہیں ہم اس سے دو روپے نہ چھین لیں یا اپنا ارادہ نہ بدل لیں۔

مہندر جی کہنے لگے۔ یہاں دو روپے کی لوکری اور بمبئی میں یہی پھل چار روپے کیلو ملتا ہے۔

ایک موڑ پر شادی کا دولہا نئے کپڑے پہنے عورتوں میں گھرا نظر آیا۔ پنجابی شلوار اور قمیص کا فیشن جو ابتک سارے راستے میں عورتوں میں نظر آتا رہا۔ یہاں آکر یکایک مغلئی شلوار اور گھیرے دار قمیص میں بدل گیا۔ سر پر ترکستانی ٹوپی۔ عورتیں پہاڑی گیت گا رہی تھیں۔ نوجوان لڑکیاں دولہا سے مذاق کر رہی تھیں۔ چند لمحوں میں یہ منظر بھی تحلیل ہو گیا۔ کیونکہ ہم نے گاڑی روکی نہیں تھی۔ اس کی رفتار بہت دھیمی کر دی تھی۔ ایسا لگا جیسے ماضی کا ایک پیارا لمحہ چند پل کیلئے

آنکھوں میں چمک چمک گیا اور پھر اسی ماضی کے دھندلکے میں کھو گیا۔

"لگتا ہے فلمی گیت ابھی یہاں تک نہیں پہنچے"، مہندر نے طنزاً کہا اور گاڑی موڑ سے گزر گئی۔

اب ہماری سڑک اور اونچائی پر جا رہی تھی۔ اور پہاڑ ایک دوسرے کے بہت قریب ہوتے جا رہے تھے۔ جیسے گھیرا باندھ کر ہمارے گرد ایستادہ ہوں۔ ہواؤں میں برف اور چیگن کی مہک تھی۔ اور جب ہوا سرسراتی تو چیڑ کے جھومروں کی پائیل اُفق تا اُفق رقص کناں ہو جاتی۔ اس پہاڑ کی چوٹی کے قریب ایک جھرنا نظر آیا جس کے پانی کو ایک باؤلی میں باندھ کر لوہے کے ایک بڑے نل سے گزار دیا تھا۔ اور اب یہ پانی اس نل سے ایک موٹی دھار بن کر آ رہا تھا۔ کئی فوجی گاڑیاں یہاں کھڑی پانی لے رہی تھیں۔ ہم نے بھی یہاں گاڑی روکی۔ خوبانیاں دھو کر کھائیں۔ پانی کیا تھا پگھلی ہوئی برف تھی۔ ٹھنڈا مصفّا اور شیریں۔ چاروں طرف کوئی آبادی نہ تھی۔ کوئی گھر نہ تھا۔ بس چیڑ کے درختوں کے مزیّن جنگل اور ان کے اوپر سورج چمکتا ہوا مگر اتنی بلندی پر اس کی چمک میں کوئی حدت نہ تھی۔

آگے بڑھے تو قریب ایک گھنٹے کی مسافت کے بعد کھمبر گلی نظر آئی۔ کھمبر کا درّہ۔ اس درّے سے تین راستے پھوٹتے ہیں ایک راستہ پونچھ کو جاتا ہے۔ جو ہماری منزل تھی۔ دوسرا راستہ تتا پانی کو جاتا ہے۔ تیسرا راستہ مہنڈر کی جانب مڑ جاتا ہے۔

"گاڑی روکو"، مہندر نے کہا۔

مہندر اور میں دھیرے سے گاڑی سے نکل کر درّے پر کھڑے ہو گئے۔ ایک دوسرے کے بہت قریب، بہت ہی تنہا، یادوں کا ایک ہجوم تھا۔ جو غول بیابانی کی طرح بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ جب ہم چھوٹے سے تھے تو تتا پانی گئے تھے۔ اپنی ماں جی کے ساتھ۔ تتا پانی میں کچھ نہیں تھا۔ ایک دھرم شالہ تھی۔ ایک ڈاک بنگلہ تھا۔ اور گرم پانی کا ایک نالہ تھا جو چند سو گز کے فاصلے پر پونچھ کے دریا سے مل جاتا تھا۔ چاروں طرف بے آب و گیاہ مغرور پہاڑ کھڑے تھے۔ کسی آتش فشاں سلسلے کی مانند۔ سرلا ابھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ ہم دونوں ہی بھائی تھے جو سخت سردی کے موسم میں دن بھر اس گرم پانی کے نالے میں نہاتے رہتے تھے۔ اس نالے کے کنارے کنارے پگھلی گندھک کا بودار مواد زرد بالائی کی جھالروں کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ اور کہیں کہیں اس نالے کی چھوٹی چھوٹی ڈالیوں میں پانی کی اندرونی حدّت سے اس قدر اُبلتا تھا کہ ہم لوگ جب کپڑے کی چھوٹی چھوٹی پوٹلیوں میں لمبے چاول باندھ کر ڈال دیتے تو چند منٹ میں وہ چاول پک جاتے تھے۔ کئی طرح کے درجۂ حرارت رکھنے والے چشمے تھے۔ گرم۔ معتدل گرم، شدید گرم۔ اُبلتا ہوا پانی کہ ہاتھ ڈالو تو آبلا پڑ جائے۔ اور چند سو گز کے فاصلے پر دریائے پونچھ کا پانی برف کی طرح سرد تھا۔ ہمیں بڑا عجیب سا لگتا تھا۔ ماں جی ہمیں یہاں لے کے آتی تھیں۔ کھانے پینے اور دیگر رسد کا سامان ہم پونچھ سے لے کے آئے تھے۔ باؤجی ساتھ نہیں آتے تھے۔ انہیں سفر کی صعوبتیں، زیادہ راس نہیں آتی تھیں۔ پنجاب بھی وہ ماں جی کی طرح ہر سال ہمارے ساتھ نہیں جاتے تھے پانچ سات سال کے بعد جاتے تھے اور وہ بھی ٹانگہ کر کے۔

دوسرا راستہ مہنڈر کو جاتا تھا۔ اور جب اس درّے پر کھڑے ہو کر ہماری نگاہ تتا پانی سے مہنڈر کی طرف مڑی تو بے اختیار میں نے اور مہندر نے ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ لیے اور ہر لحظہ یہ گرفت مضبوط ہوتی گئی۔ کہیں یادوں کے اس ریلے میں ہم کھو نہ جائیں۔

پھر نہ جانے کس وقت گاڑی سے نکل کر سرلا بھی ہمارے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ کیونکہ سرلا مہنڈر ہی میں پیدا ہوئی تھی۔ یہیں پر اس کا بچپن گزرا تھا۔ باؤجی ڈاکٹر تھے۔ مہنڈر کے مقام پر دو مرتبہ ان کا تقرر ہوا۔ ایک بار جب ہم بچے تھے دوسری بار جب ہم جوان تھے۔

اسی مہنڈر کی وادی میں مہندر کا پہلا عشق ہوا۔ مہنڈر اور مہندر میں زیادہ فرق بھی نہیں ہے۔ لگتا تھا

سامنے کے پہاڑ پھٹ گئے ہیں۔ اور وہ نم آنکھوں سے اُس وادی کو دیکھ رہا ہے۔ سیب کے اُس باغ کو جہاں وہ حسین و جمیل ونتی کے ساتھ ٹہلا کرتا تھا۔ کھیلا کرتا تھا۔ ونتی جسے میں بھی دل ہی دل میں چاہتا تھا مگر میں نے کبھی اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا۔ پہلی بار ایک ہی لڑکی سے ہم دونوں نے پیار کیا۔ ونتی کا نام میں نے نہیں بدلا۔ اس کا نام ونتی ہی تھا۔ اور میرے پہلے ناول "شکست" کی جو ونتی ہے یہ وہی ونتی ہے۔ چمپئی رنگت، گدرایا ہوا بدن، کمر اور کولہوں کی زیبائی دلکش، ہنستی تھی تو فضا میں سیب کے پھول کھل جاتے تھے۔ اور گالوں میں گڑھے پڑتے تھے۔ اس لئے وہ اکثر ہنستی تھی۔ اور بات بے بات پر ہنس دیتی تھی۔ اس کی شادی پوٹھوہار کے کسی خاندان میں ہوئی تھی۔ مگر مہندر اس کا مائیکہ تھا۔ وہ چند مہینوں کے لئے اپنے مائیکے آئی تھی۔ اور محبت کے جال میں اس طرح اُلجھ گئی جس طرح چمیلی کی شاخیں ایک دوسرے سے الجھ جاتی ہیں۔ ونتی تو شکست ہی کی ونتی ہے۔ لیکن "شکست" کا میں — میں نہیں ہوں۔ مہندر ہے۔ شاید زیادہ تر مہندر ہے اور کہیں کہیں میں ہوں۔ کسی عجیب کیمیاوی عمل سے میں نے دونوں کرداروں کو ملا کر ذہن کی کٹھالی میں ایک نیا مرکب تیار کیا ہے۔ مگر ونتی تو خالص ونتی ہے۔ جیسی وہ تھی، جیسی وہ ہمیشہ رہے گی۔ "شکست" میں اگر مہندر کا کردار ہے تو "یرقان" کے افسانے میں میرا کردار ہے۔ ان دنوں میں واقعی یرقان کے موذی مرض میں گرفتار تھا۔ اور مہینوں بستر پر لیٹا رہا تھا۔ وہ اکثر مجھے دیکھنے آتی تھی اور میرے سرہانے بیلے کے پھول رکھ جاتی تھی۔ کتنے برسوں کے بعد بیلے کے ان پھولوں کی مہکتی صدا میرے کانوں میں آ رہی ہے، چاندی کی گھنٹیاں سی بج رہی ہیں۔ باؤجی کو معلوم تھا کہ ونتی، مہندر سے محبت کرتی ہے، اس لئے جب وہ باغ سے گزرتی تو وہ اس کی جھولی سیبوں سے بھر دیتے تھے۔

پھر وہ دن آیا۔ جب ونتی کو مائیکے سے سسرال جانا تھا۔ وہ مجھ سے ملنے آئی تھی اور روز کی طرح اس نے میرے سرہانے بیلے کے پھول رکھ دیئے تھے۔ اور کہا "میں جا رہی ہوں"، جانے کیسے اس لمحے میں نے اپنے آنسوؤں کو روک لیا اور مسکرا کر اُسے الوداع کہی۔ ان آنسوؤں سے تکیہ تو بعد میں گیلا ہوا تھا۔ مگر وہ اُس وقت میرے آنسو نہ دیکھ سکی تھی۔ شاید اُس نے وہ آنسو محسوس کر لئے ہوں گے۔ کیونکہ دیر تک اس کا ہاتھ میری گرم پیشانی پر لرزتا رہا تھا۔ اور مہندر اسے مہنڈر سے سنج پیر کے میدان تک یعنی کم و بیش سات میل کی دوری تک چھوڑنے گیا تھا اور جب واپس آیا تو اس کی آنکھیں رو رو کر سوجی ہوئی تھیں۔ اُس رات مجھ سے وہ گلے لپٹ کر رویا بھی تھا اور میں اُس کا کندھا تھپتھپاتا رہا۔ جانے دونوں چاہنے والوں میں کیا عہد و پیماں ہوئے میں نے مہندر سے کبھی نہیں پوچھا۔ شاید ونتی نے دوسرے سال کی چھٹیوں میں بھی آنے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر وہ نہیں آ سکی اس سے پہلے وہ پوٹھوہار کی کسی ندی میں نہاتے نہاتے ڈوب گئی اور اس طرح مہندر کی پہلی محبت کا ستارہ بھی ڈوب گیا۔

مہنڈر کی اس وادی میں مہندر نے پہلی بار جوانی میں قدم رکھا۔ اب تک وہ بہت دبلا پتلا لڑکا تھا جو اکثر بیمار رہتا تھا۔ پھر یکایک اُسے ورزش کی سوجھی۔ اور چند سالوں میں وہ کڑیل تومند جوان بن گیا۔ جس کے بدن کی خوبصورتی کو دیکھ کر رشک آتا تھا۔ اسی مہنڈر کے ہسپتال میں وہ دق زدہ عورت آئی تھی۔ جس سے باؤجی نے ٹوٹ کر پیار کیا تھا۔ اور وہ سپیرن جس کا ذکر "یادوں کے چنار" میں ہے اور جس نے باؤجی سے پیار کیا تھا اور وہ گوری چٹی پگلی جو کسی کے قابو میں نہیں آتی تھی۔ باؤجی بڑی محنت سے اُس کا علاج کرتے تھے۔ آٹھ دس دن کے بعد جب وہ ٹھیک ہو جاتی تو اس کے رشتے داروں کو بلوا کر اس کے گاؤں روانہ کر دیتے۔ جہاں سے وہ دو چار دن بعد پھر پاگل ہو کر واپس آ جاتی۔ یہ کس طرح کا پاگل پن تھا؟ اس وقت سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ آج آتا ہے۔ کس کس کو یاد کیا جائے؟ یادوں کے اودے اودے انگور ہوا میں جھول رہے ہیں اور ہر انگور کا ہر قطرہ ماضی کی نلکی سے چھن کر مئے ناب بن گیا ہے۔

سرلا نے گھٹے گھٹے لہجے میں کہا کہ "جی چاہتا ہے۔ یہ سامنے کے پہاڑ پھٹ جائیں اور مہنڈر کی وادی میں سما جائے

مہندر نے اپنی بھیگی آنکھیں اُلٹے ہاتھ سے پونچھیں۔ پھر میرا ہاتھ چھوڑ کر جب جاپ گاڑی میں جا کر بیٹھ گیا بھمبر گلی سے سوہرن کوٹ کا راستہ اونچے اونچے پہاڑوں اور چیڑ کے گھنے جنگلات سے ہو کر گزرتا ہے، راستے میں آبادی بھی نہیں۔ کہیں کہیں اکاد کا گھر نظر آتے۔ اور پہاڑ کو کاٹ کے چند کھیت، اور مکمل سنّاٹا جیسے فطرت نے سانس روک لیا ہو۔ مجھے اور مہندر کو یہ اکاد کا گھر بہت پسند تھے۔ گرمی کی چھٹیوں میں جب بھی ہم لاہور سے پونچھ آتے کچھ دنوں کیلئے پک نک منانے کے لیے جنگل کے ان اکیلے باسیوں کے گھروں میں قیام کرنے کے لئے نکل جاتے، پہاڑوں، جنگلوں، ندی نالوں چشموں اور آبشاروں سے محبت اسی زمانے میں پیدا ہوئی اور انسان نے جنگل کے ساتھ کس طرح اپنا تعلق جوڑا۔ تاکہ نہ جنگل کا نقصان ہو نہ اسکا اپنا۔ آج یہ بات ہم بھول چکے ہیں اور فطرت کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اور اس طرح اپنی تباہی کے سامان پیدا کر رہے ہیں۔ کیونکہ فطرت کے بغیر اور درخت کے اور پتوں کے بغیر اور کھلی صاف ہوا کے بغیر انسان جی نہیں سکتا۔ آج لوگ کیو ایسے متمدن شہر میں ہوا اتنی گندی ہو چکی ہے، کہ یا بانی بچے اسکول جاتے ہوئے بھی آکسیجن کا نقاب پہن کر جاتے ہیں۔

مگر اڑتیس برس کے بعد بھی یہاں امن ہے اور چین ہے اور فطرت اپنے پُرسکون انداز میں چاروں طرف پھیلی دکھائی دیتی ہے۔ ایک پہاڑ کا موڑ کٹتا ہے تو دوسرا پہاڑ سامنے آجاتا ہے۔ پھر یکایک حیرت انگیز اور چونکا دینے والے انداز میں پہاڑ یکایک پھسل کر ایک خوبصورت وادی کو سامنے لے آتے ہیں۔ یہ سوہرن کوٹ کا مقام ہے۔ نیم دائرے میں پھیلی ہوئی ایک وسیع آبادی۔ پونچھ کا دریا دو تین دھاروں میں بہہ کر ایک جگہ سنگم بناتا ہوا۔ دریا کے کنارے تک چاولوں کے کھیت اور ٹیرس نما کھیتوں کی منڈیروں پر پھل دار درختوں کی گھنی قطاریں کچے کوٹھوں کی چھت پر لال مرچوں کے غالیچے اور آنگن میں مائیں اور بہوئیں گھیرے دار مغلئی شلواریں پہنے کام میں مصروف اور بیٹرا تنے شریر کہ بچوں کی طرح دھوئیں مچلتے ہوئے دریا کے کنارے تک چلے گئے ہیں۔

سہ پہر ختم ہو رہی تھی۔ درختوں کے سائے لمبے ہوتے جا رہے تھے۔ ہمارے قافلے نے سوہرن کوٹ کے ڈاک بنگلے میں چائے پی۔ یہیں پر افسانہ نگار شبنم سوہرن کوٹی سے ملاقات ہوئی اور محمد دین بانڈے ایم۔ ایل۔ سی بھی بڑی محبت سے ملے۔ سوہرن کوٹ جس کا اصلی نام کبھی سورن کوٹ (سنہری وادی) رہا ہوگا۔ پونچھ کی سب سے خوبصورت وادی ہے۔ اور پہلگام سے ٹکر لے سکتی ہے۔ بلکہ ایک اعتبار سے پہلگام سے بہتر ہے۔ کیونکہ ابھی یہاں سیاحوں کی آمد و رفت نہیں ہے۔ یہ ابھی تک اسی طرح صاف شفاف دُھلی دُھلائی ان چھوئی فطرت کی بہاریں وادی ہے۔ جیسے آج سے چالیس برس پیشتر تھی —— کوئی ہوٹل نہیں۔ کوئی ٹورسٹ لاج نہیں سیاحوں کی کوئی کھلواڑ نہیں۔ لوٹے ہوئے ڈبے نہیں۔ لالچی نگاہیں نہیں۔ بھیک مانگتے ہوئے فقیر نہیں، جیب کاٹنے والے دکاندار نہیں۔ جسم بیچنے والی قحبائیں نہیں۔ فطرتاً خوددار، آسودہ اور سادہ مزاج ہے۔

چائے پی کر مہندر جی نے کہا۔ "آیئے بھائی صاحب۔ اخروٹ کا وہ پیڑ ڈھونڈیں۔

زیادہ کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ میں سمجھ گیا۔ بہت عرصہ ہوا جب ہم بچے تھے تو سوہرن کوٹ کی خوبصورتی کا حال سن کر مہند پکڑ لی تھی۔ ہم سوہرن کوٹ جائیں گے۔ سوہرن کوٹ جائیں گے۔ اس قدر اصرار کیا۔ اتنی ضد کی ایسے چیخ چیخ کر روئے کہ باؤ جی اور ماں جی کو ہمیں پک نک پر سوہرن کوٹ لانا پڑا۔ حالانکہ یہ جگہ پونچھ سے صرف سولہ میل کے فاصلے پر ہے۔ مگر میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ باؤ جی سفر سے ہمیشہ گھبراتے رہے۔ چاہے وہ کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو۔ مگر آخر انہیں ایک دن ہمارے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے اور وہ ہمیں سوہرن کوٹ لے جانے پر مجبور ہو گئے۔

پو پھٹنے سے پہلے ہم پونچھ سے روانہ ہوئے تھے۔ دوپہر کا کھانا ہم نے سوہرن کوٹ میں ایک اخروٹ کے گھنے

سایہ دار پیڑ کے نیچے کھایا۔ کیا کھایا یہ تو سب یاد نہیں ہے۔ لیکن ماں جی کے ناشتے دان میں کلاڑی کی بھجیا اس قدر لذیذ تھی کہ زبان پر آج تک اس کا مزہ باقی ہے۔ کلاڑی ایک طرح کی گول روٹی کے مانند موٹی ٹکیا ہوتی ہے۔ جو کاٹیج پنیر کو سکھا کر بنائی جاتی ہے۔ دیہات کے اکثر گھروں میں یہ پنیر کی روٹیاں ایک موٹی رسی سے گذار کر آنگن یا گھر کے اندر ٹانگ دی جاتی ہیں۔ اسے پکانے کے لئے اُسے پھر سے پانی میں کئی گھنٹے رکھ کر نرم کرنا پڑتا ہے۔ بعد میں اسے یا تو شوربے کے ساتھ پکایا جاتا ہے۔ یا انڈے کی بھجیا کے مانند۔ مگر بے حد لذیذ ہوتی ہے۔ اس دن تو ہم اسے کھاتے کھاتے مرغی بھی بھول گئے۔ کھانا کھا کے ہم نے اُسی پیڑ سے سبز سبز اخروٹ توڑے اور ان کی چھال پتھر سے کوٹ کر علاحدہ کر لی۔ پھر اندر کے بالائی ایسے نرم گودے کو نکال کر کھاتے رہے۔ یہ باؤجی اور ماں جی کی جوانی کا زمانہ تھا۔ باؤجی کی گوری رنگت۔ ماں جی کا گیہواں رنگ۔ باؤجی کی چوڑی پیشانی اور ماں جی کی ممتا بھری بڑی بڑی آنکھیں آج بھی یاد ہیں۔ ان کے ساتھ ان کے تین بچے تھے۔ میں اور مہندر اور مہندر سے چھوٹا بھوشن جو چھ سال کا ہو کے مر گیا۔ مگر وہ دن کتنا خوبصورت تھا کہ ہم تینوں بھائی دریا کے کنارے کے پتلے پانیوں میں بار بار نہاتے رہے اور ماں جی گھاس کے تنکوں کی پن چکی بنا کر پانی میں چلاتی رہیں۔ آج سب کچھ یاد آ رہا ہے۔ ضرور اس اخروٹ کے درخت کو ڈھونڈا جائے گا۔ وہ تو ایک تصویر کی طرح ہمارے ذہن میں بلند تھا۔

مگر آج وہ درخت نہیں ملا۔ اخروٹ کے پیڑ کی عمر تو لمبی ہوتی ہے۔ ماں باپ نہیں رہے۔ بھوشن نہیں رہا۔ مگر ایک امید تھی کہ وہ اخروٹ کا درخت زندہ ہوگا تو ہم ایک پل دو پل اس کی چھاؤں میں بیٹھ کر اپنے ماں باپ کو اپنے بھائی بھوشن کو اس پک نک کے دن کو واپس لے آئیں گے۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے جو جاتے ہیں وہ واپس نہیں آتے صرف ان کی یادیں شہد کے چھتے کے مانند ذہن کی ٹہنیوں پر لٹکتی رہ جاتی ہیں۔

ایک بار پھر اسکول کے چند لڑکے پک نک منانے کے لئے یہاں آئے تھے۔ ان دنوں ہم پر کرکٹ کا کھیل سوار تھا۔ ہم نے آٹھ نو اور لڑکوں کو جمع کر کے کرکٹ کی ایک ٹیم بنا ڈالی تھی۔ اسے ہسپتالی ٹیم کہتے تھے۔ ہسپتالی ٹیم کے میچ اکثر اسلامیہ اسکول پونچھ یا وکٹوریہ جوبلی ہائی اسکول پونچھ سے ہوتے رہتے تھے۔ مجھے اندھا بلے باز کہتے تھے۔ Blind Hitter اور مہندر اپنی تیز باؤلنگ کے لئے مشہور تھا۔ پک نک بھی ہوئی۔ میچ بھی کھیلا گیا۔ دریا کے کنارے گھاس کے ایک خوبصورت قطع میں وکٹیں گاڑی گئیں۔ اور کھیل شروع ہو گیا۔ کھیل کے بعد کھانا اور کھانے کے بعد دو دو چار چار کی ٹولیوں میں لڑکے بٹ گئے۔ کوئی اوپر پہاڑوں کو نکل گیا، کسی نے جنگل کی راہ لی۔ کوئی دریا کے کنارے کنارے اوپر چلنے لگا۔ میں نے اور مہندر نے چلتے چلتے پیڑوں کے جھنڈ سے گھرا ہوا ایک خیمہ ڈھونڈ لیا۔ مگر ہمیں اس خیمے کے زیادہ نزدیک جانے کی اجازت نہیں ملی۔ ایک باوردی چپراسی نے بتایا کہ پونچھ کے اسسٹنٹ ریزیڈنٹ بہادر پک نک کے لئے اپنی دونوں بچیوں کو لے کر آئے ہوئے ہیں۔ یہ زمانہ انگریزوں کا تھا اور پونچھ کے راجاؤں نے جو دراصل کشمیر سرکار کے ماتحت تھے۔ لڑجھگڑ کر یہاں ریزیڈنسی کی ایک شاخ کھلوالی تھی اور اس کے ذریعے اس علاقے کے سارے بڑے بڑے آفیسر پنجاب سے یہاں آتے تھے۔ کشمیر سے نہیں۔

وہ دونوں سفید فام لڑکیاں دریا میں پیڑوں کی اوٹ میں نہا رہی تھیں۔ میں نے اور مہندر نے بید مجنوں کے پیڑوں کی جھکی ڈالیوں میں چھپ کر وہ منظر دیکھا۔ وہ دونوں عمر میں ہم سے بڑی تھیں، جوان، حسین، سنہرے بالوں والیاں اور سرو قد۔ شاید جل پریاں ایسی ہی ہوتی ہوں گی۔ اس سے پہلے ہم نے کسی جوان لڑکی کو اس حد تک ننگا نہیں دیکھا تھا۔ اس لئے ان کے حسن سے بھونچکے سے ہو گئے تھے۔ اتنی خوبصورت ہوتی ہیں انگریز لڑکیاں۔ ان دونوں ہم پہ ہی کیا سب پر گوری رنگت کا رعب طاری تھا اور اس کی فوقیت بھی اور اس کا Catharsis اس وقت ہوا جب

مہندر نے بمبئی میں آکر مراٹھی لڑکیوں کا حسن دیکھا اور میں نے کیرالا جاکر وہاں کی سیاہ فام سندریاں دیکھیں ۔ یا پھر حبشیا کہ حبشی حسینائیں ۔ بہت بعد میں معلوم ہوا کہ حسن رنگ کا محتاج نہیں ہوتا ۔ مگر اس وقت تو ہم مبہوت سے ہو گئے تھے ۔ اور بہت دیر تک ان انگریز لڑکیوں کو نہاتے ہوئے دیکھتے رہے تھے ۔

ایک بار اور ہم سوہن کوٹ آئے تھے ۔ یہ جوانی کا زمانہ تھا ۔ تین چار خاندان مل کر پک نک منانے آئے تھے ۔ گیان چند اور دیوان چند دونوں بھائیوں کے خاندان اور گوربخش سنگھ کا خاندان اور رام لال سیٹھی کا خاندان اور ہم لوگ ۔ کچی پکی کھٹی میٹھی جوانیاں تھیں ۔ جذبے کنول کے سایوں کی طرح ذہن پر لرزاں تھے ۔ نگاہوں میں محبت کی نوخیز کلیاں پھوٹی تھیں ۔ اور جھجھک ، گریز ، اضطراب اور اجتناب نے رنگ آہنگ اور چبھن کے سامان پیدا کر دیئے تھے ۔ آج وہ چبھن باقی نہیں ہے ۔ جس طرح شرابیں وقت گذرنے کے بعد پختہ ہو جاتی ہیں ۔ اسی طرح یادیں ایام کے تہ خانے میں میٹھی ہوتی جاتی ہیں مجھے مہندر اور کملا کا بار بار ایک دوسرے کو چور نگاہوں سے دیکھنا یاد ہے ۔ اور ماں جی کی ڈانٹ ۔ " اوں ہوں ۔ چھوٹے کاکا ۔ اُدھر لڑکیوں میں مت کھیلو ۔ ،، ماں جی مجھے بڑا کاکا اور مہندر کو چھوٹا کاکا کہتی تھیں ۔ آج ماں جی اس جہاں میں نہیں ہیں مگر میں ان سے پوچھنا چاہتا ہوں ۔ " ماں جی کیا تمہارا چھوٹا کاکا تمہارے پاس ہے ؟ کیا وہاں بھی وہ لڑکیوں میں کھیلتا ہے ۔ وہ فاسٹ باؤلر !

شام کے سائے گھنیرے ہو چلے تھے ۔ اسی لئے سوہن کوٹ میں زیادہ دیر رکنا مناسب نہ سمجھا ۔ حالانکہ وہاں سے ہٹنے کو جی نہیں چاہتا تھا ۔ اس لئے پونچھ کی جانب چل پڑے ۔ کافی فاصلے تک دریائے پونچھ کی جانب چل پڑے ۔ کافی فاصلے تک پونچھ کی خوبصورتی کی روانی ساتھ رہی ۔ بیچ میں نگالی صاحب کا نالہ پڑا ۔ پھر اکا دکا بجلی کے قمقمے نظر آنے لگے اہم پونچھ کے مضافات میں تھے ۔ اندھیرا بڑھ رہا تھا ۔ جب ہم پونچھ کے ڈاک بنگلے میں داخل ہوئے تو ڈپٹی کمشنر غلام نبی نائیک اور سپرنٹنڈنٹ پولیس اور دیگر افسر اور عمائدین شہر ہمارے استقبال کے لئے موجود تھے ۔ پُرانے اور نئے ڈاک بنگلے کے سارے کمرے ہمارے لئے کھول دیئے گئے تھے ۔ تھوڑی دیر میں ادم زمیر اسب سے چھوٹا بھائی اور اس کی بیوی کملا اور کملا کا بھائی پردین کمار ۔ مینی اور اس کی بیوی چارو مینی ۔ رویندر جانی اور تلک راج جانی ، ارجن ناتھ مصری اور دوسرے احباب بھی آ گئے ۔ ہم لوگ دن بھر کے تھکے ہوئے تھے اس لئے مئے ناب کا شغل مختصر ہی رہا ۔ کھانا کھا کے جلد ہی سو گئے ۔

صبح جب میں اُٹھا تو مہندر جی مجھ سے پہلے جاگ رہے تھے ۔ اور پُرانے ڈاک بنگلے کی اس روش پر چہل قدمی کر رہے تھے ۔ جو طرفین پہ چنبیلی کے پیڑوں سے گھری ہوئی تھی ۔ یہ وہی پیڑ تھے جنھوں نے ہمارا بچپن دیکھا تھا ۔ ہماری جوانی ۔ اور اب اٹھتیس سال کے بعد ہم انہیں دیکھ رہے تھے ۔ یہ پیڑ کتنے سربلند اور تناور ہو چکے تھے ۔ بچپن میں باؤ جی مجھے انگلی سے لگائے اور مہندر کو کندھے پر بٹھلائے ۔ یہاں رابرٹ کے ساتھ آتے جو عیسائی لیڈی ڈاکٹر کا شوہر تھا ۔ اور خود کوئی کام نہیں کرتا تھا ۔ باؤ جی کو شروع ہی سے عجیب و غریب کردار عام نارمل حالات سے ہٹے ہوئے کردار بہت پسند تھے ۔ رابرٹ سے ان کی دوستی تھی اور وہ دونوں اپنے بچوں کو لے کر ہفتے میں ایک بار اس ڈاک بنگلے تک سیر کرنے کے لئے آتے تھے ۔ کیونکہ اس ڈاک بنگلے کے باغیچے کے پھول دُور دُور تک مشہور رہے تھے ۔

میں اور مہندر پو پھٹے بغیر سحر کے نیم اُجالے میں پونچھ کے ڈاک بنگلے سے باہر چل دیئے ۔ قریب ہی میں ہمارا اپنے گراؤنڈ تھا ۔ وکٹوریہ جوبلی ہائی اسکول کا اپنے گراؤنڈ ۔ مگر اب اس کھیل کے میدان کے آدھے حصے میں کالج تعمیر ہو چکا تھا اور دریا کی جانب اس پلے گراؤنڈ کے کنارے جو پاپلین کے پیڑ تھے ۔ وہ سب کاٹ ڈالے گئے تھے ۔ آگے چلے تو سوچا فوارے والا باغ آئے گا ۔ جس کے دو رویہ بلند قامت سرو سربلند ہوں گے ۔ سرو تو موجود تھے مگر باغ تباہ ہو چکا تھا ۔

وہ انار کے پیڑ کہاں تھے۔ اور وہ ناشپاتیوں کے پیڑ، خوبانی، سیب، پلم اور بگو گوشوں کے درخت جن پر ہم پہلے گراؤنڈ آتے یا جاتے یلغار کیا کرتے تھے اور باغ کے مالی دور دور تک ہمارے پیچھے بھاگتے تھے۔ مگر وہ چست لڑکوں وڑ کا مقابلہ کیسے کرسکتے تھے۔ وہ فوّارہ باغ جو نشاط باغ کی نقل میں بنایا گیا تھا۔ اس کا اب کچھ باقی نہ تھا۔ نہ فوّارے، نہ ٹینس کورٹ، نہ انگور کی چھی ہوئی بیلیں کچھ تو باقی نہ تھا۔ سُنا ہے کہ جب قبائلی اِدھر حملہ آور ہوئے اور شہر کا محاصرہ کر لیا۔ تو شہر میں ایندھن کی سخت کمی محسوس ہونے لگی۔ لوگوں نے مجبور ہو کر تمام باغات کے پیڑ کاٹ کر ایندھن کے لئے چولہے میں جھونک دئے۔ اخروٹوں والی سڑک پر اخروٹ کا ایک پیڑ باقی نہ بچا تھا۔ کون جیتا کون ہارا اس کا فیصلہ تو تاریخ کرے گی۔ لیکن دو طرفہ درختوں کا جس طرح صفایا ہوا اور قتلِ عام ہوا اس کا فیصلہ کون کرے گا؟

اب ہم ڈیوڑھی سے گزر کر قلعہ مبارک کی طرف جا رہے تھے۔ آنکھیں پُرنم تھیں۔ اس لئے ہم دونوں ایک دوسرے سے نگاہیں چرائے چلے جا رہے تھے۔ قلعہ مبارک سے ذرا پہلے ٹھاکر نین سنگھ کی کوٹھی ہوا کرتی تھی جو پولو کا بہت عمدہ کھلاڑی تھا۔ جانے وہ کوٹھی کہاں گئی۔ قلعے سے ایک فرلانگ کے بعد چھوٹی سی پہاڑی پر وزیر وزارت کا بنگلہ تھا۔ پہاڑی کے نیچے سڑک کے کنارے جس جھرنے کی ہمیں تلاش تھی۔ وہ ہمیں مل گیا۔ حکومتیں بدلیں۔ حالات بدلے۔ تاریخ بدلی مگر یہ جھرنا اسی طرح رواں دواں تھا۔ ماں جی جب راج محل کو رانی جی کے ہاں جاتی تھیں تو اسی جھرنے کا پانی پیا کرتی تھیں اور دربار میں حاضر ہونے سے پہلے باؤجی بھی یہیں رک کر اس جھرنے کا میٹھا پانی پیا کرتے تھے۔ آج ماں جی نہیں ہیں۔ باؤجی نہیں ہیں مگر میں اس جھرنے کی دھارا میں ان کا شیریں لمس محسوس کر سکتا ہوں۔ جیسے ماں جی میرا منہ چوم رہی ہوں۔ مہندر اُدھر بڑھ کے اس جھرنے کا پانی پی رہا ہے۔ اڑتیس سال کی پیاس آج بجھی ہے۔ شاید کوئی اس کے کانوں میں کہہ رہا ہے چھوٹے کاکا چھوٹے کاکا.......!

میں نے مہندر سے کچھ نہیں کہا۔ ایسے لمحوں میں کچھ کہنا ایسے لمحوں کی تقدیس کو تباہ کر دیتا ہے۔ ہم دونوں یہاں سے چپکے سے واپس ہو لئے۔ پھر وہی قلعہ، وہی ڈیوڑھی۔ وہی پلے گراؤنڈ وہی ڈاک بنگلہ۔ مہندر چپکے سے اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔ میں اپنے کمرے میں۔ آدمی بچپن سے بڑھاپے تک جانے میں ساٹھ برس لیتا ہے۔ ہم نے بڑھاپے سے بچپن تک جانے میں صرف ساٹھ منٹ لئے تھے۔

ناشتے کے بعد بہت سے لوگ ملنے کے لئے آ گئے۔ درشن سنگھ اکالی، خواجہ منیر حسین میر۔ ڈاکٹر نذیر حسین۔ ڈاکٹر بھٹی۔ سردار بدھی سنگھ، بشیر احمد شیخ، خزاں چند وکیل، تحصیلدار غلام محمد گگڑو، چودھری بدری ناتھ، منموہن سنگھ دھیر، سکھ راج بالی، مہتہ راجہ رام، خواجہ غلام قادر بانڈے۔ جہانگیر میر، بابو ہری کرشن رینہ اور دوسرے بہت سے نئے پرانے چہرے، اسکول اور کالج بند تھے۔ مگر ہمارے یونٹ کی آمد کی خبر آگ کی طرح شہر میں پھیل چکی تھی اور لوگ جوق در جوق چلے آ رہے تھے۔ ڈاک بنگلے کے سارے لان ان لوگوں سے بھر چکے تھے۔ گوری دت رینہ، مہندر جی کا تعارف ان کے پرانے ساتھیوں سے کرا رہا تھا۔ لوگ آنکھوں میں خوشی کے آنسو لئے گلے مل رہے تھے۔ زور زور سے ہاتھ ملا رہے تھے۔ کمر میں ہاتھ ڈال کر بغلگیر ہو رہے تھے۔ جیسے اڑتیس برس کی جدائی کو چند لمحوں میں ملیا میٹ کر دینا چاہتے ہوں۔

کچھ دیر کیو رصاحب نے ہماری شوٹنگ ڈاک بنگلے میں کی۔ نئے گیسٹ ہاؤس میں نہیں جہاں ہم پڑھے ہوئے تھے بلکہ پرانے ڈاک بنگلے میں جہاں ہم سکول اور کالج کے دنوں میں ٹھاکر موہن سنگھ اور ٹھاکر سکھ چین سنگھ کے ہمراہ پلے گراؤنڈ میں کھیلنے کے بعد آتے تھے۔ یہ دونوں ٹھاکر سچے راجہ صاحب والیٔ ریاست کے قریبی رشتہ دار تھے۔ اس لئے ان کی وجہ سے ہمارے لئے ڈاک بنگلہ کا ایک کمرہ

کھول دیا جاتا — یہاں ہم قریب کے ڈونگس کے چشمے کا پانی منگواتے اور لیموں کا شربت پیتے یا لیمونیڈ۔ پھر گراموفون کے ریکارڈ بجائے جاتے۔ مہندر کو گانے کا بہت شوق تھا اور وہ بہت اچھا گاتا بھی تھا۔ سہگل کے اکثر ریکارڈ بجائے جاتے اور رجانکی بائی آگرے والی اور کالو قوال، ٹھاکر موہن سنگھ کو فلم لیلیٰ مجنوں کے گانے بے حد پسند تھے۔ جنہیں ماسٹر نثار اور مس کجن نے گایا تھا۔ کبھی کبھی ہم چاروں شاہی اصطبل سے گھوڑے نکلواتے خوبصورت بے صبر گھوڑے۔ میں تو گھوڑے پر چڑھنے سے ہمیشہ ڈرتا تھا مگر ٹھاکر موہن سنگھ، مہندر اور سکھ بیر اچھے شہسوار تھے۔ اور اکثر گھوڑے دوڑاتے ہوئے نگالی صاحب کے نالے تک چلے جاتے تھے۔ میں صرف ڈاک بنگلے تک آتا تھا اور یہاں ان کی واپسی کا انتظار کرتا تھا۔ مہندر کو سب کچھ یاد آرہا تھا۔ کہہ رہا تھا، بھائی صاحب۔ موہن سنگھ کس غضب کا کھلاڑی تھا ٹینس کا۔ فوارے والے باغ میں راجہ صاحب کا ٹینس کورٹ تھا۔ اس میں ٹھاکر موہن سنگھ راجہ صاحب کے ساتھ ٹینس کھیلا کرتا تھا اور ہم لوگ کورٹ کے قریب کرسیوں پر بیٹھے تکا کرتے تھے۔ ہمیں ٹینس کورٹ میں کھیلنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس کورٹ میں صرف شاہی خاندان کے افراد کھیل سکتے تھے موہن سنگھ بہت عمدہ شکاری بھی تھا۔ اس نے مہندر کو بندوق چلانا سکھایا۔ مہندر جنگل میں اڑتے ہوئے تیتر اور جھیل سے اٹھتی ہوئی مرغابی کو اپنے نشانے سے گرا لیتا تھا۔ جبکہ میرا نشانہ مرغابی یا تیتر سے سو فیٹ دور نکل جاتا تھا۔ اور بندوق کے فائر کے دھچکے سے کندھے میں شدید درد ہوتا تھا۔ مہندر نے ان دنو کی یاد سے محظوظ ہو کر میری طرف مسکرا کر کہا۔ "آج پھر ٹھاکر موہن سنگھ کے ساتھ شکار پر جانے کو جی چاہتا ہے۔ مگر ٹھاکر موہن سنگھ ہے کہاں؟ جنت کی کسی وادی میں فرشتوں کے ساتھ ٹینس کھیل رہا ہوگا" میں نے مہندر سے کہا۔ اور مہندر کا چہرہ چند لمحوں کے لئے افسردگی کے غبار میں کھو گیا

شوٹنگ دیکھنے کے لئے بھیڑ لگ گئی تھی اور ہماری حفاظت کے لئے چند فوجی بھی تعینات کر دیئے گئے تھے مگر یہاں ہمیں کس سے ڈر تھا سب اپنے تھے۔ سب سلیقے اور قاعدے سے شوٹنگ دیکھ رہے تھے۔ مدھوسودن اور مہندر ایک دوسرے سے مختلف شاٹ کے متعلق مشورہ کرتے ہوئے ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ ہر شاٹ میرے، مہندر، ادم اور سرلا کی زندگی کا ورق تھا۔ ورق الٹتے الٹتے ہم ڈاک بنگلے سے نکل کر توپ خانے کے میدان میں پہنچے۔ یہاں ہر روز ٹھیک بارہ بجے توپ داغی جاتی تھی۔ اب وہ توپ خانہ کہاں — ہاں جیل موجود ہے۔ اور وہیں موجود ہے کہ جہاں وہ تھا۔ وہیں ڈاک خانہ ہے۔ وہی پولیس لائنز، وہی ہسپتال کو جاتی ہوئی درختوں سے گھری ہوئی سڑک ہے۔ اب ہم ہسپتال کے برآمدے کے قریب آپہنچے ہیں اور وہی تو ہسپتال ہے، وہی اس کا چھتا ہوا برآمدہ کے سامنے وہی پھولوں سے بھرا ہوا باغیچہ اس برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر بائیں طرف پاؤ جی کھلے میں ایک میز کے سامنے بیٹھا کرتے تھے۔ مریضوں کو دیکھنے کے لئے ایک عجیب شوق اور اضطراب کے عالم میں ہم تینوں بھائی اس چھتے ہوئے برآمدے کی جانب بڑھ گئے۔ جب سب کچھ وہی ہے تو پتا جی بھی وہیں ہوں گے۔ میز کے سامنے کرسی پر بیٹھے نسخے لکھتے ہوئے مریضوں کو دیکھتے ہوئے کبھی کبھی کچھ گنگناتے ہوئے۔ گورا چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں، چوڑی پیشانی اور ہاتھ بالائی سے بھی زیادہ ملائم...... اور آگے بڑھے تو عجیب دھچکا سا لگا۔ وہاں تو کوئی اور ہی ڈاکٹر بیٹھا تھا۔ دریائے پونچھ کے دونوں کناروں کے بیچ بہت سا پانی بہہ گیا تھا۔ اور کتنی ہی پرانی تصویریں بہا لے گیا تھا۔

"یہ ہیں ڈاکٹر شرما" ایک آواز آئی۔

مہندر نے ہاتھ ملایا۔ میں نے بھی۔ چند لمحے تو ہم ساکت سے کھڑے رہے۔ نوجوان اور ہنس مکھ ڈاکٹر تھا۔ جیسے کسی زمانے میں میرے والد رہے ہوں گے۔ شرما جی اپنے علاقے کے بہترین پلاسٹک سرجن مانے جاتے ہیں۔ ان کی بیوی اُما شرما بھی ڈاکٹر ہیں۔

ہسپتال میں کافی بھیڑ ہو گئی تھی۔ اسکول اور کالج کے بہت سے لڑکے لڑکیاں جمع ہو گئے تھے۔ اور اپنا تعارف

شوٹ کر رہے تھے یا میرے چھوٹے بھائی اوم کا بڑا لڑکا ملکی اور اس کی بہن انیلا ان کا تعارف ہم سے کرا رہی تھی۔ معزز شہریوں میں سے اس وقت کچھ نام یاد آرہے ہیں۔ ڈاکٹر سروپ ناتھ آفتاب۔ کرشن لال گپتا۔ چمن لال ورما۔ سجاد حسین۔ ششی بھوشن شرما۔ مہتہ کھیگوان داس۔ شہزاد حسین، عبدالعزیز مستری۔ سردار نند سنگھ۔ اودھم سنگھ۔ سردار سنگھ۔ چوھدری بدری ناتھ۔ خواجہ غلام محی الدین۔ اے۔ سی سیوا سنگھ۔ ارجن ناتھ مصری اس موقع پر بھی خاص طور سے اپنی دکان سے پان بنوا کر لائے تھے۔ جتنے دن ہم پونچھ میں رہے۔ مصری صاحب مفت سوڈا اور پان سے ہماری تواضع کرتے رہے۔ ان کی دکان پروین کماریمینی کی دکان کے بالکل سامنے ہے۔ میرے بچپن کے زمانے میں یہ دکان کتابوں اور کاپیوں کی ہوا کرتی تھی۔ اور دیوالی اور دسہرے کے دنوں میں ہم یہاں سے پٹاخے اور پھلجھڑیاں خریدا کرتے تھے۔

ہسپتال میں شوٹنگ کرنے کے بعد ہم پاپیادہ اپنے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ دائیں طرف سے ایک پگڈنڈی گھوم کر اوپر ایک ٹیکری میں جاتی تھی۔ سب سے اوپر چیف میڈیکل آفیسر رام گوپال ماتھر کا گھر ہوا کرتا تھا۔ نیچے ہمارا۔ دونوں بنگلے باغات سے گھرے ہوئے تھے۔

کسی گائیڈ کی مدد کے بغیر ہم چاروں۔ میں۔ مہندر۔ اوم اور سرلا اُدھر چلے گئے۔ جدھر بچپن۔ لڑکپن اور جوانی کے خوبصورت ایام بیتے تھے۔ ہاں وہی گھر ہے۔ وہی دیوار ہے۔ دیوار سے اوپر اُٹھا ہوا وہی خوبانی کا پیڑ ہے۔ یا شاید کوئی دوسرا ہے۔ جوں جوں ہم گھر کے قریب پہنچتے جاتے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جاتی۔ اب گھر کی دیوار مڑنے کو ہے۔ موڑ کے بعد گھر کا دروازہ آئے گا۔ موڑ پر رک کر میں نے مہندر سے کہا۔ یاد ہے مہندر اس کونے پر دیوار سے لگ کر تم پتھروں سے کھیلا کرتے تھے اور جب میں سکول سے واپس آتا تھا۔ تو تمہیں یہاں اس جگہ انگور کے بیل کے نیچے پتھروں سے محو گفتگو پاتا تھا۔ وہ انگور کی بیل اب نہیں رہی۔ مگر گھر کا دروازہ تو وہی ہے۔ دل کی عجیب حالت تھی۔ اچانک ہم دروازے سے چند قدم پہلے رُک گئے۔ اور عجیب محویت کے عالم میں کھلے دروازے کی طرف تکنے لگے۔ وقت پیچھے کو لوٹ گیا تھا اور ہر دم یہ محسوس ہو رہا تھا کہ ابھی گلابی کنارے والی کریم رنگ کی ساڑی پہنے ماں جی اس دروازے سے برآمد ہوں گی اور کہیں گی۔ "اتنے برس کہاں رہے بڑے کاکا۔ چھوٹے کاکا۔ سرلا۔ اور اوم کہاں تھے تم۔ چلو جلدی سے اندر آجاؤ۔ تمہیں بھوک لگی ہوگی۔ میں نے تمہارے لئے مکھن اور شہد بھرے پراٹھے تیار کئے ہیں۔ ایک ایک گلاس میٹھے کا بھی پی لو"۔ ہم چاروں کو ماں جی کے ہاتھ کے تیار کئے پراٹھے بہت پسند تھے۔ جن پر آدھ انچ سے زیادہ مکھن کی تہہ جما کر وہ اس پر شہد انڈیل دیتی تھیں۔

مگر ادھ کھلا دروازہ ادھ کھلا ہی رہا۔ ماں جی اس دروازے سے باہر نہ آئیں۔ ہم لوگ اک دھچکے سے ماضی سے حال میں آگئے۔ اور دروازے کے اندر چلے گئے۔ وہی آنگن تھا۔ مگر اب اس آنگن میں بمباری سے بچنے کے لئے ایک بنکر بھی بنا دیا گیا تھا۔ شہد میں زہر گھل گیا تھا۔ پہاڑ کی ایک چوٹی پر اگر پاکستانی چوکی تھی تو بالمقابل دوسرے پہاڑ کی ایک چوٹی پر ہندوستانی چوکی تھی اور ہم دونوں چوکیوں کو صاف صاف دیکھ سکتے تھے۔ اسی قدر قریب تھی باہمی نفرت!

ڈاکٹر شرما گھر دکھانے لگے تو مہندر نے بے قرار ہو کر کہا۔ آپ نہ دکھایئے۔ سُنئے یہاں ماں جی کی رسوئی تھی۔ مہندر نے ایک کمرے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

ڈاکٹر شرما بولے۔ آج بھی ہم لوگوں کی یہی رسوئی ہے۔

ایک کمرے کی طرف اشارہ کر کے مہندر نے کہا۔ "اور یہ باتھ روم ہونا چاہیئے۔"

"ہاں - ڈاکٹر شرما بولے - یقیناً اب بھی یہی باتھ روم ہے۔"
پھر ہم اندر کے تین کمروں میں گئے - جی چاہتا تھا کہ ماں جی کو آواز دوں - بابو جی کو آواز دوں - مرحوم بھائی بھوشن کو بلاؤں - بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پایا - پھر ہم پچھلے کمرے کی طرف چلے گئے جو ہمارا اسٹیڈی روم تھا - اور جس کا ایک دروازہ باہر باغ میں کھلتا تھا۔
اسی دروازے سے باہر گئے - کدھر گئیں وہ سیب کے پیڑوں کی قطاریں - کدھر گیا وہ باغ ...... چاروں طرف پھیلا ہوا جس میں ہمارے بچپن کی شرارتیں بکھری پڑی تھیں - معلوم ہوا کہ قبائلی حملے کے دوران یہ باغ بھی کاٹ ڈالا گیا۔
ڈاکٹر شرما بولے - یہاں پھر سے باغ لگایا جائے گا - میں نے دیلی سے تین سو پودے منگائے ہیں۔
گھوم گھام کے پھر ہم بے اختیار رسوئی کے سامنے کھڑے ہو گئے - ڈاکٹر شرما کی بیوی مسز اوما شرما ہمیں دیکھ کر مسکرا رہی ہیں مگر ہم انہیں نہیں دیکھ سکتے - عالم رویا میں، ماں جی رسوئی میں بیٹھی چار تھالیوں میں ہمارے لیے کھانا پروس رہی ہیں - ایک کونے میں نوکر برتنوں سے کچھ کھڑ پڑ کر رہا ہے - حالانکہ اس وقت دو پہر ہونے کو ہے - لیکن چشم تخیل میں شام ہو گئی ہے - رسوئی میں لالٹین جگ رہی ہے - ماں جی سر پر پلو ڈالے طلائی چوڑیوں سے بھری کلائی والے ہاتھ سے پانی کے گلاس رکھتی ہیں کھانے کو کہتی ہیں - مگر ہم ضد کرتے ہیں - ہمیں اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاؤ ماں جی - ماں جی پہلے توڑ انٹتی ہیں - پھر ممتا بھرے جذبے سے سرشار ہو کر کھانے کے پہلے لقمے تیار کرتی ہیں - ہم چڑیا کے بچوں کی طرح ہم باری باری اپنا منہ کھول دیتے تھے اور اس میں لقمہ ڈال دیتی تھیں اور کتنا مزے دار کتنا میٹھا کتنا لذیذ ہوتا تھا وہ لقمہ - حالانکہ وہی روٹی تھی - وہی دال تھی - وہی آلو - وہی گوبھی - وہی گوشت - مگر جانے کیا بات ہے اپنے ہاتھ سے کھانے میں وہ مزا نہ تھا جو ماں جی کے ہاتھ سے کھانے میں تھا - اور بہت دیر کے بعد یہ بات سمجھ میں آئی - کہ مائیں جب اپنے پیارے بچوں کے لئے کھانا پکاتی ہیں تو وہ ہر سالن میں اور روٹی کے ہر ٹکڑے میں اپنی محبت کی مٹھاس بھر دیتی ہیں - کھانا تو تاج انٹر کانٹی نینٹل اور فائیو سٹار ہوٹل میں بھی عمدہ ملتا ہے - مگر وہ آگ پر پکایا جاتا ہے اور یہ روح کی مدھم مدھم آنچ پر تیار ہوتا ہے۔
سر لاارو رہی تھی - مہندر جی دم بخود تھے - اوم آبدیدہ - اس وقت سب نے ہم کو اکیلا چھوڑ دیا تھا - جیسے ہم کسی غیر مرئی ہستی کے روبرو پیش ہوں - ماضی سے آنے والی ہوا کی لہروں میں ماں جی کے آنچل کی خوشبو تھی -

⁂

دوسرے دن علی الصبح میں اپنے محترم دوست دیا نند کپور سے ملنے گیا - ان کا گھر ڈاک بنگلے کی سڑک پار کر کے دریا کے قریب ہے - اس سے پہلے ان کا گھر کشمیری محلے میں ہوا کرتا تھا - اور شری رام لال مینی مرحوم کی دکان کے قریب میں ان کی کتابوں کی دکان تھی - مگر میں نے دیا نند کپور کو کبھی اپنی دکان پر کچھ بیچتے نہیں دیکھا - مقامی شعراء اور ادیبوں کا ان کی دکان پر جمگھٹا رہتا تھا - ان کی دکان پر ہی میری ملاقات پہلی بار چراغ حسن حسرت مرحوم سے ہوئی - دیا نند جی سے میں اور مہندر اکثر ادبی رسالے پڑھنے کے لئے مانگ کر لے جاتے تھے خصوصاً مستانہ جوگی - اور مالنسرور نہ - اور مالنسرور رسالے کو ہم دونوں بھائیوں نے اس لئے پڑھنا شروع کیا کہ اس کے ایڈیٹر کا نام گوری شنکر لال اختر تھا اور ہمارے باؤ جی کا نام بھی گوری شنکر تھا۔
کپور صاحب کے ہاں چائے پی - گزری ہوئی باتوں کی یاد تازہ کی - اور انہیں شام کے لئے شوٹنگ میں شریک ہونے کی دعوت دے کر چلا آیا - واپس آیا تو معلوم ہوا کہ کئی گھروں سے ناشتہ آچکا ہے - پونچھ کی دو چیزیں

بہت مشہور ہیں۔ مکی اور موٹھی۔ چنانچہ ناشتے پر یہ دونوں چیزیں موجود تھیں۔ مکی کے لوڑھے مکی کے پراٹھے۔ موٹھی کا سالن اور کئی قسم کے ساگ۔ گیسٹ ہاؤس والوں نے نان دے بیج ناشتہ تیار کیا تھا مگر ہم لوگ تو مکی کے پراٹھوں اور موٹھی پر بری طرح گرے۔

اتنے میں کیپٹن اروڑہ بھی آگئے۔ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو یہ صاحب اردو کے مشہور نقاد مالک رام کے قریبی رشتے دار ہیں اور چونکہ ایک ادبی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے اردو شعر و شاعری سے بے حد شغف ہے۔ ہزاروں شعر زبانی یاد ہیں۔ جنھیں ایک فوجی کے منہ سے سن کر ہمیں بڑی حیرت ہوئی۔ یہ مجھے۔ مہندر۔ سلمیٰ۔ کملا۔ ملکی اور انیلا کو اپنے ساتھ موتی محل لے گئے۔ جو کبھی راجگان پونچھ کا خاص محل تھا۔ میں نے وہ کمرہ بھی دیکھا۔ جو راجہ بلدیو سنگھ کی خواب گاہ رہ چکا تھا۔ آج بھی اس کمرے میں راجہ بلدیو سنگھ کا ہی پلنگ بچھا ہوا تھا۔ جس کی مچھر دانی کے پیتل کے چوکھٹ پر پیتل ہی کے حروف میں انگریزی میں لہ . B لکھا ہوا ہے۔

میں نے کپتان صاحب سے کہا، "راجہ بلدیو سنگھ بڑی آن والا راجہ تھا۔ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔"

کیپٹن صاحب ہنس کر بولے۔ "صاحب آج بھی اس کی یہی حالت ہے۔"

"کیا مطلب؟" مہندر نے پوچھا۔

کیپٹن صاحب ہنس کر بولے۔ ایک دن میں رات کو اس پلنگ پر سو گیا۔ دوسری صبح کو میں نے اپنے آپ کو پلنگ کے بجائے فرش پر سوتا ہوا پایا۔

"نہیں نہیں"

"نہیں۔ واقعی سچ کہتا ہوں۔"

میں نے کہا، "ممکن ہے کسی نے آپ سے مذاق کیا ہو اور سوتے میں آپ کو بستر سے اٹھا کر فرش پر ڈال دیا ہو۔"

اب حقیقت جو بھی رہی ہو۔ کیپٹن اروڑہ بولے۔ واقعہ یہی ہے۔ جو میں نے بیان کیا۔ اس واقعے کے چند روز بعد ہی ہمارا ایک دوست میجر اس پلنگ پر سو گیا۔ رات کو اس کے لحاف میں آگ لگ گئی۔ خود بخود۔ اور وہ جلتے جلتے بچا...

مہندر نے کہا۔ ممکن ہے میجر صاحب شراب کے نشے میں اپنا جلتا ہوا سگریٹ بجھانا بھول گئے ہوں۔

کیپٹن اروڑہ بولے۔ آپ اس کی توجیہ جس طرح چاہے کر لیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اب اس بستر پر رات کے وقت کوئی نہیں سوتا۔ سلمیٰ بولیں۔ کیپٹن صاحب۔ یہ دونوں بھائی دہریئے ہیں۔ یہ تو مانیں گے نہیں۔ لیکن میں ان باتوں کو مانتی ہوں۔ ابھی اس دنیا میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جن کی سائنسی توجیہ محال ہے۔

موتی محل سے واپس آئے۔ تو قلعہ مبارک کے علاوہ شہر کے مختلف مقامات پر شوٹنگ کرتے رہے۔ لنچ سے کوئی ڈیڑھ گھنٹہ پہلے واپس ڈاک بنگلے میں پہنچے۔ تو لڑکے لڑکیوں اور پرانے دوستوں اور نئے چہروں کا ایک ہجوم تھا۔ ماسٹر دینا ناتھ رفیق بھی ملنے کے لئے آگئے تھے۔ جنھوں نے اسکول میں مجھے اور مہندر کو پڑھایا تھا۔ ہم دونوں نے ان کے پاؤں چھوئے ماسٹر جی بناوٹی غصے سے ہاتھ اٹھا کر بولے۔ "دوں ایک چانٹا؟ کہاں گم رہے اتنے دن؟" ——— پھر اکدم ہنس پڑے اور ہم دونوں کو گلے سے لگا لیا۔ اس ہجوم میں سائیں داس جی بھی تھے۔ جو اپنی بیوی کے ساتھ ہمیں دیکھنے آئے تھے۔ سائیں داس جی۔ باؤ جی کے کمپاؤنڈر رہا کرتے تھے۔ مسز سائیں داس بولیں۔ تم دونوں اتنے چھوٹے سے تھے۔ وہ اپنے گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر بولیں۔ اور میرے گھر آ کر میری رسوئی میں شوق سے میرے ہاتھ کا کھانا کھایا کرتے تھے۔ میرے گھر کی مکی کے لوڑھے

انہیں بہت پسند تھے۔ پھر اپنے پرانے ساتھی مہتر راجہ رام ملے۔ ماسٹر محمود الحسن۔ راجندر سنگھ۔ بابو نکو رام بنو ترہ۔ پرسوام گھئی ترلوک ناتھ بھسین۔ چودھری لچھمن داس کپور اور رتن لال کپور اور اپنے ہم جماعت ٹھاکر پنجاب سنگھ اور ہربنس لال ٹنڈن۔

کالج کے بہت لڑکے لڑکیوں نے فرمائش کی کہ ان کے ساتھ تصویر کھینچوائی جائے چنانچہ ان لوگوں کے ساتھ بھی شوٹنگ ہو گئی۔ شوٹنگ کے بعد ایک شوخ و تشنگ حسینہ شانوں پر بال بکھرائے ہماری طرف بڑھی اور بولی۔

"مجھے افسانے لکھنے کا بہت شوق ہے۔ میں کیسے ایک اچھی افسانہ نگار بن سکتی ہوں؟"

پیشتر اس کے کہ میں کوئی جواب دیتا۔ مہندر جی مسکرا کر بولے۔

"دیکھئے ایک اچھی افسانہ نگار بننے کے لئے آپ افسانے تو کرشن جی کے پڑھا کیجئے۔ لیکن خط مجھے لکھا کیجئے۔"

اس پر ایک زور کا قہقہہ پڑا۔ مگر وہ لڑکی ذرا نہیں جھینپی فوراً بولی۔

"اچھا چاچاجی۔"

اس پر وہ قہقہے بلند ہوئے کہ کچھ نہ پوچھیے سلمیٰ نے اس لڑکی کی پیٹھ تھپک کر کہا۔ "اب آپ کو کسی سے افسانہ نگاری کے گر سیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

کچھ دیر سرجن کلدیپ چندر شرما۔ شری شام لال نائب تحصیلدار۔ چودھری جیالال سوری۔ اور چودھری مہیشر ناتھ کپور سے باتیں ہوتی رہیں پھر لنچ کا وقت ہو گیا۔ شام کو پانچ بجے گیتا بھون میں شہریوں نے ایک جلسے کا اہتمام کیا تھا۔ اور اس سے پہلے چار بجے کے قریب ہمیں ایک جلوس کی صورت میں بازار سے گیتا بھون لے جایا جائے گا۔ سب پروگرام طے کر کے لوگ رخصت ہوئے۔ تو ہم نے لنچ لیا۔ پھر پونے چار بجے گاڑیوں میں سوار ہو کے قلعہ مبارک پہونچ گئے۔ وہاں سینکڑوں شہری استقبال کے لئے موجود تھے۔ جلوس چلا تو فضا کرشن چندر زندہ باد۔ مہندر ناتھ زندہ باد۔ سرلا دیوی زندہ باد۔ سلمیٰ صدیقی زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھی۔ ہمیں ہاروں سے لاد دیا گیا۔ رادھا رام ٹی اسٹال سے لیکر پروین کمار مینی کی دکان تک سارا بازار دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ اور چپے چپے پر خوشنما ڈیوڑھیاں بنائی گئی تھیں۔ ایک اندازے کے مطابق ایک سو پچاس ڈیوڑھیاں سجائی گئی تھیں۔ یہاں ہم سب کو روک کر ہار پہنائے جاتے تھے۔ اور شری اندر راج شرما اور لالہ ہنسراج، وجے گپتا اور ستدیو گپتا اور کمار صاحب اپنے اپنے کیمروں سے فوٹو لیتے جاتے تھے۔ بہت کم وقت میں لوگوں کو اطلاع دی جاسکی۔ پھر بھی گیتا بھون میں سینکڑوں لوگ جمع ہو چکے تھے۔ سب سے پہلے جناب محمد دین بانڈے نے تقریر کی۔ پھر ہمارے محترم رفیق شاد دینا ناتھ نے ایک نظم پڑھی۔ ارجن ناتھ مصری نے ایک گیت سنایا۔ پھر مہندر جی نے ایک جذباتی تقریر کی۔ میں نے بھی۔ مگر سرلا تو جذبات میں اسقدر ڈوب چکی تھی کہ وہ کچھ کہہ نہ سکی۔ درگا بھی خاموش رہی۔ صنف نازک کی نمائندگی سلمیٰ نے کی۔ اور لوگوں کو بتایا کہ جب جب یہ دونوں بھائی بیمار ہوتے ہیں تو مرنے سے پہلے پونچھ کے درشن کرنے کا تذکرہ ضرور کرتے ہیں۔ اور اب کہ جب میں نے پونچھ کے لوگوں کی محبت اور یہاں کے علاقے کی خوبصورتی دیکھی ہے میں سمجھتی ہوں ان کا تذکرہ بے جا نہیں ہے۔ سلمیٰ تو زبردست مقرر ہیں اس لئے انہوں نے ایک ہی تقریر میں اہل پونچھ کے دل جیت لئے۔

جلسے کے خاتمے کے بعد چائے مٹھائی سے تواضع ہوئی۔ اس چائے پارٹی میں کوئی ڈھائی تین سو افراد شریک تھے۔

پھر جب شام ڈھلنے لگی اور رات بڑھنے لگی تو ہم لوگ چائے کی پارٹی سے فارغ ہو کر پاپیادہ شری پروین کمار مینی کے گھر کی طرف روانہ ہوئے جہاں رات کا کھانا تھا۔ یہ گھر کملا کا مائیکہ ہے جو میرے سب سے چھوٹے بھائی ادم کی بیوی ہے۔ کملا کی بڑی بہن بملا سے مہندر جی کی شادی کی بات چلی تھی۔ یہ دونوں ایک دوسرے کو بہت پسند بھی کرتے تھے۔ اور دونوں خاندان

کے افراد میں بہت میل ملاپ بھی تھا اور اس امر کی زبردست خواہش بھی تھی کہ مہندر اور بملا کی شادی ہو جائے لیکن اس زبردست خواہش اور اصرار کے باوجود یہ شادی نہ ہو سکی۔ کیونکہ بملا ایک امیر گھرانے کی لڑکی تھی۔ اور مہندر جی اردو کے فری لانس ادیب بننے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ یعنی انہوں نے ادب کے لئے غریبی قبول کرتے ہوئے اپنی محبت کو قربان کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

راستے بھر خزاں چند جی شکایت کرتے رہے۔ دیکھئے کل شام آپ نے سردار بدھی سنگھ کے ہاں جانے کی دعوت قبول کر لی۔ وہاں آپ کے والد کے دوست سردار سنت سنگھ تھے۔ سردار بدھی سنگھ تھے۔ آپ کے دوست سردار گور بخش سنگھ کی ہمشیرہ موجود تھی۔ سردار بدھی سنگھ کی بڑی لڑکی جو ربوری میں لیڈی ڈاکٹر ہے وہ اور اس کی چھوٹی بہن جو یہاں کالج میں پڑھتی ہے وہ موجود تھی —— اور آپ کا سارا خاندان اس جائے پارٹی میں موجود تھا۔ مگر آپ نے میرے گھر کا کھانا قبول نہیں کیا۔ حالانکہ آج رات آپ پروین کے ہاں کھانا کھا رہے ہیں۔

مہندر ناتھ نے معذرت کرتے ہوئے کہا "بھائی صاحب اس وقت تو ہم صرف تین دن کے لئے پونچھ آئے ہیں۔ مگر اگلے سال تیس دن کے لئے آنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ پھر ہم آپکے ہاں ایک دن نہیں سات دن کھانا کھائیں گے۔ اس بار معافی دیدو بھائی صاحب"

خزاں چند جی نے مہندر کو گلے سے لگا لیا۔ شکایت دُھل گئی۔

پروین کے گھر میں بڑی رونق تھی۔ شہر کے عمائدین۔ ہندو مسلم۔ سکھ سبھی حضرات موجود تھے۔ چارو۔ کملا۔ انیلا اور پروین کی ماتا جی سبھی اصرار سے سب کو کھانا کھلا رہی تھیں۔ مہندر ایک پلیٹ میں کھانا ڈال کے پلیٹ اٹھا کے کھانے کے کمرے سے باہر آ گیا۔ میں اس کے ساتھ نہیں گیا۔ مجھے معلوم ہے کہ یادوں کے آنگن میں وہ اس وقت اکیلا کھڑا ہے۔ اور ماضی کی تمام ناآسودہ آرزوئیں اور حسرتیں اپنا آنچل پھیلائے اس کے سر پر سایہ فگن ہیں۔ کیا سوچ رہے ہو مہندر؟ گیا وقت واپس نہیں آتا۔ بملا بیوہ ہو چکی ہے۔ اب تو اس کی یادوں کا سہاگ بھی لٹ چکا ہے۔ اور اب وہ بھی اتنی اکیلی ہے کہ جتنے اکیلے تم ہو۔ اس راکھ کو مت کریدو۔ شاید کسی چنگاری سے تمہاری روح جل جائے......

آنگن میں شور ہے۔ صحن میں شور ہے۔ کھانے کے کمرے میں شور ہے۔ لوگ باتیں کر رہے ہیں۔ کوئی مجھ سے کہہ رہا ہے۔ پونچھ سے واپسی پر آپ کو سورن کوٹ میں دو گھنٹے کے لئے رکنا ہو گا۔ مہندر جی نے ہم سے وعدہ کر لیا ہے۔ مہندر جی نے ہم سے یہ بھی کہا ہے کہ وہ اگلے سال سورن کوٹ میں چھ مہینے رہ کر آپ کی سوانح حیات لکھیں گے...... کچھ عورتیں کھِل کھِلا کر ہنس رہی ہیں۔ چمچے کھنک رہے ہیں۔ لوگ باتیں کر رہے ہیں۔ —— مہندر یادوں میں گھرا اکیلا کھڑا ہے......

قریب ایک ماہ کی شوٹنگ کے بعد کشمیر کے مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے ہم لوگ واپس بمبئی آ گئے۔ چند ماہ فلم کی ترتیب و تدوین میں لگ گئے۔ پہلے چھ ہزار فیٹ کی فلم بنی۔ پھر چار ہزار فیٹ کی۔ پھر تین ہزار فیٹ کی۔ آخر میں کاٹ پیٹ کے انیس سو فیٹ پر فلم تمام ہوئی۔ اور فلم ڈویژن کے حوالے کر دی گئی۔ فروری ۷۱ء میں مہندر جی کو فلم ڈویژن سے پچپن ہزار کا چیک مل گیا۔ جو ہاتھوں ہاتھ بٹ گیا۔ بلکہ چودہ ہزار قرضہ اوپر رہا۔ میں نے مہندر جی سے بہت کہا۔ آپ آدھی رقم دیجئے۔ تین چوتھائی دیجئے۔ مگر کچھ رقم اپنے پاس رکھ لیجئے۔ باقی قرض دوسری دستاویزی فلم میں اُتار دیں گے۔ مگر یہ بات مہندر جی کے اصول کے خلاف تھی۔ کہنے لگے بھائی صاحب آپ فکر کیوں کرتے ہیں۔ امید ہے کہ مجھے فلم ڈویژن سے ایک دستاویزی فلم مل جائے گی۔ ایک فلم کشمیر کی حکومت سے۔ دو ایک جگہ اور بات کر رہا ہوں۔ دیکھ لینا دو ایک سال میں آپ کو ایسی فراغت دیدوں گا کہ آپ اس دن رات کی محنت سے بچ کر آرام سے سورن کوٹ میں

رہ کر باقی زندگی صرف لکھنے پڑھنے میں گزار سکیں گے ـــــ میں کیا کہتا۔ مہندر کو بس میری فکر تھی۔ اپنی نہیں۔

دس مارچ کو ساحر کے ہاں ڈنر تھا۔ اتنی اچھی صحت ہو چلی تھی مہندر جی کی کہ کلکتے سے آیا ہوا میرا دوست امرت بھوشن بگرال کہہ اُٹھا۔ مہندر بھائی میں نے آپ کو اتنا بشاش کم دیکھا ہے۔ یُو ڈُو۔ صحت بھی بہت عمدہ ہو رہی ہے۔

مہندر ہنس کر بولے۔ شراب چھوڑ دی ہے۔ اُبلا کھانا کھاتا ہوں۔ اور لمبی سیر کو جاتا ہوں۔ میں نے اتنے سالوں میں خود اپنے آپ کو اتنا تندرست محسوس نہیں کیا تھا۔"

ان دنوں راہی صاحب سے میں اُردو کے معاملے میں الجھا ہوا تھا۔ اخباروں میں بیانات پر بیانات آ رہے تھے انہی دنوں میں دلّی یونیورسٹی نے مجھے نظام خطبات کے لئے مدعو کر لیا۔ انیس مارچ کو میں دلّی فرنٹیئر میل سے روانہ ہوا۔ چلنے سے پہلے میں نے مہندر کو فون کیا۔ ہمیشہ کا قاعدہ یہ تھا کہ بمبئی کے باہر جانے سے پہلے میں ضرور ان سے مل کر جاتا تھا۔ مگر آج بہت دیر میں اٹھا تھا۔ دیر میں تیار ہوا تھا۔ اگر مہندر جی کے گھر جاتا ہوں تو گاڑی چھوٹ جائے گی۔ سو چا فون پر ہی بات کر لوں۔ مہندر جی سے فون پر معذرت چاہی۔ وہ بولے میں اسٹیشن پر آیا جاتا ہوں۔ میں نے آپ کے لئے ریشم کا ایک کاڑھا ہوا عمدہ کرتہ سلوایا ہے۔ وہ بھی لیتا آؤں گا۔"

میں نے کہا۔" مہندر جی۔ چند دن کے لئے تو جا رہا ہوں۔ واپسی پر آ کر پہن لوں گا۔" بس یہ آخری گفتگو تھی۔

بیس مارچ کو دلّی پہنچا۔ سیدھا بھائی ادم کے گھر گیا۔ ناشتہ کیا۔ کھانا کھایا۔ پھر بھائی کشن لال جی کے ہاں سری رام روڈ چلا گیا۔ پرسہ دینے کے لئے۔ کیونکہ ان کے بڑے لڑکے جگ موہن کا ایک موٹر ایکسی ڈنٹ میں انتقال ہو گیا تھا۔ وہاں جا کے معلوم ہوا کہ سلمیٰ کا فون آیا تھا۔ میں آتے ہی فون کر لوں۔ میں نے بمبئی فون لگایا۔ کچھ عرصہ تک فون نہیں ملا۔ جب فون ملا تو سلمیٰ کی آواز سُنائی دی۔ کہہ رہی تھیں۔" فوراً آیئے۔ مہندر کو ہارٹ اٹیک ہو چکا ہے۔ حالت نازک ہے۔ فوراً پہلا ہوائی جہاز پکڑ کر آ جایئے۔"

دو تین گھنٹے بھاگم بھاگ سیٹ حاصل کرنے کے لئے کوشش کرتا رہا۔ کسی ہوائی جہاز پر جگہ نہ ملی۔ چار بجے کے قریب سلمٰی کا فون آیا۔

"مہندر جی کی حالت بہتر ہے۔ کے۔ ای۔ ایم ہاسپٹل کے [illegible] وارڈ میں داخل کیا ہے۔ ابھی ابھی ان کو چائے اور ٹوسٹ کھلا کے آئی ہوں پھر جا رہی ہوں۔ آپ فوراً آ جایئے۔"

میں نے کہا ابھی تک تو کسی ہوائی جہاز میں سیٹ نہیں ملی۔ کوشش کر رہا ہوں۔ اس وقت نہیں تو صبح کے پلین سے آ جاؤں گا۔"

"پہلا پلین پکڑ کر آ جایئے۔"

اس وقت میں خلا میں تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا ہو رہا ہے۔ کشن لال جی کے ساتھ پینے کو بیٹھا تو پیا نہیں گیا۔ رات کے ساڑھے نو بجے یکایک میں نے کشن لال جی کے گلے سے لگ کر رو رو کر کہا۔" نہیں ہے۔ نہیں ہے۔ کوئی کہتا ہے میرا بھائی اس دنیا میں نہیں ہے۔ وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ بھائی صاحب میرا بھائی اس دنیا میں نہیں ہے (بعد میں معلوم ہوا ٹھیک ساڑھے نو بجے ان کا انتقال ہوا تھا)

رات بھر جاگتا رہا۔ کبھی باتھ روم جاتا۔ کبھی بستر پر لیٹتا۔ کبھی اُٹھ کر ٹہلتا۔ بہن کملا (کشن لال جی کی دھرم پتنی) ساتھ والے پلنگ پر بیٹھی برابر میری نگہداری کر رہی تھیں۔ لاکھ دل کو سمجھایا۔ سلمٰی نے فون پر کہا ہے۔ مہندر جی کی حالت بہتر ہے۔ میں صبح جاؤں گا۔ کل صبح ان کو ٹھیک کر لوں گا۔ وہ مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔

کب صبح اُٹھا - کیسے اُٹھا - کب گاڑی میں بیٹھا - کب گاڑی پالم پہنچی - کب ہوائی جہاز میں سوار ہوا - کب سانتا کروز کے اڈے پر اُترا - میں نہ دلّی میں تھا نہ بمبئی میں تھا - میں خلا میں تھا - یکایک ایرپورٹ کے دروازے پر سامنے عباس کھڑے نظر آئے - ان کے پیچھے سلمیٰ - ان کے پیچھے راہی - ان کے پیچھے شیام کشن نگم ان کے ساتھ کملیشور - بھارتی - بیس پچیس دوست انہیں دیکھ کر میں سمجھ گیا - آگے ایک قدم نہ بڑھ سکا - ایرپورٹ کی سیڑھی پر دھم سے بیٹھ گیا - اور گھٹنوں میں سر دبا لیا - وہ لوگ مجھے اٹھا کر اندر ہال میں لے گئے -

---

ساری زندگی وہ پتھروں سے کھیلا - پتھروں میں رہا - پتھروں سے لڑتا رہا - پتھروں سے سر ٹکراتا رہا - اور ساری زندگی پتھر کی اس دیوار میں کوئی دریچہ اس کے لئے نہیں کھلا - وہ میرا ساتھی - میرا یار - میرا دوست - میرا بھائی - مجھے چھوڑ کر چلا گیا - وہ جو بے نواؤں کا ہم نوا تھا - غریب ادیبوں کا غم گسار تھا - فلمی ادیبوں کا خدمت گذار تھا - ہم سب سے روٹھ کر ایک ہی دن میں چلا گیا - اور زندگی اور موت کے اس دوراہے پر کھڑا میں سوچتا ہوں کیسے تجھ کو واپس بلاؤں اور کہاں سے تجھ کو ڈھونڈوں اور کیسے تجھے پکاروں اور ایسا کہاں سے لاؤں ......

"ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے"

میرے دیرینہ دوست

مہندر ناتھ

کی

روح کے لئے

عقیدت کے پھول

وشوامتر عادلؔ

رفیق جعفر

دُرگا بھابی

میں نے چھپرا بلڈنگ کی اُن سیڑھیوں کو عبور کیا جن کا ذکر مہندر بھائی کے افسانوں میں جا بجا آیا ہے اور اوپر پہنچ کر کمرہ نمبر ۱۳ پر دستک دی۔ دُرگا بھابی نے دروازہ کھولا اور "نمستے جی" کہہ کر ہاتھ جوڑ دیئے۔ دُرگا بھابی کے چہرے پر جو مہندر بھائی کی زندگی میں ایک سکون تھا وہ نہیں تھا بلکہ ایک درد تھا، غمِ زمانہ کی تلخی تھی، خزاں کی پرچھائیاں تھیں۔

بھابی کو دیکھ کر میرے دل میں ایک ٹیس اُٹھی۔ میں نے اپنے درد کو چھپانے کے لئے اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر لی اور پوچھا۔

"بھابی جی کاوش بھائی کہاں ہیں؟"

"ہیں نا جی۔ وہ بھی ہیں اور صابر دت بھی ہیں۔ دونوں مہندر ناتھ نمبر پر کام کر رہے ہیں جی۔ اُدھر مہندر جی کے لکھنے والے کمرے میں۔" بھابی نے اس طرح کہا۔ گویا یہ دونوں حضرات ہندوستانی عوام کا ایک مینی فیسٹو تیار کر رہے ہوں۔ غریبوں کی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے کوئی "بلیو پرنٹ" بنا رہے ہوں۔

میں دوسرے کمرے میں چلا گیا مجھے دیکھتے ہی کاوش بھائی نے کہا۔ "آیئے رفیق صاحب! آیئے۔ پھر انھوں نے بھابی کو آواز دی: "بھابی جی، بھابی جی۔ رفیق صاحب آئے ہیں۔" جملہ پورا ہونے سے پہلے دُرگا بھابی آ گئیں اور آتے ہی انھوں نے شہادت کی انگلی سے بیٹھے ہوئے لوگوں کو گننا شروع کر دیا۔ اور چلی گئیں۔ مہندر بھائی کی زندگی میں بھی ہماری دُرگا بھابی یہی کرتی تھیں۔ مہندر بھائی آواز دیتے "دُرگا او دُرگا" اور یہ آ جاتیں، شہادت کی اُنگلی سے لوگوں کی گنتی کرتیں اور تھوڑی دیر بعد گرم گرم چائے لے کر آ موجود ہوتیں۔ اُن کے معمول میں فرق نہیں آیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ٹرے لے کر آ گئیں اور گلاس سامنے رکھتے ہوئے کہنے لگیں۔ "آپ لوگ آ جاتے ہیں تو بہت اچھا لگتا ہے جی، مہندر جی کے وقت بھی تو بہت سارے لوگ آتے تھے۔ اب تو نہیں آتے۔ بسکٹ لاؤں جی؟" بھابی نے پوچھا۔

"نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔" صابر دت نے گلاس اٹھا کر چسکی لی۔

میں دُرگا بھابی کو دیکھ رہا تھا۔ اُن کی تنہائی، اُن کا اکیلا پن اور اُداسی کے پردے میں چھُپی ہوئی باتیں۔ کاوش بھائی نے میرے سامنے مسودہ بڑھا کر کہا "اس کو پڑھیے ذرا تصحیح کر لیں۔" مجھے لگا کہ جیسے یہاں کے لوگ بھابی کی باتوں سے خاص طور پر اُن کے سامنے مہندر بھائی کے ذکر سے کنّی کاٹ لیتے ہیں۔ دُرگا بھابی نے ساری کے پلّو کو ٹھیک سے سر پر ڈالا اور باہر چلی گئیں۔ جب وہ آنکھ سے اوجھل ہو گئیں تو کاوش بھائی نے کہا "ایک کام آپ کیجیے رفیق صاحب، ذرا دُرگا بھابی کا انٹرویو لے لیجئے۔ سب عزیزوں اور دوستوں کے تاثرات تو آ گئے ہیں لیکن دُرگا بھابی کیا کہتی ہیں مہندر کے بارے میں اس کا ذکر ابھی تک نہیں آیا۔"

"آپ کیوں نہیں لے لیتے انٹرویو۔؟" میں نے جواب دیا۔

"ہم نے کوشش کی لیکن ہمارے ہاتھ سوائے آنسوؤں کے کچھ نہیں آیا"۔

کاوش بھائی کی یہ بات سن کر میں نے قلم نکالا اور کاغذ تلاش کرنے لگا تو صابر دت بولے:

"ابھی ٹھیک نہیں ہے رفیق صاحب آپ تو ہمارا ہاتھ بٹانے کے لئے اب روز آیا ہی کریں گے کبھی اٹھتے بیٹھتے سوالات کر کے انٹرویو مکمل کر لیجیے"۔

دوسرے دن سے ہی "مہندر ناتھ یاد گار نمبر" کی ترتیب و تزئین اور پروف ریڈنگ وغیرہ میں لگ گیا۔ درگا بھابی سے روزانہ ہی سابقہ پڑتا تھا۔ اسی دوران انھیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ درگا بھابی سیدھی سادی بے پڑھی لکھی، مہاراشٹرین عورت ہیں۔ لیکن یہ ہندوستان کی کئی زبانیں بولتی ہیں۔ پتہ نہیں انھوں نے یہ زبانیں کیونکر سیکھیں! گفتگو اتنی اپنائیت سے کرتی ہیں لگتا ہے ہماری رشتہ دار ہیں۔

ہم "مہندر ناتھ نمبر" میں کام کرتے ہوئے اتنے منہمک ہو جاتے تھے کہ کسی بات کی سُدھ بُدھ نہیں رہتی۔ لیکن درگا بھابی کو ہمیشہ ہماری فکر رہتی جیسے ایک ماں کو بیٹے کی فکر ہوتی ہے۔ وہ اکثر کہتیں "کھانا کھا لو جی۔ چائے پی لو جی۔ پانی لاؤں جی"۔ غرض کہ وہ سارا دن ہماری ہی فکر میں لگی رہتیں۔ کاوش بھائی کہتے: جلدی جلدی کام کرکے بھاگ چلو بھائی ورنہ درگا بھابی بیمار ہو جائیں گی"

میں نے عموماً شعرا و ادبا کی بیویوں کو دیکھا ہے وہ اُن کے دوستوں سے نالاں رہتی ہیں۔ لیکن مہندر بھائی اس سلسلے میں خوش قسمت تھے۔ درگا بھابی مہندر بھائی کی پرستش کرتی تھیں اور آج بھی کرتی ہیں۔ ایک دن کہنے لگیں "میرے ماتا پتا، بھگوان سب کچھ وہی تھے۔ وہ زندہ رہتے اور میں مرجاتی تو کتنا اچھا ہوتا جی"۔ اور اس کے بعد آنسوؤں میں درگا بھابی کی آواز ڈوب گئی اور میرا انٹرویو دھرا کا دھرا رہ گیا۔

نمبر کے سلسلے کے مضامین جب ہم لوگ پڑھنے لگتے تو وہ چپکے سے دروازے کے پاس آکر کھڑی ہو جاتیں اور خاموشی سے سنتی رہتیں — ایک مرتبہ میں سلمیٰ آپا (سلمیٰ صدیقی) کا مضمون پڑھ رہا تھا۔ اُس دن وہ صوفے پر آکر بیٹھ گئیں۔ مضمون ختم ہوا تو ان کی سسکیاں شروع ہو گئیں۔ اُس دن میں نے بھی اُن کے رونے پر دھیان نہیں دیا سوچا شاید رونے سے غم ہلکا ہو جائے اور میرے سوالات کے وقت آنسو خشک ہو جائیں۔ میں نے اپنے جذبات پر قابو پاکر کہا: "کیسا رہا یہ مضمون؟" انھوں نے آنچل میں آنسو سمیٹے اور کہنے لگیں: "سب نے اچھا لکھا ہے جی میں کہتی ہوں نا وہ آدمی ہی اچھے تھے۔ اچھے آدمی کے لئے کون بُرا لکھے گا جی"۔

میں نے کاغذ پھیلا لیا اور قلم سنبھال کر پوچھا: "وہ آدمی تو اچھے تھے بھابی سبھی نے اچھا لکھا ہے مگر آپ اُن کے بارے میں کچھ لکھوائیں گی نہیں؟"

"میں کیا لکھواؤں جی میں تو اَن پڑھ گنوار عورت ہوں"۔ بات پھر ادھوری رہ گئی۔ ایک بار پوچھنے لگیں یہ کام کب تک پورا ہو جائے گا رفیق بھیّا!" میں نے کہا "پریس میں پرچہ چھپ رہا ہے بس اگر آپ دو چار باتیں بتا دیں بھابی تو پرچہ پورا ہو گا ورنہ ادھورا رہے گا" — "میں کیا بات بتاؤں گی جی"

"مہندر جی آپ سے بہت پیار کرتے تھے نا" میں نے سوال کیا۔

"وہ تو سب سے پیار کرتے تھے۔ اپنے خاندان والوں کو بھی اتنا چاہتے تھے اتنا چاہتے تھے کہ کوئی نہیں چاہتا ہو گا اور ان کے گھر والے سارے کے سارے مجھ پر جان دیتے ہیں۔ بھائی صاحب میرا بہت خیال رکھتے ہیں سلمیٰ جی بھی مجھ سے پیار کرتی ہیں۔ سرلا بہن تو مہندر جی سے بھی زیادہ مجھے چاہتی ہیں۔ ریوتی سرن جی دہلی سے فون کرکے حال چال پوچھتے رہتے ہیں۔ ابھی اس دن سرلا بہن کا خط آیا۔ یہ دیکھئے — انھوں نے خط نکال کر سامنے رکھ دیا۔ لکھا تھا۔ "میں جب بھی چھپر ایلڈنگ کا پتہ لکھتی ہوں تو میرا قلم کانپ جاتا ہے"۔

میں بھابی کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ کہنے لگیں "سرلا بہن کی عادتیں بھی مہندر جی سے بہت ملتی ہیں وہ بالکل مہندر جی پر گئی ہیں"۔

"لیکن آپ کی اُن کی ملاقات کیسے ہوئی آپ مہاراشٹر کی رہنے والی اور وہ پنجاب کی —؟"

بھابی کے ماتھے پر تیوریاں چڑھ گئیں۔ کہنے لگیں — "مہندر جی میں کوئی بھید بھاؤ نہیں تھا جی۔ وہ ہندوستانی، چینی، جاپانی

انگریز، حبشی سب کو ایک سا مانتے تھے، ہندو مسلمان میں بھی کوئی فرق نہیں سمجھتے تھے، وہ کہتے انسانوں کا ایک ہی خاندان ہے جو دنیا میں بکھرا ہوا ہے جیسے میری ایک بہن سرلا دلی میں رہتی ہے اور میں اور بھائی صاحب یہاں۔ جگہ الگ ہونے سے کیا ہوتا ہے آدمی نہیں بدلتا۔"

میں نے بھابی کی گفتگو کو قلمبند نہیں کیا۔ کیونکہ قلم پکڑتے ہی وہ کانشیش ہو جاتی تھیں۔

میں نے کہا: بھابی سنا ہے وہ اپنے کسی دوست کے بیمار ہونے کی خبر سنتے تو فوراً اُسے دیکھنے چلے جاتے تھے۔ جیسے جب نقش صاحب بیمار ہوئے تو....."

میری بات کاٹتے ہوئے بھابی نے کہا "نقش صاحب کی بات رہنے دیجیے میں آپ کو میراجی کی بات بتاتی ہوں" میرے کان کھڑے ہوئے سوچا بھابی اب کوئی چونکانے والی بات کریں گی۔ "وہ میراجی تھے نا جی، میراجی۔ انھیں جانتے ہیں آپ؟"

"ہاں بھابی وہ بہت اچھے شاعر تھے۔"

"ہاں جی وہ شاعر بھی تھے اور آدمی بھی اچھے تھے مگر وہ شراب بہت پیتے تھے جی۔ ہاں تو میں بول رہی تھی ایک بار میراجی بیمار پڑ گئے، جب مہندر جی کو معلوم ہوا تو وہ انھیں دیکھنے کے لئے مدھو سودھن جی کے ساتھ ہسپتال پہنچے۔ وہاں ڈاکٹروں سے معلوم ہوا کہ میراجی کو خون کی فوراً ضرورت ہے ورنہ ان کا بچنا مشکل ہے۔ یہ سن کر مہندر جی اپنا دو بوتل خون ہسپتال میں میراجی کے لئے دے آئے اور خود کئی دن تک بیمار پڑے رہے۔ یہ تھے مہندر جی۔"

آخری الفاظ بھابی نے بڑے فخریہ انداز میں کہے۔ پھر کہنے لگیں "اپنے لکھنے والے دوستوں سے مہندر جی بہت پیار کرتے تھے جی۔ اور ان کے دوست بھی انھیں بہت چاہتے تھے۔

بھابی اچھے موڈ میں تھیں تو میں نے موقع غنیمت جان کر ایک سوال اور کر دیا:

"بھابی جی آپ اپنے پتی کی کہانیاں پڑھتی تھیں؟"

"نہ جی! میں پڑھنا کہاں جانتی ہوں۔ وہ خود پڑھ کر سنایا کرتے تھے اور کبھی کبھی پوچھتے تھے کیسی ہے کہانی۔ ؟ مجھے تو ان کی ہر کہانی اچھی لگتی تھی میں کہتی مجھے کیا معلوم ہے جی تو وہ ہنس کر کہتے "ارے میں تو تمہارے ہی لئے لکھتا ہوں دُرگا۔ غریبوں کی زندگی کے لئے لکھتا ہوں۔ غریبوں کے لئے لکھتا ہوں اور اسی لئے یہاں رہتا ہوں، غریبوں کے بیچ میں۔

مگر دیکھو اسی کھولی میں سب بڑے لوگ آتے تھے جی، منسٹر بھی آتے تھے، یہیں بیٹھتے تھے جی۔ کتنا پیار کرتے تھے سب انھیں۔ میں نے کہا۔ آپ بھی تو انہیں بہت پیار کرتی ہیں ـــ یہ سُن کر بھابی کے ضبط کا بند ٹوٹ گیا۔ ہماری گفتگو بھی آنسوؤں میں ڈوب گئی۔

کرشن جی کہتے ہیں "آنسو کانچ کی دیوار ہیں۔ اس کے پیچھے سے آدمی تو نظر آتا ہے لیکن آواز سنائی نہیں دیتی۔" ہم سب آج دُرگا بھابی کو کانچ کی دیوار کے پیچھے سے دیکھتے رہتے ہیں۔ دُرگا بھابی اب وہ دُرگا بھابی نہیں رہیں ـــ آنسو ہیں، سسکیاں ہیں۔ انہیں موت کا انتظار ہے وہ کہتی ہیں "مہندر جی کو پیار تو لکشمن کپور نے کیا تھا جی، جو پندرہ دن کے اندر ہی اندر اُسی ہسپتال میں اُسی بستر پر اُسی بدھوار کو مہندر جی کے پاس چلے گئے جی۔ میں پیار کرتی تو مر گئی ہوتی۔ کب کی مر گئی ہوتی جی ـــ" ▲

فارم نمبر ۴ بابت ملکیت وغیرہ

۱۔ مقام اشاعت: ۱۵ چھپر بلڈنگ، مادھو داس پاستہ روڈ۔ دادر، بمبئی ۱۴..۴۰۰　　۲۔ میعاد اشاعت: ششماہی

۳۔۴۔ پرنٹر، پبلیشر، ایڈیٹر، مالک: صابر دت　　قومیت: ہندوستانی　　پتہ: ۱۵ چھپر بلڈنگ، مادھو داس پاستہ روڈ۔ دادر بمبئی ۱۴

میں صابر دت مالک "فن اور شخصیت" اس بات کا اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و اطلاع کے مطابق درست و صحیح ہیں۔

شرح دستخط: Sabir Dutt (صابر دت) پبلیشر

آخری صفحہ

ایک انسان کی موت

از

خواجہ احمد عباس

اردو ادیب —— ہندی ساہتیہ کار —— گجراتی، مرہٹی، بنگالی کے لیکھک —— ترقی پسند ادیب

وہ جو ترقی پسند ہیں مگر اپنے کو ترقی پسند نہیں کہتے —— وہ جو ترقی پسند ادیب نہیں ہیں —— وہ جو صرف فلموں کے لئے لکھتے ہیں —— وہ جو لکھتے ہیں مگر فلموں کے لئے کبھی نہیں —— وہ جو ادب بھی تخلیق کرتے ہیں اور روزی کمانے کے لئے فلموں کے ڈائیلاگ بھی لکھتے

ادیب، ساہتیہ کار۔ کلاکار۔ معمولی لوگ —— مرد عورتیں ——

وہ جو موٹروں میں بیٹھ کر دادر آئے تھے —— وہ جو بسوں یا ٹرینوں سے آئے تھے —— وہ جو قریب کی چال سے چل کر آئے تھے۔

یہ سب پچھلے ہفتے کی شام کو دادر کے ایک چھوٹے سے ہال میں کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے —— یہ فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کا دفتر ہے —— اور یہ سب لوگ اکٹھے ہوئے تھے ایسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری مہندر ناتھ کی اچانک اور بے وقت موت پر اظہارِ افسوس، اظہارِ محبت اور اظہارِ عقیدت کرنے۔

مہندر ناتھ تیس برس سے میرا دوست تھا —— لیکن میں اُس کے بارے میں صرف اس لئے نہیں لکھ رہا ہوں کہ وہ میرا دوست تھا اور میرے دوست کرشن چندر کا چھوٹا بھائی تھا۔

مہیندر ناتھ سے میری ملاقات تیس برس ہوئے ترقی پسند مصنفین کے ایک جلسے میں ہوئی تھی۔ کرشن چندر کے بھائی کی کہانی میں وہ شاعرانہ چاشنی تو نہیں ہے، وہ الفاظ کا جادو نہیں ہے جو کرشن چندر کی کہانیوں میں اس وقت بھی تھا لیکن مہیندر ناتھ کی کہانی سے معلوم ہوتا تھا کہ عوام کی زندگی کو اس نے پاس سے دیکھا ہے۔ اس کا دکھ درد محسوس ہی نہیں کیا بلکہ اس کا تلخ تجربہ خود بھی کیا ہے اور اس تجربے نے اس کی لکھائی کو فنی اعتبار سے ایک اونچے درجے پر پہنچا دیا ہے۔

اس کے بعد اس نے میری پہلی فلم "دھرتی کے لال" میں (جو میں نے عوامی تھیٹر کے لئے بنائی تھی) ایک مثالی نوجوان کا کردار ادا کیا تھا جو بنگال کے اکال کے مارے ہوئے انسانوں کے لئے نہ صرف ایک ریلیف سینٹر چلاتا ہے جہاں وہ دودھ اور کھچڑی بانٹتا ہے بلکہ اُن کو ہمت اور اجتماعی کشمکش کا پیغام دیتا ہے اور ان کو گاؤں واپس جا کر ایک نئی زندگی کی بنیاد رکھنے کے لئے تیار کرتا ہے۔

جاتے جاتے ایک کسان (جس کا کردار مرحوم بلراج ساہنی نے کیا تھا) مہیندر ناتھ والے کردار کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہتا ہے "تم سچ مچ بھگوان ہو بھیا"

اور مہیندر جواب دیتا ہے "میں بھگوان نہیں، بھائی، میں تو صرف انسان بننے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

مہیندر ناتھ نے جو کہا تھا وہ کر دکھایا۔ ساری زندگی سچے معنوں میں انسان بننے کی کوشش میں بتا دیئے۔ یہاں تک کہ پچھلے ہفتے اُس کا انسانیت سے بھرا دل دھڑکتے دھڑکتے ایک دم رک گیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہارٹ فیل ہو کر مر گیا۔ اُس کے ہزاروں دوست اور چاہنے والے اور چال میں رہنے والے اس کے پڑوسی کہتے ہیں کہ وہ امر ہو گیا۔

مہیندر ناتھ جوانی میں بڑا خوبصورت، لمبا چوڑا نوجوان ہوا کرتا تھا۔ وہ چاہتا تو فلم اسٹار بن کر لاکھوں کماتا۔ اس نے ایک فلم میں اُس زمانے کی ایک خوبصورت اور مشہور اداکارہ کے ساتھ ہیرو کا رول کیا تھا۔ چاہتا تو اس سے یا کسی اور فلم ہیروئن سے عشق لڑا سکتا تھا شادی کر سکتا تھا —— لیکن مہیندر نے اسٹوڈیو میں کام کرنے والی، ایک سیدھی سادھی معمولی صورت کی "ایکسٹرا" لڑکی کی ہمدردی، محبت اور وفاداری بھری آنکھوں میں اپنا جیون ساتھی تلاش کر لیا۔ ایک چال کی کھولی میں رہنا منظور کر لیا۔ اور ساری زندگی صرف اسی کا ہو کر رہا اور آخر دم بھی اُسی کی آغوش میں توڑ دیا۔

مہیندر ناتھ ترقی پسند ادیب تھا۔ اس نے سینکڑوں کہانیاں عام محنت کش انسانوں کی زندگی کے بارے میں لکھیں۔ لیکن ایسی کہانیاں کون خریدتا ہے؟ نہ ایسی کہانیاں یا ایسے ناولوں کے تین تین لاکھ کے ایڈیشن بکتے ہیں۔ اس لئے وہ فلموں کے ڈائیلاگ لکھ کر روزی کماتا رہا۔

لیکن اس فلمی دنیا میں اُس نے دیکھا کہ لکھنے والے کی بے قدری ہوتی ہے۔ اُن کو معاوضہ معقول نہیں ملتا، وقت پر نہیں ملتا، اُن کے ساتھ بہت سی بے انصافیاں ہوتی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس لئے اس نے اپنی زندگی کے آخری پندرہ برس فلم رائٹرز کی تنظیم کرنے میں صرف کر دیئے۔ بارہ برس تک اُن کی ایسوسی ایشن کا جنرل سکریٹری رہا۔ (ہر سال عہدے دار بدلے جاتے تھے مگر جنرل سکریٹری مہیندر ناتھ کے سوا کوئی نہ ملتا تھا) سینکڑوں فلم رائٹرز صرف اس کی کاوشوں اور ان تھک کوششوں سے اپنا حق پا سکے۔ آج اگر فلم رائٹرز سر اونچا کر کے چل سکتے ہیں تو بہت حد تک یہ مہیندر ناتھ ہی کی محنت اور لگن کا نتیجہ ہے۔

اِس تنظیمی ٹریڈ یونین کے کام کے لئے مہیندر ناتھ کو اپنا ادبی رتبہ قربان کرنا پڑا۔ جو اس کو ضرور ملتا اگر وہ سب کام چھوڑ کر صرف تخلیقی کام کرتا۔ اوروں کی بھلائی کے لئے، اُن کو ان کا حق دلوانے کی جدوجہد میں اس کو اپنا کیریئر قربان کرنا پڑا۔ اگر وہ اپنا سارا وقت فلمی کہانیاں، اسکرین پلے اور ڈائیلاگ لکھنے پر لگاتا تو کامیابی کی ساری نشانیاں اس کے پاس بھی ہوتیں ـــ موٹر، بڑھیا فلیٹ، عمدہ فرنیچر ٹیلی ویژن سیٹ، ریفریجریٹر اور بینک کے لاکر میں کالا روپیہ۔ وہ تو صرف اتنا کام کرتا تھا کہ اپنا اور اپنی بیوی کا پیٹ بھر سکے۔ اور باقی تمام وقت اس کوشش میں لگا دیتا تھا کہ دوسروں کے کام کرنے کے حالات بہتر ہو سکیں۔

اس نے ساری زندگی دادر کی ایک چال، جس کا نام چھپرا بلڈنگ ہے کی ایک کھولی میں گزار دی۔ اس بلڈنگ میں متوسط درجے کے اور محنت کش طبقے کے لوگ رہتے ہیں۔ کلرک، چھوٹے موٹے دکاندار، فلمی دنیا کے چھوٹے موٹے آرٹسٹ، اور ٹیکنیشینز، مل مزدور گھروں میں کھانے پکانے اور برتن دھونے والیاں، ہندو، مسلمان، عیسائی، مہاراشٹرین، گجراتی، سندھی، پنجابی۔ ان لوگوں کے درمیان یہ ادیب، یہ آرٹسٹ، یہ فن کار رہتا تھا۔ ان لوگوں کی زندگی ہی اس کے انسانوں کا موضوع تھا۔ اُن لوگوں سے وہ الگ تھلگ نہیں رہتا تھا اُن میں گھل مل کر رہتا تھا۔ ہر ایک کے دکھ درد میں شریک رہتا تھا۔ چند برس سے اس کے ہاں ٹیلی فون لگ گیا تھا جب سے چال کے سب مرد عورت اور بچے، یہی ٹیلی فون استعمال کرتے تھے۔ مہیندر ناتھ کی مرنجانِ مرنج شخصیت کے گرد ہی چال کی ساری زندگی گھومتی تھی۔

جب وہ مر گیا ـــ اور فلمی اور ادبی دنیا کے سینکڑوں مشہور آدمی اس کی بیوہ کو، اس کے بھائی اور بھابی اور بھتیجوں کو پرسہ دینے آئے تو چھپرا بلڈنگ والوں نے نہ صرف اپنے کمروں کے دروازے بلکہ اپنے دلوں کے دروازے کھول دیئے۔ اُس وقت ایسا لگتا تھا یہ ساری بلڈنگ مہیندر ناتھ کی تھی۔ جس کے درجنوں کمروں میں اس کا لمبا چوڑا خاندان رہتا تھا۔

لوگ کہتے تھے مہیندر ناتھ کس گندی، اندھیری بلڈنگ میں رہتا ہے اس دن اُن کو معلوم ہوا کہ چھپرا بلڈنگ گندی نہیں ہے ـــ اندھیری نہیں ہے۔ یہاں کمروں کی صفائی کے ساتھ دلوں کی صفائی بھی ہوتی ہے۔ بجلی کی روشنی کے ساتھ دلوں اور دماغوں میں بھی محبت کی روشنی ہے۔ یہاں کی کھڑکیوں میں سے نہ صرف دور سے سمندر کی ہوا آتی ہے بلکہ انسانیت، برادری اور بھائی چارے کی ٹھنڈی زندگی بخش ہوا کے جھونکے بھی آتے ہیں۔

مہیندر ناتھ کے پڑوس میں، اُس کے پڑوسیوں کی یادوں میں، اُن کی عورتوں کی آنسو بھری آنکھوں میں، بوڑھے بوڑھیوں کی آہوں میں، بچوں کے سہمے ہوئے رکھے ہوئے چہروں پر میں نے مہیندر ناتھ کی محبت اور انسانیت اور رفاقت بھری شخصیت کی آخری جھلک دیکھی اور وہ جھلک کہہ رہی تھی "میں تو صرف انسان بننے اور بنانے کی کوشش کر رہا ہوں مرنے کے بعد بھی!"

اپنی بات

... رسالہ فن اور شخصیت پر آپ مُردہ پرستی کا الزام نہیں لگا سکتے کہ میں نے یہ کام مہندر ناتھ کی زندگی میں شروع کیا تھا۔ کیونکہ میرا خیال ہے کہ جس طرح سرمایہ پر چند لوگوں کا قبضہ ہے اُسی طرح ادب کو بھی چند لوگوں نے اپنی میراث بنا رکھا ہے۔ دور کیوں جایئے مہندر ناتھ مرحوم کو ہی دیکھ لیجیے وہ ترقی پسندوں کا جنرل سکریٹری تھا پھر بھی اس کی ادبی شعاعوں کو گمنامی کے بادلوں سے باہر نہیں آنے دیا گیا۔ سی۔ ایل۔ کاوش کا خیال ہے کہ میری بیکاری کو کارکردگی کی طرف موڑنے کے لیے اس نمبر کی تجویز پیش کی گئی ہوگی اور میں کہتا ہوں "مہندر ناتھ نمبر" میرا اپنا ارادہ تھا مہندر ناتھ کا نہیں میری بات کاوش صاحب نہیں مانتے اُن کا کہنا ہے کہ میں مہندر ناتھ کو خوب سمجھتا تھا اور کاوش صاحب کی بات میں نہیں مانتا کیونکہ کاوش صاحب مہندر ناتھ کو جانتے ہوں گے مجھے نہیں جانتے۔ پھر بھی ہم اس نمبر میں برابر کے شریک کار ہیں۔

کرشن چندر جی دل کے مریض ہیں اور مہندر ناتھ کی موت کے بعد وہ اپنے آپ کو ادھورا سا محسوس کرتے ہیں۔ وہ بلا مبالغہ ایشیا کے سب سے بڑے ادیب ہیں، کہانی کار ہیں۔ کسی اور ملک میں ہوتے تو حکومت اُنہیں بے نیاز کر دیتی، لیکن یہاں ابھی تک روزی روٹی کی تگ و دو میں اُلجھے ہوئے ہیں۔ انہیں زندہ رہنے کے لیے کچھ کہانیاں مجبوری میں لکھنی پڑتی ہیں۔ فنکار کی مجبوری کا ادب فروشی تو ہو سکتی ہے تخلیقی عمل نہیں کہلائی جا سکتی۔ یہ اُن کی نہیں ہمارے ملک کی بدقسمتی ہے۔ وہ اس پرچے کے نگران ہیں۔ بیماری کے باوجود انہوں نے ہر طرح کے صلاح مشورے اور امداد سے میری اعانت کی ہے۔ میں نے انہیں بھی کافی پریشان کیا۔

ادھر فلم رائٹرس ایسوسی ایشن نے اور مہندر ناتھ میموریل ٹرسٹ نے میرے ساتھ پورا پورا تعاون کیا میں اُن کا شکر گزار ہوں۔ سب سے بڑی الجھن بمبئی میں یہ ہے کہ نہ رہنے کے لیے مکان ملتا ہے نہ لکھنے کے لیے کاتب۔ مکان تو مجھے آج تک نہیں ملا لیکن خوش قسمتی سے سہیل احمد خان جیسا خوش نویس اور عبد الکریم جیسے کاتب مجھے مل گئے۔ عبد الکریم کے لکھے ہوئے صفحات آپ آنکھ بند کر کے چھاپ دیجیے غلطی کا امکان نہ ہوگا۔

میرے عزیز رفیق جعفر اور راشد میاں نے اس نمبر میں میرا ہاتھ بٹایا ہے۔ صبح سے شام تک میں مضامین اکٹھے کرتا تھا اور یہ لوگ اسکی لکھائی پر توجہ دیتے تھے۔ حسن خان جو دلیپ کمار کے چھوٹے بھائی ہیں اس کام میں میرے بڑے بھائی ثابت ہوئے جہاں میری ہمت ٹوٹتی تھی وہ مجھے فرہاد کا قصہ سُناتے تھے —— لانا ہے جوئے شیر کا .... " اور پھر میں ہر سخت مقام سے گزر جاتا تھا۔ پوری دلی سے فورٹ تک اور فورٹ سے کرلا کے گرد و نواح کے چکر کاٹنے لگتا تھا۔

راشد آرٹسٹ جنہیں میں حسن کار کہتا ہوں انہوں نے اپنی علالت کے باوجود اس نمبر کے سارے ڈیزائین وقت پر مکمل کر دیئے لیکن پھر بھی وقت پر یہ نمبر نہ نکال سکا مجبوریاں بہت تھیں، مجبوری پر قابو پانے کے لیے جان ہونٹوں پر آجاتی تھی۔

اتنے لوگوں کی عرق ریزی کے بعد یہ پرچہ اب آپ کے ہاتھ میں ہے۔ شریک کار ساتھیوں کا شکریہ تو میں ادا کر دونگا لیکن دُکھ کی بات یہ ہے کہ میری محنتوں کو سراہنے والا اب اس دنیا میں نہیں ہے ——

کاش مہندر ناتھ آج زندہ ہوتا!!

صابر دت

مدیر

B. R. I. Arts

'KAGAZ KI NAO'

★ing : Sarika
Rajkiran
Pradeepkumar
I. S. Johar
Aruna Irani
Helen
and
Reena Ghosh

Written & Directed by :

B. R. Ishara

Music : **Sapan Jagmohan**

Lyrics : **Naqsh**

Photography : **Omi Behl**

Issued by :

M/s B. R. I. ARTS,
Trilok Bldg.
Dr. Ambedkar Rd.,
Bandra, Bombay - 400 050.

فن اور شخصیت

کا

اگلا شمارہ

جاں نثار اختر نمبر

(ستمبر ۱۹۷۵ء)

"جاں نثار اختر کے یہاں روایت کے صالح عناصر کی پاسداری اور عرفان کے ساتھ اس دور کے درد و دماغ اور سوز و گداز کی جس طرح آئینہ داری کی گئی ہے وہ بڑے بڑوں کے بس کی بات نہیں" ——— (آل احمد سرور)

"جاں نثار کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے زندگی کو بندھے ٹکے زاویوں سے الگ کر کے سکہ بند رد عمل سے دور ہٹ کر دیکھا ہے اور اس مشاہدے بلکہ تجربے کو بے اختیارانہ بیان کرنے کے لئے ایک نیا شگفتہ اور جاندار پیرایۂ بیان ایجاد کیا ہے۔ یہ ایجاد انہیں معنوں میں ہے جن معنوں میں میر نے اپنے شیوۂ گفتار کو اور غالب نے اپنی مکتوب نگاری کے اسلوب کو خاص اپنی ایجاد بتایا تھا" ——— (ڈاکٹر محمد حسن)

"بلند اور شاندار ادب میں یہ موضوع اور اس کے ہزاروں پہلو سور داس کے پدوں میں دکھائے گئے ہیں۔ جاں نثار اختر نے یہی نعمت ہمیں گھر آنگن کی رباعیوں میں دے کر ہم سب پر بڑا احسان کیا ہے" (فراق گورکھپوری)

چند لکھنے والے

۱۔ احتشام حسین مرحوم
۲۔ آل احمد سرور
۳۔ خواجہ احمد فاروقی
۴۔ ڈاکٹر محمد حسن
۵۔ فراق گورکھپوری
۶۔ کرشن چندر
۷۔ راجندر سنگھ بیدی
۸۔ قرۃ العین حیدر
۹۔ عصمت چغتائی
۱۰۔ ڈاکٹر ظ انصاری
۱۱۔ سردار جعفری
۱۲۔ ڈاکٹر قمر رئیس
۱۳۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
۱۴۔ خواجہ احمد عباس
۱۵۔ فکر تونسوی
۱۶۔ انور عظیم
۱۷۔ اختر سعید
۱۸۔ سلمیٰ صدیقی
۱۹۔ علی جواد زیدی
۲۰۔ شفیقہ فرحت
۲۱۔ راما نند ساگر
۲۲۔ شاذ تمکنت
۲۳۔ زہرہ جمال
۲۴۔ کشمیری لال ذاکر
۲۵۔ ساحر لدھیانوی
۲۶۔ صفیہ اختر مرحومہ
۲۷۔ خدیجہ اختر
۲۸۔ رضیہ سجاد ظہیر
۲۹۔ واجدہ تبسم
۳۰۔ پرکاش پنڈت
۳۱۔ عمیق حنفی
۳۲۔ باقر مہدی
۳۳۔ عزیز قیسی
۳۴۔ محمود ہاشمی
۳۵۔ ڈاکٹر نریش
۳۶۔ سی۔ ایل۔ کاوش

ان کے علاوہ پاکستان کے کئی قلمکار